جہانِ دِگر
(جہانِ دانش) حصّہ دوم
احسان دانش

جہانِ دگر
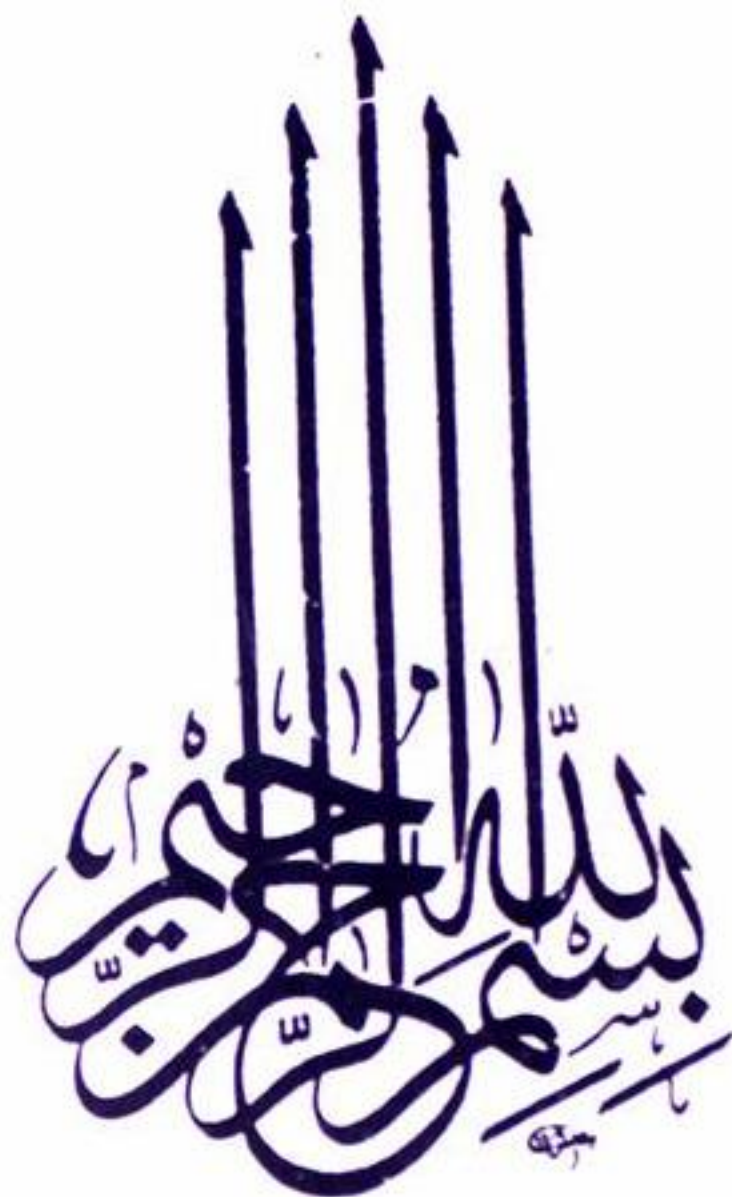
دیدہ زیب اور
خوبصورت کتب کا
واحد مرکز

تزئین و اہتمام
نذیر محمد طاہر نذیر

تاریخ اشاعت	۲۰۰۱ء
سرورق	عبیداللہ
اہتمام	محمد نذیر، طاہر نذیر
کمپوزنگ	الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
قیمت	Rs. 700/-

فہرست

جہانِ دگر

میرے لڑکپن نے چلچلاتی ہوئی دھوپ اور موسلا دھار بارشوں میں بھاگ دوڑ کر جوانی کا دامن تھاما کہ شاید اب بھی وقت کو رحم آ جائے لیکن جوانی نے بھی سوتیلوں جیسا سلوک روا رکھا اور میں سر جھکائے اس ماہ و سال کے سیلاب میں ڈوبتا ابھرتا مصروفِ سفر رہا۔ کچھ دور چل کر ایسا ماحول وجود میں آ گیا کہ میرے لیے غمخواری کی آوازیں تو آتی تھیں لیکن صورتیں اول تو دکھائی نہیں دیتی تھیں اور اگر کبھی کوئی ہمدرد مل گیا تو میرے حالات سے اس طرح الگ ہو گیا جیسے میری زندگی کا رستا ہوا کوڑھ اس کی طرف منتقل ہو جائے گا میں اپنے چاروں طرف کانس کے جھنڈ محسوس کرتا تھا جہاں ذرا سی ہوا کی رمق چونکا تو دیتی ہے لیکن سرکنڈوں کی پھلن کے سوا کوئی شگفتہ شے نظر نہیں آتی۔ اتنا ضرور تھا کہ میرے ذہن میں حادثات اور سانحات کے گرز لگتے جا رہے تھے اور میں اس جانکنی کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ ایک دن کے مصائب کا دوسرے دن خیال تک نہ آتا۔ جیسے کوئی دیکھا ہوا خواب آنکھ کھلتے ہی محو ہو جائے اور یاد کرنے کے باوجود یاد نہ آئے۔

مگر نجانے کیا بات تھی کہ عمر کی پٹری کے ہر موڑ سے ایسے جنکشن نظر آنے لگے جہاں کے عمال سزا اور جزا کا وزن کر کے مختلف مقامات کا پروانہ راہداری دے دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں عمر کے سفید اور سیاہ قبالے جلی اور روشن ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کسی مسافر کو تو کپکپی چڑھ جاتی ہے اور کسی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جھلک پڑتے ہیں۔

اب جو میں کتاب میں قلم بند کرنے کے لیے ماضی کو پھر رولتا ہوں تو واقعات اور حادثات وقت کے انبار میں دب کر ایک دوسرے سے اس طرح چپک گئے ہیں کہ احتیاط سے علیحدہ کرنے کے باوجود ایک پرت میں دوسرے پرت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور یکجان ہوا چلا آتا ہے جیسے پرانی قلمی کتابیں جڑ کر بھنڈ ہو جاتی ہیں۔

اسی چھان بین میں میرا ماضی میرے ذہن کے آئینے میں خال و خط سمیت اس طرح آ گیا کہ

کئی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں لیکن میں صرف انہیں واقعات کو لکھوں گا اور انہیں افراد کا ذکر کروں گا جن سے مجھے دور یا نزدیک کا کوئی تعلق یا واسطہ رہا ہے یا میں ان سے کسی صورت سے بھی متاثر ہوا ہوں۔

میری نظر میں زندگی رہگزار عدم سے اٹھا ہوا ایک بگولہ ہے جو جنگلوں' شہروں' دریاؤں' ساحلوں اور خلاؤں میں چکرا چکرا کے ختم ہو جاتا ہے مگر اس میں بعض بعض مقامات ایسے ایسے آتے ہیں کہ گوری گوری تالیوں کی سنہری آوازیں دل کو لبھاتی اور چشم و گوش کے لیے ایک حسین تماشا بن جاتی ہیں۔ بعض سانحات آنکھوں کو آنسو سونپ جاتے ہیں اور کہیں پازیب کی روپہلی جھنکاریں دل نقش ہوتی چلی جاتی ہیں بعض مشاہدے کا تاثر کلیجے میں اترا چلا جاتا ہے جیسے صابن سے باریک تار گزر رہا ہو اور پھر اگر کسی مشاہدے کا کوئی زخم یا خراش روشن ہو جاتی ہے تو وہ کراہتی ساعتیں میرے تصور کے دروازے سے نہیں ہٹتیں۔ اسی لیے میں صرف تصور کے بل پر جو سامنے آتا ہے لکھتا چلا جاتا ہوں۔

صداقت امر ہے

جب میں بے کار ہوتا اور کہیں کام نہ لگتا تو غلیل مارے کوے کی طرح ادھر ادھر دھکے کھاتا پھرتا اور مجھے یہ لگتا کہ بے کاری کا آرام بیماری کے آرام سے زیادہ کرب ناک ہے جو نتیجے میں اطمینان اور عافیت نہیں رکھتا' جب میں اس ناکارگی سے تنگ آ جاتا تو کہیں تنہائی میں بیٹھ جاتا اور اللہ کا ذکر کرنے لگتا اس وقت میرا خیال یقین کی حد تک ہوتا کہ خدا کی مزدوری کر رہا ہوں اور وہ مجھے کسی نہ کسی صورت سے اس کا معاوضہ ضرور دے گا اور ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا کہ گھر سے نکلا ہوں' اور مجھے معقول معاوضے کی مزدوری مل گئی اگر مزدوری نہیں ملی تو کسی نہ کسی ویران راستے سے بقدر ضرورت مصارف مل گئے اور میں خدا کا شکر ادا کر کے اپنے مصارف میں لے آیا۔

میں نے کبھی کسی سیاسی' مذہبی یا تعلیمی ادارے سے یہ نہیں کہا کہ میرے لیے ایسی سہولت پیدا کر دیں کہ مجھے اپنی ذہنی اور روحانی غذا مل جائے یا اس کے حصول میں آسانی ہو کیونکہ میں رزق کے معاملے میں خدا کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنا اپنے ایمان و یقین کی توہین خیال کرتا ہوں' نہ میں نے

کسی خاص شعبے پر ایسی توجہ دی کہ عمر بھر کے لیے اپنا لیا جائے۔ ہر حال میں میری نگاہ معاشرے پر رہی ہے اور حسن پرستی کے معاملے میں حسن فطرت کو زیادہ قابل توجہ گردانا ہے السی کے نیلے پھولوں والے کھیت مجھے ایسے معلوم ہوتے، جیسے آسمان زمین پر اتر آیا اور ستاروں کی دعا مانگ رہا ہے، علی الصبح جب بارش ہو کر تھمتی تو گلیوں میں ہوا کے ٹھنڈے اور روقت شناس جھونکے چل پڑتے، اسی عالم میں صبح کا نومولود سورج اپنا سہانا پن کوٹھوں پر بکھیر دیتا اور مجھے نشہ سا ہو جاتا، سرسوں کے پھولے ہوئے کھیت ایسے معلوم ہوتے، جیسے زمین کے نشوونما کا سبز خون زرد ہو گیا ہے جب میں منہ اندھیرے اٹھتا اور کھلتے ہوئے پھول شبنم سے بھیگی ہوئی ٹھنڈی سانسیں میرے سینے میں انڈیلتے تو مجھے پھریری آ جاتی، باغ کے پیچھے سے نکلتا ہوا چاند جب رات کے طلسم پر چھوٹ پھینکتا تو جنگل کی کالی خاموشی پر چاندی کا جھول پڑھ جاتا اور میں چپکے چپکے لطف اٹھاتا اور اسے انعام الٰہی سمجھتا۔

شاید یہی سبب ہے کہ میرا کلام اور کتابیں میری توقع سے زیادہ مقبول ہوئیں اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو یہ یقین نصیب ہوا کہ ادب کی منڈی میں سچائی کی قیمت بھی اٹھتی ہے میری کتاب ''جہان دانش'' کے بعد ادبی حلقوں میں جرأت ہوئی اور لوگوں نے اپنے سوانح کے معاملے میں سچ بولنا شروع کر دیا ہو سکتا ہے کہ یہ بھی وقت آ جائے کہ جعلی ادیب اور شاعر جھوٹ پر سچ کا رنگ روغن چھڑک کر بازار کو گندا کرنے لگیں لیکن دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کرنے والے لوگ ہر دور میں رہیں گے صداقت تو اگر کنویں میں بھی دفن کر دی جائے ایک دن باہر آ کر رہتی ہے۔ اور جھوٹ زیادہ دور تک تیز رفتاری سے نہیں چل سکتا۔

مطالعہ کے چند روز

جب مجھے ذرا ہوش آیا اور اعصابی تشنج سے نجات ملی تو میں نے چاروں طرف ایڑیاں اٹھا اٹھا کر نظر دوڑائی، بے فکری اور آسائش کی طرف تو مجھے زندگی پر دور دور تک سایہ نظر نہ آیا لیکن زندگی کے راستے میں پھیلا ہوا جھاڑ جھنکاڑ مجھے دل برداشتہ نہ کر سکا، کیونکہ میرا جسم مشقت کی بھٹیاں جھیل چکا تھا اور میں معمولی درجے کی زندگی سے گھبرانے کی بجائے دلچسپی لینے لگا تھا چنانچہ اسی طرح اجالے میں گنگنائے ہوئے دن اور جھلسی ہوئی دھوئیں میں رچی راتیں آتی جاتی رہیں۔

جب میں اپنی شاعری کی طرف نظر ڈالتا اور اپنا جائزہ لیتا تو میرے سامنے مشاہیر اور اساتذہ کا سمندر کی طرح لہریں مارتا ہوا میدان نظر آتا جسے عبور کرنے کا ارادہ تو کیا خیال بھی دشوار تھا' لیکن مجھے اپنے محنت سے کمائے ہوئے بدن اور مشقت سے بنائے ہوئے بازوؤں سے مایوسی نہیں تھی۔ چنانچہ خدا کے فضل و کرم سے ایک دن آ گیا کہ میں اپنی اور اپنے مزدور ساتھیوں کی ترجمانی کرتے کرتے اساتذہ کے ساتھ منزلیں مارنے اور مشاعرے پڑھنے لگا۔

انہیں دنوں میں نے حروف تہجی کے اعتبار سے اپنے اردگرد کے لوگوں کا ایک تذکرہ لکھا جس کا کہیں کہیں سے انتخاب اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں باقی مکمل تذکرہ اپنے وقت پر شائع ہوگا اور ملک و قوم کی حالت اور سیاسی تغیرات کے پیش نظر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وقت کب آئے گا' یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کتاب کے بعد ہی چھپ جائے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ اساتذہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور تذکروں کے علاوہ جرائد کے انفرادی نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' یہ تو اپنا اپنا اسلوب نگارش اور خلوص ہے نجانے عوام کس بات کو پسند کریں۔

مشاعروں میں بعض لوگ میری کامیابی پر ناک بھوں چڑھاتے اور بعض حوصلہ افزائی کرتے مگر میں اس تعریف و تنقیص سے بے نیاز مصروف سفر رہا کیونکہ مجھے اپنے معاملے میں خوش فہمی نہیں تھی اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس ملک میں اب تک کوئی مائی کا لال میری سطح سے اٹھ کر شعر و ادب کی عدالت میں نہیں آیا اور نہ میری طرح پس ماندہ طبقے کی زندگی کے شب و روز سے باخبر ہے۔

یہی بات تھی جو بڑی بڑی سخت جان چٹانوں پر میری آواز کا تاثر ڈالتی تھی اور لوگ آنسوؤں میں نہائی ہوئی آنکھوں سے میرا کلام سنتے تھے' ہاں علمی رخ سے میں خود سے مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے سوچ سمجھ کر اردو کے راستے سے ضرورتاً فارسی شعراء کا مطالعہ کیا اور سب سے پہلے سعدی شیرازی کو پڑھا' ان کے متعلق میری ناقص رائے یہ ہے کہ جس نے فارسی زبان کا ذوق رکھتے ہوئے سعدی کو نہیں پڑھا وہ فن فصاحت و بلاغت سے آگاہ نہیں ہو سکتا' سعدی فارسی زبان و ذوق کے معماروں میں صف اول کا شاعر ہے۔

اس کے بعد قوالیوں میں سن سن کر اور اساتذہ کے تبصرے پڑھ کر حافظ شیرازی کو پڑھا تو
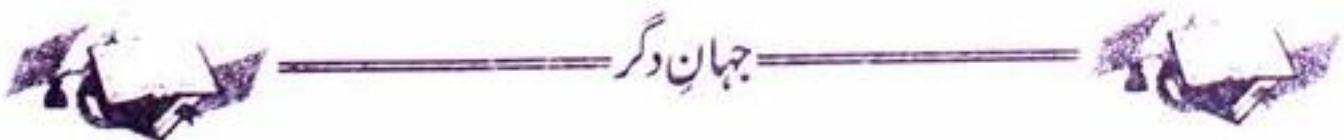
معلوم ہوا کہ جہاں تک غزل کا تعلق ہے' حافظ کا مقام تغزل کسی کو حاصل نہیں حافظ کے مطالعے سے نظر میں بلندی' ذوق میں پختگی اور خیالات میں وسعت کے علاوہ بیان میں حسن اور برجستگی آجاتی ہے' حافظ کے بعد کے شعراء میں اکثر شاعر حافظ شیرازی سے مستفید ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

علامہ ڈاکٹر اقبال کے مطالعے سے مولانا روم کی طرف متوجہ ہوا اور اب بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ مولانا روم کا علمی اور فکری دربار تصوف کا ہائیکورٹ ہے جس محی الدین محمد اورنگ زیب نے اپنے فتاویٰ کی صورت میں ایک اسلامی ریاست کا آئین دیا ہے اسی طرح مولانا روم نے مثنوی کی صورت میں اہل طریقت کے لیے عدالت عالیہ دے دی ہے۔

اس کے بعد میں خود بخود امیر خسرو کی طرف متوجہ ہوا لیکن پوری طرح مطالعہ نہ کر سکا کیونکہ مجھے اس وقت تک ان کی کتابیں میسر نہیں تھیں اتنا ضرور ہے کہ خسرو کی ''اعجاز خسروی'' سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ خسرو جیسا صاحب فن دنیا میں پھر نہیں آیا' شب و روز کی جانکاہ مصروفیات کے باوصف خسرو کے یہاں صنائع و بدائع اور عقدہ ہائے تصوف کے انکشاف اس طرح ملتے ہیں کہ برسوں کی الجھن اور تشنگی دور ہو جاتی ہے' خسرو ایسا ممتاز شاعر اور نثار ادیب ہے کہ بڑے بڑے علمی و ادبی دھنتروں کے شہتیر اس کے سامنے بونے لگتے ہیں۔ فارسی کا آخری شاعر جس نے کسی اور طرف جھانکنے ہی نہیں دیا عرفی ہے۔ اس نابغہ روزگار کو سمجھنے کے لیے بھی نابغہ شخصیت ہی درکار ہے۔

پرشوتم ضیا سے ایک گفتگو

لکھنو میں جب میں نے اپنے ایک ہندو دوست پرشوتم لعل سے کہا کہ تم یہ کیا بکواس کرتے پھرتے ہو کہ کمیونزم میں سب امیر و غریب یکساں ہوں گے' یہ کیسے ممکن ہے؟ کہ ایک غریب کے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں اور وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط نہیں اور یہاں مر مر کے دس بارہ آنے کماتا ہے اسے گیارہ آدمیوں کی خوراک دی جائے گی اور ایک امیر جو توانا اور تندرست بھی ہے اور اس غریب سے دماغی طور پر ہزار درجے بلند ہے مگر اس کے گھر میں ایک لڑکا ہے باقی وہ میاں بیوی یعنی تین افراد اور انہیں تین خوراکیں دی جائیں گی! اگر ایسا ہے تو یہ بڑی غیر منصفانہ بات ہوگی۔ اس تنظیم میں اچھے قابل اور صاحب فہم و فراست کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہوگی جبکہ اس کا معاوضہ اسے اس

سے ہزار درجے پست انسان کے برابر دیا جائے گا۔

اس نے جواب میں کہا یہاں اس بات کو کون سوچتا ہے ابھی اس ملک کے عوام میں اتنی بیداری نہیں کہ اتنی دور کی بات سوچ سکیں لیکن ذرا سلسلہ آگے چلنے دو جب ہماری اکثریت ہو جائے گی تو پھر باقی مسائل طاقت سے حل کر لیے جائیں گے۔ مطالبات طلب کرنے والوں کو کسی اور طرح بھی سمجھایا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا یعنی؟ کسی اور طرح کیسے؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ اس نے بڑے اطمینان سے کہا طاقت کے سامنے کون زبان کھول سکتا ہے ہم اس وقت استعمال کریں گے اب تک حکمران لوگوں نے اپنے مقاصد کے لیے طاقت کا صحیح استعمال نہیں کیا۔

میں: آپ کی پارٹی نے غریبوں' کسانوں اور مزدوروں کے لیے طاقت کا استعمال سوچ لیا ہے۔ لیکن اپنی حفاظت کے لیے کیا سوچا ہے؟ کیا برسر اقتدار پارٹی آپ کے ساتھ وہی سلوک نہیں کرے گی جو آپ غریبوں سے حقوق طلب کرنے کے جرم میں کریں گے؟

وہ: میاں ہم تو احکام جاری کرنے والوں میں ہوں گے۔

میں: ارے بھائی احکام جاری کرنے والوں میں بھی تو آپس میں بلند منصبوں کے تعین پر چپقلش ہوگی اسے کون روکے گا۔

وہ: روکتا کون ہمارے بازو روکیں گے اور مخالفوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اس نے یہ فقرہ بڑے طنطنے میں کہا۔

میں: یہ تو پھر وہی مار دھاڑ کی بات ہوئی اس طرح تو گلیوں میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے گا جس کے سد باب کا آپ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کیا اس وقت تک آپ ہوں گے؟

وہ: زچ ہو کر۔ میاں میں نہیں ہوں گا تو کیا ہے کوئی تو ہوگا وہ خود حالات پر قابو پالے گا اور قصہ کوتاہ یہ کہ مزدور کسان اور پس ماندہ طبقہ غالب نہیں آئے گا وہ کمائیں گے ہم جیسے کھائیں گے۔ طاقت پھر طاقت ہے آپ دیکھتے رہیں۔ ہمارے پاس ایسے ایسے آدمی بھی ہیں جن کا اسلامی اور دینیاتی مطالعہ اس بلا کا ہے کہ ایک تقریر میں مسجدوں کے لوٹے ریزہ ریزہ دکھائی دینے لگیں۔ نچلے طبقے کو عقبیٰ کی آسائش اور جنت کا ایسا منظر دکھائیں گے کہ ہر نمازی خود کو دس حوروں کا شوہر محسوس کرنے لگے گا۔

میں نے عرض کی- جناب وہ آپ کے مقررین اسلام سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں- صحیح مسلمان ان کی لسانی قلابازیوں اور شعبدہ بازیوں میں نہیں آتے آپ اگر ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ انسان دوستی نہیں غریب مار ہے غریب مار! اس میں شک نہیں کہ یہ ظرف وضمیر سے بغاوت اور جنسی گناہوں کا لپکا آپ لوگوں کو سبز باغ دکھا رہا ہے لیکن اس کا انجام ہولناک ہوگا- غریب تو بیچارے غریب ہیں جانوروں کی طرح طاقت کے اشاروں پر چلتے رہیں گے لیکن قدرت کے انتقام کا کیا توڑ ہوسکتا ہے؟

وہ میری ان باتوں سے دبا نہیں اور کہنے لگا آپ انسانی قوت کو خدا کی قوت خیال نہیں کرتے؟

میں: ضرور خدا کی طاقت خیال کرتا ہوں لیکن انسان کو خدا نہیں سمجھتا-

وہ: پھر یہاں آ کر پچاس فی صد تو آپ میرے ہم خیال ہو جاتے ہیں-

میں: میرے فقرے پر غور کرلیں آپ کی راہ سے سیدھی سادی سڑک میں پیچ وخم آ جاتے ہیں اور مسافت طویل ہو جاتی ہے اور یہ کہاں تک درست ہے؟

وہ آپ کا خیال ہے! اور بس! جناب آزاد خیال مشرب میں پیچیدہ باتیں نہیں ہوتیں اور ابھی آپ نے کمیونزم کا مطالعہ بھی کہاں کیا ہے؟ وہ تو ایک معاشی نظام ہے-

آپ نے تو کیا ہوگا ذرا مجھے بھی تو سمجھائیں میں نے اطمینان سے عرض کی-

وہ: اصل میں کمیونزم کا مکمل مطالعہ تو میرا بھی نہیں لیکن میں اس تنظیم کو درست خیال کرتا ہوں- اگرچہ یہ بات اسلام کے خلاف جاتی ہے- اس نے جلتے ہوئے لہجے میں کہا-

میں: اچھا جناب اسلام کے متعلق بھی رائے زنی کر سکتے ہیں؟ آپ کو اپنے مشرب کا انجام بھی معلوم ہے کہ اس اوہام پرست اور بے اخلاق ہجوم کا کیا بنے گا؟ اور یہ مندر یہ کرپاتھا تگ یہ اسٹوپے اور یہ مٹھ کہاں جائیں گے' ہردوار بنارس' جگناتھ پوری اور اسی قسم کی پرستش گاہیں کہاں جائیں گی اور عقائد کے اس بہتے ہوئے دریا کے رنگ برنگ گھاٹ اور ان کی سادہ خاطر مخلوق کا کیا حال ہوگا میں نے ایک سانس میں کہا- اس نے بڑے اطمینان سے کان کی پشت کھجاتے ہوئے جواب دیا'' جناب من میرا مذہب لامذہبی ہے مجھے معلوم ہے کہ ان مندروں میں پاٹھ شالاؤں میں سائنس کی لیبارٹریاں کھلیں گی اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر کنکریٹ میں ملا دیا جائے گا لیکن مجھے کیا؟ جبکہ میرا عقیدہ ہی

ان پر نہیں میرے لئے مندر اور مسجد برابر ہیں دونوں بیکار، میں تو تمام اصنام کو مٹی کے کھلونوں سے زیادہ مقام نہیں دیتا اور تمام مذہبی کتابوں کو دیو مالا خیال کرتا ہوں جن میں قیاسات کی تخلیقات کے علاوہ کچھ بھی نہیں!

میں: اچھا ایک آپ ہی ایسے ہو گئے اور یہ باقی مخلوق!

وہ: میاں مندر ہو یا مسجد، کلیسا ہو یا آتشکدہ موجودہ علوم یہ تمام ستون مسمار کر دیں گے ہندوستان میں خود خال خال ہی یہ مذہبی کافر بچیں گے اور ہندومت تو پہلے ہی سے شکتی پوجا کا قائل ہے یہ ہر معاشرے کو اپنی دیو مالا میں شامل کر لے گا جیسے اب تک کرتا چلا آیا ہے، یا پھر ان کے پنڈت اور مہنت دماغوں کی بلندی سے سینکڑوں چشموں کا اجراء کر کے اس میں لاڈالیں گے۔اب تک یہ دنیا عقائد کے دھاروں میں اسی طرح ڈوبتی تیرتی چلی آرہی ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان فلسفہ و نفسیات کا علم اور سائنس کے ایجادات سب کے پاؤں اکھاڑ دیں گے اور طاقت کا دیوتا بڑے بڑے مناروں کو زمین بوس کر دے گا۔

میں: دنیا تو جناب کی نظر کے احاطے سے باہر بھی آباد ہے۔ آپ کے آج کے نظریات ممکن ہے کل سرسام یا جنون کا لقب پائیں۔ باطل کے بعض بعض قلعے پچاس پچاس برس تک زمیں بوس نہیں ہوئے۔ بعض گناہوں کا انجام گناہگاروں کی اولاد دیکھتی ہے ذرا ٹھنڈے دل سے تاریخی حالات و واقعات پر نظر ڈالئے! پرشوتم کی نظر زمیں سے اٹھ کر افق کی طرف گئی اور وہ تیوری بدل کر بولا اچھا پھر کل گفتگو رہے گی۔

اسی طرح کا ضدی میرا ایک دوست جگدیش مجھے نہیں بھولتا اور سروپ کاش دامن کا خیال تو پہروں صورت گری کرتا رہتا ہے۔ یہ بڑے اچھے اور مخلص نوجوان تھے۔ کاش سیاسی مصلحتیں دونوں ملکوں کی سرحدوں میں نہیں دلوں میں تعصب اور منافرت کی خندقیں نہ کھودتیں اور انسان کا انسان درد بنا سکتا۔ بمبئی میں میرا جگری دوست راج بلدیو راج نہ جانے کن کن حادثوں سے دوچار ہے۔ راجندر کرشن اور دولت رام کو بلی اس طرح خط لکھتے ہیں کہ ڈار سے کٹی ہوئی کونجیں معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح کدارناتھ زلفی، روشن لال اور دیا شنکر کا تصور بندھتا ہے تو پہروں یہ حاضرات نگاہوں کے دروازے نہیں چھوڑتیں، دینی حکومت ہو یا لادینی جس میں انسان کو اپنی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی کی

فضا نظر آئے گی اور معاشی نظام میں شکم پری اور جسم پوشی کے علاوہ طبی تعاون نہیں ملے گا اس حکومت میں استحکام کا خواب بے تعبیر ہوتا ہے یہ نظام کی ناہمواری کا سبب ہے کہ آئے دن اسٹرائکوں کی ناگوار خبروں سے اخبار کے صفحے کے صفحے سیاہ رہتے ہیں کیونکہ اس ملک میں پسماندہ طبقے کو زندگی کی ضروریات بہم نہیں پہنچتیں۔ اشتراکیت میں اس قدر تعدی ہے کہ اسٹرائک کرنا خودکشی کی تجویز پر دستخط کرنے کے برابر ہے۔ لیکن یہ جبر دائمی عمر نہیں رکھتا اور بہت کم عرصہ زندہ رہتا ہے دودھ کے دانت نکلنے سے پہلے پہلے یہ نظام اچانک موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے جیسے ایک پرندہ آشیانہ مکمل کر کے پہلی بار آرام سے بیٹھنے کی غرض سے آئے اور بوڑھے شکاری کا دھماکا اسے زمین پر لے آئے۔

اس رفتنی و گذشتنی دور حکومت سے نہ عوام کو کوئی فائدہ ہے نہ خواص کو سکون میسر ہے، ہاں اجرتیں بڑھانے کا جنون اور آناً فاناً زیادہ سے زیادہ سرمائے کا حصول جنون کی صورت اختیار کر گیا اور روز بروز جان لیوا ہوتا جا رہا ہے۔

چونکہ ہمارا اسلامی فکر گوچنی ہو کر رہ گیا ہے یعنی کچھ لوگ اشتراکی نظام کے قائل ہیں اور کچھ سرمایہ دارانہ ذہنیتوں کے مداح! ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی ایک نظام کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اشتراکی جرگہ ملک کے دماغوں کو ختم کر رہا ہے تاکہ کوئی بلند فکر انسان کوئی مفید بات نہ سوچ سکے اور سرمایہ پرستی کے علوم سے انسان کے راستے مخدوش ہو رہے ہیں مشینوں سے جسموں کا رس نچوڑ کر اس بے رس کھوئی کو کسی صورت میں کوئی نیا نام دے دیا جاتا ہے اور لوگوں میں ایسی بے حسی پھیلا دی جاتی ہے کہ کسی کو کوئی احساس نہیں حالانکہ ان کے بیوی بچے بلبلاتے رہ جاتے ہیں، ان کے خون پسینے کی کمائی اور زندگی بھر کی کھولن ان کے بیوی بچوں کے کوئی کام نہیں آتی۔

اسلام سرمایہ داری کو منع نہیں کرتا کیونکہ وہ اس طرح کے قوانین کی پابندیاں بھی ضروری بتاتا ہے جو سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا نہیں ہونے دیتیں اور اپنے جواز میں اخلاقی بلندیاں اور روحانی شرف رکھتی ہیں۔ اقتصادیات اور معاشیات کے مسائل کو روحانی اور اخلاقی واسطے کے بغیر سمجھنا آسان بات نہیں ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ رزق کا انسانی معاملہ ربوبیت خداوندی اور اس کی حاکمیت کے سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

مگر اس مغرب پرستی اور خود پروری سے زمینداروں میں حکمرانی کی خو بو آ گئی اس لیے انہوں

نے پینترے بدل بدل کر اپنا ذاتی مفاد محفوظ کر لیا ہے' اور ان کی اس حکمت عملی کو ہنوز حکومت بھی سمجھ نہیں سکتی۔ کیونکہ زمیندار اور جاگیردار طبقہ سو سال تک انگریزوں کی غلامی میں حکمرانی کی تربیت لیتا رہا اور سربراہی آئے دن ادلتی بدلتی رہی ہے اور اب تک کوئی سربراہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ذہنی انصرام کو نہیں پہنچ سکا۔ جو حکمران آیا وہ اپنی ڈگڈگی بجا کر مجمع لگاتا اور برخاست کرتا چلا آ رہا ہے۔ زمینداروں کے دوش بدوش سرمایہ دارانہ نظام اور تاجرانہ سربراہی اپنی جگہ بدستور چلی آ رہی ہے اور پھر اب تو انہوں نے اپنی اولاد کو بھی علم و آگہی سے لیس کر کے حکمرانوں کے مقابلے پر اکھاڑے میں اتار دیا ہے۔ ہر چند کہ صاحب فراست افراد نے بلند دماغوں اور جاگتی ہوئی ذہنیتوں کو حکومت کے احاطوں سے خارج کر دیا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی وجہ سے عدل و انصاف کی بالادستی سچے خواب خوشگوار کی طرح قائم ہے۔

اس انقلابی جماعت کا حریفانہ توڑ اس وقت ہو سکتا ہے جب کسانوں اور مزدوروں کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے مسلح کر کے انہیں میدان دکھائیں ورنہ کیلنڈر کے ساتھ بدلنے والے منصبوں کے حکام تو قیامت تک اس معاشرے کی اصلاح سے معذور رہیں گے اور انقلاب یا رد و بدل کی اس چرخی کے رکنے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

میرے خیال سے اگر سرمایہ دار دولت کو امانت الٰہی اور خود کو اس کا محافظ خیال کر کے خدا کے احکام کے مطابق اسے صرف کریں تو ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے ورنہ دولت کو تجوریوں میں اسیر کرنا اور غلط راستوں پر صرف کرنا قیامت کے دن احتساب کو بھیانک بنا دینے کے علاوہ قبر کا آرام بھی چھین لیتا ہے۔ یہ زر اور زمین تو قدرت کی امانتیں ہیں ان کا ناروا استعمال فطرت کی بارگاہ میں گستاخی بھی ہے اور خیانت بھی۔

پاکستان میں مہاجرین

باہر سے آنے والے مہاجر مذہبی لگن میں تھے اور اپنے وطن میں آبائی مکانوں زمینوں اور جاگیروں کے علاوہ اپنے بزرگوں کی خانقاہیں اور مزارات چھوڑ کر آئے تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ زاد سفر میں ان کے پاس مذہب' ثقافت' تجربات' قابلیت اور تبلیغ دین کا جذبہ تھا اور بس۔
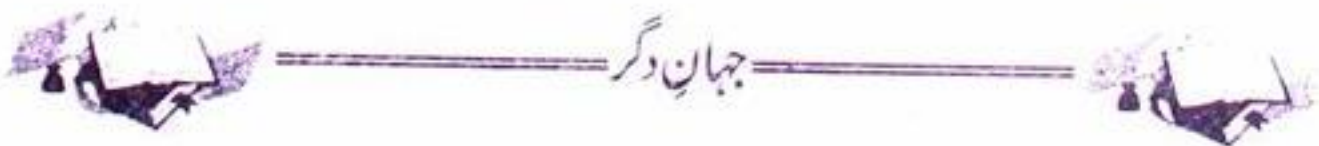
بمبئی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے لوگ دولت ہی نہیں کارخانوں اور فیکٹریوں کے تجربات کے ساتھ تجارتی مہارت اور انسانی بہبود کے جذبے سے سرشار تھے۔

دکن اور اس کے قرب و جوار کے مہاجر علمی صلاحیتوں کے علاوہ اردو زبان کا جنون اور تعمیر ملک کے منصوبے ساتھ لائے تھے۔

اسی طرح مشرقی پنجاب کے قافلوں میں کچھ ملازمت پیشہ تھے۔ کچھ صنعت اور حرفت کے دلدادہ کچھ مستری ڈرائیور، دکاندار اور ٹھیکے دار باقی کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کی صلاحیتوں کے مالک اور جنگ کے ریٹائرڈ سپاہیوں کے علاوہ تمام مزدور اور کسان۔

محکمہ آبادکاری کے سامنے ان کے ترک سکونت کا المیہ تھا اور وہ اپنے نقصانات کے گواہ ساتھ لائے تھے چنانچہ جس گواہ کو افسر نے معتبر جانا اس کے بیان پر اہلیت کی تمیز کے بغیر فیکٹریاں، کارخانے، پریس اور بڑے بڑے طرز الاٹ کرنے کے علاوہ انہیں معقول معقول کاروبار مہیا کردیئے مگر چونکہ ان چیزوں میں دماغ کی کم اور جسم کی زیادہ ضرورت تھی لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ جن نااہلوں کو ادارے سپرد ہوئے وہ انہیں فروخت کرکے دوسرے موقعوں کی فکر میں جوڑ توڑ کرتے پائے گئے ان میں بعض تو ناکام ہوئے اور بعض کامیاب جنہیں مشینری کی سوجھ بوجھ تھی انہوں نے خوب محنت سے کام کیا اور کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ ڈرائیور ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے مالک بن گئے اور چھابڑی والوں نے بڑی بڑی دکانوں پر قبضہ کرلیا۔ خوانچہ فروش بڑے بڑے ہوٹلوں کے کرتا دھرتا بن بیٹھے۔

لیکن کسی ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف اجسام ہی درکار نہیں ہوتے بلکہ اچھے اچھے زرخیز دماغوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے ایسے دماغوں کی جنہیں انصرام و انتظام میں درک ہو اور بصیرت کے ساتھ ہر کام کرسکیں مگر یہ صنف خال خال ہی نظر آتی تھی اور جو تھے وہ پریشان حال تھے افسروں کے دروازے کی ذلت اور بے توجہی برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی اگر اس موقع پر صداقت سے محکمہ آبادکاری کے کارناموں کو زبان قلم پر لاؤں تو کتاب کی ضخامت بڑھ جائے گی اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نکل جانے کے علاوہ بڑے بڑے طرہ باز خان خول سے باہر آکر اپنے مکروہ خدوخال میں نظر آنے لگیں گے۔ میری مراد یہاں کلرکوں کے طبقے سے نہیں میرا مقصد حکام سے ہے ہاں کم درجے کے لوگوں میں اگر پٹواریوں، قانون گوؤں اور تحصیلداروں تک کے دفاتر کا جائزہ لیا

جائے تو ایسے ایسے شاہکار ملیں گے کہ شیطان کے پاؤں اکھڑ جائیں ڈاکو انگشت بدنداں ہو جائیں اور بغلیں جھانکنے لگیں۔

یہ خود پروری اور اقربا نوازی کا ایسا بے ہنگم ہنگامہ تھا جس میں اہلکاروں کی نیتوں کے آئینے اور افسروں کے ضمیری شجروں نے ایسی شہادتیں مہیا کر دیں کہ بڑے بڑے مجرم معصوم نظر آنے لگے۔

طاقت وروں نے اپنے ہمسایوں تک کو پامال کرنے میں دریغ نہیں کیا اور جو ذرا چالاک واقع ہوئے تھے ان کے اعزاء اقربا اور یار وغمخوار بھی ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکے میں نے کئی سفید پوشوں کو یہ کہتے سنا کہ ہندوؤں کا جو کچھ بھی ہے وہ سب ہمارا حق ہے مہاجرین کا اس ورثے میں کیا کام؟ اور کیسا حق؟

میرے سامنے ایک نائب تحصیلدار نے ایک غریب اور مستحق آدمی کو ایک قطعہ زمین کی منظوری دلوائی تھی کیونکہ وہ اس کے ناگفتہ بہ حالات سے آگاہ تھا۔ اس نے پٹواری کو بلا کر کہا کہ جاؤ اس شخص کو پانچ ایکڑ زمین کا قبضہ دے دو اور چلتے ہوئے تاکید کی کہ دیکھو یہ غریب آدمی ہے اس سے کچھ طلب نہ کرنا اگر تمہیں مٹھائی کے پیسوں کی ضرورت لاحق ہو تو آکے مجھ سے لے لینا پٹواری نے پگڑی کا شملہ سنبھالتے ہوئے جواب دیا ''جناب میں آپ سے کیا لوں گا میں انہیں خوش کر کے انہیں سے لوں گا۔'' نائب تحصیلدار نے میری طرف دیکھ کر گردن جھکا لی اور کہا ''دیکھا جناب پٹواری مجھے کیا جواب دے کر گیا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ مجھ سے بڑا افسر اسے قریب رکھتا ہے۔''

القصہ اس دفتری لوٹ مار اور قانونی ڈکیتی کے باوجود باہر سے آنے والے ہجوم نے بانجھ زمینوں کو گل و گلزار کر دیا اور معمولی قسم کے مکان بلڈنگوں میں تبدیل ہو گئے کھڈیوں نے پاور لوموں کا چولا بدل لیا۔ تنور ہوٹلوں کے روپ میں آ گئے اور چٹیل میدانوں کی کوکھ سے باغات نکل پڑے جہاں بنجر زمینیں مالکوں کو کوس رہی تھیں۔۔ وہاں حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ ابل پڑا اور شہر کے قرب و جوار میں جو ناکارہ دھرتی پڑی تھی اس پر کوٹھیاں اور بنگلے جھونپڑوں کا مذاق اڑانے لگے جن میں رات بھر بجلی کے قمقمے ستاروں کو حقارت کی نظر سے تکتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ ہو رہا تھا بے سوچے سمجھے ہو رہا تھا جو اچھی سوجھ بوجھ کے لوگ تھے وہ اب بھی پاکستان کی حفاظت، سالمیت اور استحکام کو اپنا فرض اولین گردانتے تھے۔
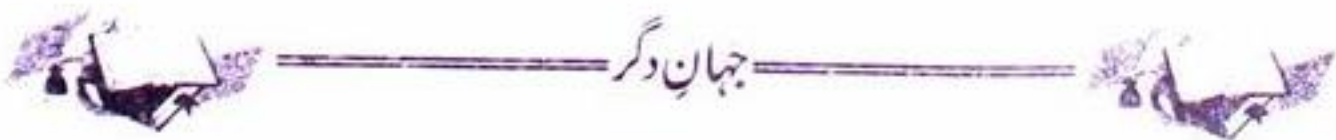
قرآن کا فیصلہ ہے کہ جس نے دین کا دامن چھوڑ دیا اس کے لیے ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں یہ آئے دن مادیت کے متغیر ہونے والے انداز انسان کے سکون و اطمینان کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ یہ تو اپنی ہوس ناک اور طمع داریوں میں خود بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور فکر و احساس کی خشکی انہیں پلک جھپکنے نہیں دیتی یہ رات کو شبینہ مطب جستجو میں موٹریں دوڑاتے پھرتے ہیں اور کسی شبینہ دار العلاج کی پونجی میں وہ دارو دستیاب نہیں ہوتی جو ان کی اس آگ کو ٹھنڈا کر دے، تا کہ آنکھوں میں نیند اترے، اور راتوں کے ڈھلوان پر ہی سہی سکون کی کاشت کے لیے زمین بن جائے۔

جب باہر کی طاقتوں کے ایماء پر انسانیت کے دشمنوں کا منصوبہ کچھ کامیابی کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو مشاہدہ ہے اور تاریخی شواہد ہیں کہ یہ شیشوں کی بنی ہوئی عمارات زمین چاٹنے لگتی ہیں کیونکہ ان کے مسمار کرنے میں باقاعدگی نہیں برتی جاتی بہت کم وقت میں نقشہ درہم برہم ہو جاتا ہے اور ملک کی حدیں بدل جاتی ہیں مگر اس ہڑبونگ میں بلند مرتبت لوگ ہی زیادہ کام آتے ہیں کیونکہ جو کوئی عمارت گرائی جاتی ہے تو پہلے چھتیں اتاری جاتی ہیں۔

صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس سے ہر انسان کو اپنے آئینے میں اپنے خدوخال نظر آنے لگتے ہیں اور ہر غم زدہ کا دکھ اپنا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن یہ مقام ان لوگوں کا ہے جن کے دل و دماغ بالغ ہو گئے ہوں اور نگاہیں شعاع سرمدی کے تھنوں سے دھاریں لے رہی ہوں۔

دو کچوکے

ابھی ریلوے اسٹیشن پر تیسرے درجے کے مسافر خانے کی بنچوں سے خون کے سیاہ دھبے مٹے نہیں تھے راستوں کے حاشیوں پر خون اور پیپ سے بنی ہوئی نیلی پٹیاں پائی جاتی تھیں۔ کونے کھدروں سے گلی سڑی لاشیں اپنی بو سے زندہ لوگوں کو آوازیں دے رہی تھیں۔ گلی کوچوں میں خالی اور ویران جگہوں پر بے یار و مددگار مہاجر اپنی خستہ حالیوں کے مرقعے ساتھ لیے حیران و پریشان نظر آتے تھے اور بعض بعض کو تو سونے جاگنے کا کوئی ٹھکانا ہی میسر نہ تھا۔ رام گلی ریلوے روڈ پر ایک لاغر اندام عورت ایک پانچ چھ سال کے بچے کی انگلی پکڑے پھرتی تھی اس کا شوہر اور دو جوان بھائی امرتسر اور لاہور کے درمیان قتل کر دیئے گئے تھے۔ مگر نہ معلوم یہ کس طرح اس بچے کو لے کر لاہور پہنچ گئی

تھی۔ اور سارے دن گلی محلے میں پھر کے ادھر ادھر تنوروں اور بھٹیاروں کی دکانوں سے گرے پڑے روٹی کے ٹکڑے لے کر بچے کو پال رہی تھی۔ رات کو گلیوں میں پھرتے پھرتے جب تھک جاتی تو کسی خالی تھڑے پر بیٹھ کر بچے کو سینے سے لپٹا لیتی اور زور سے چیختی "بھائی مجھے ڈر لگ رہا ہے" کبھی کہتی "بھائی مجھے سردی لگ رہی ہے" اس درد بھری آواز پر صاحب احساس لوگ اپنی کھڑکیوں اور منڈیروں سے جھانکنے لگتے اور بعض صاحب دل اس کی مدد بھی کرتے۔

اس کی تنہائی اور بے بسی کے اس شباب میں کوئی ظالم رات کو اس کا بچہ اٹھا کرلے گیا آنکھ کھلی تو اس کے مستقبل کی امید کا سہارا بھی چھن گیا تھا اسے اپنا اور اپنے سراپا کا بھی ہوش نہ رہا اس کے کپڑوں کی جھریوں سے اس کا بدن نظر آنے لگا تھا لیکن وہ تھی کہ ہر دروازے پر "گلوگلو"، "گلو بیٹا" کرکے آواز دیتی پھرتی تھی دو چار روز تو اس کا یہ عالم رہا پھر اندوہ کے اس مقام پر آگئی کہ تانگے کے گھوڑوں اور چھکڑے کے بیلوں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتی اور پوچھتی "میرا گلو دیکھا گلو" اس کا کالا کرتا ہے اور گلے میں تعویذ ہے۔" ایک دن اسی طرح برانڈرتھ روڈ پر اس نے ایک گھوڑے سے اپنے گم شدہ لعل کا پتہ پوچھا اور گھوڑے نے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیا اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔ "اچھا مجھے معاف کردے" اور پھر وہی رٹ "ارے گلو آ بھی جا جاڑہ ہو رہا ہے تجھے بھوک لگ رہی ہوگی" دنیا میں اگر کسی جذبے کو مقدس محبت کا نام دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ماں کی مامتا ہے باقی تمام رشتے خوف و مفاد کی آبیاری پر قائم ہیں۔

طاہر سرودھنوی مرحوم نہایت نغز گو اور بلند معیار شعر کہنے والے شاعر تھے اور شاعر سے زیادہ اچھے انسان ان میں تحصیل علم کا جذبہ بھی بے تاب تھا اور مجھ سے دوری کا شدید احساس بھی لیکن اپنے حالات کی گرفت سے نہ نکل سکے اور جھنگ میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ افلاس کے میلے اندھیرے میں گھٹ گھٹ کر دم دے دیا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی صرف ایک بچہ ہوا تھا اور وہ بھی کمسنی ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی رات کو ایک تکیہ پہلو میں رکھ کر سوتی تھی اور اکثر نیند میں تکیے پر ہاتھ رکھ کر اللہ اللہ کرنے لگتی تھی۔ کبھی طاہر صاحب کو آواز دے لیتی "اس کے لیے دودھ لا کر سونا" طاہر بے چارہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ بچے کی موت سے زیادہ بیوی کی حیات کا غم اسے کھائے جا رہا تھا آخر سکوت قلب سے راہی عدم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ان کا کلام ان کے عزیز شاگرد اور مشہور صحافی محمود شام کے پاس ہے شام نئی نسل کے کھیت سے ابھرتے ہوئے پودوں کی دیکھ بھال میں رہتے ہیں اور غالباً اسی روداد کا حسن بیان ان کی صحافت کا جاندار حصہ ہے وہ کئی بار مجھ سے ملے ہیں اور میں نے انہیں طاہر سردھنوی کے مجموعہ کلام کے متعلق کہا اور انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے مجھے پر امید جواب دیا اگر ان کے ہاتھ سے جناب طاہر مرحوم کا کلام چھپ گیا تو جہاں وہ ادب میں ایک اضافہ ہوگا محمود شام بھی اسی کار خیر سے ناقابل فراموش انسان قرار پائیں گے۔

بیداری احساس

میں جب بھی ادیبوں اور شاعروں کی سوسائٹی میں جاتا تو بڑی حیرت میں ڈوبا ہوا واپس آتا اور یہ سوچتا کہ یہ حساس اور اسرار تاریخ سے واقف مخلوق صرف خدو خال اور حسن وعشق کے دائرے سے باہر کیوں نہیں نکلتی اگر ادب' معاشرت' اجتماعیت اور ماحول کا ترجمان ہے تو یہ ادیب اور شاعر کس معاشرے کے انسان ہیں کہ ان کی تحریروں میں جنسیات کے علاوہ کوئی جذبہ زندہ نظر نہیں آتا ان کے ادب میں قوم' ملک' مذہب اور اخلاق کے لیے جگہ نہیں نکلتی' انہیں تو معاشرے اور گردوپیش کا سچا آزاد' اور روقع ترجمان ہونا چاہیے ان کے سینوں میں تو نازک ترین جذبات کی لہریں اور پاکیزہ ترین خیالات کا جوار بھاٹا ہونا چاہیے۔مگر یہ تو عموماً جنس کے رسیانشوں کے عادی اور دروغ بانی کے دلدادہ ہیں۔ان میں تو کوئی بین الاقوامی اقدار سے آگاہ اور بین الانسانی اخلاق کا حامل نہیں ہے۔

اگر شاعر اور ادیب کی تحریروں میں اس کی قوم' اس کے ملک' اس کے مسلک' اس کے دین اور اس کی اخلاقیات کی جھلکیاں نہ ہوں اس کی پہچان اور اس کے وجدان کی جانچ پرکھ کیسے ہوگی اور اس کی کون سی خصوصیت اس کا طرہ امتیاز ہوگا۔

یہاں جو شاعر اور ادیب تھوڑی بہت معاشرے کی ترجمانی کرتے تھے انہیں یہ خدو خال کے پجاری اور رقص وسرور کے شیدائی کوئی مقام نہیں دیتے تھے حالانکہ وہی لوگ صحیح شعراء وادباء کے فرائض ادا کر رہے تھے مگر چونکہ ان کی ٹولیوں' ان کے جرگوں اور ان کے حلقوں سے کٹے ہوئے تھے' اس لیے یہ بھیڑیوں کا گروہ ہرنوٹوں کو آزادی سے کلیل کرنے اور زقند بھرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

اور پارٹی بندی کے بل پر ہمچو ما دیگرے نیست کا نعرہ بلند کرتے پھرتے تھے- انہیں نہ قوم کے غم میں رونے والی آنکھیں میسر تھیں اور نہ معاشرے کے نشیبوں پر کڑھنے والے دل ان کے ضمیر سوئے ہوئے تھے اور اس فنی خسارے کا احساس انہیں نصیب نہیں تھا-

صحیح شاعر ہو یا ادیب، مصور ہو یا خطاط اپنی بیداری احساس کی بنا پر معاشرے کا سچا ہمدرد اور جز رس غم گسار ہوتا ہے، جب ہم اسے جذباتی عمرانیات کی میزان پر لاتے ہیں تو اس کا بخشا ہوا شعور فہم و ادراک کی جادہ گری سے نہیں ہٹتا اور تیز رفتار وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنا دشوار دکھائی پڑتا ہے وہ غلط قسم کے معاشرے سے بغاوت کر کے اپنی تخریب کا سلسلہ تعمیر کی تکمیل تک پہنچا کے چھوڑتا ہے-

مگر بے بصیرت بغاوت آکلہ یا سرطان کی حیثیت سے کم نہیں ہوتی، جو غلط بنی اور معاشرے کے خارجی مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے، اس میں حقائق کا اظہار نہیں ہوتا مگر انداز بیان کا کرشمہ عوام کے قلب و نظر کو کچھ کا کچھ دکھا دیتا ہے۔ جس سے گلی کوچوں، دکانوں کے تھڑوں پنواڑیوں کی دکانوں اور چھوٹے بازاروں کے سیلونوں سے غلط بغاوت کے دھوئیں نکلنے لگتے ہیں اور پست بیں لوگ اسے جدت اور فکر تازہ بتاتے ہیں، یہ خسارہ طلبی خام تعلیم، نا پختہ فکر، نارس ذہن اور کجروی کی صنعت میں داخل ہے، اس میں شک نہیں کہ جذبہ اعصاب کی منہ زور مخلوق ہے لیکن جب یہ دین و مذہب کی چھتری لگا کر چلنے لگتی ہے تو اس سے ایسے پیغام صادر ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیے آرائش اور استحکام ہوتے ہیں-

لیکن بہت کم ادیب و شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کے جذبہ شباب پر معاشرے کا خسارہ، دین کا نقصان اور اخلاق کی شکست و ریخت غالب آتی ہے ورنہ جذبات کے سامنے یہ پہلو نہیں آتا-

بلندیوں کے راہی

جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ قدرت جس شخص سے جس قسم کا کام لینا چاہتی ہے اسے اسی شعبہ حیات کے معاون بھی عطا کرتی ہے جو اس کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ سفر حیات کا رخ متعین کرنے میں معاونت کرتے اور جادہ گری کے اسلوب سکھاتے ہیں، اس پر اسی قسم کے شعور کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں جسے شاعر ادیب یا فنکار مدتوں نہیں سمجھ سکتا، اسی

ناسمجھی میں بعض تو شکوہ شکایات تک ہی رہ جاتے ہیں اور بعض فطرت سے بغاوت کر بیٹھتے ہیں انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ جس قدرت سے وہ بغاوت کر رہے ہیں وہ تو انہیں چاروں طرف سے ہر وقت سنبھالے ہوئے ہے اس کی عالی ظرفی کا کیا ٹھکانا ہے کہ وہ شرابی اور زانی سے بھی ربوبیت کا رشتہ نہیں توڑتی اور پہلے پہل تو ڈاکو کا ضمیر بھی صحیح آواز دیتا ہے مگر اس وقت سماعت کے راستوں میں کھڑنج لگ جاتے ہیں۔

جب میری ملاقات کسی اچھے اور معیاری آدمی سے ہوتی تو میں اس دن کو اپنی خوش بختی کا دن خیال کرتا چنانچہ جب میں اپنے استاد قاضی محمد زکی کاندھلوی مرحوم سے ملا تو میرے لڑکپن نے بیداری کی جماہی لی اور ذہن میں شاعری کے اکھوے سبز ہونے لگے مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم سے ملا تو معلوم ہوا کہ جذبہ تہذیب اور شعور علم بیدار ہو رہا ہے۔ امیر الدین قدوائی مرحوم سے ملاقات ہوئی تو محسوس کیا کہ کوئی غیر مرئی قوت مجھے قربت کی دعوت دے رہی ہے اور کچھ تفویض کرنا چاہتی ہے' ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے نزدیکی میسر آئی تو معلوم ہوا کہ نظریات وفکریات کا دریا جوار بھاٹا میں مصروف ہے' ڈاکٹر بشارت علی سے ملاقی ہوا تو دل میں انسانی عظمت کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ موجیں مارنے لگا اور انسانیت کے قوام کی خوشبو نے روح کا احاطہ کر لیا' مجنوں گورکھپوری کی مختصر ملاقات نے میرے شعور میں تازہ ہوا کے دریچے کھول دیئے حکیم نصیر احمد مرحوم ملے تو پہلے دن سے ہی میری تشنہ خیالات اور تہذیب نظریات شروع ہوگئی اللہ انہیں اس کی جزا دے کس خلوص اور محبت کے انسان تھے آخری وقت میں انہوں نے دوا پینا چھوڑ دی تھی مگر جب ان سے کہا گیا کہ احسان دانش نے یہ دوا بھیجی ہے یہ تو پی لیں تو انہوں نے فوراً پی لی اور کہا ان سے کہہ دیں کہ تعمیل کر دی گئی وہ شخص اپنے خلوص اور محبت کی بنا پر آج تک میرے روزمرہ کے فاتحہ میں شریک ہے۔

حکیم نصیر احمد صاحب یوں تو سرکاری ملازم تھے لیکن نہایت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے دفتر سے آکر وہ غریب خانے پر آجاتے اور مختلف مسائل پہ گفتگو ہوتی' انہوں نے جدید تعلیم کے کئی گمراہوں کو رستے پر لگا دیا وہ کہا کرتے تھے کہ نیکی بدی اور خیر و شر کا نہ کوئی موسم ہوتا ہے نہ کوئی وقت یہ دونوں جذبات علاقائی پابندیوں اور جغرافیائی حدود میں پھلنے پھولنے کے باوجود آزاد ہوتے ہیں ہر آدمی اپنی طبیعت بدلنے میں مختار ہے اور ماحول جبلت کے مطابق خیر و شر اختیار کرتا رہتا اور تنہائیوں میں

مسترد خیالات و معتقدات میں چھان پھوڑ کا عمل جاری رکھتا ہے بعض لوگ تقلیدی طور پر دوسروں کے نظریات اپنا لیتے ہیں اور بعض انہی پرانے خیالات کی تنقیح و تحلیل کرتے اور نتیجے کے طور پر مکافاتِ عمل کا جبر برداشت کرتے رہتے ہیں۔

حقیقت پرست بلندیوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور باطل پسند مادی دلدل میں پھنس کر نہیں نکلتے، بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کے پاکیزہ خیالات جنہیں وہ مسترد کر دیتے ہیں اعلیٰ اقدار اور سود مند صورت میں سامنے آتے جاتے رہتے ہیں اور موت کے وقت تک یہ خیر و شر کا امتیاز اور بہتر سے بہتر کی تلاش جاری رہتی ہے آخر میں عموماً باطل کا جادہ پہلے شکست ہو جاتا ہے مگر جب یہ جادو ٹوٹتا ہے تو حق و صداقت کے عمل کا وقت نہیں رہتا اور یہ خسارہ بڑا دکھ دیتا ہے اتنا ضرور ہے کہ اعتراف حق کے ساتھ تاسف منسلک ہو جاتا ہے اگر نیت بخیر ہے اور زندگی پر کالک کے لیپ زیادہ نہیں تھپے تو حق کی پائداری اور وسعت اسے اپنے سائے میں لے لیتی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حیات بعد الموت میں تکمیل خیر کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں لیکن کیا ان کی رفتار دنیا کے سفر سے زیادہ وقیع اور زود رس ہوتی ہے؟

صبحِ ادب

میری عمر شب و روز کی رفتار سے قدم ملائے چل رہی تھی مگر عزائم میں دھیما پن نام کو نہیں تھا ہر قدم پر ایک نئی حدت اور جذبہ محسوس کرتا تھا ہر چند کہ دن بھر کی مشقت سے جسم ٹوٹ جاتا تھا مگر وقت سے پہلے میری بیداری کو کبھی غنودگی نے مس نہیں کیا کبھی کبھی جب کوئی لایعنی گفتگو کرتا یا جھوٹے سچے قصے بیان کرنے لگتا تو طبیعت اکتا جاتی اور اپنے ذہن و خیال کے سامنے ایسا محسوس کرتا جیسے پہاڑوں کے نشیبوں میں بادل کلبلا رہے ہیں اس وقت میری پلکیں ٹھنڈک سے بوجھل ہو جاتیں اور بس آنکھیں بند کر لیتا مگر سماعت برقرار رہتی اور خواب کے دائرے وسیع نہ ہوتے۔

بعض اوقات زمانے کے عوامی قافلے سے نکل کر میری روح اکیلی ہو گئی اور مجھے اپنی منزل کے نقش و نگار بھی نظر نہ آئے مگر بالکل اس طرح جیسے کہرے میں ٹیلے کا درخت مگر میں سوچ سوچ کے رہ جاتا تھا جیسے ایک قیدی رہائی کے دن گنتا ہو جب میں مسجدوں کو ویران، ناداروں کو پریشان اور

پسماندہ طبقے کے نوجوانوں کو علم سے کورا دیکھتا تو معاشرے پر تشدد کا ارادہ جاگ اٹھتا جس کو سوچنا تو شاید قابل معافی ہو لیکن تبلیغ و اصلاح کرنا موت کو للکارنا تھا۔

ہر چند کہ مجھ پر میرے معاشی حالات کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ رہی تھی لیکن میں غریبوں اور ناداروں پر تشدد نہیں دیکھ سکتا تھا جب کوئی نوجوان مجھ سے سوالی ہوتا تو میں زمین میں گڑ جاتا، میں نے اپنے حالات کو دیکھ کر جسمانی گرسنگی اور جنسی وحشت کے نکیل ڈال رکھی تھی جو آزاد ہوتی ہے تو روحوں کو بھی بدراہ کر دیتی ہے غالباً اسی کا اثر تھا کہ بعض وقت مجھے اسرار حیات کی گتھیاں سلجھتی نظر آتی تھیں اور تقدیر کے عقدے نرم پڑتے دکھائی دیتے تھے کبھی کبھی تو میں راتوں کو اپنے مصنوعی وجود میں بھی گم ہو جاتا جو میرے برتر خیالات و تصورات کا مرکز تھا مگر ابھی میری غم سے دبی ہوئی آواز اور کانپتے قلم میں شاید علم آشنائی نے جنم نہیں لیا تھا مگر عمل کی اٹھان میں صبح ادب کے رنگ و روغن مکمل ہو رہے تھے۔

کبھی تو چلتے چلتے مجھے ایک اجنبی خوشبو مس کر جاتی کہ میرا رواں رواں معطر ہو جاتا جیسے میری روح پر عطر کھنڈ گیا ہو۔ یہ سانحہ کبھی کبھی اب تک روحانی مسرت سے سرشار کر جاتا ہے اور وہ لمحہ میرے لیے دنیا کی ہر دولت سے قیمتی ہوتا ہے۔

مردہ غائب

میرٹھ شہر سے باہر کی طرف ایک محلہ ''ابو کا مقبرہ'' ہے۔ یہ مقبرہ کبھی تو جنگل کے پہلو میں قبرستان کا جزو ہوگا لیکن اب آبادی نے بڑھ کے اسے ساتھ لگا لیا ہے اور وہ میرٹھ کا اچھا گنجان حصہ ہے جیسے عموماً آبادیاں قبرستان کی طرف بڑھ جاتی ہیں۔

اسی محلے میں ایک بڑا ہی نیک سیرت درزی رہتا تھا اگرچہ درزی کے ساتھ نیک سیرت کا لفظ بڑا ہی انمل، بے جوڑ قسم کا پیوند ہے، لیکن میں نے اپنی عمر میں بعض بعض درزیوں کو بڑا ہی متقی و پرہیز گار اور سربسر اخلاق پایا ہے۔ جن میں ماسٹر عبدالغفور جس کا ذکر میں اپنی اسی کتاب کی پہلی جلد میں کر چکا ہوں اس کے علاوہ ماسٹر محمد ظفر جو آج کل راولپنڈی میں ہیں اور آزادی ملک سے پہلے گورداسپور میں تھے اور ان کے پاس امرتسر تک کے گاہک جاتے تھے راولپنڈی ہی میں ایک

صاحب آغا نور الدین درانی ہیں ان کی تعریف بھی میں نے اکثر لوگوں سے سنی ہے اور دیکھنے کے لیے ان کے ایک دوست سید ہمایوں شفیق کے ساتھ راولپنڈی بھی گیا ہوں اور مجھے لوگوں کی بات سچ سی معلوم ہوئی۔

اسی طرح میرٹھ والا درزی بھی بھلا آدمی تھا' روزہ و نماز کے علاوہ اس کے دن مزدوری اور راتیں عبادت میں گزرتی تھیں' شہر میں جہاں قوالی یا میلاد شریف ہوتا اس میں یہ ضرور شریک ہوتا اور ساری ساری رات حق' ہو کے ہنگامے میں گزار دیتا آخر آخر میں تو وہ باقاعدہ صوفی ہو گیا تھا اور محفل سماع میں اس پر صوفیاء جیسی کیفیت بھی طاری ہو جاتی تھی' وہ گھنٹوں حال کی کیفیت میں رہتا اور اس کے حال کے لیے عام صوفیوں کی طرح ہارمونیم اور ڈھولک ضروری نہیں تھی' مزے کی بات یہ ہے کہ اسے میلاد کی محفل میں نعت خوانی سے بھی یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی' وہ پہروں روتا رہتا اور پھر بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اسی بات پر اس کے جاننے والے سب لوگ اس کا احترام کرتے تھے' ایک دفعہ رات کے دو بجے محفل میلاد ختم ہوئی اور وہ وہاں سے ایک عجیب و غریب کیفیت میں سرشار گھر کی طرف آ رہا تھا' جب وہ کمبوہ دروازے آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک جنازہ آ رہا ہے مگر اسے تین آدمی اٹھائے ہوئے ہیں' دو آگے کے دو پایوں پر اور ایک پیچھے! یہ دیکھ کر اس پر تو ایک دوسرا ہی عالم طاری ہو گیا' اس نے از راہ ہمدردی لپک کر پچھلے ایک پائے کو کندھے پر لے لیا اور چلنے لگا' قبرستان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا چنانچہ دس پندرہ منٹ میں قبرستان پہنچ گئے' ساری رات کی چاندنی تھی اور اتنی رات کا سناٹا جہاں اتقا کے جذبے کو تسکین دے رہا تھا وہیں جنگل کی سفید خاموشی ایک خوف سا بھی پیدا کر رہی تھی۔

انہوں نے جنازہ ایک نئی کھدی ہوئی قبر پر جا کے رکھ دیا اور درزی سے بصد منت کہا کہ براہ کرم اسے قبر میں بھی آپ ہی اتار دیں' یہ فرط خلوص میں قبر میں اتر گیا اور ان تینوں نے مردے کو اس کے ہاتھوں قبر کی تہ تک پہنچا دیا' وہ مردے کو قبر کے سپرد کر کے باہر آنے لگا تو انہوں نے کہا بھائی میت کے بند بھی تو کھول دو' وہ بند کھولنے کے لیے جھکا تو اس نے دیکھا کہ مردہ غائب اور قبر خالی! یہ گھبرا کے باہر آیا تو وہ تینوں بھی غائب تھے' اس نے چاندنی میں بڑی دور تک نظر دوڑائی' کہیں کسی کا دور دور تک پتہ نہ لگا' اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا اور پھر صبح تک وہیں سر راہ پڑا رہا۔

جب دن چڑھا اور راستے چلنے لگے تو لوگوں نے اسے بے ہوش دیکھ کر ہسپتال پہنچا دیا وہ ایک ماہ اسی طرح بے ہوش رہا' ایک ماہ کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے واقعہ بیان کیا! سننے والے حیران رہ گئے۔

فیض الحسن اسی طرح کام پر جانے لگا اور اس کا قوالی و میلاد کا شوق پھر ہرا ہو گیا لیکن اب یہ عشاء کی نماز کے بعد فوراً گھر آ جایا کرتا تھا' دن گزرتے گئے' تین چار ماہ کے بعد محلے میں ایک میت ہو گئی اور ہمسائیگی کے خیال سے اسے بھی ہمراہ قبرستان جانا پڑا لوگوں نے میت کھدی ہوئی قبر کی مٹی پر رکھدی اور یہ وہیں قبر کے پاس کچھ پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا' اسے پڑھتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور میت کی چادر اڑ کر اس کے سر پر آ پڑی' چادر کا اوپر آنا تھا کہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر بے ہوش ہو گیا حاضرین میں سے کسی نے کسی مرض کا دورہ سمجھا کسی نے اتفاق بتایا غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں سب نے مل جل کر اسے ہسپتال میں داخل کر دیا' پندرہ دن میں اسے ہوش آیا اور آنکھ کھولتے ہی اس نے پانی مانگا' پانی کا حلق میں اترنا تھا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دم دے دیا۔ میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کوئی مرض تھا یا انہیں تینوں کا کام تھا جو میت اٹھائے لا رہے تھے یا خوف تھا جو برداشت نہ ہو سکا۔

نابینا معاشرہ

میرے ایک کرم فرما کا کہنا ہے کہ انسان برابر ترقی کر رہا ہے اور ہر سانس اسے بہتری کی طرف لے جا رہی ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے آنے والا وقت گزرے ہوئے وقت سے بہتر ہے اس کی روشنی میں ہم دنیا کو دوزخ اور عقبیٰ کو جنت تصور کر لیں کیا ہم حق بجانب نہیں؟ کیا احسن الخالقین کی رو سے ہم سب احسن کی طرف رواں دواں نہیں ہیں؟ اس صورت میں دوزخ کا تصور مستقبل کے حصے میں کیسے آتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کیا کوئی انسان ایسا ہے جو ارتقائی طور پر اپنے اندر کوئی ترقی یا بلندی پا رہا ہو؟ ہر انسان ضعیف الایمان ہیں خود کو محتاجی اور زبوں کن حالات میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

جو لوگ آخرت کو تسلیم نہیں کرتے ان کے لیے اس الجھن کا کیا حل ہے؟ وہ ارتقاء کو کیسے ثابت

کریں گے؟

یہ بات بھی غلط نہیں کہ کائنات اپنے ارتقاء کی رو سے بہتر کی طرف جا رہی ہے لیکن یہ ارتقاء تو کائنات کے ادراک و تفہیم کا ہے یعنی انسان اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کو تقلیل و تحلیل کے عمل سے سمجھنے میں مصروف ہے قرآن اسی عمل کو تسخیر کہتا ہے' سائنسی دنیا میں جو آئے دن ایجادات واختراعات ہو رہے ہیں اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان جزئیات فہمی اور تحقیق و تفتیش سے زیادہ سے زیادہ متمتع اور مستفید ہو۔

میں تو کہتا ہوں کہ انسانی خوش بختی اسی سعی بلیغ سے طلوع ہوتی ہے' بعض مذہبی ذہن والے دنیا کے بعد جہنم کو ایک تربیت گاہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کیونکہ قرآن نے ''جہنم'' کو ''رم'' کہا ہے اور اسی کو علماء و فقہا نے سزا سے تعبیر کر لیا' تاکہ انسان جرم و گناہ میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ راستہ بدل کر نکوکاری کی طرف آ جائے' دوسری دنیا کی شرمندگی اور محنت و مشقت نصیب نہ ہو جس سے نمٹنا آسان کام نہیں۔

مگر ہمارا ملک ابھی ابھی اس راہ پر گامزن ہوا ہے' یہاں دماغوں کی کمی تو نہیں بات تربیت اور محنت کی ہے اس ارتقاء کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انسانی اعمال اور کردار مواخذہ سے بری الذمہ ہیں ہرگز نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی بہبود کے لیے ایک وقت اور موقع دے رکھا ہے کہ اختراعات وایجادات سے مخلوق کی خدمت کریں جو عبادت میں بلند مقام ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس ملک میں دماغوں کی کمی نہیں اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کئی سال کا عرصہ ہو گیا میں اپنے مکان دانش آباد میں بیٹھا کچھ احباب سے گفتگو کر رہا تھا ایک لڑکا آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا' جب میں سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے بات چیت کر چکا تو اس نے کہا ''میں راولپنڈی سے آیا ہوں میرا نام قمر الحسن ہے' میں یتیم ہوں میرے ماموں نے میری پرورش کی اور میری تعلیم وغیرہ کے تمام مصارف وہی اٹھاتے رہے اب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور خیال تھا کہ میٹرک کے بعد کہیں نوکر ہو کر ماموں صاحب کے سر سے اپنا بار کم کر دوں گا لیکن میرا نتیجہ روک لیا گیا ہے۔ مجھے آپ کے ایک جاننے والے نے آپ کے پاس بھیجا ہے آپ میری اس معاملے میں مدد فرمائیں۔ میں تو کسی قابل نہیں اللہ آپ کو اجر دے گا۔

میں نے پوچھا نتیجہ روک لینے کا سبب کیا ہے؟

قمر: میری کاپی کورس کی کتاب سے لفظ بہ لفظ مل گئی ہے!

میں: کیوں مل گئی ہے تم نے نقل کی ہوگی؟ قمر الحسن نے بصد عجز جواب دیا ''میں حلفاً عرض کرتا ہوں کہ میں نے نقل نہیں کی' البتہ میں جس عبارت کو ایک بار پڑھ لوں مجھے یاد ہو جاتی ہے اسے ویسی کی ویسی لکھ سکتا ہوں۔

میں: اگر تمہیں کوئی کتاب دی جائے تو اسے ایک بار پڑھ کر لکھ دو گے؟

قمر: انشاء اللہ! ممکن ہے ایک دو صفحات میں کہیں ایک آدھ غلطی ہو جائے ورنہ وہی کی وہی لکھ دوں گا۔

میرے پاس ایک رسالہ ''ریاض'' رکھا تھا جو رئیس احمد جعفری مرحوم نکالتے تھے' قمر الحسن کی طرف سرکا دیا اور کہا

''اس کے دو یا تین صفے پڑھ لو!

اس نے رسالہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں نظر اٹھا کر بولا

''کیا یہ لکھ دوں؟

میں نے کاغذ اور پنسل اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''اندر بیٹھ کر لکھ لاؤ اور رسالہ لے کر اپنی میز کے دراز میں رکھ لیا اور قمر الحسن کاغذ پنسل لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ابھی تین چار خطوں کے جواب لکھے تھے کہ قمر الحسن آ گیا اس نے لفظ بہ لفظ پورا اڈیٹوریل لکھ دیا' میں نے ملا کر دیکھا تو ایک لفظ بھی کم و بیش نہ تھا۔

میں نے قمر الحسن کو کہا

بیٹا اب تم گھر جاؤ' میں دیکھ بھال کرلوں گا اور تمہارے پاس نتیجہ آ جائے گا۔ جس شخص کے پاس اس کے کاغذات تھے۔ وہ شام کو ایک ہوٹل میں مستقل بیٹھتا تھا' میں شام ہی سے ایک شخص کو ساتھ لے کر اس ہوٹل میں جا بیٹھا تقریباً آٹھ بجے دو شخص آئے ان میں ایک شخص مجھے بھی جانتا تھا' وہ میری وجہ سے اسی میز پر آ بیٹھے اور میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے ایک ہندو لڑکے کا ذکر کیا جو پہلے جنم کی باتیں بتاتا تھا اور اس حافظے کے کرشمے کو

برہمی بوٹی کا اثر بتاتا - میں نے عرض کیا کہ ویدک میں برہمی بوٹی کی تعریف تو بہت آتی ہے اور کسی حد تک درست بھی ہے لیکن جو لوگ آواگون کو تسلیم نہیں کرتے ان کو کیسے یقین دلایا جائے گفتگو کے اسی موڑ پر میں نے قمرالحسن کا ذکر کر دیا اور وہ واقعہ بھی بیان کر دیا وہ شخص سن کر حیران رہ گیا۔

اس نے کہا۔

''ایک قضیہ میرے پاس بھی اسی قسم کا ہے لیکن حقیقت کھلنے پر نتیجہ مناسب دے دیا' پھر قمرالحسن کا خط بھی آ گیا اور اس نے شکریہ ادا کیا۔ غالباً دو سال کے بعد ایک شام کو میں انارکلی سے گزر رہا تھا کہ قمرالحسن نے لپک کر مجھ سے یہ کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

میں قمرالحسن! میں فوج کے ایک دفتر میں جونیئر کلرک ہوں۔ آپ کو دعائیں دیتا ہوں میں نے سنا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کلیجے میں گھونسا مار دیا ہو اور میری سانس رک گئی مجھے رہ رہ کے خیال آ رہا تھا کہ افلاس کا عفریت کیسے کیسے جوہر قابل نگل جاتا ہے' مگر کیا کرتا میں خود بھی اس کی مدد کی استطاعت نہیں رکھتا تھا نہ جانے قمرالحسن اب کہاں ہوگا' اس کا حافظہ ویسا ہی ہوگا یا کلرکی کھا گئی ہوگی' خدا فضل و کرم فرمائے۔

اول تو اس پورے ملک میں تعلیم و تربیت کے راستے بند ہیں اور اگر فطری طور پر کوئی ذہین انسان پیدا ہو جاتا ہے تو یہ دماغی افلاس کے مارے ہوئے دیکھتی آنکھوں کے نابینا اس جوہر قابل کو کس طرح پامال کرتے ہیں؟

جرم تبصرہ

تقسیم کے بعد ادیبوں کی ایک جماعت بھی عہدوں اور مناصب کے لیے گھات میں لگی ہوئی تھی کیونکہ حکام اگر چاہیں تو ہر نظریے کو عوام میں رائج کر سکتے ہیں لیکن اس ہجوم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے پاس سے رنگے ہوئے نارنجی دانتوں میں مجھے بھیڑیے باچھیں چاٹتے نظر آتے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر بعض اوقات اپنے عقائد پر کھدائی لگانے کا منصوبہ بنالیتا اور ظاہرداری کے اعتماد پر کھر چائی کا کام بھی شروع کر دیتا۔ لیکن وہ منصوبہ نہیں بنتا تھا جو یقین کی بنیادوں پر ایسا نقشہ بنا دے کہ میں عقبیٰ کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اپنے ضمیر کی ہر آواز کو غور سے سنا اور حتیٰ

المقدور عمل بھی کیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خود پروری کی زرد آندھی میرے جہاز کے نیچے سے گزر رہی ہے اور ہر طرف میری جسمانی آرزوؤں کی تصویریں لی جا رہی ہیں، کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتا تھا کہ پبلک کی جرائم پیشگی سے حکام کو مطلع کروں لیکن یہ بات بھی سامنے تھی کہ ہر تخریب بلندی سے صادر ہوتی ہے جیسے بڑے بڑے فلک بوس مکانوں کو مسمار کرنے کے لیے پہلے چھتیں اتاری جاتی ہیں، اس لئے میرے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہتا اور بار بار فیصلہ کرتا کہ اس میں شک نہیں کہ گمراہ اور بگڑے ہوئے عوام کا علاج تشدد سے بھی ہو سکتا ہے اور بعض اوقات خوف و ہراس کا تسلط پیغام امن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ علاج پائدار نہیں ہوتا۔ انسانی خون سے انسان کے درد کا علاج فہم سے باہر کی شے معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت کچھ خیالات و تصورات میں ایسی گڑبڑ مچی تھی کہ انسانی فطرت کے کسی رخ کو مستحکم تسلیم کرنے کو جی نہیں ٹھکتا تھا۔ میرے افلاس نے میرے عقائد کا حصار ایسا مضبوط بنا دیا تھا کہ ہر فتنہ خس و خاشاک اور پتا در لیے ہوئے بگولے کی طرح چکراتا ہوا گزر جاتا تھا۔ بعض دانشوروں کے سر سبز ضمیروں میں ہل چل رہے تھے۔ لیکن ابھی تعمیر سیرت کے بیج ان کی جھولی میں بھی نہیں تھے تعمیر سیرت اور اصلاح معاشرہ کا کوئی منصوبہ ان کے ذہن سے باہر نہیں جھانکتا تھا پیشوایان مذاہب اور ادباء کے گلوں میں ڈنڈیل بندھے ہوئے تھے اور شعراء زبانیں نا تھے بیٹھے تھے لیڈر اور حکام کی طرف سے مجرمانہ ذہنیتوں کو تشدد کی تھپکیاں دی جا رہی تھیں اور حکومت کے انتظامی ہسپتالوں میں غلط فکری اور گمراہی کے غدود بدلنے کا رجحان سرے ہی سے غائب تھا موٹے موٹے پیٹ والے توندل انسانی اژدھوں کی طرح چلتے پھرتے تھے جن کا حلقہ حکام کے دروازوں تک تھا اور صرف اس لیے کہ ان کی کوٹھیاں اور تجوریاں محفوظ رہیں۔ بعض بعض حکام کی انسانیت کے دیوالے کھسک گئے تھے اور وہ اپنی کفالت کا ذریعہ پبلک کو خیال کرنے لگے تھے۔ اس وقت اس سرزمین میں اچھے سے اچھا اور شریف صاحب کمال کسی ہم عصر کا خیر خواہ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہر انسان کو اپنے اپنے مستقبل کی لگی ہوئی تھی۔ داوں کے نقوش چہرے سے نہیں پڑھے جاتے تھے اور نیتوں کے پرت معلوم کرنا قیافے کے بس کی بات نہیں رہی تھی بلکہ اعمال عزائم سے تعارف کراتے تھے کیونکہ ان کے گرد و پیش مفاد پرستوں اور مصلحت اندیشوں کے سائے چھائے ہوئے تھے۔

پاکستان کے دونوں حصوں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا ان کے انتظام کے لیے عمال حکومت

کو دو ملکوں کا انتظام کرنا پڑا کیونکہ دونوں حصوں میں تہذیب و تمدن اور زبان و خیال کا اختلاف پیدا کر دیا گیا تھا اور آزادی کی عظمت و قیمت کو بے سمجھے بوجھے معاشرے کا رخ متعین کرنا کوئی آسان بات نہ تھی جس کی عکاسی ادب کرتا ہے۔ ان حالات میں ادب کا بھی جو حال ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے اور اس اختلال میں بڑا سبب جہاں حکام کی مصروفیت تھی وہاں دعوت و تبلیغ کے اداروں کی نااہلی بھی تھی۔ کیونکہ تمام اوقاف اور دیگر آمدنی کے وسائل کا حاصل بالارادہ ایک منظم سازش کے طور پر دوسری راہوں اور دیگر آمدنی میں صرف کیا جا رہا تھا اس کے علاوہ مذہبی اور ثقافتی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہی جن کی حیثیت مفت خوروں، خوشامد پسندوں اور غرض مندوں سے زیادہ نہ تھی۔

دریں صورت اسلامی تنظیم کے خواب سے تعبیر کی امید ناممکن نہیں تو محال ضرور تھی۔ اس کے علاوہ تلقین و تبلیغ کے نام سے جو ادب عوام تک پہنچایا جاتا رہا از سرتا پا التباس تھا۔ جس کی شاخیں آج توانا ہو کر مضبوط ہو گئیں اور ان میں جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ دریں صورت ملک و قوم میں کوئی تازہ ولولہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا اور عمل کی کوئی سمت کیسے متعین ہو سکتی تھی اس کا اثر تو یہ ہوا کہ زندگی کے ہر رخ پر غائت آثار کو سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کا ولولہ ہی سرد ہو کر رہ گیا اور غائت اندیشی کا تصور دھندلا ہو جائے تو ضبط و انقیاد اور نظم و ترتیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ زندگی میں ہر پہلو بد نظمی عام ہو گئی اور اب تک وہی موثرات کارفرما چلے آتے ہیں اس دوران بعض لوگوں نے صراط مستقیم کی جستجو بھی کی لیکن وہ گروہ جو غیر ملکی اقتدار کے زیر اثر ایک سیاسی فضا پیدا کر رہے تھے رکاوٹ بنتے رہے اور نتیجتہً بیچارے تھک کر بیٹھ گئے بعض کارکنان سیاسی نے قومی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے غیر ملکی حکومتوں سے عدم تعاون پر اصرار کیا لیکن ان کی کاٹ وہ جماعت کرتی رہی جو غیر ملکی حکومتوں کی طرف دادوسند کے اصول پر دست تعاون [illegible] رہی تھی اور غیر مشروط طور پر انہیں کے مفاد کی حفاظت ان کا موقف تھا اس طرح تصورات و نظریات کا دھارا ایک سمت کو بہنے کی بجائے مختلف سمتوں میں بہتا رہا اور شعور حیات کے مختلف عنوان سامنے آتے رہے اور اس اثنا میں ثقافتی قیادت انہیں لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔

آزاد خیال لوگ مسلمان ہونے کے باوصف اپنے ناموں کے ساتھ اسلام کی نسبتیں رکھنے کے باوجود کافرانہ تہذیب سے اپنے رشتے استوار کر کے قصبات و دیہات کے سیدھے سادے لوگوں

میں قدیم اسلامی ثقافت کے مقابلے میں کفر کی وفاداری کی تجدید و احیاء کے سلسلے دراز تر کرتے رہے- آخر ایک وقت ایسا بھی گزرا کہ ترقی یافتہ قوموں کا امپیریلسٹک (Imperialistic) مفاد پورا ہونے کی یہ شرط قرار پائی کہ سیاسی قوتوں کو پس ماندہ اقوام اور دیہی آبادی میں مرکوز کر دیا جائے- چنانچہ ملک بھر میں دیہات کی ترقی کے نام سے وہ سب کچھ ہونے لگا جس کی توقع نہیں تھی اس آرائش دیہات کی تحریک سے جہاں سیدھے سادے دہقانوں کے اصول و نظریات میں فرق آیا وہیں شہری قیادت بھی بے اثر ہو کر رہ گئی جس میں اسلامی و ثقافتی وفاداری جزو لازم تھی- اب جو صورت حال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ایک زبردست خلیج حائل ہو گئی- ایک طرف تو نام نہاد آزاد خیال ہے جو اسلام کو مسیحیت کی تمثیل پر قیاس کرتا ہے اور تاریخی شہادت یہ پیش کرتا ہے کہ یورپ کی سیکولر زندگی میں تمام ترقیات مسیحیت کے خلاف بغاوت سے مشتق ہیں- جس کے معنی یہ ہیں کہ ترقی کے لیے ہمیں بھی اسلام سے بغاوت کرنا ضروری ہے اس کے بغیر ترقی ناممکنات سے ہے- ایک دوسرا گروہ ہے جو وحی کی ہدایت کو مسائل حیات پر منطبق کرنے اور الجھے ہوئے مسائل کا حل پیش کرنے میں ناکام ہو کر رہ گیا ہے- اور ادب و معاشرہ میں اس کی ناکامی سے جمود کی دیواریں اٹھی ہیں اس کے عزم و عمل پر ہر طرف سے وہ لوگ حملہ آور رہتے ہیں جو آزاد خیالی کے نام نہاد عنوان پر غیر اسلامی تدابیر سے لیس ہیں چنانچہ بہ ایں حالات ہمارا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے جس کے حل ہونے سے تمام مسائل خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں یا اخلاقی ہوں یا سیاسی و علمی ہوں یا عمرانی حل ہوتے چلے جائیں اور یہ دانشوران پاکستان کے لیے اتنا اہم نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہے- ضرورت صرف اسلامی رخ سے سوچنے کی ہے اور اگر اس میں اصلاح و تنظیم سے اسی طرح بے پروائی برتی گئی تو پاکستان کا استحکام تو استحکام اس کی بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی جو اب تک اس معاشرے میں عمرانی وحدت کے نام سے کہیں کہیں نظر آ رہی ہے القصہ رہنمایان ملک کے شعور کی اساس پر اس کی قوت و ترقی کا انحصار ہے-

اصل میں ہمارا اسکرلرسٹ اسلامی مثال پسندی سے نفرت کرتا ہے- اسی لیے وہ سیکولرازم کا نعرہ لگاتا ہے گزشتہ عرصہ میں جو سیکولرازم کی بنیادوں پر ان لوگوں نے عمارت کھڑی کی ہے وہ اسلامی تصورات کے فقدان کا ثبوت پیش کرتی ہے اور اس کے نتائج سب کے سامنے ہیں چاہے تو ہر آدمی

انہیں بالتفصیل بیان کرسکتا ہے چنانچہ آج بھی اس تجویز کے پیش نظر اگر اسلامی اساس پر استحکام ملک کی سعی کی جائے تو اجتماعی سکون میسر آ سکتا ہے اگر چہ ایسا کرنے میں کئی اہم مسائل سامنے آئیں گے۔ لیکن ان سے عہدہ برا ہونا کوئی دشوار امر نہیں۔ مثلاً اسلامی ثقافت کے نمونے کے حامل معاشرے سے وابستہ رہنے کے لیے فرد کس نظام تعلیم سے پیدا ہوسکتا ہے اجتماع کے دو معاشرتی پہلو ہیں۔ایک معاشی دوسرا سیاسی' معاشی مسائل میں اسمگلنگ کا انسداد اور زرعی نظام کی اصلاح اہم اور ضروری امر ہوتا ہے جو برائے نام تو ہوا ہے' لیکن ہنوز اصلاح و تکمیل سے محروم ہے۔ اسی سلسلے میں صنعتی نظام بھی آجاتا ہے جو سرتاسر' سرمایہ دار کے قبضے میں ہے اور اس میں بھی اصلاح کی شدید ضرورت ہے اس ضرورت کے آثار اظہر من الشمس ہیں مثلاً شہری مزدور بڑی بڑی عمارتیں بناتا ہے مگر اس کی رات جھونپڑی میں گزرتی ہے۔اسی طرح کاریگر ملوں میں کروڑوں اربوں گز مختلف قسم کا کپڑا بن کر خود پیوندوں کے چیتھڑوں میں بسر کرتے ہیں اور ان کے بچے ننگے پھرتے ہیں۔ اناج گہائی کی منزل سے گزر کر کھلیان کے ٹیلے لگانے والے اور ہل چلانے والے بیشتر افراد اپنی محنت کے ثمر سے محروم رہتے ہیں۔اسی طرح کے اور ہزاروں مشاہدات ہیں۔

سیاسی مسائل بھی اسی طرح الجھنوں سے دوچار ہیں۔آئینی اور قانونی پہلو پر بھی گڑبڑ ہے اور دونوں کے سلسلے میں قرآنی اصولوں اور پیغمبرانہ قیادت سے صرف نظر کر کے نہ اسلامی آئین کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ دنیاوی اور شرعی قانون کا تضاد رفع کیا جاسکتا ہے۔

مگر جب ہم اس کا تجزیہ کریں گے تو اور کئی مسائل سامنے آئیں گے جن سے عہدہ برا ہونا خود پرور قیادت کے بس کی بات نہیں مثلاً معاشرتی رخ پر سب سے زیادہ اہم مسئلہ عوام کا ہے دوسرے نسوانیت کا یعنی اس کی عصمت کے تحفظ کی کوئی حد مقرر کردی جائے اور کسی عورت کو طوائف کا رول ادا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ خانہ داری کی تعلیم و تربیت اس معیار کی ہو کہ گھر جنت بن جائے مگر یاد رہے کہ اس میں شرم وحیا اور حجاب و کشف کا معیار معاشرہ قائم کرے گا اور نتیجے کے ذمہ دار وہی لوگ ہوں گے جو واضع ہوں گے۔

ہر چند کہ اس ملک میں سیکڑوں فلاحی اور اصلاحی ادارے قائم ہیں اور ہر سال لاکھوں روپیہ ان کے استحکام پر صرف ہو رہا ہے۔لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا آج تک کسی ادارے نے بھی ایسا

لٹریچر اور ایسی تجاویز پیش نہیں کیں جن سے ملک کا استحکام یقینی قرار پائے اور اہل ملک جدید علوم سے بہرہ مند ہو کر دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش آسکیں۔

یونیورسٹی اصولاً ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو علوم جدید اور تحقیقات جدیدہ درس و تدریس کے ذریعے نوجوانوں کو تفویض کر دے اور اس سے کمتر درجے کے علوم یونیورسٹی کے احاطے میں داخل نہ ہونے پائیں تاکہ طالب علم تازہ انکشافات اور معلومات نو سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

پنجاب یونیورسٹی سر فضل حسین کے زمانے تک صرف امتحانات لینے کا ادارہ تھا اور درس و تدریس کا کام کالجوں کے سپرد تھا۔ سر فضل حسین ہی کے زمانے میں ایم۔اے کی تدریس کی ابتدا یونیورسٹی میں ہوئی اور مختلف کالجوں کے اساتذہ کے تعاون سے یہ تجربہ آگے بڑھتا رہا۔فرقہ پرستانہ اختلافات سے مسلمان ترقی کرتے رہے اس کے بعد ارکان یونیورسٹی اور سررشتہ تعلیم کے ارباب اقتدار کے درمیان کچھ مسائل مابہ النزاع آئے اور ان سے جو نتائج نکلے وہ بعض لوگوں کے استفادہ اور انتفاع کی غمازی کرنے سے قاصر ہیں۔ درس و تدریس پر بیشتر کنٹرول ان پبلشروں کا رہا جو صرف دولت کے بل پر اپنے نمائندوں کو سینٹ سنڈیکیٹ اکیڈمک کونسل اور بورڈ آف اسٹڈیز وغیرہ میں بھیج کر اپنا مفاد محفوظ رکھتے تھے آخر یہ دنیا تو ہر سانس پر آگے بڑھ رہی ہے یہ تمام جعلی وسائل اور ان سے ناجائز استحصال کب تک چھپتا۔ مصلحین کی نظر پڑی اور انہوں نے آہستہ آہستہ ان لوگوں کے عزائم اور انفرادی کردار کا جائزہ لینا شروع کر دیا جن کے سامنے استحصال زر کے علاوہ کوئی نظریہ نہ تھا۔اس کدو کاوش کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی نئی نسل کے لیے جن علوم کی ضرورت تھی ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں اور یونیورسٹی کے دامن میں مختلف علوم و فنون کے شعبے کھل گئے اور اب صرف ایک ایسے کمیشن کی ضرورت ہے جو یہ تحقیق کرے کہ ہر مضمون میں ایم۔اے کے اندرونی اور بیرونی ممتحن کس حد تک معیار تعلیم کو پست کرنے کے ذمہ دار ہیں اور انہیں اس قسم کی آلائشوں سے داغدار ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔

میں چونکہ خود ممتحن ہوں اس لیے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ امتحانات کا موجودہ معیار علمی یا ادبی ہرگز نہیں اور امتحانات کا یہ شعبہ تمام روپیہ ضائع کر رہا ہے اس سے تو بہتر ہے کہ سال بھر میں طالب علموں کی کاپیوں کے نمبروں اور اساتذہ کی آرا کو دیکھ کر طالب علم کو اگلی جماعت میں داخلہ دے دیا

جایا کرے اور اگر طالب علم ایک یا دو مضامین میں ناکام ہو جائے تو وہ مضامین چھڑا کر ان مضامین کا وقت الیکٹرک، ریڈیو وائرلیس، اسلحہ سازی، خراد یا اسی قسم کے دوسرے فنون میں صرف کیا جائے۔ تا کہ درس گاہ چھوڑنے کے بعد اگر اسے خاطر خواہ لکھنے پڑھنے کی جگہ نہ مل سکے تو اپنی شکم پری اور تن پوشی کا بار معاشرے پر نہ ڈالے ہمارے یہاں آج سیکڑوں ڈگری یافتہ بے کار پھر رہے ہیں جنہیں کئی کئی برس سے کوئی کام نہیں مل سکا اور وہ عمر کے ضیاع کا ذمہ دار یونیورسٹی کو قرار دیتے ہیں۔

دوسرا دور

تقسیم ہند کے بعد مسلم لیگ ہی کا نہیں، تنظیم پاکستان کا ایک دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے پہلے یہ سوال سامنے آیا کہ اب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام کیا ہو جس سے مسلمان آزادی کے مفہوم کو سمجھیں اور اس سے انسانی عظمتوں کے چشمے جاری کر سکیں قائداعظم نے پاکستان کے حصول کے بعد بعض عملی نتائج کی روشنی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ برطانیہ کبھی پاکستان کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برتے گا اور اس کا رویہ پاکستان کے حق میں مفید نہیں رہے گا ان کے سامنے ریڈکلف اور مونٹ بیٹن دونوں کا خود غرضانہ اور متعصبانہ طرز عمل موجود تھا۔ جو آئندہ کی تمام امیدوں پر پانی پھیرنے اور انگریزوں کی نیت کو پرکھنے کے لیے بہت تھا کشمیر کا قضیہ پاکستان کے کنج ران میں ریڈکلف ہی کا لگایا ہوا زخم ہے جو اب تک بھرنے میں نہیں آتا۔

چنانچہ قائداعظم نے اس ملک کے لیے اسلامی سوشلزم کو بہتر خیال کر کے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اگر چہ اسلامی تصورات کے حامل افراد نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا لیکن قائداعظم کی نظر تاریخ اور سیاست کی روشنی پر تھی چنانچہ قانونی آزادی کے ساتھ انہوں نے کبھی دولت مشترکہ کے اشتراک کو اپنی گفتگو کا جزو قرار نہیں دیا۔ اگر چہ ان مسلمانوں نے بڑی سختی سے اسلامی سوشلزم کی مخالفت کی جن کی نظر کے سامنے ترقی پسند مصنفین اور دوسرے اشتراکی لوگوں کی استردار زندگیاں بے نقاب تھیں اور جن کے آئے دن کھوکھلے دعوے اور غلط بیانی خود اپنی تغلیط کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ اسلامی سوشلزم میں وہ بات نہ تھی جیسے یہ مسلمان سوچ رہے تھے لیکن مشاہدات کو کیسے روکیا جا سکتا تھا تقابل میں جہاں اسلامی اصولوں کو نظر انداز کیا گیا وہیں یہ ترقی پسند مصنفین کی جماعت بھی

قابل ضبطی سمجھی جانے لگی اس کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وقت کا برسراقتدار طبقہ ملک کو امریکہ کی استعماریت سے وابستہ کرنے پر مجبور ہو گیا جو انگریزوں کی ساختہ پرداختہ ہونے کے باوصف آزاد و خود مختار قوت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ امریکہ کے پاس دولت کے خزانوں اور اناج کے ذخیروں کے سوا کوئی ایسا نظام معاشرت نہ تھا جس سے پاکستان جیسا نیا ملک پنپ سکتا اس کا سبب یہ تھا کہ خود امریکہ کو ڈھائی تین سو برس کے تاریخی اور تمدنی حالات و واقعات کے علاوہ غلامی اور آزادی کے اس قسم کے حادثات و سانحات سے کوئی واسطہ نہ پڑا تھا جن سے سیاسی شعور اور معاشی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اسے تو صرف یہ خیال تھا کہ دولت کے زور اور اناج کے بل پر مشرق کے باشندوں کو زرخرید غلام کیسے بنایا جا سکتا ہے امریکہ اس سے بے خبر تھا کہ اس قسم کے فیصلوں اور وقتی تقاضوں کے تحت قومیں غلام نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ موقع کے انتظار میں ضمیر پر ایک بوجھ لیے امن و جنگ کی کشمکش اور موت و حیات کی کمین گاہوں میں مصروف عمل رہتی ہیں۔

مشرق کے ہر خطے میں انگریزوں کے تراشے ہوئے قوانین آج بھی پوجے جا رہے ہیں اور فرنگی کے پروردہ اس وقت بھی اسی طرح اسلامی اصول حیات اور قومی مفاد کے راستوں میں گہری گہری خلیجیں حائل کر رہے ہیں ان کے یقین میں یہ بات مرتسم ہو چکی ہے کہ ہند و پاک کے لوگوں میں انتظامی صلاحیتیں نہیں یہاں پھر انگریز ہی آ کر نظام کو درست کریں گے اور یہ دونوں ملک خود بخود انگریزوں کے قدموں میں جا گر اپنی پرورش اور نظام کے معاملات میں منت گزار ہوں گے۔

اگرچہ برطانیہ کا اقتدار ایک داستان پارینہ ہو چکا لیکن اس کے مفاد کے محافظ آج بھی یہاں خود کو اسی طرح نمک خوار خیال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ گفتگو کے ہر موڑ پر وہ یہ اظہار کرتے ہیں کہ سیاسی شعور اور تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ساری دنیا سے زیادہ برطانیہ کے مدبرین ہیں اور یہ ایک حد تک درست بھی ہے کیونکہ برطانیہ کی پالیسی بڑی دقت طلب اور دوررس نتائج کی حامل ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو اس کی اسی عیارانہ پالیسی اور ظالمانہ خود غرضی ہی نے اسے ایک ایسے بڑے ملک سے محروم کر دیا جس کے باعث وہ دنیا میں معزز گنا جاتا تھا برطانیہ طویل مدت تک اپنی اسلام دشمنی کو چھپاتا رہا لیکن آخر یہ گندگی کب تک دبی رہتی دنیا پر اس کی روباہ مزاجی آشکار ہو گئی اور اب وہ تمام دنیا میں عیار چالاک بے وفا اور مار آستین خیال کیا جانے لگا جرمنی کی شکست سب کے سامنے تھی جو

برطانیہ کے دوررس دماغ اور ہمسایہ دشمنی کی سب سے بڑی دلیل ہے جب برطانیہ نے ہندوستان سے بستر باندھا تو کون نہیں جانتا کہ وہ حکومت کانگرس کے سپرد کر کے گیا تھا کیونکہ کانگرس در پردہ انگریزوں کے خیر خواہوں ہی کی ایک جماعت تھی جس کا کام یہ تھا کہ انگریز دشمن عناصر کا سراغ لگائے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائے چنانچہ تحریک کانگرس میں نہ جانے کس قدر بچے یتیم ہوئے کس قدر عورتیں بیوا ہوئیں کتنے نوجوان پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے لیکن نتیجہ ظاہر ہے کہ آج بھی ہندوستان پر انگریز چھایا ہوا ہے اور اگر وہ چاہے تو آج بھی ہندوستان پر اس کی حکومت اسی طرح قائم ہو سکتی ہے جیسے پہلے تھی۔ برطانیہ نے حکومت مسلمانوں سے لی تھی اس کا فرض تھا کہ وہ جاتے ہوئے حکومت انہی کے سپرد کر کے جاتا لیکن اس کی اسلام دشمنی اسے کیوں ایسا کرنے دیتی اگر انگریز حکومت مسلمانوں کو لوٹا کر جاتے تو اس سے انہیں صرف مسلمانوں ہی کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا تھا بلکہ اسلام دنیا کی ایک سیاسی قوت بنتا دکھائی دے رہا تھا اس لیے انہوں نے جہاں تک ہو سکا حقائق کا خون کیا اور یہاں تک حد سے بڑھ گئے کہ عدلیہ کو بھی کج فکری میں مبتلا کر دیا اس طرح تقسیم ہند میں انگریز نے اپنے قومی وقار پر ایک اور تاریخی زخم لگایا ہے جو رہتی دنیا تک رستا اور مواد دیتا رہے گا۔ جن نظریات کے لیے یہ پاکستان قائم ہوا تھا وہ سب تہہ و بالا ہو گئے یعنی اب اسلام اور پاکستان دو الگ الگ عنوان اپنی تفصیل سمیت ابھر کر سامنے آ گئے اور انہی خطوط پر مختلف اطراف سے تعمیر کا غل غپاڑہ مچا دیا گیا۔ پاکستان رنگا رنگ خیالات و عوامل کا اکھاڑہ بن گیا عوام اپنے اس موقف سے دور ہوتے گئے جس کی آرزو ان کے خون میں رچی بسی تھی اب کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ مخالف اور موافق دونوں گروہوں پر ملک کے خیر خواہوں کا دھوکا ہونے لگا اور خیر و شر کا امتیاز دشوار ہو گیا عمل دونوں کے جدا جدا تھے مگر کوئی تہذیبی تشکیل سامنے نہ آئی تھی اس سے وہ لوگ جو صحیح معنوں میں اسلامی تصورات کے لوگ تھے بڑے دل برداشتہ ہو گئے تھے ان کے پاس حسرتوں اور آرزوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا بڑے بڑے صاحب فکر اور صاحب عمل ذہنی اور عملی طور پر مایوس اور بچھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے حکومت عوام کے مطالبات کو ٹھکرا رہی تھی اور عوام حکومت کے احکام پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ نقصان کی تکمیل کے لیے رہنما اور قائدین پارٹیوں اور اپنے اہل و عیال سمیت حکام کی کرسیوں تک رسا ہو گئے ان کا حاکم بننا تھا کہ عوام پر قوانین کی آخری گرفت بھی روا کر دی گئی۔ یہ نظریات تصورات

کی رو سے ان لوگوں سے ملتے جلتے تھے جنہیں انگریز اپنے جواز سے معرا قلموں کی صورت میں یہاں لگا کے چھوڑ گیا تھا چنانچہ انہوں نے وہی چالیں چلیں جو انہیں ناجائز وراثت میں ملی تھیں وہ عوام اور حکام کے درمیانی فاصلوں کو وسیع تر کرتے چلے گئے اور مسلمانوں میں قوت کے حصول کی سعی کو کامیاب ہونے نہ دیا اور اس تمام ہنگامے کی تہ میں ان کا یہی مقصد تھا۔

اس دور زبوں میں ان کی سب سے زیادہ توجہ تعیش کو عام کرنے سیاسی منافقت کو تازہ دم رکھنے اور معاشی بحران کو پھیلانے میں صرف ہوئی طالب علموں کی ذہنی بیداریوں پر قدغن لگی انجمن ترقی پسند مصنفین کا وجود برقرار تو کیا رہتا ناممکن سا ہو گیا اور عالم یہ ہوا کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں آئینہ حیرت بن گئے جہاں اسلامی اقدار حیات مسدود ہوئیں کمیونیزم کے نقصانات بھی بے نقاب ہو گئے اور اب عوام کے انبوہ کا عالم اس جنگل کی طرح تھا جس میں شاخوں نے بڑھ کر پگڈنڈیوں کو مسدود کر دیا ہو یعنی پاکستان کے دونوں سرے صوبائی عصبیت کی لپیٹ میں آ گئے اور اتنے بڑے ملک میں انسانی ہمدردی، اسلامی رواداری اور خونی رشتوں کے اثرات ضائع ہو گئے وہ تو خیر کچھ سر پھرے ان حالات میں بھی حقائق کی روشنی اور عدل وانصاف کی امیدوں سے محروم نہیں تھے ان کے دل میں قوم کا درد اور وطن کی محبت تھی جو انہیں رہ رہ کر ابھرنے اور نعرے لگانے پر مجبور کر رہی تھی لیکن چونکہ اعلیٰ سطح پر کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے رفتہ رفتہ اس مقام پر بھی سایہ آتا چلا گیا اور ذاتی مفاد اور شخصی خواہشات کے جھاڑ جھنکاڑ نے اعمال وافعال کے راستے بند کر دیئے اور صرف ذاتی مفاد ذاتی ترقی ذاتی بہبود اور خود پیروی کی گھاٹی کے علاوہ کانٹے دار جھاڑیوں نے سرسبز میدان ہتھیا لیے اور زمینوں پر احاطے قائم کر دیئے لیکن کبھی کبھی عظمت پاکستان اور وجود پاکستان کی آوازیں کونے کھدروں سے اٹھتی اور فضاؤں کو بیدار کرتی رہتی تھیں رفتہ رفتہ رگوں میں کچلہو گردش کرنے لگا اور ضمیر سن ہو کر رہ گئے اب اخلاق وعبادات کا کوئی معیار نظر نہیں آتا ہر آدمی الگ تصورات لیے پھرتا ہے اور جہلاء نے رہنمائی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں۔

اسی عرصے کو ممکن ہے بے ایمان مورخ یا برسراقتدار طبقے اپنے دفتری کاغذوں میں انبیاء کا دور بتانے لگیں لیکن ہمارے شعراء وادباء اور علماء کے طبقے میں کچھ لوگ ایسے بھی ملیں گے جو ہر گندگی سے پاک رہے اور صرف انسانی اصول حیات کی امیدوں اور کوششوں میں زندہ ہیں وہ ہنوز حق وصداقت

کی راہ پر گامزن ہیں اور برسر اقتدار طبقے کے جبر و تعدی اور عقوبتوں کے اعلان و امکان کے باوصف ان کا قلم گمراہ اور قدم غلط نہیں ہوا انہوں نے ہمیشہ حق کا آوازہ بلند کیا اور برسر پیکار طاقتوں سے کانپ نہیں کھائی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اور ادیب ملک اور قوم کے حالات اور معاشرے کی تعمیر میں انسانی حیثیت سے برابر کا شریک رہتا ہے لیکن جہاں شعر و ادب کا سوال آتا ہے اس کا قلم تلوار سے زیادہ کاٹ رکھتا ہے۔ اس کے ضمیر و عزائم کا فولاد سورج کے مقابل بھی نہیں پگھلتا یہ بھی غلط نہیں کہ ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر اس گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے معاشرے کے ہم آہنگ ہو گئے لیکن ہم انہیں معیاری ادباء و شعراء کی فہرست میں نہیں رکھتے صحیح شاعر اور ادیب تو اعلیٰ اقدار اور بلند تصورات کے علاوہ کچھ لکھ ہی نہیں سکتا۔ غیر صحت مند ادب غیر معیاری لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور یہ انہیں کا طرہ امتیاز ہے۔

جو لوگ وقت کے ساتھ بدل گئے ہیں ان کے متزلزل ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ تحریک پاکستان سے ہم آہنگ نہیں تھے اپنا کوئی خاص نظریہ بھی قائم نہیں کر سکے بلکہ ڈھل مل یقین رہے اور جو پاکستان کے حق میں تھے ان میں کچھ لوگ پہلے اشتراکی خیالات کے حامل تھے لیکن جب اشتراکیت سے اکتائے اور انہیں پاکستان کی عظمت اور وجود کو منوانے والا کوئی دانشور قائد یا پیشوائے دین میسر نہ آیا تو گھاس پھونس کی طرح وقت کی تیز ہوا کے سامنے جھکنا لچکنا ان کی عادت ہو گئی۔

جب مہاجر شعراء و ادباء شہروں یا شہروں سے ملتی جلتی گنجان بستیوں میں آباد ہوئے اس وقت ان بستیوں میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اشارتاً بیان کر چکا ہوں اس سے زیادہ بیان کرنا نہ میرا منصب ہے اور نہ موضوع البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ حالات کی ناسازگاری اور بے روزگاری کے باعث شاعروں اور ادیبوں نے دیہات کی وہ مخلوق نہیں دیکھی جو صدیوں سے قانون کی چکی میں پستی چلی آ رہی ہے اور ملوں کے مزدور دن بھر کی محنت مشقت کے بعد بھی اتنا معاوضہ نہیں پاتے جو تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے لیے مکتفی ہو حقیقت میں یہی ہجوم انسانی ہے جس کے خون سے شہروں میں برقی قمقمے رات بھر آسمان کے تاروں کا منہ چڑاتے رہتے ہیں اور یہی نہیں کہ ادیبوں اور شاعروں نے غریبوں

مزدوروں کسانوں اور پس ماندہ طبقے کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں بلکہ برسر اقتدار طبقے کا اشارہ پاکر اس خونی کھیل کا ذکر نہ کرنا ہی معیار ادب قرار دے لیا ہے اور یہی خصوصیت سراہی جانے لگی اس عمل سے رفتہ رفتہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جو مصائب و آلام کا اظہار جرم سمجھنے لگا اور اس کے لٹریچر میں شراب خانوں قمار خانوں، قحبہ خانوں اور جنسی مسائل کا بیان مستقل حسن اختیار کر گیا اور اس کے صلے میں حکام، امراء اور تجار کے دستر خوانوں کی ریزہ چینی کو فخر خیال کرنے لگا۔ ظالموں، جابروں، ملت فروشوں اور اخلاق باختہ لوگوں کے قصائد ان کا ذریعہ معاش قرار پا گئے جہاں یہ ان لوگوں کے ضمیروں اور خودداریوں کا ماتم ہے وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا بنیادی مقصد اس قوم کے اونچے طبقے کے دلوں سے مطلق محو ہو چکا ہے اور اس طبقے کا ہراول دستہ ایک خود پروری کی سیاست میں گم ہے قوم اور ملک کا نقصان ان کی نگاہ سے اوجھل اور دلوں سے مستور ہو چکا ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ جو ملک کا محافظ نہیں وہ خود بھی محفوظ نہیں ہے۔

آزادی کے بعد شعراء و ادباء کا ایک طبقہ فسادات کی غایت اور اس جبر و تعدی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اگرچہ اس طبقے میں زیادہ شاعر و ادیب نہیں تھے لیکن میں انہیں ملک و قوم کے لیے نہ صرف مفید خیال کرتا تھا بلکہ میری نظر میں ان کا لٹریچر تاریخ کا درجہ رکھتا ہے اور ان کے تصورات کے ڈانڈے آخر میں جا کر جہاد فی سبیل اللہ سے مل جاتے ہیں جو اسلام میں ایک نہایت وقیع مقام ہے مگر جہاد کا تصور اپنے طور پر نبرد آزمائی سے پہلے اپنا جائزہ بھی لیتا ہے جس سے تمام ضروریات اور نقصانات سامنے آ جاتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ اس بزدلانہ فضا میں مذکورہ بالا ادب بھی قابل گرفت قرار پا گیا۔ کچھ ترقی پسندوں نے بھی اپنے بعض موضوعات کو ابھارنا چاہا لیکن ان کی کوشش بھی رائگاں گئی اور کوئی منظم بات نہ بن سکی بلکہ نقص اظہار سے کئی عنوانات بے معنی ہو کر رہ گئے القصہ اس سیاسی فضا نے کسی تعمیری تحریک کو پنپنے کا موقع نہیں دیا اور یہ حقائق اخباروں اور ریڈیو کے اراکین نے دوسرے ملکوں تک بھی پہنچا دیئے۔

ہاں تقسیم کے بعد پاکستانی ادب میں جو ایک تخلیقی شعور نے نشو ونما پائی اور سر ابھارا وہ انفرادی طرز فکر کا اظہار ہے مگر اس دور کا لٹریچر زیادہ تر بے معنویت اور بے مقصدیت کا شکار ہو کر رہ گیا کچھ ہیئت کے تجربے ضرور ہوئے مگر ان سے دماغوں کو کوئی مقوی غذا نہیں مل سکی البتہ ادب کے بلند مقام

سے مزید بلندی کی طرف دیکھا جائے تو ہمیں تمام تحریکات کے اس وسیع و عریض قبرستان میں صرف اسلامی تصور ایسا دکھائی دے گا جو اپنی انتظامی قوت اور پاکیزہ روح کے باعث آج بھی جاندار نظر آتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس دور کے اشتراکیت پسند حکام نے اسے پھلنے پھولنے کی گنجائش ہی نہیں دی اور اپنے سسکتے ہوئے تصورات اور جانکنی میں گھبرائی ہوئی امیدوں کے لیے موت کا پیغام تصور کر لیا مگر یہ اسلامی نظریہ رکھنے والوں کا مختصر سا گروہ سوچتا ہی چلا گیا آخر آخر ایک مقام ایسا بھی آ گیا کہ اذہان کا رخ آفاقی انداز اور بین الاقوامی نہیں بلکہ بین الانسانی سطح تک پہنچ گیا۔ اس انداز رفتار کا ساتھ دینے سے سیکڑوں ادیب اور شاعر معذور نظر آنے لگے اور درست بھی ہے کہ ایک محدود فضا کا مصور کائناتی کینوس پر اپنے رنگوں اور خطوط کے دوائر کو یک دم کیسے پھیلا سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں سے اس قافلے کی دو صفیں ہو گئیں ایک تو الفاظ کے گورکھ دھندے میں محدود ہو کر بے روح اور بے مقصد لٹریچر کی تخلیق کرنے لگا اور دوسرا بین الانسانی سطح پر خاکہ نگاری میں کھو گیا بہت کم ادیب و شاعر ہیں جو اس اسلامی ملک میں اسلامی نظریات اور وحی کی ہدایت میں قلم اٹھاتے ہیں۔

کمال تو یہ ہے کہ تیسرے درجے کے ادیب اور شاعر عوام کو خالص تفریحی اور جنسی مطالعہ تک اتار لائے آج کل اس قسم کا لٹریچر مقبول ہو رہا ہے اور اس ہنگامے کے پس منظر میں نہ اردو کی تنظیم و توسیع مقصود ہے اور نہ معاشرہ کی اصلاح و بہبود بلکہ اردو زبان کو پیچیدہ مشکل اور ناقص زبان ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ اس ملک میں یہ رابطہ کی زبان ہے اور اس میں بین الانسانی زبان بننے کے آثار بولتے ہیں۔

شکر کا مقام ہے کہ اب چند روز سے اردو ادب میں صحت مند رجحانات پیدا ہو رہے ہیں مگر ان کے گرد آج بھی کانٹے دار جال کسے ہوئے نظر آتے ہیں اس رکاوٹ کے باوصف ادباء و شعراء میں کہیں کہیں معاشرہ نگاری کے ٹکڑے نہایت تیکھے انداز میں دکھائی پڑتے ہیں جو اچھے اور معیاری ادب کے مولود کا پتہ دیتے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ آج کے قائدین بھی جب اردو بولتے ہیں تو ان کے یہاں معیاری الفاظ اور افسون بیان کی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔

مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو

میں اپنے ہوش کے اس عرصے اور عمر کے اس میدان کارزار میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو سے بھی ملا ہوں مگر سرسری ملاقات، سفری تعارف اور رواروی کے اخلاق کی چکا چوند میں کوئی اہمیت نہیں دیتا اور نہ اسے قربت کے نام سے پکارتا ہوں۔ بہر نوع جواہر لال نہرو کی زندگی اور پالیسی کو میں تدبر خیال کرتا ہوں انہوں نے اپنی راکھ بھی خلاؤں اور ہواؤں کے سپرد کردی تاکہ کہیں ایک جگہ کوئی صورت اختیار نہ کرے [illegible] سائی پوجا نہ ہونے لگے۔

وہ رسوم ورواج کے قائل نہیں تھے بلکہ انسانیت کے پرستار تھے یہی سبب ہے انہوں نے اپنی تجہیز وتکفین کو بھی رسوم ورواج سے علیحدہ کرنے کی وصیت کردی تھی وہ اردو زبان کے شیدائی تھے اور جانتے تھے کہ برج بھاشا اور کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت اردو ہے اور یہی ایک ایسی زبان ہے جو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاسکتی ہے لیکن چونکہ ان کے چاروں طرف کا ماحول ان کے اس نظریے کا قائل نہیں تھا اس لیے ہندی زبان کو ترجیح دے دی گئی حالانکہ وہ دن رات اردو بولتے تھے اور خط و کتابت کے علاوہ ان کی تصانیف جو اردو میں منتقل ہوئی ہیں وہ اصل سے زیادہ دلکش ہیں۔

اب انڈیا نے ایٹم کا دھما کا کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب سے چھبیس برس پہلے سے یہ کام شروع ہوچکا تھا اسی اثناء میں جب میں ڈاکٹر بھٹنا گر مرحوم سے ملا تو انہوں نے مجھے ساڑھے دس بجے چائے پر مدعو کیا۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ساڑھے دس بجے چائے کا کون سا وقت ہے تو انہوں نے کہا ''بھائی کیا کروں علی الصبح مجھے لیبارٹری جانا ہوتا ہے اور جواہر لال جی بھی میرے ساتھ ہوتے ہیں ہم لوگ آج کل ایٹم پر ریسرچ کر رہے ہیں اس لیے وہاں سے فراغت پاکر تھوڑی دیر مل بیٹھیں گے۔''

انہوں نے کئی ایسے منصوبے شروع کر رکھے تھے جو ان کے بعد مکمل ہوئے اور ان سے ملک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا آج کی سربراہ اندرا گاندھی بھی انہی کی تربیت یافتہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ انہی کے منصوبوں کی تکمیل کر رہی ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جواہر لال جی خون خرابے کے انسان نہیں تھے وہ پہلے انسانیت اور پھر وطنیت کو عزیز خیال کرتے تھے۔ کاش دنیا ان کے اسی ایک کردار کو

اپنائے! اسی طرح سروجنی نائیڈو سے بھی مشاعروں میں معمولی گفتگو رہی البتہ بنگلور (میسور) کے مشاعرے میں ان سے دس پندرہ منٹ بات چیت کا موقع ملا وہ ایک اونچے درجے کی شاعرہ اور بلند فکر خاتون تھیں۔ ان کا کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا سب اردو میں تھا حالانکہ وہ انگریزی میں حیرت انگیز قابلیت کی مالک تھیں مگر اردو زبان سے بھی کم محبت نہیں تھی اردو زبان کے شاعروں ادیبوں اور آرٹسٹوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوتی تھیں اور لیڈروں سے ملتے ہوئے ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور اس ایک تصور میں ان کی پوری انسانیت بولتی تھی ان کا ذوق ادب لطیف اور مشرب آزاد تھا ان کے یہاں انسانیت کی تکمیل ہی عبادت کا نام پاتی تھی۔

سردار عبدالرب نشتر

حضرت قائداعظم سردار عبدالرب نشتر کے لیے بڑی قدرومنزلت کے جذبات رکھتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ سیاسی اور فکری طور پر کس مقام کے انسان ہوں گے۔

نشتر صاحب نہایت اچھا شعر کہتے تھے ایک دفعہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے مولانا تاجور نجیب آبادی کی معیت میں پشاور گیا نشتر صاحب مولانا تاجور کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مولانا نے میرا تعارف کرایا اور پھر بیٹھے بیٹھے بے تکلفی ہوگئی شاعر ہونے کے باوصف انہوں نے خود کو شاعر کی حیثیت سے کبھی اہم نہیں جانا بلکہ بعد میں وہ منکر ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔

جب ان کے خلوص' ذاتی قابلیت اور سیاسی فکر نے انہیں گورنری کا عہدہ پیش کیا تو انہوں نے قبول تو کر لیا مگر سوچتے رہے کہ میں اس کے فرائض سے کیسے عہدہ براہوں گا۔

وہ بلا کے خطیب اور آتش نوا مقرر تھے ان کی تقاریر میں نہایت شگفتگی اور پاکیزگی ہوتی تھی ان کا انداز خطابت ابہام سے پاک اور الجھن سے بری تھا کیونکہ وہ فطری طور پر شاعر تھے۔ اسی لیے تقریر اور تحریر میں الفاظ کا انتخاب اور موقع موقع سے مضمون سے مربوط اشعار لطف دے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ وزیر بھی رہے اور گورنر بھی لیکن خواجہ ناظم الدین کی غیر قانونی برطرفی کے بعد انہوں نے کراچی میں مستقل قیام کر لیا تھا اور کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کے یہاں اکتساب دولت کا ناجائز ذریعہ رائج نہیں تھا وہ ایک درویش قسم کے انسان تھے ان کی ضروریات محدود اور

مصارف نپے تلے تھے ان کے یہاں بعض وزراء کی طرح دولت کی بلندی کا پیمانہ نہیں تھا۔
جب مرکزی وزارت میں ردوبدل کا وقت آیا تو چودھری محمد علی سامنے آئے اور انہوں نے عبدالرب نشتر صاحب سے کہا کہ آپ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالیں اب بڑا نازک وقت ہے انہوں نے نیم خاموشی میں جواب دیا اس کے ساتھ مسلم لیگ کا صدر ہونے کی حیثیت سے جماعت کو ازسرنو زندہ متحرک کیا اور یہ اسی وقت کا پہیا گھمایا ہوا ہے جواب تک چل رہا ہے۔
وہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ پاکستان بنانے والی جماعت کو مضبوط سے مضبوط کر دیا جائے اور اس کا معیار ایسا بلند ہو کہ حکومت کرنے والی جماعت اس کے مشوروں کی محتاج رہے القصہ نشتر صاحب قابل قدر انسان تھے حکومت کو روز روز ایسے انسان میسر نہیں ہوتے۔
جناب عبدالرب نشتر کے بعد جو میں نظر دوڑاتا ہوں تو بساط حکومت نوسربازوں کا اکھاڑہ معلوم ہوتا ہے اور سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ دم توڑتا ماحول قانون کے سائے اور حکام کی گود میں پلی ہوئی مجرمانہ ذہنیت کی صنعت نہیں؟ اگر ذرا اور وسعت سے دیکھا جائے تو کلرکوں سے لے کر وزراء کی منڈلیاں تک کیا جرائم کے اڈوں کی قطاریں نظر نہیں آتیں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ بڑی کرسیاں بڑی شکارگاہیں اور چھوٹی کرسیاں چھوٹے جرائم کی ایجنسیاں ہیں اور عوام ان کا شکار! اگر منصفی کو ہاتھ سے نہ دیں اور ایمانداری سے سوچیں تو کیا ملک اور معاشرہ دونوں کی بدحالی انہیں جادوگروں کی پھیلائی ہوئی بیماری نہیں؟ اگر آج بھی سب اپنی اپنی جگہ ملک کے مخلص اور قوم کے وفادار ہو جائیں اور ضمیر صاف رکھنے لگیں تو کیا یہ تمدن اور معاشرے کی خرابیاں دور نہ ہو جائیں مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ اگر فقیر کو بھی پیسہ دیا جاتا ہے تو اس میں رحم یا خیرات کا جذبہ شامل نہیں ہوتا - بلکہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس ملک اور معاشرے سے فقیروں کا وجود مفقود نہ ہو جائے۔

پیر پگاڑو

میں جب عمرہ کے لیے گیا تو روضہ مبارک سے قریب ''فندوق الحرم'' میں مقیم تھا ایک روز دن کے دس بجے ہوں گے میں زینے سے نیچے اتر رہا تھا کہ محمد صدیق نے جو اس ہوٹل کا مینیجر تھا مجھے مخاطب کر کے کہا احسان دانش صاحب سید سکندر شاہ المعروف پیر پگاڑو سے ملیے اس وقت نہ انہیں

فرصت تھی اور نہ میں فارغ تھا چنانچہ مصافحے کے بعد دونوں علیحدہ ہو گئے اور گفتگو کا وقت نہیں ملا۔

لاہور آ کر کئی بار ملاقات کو جی چاہا مگر خیال ہوا کہ ہزاروں دلوں پر حکومت کرنے والے انسان کو میری رواداری کی ملاقات کہاں یاد ہو گی خاموش ہو کے رہ گیا لیکن مجھے اس بات کی ٹوہ ضرور رہی کہ ان کی زندگی اور دیگر اوراد و اشغال کے علاوہ عوام سے ان کا تعلق اور رویہ معلوم کیا جائے اسی تحقیق و تفحص کی بنا پر میں یہ چند سطور سپرد قلم کر رہا ہوں کہ پیر پگاڑو ایک مخلص اور نیک خصلت انسان ہیں وہ کسی عہدے یا تملق کی بنا پر سیاست میں حصہ نہیں لیتے بلکہ غالباً ان کی نظر میں اسوہ رسول ہے اور رسول کے پیروکار لوگوں کا بھی ہر رخ اصلاحی ہوتا ہے وہ دنیاوی بلندیوں سے بے نیاز ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرے گا وہ انسانیت کو زندگی دے گا کیونکہ انسانیت کا مظہر کامل تو رسول اکرم کی ذات ہے قرآن و رسول کی ترسیل سے مقصود ذات یہ ہے کہ بندوں پر اپنی اور اپنے خالق کی عظمت کا انکشاف ہو جائے اور وہ جان لیں کہ ہماری تخلیق کی علت غائی کیا ہے اور خالق رکی بندگی کس قدر ضروری ہے اس سے اپنے فرائض اور خالق کے حقوق کا شعور زندگی پر طاری ہو جاتا ہے جو اصل بندگی ہے۔

ایک وقت تھا کہ سندھ میں پنجابی اور مہاجر کے لیے قدم قدم پر موت کی کمین گاہیں تھیں اور غیر سندھی اکثریت کی زندگیاں خون سے لت پت تھیں لیکن جہاں پیر پگاڑو کا اثر یا علاقہ تھا وہاں آدمی تو آدمی چڑیا کے بچے کا بھی خون نہیں ہوا اور ان کی اس انسان دوستی نے انہیں دشمنوں اور ہمسایہ قوموں میں محترم کر دیا۔ آج پنجابیوں اور مہاجرین کی اکثریت مریدوں کی طرح ان کا احترام کرتی اور ان کا نام سن کر سر جھک جاتے ہیں۔ خدا عمر دراز کرے اور صحت برقرار رکھے۔

نواب ملک امیر محمد خان سابق گورنر مغربی پاکستان

نواب ملک امیر محمد خان سابق گورنر مغربی پاکستان کو ان کی گوناگوں خصوصیات کے باعث پاکستان کے حکمرانوں میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔

اگرچہ مرحوم پنجاب کے بہت بڑے زمیندار اور تعلیم یافتہ انسان تھے لیکن اس کے باوجود شراب و شاہد کا دلدادہ ہونا تو دور کی بات ہے مرحوم کی انگلیاں سگریٹ سے بھی ناآشنا تھیں

وہ ایک شیر دل اور بے خوف انسان کے علاوہ مردانہ کھیلوں کے شائق تھے۔ وہ فیاض غریب پرور رئیس کے علاوہ صاف گو انسان تھے وہ سیاست دان بھی تھے اور صدق مقال مسلمان بھی ان کی تعلیمی قابلیت اور ذہانت اب تک زبان زد خلائق ہے ان کی طبیعت اور عادات و خصائل سادہ اور با قاعدہ تھے۔ انگلینڈ ریٹرن ہونے کے باوصف انہوں نے ہمیشہ اپنے قومی لباس کو ترجیح دی۔

انہوں نے حصول پاکستان کی جدو جہد میں جو خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں جلی حروف سے لکھی جائیں گی۔ انہوں نے قائداعظم کی اپیل پر اس وقت پنجاب مسلم لیگ کو خطیر رقم چندے میں دی جب پنجاب میں یونینسٹ پارٹی (Unionist party) کا طوطی بول رہا تھا۔

۱۹۴۶ء میں جب میاں والی کے رؤسا یونینسٹ پارٹی کے ہمنوا ہو کر مطالبہ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے اس وقت انہوں نے میاں والی میں پاکستان کا پرچم بلند کیا اور مسلم لیگ کے امیدواران اسمبلی کو کامیاب کرانے کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے امداد کی اور جب مسلم لیگ نے برطانوی خطابات واپس کرانے کے لیے فیصلہ کیا تو امیر محمد خاں نے عطائے تو بہ لقائے تو کہہ کر خطابات واپس کر دیئے وہ ۱۹۵۱ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر اور ۱۹۵۵ء میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں پی آئی ڈی سی کے چیئر مین اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۶ء تک مغربی پاکستان کے گورنر رہے۔

ان کی دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ وہ گورنر ہاؤس کی مراعات سے کبھی متمتع نہیں ہوئے اپنے اور مہمانوں کے کھانے پینے کے مصارف وہ اپنی جیب سے برداشت کرتے تھے۔ وسیع الاختیار ہونے کے باوجود ان کا دامن ذاتی مفاد کی آلائش سے پاک رہا، انہوں نے اپنے دور میں گورنر ہاؤس کو زنا اور شراب کی گندگی سے پاک رکھا۔ انہوں نے کبھی ثقافتی عیاشیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ انہوں نے ذاتی استعمال کے لیے کبھی سرکاری موٹر استعمال نہیں کی۔

اچانک ۱۹۶۵ء میں جب پاک بھارت جنگ کا آغاز ہوا تو وہ ان دنوں نتھیا گلی میں تھے جنگ کی خبر سن کر انہوں نے فوراً لاہور کا رخ کیا جس وقت ان کی موٹر لاہور میں داخل ہوئی اس وقت بڑے بڑے افسروں کی کاریں لاہور سے باہر نکل رہی تھیں۔ امیر محمد خان جنگ کے دوران لاہور ہی میں رہے اور حکام و عوام کی حوصلہ افزائی ان کا مشغلہ رہا، انہوں نے جنگ کے دوران اشیائے خوردنی

کو مہنگا نہیں ہونے دیا - الغرض وہ اپنے گوناگوں خصوصیات کے باعث بے نظیر انسان تھے -

خدا بخشے ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہاں میں ان کا ایک واقعہ لکھنے کے لیے بھی مجبور ہوں - ان کی گورنری کے دوران ان کی والدہ کو آشوب چشم ہوا اور ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت آ پڑی بے حد تکلیف کے باوجود ان کی والدہ نے کہا ''میں ڈاکٹر کے سامنے اپنا چہرہ نہیں کھول سکتی - بڑی پریشانی تھی امیر محمد خان نے اپنے بچپن کے دوست ڈاکٹر طوسی کو بلایا اور والدہ سے کہا کہ یہ میرا دوست ہے آپ اسے بیٹا بنالیں تا کہ یہ آپ کی آنکھوں کا معالجہ کرے اس پر وہ رضامند ہو گئیں اور انہوں نے طوسی کو منہ بولا بیٹا بنالیا پھر کہیں ان کی آنکھوں کا معالجہ شروع ہوا - ڈاکٹر طوسی کو عہدے کے اعتبار سے ہی صلہ نہ ملا بلکہ اس پیکر پاکیزگی و انصاف نے سنا ہے کہ اپنی زمین کے سولہ مربعے امیر محمد خاں کے نام کر دیئے اور سولہ ڈاکٹر طوسی کے نام ! امیر محمد خان کی کوٹھی کے قریب ڈاکٹر طوسی کی کوٹھی بھی بن گئی -

ڈاکٹر طوسی

ڈاکٹر طوسی بھی نہایت خلیق فرض شناس اور ملک دوست انسان ہیں چنانچہ وہ آج بھی ایک روپیہ ماہانہ معاوضے پر پاکستان میں دن رات کام کر رہے ہیں - وہ دیانتداری ملک دوستی اور فرض شناسی میں اپنی مثال آپ ہی ہیں - ڈاکٹر طوسی کو شعر و شاعری سے بھی اچھا خاصا شغف ہے اور ان کی نظموں غزلوں کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ میری نظر سے گزرا ہے وہ جہاں اچھے ڈاکٹر ہیں ایک بلند پایہ استاد بھی ہیں اور اونچے درجے کے غریب پرور بھی -

ملک شیر محمد خان اعوان

ملک شیر محمد خان اعوان ایک مدت سے میرے یہاں آتے جاتے ہیں اور ملک امیر محمد خاں مرحوم گورنر مغربی پاکستان کے قریبی عزیز ہیں اب تو بساط مؤلفین میں وہ جانی پہچانی شخصیت ہیں لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات میں انہیں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب ان کا عنفوان شباب تھا اور ابھی اچھی طرح مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں انہیں ازل سے مطالعے کا ذوق ہے یہی سبب ہے کہ مروجہ علوم پر وہ گھنٹوں بحث کرتے ہیں ان کا قابل قدر وصف تو یہ ہے کہ ایک بڑے زمیندار اور رئیس خاندان

کے فرد ہوتے ہوئے بالغ نظر ادیب اور اسلام کے شیدائی ہیں جس کا ثبوت ان کی تالیفات ہیں یہ موجودہ دور کے تمام مسائل کا حل آئین مصطفیٰ کے نفاذ میں سمجھتے ہیں اور اکثر اوقات یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

آئین مصطفیٰ کے سوا حل مشکلات
یہ عقل کا فریب نگاہوں کی بھول ہے

ان کی تالیفات میں ''معرکہ کربلا''، ''تاریخ الاعوان''، ''خیابان دانش''، ''بیان الاسرار''، مشاہدات و محسوسات''، ''تذکرۃ الاعوان''، ''دفاع کی شرعی حیثیت''، ''مقام مصطفیٰ''، اور ''ضرورت مرشد'' معروف ہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی لائبریری ایک علمی ذخیرہ ہے۔ مزید مزے کی بات یہ ہے کہ وہ میرے لیے بھی اچھی کتب کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اپنے علاقے کی دینی اور سماجی مجالس و محافل کی روح رواں ہیں جو ممتاز شخصیتوں کا خاصہ ہے۔

عبدالوحید خاں اور میاں محمد شفیع

عبدالوحید خاں صاحب سے میری ملاقات لکھنو میں ہوئی تھی ان دنوں وہ ایک اسلحہ کی دکان کے مہتمم تھے اور ان کی پہلی کتاب غالباً چھپ چکی تھی ان کا احسان کہ وہ مجھ غریب الوطن اور بے یار و مددگار انسان سے مخلصانہ انداز سے ملے۔

تقسیم ملک کے بعد جب وہ لاہور تشریف لے آئے تو میرا وہی نگاہ خلوص کا لگا ہوا چھکا دھواں دینے لگا اور کئی بار ان سے ملا لیکن اب ان میں کچھ بردباری سی آ گئی تھی جو مجھے اکیتی اور بے فصلی سی بات محسوس ہوئی اور میں نے قربت کا ارتکاب معرض التوا میں رکھا۔ کچھ دنوں بعد جب میاں محمد شفیع صاحب کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی تو کچھ تکلف کی دھند چھٹ گئی تھی نہ جانے وہ اخلاقی برکت تھی یا موسم کا تقاضا؟

اتفاقاً ایک دن کافی ہاؤس میں کسی بات پر آغا شورش کاشمیری اور عبدالوحید خاں میں کسی بات پر اختلاف ہوا اور بحث و تمحیص برہنہ گفتاری تک آ گئی لیکن تھوڑی ہی دیر میں فریقین نے نرمی اختیار کر لی۔

اسی دن دوپہر کو میاں محمد شفیع نے مجھے بلوایا اور کسی تمہید کے بغیر نہایت افسوس ناک لہجے میں کہا احسان صاحب آج مجھے آپ کے شورش صاحب کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تقریر اور تحریر میں آپ کو استاد کے لقب سے یاد کرتے اور باپ کی طرح آپ کا ادب کرتے ہیں اب تو جو کچھ ہوا سو ہوا آئندہ اگر شورش نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں یہ سمجھوں گا کہ وہ آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔ میں ان کی گفتگو سن کر نادم سا ہو گیا اور اٹھ کر چلا آیا گھر آتے ہی میں نے شورش کو بلوایا اور کہا کہ میاں جوانی میں تو جوں توں کر کے ہم نے عزت اور آبرو سے گزار دی' اب میری بنی بنائی بات کو تم کیوں بگاڑ رہے ہو۔ یہ کہاں کی شرافت ہے وہ پہلے تو بھو چکا سا رہ گیا لیکن جب میں نے عبدالوحید خان کا نام لیا تو تھوڑی دیر تک وہ خاموش فضا میں نگاہیں ٹہلاتا رہا پھر کہنے لگا کہ ہر چند میں اس میں بے قصور ہوں لیکن اب انشاءاللہ آپ پر کوئی بات نہیں آنے دوں گا اور عبدالوحید خاں کی ہر بات کو برداشت کر لوں گا آپ بے فکر رہیں۔

عبدالوحید خان اور میاں محمد شفیع کے تعلقات کی نوعیت اور اسباب تو مجھے معلوم نہیں' ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب عبدالوحید خاں وزیر ہوئے تو ان کی آمد و رفت کم ہو گئی تھی شاید اس لیے کہ اس منصب میں مصروفیتیں بڑھ جاتی ہیں۔

ایک دن ایک شخص نے اس کم آمیزی اور فاصلے کو غلط انداز سے موضوع گفتگو بنایا تو میاں محمد شفیع نے بڑے ہی ٹھنڈے انداز میں یہ کہا بھائی وزیروں کی مصروفیت سے آپ واقف نہیں۔

''جن کے رہتے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے''

ایک دفعہ عبدالوحید خان نے غالباً کہیں اخبار کے مضمون سے متاثر ہو کر مجھے تین سو روپے کا چیک دیا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ چیک مجھے کس لیے دیا ہے۔ انہوں نے ایک ہنکارا بھر کے میرے چہرے کو ذرا غور سے دیکھا اور کہا ''میں اس رقم کی کتابیں لوں گا آپ کو خبر نہیں میں ہر مہینے کتابیں خریدتا ہوں۔'' اس کے بعد اپنی وزارت کے دوران میں ایک پانچ سو روپے کا چیک بھیجا میں نے میاں محمد شفیع سے مشورہ کیا اور کہا کہ آپ کے دوست مجھ پر یہ عنایت کر رہے ہیں اور میں اسے اچھا خیال نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا فی الحال رکھ لو اگر یہ خلوص کی پیش کش ہے تو میں ان کا شکریہ ادا کر دوں گا اور اگر انہیں کتابیں درکار ہوئیں تو آپ جانیں اور وہ جانیں۔ ادھر میں خاموش ہو گیا اور

ادھر انہوں نے چپ سادھ لی۔

میاں محمد شفیع ادب پسند اور اردو پرست انسان واقع ہوئے تھے جب وہ لاہور میں ڈپٹی کمشنر تھے تو فائلوں پر میں نے ان کی اردو تحریریں ہی دیکھی ہیں۔ میاں مجھ سے بڑے بے تکلف تھے اور میرے گردو پیش کو اچھی طرح جان چکے تھے انہوں نے اپنی نظر سے کبھی میری نزاکت احساس اور عظمت افلاس کو اوجھل نہیں ہونے دیا اور جب تک وہ زندہ رہے ان کی انسانیت کے جوہر اجاگر ہی ہوتے چلے گئے۔

میں نے اپنی اس خاک بسر عمر میں میاں محمد شفیع جیسے شعر و نغمے کو سمجھنے والے بہت کم دیکھے ہیں وہ دل کی آگ کے شعلوں اور شرافت کی حدت کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو ایک مومن کی شناخت ہے۔

وہ آہستہ آہستہ تصنیف و تالیف کی طرف آ رہے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء پر ان کی کتاب معلوماتی مواد کے اعتبار سے تاریخ اور سیاست کے طالب علموں کے لیے حوالہ کی کتاب ہے۔

وہ حضرت اصغر گونڈوی پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور اللہ کو پیارے ہو گئے جب ان کا تابوت لاہور قبرستان میں آیا تو آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ میں نے کسی بڑے آدمی کی میت پر کبھی یہ محشر آدم نہیں دیکھا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی صاحبزادی کی شادی میں جب ایوب شاہد نسیم شفیق کوثی حفیل ہوشیار پوری اور راقم الحروف پہنچے تو ان کا چہرہ بشاش ہو گیا اور ہاتھ پھیلا کر کہا ''میری اصل برادری تو اب آئی ہے۔'' اس دنیا میں اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے؟ اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے آمین ثم آمین۔

چودھری ظفر اللہ خان

جہاں تک ملک کی عظمت کا سوال ہے چودھری ظفر اللہ خان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ عالمی عدالت کے معروف جج رہ چکے ہیں اور آج بھی وہ ایک بلند منصب پر ہیں اور پاکستانی کہلاتے ہیں۔

انہوں نے میری کتاب ''جہاں دانش'' پڑھ کر مجھے اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا میں عبدالرشید تبسم کی معیت میں ان کے یہاں گیا اور اس طویل ملاقات میں انہیں میں نے پاکستان کا خیر خواہ پایا اور انسانیت کا اعلیٰ مربی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''تحدیث نعمت'' عنایت فرمائی جو مہینوں میری مطالعے کی میز پر رہی۔

اتفاق سے شیخ اعجاز صاحب بھی وہیں موجود تھے میں انہیں ایک زمانہ سے علمی شخصیت سمجھتا ہوں۔ وہ فراخ دل، فراخ نظر، اور فراخ حوصلہ انسان ہیں۔ اگرچہ اعجاز صاحب نے افلاس کی آنچیں نہیں دیکھیں لیکن ان کی زندگی کے تجربات نے انہیں ایسا شعور دے دیا ہے کہ جہاں وہ نغمے کی الاپ کی پرواز کو پہچانتے ہیں وہیں ٹھنڈی سانسوں اور ڈوبتی نبضوں کے کرب کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

چودھری صاحب نے مجھے اپنی کتاب دی تو شیخ اعجاز احمد سے فرمایا کہ آپ اس پر کوئی فقرہ لکھ دیں تو میں دستخط کردوں انہوں نے از راہ کسر نفسی عبدالرشید تبسم سے کہا جو مجھے ساتھ لے کر گئے تھے انہوں نے بھی بہت سوچا فکر کی پیشانی سہلائی مگر وقت کی بات ہے کچھ نہ سوجھا۔ آخر غنیمت کے مصرعے ''بنام شاہد نازک خیالاں'' میں تصرف کرنے لگے لیکن فوری طور پر کامیاب نہ ہوئے آخر میں نے چودھری صاحب سے کہا فقرے کی کیا ضرورت ہے مجھے تو آپ کے دستخط ہی کافی ہیں۔

انہوں نے از راہ التفات دستخط فرما دیئے۔ شام کے وقت کے ساتھ خنکی بڑھ رہی تھی میں نے اجازت چاہی اور چودھری ظفر اللہ خاں صاحب بنگلے کے دروازے تک ساتھ آئے۔

تین چار روز گزرے ہوں گے کہ میں ایک مذاکرے میں انجینیئرنگ یونیورسٹی گیا ہوا تھا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ چودھری ظفر اللہ صاحب تشریف لائے تھے وہ ایک کتاب دے گئے۔ کتاب کا نام ہے ''میری والدہ'' جو انہوں نے اپنی والدہ کے متعلق لکھی تھی۔ کیا بتاؤں کس قدر افسوس ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محبوب کواڑوں پر دستک دے کر گزر جائے اور ہاتھ کے نشان روشنی اور خوشبو دیتے رہیں۔ ایسے مخلص بزرگ اب کہاں۔

نیاز احمد مرحوم

میں جن دنوں کلکتے میں تھا تو وہیں کلکتے ہی میں ایک ہندو پروفیسر تھے جسے لوگ صاحب باطن بتاتے تھے اور اس کے جھڑکیاں دینے کے باوجود معتقدین کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی میں نے کئی باران سے ملنا چاہا مگر محرومی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں لاہور آ گیا۔

عرصہ کے بعد جب لاہور میں نیاز احمد صاحب سی-ایس-پی سے ملاقات ہوئی تو یونہی ایک دن بات آ گئی اور میں نے اس پروفیسر کا ذکر کر دیا نیاز احمد صاحب نے کہا وہ افواہ بڑی حد تک درست ہے میں ہندو پروفیسر سے ملا ہوں وہ صاحب باطن تو معلوم نہیں تھا یا نہیں لیکن ٹیلی پیتھی (Telepathy) میں اس کی مشق و مزاولت بیحد کمال ضرور تھی۔

ایک دن پروفیسر صاحب کے یہاں ''دل را بہ دل رہیست'' کے موضع پر بات چل پڑی۔ پروفیسر صاحب نے کہا اپنے دل کی بات یا اپنے منہ کے بول دوسرے شخص تک پہنچا دینا کوئی بات نہیں خواہ وہ کتنی ہی مسافت پر کیوں نہ ہو۔ ان دنوں ان کی اہلیہ دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا ''کیا آپ اپنے الفاظ اپنی اہلیہ کو یہاں سے دارجلنگ پہنچا سکتے ہیں؟'' پروفیسر صاحب نے جواب دیا ''کیوں نہیں؟''

میں نے کہا ''مگر جو ہم کہیں گے وہی الفاظ پہنچنا چاہئیں نہ کہ آپ کے الفاظ'' وہ بولے ''جی ہاں جو آپ فرمائیں۔''

میں نے یونہی ایک اوٹ پٹانگ اور غیر مربوط سا فقرہ کہہ دیا۔ اور کہا کہ یہ دارجلنگ میں اپنی اہلیہ کو پہنچا دیں۔''

پروفیسر بولے ''مجھے صرف دو منٹ کی تنہائی درکار ہے۔''

میں نے انہیں ایک غسل خانے میں بند کر دیا اور چاروں طرف خوب اچھی طرح دیکھ لیا مبادا کوئی ٹیلیفون ریڈیو اور کوئی آواز رسانی کی مشین لگی ہو۔

مشکل سے دو ڈھائی منٹ ہوئے ہوں گے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئے اور بولے ''لیجئے، جو آپ نے کہا تھا کہہ دیا۔

میں نے اسی وقت دارجلنگ کال کی اور ان کی اہلیہ سے پوچھا ''پروفیسر صاحب نے آپ سے کیا کہا ہے۔'' انہوں نے میرا فقرہ دہرا دیا۔ اور کہنے لگیں کہ '' یہ کیا قصہ ہے میں بالکل نہیں سمجھی۔'' میں نے جواباً کہہ دیا آپ کو فکر کی ضرورت نہیں یہ ہمارا اور پروفیسر صاحب کا معاملہ ہے مگر صاحب میں تو حیران رہ گیا۔''

جب پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ '' جناب معاملہ کیا ہے یہ آپ نے کیا طلسم باندھ رکھا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا بات تو کچھ بھی نہیں تل اوٹ پہاڑ والی بات ہے لیکن اس علم کے بعد جیسے میں ہندو نہیں ایسے ہی آپ مسلمان نہیں رہیں گے۔ بس اس قصے کو یونہی رہنے دیں۔ حقائق کی رسوائی سے سزا کا امکان بھی روشن ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں بعد پروفیسر صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ ہم کئی دوست تعزیت کے لیے گئے تو انہوں نے کہا '' بھائی اس کی ماں کو پرسا دے کر ڈھارس بندھاؤ میں تو اس سے ملتا رہتا ہوں وہ بلاناغہ میرے پاس آتی جاتی رہتی ہے۔''

نیاز احمد مرحوم نے اس پروفیسر کا نام بھی بتایا تھا۔ افسوس کہ مجھے یاد نہیں رہا نیاز احمد بڑی خوبیوں کے انسان تھے وہ علمی ادبی لوگوں کی قدر بھی کرتے تھے اور غالباً امداد بھی انہیں موقع موقع کے ہزار ہا اشعار یاد تھے اور جو شعر ان کے حافظے میں تھا اس میں کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ ان کی یادداشت کے ذخیرے میں صرف قدیم اساتذہ ہی کے اشعار نہیں تھے بلکہ موجودہ دور کی شاعری سے بھی وہ متاثر تھے اور نئے شعراء کے بہت سے اشعار انہیں ازبر تھے۔

جب وہ حیدرآباد میں کمشنر تھے تو ہر سال ایک مشاعرہ ان کا معمول سا تھا اور اس میں شعراء کی اچھی خاصی تعداد شامل ہوتی تھی۔ پبلک مشاعرے کے بعد ایک مخصوص نشست نیاز احمد کے گھر پر بھی ہوتی تھی۔ وہیں نشست میں پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ ان کے بھائی شعیب صاحب بھی شعر کہتے ہیں اور جو غزل انہوں نے سنائی وہ معمولی غزل نہیں تھی۔

یہاں مشاعرے کا غالباً تیسرا سال تھا اور چند شاعروں کو دوسرے روز بورے والا کے مشاعرے میں شریک ہونا تھا جن میں راقم الحروف بھی تھا۔ ہم نے پبلک مشاعرے میں غزل پڑھ کر ان سے اجازت چاہی تو نیاز صاحب اس پر جزبز ہو گئے اور مشاعرے کے سیکرٹری سے کہلوا دیا کہ نجی

نشست کے بعد مصارف سفر ملیں گے- میں نے کہا ''جناب ہم مصارف سفر کے لیے وعدہ غلط نہیں کر سکتے-'' چنانچہ فیض احمد فیض شور علیگ اور راقم الحروف اسی وقت اٹھ کر اسٹیشن چلے آئے اور دوسرے دن بورے والا مشاعرے میں شامل ہوئے- میں نے گھر آ کر نیاز احمد صاحب کو ایک تلخ لہجے میں خط لکھا جس میں ان کی کمشنری کو خوب گھسیٹا' انہوں نے میرے خط کا جواب تو نہیں دیا لیکن بیگم سمیت غریب خانے پر آئے اور مجھ سے معافی چاہی' میں نے انہیں سینے سے لپٹا لیا اور کہا ہم تو اس نیاز احمد کے جاں نثار ہیں کمشنر کے نہیں'' اس سے میری نظر میں ان کا مقام اور بھی بلند ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ خوشامدی لوگ اس نوکر شاہی مخلوق کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں ورنہ ان میں تمام کے تمام لوگ برے نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے جوہر قابل چھپے پڑے ہیں مصطفی زیدی مرحوم بھی انہیں میں سے ایک تھا میں نے بہت کم ایسے ذہین اور انسان شناس لوگ دیکھے ہیں-

پان تمباکو

پان تو میں اپنے استاد اول قاضی محمد زکی صاحب زکی کے گھر سے ہی کھانے لگا تھا مگر کبھی کبھی اس کے بعد شمعی کے یہاں کی آمدورفت نے اضافہ ضرور کر دیا مگر پھر بھی دن میں ایک دو پان سے زیادہ نہ بڑھا مگر جب مشاعروں میں آمدورفت کا سلسلہ شباب پر آیا تو شاعری کی مقبولیت کے ساتھ پان کھانے کی عادت بھی پختگی تک پہنچ گئی- لیکن جب سے ڈاکٹر حشمت آرا حجاب نے مجھ سے اصلاح کا سلسلہ شروع کیا اس وقت سے یہ عادت مرض کی صورت اختیار کر گئی- کیونکہ حشمت آرا حجاب پان کی اس قدر عادی ہیں کہ جب تک انہیں پان نہ ملے وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہیں- جیسے وہ گھر سے لڑ کر آئی ہوں یا مجھ سے لڑنے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہوں-

انہوں نے مجھے تمباکو کی ایک ایک پتی پان میں دینا شروع کر دی- اس طرح میں رفتہ رفتہ پان میں تمباکو کو کھانے لگا اور یہ تمباکو کی لے اس قدر بڑھ گئی کہ تمباکو کے بغیر مجھے پان میں مزہ نہ آتا اور جب تک تمباکو کا پان نہ کھا لیتا منہ میں صابون سا گھلا رہتا- زبان نے دل و دماغ کو نہ جانے کیسے ہم آہنگ کر لیا تھا کہ اس کا تقاضا دل و دماغ کا تقاضا ہو گیا تھا-

تمباکو نے ترقی کی تو میں آہستہ آہستہ قوام کھانے لگا اور تمباکو ماضی کی چیز ہو کر رہ گیا جب تک

قوام نہ کھاتا جماہیاں آتی رہتیں اور ہاتھ پاؤں میں ایک قسم کا تشنج سا محسوس کرتا مگر چونکہ میرے مکان کے سامنے عبدالرحمان پان فروش نے ایک تھڑے کو دکان بنالی تھی اور وہ رات کے بارہ ایک تک دکان کھولے بیٹھا رہتا تھا اس لیے زیادہ بھاگنے دوڑنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

عبدالرحمان دو پیسے سے لے کر پانچ روپے تک کا پان بیچتا تھا۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا کہ "میاں تم پانچ روپے کے پان میں کیا ڈالتے ہو اور اسے کون لوگ لیتے ہیں" مگر وہ سن کر خاموش ہو جاتا صرف اتنا کہتا کہ کسی دن دکھا دیں گے۔

چنانچہ ایک بار رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے میں گھر سے اترا ہی تھا کہ عبدالرحمان نے مجھے آواز دی میں گیا تو کہنے لگا ذرا یہاں ٹھہرے رہو ابھی دس بیس منٹ میں ایک شخص پانچ روپے کا پان کھانے والا ہے مگر ذرا اس نوجوان پر بھی نظر رکھنا جو سامنے تھڑے پر بیٹھا ہے میں اس نوجوان کو پہلے ہی سے جانتا تھا وہ ایک رئیس زادہ تھا جو میرے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے کوتکوں سے پیسے پیسے کو تنگ تھا۔ خیر میں اس تنبولی سے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں ایک نوعمر نوجوان قیمتی لباس میں ملبوس آیا۔ پانچ روپے عبدالرحمان کو دے کر ایک پان لیا اور جو پان اس کے منہ میں تھا وہ فٹ پاتھ کی دیوار کے قریب تھوک کر تازہ پان کھا کے چلتا بنا۔ وہ دو چار ہی قدم گیا ہو گا کہ سامنے تھڑے پر بیٹھا ہوا نوجوان بلی کی طرح لپک کر آیا اور اس کا اگلا ہوا پان اٹھا کے کھا لیا۔ عبدالرحمان نے کہا دیکھا جناب اس نوجوان کے پاس پیسے نہیں ہیں تو دوسرے کا اگلا ہوا پان کھاتا ہے۔

میں نے عبدالرحمان سے پوچھا اسے یہ غلاظت کھانے کی عادت کیسے پڑی اس نے کہا جناب یہ بھی پانچ روپے والا پان کھاتا تھا اب قلاش ہو گیا تو پانچ روپے کہاں سے لائے تو لوگوں کے اگال کھاتا پھرتا ہے۔ یہ جو آپ کے سامنے پانچ روپے والا پان کھا کے گیا ہے یہ بھی ایک دن اسی اسٹیج پر آ جائے گا۔ یہ لوگ پان میں کوکین کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر یہ اس کے لیے ہر بری بات کر ڈالتے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کوکین میں ایسا نشہ ہوتا ہے کہ آدمی کو خود پر قابو نہیں رہتا۔ اس نے کہا "جناب قوام سے آگے یہی مقام ہے" میں تو سناٹے میں آ گیا اسی وقت سے میری طبیعت قوام تمباکو اور پان سے بھی متنفر ہو گئی۔ اب میں تمباکو اور قوام تو کسی قیمت پر نہیں کھاتا البتہ

سادہ پان وہ بھی کبھی کبھی بعالم مجبوری سفر ہو یا حضر محفل ہو یا تنہائی مجھے کبھی پان کا خیال تک نہیں آتا۔

شب و روز کا زینہ

پہلے پہلے میں کئی بار اپنے لیڈروں اور دیگر مقررین کی تقریر سننے گیا لیکن ایک تقریر سے دوسری تقریر تک وعدوں کی ایفاء اور ارادوں پر عمل کا دھبا نہیں دیکھا' میں' ایسے' حکام' عمال اور صاحب منصب لوگوں سے بھی ملا جو بادی النظر میں شریف انسان تھے لیکن بہت قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ بعض شرابی اپنی نسلی کمزوری کے باعث شراب پی کر ہی اچھا جھوٹ بولتے اور غلط وعدے کرتے ہیں اور یہ تھکی ہوئی ذہانت کی دلیل ہے ورنہ شراب تو دروغ بانی کا علاج سنا جاتا ہے' مگر مشاہدہ یہ ہے کہ جو شرابی دن میں شراب پیتا ہے' وہ کتنا ہی ہوش مند کیوں نہ ہو اس سے فرائض کی انجام دہی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اس وقت حکومت کی رکنیت ان لوگوں کا حصہ تھی جو توڑ جوڑ کے علاوہ صاحب حیثیت بھی ہوتے تھے اور فرائض سے ناواقف بھی وہ جہل کے باعث اپنے فرائض اور اختیارات سے نابلد ہونے کے باعث دوستیوں سے دست بردار ہو جاتے تھے' اس کے باوجود نام ہی کا سہی اقتدار کے نشے اور منصب کے احساس کا ہضم معمولی معدے کے انسان کے بس کی بات نہیں' وہ تقریروں میں اپنی قابلیت کا لیبل لگا کر بڑے بڑے لوگوں کے اقوال تو ضرور بیان کرتے تھے لیکن چند روز بعد ہی ان کی جعلی شرافت لبادہ اتار پھینکتی جس سے ان کی بلندی کی حریری جلد جگہ جگہ سے جھڑنے لگتی تھی اور رفتہ رفتہ ان کا ظرف وضمیر بے نقاب ہو جاتا تھا وہ سقراط کی ذہنی نسل تیار کرنے کے بجائے متعصب اور بازاری لوگوں کی گروہ بندی میں مبتلا ہو جاتے تھے جس سے ان کے تمام ذاتی اور صفاتی منصوبے لوگوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ نوجوانوں کو جس بیچ پچی دلدل کی طرف ہانکنا چاہتے اس کے علاوہ ہر رستے میں کانٹے دار تار لگ جاتے' کیونکہ ان کے اقوال سے صداقت کی روشنی نہیں ابھرتی تھی بلکہ دروغ بافی کا کالا دھواں دلوں پر ابریاں پھیلاتا چلا جاتا اور ان کی اس ظاہرداری میں ریت کی بھربھری ڈلیوں کے سوا کچھ نہ رہتا' جب وہ شرفا کو اپنی طرف سے بدگمان پاتے تو رفتہ رفتہ غنڈوں اور لقوں کو بلند منصبوں پر لانے لگتے تھے' جیل خانوں میں اسلحہ پہنچانا اور قیدیوں کو بغاوت

پر آمادہ کرنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا' رات کو قیدی جیل خانے سے نکل کر قتل و غارت تک کر جاتے مگر جیل خانوں میں شہریوں کی زندگی سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کا شور اخبارات میں روز نئی نئی خوش کن خبروں کی صورت میں سماعت آشنا ہوتا' حکام نے کوڑوں کی تجدید کو جرم اور قصاص کو گناہ قرار دے دیا تھا اور وعدوں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جو ان کی لغت میں موجود نہ تھے- ان کی نگاہیں مخلصوں سے بے پروائی کو روا سمجھنے لگی تھیں اب ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ ایک بار کے نیچے دبا جا رہا ہے-

حکام کی بے راہ روی اور بے پروائی سے عورت کی قیمت سگریٹ کے پیکٹ اور سینما کے ٹکٹ سے لے کر چائے کی پیالی تک آ جاتی تھی لیکن اس میں افلاس کا دخل نہیں تھا اور یہ تعجب کی بات نہیں' جب بھی کوئی متعصب اور خود غرض حاکم آتا ہے تو اہل علم اور محب وطن لوگوں کی تلاش میں تھانوں سے زنجیریں نکل پڑتی ہیں- اس وقت بڑے عہدے ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں- جن کی اولاد بھی حب الوطنی کی قلموں کو قبول نہیں کرتی' آئے دن اغراض و مقاصد کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں اور پستیاں ابھر ابھر کر آفتاب و ماہتاب کے چہروں پر کالک ملنے لگتی ہیں اور ان کے انتظامی جھاڑ جھنکاڑ میں تلخ پھلوں کے سوا کچھ نہیں ملتا-

ہر چند کہ صحیح شاعر اور ادیب اپنے کلام سے صحیح راستوں کے داغ بیل لگاتے رہتے ہیں لیکن حکومت اور اس کے زر خرید غلام اقوال کو عمل میں لانے کے اقدام نہیں کرنے دیتے اور نہ اس قسم کا کوئی منصوبہ ان کی رات دن کے قول و عمل سے برآمد ہوتا ہے-

اس وقت جیل خانے کے دروازے بھی اسپرنگ دار کواڑوں کی طرح کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں' اس بات کو کوئی نہیں سوچتا کہ باہر کے حالات کی سنگینی سے گھبرا کر ہی انسان جیل کے احاطے کی دیوار کی طرف قدم بڑھاتا ہے ورنہ کون اپنی آزادی کو گنواتا ہے؟

قصبہ کاندھلہ اور اس کے ارد گرد قصبات میں جس قدر علماء و فضلاء پیدا ہوئے پورا ضلع اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا اور کمشنری میرٹھ میں جتنے مشاہیر ہو گزرے ہیں پورے ملک میں بمشکل ہی جواب ملے گا' مسلمانوں میں مفتی الٰہی بخش نشاط' مولانا محمد زکریا' تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس' مولانا موحمد یوسف' مولانا محمد ادریس' مولانا محمد علی صدیقی سے قطع نظر دیو بند' کیرانہ' نانوتہ

پھلت' تھانہ بھون' گنگوہ' بوڑھانہ وغیرہ قصبات میں بے شمار مشاہیر ملتے ہیں اور مسلمانوں کی تخصیص نہیں ہندوؤں میں ایسے ایسے جید جید بزرگوں کے نام پائے جاتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے' میر۔۔۔ کتب خانے میں کئی قلمی کتب کاندھلے کے ہندوؤں کی تحریر کردہ ہیں اور مجھے حیرت ہے کہ اب تک کاندھلے کے ہندوؤں نے ان پر تحقیقی کام کیوں نہیں کیا؟

ایک دفعہ میں ایک کتاب ''بھگت مال از نارائن داس نابھاجی'' پڑھ رہا تھا اس کے صفحہ ۱۶ کی انیسویں سطر میں لکھا ہے کہ برندابن کے بعد اول ترجمہ لالہ لال جی داس صاحب نے ۱۲۵۸ھ میں بعد تحقیق از بیشنو داس نیرہ ''سوامی پریاداس شارح کے کیا اور بھگت اریسی'' نام رکھا یہ صاحب کاندھلہ کے رہنے والے تھے اور لچھمن داس کے نام سے بایام خدمت چکلہ داری وغیرہ نواح متھرا کے ان کو ست سنگ ہوا اور سیوک گادی ہت ہرنس جی اپاشک شری رادھابھ جی کے ہوئے' اور گورو سے لعلجی داس نام پایا' یہ ترجمہ ازبس صاف اور حسب قاعدہ اپاشنا کے سریع الفہم ہے اور بھگتی اور محبت مصنف کی عبارت ترجمہ سے مثل آفتاب روشن و ظاہر ہے۔ از بھگت مال از نارائن داس ص ۱۶/۱۹۔

اگر کسی اور نے یہ کام نہ کیا اور مجھے ذرا بھی فرصت مل گئی تو کاندھلہ کے ہندو مشاہیر میں خود لکھوں گا! مجھے جہاں قصبہ کاندھلہ کے مسلمان نمایاں دکھائی دیتے ہیں میں ہندوؤں میں بھی بزرگوں کی کمی نہیں پاتا۔

ایک مہوش

مختلف مشاعروں میں سیدہ اختر حیدر آبادی سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اس لیے وہ مجھے اور میں اسے اچھی طرح جاننے پہچاننے لگے تھے کوئی بڑا مشاعرہ ایسا نہیں تھا جس میں اختر حیدر آبادی صاحبہ حصہ نہ لیتی ہوں اس کے قیام وکلام سے سب متاثر تھے وہ نجی نشستوں میں بڑی آزادخیالی سے بات چیت کرتی تھی اور بعض بعض اوقات تو شاعروں کو ایسے ایسے جواب دیتی کہ وہ ہونٹ چاٹتے رہ جاتے اور سوچنے لگتے کہ اگر عورتوں کو اس قسم کی آزادی مل گئی تو مردوں کا ٹھکانا کہاں رہے گا۔ الغرض وہ شاعری کے ساتھ سوسائٹی کی نبض شناس بھی تھی اور پھر اس کا انداز کلام ایسا تھا کہ تالیوں سے مشاعرہ

گاہیں گونجنے لگتی تھیں۔

بنگلور میں ایک مشاعرہ غالباً اسی خاتون کے ایماو اہتمام سے منعقد ہوا اور میں مہمان کے طور پر خاں صاحب عبدالغنی کے حصے میں آیا۔ خان صاحب عبدالغنی عمر کے لحاظ سے پچپن ساٹھ کے پیٹے میں تھے سر پر بڑی سی پگڑی اونچی شلوار اور سادہ سا کوٹ ان کا لباس تھا حالانکہ ان کے نوکروں کی تنخواہیں ہزاروں تک پہنچتی تھیں۔ وہ بڑی بڑی چھاونیوں میں افواج کی کینٹینوں کے ٹھیکیدار تھے۔ بڑے امیر کبیر مگر نہایت سادہ اور شریف انسان انہوں نے چار بنگلے کرائے پر تو لیے ہوئے تھے مگر اپنا چارکڑی کا چھونپڑا تک نہیں بنوا سکے تھے۔

جب ان سے تنہائی میں گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے صاحب کمال انسان ہیں وہ سیروں کی مقدار میں سونا بناتے تھے اور پتھروں کو مختلف رنگ دیتے تھے انہوں نے مجھے وہ رنگ بھی دکھائے جن سے وہ زمرد، عقیق، نیلم، لہسنیا وغیرہ بناتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے رنگ پتھروں کے دل وجگر میں اترتے نظر آتے تھے۔

میں نے ان سے عرض کی ''خان صاحب جب آپ کے پاس یہ کمال موجود ہے تو یہ ٹھیکیداری کا قلادہ گلے میں کیوں ڈال رکھا ہے'' انہوں نے جواب میں کہا'' میاں احسان دانش میں نے کبھی ایک پیسے کا بھی سونا فروخت نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سونا اصل سونا نہیں ہوتا سونے کے رنگ اور نرمی سے ملتی جلتی ایک اور دھات بن جاتی ہے اور میں اس سے انگریزی قسم کے زیورات بنوا کر اس میں اپنے بنائے ہوئے نگینے جڑواتا ہوں اور پھر وہ بڑے بڑے افسران کی بیویوں کو پیش کرتا ہوں اور دیکھنے میں لاکھوں کی قیمت کے معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ سے وہ مجھے اچھے اور منافع بخش کام دیتے ہیں۔ جن سے مجھے اچھا خاصا فائدہ ہوتا ہے لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ میں کیمیا گر ہوں لیکن اس بات میں کوئی حقیقت نہیں اصل بات وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔

البتہ بہت سی دھاتوں کا کشتہ کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ایک اور فن بھی ہے لیکن اس میں بڑی محنت پڑتی ہے موجودہ کیمیا گری کے لیے تو میں نے دو آدمی کوٹنے چھاننے کے لیے رکھے ہوئے ہیں وہ سب کام کر لیتے ہیں اس سے زیادہ کی مجھے ضرورت بھی نہیں۔''

میں نے کہا'' جناب اگر کل آپ کو ٹھیکے ملنا بند ہو جائیں اور گوشت وغیرہ کی سپلائی کا شکار نہ

ملے تو کیا ہوگا۔'' خان صاحب نے بڑے اعتماد کے لہجے میں کہا'' میرا خدا تو کہیں نہیں گیا اور مجھے ان تمام کاموں سے اچھا کام بھی آتا ہے جس کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ اس میں محنت زیادہ کرنا ہوتی ہے مجھے جب زیادہ رقم درکار ہوتی ہے تو میں وہی کرتا ہوں۔''

میں: وہ کیا فن ہے صاحب فرمائیے تو سہی۔

خان صاحب: میں بمبئی یا جے پور جا کر ہیرے کی کان پر سے اترا ہوا چورا یا غبار لے آتا ہوں اور اسے ایک خاص ترکیب سے آنچ دے کر ہیرا بنا لیتا ہوں اور فروخت کر لیتا ہوں اس میں کوئی دھوکا یا بے ایمانی بھی نہیں اور کام بھی ہو جاتا ہے۔''

میں: ایسے ایسے قیمتی فن آپ نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟

خان صاحب: مختلف فن مختلف طریقوں سے لیے ہیں۔ پہلے پہل میں نے ایک آدمی سے سنا کہ فلاں صراف کے وہاں کوئی ایک تولہ چاندی روز فروخت کرتا ہے میں نے اس سے حصول فن کی ترکیب یہ کی کہ چھ ماشے سونا روز اسی دکان پر فروخت کرنے لگا۔ صراف نے اس کیمیا گر سے ذکر کیا کہ آپ ایک تولہ چاندی روز لاتے ہیں اور ایک شخص چھ ماشے سونا روز بنا کر بیچ جاتا ہے۔ اس نے اسی وقت سے میری تلاش شروع کر دی اور چار پانچ روز کی تگ و دو میں مجھ سے آ ملا اور بصد منت اپنی آرزو کا اظہار کیا میں نے جواب دیا کہ پہلے اپنا نسخہ بتائیں اور میرے ہاتھ سے بنوائیں تو پھر میں بھی عرض کر دوں گا اس نے قول قسم کے بعد اپنا نسخہ بتا دیا اور میرے ہاتھ سے ایک تولہ چاندی بنوا بھی دی پھر میں نے بھی سچ سچ کہہ دیا کہ میں تو آپ کا نسخہ معلوم کرنے کے لیے چھ ماشے سونا روز فروخت کرتا تھا آپ کا شکریہ آپ کا نسخہ ہے تو درست مگر اس میں محنت زیادہ اور معاوضہ کم ہے اس لیے یہ نسخہ میرے کام کا نہیں۔

اس کے بعد خان صاحب اٹھے اور ایک قلمی کتاب اٹھا لائے مجھے دیتے ہوئے کہا اس کتاب میں ہر قسم کا سونا بنانے کی ترکیبیں درج ہیں اور سب درست ہیں میں اسی کتاب سے سب کام کرتا ہوں۔''

وہ کتاب پالی زبان میں تھی جو میرے پلّے تو نہیں پڑتی تھی لیکن خان صاحب اسے سمجھتے تھے انہوں نے مجھے آتے ہوئے کئی کشتے عنایت فرمائے تھے جو غالباً اب تک میرے پاس موجود ہیں لیکن

یہ یاد نہیں رہا کہ وہ کن کن امراض کے لیے ہیں اس لیے بیکار ہیں۔

میں نے خان صاحب سے ذکر کیا میرے والد صاحب کو بھی یہ جنون تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اصل سونا نہیں بنتا کیونکہ یہ دھات مرکب نہیں مفرد ہے جو سونا بنانے کا دعویٰ کرتا ہے وہ غلط ہے خان صاحب نے کہا انہوں نے اپنی جگہ درست کہا ہے میں نے بھی عرض کر دیا کہ میرا سونا خالص سونا نہیں ہے اس لیے بازار کے قابل نہیں۔''

خان صاحب سے دوبارہ ملنے کی آرزو ہی رہی مگر ملاقات نہ ہو سکی وہ ایک سچا اور بے لوث قسم کا درویش منش تھا۔ اس سے سیکڑوں غریبوں اور ناداروں کو امداد ملتی تھی۔

میری نظر سے کئی مہوس گزرے لیکن خاں صاحب عبدالغنی جیسا بھلا انسان پھر نظر نہیں پڑا۔ وہ امیر اور دولت مند ہونے کے باوصف سیدھی سادی زندگی رکھتا تھا اور اس کا تمام کاروبار اختر حیدر آبادی سنبھالتی تھی نہ جانے دونوں کی روحوں میں کون سی شے زنجیریں ڈالے ہوئے تھی حالانکہ دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ابھی چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے کہ ایک شخص حکیم چراغ نامی میرے مکان کی پشت پر دہلی مسلم ہوٹل میں آکر اترا اس کے ساتھ بیوی بچے بھی تھے اس کے متعلق لوگوں میں کیمیا گری کی افواہ ہے لیکن مجھے ان لوگوں کا نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا شاید اس لیے کہ سونا بننا میرے یقین سے باہر کی بات ہے۔ جو اس قسم کے تماشے دکھاتے ہیں میں انہیں شعبدے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

دوسرے روز میرے ایک شناسا اقبال احمد صدیقی بوکھلائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ''میاں آپ کے پچھواڑے والے ہوٹل میں ایک بڑا باکمال انسان آیا ہے۔ میں نے پوچھا ''کون ہے کیا کمال رکھتا ہے؟'' فرمانے لگے' میری موجودگی میں اس نے اپنے دوست ایک وکیل کو جو اس کے مقدمات کی پیروی کرتا ہے کہا کہ جاؤ بازار سے کوئی لوہے کی کیل لے آؤ وہ بازار گیا اور ایک بڑی ٹوپی دار کیل لے آیا۔ حکیم صاحب نے اسے انگیٹھی پر رکھ کر سرخ کیا اور ذرا سی اکسیر ڈال کر سونے کی بنا دی اور بازار میں فروخت کے لیے بھیج دی۔

ایک ملاقات میں میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ جناب یہ شعبدہ ہے تو خوب مگر میں ابھی شیو کے لیے بلیڈ لایا ہوں ایک بلیڈ کو سونا بنا دیجیے اس نے کہا جناب مجھے امتحان دینے کی ضرورت نہیں

لیکن لائیے اسے انگیٹھی میں رکھئے میں نے ایک بلیڈ اپنے ہاتھ سے انگیٹھی میں آگ پر رکھ دیا جب وہ سرخ ہوگیا تو حکیم صاحب نے خشخاش کے برابر اکسیر ڈال دی اور بلیڈ سونے کا ہوگیا یہ دیکھیے سونا ہے یا نہیں؟

میں نے دیکھا تو بلیڈ سونے کا تھا لیکن مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا اور میں جناب اقبال صدیقی کی طرف سے بدگمان ہوگیا اور جب میں نے اپنی بدگمانی کا اظہار کیا تو انہوں نے فن کیمیا گری پر تقریباً پون گھنٹہ تقریر کی اور آخر میں کہا کہ ایمان تو میرا بھی یہی تھا جو آپ کہہ رہے ہیں لیکن میں اپنے مشاہدے کو کیسے غلط سمجھ لوں یہ کوئی خواب تو نہیں بے داری کا واقعہ ہے۔ میں اس شخص کا پیچھا ضرور کروں گا اور آپ کو اس کے صحیح حالات بتاؤں گا اس کے باوصف میری بدگمانی دور نہیں ہوئی اور میں ان کے آخری فقرے کو بھی اس کی ایک کڑی خیال کرتا رہا۔

ہفتے عشرے کے بعد اقبال صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے ''سنئے جناب اس شخص پر تو لوگوں نے مقدمے دائر کر رکھے ہیں کسی نے سونا بنانے کے لیے پانچ سو روپے دئے کسی نے سات سو کسی نے ہزار اور حکیم صاحب ہر جگہ سے روپیہ لے کر فرار ہوگئے۔ کسی کو سونا بنا کر نہیں دیا۔ حیرت ہے کہ ایسا باکمال مہوس اور اس قسم کے مقدمات! نہ جانے کیا چکر ہے یہ! اسی تحقیق وتفتیش میں اقبال صدیقی صاحب حج کو چلے گئے۔ واپس ہوئے تو ان کی جستجو کا انجام معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کن منزلوں میں ہیں اور کیمیا میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

اقبال صاحب شاعر بھی ہیں اور بہت اچھا شعر کہتے ہیں اور شاعر سے زیادہ میں انہیں ایک اچھا مسلمان خیال کرتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ تبلیغ کے سلسلے میں مجھے بھی رگید دیتے ہیں اور میں سر جھکائے سنتا رہتا ہوں۔ خدا ان کے نیک اعمال اور تبلیغ کی سعی کو قبول فرمائے آمین ثم آمین!

موقع پرست طالب علم

اب مجھے لوگ شاعر کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ ایک دن میں ''قصور'' کے ایک جلسہ سے واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک نوجوان عبدالنادر نامی سے تعارف ہوا۔ اس کے ساتھ محمود علی صاحب بھی تھے جو اچھے پڑھے لکھے اور علمی طور پر قابل قدر معلومات کے حامل نظر آئے۔ عبدلنادر

نے میرا نام معلوم کر کے کہا ''چلو آج کا سفر اچھا رہے گا۔ احسان صاحب سے باتیں ہوں گی۔'' میں نے کہا ''میں باتوں کا آدمی نہیں ہوں کیونکہ میں علم کی طرف سے کورا ہوں اور مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہوں کسی صاحب علم و فضل سے ملتے تو شاید سفر اچھا گزرتا۔ مجھ سے باتیں کرنے میں کیا ملے گا؟'' اس پر محمود علی صاحب نے مجھ سے کہا ''جناب ان سے باتیں کرنے میں آپ کو بہت کچھ ملے گا۔'' میں نے کہا ''سبحان اللہ! یہ بات ہوئی۔'' قصور سے لاہور تک عبدالنادر سے باتیں تو ایسی زیادہ نہیں ہوئیں لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ وہ طالب علم' اچھا اور ذہین قسم کا نوجوان ہے۔ اسے علم کی تشنگی ہے اور وہ کسی عالم میں بھی مایوسانہ تصورات کے نزدیک نہیں جاتا۔ وہ میرے مکان تک ساتھ آیا اور پھر آمد و رفت شروع ہو گئی ہر ملاقات پر اس میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک دن عبدالنادر نے کہا ''میں نے میٹرک تو کر لیا ہے چاہتا ہوں کہ کس طرح بی اے کر لوں مگر حالات اجازت نہیں دیتے۔ ہمارے ملک میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو تعلیم کے لیے قرض دے دے۔'' میں نے کہا ''کون کہتا ہے کہ ایسا ادارہ نہیں۔ یہاں تو ایسے ایسے ادارے سننے میں آئے ہیں جو قرض نہیں ویسے ہی تعلیم کے مصارف دے دیتے ہیں۔''

عبدالنادر: وہ کون سے ادارے ہیں۔ کہاں ہیں۔''

میں: مثلاً شیعہ صاحبان ہیں سنا ہے کہ انہوں نے اپنی جماعت کے لیے ایسا انتظام کیا ہے کہ اگر چاہیں تو ساری عمر تعلیم حاصل کرتے چلے جائیں اور روپیہ کی ادائیگی کا انحصار بعد کے حالات پر ہوتا ہے۔''

عبدالنادر: اچھا معلوم کروں گا۔ میرا کام تعلیم کے بغیر نہیں چلے گا۔'' میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جس طرح بھی ہو گا تعلیم حاصل کروں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد عبدالنادر چلا گیا اور پندرہ بیس روز کے بعد ملا۔ ملتے ہی اس نے سب سے پہلے یہ کہا احسان صاحب میں آپ کا ممنون ہوں کام ہو گیا ہے۔ میں شیعہ ہو جاؤں گا۔ ایک صاحب نے مجھے ایف۔ اے میں داخل کرا دیا ہے۔''

میں: خدا کا شکر ادا کرو اور دل سے تعلیم حاصل کرو مجھے اپنے حالات سے اطلاع دیتے رہنا۔''

عبدالنادر: ہاں ہاں کیوں نہیں' ضرور ضرور۔''

اس کے بعد وہ مجھے گاہے گاہے ملتا رہا میرا خیال تھا کہ یہ راستے پر لگ گیا ہے۔ مگر باتیں کرنے

سے معلوم ہوا کہ شیعیت کی تعلیم و تبلیغ نے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑا' وہ تو کچھ پھسلے ہوئے سے مشرب کا آدمی ہے۔

شیعیت کے بعض ایسے دھندلے پہلو اس کے سامنے آ گئے تھے جن سے وہ مطمئن نہ تھا اور ان کے خلاف مسلسل بکارتا۔ بات صرف لہجے کی تلخی تک ہی نہ رہی بلکہ بعض اوقات اس کی گستاخی اس مقام تک آ جاتی کہ وہ ناقابل برداشت ہو جاتا اور میں اسے برا بھلا کہہ کر خاموش کرتا' کیونکہ بحث میں جواباً کچھ ایسے الفاظ بھی منہ سے نکل جاتے ہیں جس سے گناہگار ہو جانے کا احتمال ہونے لگتا ہے۔

کچھ عرصہ تک عبدالنادر مجھ سے نہیں مل سکا۔ ایک دن اچانک خط آیا ''میں ایف اے میں پاس ہو گیا ہوں مگر اب میری تعلیم کا انتظام ہوتا نظر نہیں آتا لہذا میں نے قادیانی ہو جانے کی ٹھانی ہے کچھ گفتگو ہو چکی ہے کچھ ہو جائے گی۔ انشاء اللہ چند روز میں بی اے میں داخلہ لے لوں گا۔ ذرا فرصت ملی تو حاضری ہو گی۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ عجیب قسم کا انسان ہے اس کی رفتار یہی رہی تو نہ جانے کہاں جا کر دم لے گا اور آخر میں نہ جانے کیا مذہب اختیار کرے گا۔ چنانچہ اس نے کالج سے بی اے کیا اور پھر غائب عرصہ تک کوئی پتا نہ چلا کہ کہاں چلا گیا۔ خیال ہوا کہ کہیں ملازم ہو گیا ہو گا۔ لیکن اچانک ایک روز خط آیا ''بعض وجوہ کی بنا پر آپ سے نہ مل سکا مجھے مرزائیت بھی راس نہ آئی کیونکہ وہاں بھی انسان دشمنی اور تعصب کا سبق دیا جاتا ہے اور میرا یہ مشرب نہیں۔ میں تو انسانیت کو عزیز رکھتا ہوں۔ میں اسی گڑ بڑ میں لاہور چھوڑ کر لکھنو آ گیا ہوں۔ یہاں لال باغ میں بپتسمہ لے کر لائبریرین کلاس میں داخلہ لے لیا ہے یعنی عیسائی ہو گیا ہوں۔''

جب اس کا یہ خط آیا تو کئی دوست بیٹھے ہوئے تھے میں نے اس کا سارا واقعہ سنایا۔ سب لوگ حیران رہ گئے اور کہنے لگے ''عجیب و غریب آدمی ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''علم تو اسی طرح حاصل ہوتا ہے۔'' دوسرا بولا ''یہ لامذہب ہو جائے گا' کسی نے کہا۔ نہیں یہ ہمیشہ مسلمان رہے گا لیکن میرا خیال تھا کہ جس مذہب کی عورت سے شادی کرے گا وہیں رک جائے گا کیونکہ اس کا جنسی ذخیرہ متعفن تھا غرضیکہ کسی نے گالی دی اور کسی نے سراہا اور دیر تک اس کے مہمات بحث و مباحثہ کا موضوع

بنے رہے۔

لیکن شاید اب اس کی عمر ایسی ہوگئی تھی جب اچھے دستکار اور آرٹسٹ صحیح زندگی کی طرف چل پڑتے ہیں چنانچہ عیسائیوں نے اس کی نفسیات کا مطالعہ کرلیا' جو عبدالنادر نے لائبریری کا کورس ختم کرکے ایک عیسائی معلمہ سے شادی رچالی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اہل وعیال سمیت راولپنڈی چلا آیا اور اب وہیں کسی لائبریری میں لائبریرین ہے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

اب بھی اس سے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ اس کی وہی ادائیں چلی آتی ہیں اس نے کبھی کوئی علمی بات نہیں کی اور شاید اس کے پاس علمی موضع سخن ہے بھی نہیں' ہاں تفریح کے لیے وہ بہترین قسم کا انسان ہے میرا خیال تھا کو وہ کبھی جب سکون پائے گا تو اپنی زندگی کے تجربات دنیا کو دے گا جو پس ماندہ طبقے کی تعلیم وترقی میں ممدومعاون ثابت ہوں گے' لیکن افسوس کو میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور عبدالنادر ایک ٹھس سکے کی طرح رہ گیا' جو پتھر اور فولاد سے ٹکرا کر بھی آواز نہیں دیتا۔

وہ اب صرف نام کا عبدالنادر ہے وہ زندگی کو تفریح سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا وہ کہتا ہے۔

''جب ہم زندگی کا سیاق وسباق معلوم نہیں کرسکتے تو عمر کو تذبذب میں کیوں ڈالیں جنت کی آرزو اور دوزخ کے خوف کا علاج نہ عبادت ہے نہ اطاعت اور عقل کی رسائی میں یہ راز کبھی آئے گا بھی نہیں۔''

کائنات بہت وسیع ہے اور انسانی عقل محدود' کاش اس عبدالنادر کے دل میں انسانی ہمدردی جگہ لے لیتی اور وہ تقسیم علم کی عظمت سے واقف ہوجاتا' مگر مجھ سے اس قدر دور ہے کہ روز ملنا جلنا ناممکن' اور جب تک مسلسل نشست وبرخاست نہ ہو تصورات ونظریات پر سیر حاصل تبصرہ کیسے ہوسکتا ہے۔ خود کو دوسروں کے سینوں میں ڈال دینا آسان بات تو نہیں۔

حکیم حافظ محمد بخش صاحب

جناب نازش ایڈووکیٹ کے توسل سے حکیم حافظ محمد بخش صاحب سے بھی ملاقات ہوئی ان کی عمر ستر کے لگ بھگ ہوگی۔ چھ سات زبانوں کے ماہر' ارسطوئے فطرت اور لقمان حکمت تک کہدوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ طب سے قطع نظر منطق فلسفہ' فقہ' حدیث' اور نجوم کے ساتھ ساتھ تاریخ عالم

پر نظر اور تحقیق مذاہب کے شناور کے علاوہ علم طبیعات پر بھی ان کی گہری نظر ہے میں حیران تھا کہ اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ایسا صاحب علم و فن چھپا پڑا ہے تقسیم علم میں ان کا یہ عالم کہ اگر ان کے شاگردوں کا تذکرہ لکھا جائے تو اچھی خاصی کتاب ہو سکتی ہے سیاسی جنون کا یہ عالم کہ سنت یوسفی بھی ادا کر چکے ہیں یوں تو ان کی شہرت پنجاب' سندھ' بلوچستان' غزنی اور قندھار تک پھیلی ہوئی ہے لیکن درویش منش اور گوشہ نشین انسان ہیں حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مقامی لوگ بھی عزت سے ان کا نام لیتے ہیں جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان کا مطب ایک نیم خیراتی ادارے کی طرح ہے وہ مریضوں سے ایسی واجبی قیمت لیتے ہیں کہ شاید ہی کوئی اس طرح خدمت خلق کرتا ہوگا۔

ان کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے اچھے اور اصیل شاگردوں کا نام بھی احترام سے لیتے ہیں بلکہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں وہ مریضوں سے نذر و نیاز بھی قبول نہیں کرتے اور ہزاروں روپے ٹھکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ میرا نہیں غریبوں اور مسکینوں کا حق ہے۔ خاندانی طور پر بھی وہ علمی سلسلے کے فرد ہیں۔ ان کے والد حافظ میاں جلال الدین صاحب سیال شریف ضلع سرگودہا کے رہنے والے تھے اور حکیم حافظ محمد بخش صاحب وہیں پیدا ہوئے ان کے دو بھائی اور بھی ہیں۔ حافظ احمد بخش اور واحد بخش جو ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر مڈل سکول ہیں اور زمینداری کرتے ہیں۔ حافظ جلال الدین کا سلسلہ نسب قطب شاہی کے کھوکھر قبیلے سے ملتا ہے انہوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر آٹھ ہزار حافظ قرآن بنائے تھے غالباً یہی سبب ہے کہ حکیم محمد بخش صاحب کے ہاتھ میں شفا' زبان میں تاثیر اور تشخیص و تجویز میں صداقت ہے ان کے دو دو چار چار آنے کی دوا پینے والے مریض بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیبوں سے کم تعداد میں شفایاب نہیں ہوتے اور ان کے شاگردوں کا بھی یہی عالم ہے۔

حکیم اللہ بخش: یہ حکیم محمد بخش صاحب کے مطب میں مہتمم ہیں اور حکیم صاحب ان کی ایمانداری اور وفا کے معترف ہیں انہیں کشتہ سازی اور تجویز میں شغف ہے۔

حکیم صالح محمد: یہ بھی حکیم صاحب کے ایسے شاگرد ہیں جن پر حکیم صاحب کو ناز ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں مطب کرتے ہیں اور کشتہ سازی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حکیم صوفی فیض اللہ صاحب: یہ بھی کراچی کے مشہور طبیب ہیں اور اپنے فن طبابت کے باعث ہر

دل عزیز ہیں۔
حکیم سراج الدین صاحب: فورٹ سنڈے من (بلوچستان) میں طبیب ہیں نوجوان ہیں مگر علم الابدان پر قابل رشک عبور ہے۔
حکیم رحیم بخش صاحب: شجاع آباد (ملتان) میں مطب کرتے ہیں ان کی مشق و مزاولت اور شہرت سے حافظ حکیم محمد بخش صاحب بہت خوش ہیں اور عزت سے نام لیتے ہیں انہوں نے فن کشتہ سازی حکیم محمد بخش صاحب ہی سے حاصل کیا تھا۔

غریب محمد

غریب محمد یوں تو مظفر نگر کے معمولی لوگوں میں تھا لیکن اس کے رہن سہن کا طرز و طریق اور زندگی کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ سب لوگ جہاں عزت کرتے وہیں کانپ بھی کھاتے تھے۔ کیونکہ غریب محمد سے قطع نظر اس کے دوسرے بھائی بڑے قوی ہیکل مگر نہایت شریف اور خاموش انسان تھے وہ جہاں انصاف کا خون ہوتا ہوا دیکھتے وہ ہندو ہو یا مسلمان عیسائی ہو یا پارسی اس کی امداد میں خون پسینہ ایک کر دیتے تھے۔

غریب محمد مظفر نگر کے محلہ کھالہ پار میں ٹال کرتا تھا اور شاید جنگل کے درخت بھی خرید کر عمارتی لکڑی اور سوختہ الگ الگ فروخت کرتا تھا کیونکہ اس کی ٹال میں جہاں چولھے کا ایندھن ملتا تھا وہیں شہتیر اور کڑی برنگے وغیرہ بھی ملتے تھے آئے دن اس کے یہاں گیلی لکڑیوں کے چھکڑے آتے رہتے تھے اور اس بار برداری پر اس کا بھائی نورو متعین تھا اور اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ شہر سے پانچ میل باہر اس کا بیل بیٹھ گیا۔ اول تو اس نے ادھر ادھر سے دوسرا بیل مہیا کرنے کی کوشش کی لیکن جب بیل دستیاب نہ ہوا تو اس نے کمزور بیل کو تو چھکڑے سے پیچھے باندھ دیا اور اس کی جگہ خود چھکڑے میں جت گیا۔ شہر تک آتے آتے وہ پسینے میں شرابور تو ہو گیا اور اس کی سانس دھنکنی کی طرح تو بولنے لگی لیکن وہ بیل کی جگہ جت کر پانچ میل گیلی لکڑیوں سے بھرا چھکڑا لے آیا۔ اس پر غریب محمد نے اسے برا بھلا بھی کہا لیکن وہ مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ ایک دفعہ غریب محمد کہیں گاہکوں سے روپیہ وصول کرنے گیا ہوا تھا۔ اس کی جگہ نورو ٹال پر لین دین کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک پہلوان دوست

آ گیا نورو کام نمٹا کے اس کے پاس آ بیٹھا میں ان سے دور چھپر میں بیٹھا تھا نہ جانے کیا بات ہوئی کہ آپس میں وزن کی تلائی تک بات آ گئی پہلوان کہتا تھا کہ مجھ میں وزن زیادہ ہے۔ نورو کہتا تھا کہ تیرا بدن پھیر میں زیادہ ضرور ہے مگر وزن میں تو مجھ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ پہلوان نے کہا اگر تیرا یہ خیال ہے تو کچھ شرط لگا اور سامنے لکڑی تولنے والے کانٹے پر آ جا پھر جسے دے مولا۔ دس دس روپے کی شرط ہو گئی لیکن جب دونوں تک کے پلوں میں بیٹھے تو نورو پہلوان سے ڈھائی تین سیر کم نکلا تالیاں بج گئیں اور نورو نے بہ اطمینان آنٹ سے دس روپے نکال کر پہلوان کے حوالے کر دیئے اور ہارے جواری کی طرح خوش خوش بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد پیشاب کے بہانے سے باہر نکل گیا اور دیکھتے دیکھتے پھر وہیں آن بیٹھا۔ پہلوان بڑا خوش تھا کہ آج نورو کو دس روپے کو چت کر دیا۔ جب پہلوان چلنے لگا تو نورو سے طنزاً کہا "میاں نورو پھر کسی کے ساتھ ایسی شرط نہ بدنا۔ نورو نے جھلا کر جواب دیا کہ اگر کپڑے اتار کر خالص بدن کا وزن کرے تو میں تجھ سے ہی دوبارہ شرط کے لیے تیار ہوں۔ پہلوان نے کہا اب کی بار دس کی نہیں پچاس پچاس روپے کی شرط ہو گی نورو نے کہا منظور! آ جاؤ پہلوان گھر جاتے جاتے واپس آ گیا اور دونوں نے کپڑے اتار کر آز بند باندھ لیے لکڑیوں کے خریداروں اور آنے جانے والوں کا ہجوم ہو گیا اور پہلوان نورو کے ہاتھ پکڑ کے کانٹے کے قریب لے آیا کیونکہ اس نے تھوڑی دیر پہلے اس سے دس روپے جیتے تھے مگر نورو خاموش تھا جیسے اس نے شرط بد کر غلطی کی ہے۔ آخر کار دونوں تک کے پلڑوں میں بیٹھ گئے لوگوں کی حیرت کی حد نہ رہی جب دیکھا کہ نورو کا پلہ زمین پر ٹکا ہوا ہے اور پہلوان کا زمین سے فٹ بھر اوپر ہے پہلوان کو کھسیانا ہو کر پچاس روپے دینا پڑے۔

میں نے نورو سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں یہاں سے اٹھ کر جو باہر گیا تو سامنے والے حلوائی کی دکان سے سات سیر دودھ پی آیا تھا اس کے یہاں اس سے زیادہ دودھ تھا ہی نہیں لیکن میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اب اپنے یار سے ہر حالت میں بجل رہوں گا کپڑے اتارنے کا ایک دھوکا تھا جس پر پہلوان چاروں خانے آیا۔

لیکن میں یہاں صرف اس کے ایک واقعے پر اکتفا کروں گا غریب محمد کی ٹال کے باہر والے حلوائی کی دکان پر کوئی ورزشی آدمی اپنے لیے ایک بادیہ میں دودھ جلیبیاں رکھوا گیا لیکن کسی وجہ سے

اسے آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ نورو گھر سے شام کا کھانا کھا کر نکلا اور تفریحاً حلوائی کی دکان پر جا کھڑا ہوا اور دل لگی کے طور پر حلوائی سے کہا کہ میں گھر سے کھانا کھا کر آیا ہوں اگر یہ بھرا ہوا بادیہ کھا جاؤں تو مجھے تو کیا دے گا؟ حلوائی نے کہا دو روپے اور دودھ جلیبیاں مفت مگر پورا بادیہ کھانے کی شرط ہے اس ردوقدح میں اچھا خاصا ہجوم ہوگیا نورو نے بادیہ اٹھا کر منہ سے لگالیا اور ایک سانس میں سب ملغوبہ پی گیا جب خالی برتن حلوائی کی طرف سرکایا تو اس نے کہا جناب یہ مٹی کا تولا بھی تو اسی کے ساتھ ہے میں تو دو روپے اس وقت دوں گا جب یہ بھی کھالیا جائے گا نورو نے شیخی میں آ کر وہ جنگی پیالا اپنی طرف کھینچ لیا اور الٹا کر کے اس پر ایک مکا مارا اور کرچی کرچی کر کے ریوڑیوں کی طرح کھا گیا۔ حلوائی نے دو روپے نکال کر دے دیے!

گھر جا کر نورو کو تکلیف محسوس ہوئی طبیبوں اور ڈاکٹروں نے اپنی سی بہت کی مگر نورو نے صبح تک دم دے دیا۔

جو لوگ اپنی توجہات اپنے ظاہری محاسن اور انفرادی قوت رکھتے ہیں وہ زندگی کی عظمت اور قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے وہ اپنی بہترین صلاحیتوں اور اعلیٰ قوتوں کو نامناسب جگہوں پر صرف کر کے ہاتھ ملتے ہیں اور یہ نتیجہ ہوتا ہے لڑکپن کی غلط روی اور بے جا حوصلہ افزائی کا۔

نورو کے انتقال کے بعد غریب محمد بھی لاغر ہوتا چلا گیا جیسے ہڈیوں کی دق میں مبتلا ہوگیا ہو ایک دن اسے ذرا قبض کی شکایت ہوئی اور کسی نیم حکیم نے اسے مسہل کا نسخہ تھما دیا اس کے ٹال میں بیٹھنے اٹھنے کا کمرہ تو دروازے کے قریب تھا اور دور ٹال کے ایک کونے میں بیت الخلا تھا۔ دن کے گیارہ بجے ہوں گے غریب محمد بیت الخلا گیا اور آ کے کہنے لگا احسان میاں مجھے کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا ہے نجانے کیا بات ہے؟ میں نے کہا شاید دستوں کی دوا یا کمزوری کا اثر ہو وہ سن کے خاموش ہوگیا اور پھر رفع حاجت کے لیے چلا گیا واپس آ کر پھر وہی شکایت کی ہر چیز دھندلی نظر آ رہی ہے میں نے کہا دھوپ سے آئے ہو آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ وہ لیٹ تو گیا مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا کچھ دیر کے بعد وہ پھر ہڑبڑا کر اٹھا پاخانے کی طرف چل دیا مگر اب کی بار اس نے مجھے ٹٹی کی دیوار سے آواز دی میں گیا تو غریب محمد رو کر مجھ سے لپٹ گیا اور پگھلے پگھلے الفاظ میں کہا احسان اب مجھے کچھ نظر نہیں آتا میرا ہاتھ پکڑ کے کمرے میں لے چلو۔

دوسرے دن اس کی آنکھوں میں درد شروع ہوا اور ہزار کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بیٹھ گئیں جیسے دو پھنسیوں میں شگاف دے دیا گیا ہو اب غریب محمد ایک زندہ لاش کی طرح رہ گیا تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنی لکڑی کی تجارت سے غافل نہیں ہوا لیکن اب گلی محلے میں اس کی وہ پہلی ہوا نہیں رہی تھی نورو کے انتقال کے بعد غریب محمد کا شباب ڈھل گیا تھا وہ بھائی کی جدائی کے صدمے کی تاب نہ لا سکا اس نے بڑی تیزی سے زندگی کا سفر طے کر لیا۔ جیسے چشمے کے آس پاس کی برف پگھل کر بہ جاتی ہے اور اس کے وجود کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔

غریب محمد کوئی متقی اور پرہیز گار انسان نہیں تھا مگر وہ زندگی بسر کرنا جانتا تھا معذوری کی صورت میں بھی وہ تمام تمام دن لکڑیوں کے گاہک بناتا پھرتا تھا اس کے بعد جب میں وفاداری کی ٹوہ میں اس قسم کے لوگوں سے ملا تو ان پر افسوس ہونے کے بجائے خود پر غصہ آیا اور فوراً ماحول پر نظر ڈالنا پڑی کہ اس دوستی کے شر سے کس رخ پر محفوظ رہ سکوں گا۔ میرا خیال تھا کہ جب روحیں حلف اٹھاتی ہیں تو مشکلات اور مستقبل کی پیچیدگیوں کا حل خود بخود نکل آتا ہے۔ لیکن میرا یہ تصور غلط رہا اور سمجھ میں یہ آیا کہ محاسن کو انسان ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے جہاں ماحول کا اثر انسانی کردار کو بدل دیتا ہے وہیں خون کے اثرات بھی اپنی خصوصیات سے عاری نہیں ہوتے گرد و پیش کے خودرو سیاسی اور معاشی حالات کے ساتھ جبلی راہیں بھی اپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہتیں اور انسان میں یہ تغیرات خود بخود ہوتے ہیں۔

ایک انسانی نظریہ

آزادی ملک سے پہلے میرے دوستوں کی ایک سوسائٹی کا نظریہ یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر ملت ہی نہیں ہر فرقے کا پیشوا یہ مقصد لے کے اٹھتا ہے کہ دنیا میں اتفاق و اتحاد ہو۔ ہر بڑے ادیب اور بڑے شاعر کا یہ نظریہ رہا ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک کے افراد اتحاد اور محبت سے مل جل کر رہیں اور سب کے اچھے نظریات لے کر ایک معاشرے کی تشکیل کی جائے جو زندگی کی بین الانسانی ضرورتوں کا حل ہو اور تمام معاشروں کی اقدار مشترک منظم ہو کر انسان کی فطری ضرورتوں کو فطری ذرائع سے پورا کریں۔

ایسی تحریکوں میں یوں تو ہر مذہب کے پیشواؤں نے اس درس کو جز و حیات بنایا ہے لیکن اس میں زیادہ حصہ صوفیوں درویشوں اور ان کے ماننے والوں کا ہے ان کے بعد معیاری شاعروں اور ادیبوں نے کسی تبلیغ و تحریص کے بغیر اپنے فطری اور روحانی اشتراک سے کلام اور تحریروں کو ذریعہ بنا کر اس نظریے کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور قریب قریب سب کا یہی منشا رہا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک برادری کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں جبکہ تمام کائنات کے انسان ایک ہی خدا یا ایک ہی فطرت کی پیداوار ہیں۔ آخر الگ الگ رہ کر خیالات کی یکجائی اور روحانی آرزوؤں کو منتشر کیوں کریں۔

یہ بھی غلط نہیں کہ جو لوگ فرقہ بندی کرتے ہیں ان کے پیش نظر بھی انسانی بہبود ہوتی ہوگی لیکن وہ اس بہبود کو عام انسانوں کے لیے کیوں لازم نہیں سمجھتے اس فرقہ داری سے یہ تو ممکن ہے کہ ایک مخصوص اور مختصر جماعت کو اس علیحدگی سے کچھ دنیاوی فائدہ پہنچ جاتا ہو لیکن یہی چیز بڑھ کر انسانی برادری کے ٹکڑے کر ڈالتی ہے اور پھر انسان اپنے مقصد تخلیق تک نہیں پہنچتا بلکہ مختلف نظریات کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور دین ہو یا دنیا اس کی نظر میں اول تو اجاگر ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو صرف جزوی طور پر۔

اسی انتشار خیالات و نظریات نے پھیل کر انسانوں میں نفرت، عداوت، پستی، بلندی اور سیکڑوں امتیازات کی دیواریں اٹھا دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کہیں کسی طرف دو تضاد ٹکراتے ہیں تو جنگ کی صورت نکل آتی ہے اور اس قسم کی جنگ میں بربریت اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ درندے دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے ہیں۔ انسانوں کے نظریات کی جنگ میں لاکھوں کروڑوں بے خطا معصوم انسان موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں جن کے حشر و نشر کے متعلق دعوے سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اور یہ فتنہ ایک قائد یا رہنما، لیڈر یا سربراہ قوم کا برپا کیا ہوا ہوتا ہے یہ بھی درست ہے کہ جنگ میں مرنے والوں یا بلووں میں کام آ جانے والے معصوموں کا خون سربراہ کی گردن پر ہوتا ہے اور بعض اوقات تو سربراہ کو بھی عبرت ناک سزا ملتی ہے لیکن سوچا جائے تو اس شگوفے کی شاخ وہی افتراق کا نظریہ ہے اور پیشوایان تمدن ہی ان تمام خونریزیوں کے نقطہ تخلیق قرار پاتے ہیں۔

حالانکہ اگر تمام پیشوا یا قائد یا رہنما ایک ہو جائیں تو دنیا انسانوں کے لیے جنت بن جائے

جس کی تلاش و آرزو میں یہ تمام شوشے لگائے جاتے ہیں اور نتیجہ انتظار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آج بھی اگر طاقتوں کے ناجائز اختلاف اور ناروا توسیعات کے حامیوں کے احاطوں سے علیحدہ ہو کر تجزیہ کیا جائے تو ہر معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے آدمی کی یہ خواہش نہیں یا اس کا فطری تقاضا یہ نہیں کہ تمام انسان مل جل کر ایک باپ کی اولاد کی طرح رہیں اور شیر و شکر ہو کے زندگی بسر کریں اور مار دھاڑ کشت و خون اور آپس کی چیخ و پکار کا وجود نہ رہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا جنگ کا ہر سپاہی مدمقابل کا دشمن ہوتا ہے ہرگز نہیں اور اگر ہے تو صرف اس لیے کہ حریف اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے ورنہ سپاہی۔سپاہی میں کیا وجہ خصومت ہو سکتی ہے؟ کیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو سکتے ہیں آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔ یہ تو سب نظریاتی اختلاف اور ہوس اقتدار ہے جو چاروں اور قیامت برپا کئے ہوئے ہے اگر سیاست کے لفظ کی تشریح کی جائے تو یہ اختلافات کی زنجیریں پہنانے اور عداوتوں کے طوق بنانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں بھولے بھالے عوام مفت مارے جاتے ہیں اور پھر مقتولوں کے پس ماندگان کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ قوم اور ملک کے نام پر جو فتنے برپا کیے جاتے ہیں اور جو معصوم اور جری کے علاوہ ملک اور قوم کے وفادار اس جنگ میں کام آ جاتے ہیں ان کے بچے لیڈروں کے دستر خوانوں کو تکتے پھرتے ہیں اور ان کی تاریک بختی میں کوئی روشنی کا دیا نظر نہیں آتا لیکن اس کے باوصف یہ اختلافات کے کارخانے بند نہیں ہوتے اور یہ کشت و خون کے اسباب کی فیکٹریاں چوبیس گھنٹے چلتی رہتی ہیں اور بڑے ملکوں کے اسلحہ کی فیکٹریاں انہیں کے توڑ جوڑ پر قائم ہیں اور کسی قسم کا ہتھیار اپنی عمر استعمال سے تجاوز نہیں کرتا۔

جتنی بڑی تعداد میں افراد ہم خیال ہو گئے اسی قدر ان کے نظریاتی بارود کے کارخانوں میں ترقی ہوتی چلی گئی۔ ہیں تو یہ لوگ ترقی یافتہ لیکن سوچا جائے تو یہ جس قدر اختلافات میں لت پت ہیں اسی قدر غیر مہذب اور پس ماندگی ان کے ہر منصوبے سے بے نقاب ہو رہی ہے۔

امریکہ ہو یا روس، چین ہو یا جاپان جتنی بڑی انسانی تعداد ہم خیال ہو گئی اور بڑے دماغوں کو سوچنے کا موقع مل گیا اسی قدر انہوں نے اپنے لیے سہولتیں پیدا کر لیں ہیں اور زندگی کی ضروریات سے ہٹ کر بھی آئے دن نئی نئی ایجادات اور نئی نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں کوئی گروہ آسمان کے رستوں میں ہے کوئی سمندر کے سینے میں کوئی زمین کے طبقات کی تحقیق میں مصروف ہے اور کوئی

پہاڑوں کی اجنبی چوٹیوں کو سر کر رہا ہے الغرض جو قوم یا جو انسانی گروہ جتنا منظم اور متفق ہے اسی قدر انسانی عظمتوں کو اجاگر کرتا چل رہا ہے۔ لیکن انہیں محققین میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کشت و خون اور تباہی و بربادی کے آلات بنا رہا ہے۔ بحیثیت انسان اس گروہ کی نیت اچھی نہیں اس کے پشتانے میں انسانی تخریب کا جذبہ کارفرما ہے جو ہرگز انسانیت نہیں۔ جس قدر کوشش اور سرمایہ انسانی تخریب کے آلات پر صرف ہوتا ہے اگر زندگی کے دوسرے شعبوں کے کام آئے تو ہر انسان اپنی جگہ ایک ربوبیت میں ڈوبی ہوئی شخصیت ہو سکتی ہے۔

لیکن ان ترقیوں کے باوصف انسان اس کا بالطبع متمنی ہے کہ ایک ہو کر سب اسی ایک قوت کو مانیں ایک قوم یا ایک نسل کہلائیں اور ایک اصول حیات پر کاربند ہوں اور ممکن ہے کہ انسانی جانوں کی یہ ناروا تلفی اور اقتدار کا ناروا جنون کبھی ان کے دماغوں سے پردے ہٹا دے اور انہیں یہ خیال گھیر لے کہ یہ بکھری ہوئی انسانی طاقتیں جو حیرت انگیز انکشافات کر رہی ہیں اگر ایک جگہ مجتمع ہو جائیں تو دنیا اور انسانیت کے لیے کس قدر مفید معاشرہ بن سکتا ہے اور کس قدر سہولتیں مہیا ہو سکتی ہیں۔ جنگ کے لیے جس قدر دولت صرف ہوتی ہے اور جس قدر غور و فکر کیا جاتا ہے یہ محنت اور کاوش انسانی بہبود اور انکشافات کائنات پر صرف ہو تو دنیا کیا سے کیا بن جائے مگر ابھی ان کی گمراہی کے نشے نہیں ٹوٹے یہ ابھی انسانی جانوں، دلوں، دماغوں اور صلاحیتوں کی قیمتوں اور عظمتوں سے آگاہ نہیں اور اگر آگاہ بھی ہیں تو ابھی کوئی ایسی قوت سامنے نہیں آئی جو ان منہ زور بھری ہوئی قوتوں کو متحدہ طور پر سمجھنے سوچنے پر مجبور کر دے اور یہ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کی تعلیم پر آ جائیں۔

ادب بھی ایک مشرب ہے جو کسی تبلیغ کے بغیر آشتی اور انسانیت کی خیر خواہی کا حامل ہے مگر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اکثر شاعر اور ادیب صرف آسائش حیات اور کسب زر کے لیے اپنے مذہب سے بغاوت کر رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس دور کا ادب آگے چل کر کوئی قیمت نہیں پائے گا کیونکہ محقق بنیادی نقطہ نظر کو ٹٹولتا ہے، ناانصاف حکومت ظالم حاکم اور متعصب لیڈر کے ناجائز پروپیگنڈے کے لیے زبان و قلم کا استعمال جرم بھی ہے اور گناہ بھی بددیانتی بھی ہے ناانصافی بھی۔ ظالم اور جابر حکومتوں کے خریدے ہوئے افراد اور دلال اصل مجرموں سے زیادہ سزا کے مستوجب ہیں کیونکہ یہ لوگ فتنہ پردازوں کے دست و بازو کا کام دیتے ہیں۔ ان میں کوئی یہ جگر گردہ نہیں رکھتا کہ چوکنے کی صورت

میں اپنے قائد کو صحیح راہ سے آگاہ کر کے فطرت کا ہاتھ بٹائے اور انسانی خدمت کا جذبہ جگا کر انسان کو انسان کا معاون و مددگار بنا دے۔

جو قائد یا سربراہ اٹھتا ہے وہ اپنا ایک نظریہ لے کر آتا ہے اور اس پر اس کا یقین اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے خیالات و نظریات کو نظر انداز کر کے اپنی ہی بات پر اڑا رہتا ہے حالانکہ اگر دنیا میں خیالات اور الفاظ کا تکرار نہ ہو تو سب خیالات ختم ہو جائیں اور بیان کرنے کے لیے کچھ نہ رہے جو خیال انسانی دل و دماغ میں آتا ہے وہ ہرگز نیا نہیں ہوتا اگر وہ ماضی پر بھی غور کرے تو اس کے آثار و علامات کے علاوہ تحریر و تقریر کی بھی کہیں نہ کہیں جھلک نظر آ جائے گی لیکن وہ اس بیمار خیال اور سیکنڈ ہینڈ نظریے پر اپنی چھاپ لگا کر ایک سستی شہرت اور جھوٹی عظمت کا دعوے دار ہوتا ہے اسے اپنے نظریے میں دین و دنیا کے فوائد نظر آنے لگتے ہیں جس سے اس کی نام آوری کی تشنگی اس سے سیراب ہو کر سکون پاتی ہے۔

اصل میں اس کے اس خیال کو قوت و صحت بخشنے والے اس کے اردگرد کے جہال، خودغرض اور تحسین باہمی پر کاربند اصحاب، ہوتے ہیں حالانکہ یہ جاننا اور مشاہدے میں لانا کوئی دشوار بات نہیں، انسانی برادری میں سیدھے سادے اور اینچ پیچ سے بے خبر لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے کوئی سرپھرا کیسا بھی پست خیال لے کر کسی دعوے پر مصر ہو جائے تو اس کے ماننے والے ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں نکل آتے ہیں لیکن کوئی سورت بھی ہو رہنمائی کا جنون اور قیادت کی ہوس انہیں کسی طرف بھی نظر اٹھانے نہیں دیتی وہ اپنی چوحدی سے باہر کے بارے بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور برابر اپنے ثنا خوانوں کو نوازتے چلے جاتے ہیں بعض اوقات وہ ثنا خوانوں کی اقلیت ثنا خوانی کرتے کرتے ان کے مزاج سے اس قدر قریب آ جاتی ہے کہ وہ گستاخ ہی نہیں منھ چھٹ بھی ہو جاتے ہیں اس وقت شرفاء کی عزتیں محفوظ نہیں رہتیں اور ماحول میں اردگرد تشویش کے آثار ابھر آتے ہیں اور ایک خاص وقت پر وہی آثار اس قیادت کی تعزیت تک میں نظر نہیں آتے بلکہ منہدم کر کے دم لیتے ہیں۔

دنیا پر اگر نگاہ تحقیق ڈالی جائے تو شراب، چوری، راہزنی، جوا اور شعبدہ بازی جیسی پست باتوں کے صاحب کمال لوگوں کے پیروکار بھی جوق در جوق پائے جاتے ہیں، چنانچہ کسی قائد یا لیڈر کا بے

سوچے سمجھے اپنے نظریے پر اڑ جانا کوئی اچھی مفید اور زود اثر بات نہیں ہے۔ وہاں یہ سوچنا درکار ہے کہ جب اس دنیا میں کوئی خط اور یجنل نہیں ہے تو کسی نظریے پر طبع زاری کا لیبل چسپاں کرنا یا کسی لکیر کو اپنی اختراع کہنا حماقت نہیں تو بے علمی ضرور ہے۔

جہاں تک ماننے اور تسلیم کرنے کا سوال ہے وہاں بری سے بری بات اگر شدت اور قوت سے منوائی جائے تو سیکڑوں گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔ اچھی اور تیکھے نقش و نگار والی صورتیں تو فطری طور پر قابل توجہ ہوتی ہیں لیکن اگر ذرا نظر ہٹا کر دیکھا جائے تو جو بھدی صورتیں اور غیر جاذب خد و خال کے لوگ ہیں ان کے خریدار ہی نہیں جاں نثار موجود ملیں گے وہ انہیں میں جاذبیت محسوس کرتے ہیں اور خورشید کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ میری نظر میں ایک ایسی صورت ہے کہ رنگ تو اس کا ملگجا سا ہے لیکن نقش و نگار اس کے بلا کے ہیں کہ آدمی ڈوب کے نہ ابھرے اس پر اس کی تعلیم سونے پر سہاگا۔ نہایت مہذب اور علمی اسلحہ سے مسلح اور اس پر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔

ایک دن جب میں نے سنا کہ اس کی آنکھیں جاتی رہیں تو ایسا دھچکا لگا جیسے کسی نے کلیجے پر ڈکا مار دیا ہو سانس نیچے کی نیچے رہ گئی وہ لاہور آئی تو میں اسے دیکھنے گیا' شام کا وقت تھا اور وہ ایسی بیٹھی تھی جیسے گیندے کے پھولوں کا گلدستہ دھوئیں میں رچ گیا ہو۔ میں نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں اپنی ایک آنکھ کی پیش کش کی اور اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''شکریہ'' آپ مجھ سے زیادہ مفید کام کریں گے۔

میرے موضع کا تعلق اس گفتگو سے نہیں تھا لیکن کیا کروں دل کی بات زبان پر آ گئی۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسانی محبت کو اس قدر عام اور مقبول کیا جائے کہ ہر دل میں یہ شعلہ سر ابھارنے لگے اور ہمیں یا ہمارے قائدین کو کشت و خون کے جرائم گناہ آلود نہ کرنے پڑیں۔ نوع انسانی ایک ہی صورت میں ایک نسل کے لوگ ہیں اس لیے انہیں نظریاتی طور پر بھی ایک ہی صورت کی تصدیق کرنی چاہئے خواہ وہ ''بے صورتی'' کے لفظ سے ہی منسوب ہوتی ہو۔

بلندی و پستی' رنگ و نسل اور خد و خال کا معمولی سا اختلاف انسانوں کو درجوں ذاتوں اور ریتوں میں تقسیم کرنے کے باوجود انسانی کڑی سے الگ نہیں نکال سکتا۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک باغ میں مختلف قسم کے میوہ جات اور لالہ و گل ہوتے ہیں اور سب کے رنگ و بو جدا اور برگ و بار کی شکلیں

مختلف ہوتی ہیں اور ذائقوں میں بھی فرق ہوتا ہے لیکن اسے فرق نہیں کہا جاسکتا اسے تنوع کہتے ہیں جو کسی درخت تو کیا تنکے کو بھی باغ سے الگ نہیں کرتا۔ سب کو ایک ہی زمین سے خوراک ملتی ہے ایک ہی آب و ہوا میں پلتے بڑھتے ہیں اور ایک ہی مالی کے ہاتھ سے سجائے سنوارے جاتے ہیں۔ باغ کی بوقلمونی کے لیے یہ معمولی سے تنوعات کا سلسلہ بھی نہایت ضروری ہے۔

انسانوں کی طبیعتوں کا بھی یہی عالم ہے اسے اس قسم کا شعور ملا ہے کہ جس شے کا جو رخ اس کے سامنے ہوا سی پر سوچتا اور غور کرتا ہے اور ہر انسان کے سوچنے اور غور کرنے کا طریقہ جدا ہے اور ہر شے کے بے شمار پہلو ہیں چنانچہ یہ اختلاف بھی اختلاف نہیں تنوع ہے اور ہم اس تنوع کی بنا پر انسانیت میں احاطے نہیں کھینچ سکتے اور بوقلمونی کا نٹے دار تار لگانے سے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی۔

کسی موضوع کے اقرار یا انکار سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دونوں کے فکر و خیال کا وزن یکساں ہے یہ عین ممکن ہے کہ دونوں طرف غلط نگاہی دامن گیر رہی ہو یا ایک طرف صحیح فکر و خیال ہو اور دوسری طرف ناقص یا دونوں ناقص ہوں اور میاحثی اسقام نے دونوں طرف گرد و غبار اتار رکھا ہو۔

یہ مسئلہ کسی قدر تقابلی مطالعے سے حل ہوسکتا ہے لیکن تقابلی مطالعے میں بھی غیر معتبر مصنفین اور ناپختہ مولفین کی کتابیں ان کے مضامین اور نظریات کے بل پر اقرار یا انکار کوئی معتبر بات نہ ہوگی اور میرے خیال سے تو ایسے متنازعہ مسائل میں عوام کو الجھنا نہیں چاہئے ان کے لیے تو جب تک کوئی مسئلہ تحقیق و تدقیق کے جھنجھٹ سے نکل کر نہ ابھرے اور محققین میں ایک جانب سے سکوت عمل میں نہ آجائے اس وقت تک اس پر یقین و عمل کوئی سود مند بات نہ ہوگی بلکہ اس میں زندگی کا ضیاع اور وقت کا نقصان ہے۔

اس سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ معمولی قسم کے آدمیوں کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی ہرگز نہیں میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہر بڑا آدمی بڑا آدمی نہیں ہوتا اسی طرح ہر چھوٹا انسان چھوٹا نہیں ہے بلکہ جیسے ہر بلند فطرت انسان کا نظریہ انسانیت کے خلاف نہیں ہوتا اسی طرح معمولی انسانوں میں بھی کوئی انسان انسانیت کا دشمن نہیں ۔ ملے گا یہ الگ بات ہے کہ بحث و تمحیث کی قلابازیوں سے دماغوں کو بھٹکا دیا جاتا ہے اگر انسان سے محبت کا تصور بنیادی نقطہ نگاہ ہو تو کوئی بات بھی عوام کے نقصان اور معاشرے کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ بلکہ تہذیب سے چھان پھٹک کے بعد آتی ہے' بشرطیکہ انسانی فکر و

خیال سے اس کا رستہ کھوٹا نہ کر دیا جائے۔

عامتہ الناس کی آزاد خیالی اور رائے زنی میں رکاوٹیں پیدا کرنا تکمیل تمدن اور تہذیب کا نقصان ہے۔ یہ قیود و شرائط کا سلسلہ انسانی فکر کو بلندیوں سے روکتا ہے۔ کیونکہ ہر قدم پر تعزیری احکام ذہن و عقل کے حق میں سم قاتل سے کم نہیں اس طرح بہت سی جز رس طبائع اور جوہر قابل نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ پورے ملک اور تمام قوم کا خسارہ ہی نہیں، حقائق کی بڑھوتری اور دقائق کی ترقی سے دشمنی کے مترادف ہے، جو قائد یا سربراہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ہم ہی ملک اور قوم کی بہبود کے مسائل کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں وہ خواہ درست ہی کہتے ہوں لیکن عوام کو ان سے پورے پورے اختلاف کا حق ہونا چاہیے اگرچہ یہ کج بحثی ہوگی لیکن بعض بعض اوقات اس کج بحثی سے بڑے بڑے مفید اور رہوادار دریچے کھل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناقص لیڈر اور اوچھے قائد کو اپنے خلاف باتیں سن کر غصہ آتا ہے اور پھر وہ شدت سے اسی نظریے پر زور دیتا ہے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو اس میں وہ اکثر تشدد اور خون ریزی تک اتر آتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ حریف کے مقابلے میں اپنی کمزور اور ہیچ پوچ بات کو بڑھا کر کوئی اچھی اور مفید بات نہیں کرتا اور نہ وہ اصول رہنمائی سے آگاہ ہوتا ہے۔ جب مخالفین اپنی رائے کے اختلاف پر فریق مخالف کو بضد پاتے ہیں تو چنداں جز بز نہیں ہوتے بلکہ ان کے حقائق پر صداقت کی چھوٹ پڑنے لگتی ہے اور پھر ان کے تصورات و مجوزات کو عامتہ الناس صحیح پڑھنے اور سمجھنے لگتے ہیں اور پھر قائد یا لیڈر کا غرور اور چڑچڑا پن کوئی معنی نہیں رکھتا اس ندامت کی جھانجھ میں اگر وہ تشدد اور مار دھاڑ کی رکیک حرکات پر اتر آتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہمارے سامنے ترقی پسند ملکوں کی مثالیں موجود ہیں تاریخ ان شواہد سے بھری پڑی ہے۔

جب اس قسم کی کشمکش سے عامتہ الناس میں مختلف قسم کی آوازیں گشت کرتی ہیں تو جگہ جگہ رائے زنی شروع ہو جاتی ہے منتخب لیڈر کوئی آسمان سے تو اترتا نہیں بلکہ عوام ہی میں سے ایک انسان ہوتا ہے جسے اکثریت چنتی ہے اور اس چناؤ میں بھی اگر جاہل اور تیسرے درجے کے لوگوں نے اس کا انتخاب کیا ہے، تو وہ انتخاب بھی قابل اعتماد نہیں ہوتا اس میں شک نہیں کہ اس منتخبہ شخصیت کے ساتھ کچھ خود غرض اور چالاک لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں لیکن ملک کا لکھا پڑھا اور دانشور طبقہ اس سے

ہرگز اتفاق نہیں کرتا چنانچہ ملک میں آئے دن ابتری گمراہی رشوت اور لوٹ مار کے علاوہ کشت وخون شروع ہوتا ہے شرفاء کچھ روز تو اس جہل مرکب سے گھبراتے اور دبتے چلے جاتے ہیں لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ شریفوں کی عزت اور عصمت پر ہاتھ پڑنے لگا ہے تو پھر وہ بالا تفاق ان سے زیادہ منہ زور اور ہتھ چھٹ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان شرفاء کا مقابلہ بڑے بڑے غنڈے نہیں کر سکتے کیونکہ پہلے وہ غنڈوں ہی سے نمٹتے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنڈوں کی تعداد شرفاء سے زیادہ نہیں ہوتی اگرچہ یہ نتیجہ خانہ جنگی کے لیے رستے کھول دیتا ہے اس گروہ میں ان کی اکثریت ہوتی ہے جو شرافت اور اتحاد سے مل جل کر رہنا چاہتے ہیں اور جرائم وگناہ کو پسند نہیں کرتے بلکہ عدل وانصاف کے دلدادہ اور رحم وکرم کے خوگر ہوتے ہیں اس کی ہر ذی شعور گواہی دے گا کہ ایک حقیقت کو ماننا ایک صداقت کو تسلیم کرنا اور ایک مسلمہ پر متفق ہو کر زندگی بسر کرنے کی سعی کرنا کوئی جرم نہیں بلکہ انسان کا پیدائشی حق ہے۔

ایک دن آخر ان بکھرے ہوئے مسلمات اور بھٹکی ہوئی صداقتوں کو ایک مرکز پر جمع ہونا ہے اور یہ بکھرے ہوئے اجزائے حیات مجتمع ہو کر ہی رہتے ہیں ہاں اتنا عرض کروں گا کہ جب تک حکومت اور رعایا کی آرزوؤں اور مقاصد میں ہم آہنگی نہیں ہوتی اس وقت تک کوئی حکومت بھی صحیح حکومت نہیں کہلا سکتی حکومت تو فطرت کی تقلید کا نام ہے کہ جیسے انسان کو بھوک لگتی ہے اور رزق کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ جب انسان تاریکی سے گھبرا جاتا ہے تو قدرت اس کی آرزوؤں کے مطابق چاند ستارے اور سورج رونما کر دیتی ہے غرض کہ انسان کی ہر فطری آرزو جہاں انسانی دل ودماغ کے لیے باعث مسرت ہے وہیں تخلیق کا منشا بھی یہی ہے اور وہ اس کی ذمہ دار بھی ہے۔

بالکل اسی طرح جو لوگ اپنی طبیعتوں کی خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں دنیا بھی ان کی طرف ٹکٹکی باندھ لیتی ہے اور عوام کے سامنے ہر وقت وہی رہنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی کامیابی کا ذمہ تو خود فطرت لے لیتی ہے اور ان کی سعی وصداقت اور عرق ریزی کے نتائج بھی قدرت کے منشاء سے باہر نہیں ہوتے۔ ایسے انسانی اجسام وارواح کے حق میں یاقوتی کا کام کرتے ہیں۔

جو سربراہ اقتدار حاکم تحکم یا فریب سے اپنی بات منواتا ہے وہ اصل میں حقائق کے خلاف ایک

محاذ کھولتا ہے جس کا انجام ندامت اور شکست کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے صداقتوں کو ماننا اور حقائق کو تسلیم کرنا حاکم ہو یا محکوم رعایا ہو یا فرمانروا سب کے لیے انسانی عظمت ہے اور نفوس انسانی اسی میں فخر و مباہات کی چھاؤں پاتے ہیں۔

جنگلوں میں رہنے والے جنگلوں اور باغوں میں بسیرا کرنے والے باغوں کے اصول وضوابط پر کار بند نظر آتے ہیں اور آب و ہوا کے مطابق نشو و نما کی تقسیم رہن سہن اور رفتار و پرواز پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔

مگر یہ انسان ایسا جانور ہے اور خصوصاً میرے پنجاب کے خطے کا یہ عجیب و غریب حادثہ ہے کہ اگر کسی بات کو طے کرنے کے لیے سو آدمی اکٹھے ہوں گے تو ہر شخص کی رائے علیحدہ ہوگی جس کا سبب یہ ہے کہ یہ اپنے ذرا ذرا سے مفاد پر دوسروں کے بڑے بڑے مفاد کے راستوں میں پھاٹک لگانے کے عادی ہیں اور اسی ایک عیب نے انہیں آج تک کسی دور میں بھی سرخرو نہیں ہونے دیا اور ایک دوسرے کی مخالفت کے جنون میں انہوں نے ہمیشہ باہر کی طاقت کی غلامی کا طوق ڈالے رکھا۔

خدا بھلا کرے قائداعظم کا وہ انہیں ان کی روایات کے خلاف ایک ملک بنا کر دے گئے لیکن یہ اپنی خود پروری کے نشے میں اس قدر راندھے ہو گئے کہ ملک کی فلاح و بہبود کی طرف کسی نے سوچنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی اگر کسی زخمی روح اور مضروب احساس نے کبھی کوئی آواز اٹھائی بھی تو اسے قابل اعتنا نہیں گردانا گیا یا اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا گیا۔

ان کے اس عیب سے تمام دنیا آگاہ تھی مگر یہاں کی افواج کی دھاک ایسی تھی کہ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ انہیں زہر سے نہیں شکر سے ہلاک کرنے کی اسکیم سوچی گئی ہر چند کہ یہ اسکیم سوچنے والے بھی صحیح راہ پر نہیں لیکن انہوں نے سب سے پہلے فوجی قوت کو کمزور کیا اور ریڑھ کی ہڈی کڑکا دی پھر کیا تھا تمام اعضائے جسم بیکار ہو کر رہ گئے۔

اس کے باوجود کام چلتا رہا کیونکہ انگریز نے اس معاشرت کا پہیا اس زور سے گھمایا تھا کہ اس کے رکنے کے لیے بھی عرصہ درکار تھا جونہی رفتار میں کمی آئی اور کرسی بدلی تو انتظامیہ سے ان لوگوں کے خراج کو ضروری سمجھا گیا جو سر سے پاؤں تک دماغ تھے اور اس پورے ملک کی مشینری کو چلا رہے تھے۔ ان کی جگہ آنے والے مہروں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ابھی تو ہم سے زیادہ سوجھ بوجھ اور

تدبیر و تعمیر کے انسان اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں انہوں نے پھر بچے کھچے اہل بصیرت کو چن چن
کر نکالا اور اب یہ ذرا اطمینان سے کرسیوں پر سنبھل سنبھل کر بیٹھ گئے لیکن ملک کا انتظام تو ہر شخص کے
س کی بات نہیں ہوتی چنانچہ ہر شعبے میں افراتفری خودغرضی رشوت لوٹ کھسوٹ کے جذبات عود کر
آئے۔ عوام تھے کہ سر جھکائے بھیڑوں کی طرح بھیڑیوں کی طرف دیکھتے رہے کہ شاید پیٹ
بھرنے پر یہ انسانیت کی طرف جھک جائیں لیکن انسان کی ہوش کی کھوپڑی تو صرف قبر کی مٹی سے
بھرتی ہے۔ چنانچہ دن رات عوام میں چوری ڈاکہ کشت و خون کے حالات و واقعات رونما ہوتے
چلے گئے اور یہ خونی سلسلہ اب تک جاری ہے ان کے سربراہوں کی اس پر نظر نہیں کہ وقت کے ساتھ
رتقا کا پہیا پورے ماحول کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس بھیڑیوں کے گروہ کو جو گھر بنانے کا عادی
ہیں برسات کی طویل جھڑی سے گزرنا پڑے گا جس کا انجام ایک گرگ باراں دیدہ ہوگا۔

عزیز الرحمٰن

میرے یہاں آنے والے لوگوں میں عزیز الرحمان بھی ہے یہ نوجوان بی اے کے امتحان کی نجی طور پر تیاری کر رہا ہے لیکن اسے دست شناسی کی ایسی چاپیک لگی ہے کہ وہ ایک اور نوجوان کو ساتھ لیے دن بھر لوگوں کے ہاتھ پڑھتا اور ہاتھوں کے نشان لیتا پھرتا ہے۔ اس کا ہمراہی اس کا شاگرد بھی ہے اور محرر بھی چنانچہ جو عزیز الرحمان کہتا جاتا ہے وہ لکھتا جاتا ہے۔ جب اس کام سے فراغت ملتی ہے تو شاگرد رشید ذکر واذکار چھوڑ کر بات کا رخ سیاست اور آزاد خیالی کی طرف موڑ دیتا ہے اور پھر پہروں اپنا تھیتھلا علم دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس بحث و تمحیث میں عزیز الرحمان حصہ نہیں لیتا جیسے اس کا اس مضمون سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ عزیز تم اس ملحدانہ بحث میں حصہ کیوں نہیں لیتے جب کہ تم استاد اور شاگرد بھی کہلاتے ہو عزیز الرحمان نے کہا جناب اول تو غریب الوطن ہوں دوسرے طالب علم اور پھر ایک دو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں جس سے گزر بسر ہوتی ہے میرے بوڑھے والدین ہیں اور جوان بہن ہے ایسے حالات اتنی جرات و ہمت کہاں کہ خدا رسول کی مخالفت کر کے دنیا کو بھی دشمن بنالوں مجھے تو میرے گھر کا ماحول ہی گھن کی طرح کھا رہا ہے۔

میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ قدرت مجھے یہ دلخراش مناظر کب تک دکھائے گی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں کوئی سکھی نہیں ہر شخص سینے میں کوئی نہ کوئی سلگتا ہوا زخم لیے پھرتا ہے اور پھر حساس لوگوں کے لیے تو دنیا میں قدم قدم پر جہنم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس دن سے مجھے عزیز الرحمان کے چہرے پر غم کی کونپلیں سی پھوٹتی دکھائی دینے لگیں نہ جانے یہ مرا احساس تھا یا اس کا کرب ارتقا کی رفتار سے بڑھ رہا تھا مجھے اس کے چہرے پر کبھی مردہ کھیت اور بیمار کیاری کا گمان گزرنے لگتا تھا۔

ایک دن جب میں نے اسے بہت اداس پایا تو بڑے ہی پیار سے اس کی اداسی کا سبب دریافت کیا اس نے میری بات سن کر آنکھیں جھکالیں میرے سینے میں میرا کرب اور بھی سنسنانے لگا میرا خیال تھا کہ میں نے اس کا حال پوچھ کر غلطی کی نہ جانے اور کتنے لوگ اس کی خاموشی کے پھوڑے کو چھیڑتے ہوں گے۔ لیکن اس نے بڑی آہستگی اور نرمی سے اتنا کہا کوئی خاص بات نہیں آج میرے

دونوں ٹیوشن ختم ہو گئے- کیونکہ امتحان ہو چکے ہیں میں تلاش میں ہوں اللہ مالک ہے اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا سات آٹھ دن نہ آیا میں روز سوچتا تھا کہ خدا جانے عزیز الرحمان پر کیا بنی ہے کہ آیا نہیں-

ہفتہ عشرہ کے بعد ایک دن وہ اچانک آ گیا اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ایک ڈستی ہوئی اداسی اس کے خدو خال کو اور بھی ڈبوئے دے رہی تھی پھر جو میری نظر پڑی تو اس کی کلائی سے ذرا اوپر ایک سفید پٹی بھی بندھی تھی میں نے پوچھا عزیز یہ پٹی کیسی باندھی ہوئی ہے کیا ہوا ہے! میں نے سوال کے جواب کے لیے جب اس کی طرف دیکھا تو اس کی پتلیوں پر آنسو پھر چکے تھے جیسے بارش کے بعد آئینے- میں نے استفسار کے دستپنے سے اس کے سکوت اور اداسی کے الاؤ کو پھر کریدا تو اس نے نظر جھکائے جھکائے کہا مجھے اب تک کوئی ٹیوشن نہیں مل سکی اور رات سے میرے والدین اور بہن نے کچھ نہیں کھایا- میں نے ہسپتال جا کر اپنا دو بوتل خون فروخت کرایا اور گھر والوں کے لیے خوردونوش کا سامان دے کر آ رہا ہوں- یہ پٹی بھی اسی ڈاکٹر نے باندھ دی تھی اور کہا تھا کہ اگر اور رقم درکار ہو تو بلا تکلف چلے آنا آج کل ہمیں جوان خون کی ضرورت ہے-

اس کا یہ بیان سن کر میرا تو سر چکرانے لگا اور دل بھر آیا' آنسو چھپانے کو میں غسل خانے میں چلا گیا اور پھر چائے کے لیے نیچے اتر گیا' چائے کا آرڈر دے کر آیا تو عزیز الرحمان ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ کا سہارا لگائے بیٹھا تھا جیسے وہ اپنے احساس غم کی دھار پر انگلی پھیر کر اپنی توقعات کو خود زخمی کر رہا ہو-

وہ شرماشری چائے پی کر زینے سے اتر گیا- مجھے حیرت تھی کہ یہ جب یامست ہے کہ اپنی تقدیر سے بے خبر ہے اور لوگوں کے زائچے بناتا پھرتا ہے' اس موجودہ معاشرے نے ایسا رخ اختیار کر رکھا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان زیادہ پریشان ہیں کیونکہ آج کل علم طالب علموں پر معیشت کے دروازے نہیں کھولتا اور رحم و انصاف کے دریچوں کے کھٹکے چڑھے ہوئے ہیں' اخلاق ماضی کی چیز ہو کر رہ گیا اور ہماری درسگاہیں حصول معاش کی تعلیم سے خود بھی بے بہرہ ہیں' اس سرزمین میں اب ان لوگوں کی پیداوار نہیں جو اپنے جسموں کے مرہم سے قوم کی سطح کے زخم بھرا کرتے ہیں-

گھریلو عذاب

ایک دن مجھے راولپنڈی سے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا میں نے ڈاکٹر طاہر سے ذکر کیا' انہوں نے کہا' وہ تو میرا وطن ہے' میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گا۔ چنانچہ وہ دوسرے روز علی الصبح غریب خانے پر تشریف لے آئے اور ہم دونوں راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے' تمام راستے ڈاکٹر صاحب نے اپنے تجربات اور لوگوں کے رویے کے ایسے ایسے واقعات سنائے کہ میں ششدر رہ گیا۔

جہلم سے نکل کر میں نے کھڑکی کھولی تو سورج کی سنہری کرنیں چٹانوں پر نام کھودنے میں مصروف تھیں اور غاروں کے نشیبوں میں روشنی کے زینے اتر رہے تھے' سڑک کے دونوں طرف پانی کے ریلوں سے مسمار زمین پر شوالوں کی طرح میلوں کٹاؤ ہی کٹاؤ پھیلے ہوئے تھے' یہ مرحوم تہذیبوں اور مدفون واقعات کا قبرستان میرے لیے فکر انگیز تھا کیونکہ پتھروں کے پرت' زمین کے گھاؤ' ساحلوں کے کٹاؤ اور درختوں کی کھالیں تو خاص طور پر تاریخ کی غمازی کرتی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی گفتگو بھی کچھ کم خیال انگیز نہیں تھی۔

راولپنڈی جا کر عبدالعزیز فطرت صاحب کے یہاں قیام ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فطرت صاحب ڈاکٹر طاہر کے شاگرد رشید ہیں۔ یوں تو فطرت صاحب سے لاہور ہی سے شناسائی تھی کیونکہ جب وہ لاہور میں ڈاک خانہ کے ملازم تھے تو مزنگ ہی میں مجھ سے بہت قریب بازار کے ایک چوبارے میں رہتے تھے اور وہاں بھی ان کی وجہ سے شعر و شاعری اور نجی نشستوں کا سلسلہ جاری تھا' مجھے مسرت ہوئی کہ استاد اور شاگرد دونوں سے میرے تعلقات ہیں اور دونوں قابل قدر اور شریف انسان ہیں۔ عبدالعزیز فطرت رواں دواں شعر کہتے تھے اور بھلے لوگوں کی صف کے انسان تھے۔ وہ عمومی شاعروں کی طرح حاسد اور منافق انسان نہیں تھے بلکہ سیدھے سادے شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو شرافت قرار دیتے تھے۔ شاعری اور یار باشی نے انہیں نہایت دلچسپ انسان بنا دیا تھا۔ وہ جہاں عبدالعزیز تھے وہیں ہر دل عزیز بھی تھے۔

ہفتہ کی رات کو مشاعرہ ہوا اور اتوار کی صبح کو ڈاکٹر طاہر' فطرت اور میں تفریح کے لیے نکلے۔ ان دنوں مہربان علی اوریا بین راولپنڈی ہی میں کسی قناد کی دکان پر کاریگر تھے میں ان سے جا کر ملا تو وہ

بڑے خلوص اور تواضع سے پیش آئے' وہاں سے چلے تو ڈاکٹر طاہر نے کہا کہ ان غیر شاعر لوگوں سے آپ کے تعلقات کیسے ہو گئے؟

میں نے کہا جناب میں تو اصل میں اسی طبقے کا آدمی ہوں اور خلوص و ایثار کے معاملے میں انہیں پڑھے لکھے لوگوں پر ترجیح دیتا ہوں' یہ لوگ افلاس سے نہیں ڈرتے اور قربانی کے معاملے میں جان پر کھیل جاتے ہیں۔

جو انسان افلاس سے نہیں بدکتا وہ دوستوں کے لیے بڑے سے بڑا ایثار کر گزرتا ہے' یہ شریف لوگ ہیں اور ان کے میلے کچیلے کپڑوں سے مجھے پیار ہے۔ میرے ساتھی مسکرا کر خاموش ہو گئے' صرف اتنا کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں۔

چلتے چلتے ڈاکٹر طاہر اپنے ایک وکیل دوست کے یہاں لے گئے جو اچھا خاصا مشہور اور معزز قسم کا وکیل تھا' ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا' وہ دیر تک ڈاکٹر کے سینے سے لپٹ کر ان کے کندھے پر منہ رکھے رہا۔ اس کے بعد ہم دونوں سے تعارف ہوا۔ وہ ایک خوش ذوق انسان معلوم ہوتا تھا۔

ہم ابھی مزاج پرسی کی منزل پر تھے کہ زنان خانے سے ایک خادمہ آئی اور وکیل صاحب سے کہا کہ جوتے والا موچی آیا ہے' بی بی جی سو روپیہ منگا رہی ہیں۔ وکیل صاحب نے کہا کہ ایک جوڑے کا فیصلہ پچیس روپے پر ہوا تھا۔ وہ سو روپیہ کیسے مانگتا ہے؟ جاؤ پوچھ کے آؤ۔

خادمہ اندر گئی اور الٹے پاؤں آ کر کہا جوتے والا چار جوڑے بنا کر لایا تھا اور بی بی جی کو چاروں جوڑے پسند آ گئے۔ اس لیے سو روپیہ مانگا ہے وکیل صاحب نے ذرا تلخ ہو کر کہا کہ ان سے کہو فی الحال ایک ہی جوڑا خرید لیں چار جوڑے تو فضول خرچی ہے' اور یہ کہتے ہوئے اسے پچیس روپے نکال کر دے دیئے اور ہم سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

مشکل سے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ وہی خادمہ سیاہ رنگ کے خوان پوش سے ڈھکا ہوا ایک طشت لائی اور خاموشی کے ساتھ اندر کمرے میں رکھ کر چلی گئی' ہم لوگوں نے دل ہی دل میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب عرصے کے بعد ملے ہیں' خشک میوہ یا چائے وغیرہ کا تکلف کیا ہوگا۔ وکیل صاحب اٹھ کے کمرے میں گئے اور اشارے سے صرف ڈاکٹر طاہر کو اندر بلایا اور خوان پوش اٹھا کر

دکھایا' طشت میں چاروں جوڑے چاقو سے کٹے ہوئے اور ان پر سو روپے کا نوٹ اور ساتھ ہی ایک پرچہ تھا کہ یہ سو روپیہ جوتے والے کو دے دیں۔

یہ وکیل ڈاکٹر طاہر کے پرانے دوستوں میں ہونے کے باعث بے تکلف تھے چنانچہ ڈاکٹر طاہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر بچوں کی طرح ڈھاڑیں مار مار کر ایسے روئے کہ ہم لوگ گھبرا گئے اندر جھانکا تو یہ ماجرا نظر پڑا۔ وکیل صاحب ڈاکٹر طاہر سے کہہ رہے تھے کہ یہ واقعہ میرے مصائب کا ہزارواں حصہ بھی نہیں' میری زندگی جہنم میں گزر رہی ہے' اور یہ ہے میری جوانی کی سادگی اور امیر گھر میں شادی کا انجام۔ طلاق دیتا ہوں تو بیوی کے لواحقین سے قتل و غارت کا اندیشہ ہے اور اسی ضیق میں رہتا ہوں تو یہ ہر وقت فرمائشوں کا عذاب' عزیز مہمانوں اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ان کے مردوں کی آمد و رفت کا مستقل تانتا زندگی کو اجیرن کیے ہوئے ہے۔

چھٹکارے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی' کبھی یہ ملک چھوڑ کر نکل جانے کا خیال دامن گیر ہوتا ہے' کبھی خودکشی کا' خدا کا شکر ہے کہ دونوں میں شدت نہیں' بار روم میں یار دوستوں سے ہنسی مذاق اور اپنی کمیں گاہوں سے موکلوں کا شکار اور تمام دن لوٹ کھسوٹ کا قانونی مشغلہ حوصلہ مند تو بنائے رکھتا ہے' لیکن سوچتا ہوں کہ دکھ تکلیف زندگی کے ساتھ ہے' اگر کبھی بیمار ہو گیا یا خدانخواستہ کسی صورت میں ناداری سے سابقہ پڑ گیا تو کیا حال ہو گا اور کیسے گزرے گی؟ پہلے دعاؤں کا قائل نہیں تھا مگر اب خدا پر یقین رکھتا ہوں اور آپ لوگوں سے بھی دعا کی التجا کرتا ہوں۔ ہم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور خلوص دل سے ان کے لیے دعا کی۔

میں نے وکیل صاحب سے کہا' وکیل صاحب آپ کے سسرال والے کیا کرتے ہیں؟ زمیندار بھی ہیں' ملز اونر بھی' حکام بھی اور لچے لفنگے بھی! وکیل نے ایک سانس میں کہا کیا آپ کو پہلے معلوم نہیں تھا؟ میں نے پوچھا

جی ہاں معلوم تھا لیکن میں نے سوچا تھا کہ مجھ جیسے لکھے پڑھے داماد کی یہ ضرور قدر کریں گے' اور یہ ٹانکا پکا لگے گا' یہ خبر نہیں تھی کہ یہ اپنے گھر ایک غلام بے دام کا اضافہ چاہتے ہیں۔ وکیل صاحب نے متاسفانہ لہجے میں کہا!

بھائی آپ تو لکھے پڑھے انسان تھے' آپ نے ان کی امارت اور سرمایہ داری تو دیکھ لی لیکن یہ

نہ سوچا کہ قیمتی لباس سے ضمیر کا تعفن اور نیت کا فضلہ مشک وعنبر میں نہیں بدل سکتا کاروں اور ہوائی جہازوں کی سواری سے شیطنت ابھر کر ولایت نہیں بن جاتی لیکن آپ تو خود جرائم میں مبتلا تھے اس لیے اس رخ پر کیسے سوچ سکتے تھے۔ آپ کے یہاں بھی حصول زر کا ارتکاب جواز کی حدود میں نہیں آتا اب بہتر یہی ہے کہ آپ پہلے اپنی اصلاح کریں اور پھر خدا پر بھروسہ کر کے کوئی قدم اٹھائیں اتقا اور پاکیزگی سے روح کی بیداری کا آغاز ہوتا ہے اور بصریت نقاب الٹ دیتی ہے، پھر انسان کھلی آنکھوں اپنے نشیب وفراز کا جائزہ لینے لگتا ہے اور مستقبل کو متوجہ کرنا مشکل کام نہیں رہتا۔

ممکن ہے آپ کے سسرال والے ایک دفعہ نرمی برتنے لگیں اور آپ کو آپ کی امید کے مطابق نظر آنے لگیں مگر آپ یہ ہرگز نہ بھولیں کہ فیکٹریوں اور کارخانوں کی ملکیت گاہے گاہے دروغ بانی کا ریشمی لبادہ تو ضرور اوڑھ لیتی ہے لیکن اپنا شجرہ بدل کر شرافت وصداقت نہیں بن سکتی۔

ڈاکٹر طاہر نے علیحدگی میں بھی اسی قسم کی باتیں بتائیں پھر انہیں ساتھ لے کر ایک قریب کے ہوٹل میں جاڈٹے اور ادھر ادھر کی گپ لگتی رہی۔

ہوٹل سے اٹھ کر فطرت صاحب کے گھر آگئے اور وہاں سے لاہور کا رخ کرلیا۔ تمام راستے وکیل صاحب ہی کی باتیں ہوتی چلی آئیں۔

ڈاکٹر طاہر نے کہا جناب یہ نوجوان تو امیر گھرانے میں شادی کرنے سے مصیبت میں ہے اس طرح اگر کوئی امیر لڑکا قسمت سے کسی غریب کی لڑکی سے شادی کرلیتا ہے تو لڑکی کی زندگی کو گھن لگا دیتا ہے اور غریب والدین کو آئے دن اسی قیامت کا سامنا رہتا ہے ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔

تمام امراء میں لڑکی ہو یا لڑکا شریفانہ زندگی کی مقبولیت سے دست بردار رہتا ہے اور تعیش کے علاوہ آرام طلبی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اسی ذکر واذکار میں ہم لاہور آاترے

ڈاکٹر عطا محمد طاہر

موصوف سے جناب عبدالعزیز فطرت کی وساطت سے راولپنڈی ہی میں تعارف ہو چکا تھا لیکن جب وہ لاہور آگئے تو غیر محسوس طور پر ان سے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے اور یہ نزدیکی کا سلسلہ اس قدر بڑھا کہ جناب طاہر مطب سے فراغت پا کر روزانہ باغبان پورہ سے مزنگ لاہور آجایا

کرتے اور پھر پہروں شعروشاعری اور دنیا کے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔

ایک دن ڈاکٹر طاہر نے چند دوستوں کو مدعو کر کے ایک ہفت روزہ مشاعرہ کا سلسلہ قائم کر دیا جو صرف دوستوں تک محدود تھا ہر شاعر اپنے گھر سے مرغوب کھانا پکوا کر لاتا اور مشاعرہ کے بعد وہیں ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے۔ یہ ہنگامہ کبھی تو لاہور کے شالامار باغ میں کبھی جہانگیر کے مقبرے پر اور کبھی شیخوپورہ کے ہرن مینارے پر برپا ہوتا دن بھر کی تفریح اور علمی ادبی صحبت کے بعد شام کو واپسی ہوتی اور آئندہ ہفتے کے مشاعرہ کے لیے مصرع طرح پر اسی دن سے فکر شروع ہو جاتی اس میں جناب شفیق کوثی، ڈاکٹر طاہر، ایوب شاہد نسیم، مسیح الحسن بقا، کلیم عثمانی، ضمیر فاطمی، حسرت حسین حسرت بہاری، ڈاکٹر تمیر تھی اور شاہد چاند پوری مرحوم وغیرہ شریک ہوتے اور پر لطف صحبتیں رہتیں۔

ڈاکٹر طاہر جب بھی موقع پاتے ہومیوپیتھی کے کرامات اور اپنی مرض شناسی کے واقعات معجزوں کی طرح بیان کیا کرتے۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی اور وہ دوستوں سے کسی بات کو چھپاتے نہ تھے۔ صاحب حیثیت لوگوں سے ان کے معیار کو دیکھ کر قیمت وصول کرنا اور غریبوں کو مفت دوائیں دینا ان کا شعار تھا۔ ڈاکٹر طاہر خیر قسم کے انسان تھے۔ جب وہ باغبان پورہ سے چلتے تو واپسی تک کسی سوالی کو خالی نہ جانے دیتے بلکہ دوستوں سے بھی ان کا اسی قسم کا سلوک تھا۔ وہ ضرورت مند کے چہرے اور مظلوم کی پیشانی کو پڑھنا جانتے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ چند روز ہوئے ایک عورت کو اس کا خاوند لے کر میرے پاس آیا اور کہا کہ گھر لیپتے ہوئے اس کی ہتھیلی میں کوئی کانٹا یا کسی قسم کا تار چبھ گیا ہے۔ ہسپتال والوں نے اس کے ہاتھ کی سوجن اور جسم پر کالے دھبے دیکھ کر کہا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ورنہ تمام جسم میں زہر پھیل جائے گا' آپ فرمائیں کہ ہاتھ کٹے بغیر بھی اسے آرام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ میں نے مریضہ کو دیکھا تو فوراً دماغ میں دوا بول پڑی اور میں نے اسے اطمینان دلایا کہ انشاء اللہ چند روز میں تندرست ہو جائے گی اور ہاتھ کٹنے کی نوبت نہیں آئے گی اور اسی وقت ''سلیشیا'' کی خوراک دینا شروع کر دی اور اسی میں کپڑا تر کر کے ہتھیلی کے نشان پر رکھ دیا۔ آہستہ آہستہ آرام ہوتا چلا گیا۔ آج بیس بائیس روز کے بعد جس سوراخ سے سوئی داخل ہوئی تھی اسی سے واپس آ گئی ہے۔

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اور اسی دن سے ڈاکٹر طاہر معالجے کے متعلق جو بات کرتے میں غور

سے سنا کرتا انہیں بہت سی دواؤں کی سوانح عمریاں اور اسناد از بر تھے اور وہ انہیں بڑے مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔

وہ عموماً مشق سخن میں غلطاں و پیچاں رہتے اور جب وقت نکلتا تو ہومیو پیتھی کی تبلیغ کرتے میں آہستہ آہستہ ہومیو پیتھی پر ایمان لاتا چلا گیا۔ شروع شروع میں ذرا الجھن ہوئی لیکن پھر بہت جلد طبیعت مناسبت پر آ گئی اور چپکے چپکے معالجے شروع کر دیئے مجھے ان میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی لیکن شعر و ادب کا ذوق اپنے سائے میں دوسرے ذوق کو کہاں پنپنے دیتا ہے چنانچہ میں ہومیو پیتھی کو روزی کا ذریعہ نہ بنا سکا لیکن اس طریقہ علاج پر یقین استوار ہو گیا۔ میں اب تک اس معالجے سے نہ غافل ہوں نہ مایوس بلکہ اس میں میرے کچھ تصورات اور ایجادات بھی ہیں جو ہنوز کتابوں میں دستیاب نہیں۔ بعض اوقات نوجوان مریض اپنے حالات چھپا لیتے ہیں اور علامات سے مکمل مرض کی غایت پر نظر نہیں جاتی۔ میں ایسی حالت میں مریض سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے غایت معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ جو مریض کی احتیاط، شرم اور نرم لہجے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر طاہر کی وفات کے بعد میں نے اپنے بڑے لڑکے محمد ذیشان دانش کو بھی اسی فن کی طرف رغبت دلائی اور اسے تاکید کی تھی کہ غریبوں کی خدمت کے لیے ہومیو پیتھی طریق علاج خدمت اور عبادت دونوں ناموں سے پکارا جا سکتا ہے اور یہ آسان ذریعہ ہے خدمت خلق کا۔

میں نے اسے ڈاکٹر محمد رفیق کا شاگرد کرا دیا تھا جو ہومیو پیتھی کی سیکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں اور رفاہ عام کے لیے اس فن کے معلم بھی۔ ان کی اہلیہ حشمت آرا جاب بھی ہومیو پیتھی میں بڑی سوجھ بوجھ کی مالک ہیں اور شفا ان کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن انہیں بھی شاعری کا ذوق اس حد تک ہے کہ بعض اوقات جنون کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیق سے سرٹیفکیٹ حاصل کر کے محمد ذیشان لندن چلا گیا۔ یوں تو وہ ٹکسٹائل کا ماہر ہے لیکن اس کا ہومیو پیتھی کا ذوق اس قدر بڑھا کہ اس نے لندن سے اس کا ڈپلوما حاصل کر لیا اور اب ایجاد و اختراعات کی طرف رجوع ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس کی ٹیکسٹائل کی مہارت اس کے سائے میں دب کر رہ گئی اب وہ دن رات اسی میں منہمک رہتا ہے اور ایک جنون ہے وہ کہیں قرار نہیں پاتا۔

طلسمی انگوٹھی

دانش آباد میں شام کے وقت ہمایوں شفیق محمد عثمان اور میں نجانے کس گفتگو میں مصروف تھے کہ ان کا ایک دوست خواجہ طارق حسن آیا - انہوں نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں ایم اے او کالج کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں چھ چھے سات سات سال کے کئی ایک بچے کھیل رہے ہیں پیار سے ایک دوسرے کو لپٹتے اور ہنس ہنس کے دوہرے ہوئے جا رہے ہیں انہیں میں سے ایک بچہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے پوچھا ''بیٹے تم اتنا کیوں ہنس رہے ہو کیا بات ہے؟

اس نے کہا کچھ نہیں ایک جادو کی انگوٹھی ہے آؤ آپ کو بھی دکھاؤں'' سامنے تو تھا ہی میں ساتھ ہولیا - میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک ایک لڑکا چھپا چھپا کے ایک انگوٹھی دور پھینک دیتا ہے اور وہ انگوٹھی ان لڑکوں میں پھر آ گرتی ہے - میں حیران رہ گیا اور ان سے کہا ''لاؤ میں پھینکتا ہوں'
انہوں نے کہا ''بسم اللہ'' میں نے پوری طاقت سے انگوٹھی کو فضا میں اونچائی کے ساتھ پھینکا مگر وہ انگوٹھی بچوں سے مخاطب ہونے سے پہلے بچوں میں آ پڑی میں نے سامنے سے ایم - اے او کالج کے چوکیدار کو بلایا اور کہا ''دیکھو تم یہ انگوٹھی کالج کے احاطے میں جا کر کہیں دور پھینک دو'' اس نے پوچھا ''کیا بات ہے آپ کیوں پھنکوا رہے ہیں؟ انہیں میں سے ایک لڑکے نے کہا'' جناب یہ جادو کا کھیل ہے یہ انگوٹھی پھر یہیں آ جائے گی'' چوکیدار نے کہا ''اچھا انگوٹھی لاؤ اور اس سے ہاتھ دھو لو اب یہ نہیں آ سکتی -''

چنانچہ وہ انگوٹھی لے کر کالج کے احاطے کی مغربی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جدھر لیاقت آباد کی گنجان آبادی ہے پھر اس نے انگوٹھی اس زور سے پھینکی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محلہ پار کر جائے گی - وہ انگوٹھی کو پھینک کر لڑکوں کو شرمندہ کرنے کے لیے آ رہا تھا اور ابھی لڑکوں تک نہیں پہنچا تھا کہ لڑکوں نے دور سے ٹی لی کر کے وہ انگوٹھی دکھائی - چوکیدار نے کہا ''کوئی دوسری انگوٹھی ہوگی'' بچوں نے کہا اچھا اسے پھینک آؤ دیکھو واپس آتی ہے یا نہیں چوکیدار نے وہیں کھڑے ہو کر انگوٹھی اس زور سے فضا میں پھینکی اور ایسا معلوم ہوا کہ دور مدرسۃ البنات والی سڑک پر جا کے گری ہے مگر پھر دیکھا تو وہ انہیں

لڑکوں کے پاس تھی اب تو ہم دونوں حیران تھے ہم وہاں سے خوفزدہ ہو کر چل دیئے چوکیدار کا ڈ
کے احاطے میں داخل ہو گیا اور میں آہستہ آہستہ اس کے متعلق سوچتا ہوا یہاں آ گیا۔

میں نے ان سے پوچھا ''تم نے اتنی دیر وہاں لگائی یہ بھی معلوم کیا کہ وہ انگوٹھی کس لڑکے کی تھی
یا ان کے ہاتھ کہاں سے آئی تھی میرا تو خیال ہے کہ یا تو وہ سب بچے جنوں کے تھے یا ان بچوں میں
کوئی جن کا بچہ کھیل رہا تھا اور اسی نے دوسرے بچوں کو چکر میں ڈالا ہوا تھا ورنہ انگوٹھی کا اس طرح
واپس آنا سمجھ میں نہیں آتا یہ تو کسی خاص نظر یا خاص کشش کا اثر ہے۔''

وہ اس پر خاموش رہا اور کہا ''اس وقت یہ خیال ہی نہیں آیا کہ اس کی تحقیق کروں اب آپ کے
کہنے سے ہوش آیا۔''

سگ گزیدہ

عاشق الرحمان لکھنو کے قرب وجوار کا رہنے والا تھا اس میں شاعرانہ عادات وصفات بدرجہ اتم
موجود تھے، سلیس اور بے جھول اردو بولتا تھا، ہر چند کہ وہ لاہور سے دس بارہ میل پر ایک معمولی سے
گاؤں میں رہتا تھا، مگر خلاملا کے باوصف اس کی زبان اور معاشرت پر ماحول اثر انداز نہیں ہوا تھا، وہ
چٹھی رساں تھا مگر اس کی شرافت اور ہر دل عزیزی کے باعث گاؤں میں بڑی عزت تھی، پاس پڑوس
کے لوگ اس کے مداح تھے اور وہ عزیزوں کی طرح ان کی خوشی اور غمی میں شریک رہتا اور مفید
مشورے دیتا، اردگرد کی عقیدت، خلوص اور محبت سے وہ اپنی غریب الوطنی کو بہلاتا رہتا جیسے بانجھ
عورتیں پلاسٹک کے کھلونوں کو کپڑے پہنا کر خوش ہوتی ہیں، اس کا کام تھا کہ ڈاک خانے جا کر اپنے
آس پاس کے چکوں کی ڈاک لے آتا اور تقسیم کر دیتا اس کے مکان کے سامنے ایک پیپل کا درخت
تھا اور چند قدم کے فاصلے پر ایک کنواں!

عاشق الرحمان میں ایک کمال یہ تھا کہ جسے پاگل کتا کاٹ لیتا وہ پیپل کے تنے پر ٹانگ
رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور لوگ سگ گزیدہ کو اس کی ٹانگ کے نیچے سے نکال دیتے اور آن کی آن میں وہ
مریض اچھا بھلا ہو جاتا۔ ایک دو نہیں دسیوں بیسیوں واقعات ہیں کہ منہ سے جھاگ دیتے اور کتے کی
طرح بھونکتے سگ گزیدہ آئے اور عاشق الرحمان نے پیپل کے تنے پر ٹانگ رکھ کر محراب سی بنا دی

اور لوگوں نے مریض کو رسوں میں باندھ کر کھینچ کر ٹانگ کے نیچے سے نکال دیا اور یہ مریض اپنے حواس میں آ گیا پاس والے کنویں سے عاشق الرحمان دو ڈول پانی اس پر ڈلوا دیتا اور مریض ہنستا کھیلتا گھر چلا جاتا' اس عمل سے قرب و جوار کے دیہات میں بھی اس کی شہرت تھی اور مرد و زن میں اس کے چرچے رہتے۔

ایک دن تین آدمی آئے جن میں دو میاں بیوی اور ایک ان کا بچہ' بچے کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور پلے کی طرح کبھی بھونکتا کبھی غراتا اور کبھی ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا جیسے کتے کے کوئی لکڑی یا اینٹ مار دے' اسے انہوں نے رسوں سے باندھا ہوا تھا۔

عاشق الرحمان سے بصد لجاجت کہنے لگے' منشی جی ہمارے بچے کو باولے کتے نے کاٹ لیا ہے اور اسے ہڑک ابھر رہی ہے خدارا اسے اس عذاب سے نجات دلوائیں ہم عمر بھر آپ کے غلام اور دعا گو رہیں گے اور خدا اجر دے گا۔''

عاشق الرحمان اٹھا اور پیپل پر ٹانگ کی محراب بنا کر کھڑا ہو گیا' اور کہا اسے میری ٹانگ کے نیچے سے گزار دو انشاء اللہ ابھی صحت یاب ہو جائے گا۔'' انہوں نے بچے کی ٹانگ میں رسی باندھ کر عاشق الرحمان کی ٹانگ کے نیچے سے گزار دیا وہ اسی وقت دیکھتے دیکھتے شفا پا گیا۔ لیکن عاشق الرحمان کی نظر جب اس پر پڑی تو اس کا قد پچیس تیس فٹ کا تھا وہ حیرانی سے بے ہوشی میں چلا گیا دوسرے روز ہوش آیا تو اپنے اہل و عیال سے یہ واقعہ بیان کیا اور بیان کرتے کرتے پھر بیہوش ہو گیا اور تیسرے روز اللہ کو پیارا ہو گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

میرے کرم فرما جناب اخلاق احمد کا بیان ہے کہ عاشق الرحمان کے گھر روپے کی ریل پیل ہو گئی اور اس قدر دولت آئی کہ مرحوم کے بیوی بچے عمر بھر کو فکر معاش سے بے نیاز ہو گئے۔

اب عاشق الرحمان کا لڑکا بھی اپنے مرحوم باپ کی طرح سگ گزیدہ کا اسی طرح معالجہ کرتا ہے اور وہی اثر ہوتا ہے۔

سمبل ازم اور تجریدی ادب

اس میں شک نہیں کہ عمل ارتقاء کے تحت گردوپیش کے حالات ادلتے بدلتے اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں' سیاسی' معاشی اور جدلی تقاضوں کے ایماء پر رسم و رواج اور یقین و عمل کے سانچے بھی عجیب عجیب ہیئت میں نمودار ہوا کرتے ہیں لیکن حقائق اوران کے سائے میں پیدا شدہ روایات تبدیل نہیں ہوتے تغیر صرف ان معمولات و مشاغل اور حالات و اطوار میں آتا ہے جو حقیقی اور روایتی طرز سے ملتے جلتے تو ہیں لیکن حقیقی نہیں ہوتے البتہ بعض اوقات اوچھے اور پایاب علم کے دانشور حقائق و معارف ہی کو توڑ مروڑ کر اپنے انداز میں ڈھال لیتے ہیں اوراس پر اپنی تخلیق کا ٹھپا بھی لگا دیتے ہیں لیکن چونکہ ان میں اصلیت نہیں ہوتی اس لیے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب وہ بدلتے ہوئے زمانے اور ترقی کرتے ہوئے انسانی دماغوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

بعض لوگ شہرت کی بھوک اور مقبولیت کی تشنگی میں ایسے ایسے حقائق پر حملہ آور ہوتے ہیں جو ہزاروں برس سے جوں کے توں شاداب اور موثر چلے آرہے ہیں۔

اور یہ ایک ہی شاعر نہیں ہے بلکہ ایک جماعت ہے جو شہرت کے حصول میں نیچے اونچے کھڈوں میں آسمانی کتابوں کی تغلیط اور پیغمبروں کا انکار کرتی پستی کی طرف اترتی چلی آرہی ہے یہ انکار بعض مابعد الطبیعیاتی حوالوں کی نفی تو کرتا ہے لیکن وہ حوالے اصل حوالے نہیں بلکہ روایتی طرز پر حوالہ تراشی کی ایک مجرمانہ سعی ہوتی ہے ان کے اس ارتکاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقلیدی نظم و ضبط اور تمدنی و معاشی نظام سے تہذیب کا رشتہ' عارضی طور پر ہی سہی منقطع ہونے کے امکانات ضرور نظر آنے لگتے ہیں تو آنے والا حال ان پر پہلے تنقیدی اور تحقیقی نظر ڈالتا ہے ان میں جو مجسمے اور تصویریں بے جان ہوتی ہیں۔ وہ مخلوک ہو جاتی ہیں اور جن میں زندگی کے آثار ہوتے ہیں خواہ وہ اقوال ہوں یا نظریات ہر نظر کے انتخاب میں آجاتے ہیں۔

اس سلسلے کا ایک گروہ تو وہ ہے جو حقائق پسند ہے اور وقت کے تقاضوں پر لبیک کہہ کر نئی معلومات اور جدید علوم کے تازہ ترین نظریات پر یقین رکھتا ہے اور ماضی کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ تو

حال کی اصلاح بھی ماضی کے نشیبوں ہی کو دیکھ کر کرتا ہے۔ دوسرا گروہ اقوال و روایات، تلمیحات و محاورات کو توڑ مروڑ کر جو نئی شکل دیتا ہے اور ایجاد بندہ کا نعرہ لگا کر پیش کرتا ہے وہ ماضی سے اپنے دور کا رشتہ بھی استوار نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ اس گروہ میں جدید علامتوں کا کوئی نظام نہیں بلکہ گڈمڈ قسم کے مفروضے ہیں جن کا کوئی سلسلہ کہیں سے نہیں ملتا اور ان کی زنجیر کی چھوٹی بڑی کڑیاں بکھری نظر آتی ہیں اور اگر کہیں دو دو چار چار ہم خیالوں کی گروہ بندی ہوتی بھی ہے تو ان کے عمل سے قنوطیت کی مرطوب ہوائیں چلنے لگتی ہیں جن میں تعمیر و ترقی کا کوئی نمایاں پہلو نہیں ہوتا۔

انہیں میں سے کچھ لوگ ہیں جو ماضی پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ماتم میں مبتلا ہیں وہ بھی صحیح راستے سے دور دور جا رہے ہیں اور ان کے ان معمول و مشاغل سے حال پر بھی مایوسی کی لہریں تیرتی دکھائی دیتی ہیں اور آثار میں التباس، الجھن توارد۔ اور کشمکش کی ریل پیل ہوتی ہے ان کا ماضی ان کے حال کی راہنمائی نہیں کرتا اور یہ اسی کہولت میں ارتقاء کی کڑیوں سے نکل جاتے ہیں، راہ راست پر صرف وہ دانشور ہیں جو ماضی کو سامنے رکھ کر کج فکری اور گمراہی کے کانٹوں سے حال کے راستوں کو پاک کرتے ہیں انہیں راستوں کی روئیداد سفر ان کی ذات کی توانائی ہوتی ہے اور مابعد الطبعیات کے علاوہ حشر و نشر سے بھی ان کا رابطہ شکست نہیں ہوتا اور وقت کی ترقی پسند جماعت سے بھی وہ علیحدہ شمار نہیں ہوتے۔

جو لوگ آسمانی کتابوں اور مابعد الطبعیاتی تصورات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے انہیں ہر قدم پر ندامت ہی نہیں ناکامی کے احساس سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے یہ انکار ان کے اعتماد و اعتقاد کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جس سے تقابل و تفحص کی سکت باقی نہیں رہتی بلکہ یہ ایک ایسا یک رخا تصور ہوتا ہے جو کسی طرف بھی نظر اٹھانے نہیں دیتا۔

اس بزم آب و گل کا ایک انسان اگر اپنی زندگی میں پورے نظام کائنات میں تغیر و تجدید کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ دیوانگی تو کہلائی جا سکتی ہے اس میں بصیرت کو کوئی دخل نہیں جو لوگ ایسی جرات کرتے ہیں ان کا مقابلہ پورے انسانی معاشرے سے ہوتا ہے اور جس میں انہیں کامیابی ناممکن ہے نتیجہ یہ کہ روز روز کے ٹکراؤ سے یا تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں یا پھر دفاعی ہسپتال آباد کرتے ہیں حالانکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے ان کی نیت میں دنیا کی تخریب نہیں ہوتی البتہ فکر ناقص اور اصول کار غلط ہوتے

ہیں یہ تو صرف محمد عربی کی ذات بابرکات تھی کہ آسمانی کتاب کے مطابق زندگی بسر کر کے دنیا پر ثابت کر دیا کہ اس کتاب کے احکام تمام تر قابل عمل ہیں مگر قرآنی معاشرہ لانے میں رسول مقبول ﷺ کو بھی تصادم اور ٹکراؤ سے دوچار ہونا تو ضرور پڑا لیکن ان کے پیغام میں ایسی خدائی قوت تھی کہ اس کی ہمہ گیری کو آج تک کوئی چیلنج نہیں کر سکا اگر کہیں سے کوئی اس قسم کی غلط آواز اٹھی بھی تو اسے اسی طرح کا جواب بھی دیا گیا اسی لیے آج تک وہ شریعت اسی طرح زندہ و پائندہ چلی آ رہی ہے اور یہ اسی تعلیم کا اثر ہے کہ مسلمانوں کو نہ جانے کتنے انقلابوں سے گزرنا پڑا اور کس قدر بدلتے ہوئے نہیں بچھڑے ہوئے معاشروں کا عبور ان کے فرائض میں آیا لیکن اس تیرہ سو برس کے قیامت خیز ہنگاموں اور زہریلے موسموں سے ہنوز بھڑتے چلے آ رہے ہیں سینکڑوں تہذیبیں ہزاروں تمدن اور بے شمار طرز حیات ان کے راستوں کی گرد میں چھپ گئے لیکن یہ آج تک اسی فانوس کو لیے زندگی کے صحیح راستوں کی داغ بیل ڈال رہے ہیں اور الہیاتی رہنمائی ان کی دستگیری کر رہی ہے اس کے مقابلے میں تقلیدی طرز حیات وایجاد بندہ سے اصول تمدن کے محاذوں پر خاک اڑ رہی ہے اور کچھ نہیں۔ ان نئے تصورات وخیالات کا انسان ذاتی اور انفرادی طور پر تو شاید اطمینان کر دے گا؟ اور جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے اس میں تو ہر زیرک انسان اپنی جگہ مطمئن ہی ہے اگر نہیں بھی ہے تو ندامت کے سد باب کی خاطر وہ خود کو مطمئن بتاتا ہے لیکن اس گروہ کے لوگ جو خود کو مطمئن بتاتے ہیں وہ حقیقت میں مطمئن نہیں ہوتے کیونکہ ان کے وضع کردہ اصول حیات کے گرد سیکڑوں الجھنوں' خامیوں اور تعبیروں کا میلہ لگا رہتا ہے اور انسان تو آخر انسان ہے وہ بیک فکر اس ہنگامے کا احاطہ نہیں کر سکتا اس عالم میں بعض لوگ تو بوکھلا کر خاموش ہو جاتے ہیں اور بعض اپنی اس تخلیقی برتری کو قائم رکھنے کے لیے محرومیوں اور ناکامیوں سے نبرد آزما رہتے ہیں ان کی جدوجہد میں فرق نہیں آتا۔ اس ضد اور اس بے بصیرتی کے اصرار کو ان کا نارس گروہ اور قنوطی حلقہ آبرومندی کہتا ہے اور بسا اوقات مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کئی ناتندرست دماغ تو اپنی بلند پروازی میں اس قدر اونچے پہنچ جاتے ہیں کہ زمین کے باشندے ان کی نظر سے اور وہ زمین کے باشندوں کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور جب وہ تھک کر زمین پر اترتے ہیں تو اپنی تہ کو نہیں پہچان سکتے اور جس فضا کی وہ بات کرتے ہیں وہاں کے باشندگان خاک کے لیے وہ زبان و بیان بالکل اجنبی ہوتا ہے اسی سلسلے کے کچھ لوگ فرائڈ کے فلسفے سے بھی

متاثر ہیں اور ان میں علمی زعم اپنی حدود سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ زمانہ ان کے نظریات کو عجیب وغریب شے خیال کرتا ہے حالانکہ انسان نہ جانے ایسی ایسی کتنی ہی پنیریوں کو نیست و نابود کر چکا ہے۔ یہ لوگ روحانی مسائل کو ایک لایعنی مفروضوں کا سلسلہ خیال کرتے ہیں اور اخلاقی ورثے کو ایک فیشن سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس رویہ کو وہ فطری طریق کار کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ یہ فطرت نہیں جبلت ہے اور جبلت اپنے آغاز میں ایک شعور رکھتی ہے جبلت کے معنی ہیں پیدائشی عادت بچپن میں جس کو اپنے ماحول میں جو عادتیں پڑ جاتی ہیں وہ جبلت کی تعریف میں آتی ہیں اور سعدی کا قول ہے۔ جبل گردد جبلی نگردد

ممکن ہے موجودہ ترقی یافتہ زمانے میں جبلت قابل اصلاح وترمیم ہوگئی ہو لیکن فطرت میں تو ترمیم وتنسیخ ناممکن بات ہے آنکھوں سے انسان دیکھ سکتا ہے سن نہیں سکتا اور ناک سے صرف سونگھتا ہے سنتا نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں دماغی احاطے میں پڑوسی ہیں لیکن فطرت نے جس کو جس کام کے لیے متعین یا تخلیق کر دیا ہے وہ اس حد کو شکست نہیں کرتا۔ بفرض محال جبلت میں ترمیم وتنسیخ ہوتی بھی ہے تو یہ مسئلہ بہت اہم نہیں ہے جب ایک راستہ کھل جاتا ہے تو اس میں سے سیکڑوں پگڈنڈیاں نکل کر چل پڑتی ہیں۔ البتہ اس شکست وریخت کے پیچھے یہ جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ہو اور جس بنیاد پر بھی ہو سکے ایسا طریقہ حیات مدون کیا جائے جس میں تمام موجودہ انتشارات مثلاً اخلاقی الجھنیں، جنسی مشکلات موت وحیات کا فیصلہ اور فرد واجتماع کے تمام ہنگامے یا تو سرے ہی سے نہ ہوں اور اگر ہوں تو وہ عقدے آسانی سے سلجھ جائیں اور کائناتی اصول وحوالہ سے مدون ہوں۔

ان کی کوشش اور نئی ترتیب میں تمام مادی ذرائع، مادی فیصلے اور مادی مسائل حل کرنے کی ایک سعی نامشکور ہوتی ہے اور مابعد الطبیعیاتی مسائل جب سمجھ میں نہیں آتے اور دماغ اس سعادت سے قاصر رہتا ہے تو وہ روحانی مسائل کو سرے ہی سے غائب کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی کا عقبیٰ سے کیا تعلق وہ تو ارتقا کے راستے میں دیوار کی حیثیت رکھتی ہے قد آدم دیوار کی جس میں بے جا پابندیوں اور نامناسب رکاوٹوں کے انبار لگے پڑے ہیں۔ آج کے انسان کو تو گزرے ہوئے دن کا نظام حیات بھی تنقید کا مواد فراہم کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کے نظریات کو کیوں اپنائے اور اس فرسودگی پر کیوں اکتفا کرے جبکہ زندگی کے سامنے نئے

مسائل کا جنگل لہریں مار رہا ہے اور یہ سب ہیں مغربی تعلیم کے اثرات جن سے یقین و اعتماد روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں لیکن کوئی نیا نظام حیات صورت پذیر ہونے میں نہیں آتا اور یہ صنعتی عہد کا ادبی فتنہ انسانی دل و دماغ کا سکون چھینے ہوئے ہے۔ اور اس کی خواہشات کے ریزے جگہ جگہ پامال دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ اس چکا چوند کو غنیمت خیال کر کے اس میں گم ہوئے جا رہے ہیں آج کا انسان جس قدر روحانی حوالوں سے دور ہوتا جا رہا ہے اسی قدر اس پر خارجی اثرات کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے اور یہ اپنی زنجیروں میں جکڑا ہوا سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور اسے کہیں سکون تو کیا ٹھنڈا سایہ بھی میسر نہیں جہاں اس کے اعصاب تھکن سے نکل سکیں نتیجہ یہ ہے کہ تسکین کی راہ ریت میں گم ہو گئی اور اقتصادی و معاشی غربت پھیلتی جا رہی ہے اور اس صبح کاذب نے ایسی بھول بھلیاں بچھا دی ہیں کہ کہیں منزل کے آثار نظر نہیں آتے اور ناکام انسان مایوسیوں کے غرغل اور محرومیوں کے لبادے اوڑھے تجدید اور ترقی پسندی کے جھکڑ میں کانپتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ زبان کے تناقض کے باعث اپنی خواہشات کو الفاظ دینے سے بھی قاصر ہیں اور یہ اس کابوسی کیفیت میں اپنی بڑبڑاہٹ کو سمبل ازم یا علامت نگاری کہتے ہیں اور مجذوبوں کی طرح ان کے منہ سے کوئی کام کی بات تو نکلتی نہیں۔ ہفوات کے جنگلوں میں بنکارتے اور عریانی و فحاشی کے ذائقے چکھتے پھرتے ہیں۔ اس سے پہلے کے بھی تلمیحات اور محذوفات کے بے شمار ہنگامے اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح ضرب الامثال اور محاورات بھی اسی کا جنگل ہیں۔ جو شاخ تراشی کے بعد باقی رہ گئے ہیں اور حقائق سے تعلق رکھتے ہیں یہ وہ یادگاریں ہیں جو انکار و اقرار اور تشکیک کی بھٹیوں سے نکل کر بھی شاداب و تازہ ہیں کیونکہ یہ اپنے تاثرات و خواص سے ہنوز دست بردار نہیں ہوئے اصل میں ناقص تعلیم اور یک رخے رجحان کے باعث اس دور کا کوئی دانشور اپنا نظریہ سوچ سمجھ کر قائم نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ جگہ جگہ مشق و مزاولت اور تشہیر و تبلیغ کے باوجود ان کے اعمال کی گدڑیوں میں جھر جھر اڑ نظر آتے ہیں اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ ان کی اچھی باتیں سننے کے لیے بھی لوگ وقت کی قربانی سے گریز کرنے لگے کیونکہ ان میں بڑی تعداد ایسے نوخیزوں کی ہے جن میں تخلیق کا مادہ تو ہے لیکن ابھی بصیرت پیدا نہیں ہوئی یہ آئے دن فنکاروں میں شمار ہونے کے لیے مختلف انداز سے قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں اور ان کی نقالی سے تخلیق کی محرومی شعر سے وزن کی محرومی اور ترتیب و

تدوین میں علم کا افلاس بولتا ہے۔ ایسے فنکار سماجی اصول وضوابط سے بے زار اور جنسی مالیخولیا میں مبتلا نظر آتے ہیں جہاں وہ کسی تقریب یا ہوٹل میں دو چار اکٹھے ہو جاتے ہیں وہاں انہیں کوئی سنے تو ان کے جوہر کھلتے ہیں ان میں جو ہے وہ تخریب کے مرض کا شکار ہے اور تخلیقی وتعمیری دولت خیال کو تجریدی گوبری سے چھپا کر فرار کو مشرب قرار دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کائنات انسان کے لیے ہے جرم وگناہ کے وجود کی افادیت اور خسارہ اپنے اپنے ماحول کی اصطلاحات ہیں اور بس۔

لیکن ان کے تہذیبی جائزے اور اسلوب حیات کے نئے منصوبے تمام تر غلط نہیں۔ ان کے خذف ریزوں میں ہیرے جواہرات بھی دستیاب ہوتے ہیں لیکن شعور کا دیوالیہ پن اور جستجو کا فقدان ان میں انتخاب کی صلاحیت باقی نہیں چھوڑتا اور جنہیں اس کا خیال ہے انہیں اپنی جستجو کے صلے میں اسی درجے کا مقصد حاصل ہوتا ہے جس درجے کی سعی شعور ہے۔

میں ان نوجوانوں سے نفرت نہیں کرتا اور نہ میرا مشرب اس کی اجازت دیتا ہے مجھے ان سے ہمدردی بھی ہے اور محبت بھی۔ کیونکہ میں تخلیق کے ہنگامے کو دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی فطرت انسانی تخلیق میں اس کے محاسن سے مایوس نہیں۔ بلکہ اگر ہم غور کریں تو اکثر محاسن کی دھاریاں نشیب ہی کے اندھیروں سے ابھرتی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہی نومولود گروہ تلمیح کی جگہ سمبل کو لایا ہے اور کمال یہ ہے کہ یہ جماعت اب تک اس سمبل ازم کا نظام درست نہیں کر سکی ہر شاعر کا ہر شعر میں سمبل جدا ہے وہ کسی دوسرے کی سمجھ میں آئے تو کیسے؟ کوئی الو کو ستاروں کا بادشاہ بتاتا ہے کوئی خرگوش کو تھانیدار کوئی افیون کو پرستش اور بعض بعض تو ایک ایک چیز کے کئی کئی سمبل بنائے پھرتے ہیں حالانکہ سمبل ازم کی ترتیب وتدوین ایسا کوئی مشکل کام نہیں۔ شاید اس کی بنیاد بھی مجھے ہی ڈالنی پڑے کیونکہ میں ان کی اس تحریک کے خلاف نہیں بلکہ ان کی بے مقصدی سے نالاں ہوں۔ اگر سمبل ازم اسی کا نام ہے کہ ہر آدمی اپنی ڈفلی پر اپنا راگ الاپے اور اس میں دوسروں کے کچھ بھی پلے نہ پڑے تو آخر اس شاعری سے کیا فائدہ اور ایسی شاعری کی آخر کون سی ضرورت لاحق ہے۔ یہ کبھی اس بات کو سوچنے پر تیار نہیں کہ ہم جس ملک میں رہتے سہتے اور زندگی بسر کرتے ہیں ہم اس کے کس مرض کی دوا ہیں۔ ہمارا سارا ملک آج معاشی بحران میں مبتلا ہے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں عجیب ادب ہے اور عجیب تر ہیں اس کے ادیب وشاعر ہیں کہ ناداری، فاقہ کشی اور ناقص تعلیم سے پیدا ہونے والی خرابیوں

پر کسی کی نظر نہیں - مزدوروں کسانوں اور دیہاتیوں کی محنت سے فائدہ اٹھانے والے ظالموں کا کوئی محاسبہ نہیں کرتا - تاجروں کے ذخیروں میں لاکھوں من گندم کی موجودگی کے باوجود عوام کی بھوک اور پریشانی کی طرف کسی کی توجہ نہیں - کیا یہ بے توجہی ہمارے تنظیمی سوالات کو اہم سے اہم تر نہیں بنا رہی ہے؟ کیا کوئی شاعر' ادیب' دانشور' لیڈر یا پیشوا اس کا حل سوچ رہا ہے؟ اور سوچ رہا ہے تو وہ حل اب تک پردہ راز میں کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس جدید تحریک کی تہ میں کوئی سیاسی مصلحت کام کر رہی ہو - کیونکہ یہ بے مقصدی بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی - اس ابہام کی شاعری کو ایک حد تک تو روا خیال کیا جا سکتا ہے لیکن اس عقدہ در عقدہ پیچیدگی کا پر چار کچھ نہ کچھ معنی تو ضرور رکھتا ہے کہیں اس ابہام کی تہ میں یہ مقصد تو نہیں کہ مزدور اور سرمایہ دار دونوں کے درمیان ایک بے مقصد ادب کی دیوار کھینچ دی جائے یا فاصلہ دے دیا جائے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے حالات سے بے بہرہ اور نابلد رہے جس سے کوئی انقلابی داغ بیل نہ پڑ سکے - کیونکہ شاعری اور ادب ہی ایسی چیزیں ہیں جو جسموں اور روحوں دونوں کو متاثر کرتی ہیں اور ان سے فکر و خیال کے جنگلوں میں پگڈنڈیاں نکلتی آتی ہیں جو کبھی کبھی خود بخود شاہراہیں بن جاتی ہیں - ہمیں نئی شاعری سے بالکل کد نہیں بلکہ ہم تو ارتقاء کے ماننے والوں میں سے ہیں لیکن قوم اور ملک کے نوجوانوں کو بے مقصدی کی افیون میں اونگھتے اور جھانجھ میں یہ اول فول بکتے نہیں دیکھ سکتے -

آلودہ غبار

احمد ہمیش

میں جب بھی پاک ٹی ہاؤس میں جاتا تو ایک لڑکے کو عموماً دیکھا کرتا وہ نوجوانوں میں ہے لیکن ہر آدمی اس کا مذاق اڑاتا ہے ایف سی کالج کے ایک مشاعرہ میں میرا اس سے رسمی سا تعارف ہوا اور جب ذرا نزدیکی ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بے روزگار ہے اور اس کا دارومدار دوستوں ہی کے رحم و کرم پر ہے کمزور ایسا کہ محنت و مشقت کے قابل نہیں اور ان دنوں ڈاکٹروں نے اسے دق کا مریض بھی بتا دیا تھا۔

شرمیلا ایسا کہ بے تکلفی سے کوسوں دور بلکہ متنفر، چہرے پر افلاس کی زردی اور دست و بازو میں کم خوری کی نقاہت لیکن اس کی نظموں میں اس کے دل کی چنگاریاں اور درد کی لہریں موجود!

جب سب لوگ اس سے دامن بچانے لگے اور ڈاکٹروں نے اسے دق کے وہم میں مبتلا کر دیا تو میں اسے اپنے مکان پر لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس کی خوراک میں باقاعدگی آ گئی تو وہ تندرست ہو جائے گا اور تندرست ہو گیا تو اس دور کا اچھا خاصا شاعر کہلائے گا وہ آزاد نظمیں کہتا تھا لیکن ان میں اس کی وہ فطری خصوصیت نمایاں تھی جو ایک شاعر کے ہیولے میں ہوا کرتی ہے دو چار روز بعد اس نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ ''میرے والدین موجود ہیں اور ایک غیر ملک میں ہیں میں نے ان سے علیحدہ ہو کر بڑی غلطی کی اور اب میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں آپ میرا پاسپورٹ بنوا دیں۔'' میں نے کہا تم ذرا تندرست ہو جاؤ۔ ضرور اس میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔ میں تمہاری اس حالت سے مایوس نہیں۔ انشاء اللہ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے اور اگر اس اثنا میں تم نے یہاں سے ناجائز راستوں سے جانا چاہا تو یاد رکھو مشکل میں پھنس جاؤ گے ہر چند کہ اس ملک میں شاعر کی کوئی قیمت نہیں صرف گروہ بندی اور توڑ جوڑ معیار قابلیت ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ادب کی عظمت اپنی جگہ بڑی چیز ہے خود موت کے ہاتھ میں ہاتھ دینا کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں۔

احمد ہمیش میری اس گفتگو سے سہم سا گیا اور پھر اس نے پاسپورٹ کے لیے نہیں کہا۔

ایک دن جبکہ وہ باہر گیا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کے دریچے میں سطح پر سے کچھ پلاسٹر اکھڑا ہوا ہے میں نے ادریس سے کہا یہ پلاسٹر کیسے اکھڑ گیا؟ اس نے کہا کہ جب احمد ہمیش یہاں بیٹھتا ہے تو تھوڑا تھوڑا توڑ توڑ کر کھاتا رہتا ہے مجھے حیرت ہوئی میں نے یہ تو سنا تھا کہ بعض لوگوں کو مٹی کھانے کی عادت ہوتی ہے بعض کو کوئلہ کھانے کی لیکن یہ پلاسٹر ٹھونگنا عجیب بات ہے میں بیک فکر سمجھ گیا کہ احمد ہمیش کی جسمانی کمزوری صرف اس لیے ہے کہ اس کا معدہ تو کنکر پتھر پینے میں جٹا رہتا ہے تندرستی کیسے بحال رہ سکتی ہے۔

میں نے اپنے پرانے دوست حبیب اللہ خان سعدی کو بلوایا ان دنوں وہ کمالیہ ضلع لائل پور ہی میں مقیم تھے۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اس لڑکے احمد ہمیش کو اپنے ہمراہ باغ میں لے جائیں اور صرف کھانے پینے ہی کا نہیں دواؤں اور ڈاکٹروں وغیرہ کا بھی انتظام کر دیں یہ ذہین لڑکا ہے مگر افلاس کا مارا ہوا ہے غلط صحبتیں اسے تھکا کر راستہ میں پھینک گئیں اور اب یہ قابل رحم ہے اس میں شعر و ادب کے جراثیم بھی اچھی نسل کے ہیں اگر سنبھل گیا تو ممکن ہے کارآمد آدمی نکلے۔

حبیب اللہ سعدی اسے سلطان کی طرح اپنے باغ میں لے گئے اور وہیں اس کے رہنے کا انتظام کر دیا وقتاً فوقتاً وہ اس کے لیے لاہور سے زیتون یا مچھلی کا تیل اور دوسری دوائیں بھی لے جاتے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک مشاعرہ میں کمالیہ جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ گیس کی روشنی میں سامنے ہی اگلی صف کے شروع میں احمد ہمیش بیٹھا ہے چہرے کی زردی گلابی پن میں بدل گئی تھی اور ہاتھ پاؤں کی کمانیوں میں لچک آ گئی تھی اس کی پیشانی پر روشنی کی جھلکیاں تیر رہی تھیں۔

جب وہ تندرست ہو گیا تو صحت مندی کے اثرات کچھ اعمال و اشغال کی صورت اختیار کرنے لگے اور اس کے سائے دوسروں کو بھی محسوس ہونے لگے۔

ایک دن وہ اچانک حبیب اللہ سعدی صاحب کی اجازت کے بغیر کمالیہ سے نکل بھاگا اور کبھی لاہور کبھی منٹگمری کبھی لائل پور گھومتا پھرتا رہا۔ اب سنا ہے کہ کراچی میں ہے اور اسے اراکین ریڈیو نے کہیں چپکا لیا ہے۔

یوں تو مجھے خوشی ہے کہ ایک شاعر اپنی تندرستی کے حصول میں کامیاب ہو گیا لیکن کاش وہ سعدی صاحب کی اجازت سے جاتا تا کہ موصوف آئندہ بھی مصیبت زدہ لوگوں کی امداد پر تیار رہتے اور

مظلوموں نیز صاحب ضرورت لوگوں کے لیے گنجائش رہتی - عمر اور تندرستی کے ساتھ بعض لغزشیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو روبرو ہونے سے باز رکھتی ہیں لیکن اس پوزیشن کو کون نہیں جانتا اسے ناقبل معافی و تلافی جرم کیوں گردان لیا جائے اور اس شرم کو حیا اور غیرت کا نام دے کر دوسروں کے راستے کیوں رد کئے جائیں-

میں دو ایک بار کراچی گیا اور اس سے ملنے کو دل بھی چاہا لیکن خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے بھی چشم پوشی کرنے لگے کہ مبادا میں اس سے کمالیہ چھوڑنے کا سبب پوچھنے لگوں حالانکہ زندگی اور اس کے حادثات و واقعات سب رفتنی وگزشتنی ہیں-

بعض بعض انسان

یہاں کئی انسان مجھے ایسے بھی ملے جنہیں خداوند کریم نے علم' بردباری' محبت اور فقیر دوستی کے علاوہ انسانیت کے جوہر سے مالا کیا تھا' اور انہوں نے سیکڑوں نہیں ہزاروں دلوں کو مسخر کیا اور اپنے اردگرد کے احباب کے غم کو اپنا غم خیال کر کے ان سے وہی سلوک روا رکھا جو بھائی ایک حقیقی بھائی سے رکھتا ہے- میں نے انہیں کبھی حسد کی چھوت اور تعصب کی لوت میں مبتلا نہیں پایا-

ان میں ایک شخصیت تو خواجہ دل محمد مرحوم کی ہے' میں نے جب بھی ان کے عادات اور کردار پر نظر ڈالی' انہیں شریف انسان اور اچھا مسلمان دیکھا- وہ دل کے نرم اور غریبوں کے دستگیر تھے' اپنی پرنسپلی کے زمانے میں انہوں نے سیکڑوں غریبوں کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا اور وہ ڈگریاں لے لے کر اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہوئے-

پاکستان بنا تو انہوں نے مہاجرین سے ایسا سلوک روا رکھا جو اعزہ و اقرباء اور بڑے بڑے مخیرّوں میں مثال نہیں رکھتا' خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت دے- انہیں اب تک کئی بیوائیں اور یتیم دعائیں دے رہے ہیں' وہ ریاضی میں جس قابلیت کے مالک تھے' یہ ملک مدتوں ایسا انسان پیدا نہیں کر سکے گا- وہ صف اول کے شاعر بھی تھے اور اونچے درجے کے ادیب بھی مگر افسوس کہ اس سرزمین میں شرافت کی قلم بمشکل ہی بار آور ہوتی ہے-

خواجہ صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں پر اب تک کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری!

کیونکہ موجودہ دور کے دانشور تو اپنی ہی مڑھیوں کی لیپ پوت میں مصروف ہیں' انہیں اپنے پردے کی دیواروں پر گوبری پھیرنے سے کہاں فرصت' دیکھا جائے تو ان کا بھی قصور نہیں' موجودہ دور اسلامی روایات اور محاسن کے ٹیکسلاؤں کی کھدائی سے جان چراتا ہے اور صرف اپنے اہرام کی تعمیر کے جوڑ توڑ میں مبتلا ہے اور بس!

انہیں یہ خبر نہیں کہ خدائے قدوس کسی کی محنت کو ضائع نہیں ہونے دیتے اور خلوص سے کیا ہوا کام کبھی نہ کبھی قیمت پاتا ہے۔

پروفیسر منیر الدین منیر چغتائی

منیر چغتائی کو میں نویں جماعت سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ آکسفورڈ سے ڈی فل کر کے آئے اور تقریباً پانچ برس انگلستان میں رہے لیکن انہوں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور اپنی اسلامی تہذیب کے دامن کو داغ دھبے سے پاک وصاف رکھا' وہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ حافظ قرآن بھی ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھاتے ہیں۔ عقیدے میں شگاف اور دامن میں جھرکی نہیں آئی' وہ ایک صالح نوجوان ہیں اور اسلامی سیاسیات پر جس قدر گہری نظر رکھتے ہیں وہ کم اساتذہ میں ملے گی' یوں تو وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی' لیکن ان کا درس وتدریس کا ذوق اور تقسیم علم کا لپکا ان کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے' وہ شعر بہت کم کہتے ہیں مگر جو کہتے ہیں وہ اپنے مفاہیم میں لنگر ڈالے ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی نثری تحریروں کے چول بھی کسے ہوتے ہیں اور فقروں کے جوڑ کھڑ اتے نہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم جیسا ادیب شہیر پاکستان میں مشکل سے پیدا ہوگا۔ وہ اردو دنیا کا ایک جیالا سالار تھا جو لچکنا نہیں جانتا تھا۔ اس سرزمین نے صدیوں کے بعد بے جگر اور سنگین عزائم کا انسان پیدا کیا تھا۔ جو جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ یوں تو اس سیکڑوں میل کی بھیڑ بھڑ کا میں ہزاروں ہی انسان اردو کی توسیع واشاعت کے دعویدار ہیں لیکن مولانا صلاح الدین احمد جیسا گھر پھونک تماشا کرنے والا ادیب موصوف کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ ادبی دنیا کے
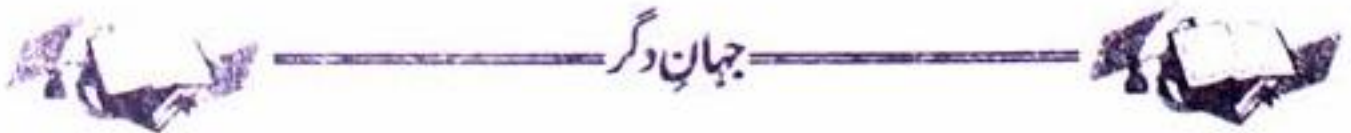
اوراق مولانا موصوف کے اسلوب نگارش کی یادگار ہیں- اہل بصیرت جانتے ہیں کہ قدرت نے اسے کیسا رسا ذہن عطا کیا تھا- اس کا تحقیقی اور تعارضی انداز ہر شخص کے بس کا روگ نہیں- وہ اپنے طرز تحریر کا خود ہی موجد تھا اور خود ہی خاتم-

مولانا صلاح الدین نے ادب ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اس نے بہت سے ادیبوں کو عالم آشنا کیا ہے- ان کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں جو ادیب چھپتے تھے وہ قریب قریب مولانا موصوف ہی کی دریافت تھے چنانچہ پنجاب کے مشہور اور آزاد خیال ادیب میرا جی اور چودھری ابوالفضل صدیقی جیسا ادیب بے بدل بھی ادب کو مولانا موصوف ہی کی دین ہے-

جس طرح مرزا غالب نے اپنے دور میں اردو کے راستے میں لوہے کے خاردار تار لگا دیئے تھے اور اگر داغ اور ذوق نہ ہوتے تو آج اردو زبان نہ جانے پاتال کے کس گوشے میں ہوتی بالکل اسی طرح مولانا صلاح الدین کے دور کی حکومت بھی اردو زبان کی توسیع و اشاعت میں تامل کر رہی تھی- اس وقت میں اگر صلاح الدین کا دم نہ ہوتا تو اردو زبان کو بڑا زبردست دھچکا پہنچتا لیکن یہ اردو زبان کے شباب کا آفتاب اور علم و فن کا سحر خیز ادیب اپنے بیگانے کے امتیاز کے بغیر سعی مسلسل میں مصروف رہا-

مولانا صلاح الدین احمد نے ہی اس خطہ خوابیدہ کے پڑھے لکھے اور سند یافتہ طبقے کو خود شناسی کی طرف متوجہ کیا اور انہیں تصنیف و تالیف کی اہمیت بتا کر ادب میں ایسے کاموں کی داغ بیل ڈال دی جو ترقی یافتہ ملکوں کی تقلید ضرور تھی لیکن اس ملک کی ادبی تاریخ کے لیے راستے کھل گئے جو مدتوں سے غفلت کی دھند اور پست خیالی کی کہر میں ڈوبے ہوئے تھے- آج بازار میں سیکڑوں قابل قدر ادبی کتابیں موجود ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مولانا صلاح الدین احمد کی کوشش کا بنیادی پتھر اردو اکیڈمی کا قیام ہے- اردو اکیڈمی کے قیام سے پہلے مولانا کی گفتگو مجھ سے ہوئی- انہوں نے کہا کہ میں پاکستان میں اردو زبان کی توسیع و اشاعت کے لیے نولکشور جیسا ادارہ قائم کرنا چاہتا ہوں جو ہر مکتب فکر کی کتابیں چھاپ کر سستی قیمتوں سے عوام میں پہنچائے اگر موصوف زندہ رہتے تو مجھے امید ہے کہ وہ یہ کام کر گزرتے مگر افسوس کہ انہیں موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا- لیکن ان کی مخلصانہ سعی مسلسل اور کوشش بلیغ کے خطوط اب تک روشنی دے رہے ہیں اور یہاں علم و ادب کی

تصنیف وتالیف کا کام نہیں رکا - اگر چہ میں اس رفتار ادب سے مطمئن نہیں لیکن یہ صرف اردو دوستی کا ثبوت ضرور ہے جیسے خانقاہ میں اگر بتی کا دھواں -

مولانا صلاح الدین اور ان کے کام پر اب تک کوئی اچھی اور معیاری کتاب نہیں آئی حالانکہ ان سے کم درجے کے لوگوں پر کتابیں موجود ہیں - نہ جانے اس جرم میں ادارہ ہائے تحسین باہمی کا ہاتھ کہاں تک ہے؟

یہ بے انصافی اور محسن فراموشی نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے اس مخلص علم کو فراموش کر دیا ہے جس نے اپنی زندگی ذاتی سرمائے سمیت اردو کے لیے وقف کر دی تھی - آج کی تمام فکری جولانیاں اور علمی توانائیاں اسی کے راستے کا اڑا ہوا غبار ہے جو ہر ہوا کے جھونکے کو مہک دیئے چلا جا رہا ہے -

ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب

موصوف سر سید احمد خان کے خاندان سے تھے زبانوں میں عربی، فرنچ، جرمن، انگریزی، فارسی اور اردو پر عبور تھا - جن دنوں وہ چنیوٹ میں کالج کے پرنسپل تھے، ربوہ میں ایک تقریری مقابلہ تھا جس میں سید وقار عظیم صاحب عابد احمد علی صاحب اور راقم الحروف منصفین کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہیں سے میرے ان کے تعلقات استوار ہو گئے' پھر ان کے علمی اور اخلاقی جوہر اجاگر ہوئے تو مجھے ان سے مل کر یک گونہ مسرت ہوئی تھی -

لاہور کے بیت القرآن کے قیام کا سہرا تو جناب مختار مسعود کے سر ہے جو میری نظر میں بڑی عظمت ہے اور یہ مختار مسعود صاحب کی ایسی یادگار ہے جو کہیں کہیں ان کی تصنیفی تحریروں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے -

لیکن جہاں تک قرآن کی محاسن فہمی کا تعلق ہے اس سلسلے میں قرآن کے کس قدر قیمتی نسخے ہیں، وہ عابد احمد علی صاحب کی کاوشوں اور مختار مسعود صاحب کی کوششوں کی برکت ہے - افسوس کہ عابد احمد علی صاحب دس مئی ۱۹۷۴ء کو راہی عدم ہو گئے - انا للہ وانا الیہ راجعون!

حکیم عبدالقادر انصاری

میں حکیم عبدالقادر صاحب سے ملا ہوں - وہ نیلا گنبد کے چوک پر شمال کی طرف کونے والے مکان کے بالائی حصے میں مطب کرتے تھے' قدیم حکماء کی طرح کم گو مگر جہاں تک تشخیص و تجویز کا تعلق تھا' لاثانی انسانی تھے - میں جناب ایوب شاہد نسیم کے ساتھ ان کے مطب میں گیا اور تکلیف کا اظہار کیا' تو انہوں نے نسخہ ہی تجویز نہیں کیا بلکہ ایک معجون اور دو قرص بھی عنایت فرمائیں' میں نے ہدیہ دریافت کیا تو فرمایا' میں آپ کو جانتا ہوں' ادیبوں اور شاعروں سے میرے مطب میں دوا کی قیمت نہیں لی جاتی - میں خاموش ہو گیا کیونکہ میں نے دہلی میں ہر بڑے طبیب کو اسی کار خیر پر کاربند دیکھا جن میں میرے استاد حکیم کبیر الدین' حکیم رضوان احمد' حکیم محمد احمد' حکیم حبیب اشعر اور حکیم کیف دہلوی کے علاوہ حکیم نیر واسطی' حکیم احمد بخش (بھکر) حکیم محمد عبداللہ (جہانیاں)' حکیم جاوید حیات (حافظ آباد) وغیرہ میرے سامنے کے لوگ ہیں اور پھر حکیم عبدالقادر صاحب تو ایسے مشہور و معروف باپ کے بیٹے ہیں جن کے غیر ملکوں میں بھی تذکرے ہیں یعنی حکیم سید عبدالوہاب صاحب یوسف پوری (ضلع غازی پور) المعروف بہ حکیم نابینا' جہاں آپ دلی کے سرنام اطبا میں تھے' وہیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے عاشق مرید اور علم دین کے ماہر بھی تھے - آپ نے بینائی سے معذوری کے عالم میں تحصیل علم اور مہارت تامہ حاصل کی - یہ حضرت مولانا محمد یعقوب کے تلامذہ میں تھے -

ان کی طالب علمی کے زمانے میں ایک ماہر تعلیم انگریز دارالعلوم دیکھنے دیوبند آیا اور واپسی پر یورپ کے مختلف اخبارات میں مضامین لکھے اور یہ بھی بیان کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں علوم کا تجزیہ کر کے جزئیات پر بحث کی جاتی ہے اور یہ طریق درس صرف اسی دارالعلوم میں دیکھا گیا ہے - اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک نابینا طالب علم اپنے ساتھیوں کو اقلیدس کی تکرار کرا رہا ہے اور اقلیدس کی مشکل شکلیں سامنے کے طالب علم کی کمر پر انگلی سے خط کھینچ کھینچ کر سمجھا رہا ہے اور وہ حکیم عبدالوہاب نابینا تھے -

انہوں نے تعلیم مکمل کر کے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کی' محبت سے مستفید ہو کر باطن روشن کیا' ایک دفعہ انہوں نے خود فرمایا کہ میں نے طب پڑھنے کے بعد اپنے شیخ حضرت گنگوہی

سے عرض کیا کہ "یا حضرت میں نے ذریعہ معاش کے لیے طب پڑھی ہے' اطبا ر مریضوں کے چہرے اور قارورہ وغیرہ دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتے ہیں میں نابینا ان تمام مشاہدات سے محروم ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس فن طب پر ہی اپنی معاش کا بار ڈالوں' آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔

حضرت گنگوہی نے بخلوص دل فرمایا کہ اللہ تمہیں نباضی میں مہارت عطا فرمائیں گے اور تم نبض سے وہ تمام باتیں معلوم کرلو گے جو دوسرے اطبا مشاہدے سے حاصل کرتے ہیں۔

حکیم نابینا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے شیخ کی کرامت اور دعا کی مقبولیت روزانہ لفظ بلفظ مستجاب و مکمل پا رہا ہوں۔ نبض پر ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھ پر مریض کے احوال کی تمام نوعیات و کیفیات منشکف ہو جاتی ہیں۔

حکیم صاحب موصوف کو نباضی میں یہاں تک درک تھا کہ باپ کی نبض سے بیٹے کے امراض اور بھائی کی نبض سے دوسرے بھائی کے امراض بتا دیتے تھے۔ زندگی بھر ان کا مشغلہ حیات طب ہی رہا اور اس میں جو انہیں شہرت ملی وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے کمال کو شیخ کی دعاؤں کا صدقہ بتاتے رہے' طب کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب تقویٰ و طہارت میں بھی شیخ کی پیروی کرتے رہے۔

حکیم نابینا کے صاحبزادے حکیم عبدالقادر صاحب تقویٰ و طہارت اور تشخیص و تجویز میں باپ کے نقش قدم پر تھے۔ ایک دن انہوں نے جناب ایوب شاہد نسیم کو ان کی خوش خطی کی بنا پر ایک قطعہ لکھنے کے لیے دیا۔ میں نے پڑھا تو وہ حکیم نابینا کی مشہور دوا "روح الذہب" کے متعلق علامہ اقبال کا تھا جو انہوں نے استعمال کے بعد لکھا تھا' میں نے وہ قطعہ فوراً نقل کر لیا میرے خیال سے اس قطعہ کا ذکر اب تک علامہ کی کسی کتاب میں نہیں آیا' وہ قطعہ اب بھی ان کے خاندان میں ہونا چاہیے۔ بہر نوع میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی مرا — رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مراذوق طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے روز ازل — دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

(اقبالؒ)

مولانا علم الدین سالک

بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ انہیں اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کے موضوع پر اس قدر عبور تھا کہ ذرا چھیڑ دیجیے اور استفادہ کرتے چلے جایئے۔ ان کے دل میں اسلام کا سچا جذبہ موجزن تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کوی بات اسلام کے خلاف نہیں سن سکتے تھے' انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں ان کا وہی جذبہ صداقت بولتا ہے اور سیکڑوں مضامین مختلف رسالوں میں ان کے دینی رجحان اور تاریخی معلومات کا تعارف کراتے ہیں وہ ایک شفیق استاد بھی تھے اور خلیق دوست بھی' میں نے اسلامی علوم کے ماہر اساتذہ میں ان جیسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں اور ایسا جری اور بے باک استاد تو ناپید ہے۔

وہ مجھ پر مہربان تھے۔ جب وہ ملتے تو مہینوں کی دلی خراشیں بے نقاب کر دیتے۔ انہیں اس کا بڑا قلق تھا کہ اسلامی معاشرہ روز بروز انحطاط پذیر ہے اور حکومت اعلیٰ تعلیم اور معیاری نصاب سے بے پروائی برت رہی ہے' ان کے تین مطبوعہ مضمون میرے پاس تھے لیکن حالات کے تحت سامان بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ اس میں کہیں ضائع ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کبھی اچانک وہ طبلق سامنے آ جائے۔

بہر نوع وہ ایک قابل قدر استاد اور دیندار انسان تھے۔ وہ بیک وقت معلم بھی تھے اور تبلیغ کے سپاہی بھی' اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے! آمین ثم آمین

صلاح الدین صاحب

میاں صالح الدین منڈی بہاؤ الدین ضلع گجرات کے نمودار لوگوں میں ہیں اور ایسے نمودار لوگوں میں جو قوم اور ملک کے لیے دامے' درمے' سخنے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے ہیں' قصبے میں اسکول کی تعمیر ہو یا مسجد کا سنگ بنیاد' مہاجرین کی آبادی کا سوال ہو یا مزدروں کے جلوس کا' صلاح الدین صاحب پیش پیش رہتے ہیں' ان سے جو شاعر یا ادیب ملتا ہے' وہ ان سے یہی سوال کرتے ہیں کہ خدا نے شراب کو قرآن میں کہاں حرام کیا ہے؟ غالباً وہ حرام کو امتناع سے کوئی جدا بات خیال کرتے ہیں' نہایت بلند حوصلہ' خلیق اور صاحب ہمت انسان ہیں۔ خدا انہیں اپنے مشن میں استقامت عطا

فرمائے آمین!

مجھے خوشی ہوئی کہ میں مشاعرے کے بہانے ایک ایسے آدمی سے ملا ہوں جو شراب کا بہت بڑا تاجر ہے مگر شراب کے خلاف لوگوں کو دس دس روپے دے کر جلوس نکالتا ہے اور شراب کے خلاف سلوگن لکھوا لکھوا کر سینما میں سلائیڈ چلواتا ہے' نشے کے خلاف مختلف آبادیوں میں قد آدم پوسٹر لگوانا اس کا مشغلہ ہے وہ شراب سے جس قدر کماتا ہے' اس سے کہیں زیادہ اس کے خلاف پروپیگنڈے میں صرف کر دیتا ہے- میرے خیال سے یہ بھی ایک جہاد ہے اور اس کے مشاغل عبادت کی صف میں آتے ہیں' میری نظر میں ایسے لوگوں کا بھی ایک مقام ہے

نواب مظفر علی خان

نواب مظفر علی خان کے متعلق سنا ہے کہ وہ نواب زادہ لیاقت علی خان کے جد امجد تھے اور مظفر نگر ہی میں رہتے تھے- لیکن بعض بعض وقت واقعات اپنے نقوش دھند یا دھوئیں کی صورت میں چھوڑتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ مٹتے چلے جاتے ہیں' عوام کے دماغوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اچھی بری باتوں کو یاد رکھ سکیں لیکن نیکی زندہ رہتی ہے-

نواب مظفر علی خان صاحب نے مظفر نگر میں اپنے باغ میں ایک وسیع وعریض محل تعمیر کرایا تھا- محل تیار ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا اور صفائی کے لیے آدمی لگے ہوئے تھے کہ وہیں شہر میں ایک نہایت غریب آدمی کی لڑکی کی شادی طے پائی مگر اسے برات کے قیام کے لیے جگہ میسر نہیں آئی' کسی نے مشورہ دیا کہ نواب مظفر علی خان صاحب نے جو محل بنوایا ہے' وہ ابھی استعمال میں نہیں' ان سے جا کر عرض کی جائے- ممکن ہے دل پسیج جائے اور وہ ایک دو روز کے لیے محل میں برات کے قیام کی اجازت دے دیں-

لڑکی کا والد نواب صاحب کے پاس گیا اور ان سے عرض کی کہ میری لڑکی کی شادی ہے- ایک دو روز کے لیے اپنا محل برات کے قیام کے لیے دے دیں تو غریب پروری ہوگی- نواب موصوف نے کہا کہ محل تو میں دے دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ برات کا کھانا وغیرہ بھی میری طرف سے ہوگا اور اس کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں گا- مجھے ایسے موقع کہاں میسر آتے ہیں؟ بار احسان سے لڑکی کے

باپ کی نگاہیں جھک گئیں اور پلکوں میں آنسو سرسرانے لگے۔ اس نے پگڑی کے پلے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا نواب صاحب آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں کیا عرض کروں میری معروض تو صرف محل میں ایک روز کے قیام کی تھی اور بس! میں کس طرح آپ کے احسان کا بدلہ چکاؤں' میں تو ساری زندگی بھی آپ پر قربان کردوں تو اس کا بدلہ نہیں کہا جاسکتا۔

نواب صاحب نے کہا میاں اس سے اچھا میرے مکان کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے؟ صندوقچے میں سے چابیاں نکال کر اسے دے دیں اور کہا جاؤ کھول کر جہاں جہاں صفائی نہ ہوئی ہو خود کر لینا۔

برات آئی تو برات کے کھانے وغیرہ کا انتظام نواب موصوف کی طرف سے ہوا۔ چلتے ہوئے براتیوں کو ایک ایک جوڑا عورتوں اور بچوں سمیت راتوں رات تیار کرا کے تقسیم کیا جیسے اپنی لڑکی کی شادی ہو۔

لڑکی کا والد ممنون بھی تھا اور شرمندگی سے اشکبار بھی' برات رخصت ہوئی تو وہ محل کی کنجیاں واپس کرنے گیا۔ نواب صاحب نے گچھا واپس کر دیا اور اس سے کہا کہ یہ محل تو ہم نے اس لڑکی کو دے دیا ہے۔ بلکہ اس وقت دے دیا تھا جب تم پہلی بار میرے پاس آئے تھے۔ اب میرا اس باغ اور محل پر کوئی حق نہیں۔

وہ باغ اور مکان ابھی تک اسی خاندان میں چلا آتا ہے اور سخاوت کا یہ واقعہ بھی سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ میں آج دیکھتا ہوں تو اس قسم کے رئیس نظر نہیں آتے۔ البتہ اخلاق باختہ اور جرائم پیشہ لوگوں کی کثرت ہے' اللہ کرم کرے۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں

جتنی میری سوجھ بوجھ بڑھتی چلی گئی اور تجربہ منزلیں مارتا گیا میرا اصرار اس پر رہا کہ آخر اس کائنات کا صانع تو کوئی ضرور ہے اور اس نے ذرے ذرے کے لیے جو اصول وضع کر دیئے ہیں ازل سے وہ اپنے اصول و وظائف میں برابر کام کرتے آرہے ہیں پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے لیے دستور مرتب نہ کیا ہو' یہ ہمارے اخلاقی' اقتصادی اور سیاسی رہنما اور تہذیب و

تمدن کے اجارہ دار اس اصول کو معلوم کر کے اسے کیوں عام نہیں کرتے ہمارے تمام جسم کی وریدوں اور شریانوں تک کا تعلق دماغ سے ہے تو اب تک لوگوں نے دماغی چھان بین اور رگ و پے سے داغ کے تعلق کو تحقیق کر کے تفصیل سے کیوں بیان نہیں کیا۔

ایک دن کھانا کھاتے کھاتے میں زبان کے متعلق سوچنے لگا کہ آخر زبان بھی ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے اور اسی گوشت کی ایک کونپل ہے۔ جس میں بظاہر نہ آنکھیں ہیں نہ دماغ مگر یہ منہ کے اندھیرے میں لقموں کو ڈاڑھوں کے نیچے دیتی رہتی ہے اور چلتے ہوئے منہ میں دانتوں کے نیچے نہیں آتی۔ اس میں یہ شعور اور ذائقوں کی حس کہاں سے آ گئی یا کس نے ودیعت کر دی؟ اس کے علاوہ اگر کسی بات کسی فقرے یا کسی نغمے کو یاد کرنا چاہیں تو دو چار بار کی تکرار کے بغیر یاد نہیں ہوتا اور مواد کو دہرانے کا تعلق دماغ سے بالکل نہیں بلکہ زبان ہی میں قوت حافظہ بھی موجود ہے۔ جو بات ہمیں از بر ہوتی ہے اس کے کہنے یا بیان کرنے میں دماغ کا کوئی حصہ نہیں ہوتا بلکہ زبان ہی میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے' جو بات زبان پر بار بار آئے' زبان اسے ایک خاص وقت تک دماغ کی مدد کے بغیر بیان کر سکتی ہے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ قرآن پاک جیسی ضخیم کتاب جس میں متشابہات بھی ہیں حفاظ دماغی مدد کے بغیر فرفر پڑھتے چلے جاتے ہیں (جبکہ ان میں سے اکثر ان کے معانی سے نابلد ہوتے ہیں) اور دماغ کسی دوسری طرف مصروف رہتا ہے۔

یوں تو کائنات کے جس گوشے پر نظر ڈالیے اور جس سمت غور کیجیے خدا کی قدرت نظر آتی ہے اور ہر شے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کے چلانے والی کوئی ایک ہی ذات ہے اور اس کے کاموں میں کسی کے مشورے کو کوئی دخل نہیں۔ ہر شے رفتہ رفتہ اپنی تکمیل کی طرف جا رہی ہے جو شے بھی جسم رکھتی ہے اور نظر آتی ہے وہ دبے الفاظ ہی میں سہی اپنے بنانے والے سے تعارف ضرور کراتی ہے' روئے زمین کا کوئی ذرہ اپنی تعیناتی حرکت سے بغاوت نہیں کر سکتا بلکہ اپنے صانع کا ثبوت مہیا کرتا رہتا ہے۔

مجھے اپنے اس سفر حیات میں کچھ لوگ ایسے بھی ملے جو یوں تو اخلاق اور انسانیت کے علمبردار تھے لیکن وہ اپنی معمولی جماعت کا فروغ چاہتے تھے۔ ان کے خیالات محدود تھے اور عزائم میں بلندی نہیں تھی' بلکہ ایک معمولی سی بھیڑ بھڑ کا کو معاشی الجھنوں سے نجات دلانے کی فکر میں غلطاں تھے' میری

انسان جوئی اور حق پسندی نے ان کے علمی افسوں کو قبول نہ کیا بحث و مباحثے کی رد و قدح کو علمی قلا بازیوں کے علاوہ کوئی مقام نہ دیا اور میں ایک مایوس نظری کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ اس وقت میری نظر میں حاکمیت کی چھوٹی بڑی نسلیں تھیں جن کی بات ماننا اور لسانی غلامی قبول کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی، میں تو اسی حق کی جستجو میں تھا جسے عام کرنے کے لیے قرآن اترا اور پیغمبر مبعوث ہوئے اور اس جماعت میں کہیں اس کے آثار دور دور تک نہیں تھے' حالانکہ اس ادارے میں میری معاشی بہبود کے سیکڑوں جتن نکل سکتے تھے لیکن مجھے تو چٹیک ہی دوسری تھی مجھے ان دنوں اخبار کی ایڈیٹری کا لالچ بھی دیا گیا لیکن میں ایسی ایسی چیزوں کا ندیدہ کہا تھا' میں تو ایسی جماعت کی ٹوہ میں تھا جو صرف ایک خدا کو ماننے والی ہو اور وہ خدا ان کی زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما نظر آئے۔ اس کے پیچھے یہ پیاس بھی تھی کہ یہ ملک خداداد ہے۔ اس میں صرف اللہ ہی کا اقتدار ہونا چاہئے مگر ایں خیال طلب و کال۔

ایک صاحب سے نزدیک ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا حال و احوال اور ہی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ہر مکتب فکر کے علماء کو برا کہنا شروع کیا۔ کچھ دنوں تو میں سنتا رہا اور مافی الضمیر کا اندازہ لگا تا رہا کیونکہ ان کی تبلیغ کا کوئی رخ متعین نہیں تھا۔ جب آہستہ آہستہ رو براہ ہوئے اور مقاصد کی چھتری پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ تو پیغمبر آخر الزمان پر بھی اکتفا نہیں کرتے جس پر قرآن نازل ہوا ہے۔ میں پہلے تو علماء کی تکذیب و اہانت سے ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے تبدیل مذہب کی پگڈنڈی پر چل رہا ہوں اور اب تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ تصور تو ایک رحمت سے مایوسی کی صورت ہے جو پیغمبر کی جگہ پیغمبر لا کر اپنے وضع کردہ اصولوں کو تنقید و تنقیص سے بچانا چاہتے ہیں۔ ایک دن جب مجھے حضرت مولانا محمد علی صاحب کے زہد و اتقا کے متعلق رطب اللسان دیکھا تو کہنے لگے احسان صاحب اصل میں آپ ایسے ہی علماء کے بھٹکائے ہوئے ہیں صحیح راہ پر ذرا دیر میں آئیں گے۔ میرے خون میں تو چنگاریاں تیرنے لگیں اور میں نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ جناب علماء کا بھٹکایا ہوا تو بقول آپ کے جلد یا بدیر صحیح راستے پر آ ہی جائے گا لیکن جس جماعت یا گروہ کو پیغمبر (خود ساختہ) بھٹکا دے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حضرت سن کر ذرا جزبز تو ہوئے لیکن پھر ذرا سوچ کر فرمانے لگے کہ پیغمبر کبھی کسی کو نہیں بھٹکاتا! میں نے فوراً توڑا لگایا'' بشرطیکہ خود بھٹکا ہوا نہ ہو! انہوں

نے جھلا کے کہا کہ کیا پیغمبر بھی بھٹکا ہوا ہوتا ہے- میں نے عرض کی کہ حضرت محمد ﷺ کی پیغمبری کے بعد پیغمبری کا دعوئ علامت ہے دماغی گمراہی کی' انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اپنا اپنا خیال ہے آپ کا دماغی ڈھانچہ چودہ سو برس پہلے کا ہے' میں نے کہا خدا کا شکر ہے کہ اس مشینی دور اور علوم الحاد کا تراشا ہوا نہیں!

یہیں ایک گروہ جدید علمی اسلحہ سے لیس اس قسم کا بھی ابھر رہا تھا جو مزدوروں کسانوں اور پس ماندہ طبقے کو گھیرے میں لے کر دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف طبقاتی جنگ کا شگوفہ چھوڑنا چاہتا تھا- میں چونکہ مزدوروں' کسانوں اور مصیبت زدہ لوگوں سے متاثر ہو کر نظمیں کہتا تھا- اس لیے وہ مجھے بھی اپنا ہم خیال سمجھ کر میرے لیے لاسہ لیے پھرنے لگے مگر میں کہاں ان کے اڈے پر پنجے چھوڑنے والا تھا- میں ان کا طریق فکر اور پروپیگنڈے کا اندازہ لگاتا رہا- انہیں کیا خبر تھی کہ یہ تو سبط حسن اور علی سردار جعفری جیسے لوگوں کی چھوٹ کھائے ہوئے ہوں- مجھ پر یہ تبلیغی جال پھینکنا تو اونٹ کے سامنے ڈگڈگی بجانا ہے- جس کی کمر پر نقارے بجتے رہتے ہیں اور وہ بہ اطمینان سفر کرتا رہتا ہے-

پس ماندہ طبقے کو بھڑکا کر سرمایہ داروں کے خلاف محاذ بنالینا تو آسان ہے لیکن مقابلے کی مدت تک وہ اپنے پاس کھانے پینے کا سامان رکھتے ہیں یا نہیں؟ کیا ان کی پشت پناہی رائج الوقت حکومت کا قانون کرے گا؟ اور اس عالم میں جبکہ یہاں کی ہر شے اپنی قیمت رکھتی ہے- وہ دکھاوے کا مذہب ہو یا داشتاؤں کا حسن و جمال سب کی حیثیت مفاد اور ہوس کے بازار میں یکساں ہے- اگر نچلے طبقے نے اونچے طبقے کے کارخانوں' فیکٹریوں اور جاگیروں پر قبضہ کر بھی لیا تو کیا وہ موجودہ دور میں تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہوئے ان تمام شعبوں کے انتظام کو سنبھال سکیں گے؟ ہرگز نہیں!

علاوہ ازیں جن لوگوں سے سرمایہ چھینا جائے گا- وہ عوام کی طرح جذباتی تو نہیں' وہ تو موقع و محل کی مناسبت دیکھ کر پھر ابھریں گے اور اس وقت پس ماندہ طبقے پر سرمایہ کاری کی گرفت ایسی سخت ہوگی کہ زندگی اجیرن ہو جائے گی اور لیڈر رو ہوں یا سربراہ سب اپنے اپنے ظرف وضمیر کا سودا چکا کر چلتے بنیں گے- پھر اگر کل کوئی جماعت طاقت پکڑ گئی یا خانہ جنگی کا بہانا کر کے کسی دوسرے ہمسایہ ملک نے دھاوا بول دیا تو پھر یہ حاکم اور رعایا دونوں کا کیا انجام ہوگا' ایک سرمایہ داری کا جوا اتارتے

اتار تے سیکڑوں حاکموں کی غلامی کی زنجیریں بھی تو ممکن ہیں- میرے ذہن میں تو وہ نظام تھا جہاں معاشرے کے اندر حقیقی اور اجتماعی عدل کے سوتے ایک ہمہ گیر نظریہ کے بلند و بالا جھرنے سے نکلے ہوں اور جس سے چھوٹے سے چھوٹا پودا بھی آبیاری کی شکایت نہ کر سکے' معاملات کی باگ دوڑ کلیتاً خالق کائنات کے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے کسی ارادے کی ناکامی سے متہم نہ ہوں' جس میں رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر سب بھائی بھائی ہوں اور کائنات کی نعمتوں میں سب کے مساویانہ حقوق تسلیم کر لیے گئے ہوں- معاشرہ ہر اس فیصلے کو بہ رضا و رغبت تسلیم کرتا ہو جو سرمائے کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے باب میں بارگاہ الٰہی سے صادر ہوا ہو' حاکم اور محکوم دونوں رضائے الٰہی اور اصول دین پر کاربند ہو کر اسے دنیا و آخرت دونوں کے لیے انعام خیال کرے- یہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ معاشرے میں کچھ لوگ تو آرام و آسائش کی زندگی بسر کریں اور کچھ ناداری کے شکنجے میں کسے ہوئے ہوں اگر ایسا ہے تو وہ الٰہیاتی نظام نہیں بلکہ شیطنت کے مختلف شعبے اور آفات کے مختلف روپ ہیں جو اپنا کام کر رہے ہیں-

اس میں شک نہیں کہ زندگی کے راستے میں ٹھنڈے سویروں سے گزر کر چلچلاتی دھوپ کے میدان بھی آتے ہیں لیکن تمام معاملات ہی تشدد' کشت و خون' ڈانٹ ڈپٹ اور دھونس بے سے طے نہیں ہوا کرتے- یہ تو غیر اللہ کے قوانین ہیں جو رحمت اور سکون سے مطلق خالی ہیں- نبوی زندگی سے پہلے رسول مقبول ﷺ کی حیات میں اس قسم کے سیکڑوں فتنے برپا تھے اور اخلاقی طور پر جزیرۃ العرب پستی کی آخری نمی تک پہنچا ہوا تھا- چوری' ڈاکہ' لوٹ مار اور قتل و غارت جیسے جرائم عام تھے اور دولت کے بل پر چند لوگ قوتوں کو خرید کر حاکمیت کا طرہ لگائے پھرتے تھے' ظلم و تعدی کے علاوہ جارحیت نے اس قدر پاؤں پھیلا لیے تھے کہ زہیر ابن ابی سلمہ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے-

ترجمہ: "آج وہ وقت ہے کہ جو اسلحہ کی قوت اور دست و بازو کے ہجوم سے اپنا دفاع نہیں کرے گا- وہ زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتا' جو خود لوگوں پر ظلم کی پہل کرے گا وہ خود ظلم کا شکار ہو جائے گا-"

شراب اور زنا اس وقت کی روایت بن چکے تھے- یہی سبب ہے کہ جاہلی دور کا ادب تمام کا تمام اسی گندگی سے بھرا پڑا ہے اور اسی جور و تعدی کے تصور کے گرد گھومتا ہے-

مگر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کسی پر ظلم و تعدی کو روا نہیں رکھا- حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایک
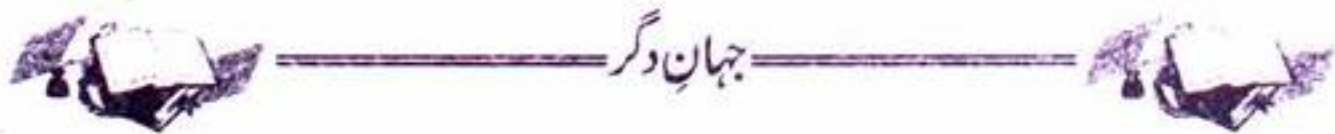
ایسی فعال جماعت بنا سکتے تھے جوان اونچی نیچی گمراہیوں کا قلع قمع کر دیتی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ دلوں میں ایک ایسا عقیدہ مرتسم کر دیا کہ خود ان کی ذات ان کے سینوں میں محاسب کی صورت اختیار کر گئی اور انہیں عقبیٰ کی طرف ہانکا لگانے کے علاوہ اس بالاتر قوت کے تدبر اور بصیرت کا یقین دلایا جس نے زمینوں' آسمانوں' پہاڑوں اور چشموں کو اپنی اپنی جگہ مناسب مقامات دیئے اور کردار و عمل کے اعتبار سے بلندی و پستی کے احکامات صادر کیے- وہی طاقت عوام کو اقامت دین کا صلہ جنت اور آرام قبر بتاتی ہے-

یہ عقیدہ اور تطہیری معاشرہ جاگیرداروں اور فرمانرواؤں کے خلاف تو پڑتا ہے اور اس کے استحکام کے لیے توحید کے پرستاروں کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن آخر میں میدان اسی صداقت کبریٰ کے ہاتھ رہتا ہے اور پھر طاغوتی قوتوں کے علاوہ مختلف قسم کے سامراجوں سے نجات مل جاتی ہے- گویا نتیجتاً انسانیت کا بول بالا ہو کر رہتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ تمام خیر و شر اور زشت و خوب میزان الٰہی پر آ جاتے ہیں اور اس عدل و اجتماع کی اساس توحید و رسالت پر ہوتی ہے-

جب معاشرہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو اسی کا نام اسلام پڑ جاتا ہے اور پھر اس نام میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں رہتی' ہر فرد کا ایمان لا الہ الا للہ محمد رسول اللہ پر ہوتا ہے' اس پرچم کے سائے میں خود بخود روحوں اور دلوں کا تزکیہ ہوتا ہے جس سے دو باتیں مستنبط ہوتی ہیں اول اجر کی خواہش دوسری عذاب کا خوف' اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دلوں میں نہ تو آباء و اجداد کا تفاخر باقی رہتا ہے اور نہ دولت و قوت کا پندار جگہ پاتا ہے نہ نسبی بلندی سر ابھارتی ہے' اور نہ عبادات کا احساس برتری قوت پکڑتا ہے' ان کے تمام فیصلے خدا کی حاکمیت سے صادر ہوتے ہیں- ان کے محاسب ضمیر اور سینوں میں رہنے والے عادل ان کا اعلان کرتے ہیں' اللہ نے جو امانت ان کی تحویل میں دے دی ہے' وہ اس کے سچے امین اور دیانت دار قرار پاتے ہیں ان کی ہر مرضی خدا کی مرضی ہوتی ہے اور ہر ارادہ خدائی توفیق یہ انقلاب حقیقی معنوں میں انقلاب ہوتا ہے جو اپنے دامن میں دونوں جہان کی فلاح و بہبود رکھتا ہے اور انسانیت کا یہی وہ فطری راستہ ہے جو منزل مقصود تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے-

ہمارے آج کے علماء رات دن اخلاق کی رٹ تو لگاتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اخلاق تو

عقیدے کی پیداوار ہوتا ہے- پہلے عقیدہ درست ہوتو اس پر عمل ممکن ہے اور جہاں انسانوں کے دل ویران ہو چکے ہوں اور روحیں دم توڑ رہی ہوں وہاں راحت دسکون کہاں سے آ جائے گا- یہ تو تمام پھل پھول عقیدے کے ہیں جو ایک جانب تو اخلاقی اقدار اور معیار حیات سے ہر قسم کی ردو قبول فراہم کرتا ہے- اور دوسری طرف اس طاقت کا یقین دلاتا ہے جو عقیدے روح اور بصیرت کی جان ہے جس سے یہ تمام اخلاقیات و معیارات ماخوذ ہیں جو سزا و جزا کی نشاندہی کے ساتھ انہیں مستند بھی قرار دیتا ہے اور اقدار و معیار کی پابندی بھی لازم گردانتا ہے-

اس بالاتر تصور کے بغیر کوئی بھی نظام کیوں نہ ہو اوچھا اور نا تمام رہتا ہے- اور آئے دن اس پر چاروں طرف سے تباہ کن اور ناپاک حملوں کا تانتا بندھا رہتا ہے' ظاہر ہے کہ جو تصور خدا کی حاکمیت سے ہٹ کر ہو گا وہ ہمیشہ ہی ڈانواں ڈول رہے گا' اس کے پرچم دعوت وتبلیغ کی لہریں پیدا نہیں کرتے کیونکہ اس نظام کی پشت پناہی پر کوئی ذی شعور اور لازوال محتسب طاقت نہیں ہوتی' وہ تو انسانی عقل و خرد کا کاروبار ہوتا ہے جو محدود بھی ہوتا ہے اور بے اعتبار بھی- اس میں شک نہیں کہ عقل انسانی سے بھی بڑے بڑے حیرت ناک کارنامے سرزد ہوتے ہیں لیکن انسان کو بنانے اور تخلیق کرنے کے علاوہ توفیق دینے والی ذات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے-

لمحہ فکریہ

قرآن کے فہم و تدبر کی راہ میں سیکڑوں نہیں ہزاروں دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں اور وہ دیواریں عملی سے زیادہ فکری ہیں- فکر ہی ایسی چیز ہے جو عمل میں آکر اپنی خصوصیات دکھاتی ہے غالباً اس بے فکری اور بے عملی کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں سرکاری طور پر کوئی تبلیغی شعبہ فکر و عمل کا نہیں اور اس سونے معاشرے کے ویران دماغوں میں مغربی تہذیب کے سیکڑوں عناصر ایسے داخل ہو گئے ہیں جن سے پوری قوم کے ظرف وضمیر بے خبر اور قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے ہیں اور اس پر چاروں طرف سے مغربی تعلیم کی مادی یلغاروں نے اور بھی عقائد و افہام میں ہل چلا کر رکھ دیئے-

مسلمانوں کی بنیادی تعلیم کے لیے جگہ جگہ مدارس قائم تھے- جو اساسی تعلیم کے مراکز تھے اور زندگی میں علمی سفر کے لیے وہیں سے اسلحہ دستیاب ہوتا تھا- ہمارے ان مدارس میں قرآن' حدیث
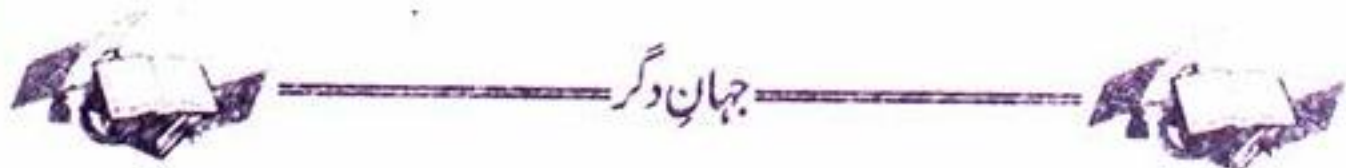
فقہ، حکمت، فلسفہ، تصوف، منطق، علم سیارگان، علم ریاضی، صرف ونحو، الجبرا اور علم الاعداد تک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ ابتدائی منزل سے نکل کر طالب علم اپنی مرضی کے مطابق اپنا شعبہ علم پسند کر لیتا تھا اور پھر زندگی بھر اسی رخ پر تحقیق و تدقیق اور فکر و عمل رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے ایسی ایسی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ جن سے آج کے مغربی علوم پھول پھل رہے ہیں۔ قرآن چونکہ قیامت تک کی انسانی ہدایت کے لیے اترا ہے اس لیے اس میں قیامت تک کے علوم کے اشارات اور اساسی ہدایات پائی جاتی ہیں۔ وہ سائنس ہو یا فلسفہ، اخلاق ہو یا معاشرت سب کا سرچشمہ یہی کتاب ہے۔ چنانچہ جو قوم یا ملک قرآن کی ہدایات پر عمل کرے گا اس کو قرآن کے وعدے کے مطابق عظمت و شہرت ملے گی اور جو غفلت کرے گا اسے ویسی ہی عقوبت و تذلیل کا سامنا کرنا ہوگا۔

ہمیں اس دور کی پستی سے نکلنے کے لیے سب سے پہلے اپنے نوجوانوں کے دل و دماغ میں اسلامی ذخیرہ علم کو داخل کرنا ضروری ہے یہ غیر فطری زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور ہر فرد کو غیر فطری حیات اور روحانی اخلاق سے دست برداری کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ نیز اس قسم کے معاشرے سے اعلیٰ ذہانتیں اور غیر معمولی فہم و ادراک کنارہ کر جاتے ہیں۔ کوئی فکر و عمل جسم کی گرفت میں نہیں آتا۔ ذہنوں سے تخلیق کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور علم اپنے ایجادات کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ نتیجے میں ذلت و خواری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا کیونکہ وہ مستقبل کی پاکیزگیوں اور روحانی سالمیت کا ادراک حاصل نہیں کرتے اس کے برخلاف شیطانی اکساہٹ پر زندگی میں ایسا کردار پیدا کر لیتے ہیں۔ جو رسوائی کے ساتھ شرمناکی اور بدنامی جیسی ہولناکیوں کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

میرے کئی ساتھی اس طوفان مادیت اور سیاست میں بہ گئے اور سیاسی اور مادی جوار بھاٹا نے پھر ان کا ذکر تاریخ تک نہ پہنچنے دیا۔ حالانکہ ان میں بڑی ہی منہ زور صلاحیتیں بولتی تھیں۔ لیکن وہ جذبات کی مکر چاندنی میں رہنماؤں اور رہزنوں میں امتیاز نہیں کر سکے۔ انہوں نے اصل خیر خواہوں اور نجات دہندوں کی تلاش نہیں کی انہوں نے اندھیروں میں رہنے کے باوجود اندھیروں سے نہ تو احتجاج کیا اور نہ ظلمتوں کے خلاف جہاد کو لازم گردانا۔ وہ مغربی تہذیب کی جھلکیوں میں حقیقت کل اور محرک اول کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کا پورا معاشرہ اسی زہریلے سیلاب میں بہا چلا جا رہا ہے اور جس کا سبب صرف اسلامی خیر و برکت سے ناواقفیت کے سوا کچھ نہیں۔ انہوں

نے اسلامی معاشیات کا مطالعہ نہیں کیا اور مطالعہ کرتے بھی کہاں سے؟ اسلامی معاشیات و اقتصادیات پر ہمارے یہاں کتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں؟ اور جو چھپی بھی ہیں کیا وہ عوام کے ذہنوں کی کتابیں ہیں؟ کیا ان میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ ذہنوں کی تشنگی کے لیے سیرابی کا سامان موجود ہے؟

میں موجودہ نسل کے نوجوانوں میں تحقیق اور تشنگی بدرجہ اتم موجود پاتا ہوں اگر کسی دیوانہ سفر کے سامنے صحیح راہ کھلی ہوئی نہ ہو تو وہ غلط راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور اس میں وہ قابل نفرین نہیں۔ہاں اگر صحیح راستے کی وضاحت ہوتے ہوئے غلط راہ پر چلے تو قابل عقوبت ہے۔میں کمینوزم کے خزانہ کو بیت المال سے تشبیہ دیتے ہوئے ڈرتا ہوں اور اسے شرکت قائدین کا نام دیتا ہوں جس میں حصے کے مطابق صرف روٹی کپڑے کی سہولت کے لیے ہزاروں لاکھوں انسان اپنے مذہب و ثقافت اور آزادی رائے سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اس طرح انسانیت کا نرخ کس قدر گر جاتا ہے۔

اگر اسلامی بیت المال کا بھی یہی مفاد عام ہو تو کیا یہ راہ گم کردہ لوگ اصل راستے پر نہیں آجائیں گے؟ لیکن ہمارے رہنماؤں کی بلند خیالی نے عوام کے معیار ذہنی کو پیش نظر نہیں رکھا اور ان کی اس غفلت سے خود پروری کی وبا عام ہوگئی اور ظاہر ہے کہ خود پروری میں آلودہ اور ذاتی مقاصد میں منہمک انسان بداخلاقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔وہ عالمگیر مقاصد اور مفاد عامہ کی راہوں سے کترانے اور خدمت انسانی سے بچنے میں بہتری خیال کرنے لگتا ہے۔اس کی پیروی بھی وہی لوگ کرتے ہیں جو انسانیت کے دشمن اور عدل و انصاف سے منحرف ہو چکتے ہیں ان کی مجلس میں ملک دشمن اور انسانیت سوز قسم کے افراد کی کثرت ملتی ہے وہ نیکی اور تقدیس کے خیال و معیار کو برقرار اور پاکیزہ رکھنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو جاتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ ریاکاری کا لبادہ نہیں اترتا۔یہی سبب ہے کہ معاشرے میں تنگ دلی اور کم حوصلگی بڑھتی جارہی ہے۔روح سے اخلاقیات اور مذہب سے پاکیزگی کے فاصلے طویل ہوتے جارہے ہیں اور خیر و شر کی صحیح صورتیں اجاگر نہیں ہوتیں۔

اسلام کا سب سے بڑا خاصہ ہی یہ ہے کہ چونکہ وہ اعلیٰ زندگی کا اعلیٰ منشور ہے اس لیے روح کی برومندی کی دعوت دیتا اور جنسی کج راہیوں کے علاوہ ایمانی ناہمواریوں کو روکتا ہے اور اگر یہ معیار نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے قائدین اور مبلغین بھی کہولت اور جہالت میں لت پت ہیں۔

آزاد معاشرے کے آزاد دماغوں سے ابھرتے ہوئے خیالات کو نظر انداز کر دینا بھی تو معمولی

درجے کا قصور نہیں ہے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ آج کے مبلغین کے پاس تحقیق وتفتیش کی چھلنیاں نہیں ہیں جس سے مرکزی تصور سامنے نہیں آتا اور معاشرہ گمراہی کے نم آلود نشیب میں اترتا چلا جارہا ہے۔

انسان شیطان سے تو بچ سکتا ہے لیکن مصنوعی تقدس کے لبادوں اور گنجان ڈاڑھیوں کی تاریکی میں بیٹھے ہوئے گھاتیوں کو نہیں پہچان سکتا چنانچہ کئی شکاری اس مذہبی آڑ اور خام اخلاق کا بانکا لگا کر شرافت پر جال پھینکتے اور شکار کرتے رہتے ہیں اور یہی ان کا ذریعہ رزق ہے۔

اسلام ایک غیر فانی اور آفاقی تصورات کا مذہب ہے اس لیے اپنے دامن میں بصیرت اور فراست کے انبار رکھتا ہے وہ زندگی نہیں زندگی کے منصفانہ مزاج کی گواہی ہے جو معاشرے کو اپنے خطیبانہ انداز میں چراغ راہ تقسیم کرتی ہے جس سے معاشرے میں تقدیس کی تبلیغ اور انکسار کی تعلیم پر ثابت قدمی سے تیز روی آجاتی ہے نیز جرم و گناہ کے نتیجے سے آگاہی بھی ہو جاتی ہے اور نیکی کے راستے سے خود بخود جھاڑ جھنکاڑ صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میں اسلام میں راہبانہ زندگی بسر کرنے پر مصر نہیں۔ انسان مادی دنیا کا باشندہ ہے۔ اسے مادیات کا علم بھی ضروری ہے۔ خدا نے اسی کی خاطر دریا، جنگل، چشمے مفت اور بہ افراط پیدا کیے ہیں۔ جو قیامت تک ختم نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ سب اس لیے ہیں کہ ان سے انسان استفادہ کرے اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ نئی نئی ایجادات سے زندگی کے ظاہری اور باطنی حسن میں اضافے کرتا چلا جائے نہ کہ خدا کی زمین پر قبضہ کرے اور اسے اپنی ملکیت سمجھ بیٹھے۔ ایسے لوگوں کی جہالت علم کا لبادہ اوڑھ کر سیدھے سادے عوام کو مختلف قسم کی مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ان میں بعض اوچھی فطرت کے سرمایہ دار بھی ہیں جن کا اسلامی کردار نمائشی شعبدہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے سامنے جب زکوٰۃ عشر یا خیرات کا سوال آتا ہے تو وہ اس قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں خریدتے ان کے دکھاوے کے اخلاق بہت جلد زوال آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عقائد میں غیر فانی اخلاقیات اور حقیقی قیادت کا مواد ناپید ہوتا ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ انسانی برادری میں ہمارا کیا مقام ہے اور ہم کس ریت کے ٹیلے پر کھڑے ہیں؟

اصل میں سرمایہ داروں کو طرح طرح کی آسائشیں اور رنگا رنگ راحتیں روحانی انکشافات اور پاکیزگی سے دور لے جاتی ہیں۔ اس سوسائٹی میں گناہوں کو رسم و رواج کی طرح اختیار کر لیا جاتا ہے

اور جرائم کرتے وقت ان کا دل دھڑکتا ہے اور نہ ہاتھ کانپتا ہے اور اب تو یہ ایک برادری بن گئی ہے جس کا عوامی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

موجودہ مستقر

میرے مکان کے مغربی سمت انارکلی کی چہل پہل اور رنگ و بو کی ندی موجزن رہتی ہے لیکن میں آج تک اسی طرف کی گیلری میں نہیں بیٹھا۔ ہر چند کہ میں اول سے خوش گل اجسام اور خوش گلو فنکاروں کا پرستار رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ دنیا میں صرف آواز ہی کا جادو ہے جو مٹی میں سونے کی جھنکاریں پیدا کر دیتا ہے جس سے انسانی عظمتوں کو چار چاند لگ جاتے ہیں بلکہ نغمے کی کوئی کوئی تان ستاروں تک رسا ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ کائنات کی تخلیق ہی آہنگ سے ہوئی ہے اور سیاروں ... تک ہر نگے بیلوں آوازوں ہی میں رقصاں ہیں ایک دن ہو گا یہی آواز کا حربہ بھری پری کائنات کو درہم برہم کر دے گا اور ہر بلندی کھڑے قد زمین پر آ رہے گی۔

انارکلی سے اٹھی ہوئی بے ہنگم آوازوں کے مرغولے مجھے پسند نہیں کیونکہ یہ غیر فطری اور غیر مرتب آوازیں مجھے ایک دوسری پر چڑی گانٹھے معلوم ہوتی ہیں اور ان میں کوئی حیات پرور تال سم نہیں ہوتا۔

جہاں تک بس چلتا ہے میں کبھی اس ہوٹل میں چائے نہیں پیتا جہاں ریکارڈنگ کی ہڑبونگ اور بے ضرورت نغموں کی آڑی ترچھی بوچھاڑیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کوئی بے ضرورت پتھے پر کھجلانے لگے۔

میرے اس مکان کی سمت کھڑکیاں دی مسلم ہوٹل کی طرف کھلتی ہیں۔ یہ ہوٹل کبھی میاں شیخ کی سرائے کہلاتا تھا۔ سنا جاتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کی جماعت کے مجاہدین کے لیے یہ سرائے گھر کی طرح آرام رساں تھی۔ میں جس کمرے میں لکھتا پڑھتا یا مطالعہ کرتا ہوں اس کی کھڑکیوں کے سامنے ایک گولر کا درخت ہے۔ اس سے لے کر میو ہسپتال کی دیوار تک ہرے بھرے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ جب کبھی ذرا سی بارش کے بعد دھوپ نکلتی ہے تو پیپل کے درختوں کے دھلے ہوئے پتوں پر سورج کی روشنی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہوا میں نئے سکوں کے کھیان میں

چٹکیاں لگا لگا کر ھرا کھوٹا جدا کر رہی ہیں۔

علی الصبح درختوں پر چڑیوں کی چہکاریں ایسی لگتی ہیں جیسے ہر ٹہنی کا پتا پتا اور کونپل کونپل حمد و ثنا میں مصروف ہے۔ اس موسیقی اور اس کے موسیقاروں کو کوئی طاقت غلام نہیں بنا سکتی' وہ تو دنیاوی طاؤس و رباب سے بلند و بالا آہنگ ہے جو مادی پیمانوں سے ماپنے کی چیز نہیں' وہ تو پرندوں کے اس سکون کا حمد یہ ہے جو صفات کے باطن سے پھوٹتا ہے اور خرید و فروخت کی اشیاء میں نہیں آتا مگر سونے چاندی کے بھاؤ سے اونچی چیز ہے جسے جواہرات کے پلڑے نہیں پا سکتے' اس کا درجہ کیمیا اور پارس سے بلند ہے' چڑیاں ہی نہیں تمام پرندے قدرت کے اس قانون پر کاربند ہیں جس پر چاند سورج اور ستاروں کے طلوع و غروب کا دارومدار ہے اور زمین اپنے مدار و محور پر گھوم رہی ہے۔ پرندوں کا مشرب خلاق کائنات کی تسبیح و تہلیل کے سوا کچھ نہیں' وہ کسی عالم میں بھی غافل نہیں ہوتے جب کبھی بھی جھڑی لگ جاتی ہے تو چڑیاں تین تین دن کا روزہ رکھتی ہیں۔ مگر تسبیح سے غافل اور ثنا گستری سے کنارہ نہیں کرتیں لیکن انسان اپنے وضع کردہ قوانین رائج کر کے کس قدر پریشان اور غیر مطمئن ہے۔

کبھی جب میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر جا بیٹھتا ہوں تو زمین و آسمان کی افقی سیون تک نظر کام کرنے لگتی ہے۔ ہمیشہ علی الصبح چڑیوں کی چہکار سے میری آنکھ کھل جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گولر کے گنجان حصے میں نغموں کی جھڑی لگ رہی ہے' میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر دیر تک چڑیوں کی چہکار سنتا اور اس وقفے کو عبادت کا وقفہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت نباتات سے لے کر جمادات اور حیوانات تک سب خالق کی حمد و ثنا میں مصروف ہوتے ہیں اور عابدوں کی صحبت بھی عبادت سے کم نہیں ہوتی۔

جب سورج کی کرنوں کا چنور درختوں کی پھننگوں پر ملنے لگتا ہے تو چڑیاں اس روشنی کے الارم پر دانہ دنکا چگنے نکل جاتی ہیں اور درخت خاموش کھڑے رہ جاتے ہیں ایسے میں بھی کسانوں اور مزدوروں کے محلے میں ایک طالب علم کی طرح کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہوں لیکن پڑھنے سے زیادہ لکھنے کو جی چاہتا ہے نہ جانے یہ خاموشی کا اثر ہے یا سحر خیزی کا۔

موقع شناس۔انیق

مشاعروں کے سلسلے میں کئی بار کراچی جانا ہوا تو سرکاری دفاتر کے بعض ادب پسند اصحاب سے بھی ملاقات ہوئی۔کلرکوں کے زمرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ایک شخص انیق نامی سے بھی ملا۔اس کی شادی میرے وطن قصبہ کاندھلہ کے ایک شریف گھرانے میں ہوئی تھی اس وجہ سے میں غیر شعوری طور پر اس سے نزدیک ہوتا چلا گیا۔

انیق ایک دفتر میں ملازم تھا اور اس کی سوسائٹی میں زیرک قسم کے کلرک اور ہیر پھیر کر کے دولت کمانے والے تاجر زیادہ تھے۔شاید اسی وجہ سے ہوٹلوں کے ملازم اس کا زیادہ احترام کرتے تھے کیونکہ انیق کا زیادہ وقت ہوٹلوں ہی میں گزرتا تھا۔ظاہر ہے کہ ہوٹلوں کے ملازمین کو رسم و رواج سے زیادہ انعام و اکرام اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔لیکن یہ دفتر میں ہر شخص جانتا تھا کہ انیق رشوت نہیں لیتا میں حیران تھا کہ یہ کیا رسم ہے اور یہ اللے تللے کہاں سے اور کیسے پورے ہوتے ہیں۔

اکبری

جہاں انیق ملازم تھا میرے ایک پرانے دوست عاشق حسین اکبری ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے یہ بہار کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے اور سر سلطان احمد صاحب جو بہار کی مشہور شخصیتوں میں تھے عاشق حسین اکبری کے قریبی عزیز تھے اس خاندان کا ہر فرد اب تک اپنے اسی قدیم معاشرے پر کاربند نظر آتا ہے جو بڑے پن کی خصوصیات میں شامل ہے۔

عاشق حسین اکبری اتفاق سے پرائس کنٹرولر ہو کر لاہور آ گئے اور پھر کچھ دنوں بعد انہوں نے انیق کو انسپکٹر کی حیثیت سے لاہور بلوا لیا اس طرح انیق لاہور کے تاجروں اور ان کے ہتھکنڈوں سے بھی بخوبی واقف ہو گیا۔تھوڑے دنوں بعد ہی اس کا تبادلہ لائل پور کر دیا گیا جو صنعتی مرکز ہونے کے اعتبار سے پاکستان کا مانچسٹر کہلاتا ہے۔لائل پور پہنچ کر انیق اپنی ذہانت کے بل پر ملوں کے کارکنوں اور ان کی پالیسیوں کے علاوہ ان کی نفسیات سے بھی بخوبی آگاہ ہو گیا ان تجربات نے اسے ایسا چوکھا انسان بنا دیا جس کے لیے دنیاوی طور پر ناکام ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

اتفاق سے محکمہ میں تخفیف ہو گئی اور اس کی لپیٹ میں انیق بھی آ گیا لیکن چونکہ وہ ملنسار ہونے

کے علاوہ جوڑتوڑ کا آدمی بھی بن گیا تھا اس کے علاوہ تاجروں کی فطرت اوران کی کمزوریاں بھی اس کی نظر میں آ چکی تھیں وہ فوراً ایک بڑے تاجر کے یہاں اس کی ایک شاخ کا مہتمم ہو گیا۔ اولاً سوسائٹی دوسرے اس کے مالک نے جہاں اس کے مقام کو بلندی بخشی وہیں اسے تاجراور افسروں کے مشغلوں کا علم بھی دے دیا۔ اس میں وہ تمام باتیں بدرجہ اتم آ گئیں جن کی اس ماحول کے لیے ضرورت تھی چنانچہ دیگر فنون کے ساتھ ساتھ مالک کی ہاں میں ہاں ملانا بات یا واقعے کو اعلا رج کر کے بیان کرنے بے غرض دوستوں میں اپنی بلندی کا ڈھول پیٹنا نیز حکام کی حاشیہ نشینی اور موقع موقع کی بھرے بازی انیق کو پر لگ گئے۔

اتفاق سے ایک دفعہ میں کراچی گیا تو انیق سے ملاقات ہو گئی وہ کسی ایسے تاجر کے ساتھ تھا جس کا کوئی کام انیق کی توجہ چاہتا تھا۔ انیق مجھ سے ملتے ہی لپٹ گیا اور کہنے لگا کہ آؤ ذرا تفریح کو چلتے ہیں۔ ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور انیق نے اس گناہ گار بازار میں جا اتارا جہاں عورتیں اپنے جسم کرایہ پر چلاتی ہیں۔ انیق کو دیکھ کر نائکہ بڑی بوڑھیوں کی طرح دعائیں دیتی ہوئی آؤ بھگت میں لگ گئی اور سازندے ذرا چوکنے ہو بیٹھے سامنے والی ایک جوان العمر طوائف سے انیق نے کسی خاص غزل کی فرمائش کی جو اسے بطور خاص پسند تھی۔ ہم اسی تاجر کے سامنے یہ حالات ایسے تھے جیسے ایک زرخرید غلام یا متاعی عورت کی پہلی رات؟ یوں تو وہ تاجر شریف صورت اور نیک معلوم ہوتا تھا لیکن شاید انیق سے اس کا کوئی خاص ہی کام اٹکا ہوا تھا کیونکہ کبھی کبھی وہ بھی داد و تحسین کے وقت انیق کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا اور او چھا تاجر مفاد کے لیے ہر ذلت برداشت کر لیتا ہے جائز یا ناجائز کا اس کی دنیا میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض نا تجربہ کار مگر کنجوس تاجر دفتروں کے چکر میں آ کر کچھ نہ کچھ اگل دیتے ہیں ورنہ دوستوں کی آرزوؤں رشتہ داروں کی امیدوں اور حکومت کے مطالبات یہ اپنے طلائی اور نقرئی وعدوں سے پورا کر دیتے ہیں ان کی گفتگو میں اخلاق مذہب اور خلوص کا جھوٹا بادل ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے وعدے ایفا کی تلخی تک نہیں جاتے۔ وہ زبانی جمع خرچ سے ہی لوگوں کی توقعات اور گورنمنٹ کے دفتروں کی خانہ پری کر دیتے ہیں۔

انیق کی بے تکی اور گھبرائی ہوئی لسانیت بتا رہی تھی کہ وہ مجھے اپنی اس پست بلندی سے کما حقہ

آگاہ کردینا چاہتا ہے تاکہ اس کی شاہ خرچی' بے باکی اور فراخدلی مجھ پر آشکار ہو جائے اور میں اپنے دوستوں میں جا کر اس کی ڈونڈی پیٹوں کہ میرا ایک دوست بازار حسن میں کئی ایک آڑھتیوں پر اثر انداز ہے۔

اس بازار میں نہیں اس گھر میں انیق فراخ دلی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ریاست کا مالک ہے اور نمائش دولت کو روا خیال کرتا ہے۔طوائف کے ملازمین تک اس کے سکوں کی بے قدری پر نازاں تھے اور جب وہ اسے حضور' سرکار' یا سیٹھ کے لقب سے مخاطب کرتے اس کی آنکھیں مسکرا کر داد طلب انداز سے میرے اور حاضرین کے چہروں کا جائزہ لینے لگتیں۔

مجھے حیرت تھی کہ اسے یہ کیا ہو گیا کہ دو گھونٹ میں آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں' لال پری ان کی عموماً یہی حالت کر دیتی ہے۔

انیق کی جیب خالی ہو جانے کے بعد تاجر کا نمبر بھی آ گیا اور ایک دو گھنٹے میں اس کی جیب کا وزن بھی طوائف کے پاندان میں پہنچ گیا۔

طوائف نستعلیق قسم کی عورت تھی اور موسیقی میں بھی اسے اچھا خاصا ملکہ تھا۔انیق کا بیان تھا کہ وہ مسرت پور سے ہی اسے پسند کرتے ہیں۔تھوڑی دیر تو گانا سنا اور پھر کچھ شغل بادہ ہونے لگا۔ اس میں گھریلو باتیں بھی چھڑ گئیں۔ نائکہ نے کہا میاں یوں تو کراچی بہت اچھی جگہ ہے لیکن وہ مسرت پور والی بات کہاں۔ریاستوں کی تو شان ہی کچھ اور تھی۔کیا کیا لوگ میسر تھے!

میں انیق ہی کو بڑا خرچیلا انسان خیال کرتا تھا مگر اس سے نزدیک ہو کر معلوم ہوا کہ اس دنیا کا تو ہر کلرک جو تنخواہ پر انحصار نہیں کرتا اسی معاشرہ کا انسان ہے اور انہیں کے دم سے سماج کی ریڑھ کی ہڈی کا یہ ناسور رستا رہتا ہے اور تہذیب کے سینے کے زخم خشک نہیں ہونے پاتے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ میں کراچی میں انیق کے ساتھ پھر کر ایسے ایسے لوگوں سے ملا ہوں' جو بظاہر صاحب حیثیت تھے لیکن میں نے ان میں مخیر کسی کو نہیں پایا۔فقیروں کے کاسے تو غریبوں اور ناداروں کے طبقے کی خیرات ہی سے بھرتے دیکھے۔عیاش اور اوباش طبقہ زبان سے نہ کہے لیکن یہ خیرات اور زکوٰۃ کو فضول خرچی قرار دیتا ہے مجھے اپنے دوست کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ایک فقرہ یاد ہے کہ اگر شراب پی کر انسان مخیر نہیں ہوتا تو وہ شراب کی توہین کرتا ہے۔مگر یہاں دوسرا ہی معاملہ

ہے اصل میں یہ رشوت کا لپکا عموماً انسان کو انسانی ہمدردی سے محروم کر دیتا ہے- اس وقت دوستی کی عظمت عموماً تخفیف میں آ جاتی ہے اور وفاداری صرف نمائش کی چیز رہ جاتی ہے- یہ اپنی ذات کے لیے دن بھر لوٹ مار کرتے اور رات کو تعیش میں اڑا دیتے ہیں- ان کا دل بیویوں کی طرف راغب نہیں ہوتا- انہیں تو ہارمونیم اور طبلے پر کد کنے والے اجسام اور منکنے والے کولہے زیادہ بھاتے ہیں-

میں انیق کے ساتھ یہ نوٹنکی دیکھ تو رہا تھا لیکن مجھے کبھی کبھی ان کے غسل خانے سے ایسا بھبکا بھی آ جاتا تھا جیسے جھینگے سڑ گئے ہوں- برابر والی کھڑکی میں ایک پلنگ پر میلی چادر اور گندا سا تکیہ بتا رہا تھا کہ شاندار ظاہر کا باطن کیسا کثیف اور متعفن ہوتا ہے-

انیق کبھی کبھی اس نوجوان طوائف کے ساتھ بہت پست قسم کا مذاق بھی کرتا تھا جسے وہ مصنوعی قہقہوں میں اڑا دیتی تھی- غالباً اس وقت وہ اپنی جسم فروشی کی بانگی دکھاتی تھی جس سے گاہک کی ذہنیت کا اندازہ ہو جاتا ہے- تھوڑی دیر کے بعد بائی نے پھر ایک غزل چھیڑی اس کی سنگتی رہ رہ کر موقع موقع سے اپنی معمولی ضروریات کا اظہار کرتے جا رہے تھے اور انیق ان کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی قیمت ادا کر رہا تھا جیسے آج کل ماتحت بعض افسران بالا کے جائز و ناجائز احکام اور مطالبات کو اپنے لیے قابل قبول خیال کرتے ہیں- رات کے دو بجے تک یہی ہنگامہ رہا-

اب نشے کا اتار شروع ہو رہا تھا اور انیق نے تمہید کے بغیر ہی کہنا شروع کر دیا کہ اب بیگم میری جان کو آئے گی اور دروازہ بڑی مشکل سے کھولے گی- اگر ذرا سی بھی مہک پہنچ گئی تو صبح تک مکالے رہیں گے تاجر کی جیب خالی سی ہو چکی تھی اس نے انیق کے کان میں کہا- اب جلدی نکل چلو وقت زیادہ ہو گیا ہے- ہم اٹھے اور اپنے اپنے مستقر کی راہ لی نہ جانے انیق بے چارے پر کیا گزری ہوگی اور بیگم نے دروازہ کھولنے کے لیے کتنی دیر خوشامد کرائی ہوگی اس کی اہلیہ نہایت شریف نیک اور قدیم وضع کی عورت ہے- جوان تمام باتوں سے اجتناب میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور پھر انیق کی تمام بھیڑیوں اور ان کے اتار چڑھاؤ سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایک وفادار اولاد پرور اور شریف بیوی بھی ہے-

بچوں کی تربیت اور گھر کی دیکھ بھال میں بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی وہ جہاں انیق جیسے شوہر کو بھرتی ہے وہاں بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں- وہ نہایت سلیقے سے گھر کو سنبھال رہی ہے

اور بچے اعلیٰ تعلیم کی راہ پر گامزن ہیں۔
انیق کی نمائش پسند طبیعت مجھے مختلف اوقات میں کئی ایسی جگہوں پر لے گئی جہاں میری روح نے ندامت محسوس کی اور میں ان احساسات کو نظم کرنے پر مجبور ہو گیا' انیق آج کل کراچی ہی میں مقیم ہے اور ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک جگہ پیدا کر لی اور وہ ایک فیکٹری کا مالک ہے۔ میں نے ایک رات اس کی کوٹھی میں گزاری ہے اس کی زندگی میں اوپر نیچے نہ جانے کتنے استر اور میانہ تہیں ہیں اور ہر ایک کا رنگ جدا ہے لیکن اب بھی اگر وہ صحیح راہ پر گامزن ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ شریفانہ زندگی کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے لیکن شاید اس کی جوانی کی خامیاں پختہ ہو گئی ہیں اور ان سے دستبردار ہونے کو جرات درکار ہے کاش اس پر کسی صاحب باطن کی نظر پڑ جائے جس سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اس کی انسانیت سے مایوس ہونے کو میرا دل نہیں مانتا

عمرہ

میرے ایک دوست حج کر کے آئے تو جہاں چار آدمی بیٹھے دیکھتے وہیں اپنے حج کے حالات و واقعات بیان کرنے لگتے اور ایک معلم کی مدح و ثنا اور ایک حافظ معلم کی بداخلاقی میں یہاں تک غلو کرتے کہ طبیعت ٹھکانے نہ رہتی اور کوزی اچھلنے لگتی اور آخر میں اس کثرت بیان کا زہر کم کرنے کے لیے فرماتے کہ احسان دانش صاحب آپ حج کیوں نہیں کرتے حالانکہ وہ میرے حالات سے بخوبی آگاہ تھے لیکن ان کے باوصف وہ اپنے طنزیہ نشتر جاری رکھتے اور میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے خاموش رہ جاتا۔

بیت اللہ اور آستان رسول کی آرزو تو ایک مدت سے میرے دل میں سلگ رہی تھی مگر حالات کی طرف دیکھ کر دل مسوس کے رہ جاتا' ایک دن ایک اور صاحب نے بھی وہی بات کہی میں نے کہا لیجیے "یک نہ شد دو شد" مگر میں نے اپنی محرومی کو شگفتہ اور بے کسی کو جی دار بناتے ہوئے کھسیانا ہو کر کہا "جناب آپ جانتے ہیں کہ میں شاعر ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مشاعرہ کرائیں گے اور آمد و رفت کے مصارف بھیج دیں گے تو انشاء اللہ ضرور جاؤں گا۔"

ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ میرے ایک عزیز شاگرد محمد ظفر قادری اور ان کے برادر بزرگ سید محمد

نواز قادری تشریف لائے اور فرمانے لگے'' کیا آپ کے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ ہے؟ اگر ہے تو ابھی ہمیں دے دیں اور عمرہ کے لیے تیار ہو جائیں میں نے کہا'' پاسپورٹ تو لے جائیں لیکن مصارف سفر؟'' انہوں نے کہا ابھی یہ مسئلہ طے نہیں ہوا بڑے بھائی صاحب فرماتے ہیں کہ مصرف میں دوں گا میں کہہ رہا ہوں کہ اس خدمت کا حق مجھے پہنچتا ہے میری اہلیہ قمر النساء اس پر مصر ہے کہ میں بچپن سے احسان دانش کی معترف ہوں اس لیے انہیں میں اپنے مصارف سے لے جاؤں گی - اب دیکھیے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ بہرنوع آپ تیار رہیں - میں —— ہم درویشوں کی کیا تیاری! جب آپ کہیں گے اٹھ کر ساتھ چل پڑوں گا - ظفر قادری تھوڑی دیر قیام کے بعد میرا پاسپورٹ لے کر چلے گئے -

تین چار روز کے بعد پھر آئے اور کہنے لگے'' استاد تیار ہو جایئے - شام کو آٹھ بجے جہاز جائے گا - شام کے وقت انہوں نے گاڑی بھیج دی اور میں دو کھدر کے جوڑے ایک ٹین کے صندوقچے میں رکھ کر گھر سے روانہ ہو گیا -

لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز رات کو کراچی جا اترے میں تمام راستے اللہ کے فضل اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے اذن حضوری اور اپنی بے مائیگی پر غور کرتا چلا گیا - کراچی پہنچ کر قرب سحر تک نیند نہ آئی ایک کیفیت تھی جس میں تمام رات بہتا رہا دوسرے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے کراچی سے ایک دوسری یوان ناؤ میں سوار ہو کر ساڑھے بارہ جدہ پہنچ گئے - اس اثنا میں بھی میرے سامنے اپنی بے حیثیتی اور قدرت کی بارش کرم کا سلسلہ غیر مختتم سا رہا -

جدہ پہنچ کر دل کی کیفیت اور ہی کچھ ہو گئی ہر سانس میں کبھی خوشبوئی لپٹ آتی اور کبھی روحانی پرواز کی کیفیت بدن میں ایک جھرجھری سی چھوڑ دیتی کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا تمام جسم تعزیر کے گرم اندھیروں سے نکل رہا ہے اور اجاڑ آنکھوں کے دالان میں انوار و سرور کی کاشت لہلہا رہی ہے -

پیرزادہ محمد ظفر قادری اور سید محمد نواز قادری کے ملازم غلام جیلانی نے ٹیکسیوں سے بڑی کدو کاوش کے بعد مکہ معظمہ تک کا معاملہ طے کیا - میں تو خیال کرتا تھا کہ لاہور ہی کے ٹیکسی ڈرائیور آنکھوں گانٹھ کمینہ ہوتے ہیں لیکن یہاں کے ڈرائیور تو اخلاق سے دست برداری اور تیسرے درجے

کی پارائی میں ان سے منزلوں آگے ملئے وہ آپس میں زبان سے کم اور عقاب جیسی آنکھوں سے زیادہ گفتگو کرتے تھے۔ دو دو تین تین ڈرائیور زائرین کے ہجوم اور سامان کی ڈھیریوں میں اس طرح گھل رہے تھے اور لوگوں کے تن و توش کے علاوہ سامان سفر کو اس طرح تک رہے تھے جیسے عید الضحیٰ سے پہلے بکروں، مینڈھوں اور دنبوں کے خریدار انہیں گھیرتے اور پٹھے ٹولتے پھرتے ہیں پٹرول کے چشموں یا یوں کہیے کہ اس سیال سونے نے جو ہزاروں کے سینے سے ابل رہا ہے جدہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بھاؤ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ ہر ٹیکسی والے کی گفتگو میں سرمایہ کی بڑبڑاہٹ معلوم ہوتی تھی۔ جدہ کے بازار میں مختلف ہوٹل اور رنگ رنگ کی عمارتیں زمین کی برآئی ہوئی مرادیں معلوم ہو رہی تھیں اور میں یہاں کے تاجروں کے لہجے میں بہتی ہوئی سنہری جھنکاریں سن رہا تھا۔

جب یہ چار پانچ موٹروں کا قافلہ جھنجھلائے ہوئے سورج کے سفید دریا میں جا رہا تھا تمام ڈرائیوروں نے اپنی اپنی ٹیکسیوں میں مختلف قسم کے گانوں کے ریکارڈ لگا رکھے تھے اور ہم اس کولتار کی چمکتی ہوئی سنگین سڑک پر بہتے نغموں کے انتشار میں بہتے چلے جا رہے تھے اور وہ سڑک ان کا دل پی جھوڑے ہوئے جوان مانند معلوم ہو رہی تھی۔ ڈرائیوروں کی گفتگو میں تیز مزاجی کے آثار تھے شاید اس لیے کہ دولت کی ریل پیل سادہ لوح لوگوں کی زبان سان پر چڑھا دیتی ہے مجھے ان کے بعض بعض فقروں میں ان کے دل کی چڑ اند محسوس ہو رہی تھی۔

یہ ہمواریوں کا دیار اعظم اپنے دامن میں سیکڑوں حائل پہاڑوں کے زخم لیے پھیلتا چلا گیا تھا اور یہ مختلف قافلہ بدوؤں کے مال تجارت اور ڈرائیوروں کے سوچی شکاری طرح بے عذر و انکار خاک چاٹتا اور اس ریزنی سرزمین میں کھڑے اخلاق اور سخت دل لوگوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات سہتے ہوئے اور دیکھتا اور برداشت کرتا جا رہا تھا۔

ایک جگہ ڈرائیوروں نے موٹریں روک دیں جہاں قزاقوں یا اسمگلروں کے ڈیروں کی طرح چائے اور کھانے کی تین چار دکانیں ایسی تھیں جیسے گھوڑوں کے اصطبل خالی کرا کے دکانیں بنالی ہوں۔ دکانوں کے مالک رہزنوں سے زیادہ سخت گیر اور جیب تراشوں سے بڑھ کر روپیہ جھپٹنے میں مشاق تھے۔ وہاں ہم لوگوں نے پانی پیا اور ایک مچھلی خریدی جس کا وزن آدھ چھٹانک سے زیادہ نہ

تھا- دکان دار نے اس ایک مچھلی کے پچپن روپے بتائے اور چار آنے فی گلاس پانی کے وصول کیے۔

میں رہ رہ کے سوچتا تھا کہ الہ العالمین آخر اس دیار مقدس کے لوگ اس قدر اخلاق نبوی سے دور کیوں ہیں؟ سوچتے سوچتے سمجھ میں آیا کہ آخر یہ وہی تو لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے محسن انسانیت کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا اس خیال کا آنا تھا کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور دل کی تمام تلخی معافی میں بدل گئی اس کے بعد میں نے وہاں کی ہر بے رحمی بداخلاقی اور تندخوئی کی برداشت کو سنت نبوی سمجھ کر برداشت کیا۔

دو پہاڑوں کے درمیان ہر گھاٹی سمندر کی قدیم گزرگاہ کا کتبہ معلوم ہو رہی تھی جہاں کہیں کھجوروں کے دو چار درخت آتے وہیں چند گھروندے بھی دکھائی پڑتے جو اپنی ویرانی کی زبان میں یہاں کے باشندوں کی سہولت پسندی اور بےفکری کی داستانیں کہہ رہے تھے اور یہ وقت کی طویل رد داد ابھی تاریخ کے مقام تک نہیں پہنچی تھی جہاں قنائیت پر دوامیت کی مہریں ثبت کرنے والے رجال الغیب مہتمم ہوتے ہیں۔

جب ریگزار شروع ہوا تو حد نظر تک سراب کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ جس میں پہاڑوں کے عکس مکانوں کے سائے اور سفید ابر کے ٹکڑوں کا عکس توجہ مبذول کر لیتا تھا۔ حالانکہ دور تک آسمان نیلی جھیل کی طرح خالی اور زمین اشجار و کوہسار سے نابلد تھی۔

ایک جگہ سڑک محراب کی طرح خم ہوئی اور تھوڑی دیر سفر کرنے کے بعد ادھڑی ہوئی جلد کے پہاڑ شروع ہو گئے، مصیبت زدہ مسلمانوں کی طرح غبار آلود سنگریزے دور دور تک پھیلے پڑے تھے جن کی مزاج پرسی صرف موسمی ہوائیں یا بگولے کر رہے تھے اس ادھموئی زمین میں کچھ نیچے سے اور ٹھگنے درخت بھی اُگے ہوئے تھے لیکن وہ چھدرے اور بے برگ و بار تھے کہ زمین کو ان کا سایہ نصیب نہ تھا۔

پھر ایک جگہ موٹریں رکیں جہاں غسل وغیرہ کا ادھورا سا ماحول تھا سب وہیں اتر پڑے اور غسل کر کے سب نے احرام باندھ لیے اور دو رکعت نفل ادا کر کے موٹروں کی طرف چل پڑے اس وقت میری نظر میں قیامت کا میدان پھر گیا جیسے ہم قبروں سے نکل کے خدا کے سامنے جا رہے ہیں۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا اور پلکوں کی جڑوں میں آنسو سہم رہے تھے۔ اسی عالم میں ہم

موٹروں میں سوار ہو گئے اور پھر سفر شروع ہو گیا میں یہاں کے تانبے جیسے پتھروں کے ڈھیروں کو دیکھتا جا رہا تھا جو آنچ کھا کر کالے پڑ گئے تھے اور اس نظر سے معاً یہ خیال ہوتا تھا کہ کبھی یہاں سمندر اور سورج میں جنگ ہوئی ہے اور سمندر ہتھیار ڈال کر میدان چھوڑ گیا۔ یہاں کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں اور نکیلی پہاڑیاں سیاروں کے ان گنت ٹوٹے ہوئے دانتوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ رستے کے دونوں طرف آہنی پہاڑوں خورد سال اولاد ہتھوڑوں کے کارخانوں اور گھنوں کی فیکٹریوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ آگے چلے تو سورج کی نگاہوں سے بھنی ہوئی سرخ مٹی اور چٹختے ہوئے ذروں کے کھلیان اپنی اپنی بپتا میں ڈوبے ہوئے تھے اور کچھ جواب کے لیے گوش بر آواز یہاں کی کانٹے دار جھاڑیاں سوکھیا مسمان میں مبتلا نظر آ رہی تھیں اور آس پاس کے مہیب مناظر انسانی ترقی یا پاکستانی انتظامیہ کا انتظار کر رہے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا کہ ہمارا یہ گیارہ نفوس[۱] کا قافلہ مکے میں داخل ہو گیا اور ہم لوگ اپنا سامان فندوق الشیر امیں رکھ کر شرائط عمرہ میں مصروف ہو گئے۔ سعی کے بعد مجھے محمد ظفر قادری نے بتایا کہ زمزم پینے کے وقت جو دعا کی جائے وہ مقبول ہوتی ہے۔ میں خوش ہوا کہ آج اللہ اور اس کے حرم کی تقدیس وتاثر میں بھی امتحان سہی چنانچہ میں نے بارگاہ باری تعالیٰ میں عرض کی کہ الٰہ العالمین میں یہ زمزم پی رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ قیامت کے دن امت محمدی کی پیاس اسی طرح بجھائی جائے۔ آمین! اور اس تحریر سے میں اپنے ناظرین کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اس ایک دعا کے علاوہ خدا سے دنیا کی کوئی نعمت نہیں مانگی!!

اس کے بعد میں نے کئی عمرے کیے اور ہر عمرے پر اسی دعا کی تکرار جاری رکھی اور ایک روحانی سکون سا محسوس کیا' ایک عمرے کے بعد مجھے یہاں کی فضا اور ماحول کے برتاؤ سے کوئی شکوہ نہیں ہوا جب ذرا کوئی طبیعت کے خلاف بات ہوتی فوراً رسول مقبول ﷺ کے مصائب کا خیال آ جاتا اور اللہ سے معافی طلب کرتا۔

البتہ میں اس دیار کے بعض چہروں کو دیکھ کر خدا کی قدرت کے سامنے سر جھکا لیتا اور خیال کرتا کہ کیسے کیسے کھردرے لوگوں کو اس رحمت عالم نے سیدھا رستہ دکھایا اور دو سو برس کی ترقی صرف بیس

۱۔ سید محمد نواز قادری مع اہلیہ۔ صاحبزادہ محمد ظفر قادری مع اہلیہ۔ محمد قاسم مع اہلیہ۔ سردار محمد۔ غلام جیلانی۔ دو ارادت مند اور راقم الحروف۔

برس میں دے کر دنیا کے سربلندوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ ان ناہموار مزاج کے لوگوں میں خدا کا اقرار عام کر دینا صرف اسی رحمۃ اللعالمین کا کام تھا' کیونکہ یہ تو تمام جھوٹی عظمتوں اور ناقص جبروت کے مجسمے تھے۔ ان سے خدا کی عظمت کو تسلیم کرانا معمولی دل گردے کی بات نہ تھی۔

میں نے شرائط و واجبات سے فرصت پا کر ایک نگاہ خانہ کعبہ پر ڈالی اور حد نظر تک بے نیازی کا لق و دق میدان پھیلا ہوا پایا وہاں بھی رسول مقبول کے ابتدائی ایام کا ضبط و تحمل صبر اور بردباری سامنے آ گئی اور خود بخود میری گردن جھک گئی۔

جبل نور وہی پہاڑ ہے جہاں کے ایک ''غار حرا'' کو فکر گاہ رسول ہونے کا شرف حاصل ہے میں اپنی معذوری اور ناتوانی کے باعث اپنے ساتھیوں سے کٹ کر ایک گوشہ سنگ میں نوافل ادا کرنے لگا۔

حرا کے گرد و پیش میں آج بھی دنیا کی اس نئی سحر کی باقیات محسوس کر رہا تھا جو اس امی لقب کے ہونٹوں سے طلوع ہوئی آج بھی اس فضا میں جبریل کی پروازوں کے دائرے اور ہواؤں کے حلقے مجھے مس کر رہے تھے اور میں براہ راست دل و دماغ میں ایک ایسا تاثر محسوس کر رہا تھا جسے کسی کیفیت کا نام نہیں دیا جا سکتا مگر ہاں اسے روحانی لذت کہہ سکتے ہیں۔ پیشانی رسول سے پھوٹی ہوئی شفق اور خلق رسول سے پھوٹی ہوئی کرنوں نے کائنات کے درون و بیرون میں روشنی کے چشمے اتار دیئے تھے۔ جس سے دلوں میں نور اور آنکھوں میں سرور مسکرانے لگا تھا۔ اسی کے فرمان پر تاریخ نے اپنا صدر دروازہ کھولا تھا اور زمان و مکان نے چونک کر انگڑائی لی تھی۔

اسی کی نکتہ سنجی سے حکمت کو پرواز اور فلسفہ حیات کو رسائی تفویض ہوئی اسی کی زبان و بیان سے تعلیم و تربیت کا نظام بلندی کی طرف گامزن ہوا تھا جس سے تمام تعلیمی اور تدریسی ادارے جامعات کی طرف مڑ گئے تھے۔

اسی کی صداقت و دانائی نے عدالتوں کو عدل کا شعور دیا اور مظلوموں کی فریادوں کو آسانی گزر گاہوں سے آشنا کیا اور بارگاہ قدس کی نشاندہی کی!!

اسی نفسیات کے نبض شناس نے دولت مندوں میں ہمدردی ابھاری اور تاجر ایمانداری اور صداقت کے پرستار ہو گئے۔ آقاؤں میں عاجزی آ گئی اور حکمرانوں میں عدالت و فراست کے شعلے

خوشبو دینے لگے، یہ دنیا کے مصلحین میں پہلا دور تھا جب اصولوں اور عقیدوں کو منافعوں اور مصالح پر ترجیح دی گئی!!

میرا جی چاہتا تھا کہ یہاں کے ہر ذرے کو چوموں، آنکھوں سے لگاؤں اور دل میں رکھ لوں۔ میری پیشانی میں سجدوں کی فصل لہلہا رہی تھی اس خیال سے کہ شاید حضور کے قدم یہاں بھی آئے ہوں جہاں میرا سر نیاز خاک بسر ہے۔ مجھے اس سرزمین کا ہر ذرہ حرم نظر آ رہا تھا اور میں اپنے گوشت پوست کو عجز میں تحلیل کر دینا چاہتا تھا۔

اسی کیفیت میں میرے ہاتھ دعا کے لئے بلند ہو گئے اور نجانے اس وقت میری ہکلائی ہوئی زبان نے معروض کے کیا کیا پیرائے اختیار کئے ہوں گے۔

اتنے ہی میں میرے ساتھی اپنے اپنے حصے کی کیفیت اور برکت لیے آ پہنچے اور ہم آبادی کی طرف چل دیئے راہ میں غار ثور کا مقام آیا تو اس کی بلندی اور راستے کی ناہمواری دیکھ کر نگاہ گھوم گئی اور نظر میں اس رات کا منظر پھر گیا جب ایک بوڑھا صدیق پیغمبر دو عالم کو کاندھے پر اٹھائے پنجوں کے بل اس بلندی پر پہنچا تھا، اور پورا قدم زمین پر اس لیے نہیں رکھا تھا کہ مبادا کوئی تھا نگیا نقش قدم سے کھوج لگا لے اور حضور تک پہنچ جائے۔

اس کے بعد مختلف مقامات دیکھتے ہوئے ہم سب عمارت الاشراف میں جا اترے اور بڑی دیر تک اس سلسلے کے خیالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

ایک دن صاحبزادہ محمد ظفر قادری اور میں ایک دکان پر بیٹھے کچھ گفتگو کر رہے تھے کہ جناب عبداللہ عباس ندوی سے ملاقات ہوئی وہ میرا نام سنتے ہی چونک پڑے اور فرمایا خدا تعالیٰ گھر بیٹھے کیسی کیسی نعمتیں عطا فرماتا ہے وہ اسی وقت ظفر قادری کو اور مجھے اپنے دولت کدے پر لے گئے وہ ان دنوں وہیں عمارت الاشراف میں رہتے تھے ان سے نزدیکی ہوئی تو وہ بڑے کام کے آدمی نکلے اور کار آمد باتیں ہوئیں۔

عبداللہ عباس صاحب عربی لسانیت میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، اس کے علاوہ وہ ایک بلند ذوق ادیب، افسوں قلم صحافی اور نغز رقم مصنف ہیں۔ بحیثیت انسان وہ اعلیٰ قسم کے انسان ہیں اس لیے ان کی دوستی بھی قابل اعتماد ہے ہم جب تک مکے میں رہے ان سے پر لطف صحبتیں رہیں اور ان کا حسن

اخلاق بس زندگی بھر کا رابطہ ہو گیا۔

مدینے کو روانہ ہونے سے ایک روز پہلے میں اور ظفر قادری صاحب مولانا محمد سلیم صاحب سے ملے ان سے اور حافظ نعیم مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے' حافظ نعیم صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے کاندھلہ اور دہلی میں ان سے یادگار ملاقاتیں رہیں وہ کچھ ایسی جاذبیت رکھتے تھے کہ جس نے ان سے ایک بار بات کی بس عمر بھر کے لیے انہیں کا ہو رہا' ایسا اخلاق اور اتنی پر اثر اندازِ گفتگو میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے اور ان کی بے وقت موت سے مجھے اکیلے ہی کو نہیں ان کے تمام دوستوں کو دلی قلق ہے۔

محمد سلیم سے دہلی میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں وہ تقسیم ہند سے پہلے رسالہ ''برہان'' کے دفتر سے قریب کھجور روڈ پر رہتے تھے اس وقت ان کا ماہنامہ ''حرم'' بھی وہیں سے شائع ہوتا تھا' تقسیم کے شدید خسارے اور خمیازے کے بعد وہ پھر مکے چلے گئے اور وہیں سر سفید کر لیا' لیکن خدا کا شکر ہے خون سفید نہیں ہوا ان کی شفقت محبت اور انسانی دوستی جوں کی توں شاداب ہے۔

وہ مدرسہ صولتیہ کے مہتمم ہیں اور اپنے اہل و عیال کی طرح مدرسے سے محبت اور اس کی خدمت کو روا گردانتے ہیں مدرسہ صولتیہ میں قرآن اور حدیث کی تعلیم ہوتی ہے اور بڑے بڑے جید علماء پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اگرچہ یہاں دینی تعلیم کا ادارہ چلانا اور قائم رکھنا معمولی جگر کردے کا کام نہیں لیکن مولانا سلیم ہیں کہ دن رات اسی میں منہمک رہتے ہیں۔ میرے خیال سے اس دور میں اس ادارے کی امداد یقینی طور پر دین کی امداد ہے اور اسی پر اس کا دارو مدار ہے۔

اسی اثناء میں جناب حسن الحسنی صاحب سے ملاقات ہوئی' خوش خلق اور خوش ذوق ہونے کے علاوہ خدمت خلق میں ایسے منہمک کہ سر پیر کا ہوش نہیں جتنی دیر ان سے ملاقات رہی معنوی مہذب صحبتوں کا سماں بندھا رہا جنہیں صحیح معنی میں شرفاء کی صحبتیں کہا جاتا ہے۔ مکے سے مدینے کو روانگی ہوئی تو تمام رستے رسول اللہ صلعم کا پیدل سفر اور اس ناہموار رستے کے جان لیوا نشیب و فراز سامنے آ آ کے مغموم کرتے رہے۔

مدینے پہنچے تو آستانہ رسول کے قریب صندوق الحرم میں قیام ہوا اس ہوٹل میں لاہور کا رہنے والا ایک نوجوان صدیق نامی انتظامیہ عملے کا ایک رکن تھا اور مجھے لاہور ہی سے جانتا تھا' چنانچہ بڑے

تپاک سے ملا اور فوراً ہمارے قیام کا معقول انتظام کردیا- ہم سب روضہ رسول پر جانے کے لیے ہوٹل سے اتر ہی رہے تھے کہ صدیق نے سید سکندر شاہ پیر پگارو سے ملاقات کرائی' ان سے دیر تک گفتگو نہ ہو سکی اور موقعے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے ابھی چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک حسین چھریرے بدن کا نوجوان ملا اور اس نے پوچھا آپ صاحبان میں سے احسان دانش کون صاحب ہیں؟ میں نے بڑھ کے تعارف کرایا اور اس نے اپنا نام سید احمد بتایا اور کہا "آج شام کو یہاں ایک مشاعرہ ہے آپ اس میں صدارت کریں گے میں شام کو گاڑی لے کر آ جاؤں گا آپ تیار رہیں-"

میں نے گھلے گھلے لفاظ میں ہاں تو کر لی لیکن سوچنے کے بعد ایک کپکپی سے بڑھ گئی پنڈلیاں تھرتھرانے لگیں اور آنکھوں سے آنسو نہ سنبھل سکے میں نے بمشکل تمام ضبط کیا اور اس مقدس کیفیت میں غلطاں و پیچاں ساتھیوں سے الگ الگ اپنی منزل کی طرف چلتا رہا-

مجھے جناب ظفر قادری نے بتایا کہ جو آپ کو مشاعرے کی صدارت کی دعوت دے گئے ہیں- مدینے کی بزم اردو کے صدر ہیں- آستانہ رسول پر پہنچے تو میرے حواس ٹھکانے نہ رہے- روضہ رسول کیا عظمت و رحمت کا بلند منارہ ہے جہاں نیا بھرے زاہد و مرتاض بالشتیوں کی طرح خاک بسر تھے- آنکھیں اس رحمت للعالمین کے روضے پر سرنگوں تھیں' جس نے اپنی سیرۃ کو احکام خداوندی کے مطابق ڈھال کر اعلان کر دیا تھا کہ عبادت بغیر ملوکیت و ریاست حقیقی کا احساس اپنے ضمیر کو دھوکا دینا ہے!

جس کے عدلیے کے روبرو بڑے بڑے عادلوں کی گردنیں جھک گئیں اور عبادت کے سامنے فرشتے دم بخود رہ گئے جس کی فراست سے بڑے بڑے بلند بانگ منطقیوں اور فلسفیوں کی زبان میں تالے پڑ جاتے تھے جس کی عبودیت کے سامنے ریاضت و مجاہدہ اور مشاہدہ و مراقبہ انگشت بدنداں ہیں' جس نے ببانگ دہل کہا تھا کہ خدمت خلق کے بغیر عبادت کا جذبہ خود پروری ہے اور خدا ترسی کے بغیر احتیاج نفس کسی صورت میں نفسانیت سے کم نہیں' جس نے اپنے اور خدا کے درمیانی فاصلے تمام کر لیے تھے اور حق سے معاملہ طے ہو گیا تھا' جس نے اپنا نام لے کر خدا کا کام کرنا سکھایا' جس نے کائنات کے دلوں کی دھڑکن کو اپنے سینے میں سنا اور دماغوں کو اپنے آئینے میں منعکس کر لیا' جس

نے اپنے معیارِ عمل سے آسمانی کتاب کو قابلِ عمل ہونے کا ثبوت مہیا کیا' ایسا ثبوت جو وقت کے احاطے سے آزاد ہے اور کہنگی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی' جس کی ذات بابرکات نے قرآن کے قال کو حال بنایا جس میں کہیں دلائل کے لیے کوئی درز نہیں چھوڑی' اسی نے قرآن کے مرادی معنی سمجھائے اور مخفی گوشوں سے روشنیاں پھوٹ پڑیں' جس کی سیرۃ کی تفصیل سے گزر کر انسان قرآن کے متن میں داخل ہو سکتا ہے اور ایمان و ایقان کے دروازے چوپٹ ہو جاتے ہیں' اگر قرآن قیامت تک علوم و حکم سے انسانیت کی تکمیل کا ضامن ہے تو سیرۃ رسول بھی اقوام عالم کی تکمیل و تسکین کی ضامن رہے گی۔ یہ اسی پیغمبر کی شخصیت سے پتہ چلتا ہے کہ صحیح مسلمان وہ ہے جس کی عادت و عبادت میں فرق نہ رہے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب سزا و جزا کے عقائد عام ہو جائیں اور عبادت کے تحفظ کے لیے سیاست کا حصار ایسا مضبوط ہو کہ تمام قوتیں مجتمع ہو جائیں جس سے آسمان پندار پر بیٹھنے والے اور غرور کے مناروں پر بنکارنے والے زمین پر اتر کر عوام میں شامل ہو جائیں تاکہ خلافت خداوندی کا لقب زیب دے سکے۔

میں جتنی دیر حضور کے روضے پر رہا آنکھوں میں آنسو اور حیرت دونوں امڈ رہے اور ایسی روحانی لذت نصیب رہی کہ اس سے پہلے روح میں ایسی خوشبودار روشنی کی دھاریاں کبھی نہیں سرسرائی تھیں۔ شام کو سید احمد صاحب تشریف لائے' یہ بزم اردو مدینہ کے صدر تھے اور انہوں نے جہد مسلسل سے بزم اردو کے دفتر ہی میں اردو کتابوں اور اخباروں کی ایک قابل قدر لائبریری قائم کر رکھی تھی۔

وقت معینہ پر سامعین آ گئے اور مجھے صدارت کے منصب سے نوازا گیا۔ میں اس وقت کبھی تو اپنی بے مائیگی پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی رحمت للعالمین کی مہمان نوازی پر غور کرتا تھا۔ کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے میری روح گلاب میں غسل کر کے زعفران کی کیاری پر کھڑی ہے' میرے برابر ہی صاحب زادہ ظفر قادری بیٹھے تھے۔ حاضرین نے ان کے کلام اور ادائے کلام کو بے حد سراہا اور کئی لوگوں سے یادگار ملاقاتیں رہیں۔

جب ہم دل کے پیمانے اور آنکھوں کے کاسے لبریز کر کے ان مشہور اور مقدس مقامات کے نقشے ذہن میں لیے مدینے سے روانہ ہوئے تو جناب حسن الحسنی ہم سے پہلے جدہ پہنچ گئے اور وہاں کے صاحب ذوق حضرات کے مشورے سے جنہیں جناب عبداللہ عباس صاحب پہلے میری آمد سے

مطلع کر چکے تھے۔ اکٹھا کر کے صدارت میں ایک مشاعرہ احمد جمال صادق کے دولت کدے پر منعقد کر دیا' احمد جمال صاحب نہایت ذہین' خوش خلق' خوش اطوار اور نغز گو شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ جدہ میں ایک بڑی تجارتی فرم کے فرض شناس کارکن اور وفادار قسم کے نوجوان ہیں۔ کاش مسلمانوں میں ایسے زیرک اور خلیق صالح نوجوانوں کی اکثریت ہو جائے' میں صدق دل سے ان کی ترقی اور صحت کے لیے ہنوز دعا کرتا ہوں۔

مشاعرے کی اس نشست میں جتنے آدمی تھے نہایت خوش ذوق اور خوش کلام۔ جتنی دیر یہ مجلس شعر و سخن رہی' روح کو یا قوتی ملتی رہی اور ایسا لطف آیا کہ بڑے بڑے مشاعروں میں نہیں ملتی' یہاں نوجوانوں نے ایسا جوان اور جدید رخ کا کلام سنایا جو میری توقع سے باہر کی بات تھی' انہیں میں ایک نعیم علی صاحب ملے جو یوں تو ایک نوجوان دکاندار ہیں لیکن قدرت نے انہیں نہایت نکھرا اور ستھرا ذوق سخن عطا کیا ہے' ان دنوں وہ اچھے شعراء کا ایک انتخاب کر رہے تھے' نجانے وہ کہاں تک پہنچا ہوگا' میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ انتخاب میں شعراء کی مختصر سوانح آ جائے تو اس کی ادبی حیثیت مسلم ہو جائے گی' پھر پتہ نہ چل سکا کہ انہوں نے میری اس تجویز کو کہاں تک قابل عمل خیال کیا ہوگا میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سعودی عرب میں بیٹھ کر اردو شعراء کا انتخاب کوئی آسان بات نہیں لیکن میں ان کی کاوش قلم سے مایوس بھی نہیں' ایک صاحب محمد حفیظ قریشی رئیس العملیات سے ملاقت ہوئی صالح نوجوان مگر نہایت سوجھ بوجھ کے مالک اور اچھے سائنٹسٹ' پہلے وہ ایک عرصہ تک پیپسی کولا کے مختلف ذائقے ایجاد کرتے رہے مگر اب سمندر کے پانی کو میٹھا پانی بنا کر زندگیوں کو سیراب کر رہے ہیں' جناب حسن الحسنی حج کے عملے سے منسلک ہیں اور دن رات آگاہی و رہنمائی ان کا کام ہے اعلیٰ درجے کے مسافر نواز اور انسان دوست ہیں اور شعر و ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے کاش ایسے لوگوں سے مستقل ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے! آمین

جنت البقیع

جنت البقیع میں سونے والوں کی خوش بخت نیندوں پر میری زندگی کی شب بیداریاں رشک کر رہی تھیں اگرچہ وہاں کوئی مزار اپنی اصل حالت میں نہیں لیکن اس خاک میں ایسی ایسی جلیل القدر

ہستیاں محوخواب ہیں جن کے جد و جہد کے منارے آج بھی بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھاتے اور سفر کی سمتیں معین کرتے ہیں۔

سورج کی نظر ہماری پیشانیوں سے گدیوں کی طرف چل رہی تھی اور ہم مختلف سنگریزوں کے ڈھیروں، خاک کے تودوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے ہوتے شمال مشرق کے ایک کونے میں پہنچے۔ یہ حضرت حلیمہ سعدیہ کا مزار تھا جسے کچھ صدا بہار جھاڑیاں چھپائے ہوئے تھیں اور برف میں نہائی ہوئی ٹھنڈی سیت میں نہائی ہوا قبر کا طواف کر رہی تھی۔ میرا دل کیفیات کے غلبے میں کہہ رہا تھا کہ دیکھ یہ اس کی قبر ہے جس نے محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ جیسا پیغمبر پال پوس کے دنیا کو دیا جس کے خون نے دودھ بن کر محمد کے رگ و پے کو شاداب و سیراب رکھا، جس کے آغوش میں برسوں محمدؐ کا دل دھڑکتا رہا، جس کی گود نے دنیا کی تاریکیوں کی گودیں روشنیوں سے بھر دیں جس کے ہونٹوں نے دن رات محمدؐ کے لب و رخسار کو چوما اور اس نور مجسم کے شب و روز اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مجھے اس دنیا بھر کی ماؤں سے خوش نصیب دایہ کی قبر پر ایسا سکون ہوا جیسے گرمیوں کے روزے میں ٹھنڈے پانی کے پہلے گھونٹ سے

واپسی

جدہ سے روانگی ہوئی تو ہمارا جہاز چار ساڑھے چار گھنٹے میں پھر اسی سرزمین میں اترا جہاں کا سرمایہ دار سنگ دل بھی ہے اور کنجوس بھی! ظالم بھی ہے اور خود غرض بھی، جہاں کا لیڈر اپنی پارٹی کے مفاد سے آگے نہیں سوچتا اور محدود دائرے میں زندگی کے نفع و نقصان پر تقریروں کا عادی ہے، جہاں کاشت اور ایجادات سے نہیں بلکہ ٹیکسوں کی ناروا بھرمار کر کے بجٹ پورا کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ بے عمل کاہلی، قرض داری اور غیر ملکی امداد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، جہاں کے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے علاوہ موجدین ویرانی کے دیوتا اور قبرستان کے موجد معلوم ہوتے ہیں، جہاں کا تاجر لالچ اور ذخیرہ اندوزی کی دلدل میں لت پت ہو کر اخلاق اور مروت سے دستبردار ہو گیا ایسے تاجروں کی بے ایمانی اور ریاکاری سے بھوک اور معمولی معمولی ضروریات بھی پریشانی کا باعث بنتی رہتی ہیں۔ جہاں کا مفلس کاہل اور سست ہے اور محنت کے بغیر افلاس کا سدباب چاہتا ہے جو کسی بھی

صورت ممکن نہیں، جہاں کا مزدور کام چور اور سہولت پسند ہے، یہ فرض کی ادائی میں کوتاہی کر کے اچھی بھلی روزی کو حرام کر لیتا ہے۔ جہاں کا خزانچی امین نہیں، خائن ہے، وہ بے ایمانی بھی کرتا ہے اور غبن بھی، جہاں کے حکمران خود پرور اور بندہ نفس ہیں، جہاں برے اور نااہل افراد کی اکثریت بلند مقامات پر ہے اور اچھے لوگ مفلس و نادار ہیں، جہاں کا تنگ دست سرکش ہے اور کاریگر آرام طلب اور بلند اجرت! چنانچہ یہ غلط رو معاشرہ جس نے اپنی اصلاح کو جرم خیال کر لیا ہے، نتیجے میں تاسف کے سوا کیا دے سکتا ہے، ستم تو یہ ہے کہ یہاں اجتماع میں بھی بلند اخلاق پیدا نہیں ہوتا اور آئے دن مشکلات کے عقدے پر عقدے لگتے جا رہے ہیں۔ مادہ پرستی کی سیاہ دھند نے ان کی روحانی کیفیتوں پر سیاہ پردے ڈال دیئے اور ان کے دل عبادت سے خالی اور عبودیت سے دور جا چکے ہیں اب یہاں روحانی تنگ دستی اور بے نور مادیت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔

اب یہ کمیونزم اور سوشلزم کی طرف جھک رہے ہیں اور ہر صبح یہ سورج کی زرد کرنوں سے بیدار تو ہو جاتے ہیں لیکن دلوں کے خواب پہلے سے زیادہ دبیز ہو رہے ہیں، یہ کرنیں ان کی روحوں پر روشنی نہیں ڈالتیں اور ان کی تاریخ مدتوں سے جہاں تھی، وہیں رکی پڑی ہے۔

دماغی آپریشن

جناب اختر حسین کے توسل سے ڈاکٹر کبیر صدیقی صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی مرحوم اس وقت دماغ کے اپریشن کے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ نہایت شریف طبع، حلیم اور صاحب ذوق انسان! اور ان سے بڑھ کر صاحب ذوق اور شعر پسند ان کی بیگم، وہ تو گاہے گاہے شعر بھی کہتی تھیں اور بڑی خوبیوں کی خاتون تھیں۔

ایک دن ڈاکٹر صدیقی نے کہا ''احسان دانش صاحب آپ کل دس بجے میو ہسپتال تشریف لائیں، میں ایک غزل کہنے والا ہوں آپ خوش ہوں گے'' میں نے جواب دیا کہ ''جناب آپ غزل کہہ لیں پھر سنائیں میرا وہاں آنا اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ تو مصروف ہوں گے'' مگر انہوں نے بضد ہو کر مجھے میو ہسپتال آنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

میں ہسپتال گیا تو انہوں نے مجھے ایک کمرے کی نچلی گیلری میں بٹھا دیا اور کہا ''میں ایک پاگل

کے دماغ کا اپریشن کر رہا ہوں یہاں بیٹھ کر آپ دیکھیں!'' اتنے میں ایک بے ہوش شخص کو ڈنڈ ڈولی (اسٹریچر) میں لا کر آپریشن کی میز پر لٹا دیا اور احتیاطاً اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے پھر ڈاکٹر صدیقی نے نشتر سے اس کی منڈی ہوئی کھوپڑی پر ایک خط سا لگایا اور پھر پچھلے حصے کی کھال ماتھے کی طرف الٹ کر گول آری سے چاندی کے روپے کے برابر کھوپڑی میں دو سوراخ کھولے ان میں سے اندر سفید سفید مغز دکھائی دے رہا تھا ڈاکٹر صدیقی نے ایک پتلی سی ربڑ کی نالی سے اندر کا کوئی کوئی حصہ دھویا پھر چھتری کی کانپ جیسے ایک آلے سے اندر سے کچھ جلایا' تین چار اسسٹنٹ صدیقی صاحب کے گرداوزار دیئے اور دیگر احکام کی تعمیل کے لیے بجلی جیسی رفتار سے کام کر رہے تھے' صدیقی صاحب کی زبان کھلنے سے پہلے ضرورت کی چیز ان تک پہنچ جاتی تھی۔

صدیقی صاحب نے مناسب عمل کے بعد کھوپڑی کے سوراخوں پر وہی ہڈی کی ٹکیاں رکھیں اور کھال کو اسی طرح منڈھ کر سی دیا' میں یہ تمام عمل ایک جادوگر کے تماشے کی طرح دیکھ رہا تھا' اس کے بعد وہیں کے دو آدمی اس بے ہوش مریض کو باہر لے گئے اور صدیقی صاحب مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گئے اور کہنے لگے'' دیکھا جناب ہم لوگ اس طرح غزل کہتے ہیں۔''

میں چوتھے پانچویں روز گیا تو وہ مریض چائے پی رہا تھا۔ اب وہ دماغی طور پر تندرست ہو چکا تھا وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اس کے اعزاء واقربا کے نام کیا کیا ہیں وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کیا کام کرتا تھا' وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ پیشاب کہاں کرتے ہیں اور بیت الخلاء کہاں واقع ہے' قدم قدم پر ہسپتال کے معینہ آدمی اس کی رہنمائی کر رہے تھے! مجھے ڈاکٹر صدیقی کے اس کارنامے پر حیرت ہوئی اور سوچا کہ اگر انسان اسی طرح ترقی کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں کہ یہ سائنس پہلے شباب کو دائمی کرے گی پھر حیات کو اور اس طرح انسان خدا سے انکار پر مصر ہوگا اور یہ اس کی سب سے بڑی جہالت ہوگی جو علم کے نام سے اپنا تعارف کرائے گی۔

اس مشاہدے کے بعد میں ایک خاتون سے ملا تو اس نے علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا اور فن شعر میں مجھ سے مشورہ کرتی تھی میں نے اس سے ڈاکٹر صدیقی کے اپریشن کا واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا'' میری ایک رشتے کی بہن عرصے سے دماغی خرابی میں مبتلا ہے۔'' میں نے پوچھا'' کیا خرابی ہے اور بیماری کے آثار وعلامات کیا ہیں؟

اس نے کہا" دو ڈھائی سال ہوئے اس کی منگنی ہوئی تھی اور غالباً وہ اس لڑکے کو پسند بھی کرتی تھی لیکن خاندانی غلط فہمیوں کے باعث منگنی شکست ہوگئی لڑکے کے والدین نے تو لڑکے کی شادی کہیں اور کردی مگر لڑکی کا یہ عالم ہے نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے خاموش درو دیوار کو تکتی رہتی ہے کسی نے تھوڑا بہت دے دیا تو کھا پی لیا ورنہ اسے دنیا کے غم و نشاط سے دور کا بھی واسطہ نہیں' البتہ جب اس لڑکے کا نام لیا جاتا ہے جس سے وہ منسوب تھی اس وقت وہ چونک پڑتی ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے۔لڑکیاں بالیاں اس سے تمسخر بھی کرتی ہیں مگر وہ ڈھائی سال ہوگئے نہ ہنستی ہے نہ روتی ہے نجانے کس عالم میں مستغرق رہتی ہے۔"میں نے خیال کیا کہ شاید وہ شوق ضبط کی درمیانی پگڈنڈی پر چل نکلی ایسے لوگ گناہ اور خوف کی حد فاصل پر زندگی گزارتے ہیں اس خیال سے میں نے مشورہ دیا کہ "اسے یہاں بلوالو تو ڈاکٹر صدیقی تندرست کردیں گے وہ سب کچھ بھول کر اپنے اصلی برن میں آجائے گی!"

چنانچہ اس خاتون نے اپنے شوہر اور اس کے شوہر نے ڈاکٹر صدیقی سے مشورہ کرکے اس لڑکی کو نہٹور (ضلع بجنور) سے لاہور بلوالیا' وہ ایک شریف اور سادہ رولڑکی تھی رنگ گورا چہرہ ستا ہوا سورج کی نکلتی ہوئی دھوپ میں بیٹھی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شفق کی زرد ہوتی ہوئی سرخی انسانی روپ میں ڈھل گئی ہے۔ پہلی بار تھی وہ مجھے دیکھ کر سمٹی جیسے اس پر سردی کی برسات میں چھت ٹپکنے لگی ہو۔"

ڈاکٹر صدیق نے اس کے کالے ریشم سے لمبے اور ملائم بال منڈوا کر اپنے مکمل فن و عمل اور احتیاط کے ساتھ دماغ کا اپریشن کردیا اور یقین دلایا کہ یہ بالکل درست ہو جائے گی اس پر تمام اعزاء خوش تھے کہ لڑکی تندرست ہو جائے گی۔

ایک ہفتے کے بعد گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ماضی کو ماں باپ بھائی بہن اور دیگر لواحقین سمیت سب کو بھول گئی ہے مگر جب اس لڑکے کا نام لیا جاتا ہے تو اس پر پھر وہی آسیبی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے' جیسے آواز پر کان لگائے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو' میں نے ڈاکٹر صدیقی سے کہا تو کہنے لگے "بھائی میں نے دماغ کا اپریشن کیا ہے یہ تو کوئی روحانی پیچ معلوم ہوتا ہے جس کا علم خدا کو ہوسکتا ہے میں تو صرف دماغ تک محدود ہوں لیکن

مایوس نہیں ممکن ہے کچھ روز بعد درست ہو جائے۔'

میں: صدیقی صاحب کیا آپ خدا کے بھی قائل ہیں؟''

صدیقی صاحب بولے۔ ''ارے بھائی جہاں انسانی دماغ کی تمام کوششیں ختم ہو جاتی ہیں وہیں سے خدا کا یقین شروع ہو جاتا ہے' میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دماغ کا گودا تحصیل علم کیسے کرتا ہے اس میں قوت فیصلہ کہاں سے آتی ہے تشخیص و تجویز کا شعور کیسے ملتا ہے میری نظر میں تو یہ سب خدا کی قدرت ہے اور خدا ہی کو سب سے بڑی قوت تسلیم کرتا ہوں۔''

میں نے اپریشن کی ناکامی کے بعد بھی ایک بار اس لڑکی کو دیکھا ہے وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے ترمتی سے ڈرا ہوا کبوتر کہیں سے اچانک آ گرے مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ میری آنکھیں جنت میں ضرور جائیں گی میں نے ان آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ جسے محبت کی دیوی کہا جا سکتا ہے۔

غیبی امداد

ڈاکٹر نذیر احمد مزنگ میں یوں تو ڈاکٹر عبدالرؤف اور ڈاکٹر عبدالخالق کے علاوہ صوفی صدر الدین بھی میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھے اور یہ سب لوگ مجھ پر مہربانی فرماتے تھے' ڈاکٹر عبدالرؤف کے بڑے بھائی عبدالخالق صاحب نوجوان اور سند یافتہ ہونے کے باعث لکھے پڑھے طبقے میں عزت و آبرو کی نظر سے دیکھے جاتے تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مزنگ کے رؤسا میں ان کا شمار بھی تھا اور یہ پیشہ انہیں وراثت میں ملا تھا اور ڈگری سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی اس آبادی میں ایک ڈاکٹر نذیر احمد بھی میرے بہی خواہوں میں تھے اور میں بھی ان سے پر خلوص تعلق رکھتا تھا وہ نوجوان شریف اور متقی ہونے کے علاوہ انسان شناس اور ادب دوست بھی تھے انہیں مریضوں سے ایسا لگاؤ تھا کہ رات رات بھر مریضوں کے سرہانے بیٹھنا ان کے لیے معمولی بات تھی' پہلے تو میں نے خیال کیا کہ نوجوان ہیں اور اپنی ہر دل عزیزی کے لیے کام پر توجہ دیتے ہیں لیکن جب ذرا نزدیکی بڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ تو پر خلوص مخنتی اور اپنی روزی کو حلال کر کے خوش ہونے والا انسان ہے اور عبادت کے ساتھ خدمت خلق کا جذبہ ان کی زندگی کو سرتاسر عبادت بنائے ہوئے ہے۔

انہوں نے ایک دن بتایا کہ مجھے مطب قائم کیے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ مطب میں ایک شخص بوکھلایا ہوا آیا اور کہا ڈاکٹر صاحب میری بیوی نے افیون کھالی ہے خدارا آپ چل کر اسے دیکھ لیں۔ میں اس کے ساتھ ہولیا اور جا کر دیکھا تو مریض کی حالت غیر تھی میں گھبرا گیا کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی مریض میرے سامنے نہیں آیا تھا' ہزار دماغ پر زور دیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی میں اٹھ کر چل دیا اور مریضہ کے خاوند سے کہا ''آؤ مطب سے دوا دوں گا۔'' وہ میرے ساتھ ہو لیا' اس کے ساتھ میرے قدم تو ضرور اٹھ رہے تھے لیکن میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کوئی دوا یا انجکشن یاد آ جائے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دماغ کے دریچے بند ہیں۔ آخر ہم دونوں کلینک آ گئے' میری میز پر ایک رسالہ پڑا ہوا تھا میں سیدھے سبھاؤ ندامت آمیز پریشانی میں اس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا تو اچانک مجھے ایک جلی عنوان ''افیون'' نظر پڑا' میں نے اپنی ناتجربہ کاری کی خفت مٹانے کے لیے ایک ناپید دوا کا نام لکھ کر مریضہ کے خاوند کو دیا اور کہا جاؤ بازار سے جا کر یہ دوا لے آؤ وہ بازار چلا گیا اور میں نے اس رسالے سے افیون کے اثرات اور تدارک کی دوا پڑھی اور نسخہ تیار کر کے رکھ دیا' تھوڑی دیر میں وہ بازار سے ناکام واپس آ گیا اور میں نے اسے وہ دوا دے دی اور ہدایت کر دی کہ دو دو گھنٹے کے بعد دوا دو اور مجھے مریض کی حالت سے اطلاع دیتے رہو!! چنانچہ دو دو گھنٹے کے بعد افاقے کی خبر آتی رہی اور دوسرے روز مریضہ خطرے سے باہر ہو گئی۔

اس کے بعد میں اس رسالے کو کہ مہینوں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا رہا اور علی الصبح اٹھ کر قرآن کی تلاوت کے بعد اس مضمون کی جستجو میں اول تا آخر پڑھتا اور اوراق گردانی کرتا لیکن اس میں کہیں افیون کا عنوان تو کیا افیون کا ذکر تک نہ ملا نہ جانے میں نے اس رسالے میں وہ مضمون کہاں سے پڑھ لیا تھا۔

دو سال کے بعد ایک غیر ملکی ڈاکٹر نے افیون کے توڑ میں اپنی ایجاد کردہ ایک دوا کا نام لکھا اور وہ دوا وہی تھی جو میں اس مریضہ کو استعمال کرا چکا تھا' میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور اس طلسم کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

میں نے بعض بزرگانِ دین میں بھی یہ بات پائی ہے کہ وہ وقت سے پہلے آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات و حالات کی نشاندہی کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی مدت اور مسافت کا فرق پڑ جاتا

ہے اور شاید کہ اس لیے کہ ان کی صاف باطنی سے آنے والے واقعات و حادثات انہیں معلوم تو ہو جاتے ہیں لیکن صحیح فاصلے کا اندازہ نہیں ہوتا جس سے ان کی پیشن گوئی قبل از وقت یا بعد از وقت ظہور میں آتی ہے' میرے خیال سے تو یہ روح کی صفائی اور تصور کی رسائی کا کھیل ہے اور قدرت کسی کو اپنا ایسا راز دار بھی نہیں بناتی کہ ایک انسانی مشق و مزاولت کو خدارسی کا نام دیا جا سکے ہاں جن لوگوں کی زندگی خلوص اور عبادت و محبت پر مبنی ہوتی ہے ان کے دل و دماغ پر بھی مستقبل کی جھلکیاں پڑتی رہتی ہیں اور وہ اسے بعض بعض اوقات اپنا کمال دانائی خیال کرتے ہیں' بعض اوقات اتفاقی تصور یا علمی بصیرت بھی یہ کام کر جاتی ہے مگر صحیح بات ان سے ماورئی ہے جس کے تار و پود سے اہل طریقت بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی وہ بڑے مجاہدے اور مشاہدے کا حاصل ہوتی ہے۔

میرے علم میں ایک ایسے بزرگ ہیں کہ ایک دن وہ غریب خانے پر تشریف لائے تو میری ایک بحث سے تاؤ کھا کر میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا میں نے اچھی طرح دیکھا کہ وہ جب ''لاالہ'' کہتے تھے تو دل رک جاتا تھا اور جب ''الا اللہ'' کہتے تھے تو دل کی حرکت معلوم ہونے لگتی تھی' انہوں نے کئی منٹ تک میرا ہاتھ اپنے سینے سے نہ اٹھنے دیا اور فرمایا '' جناب یہ سب ریاضت سے ہے تصوف اس سے بلند چیز ہے جہاں میری پہنچ نہیں -'' میں نے ان سے عرض کی کہ'' جناب جتنی دیر آپ کا دل بند رہتا ہے آپ مر کیوں نہیں جاتے؟'' انہوں نے ہنس کر جواب دیا کہ'' زندگی کا تعلق دل کی حرکت سے نہیں اللہ کے حکم سے ہے۔''

سنا گیا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی مر چکے تھے لیکن ان کا دل دھڑک رہا تھا لوگوں نے ان کی تجہیز و تکفین میں تامل کیا تو ان کے ہم مشرب درویشوں نے کہا کہ'' ان کی وفات تو ہو چکی ہے رہا دل کا معاملہ یہ تو قبر میں بھی دھڑکے گا انہیں دفنا دیں! یہ تو اللہ کے ذکر کا کرشمہ ہے ان کا نہیں! بیماریاں' حادثے اور پریشانیاں تو موت کی دھمکیاں ہیں اور دل سے برائے نام تعلق ہے ورنہ دھڑکنا تو دل کی فطرت ہے۔''

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی' ڈاکٹر نذیر کی قدر و منزلت میرے دل میں ایسی ہے جیسے کسی موسم کی آب و ہوا' جو فضا کو کبھی خراب نہیں کر سکتی ان کے کردار نے ان کی جاذبیتوں کو زبان دے دی ہے اور سنجیدگی میں بھی وہ روح کی شادابی کا باعث ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جو ڈاکٹر طبیب صورت

اور سیرت دونوں کے اعتبار سے دلچسپ نہ ہو اس کے ہاتھ میں شفا بھی نہیں ہوتی' حسن بذات خود معالجہ ہے۔

میں ایک بار لاہور کے میو ہسپتال میں مریض کی حیثیت سے داخل ہوا اور ڈاکٹر نے میرے لیے ایک ایسی نرس کا تعین کر دیا جو مجھ سے بھی گاڑھا رنگ رکھتی تھی اور نقش و نگار کے اعتبار سے بھی کسی خاص جاذبیت کی مالک نہیں تھی' دوسرے روز جب ڈاکٹر نے آ کر میرا حال پوچھا تو میں نے عرض کی کہ ''جناب اور تو سب درست ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اندھوں کے وارڈ کی نرس مجھ پر مسلط کر دی ہے اس سے ایک شاعر کی نظر کو کچھ نہیں مل سکتا بلکہ اور نظر مجروح ہوتی ہے۔'' یہ سن کر ڈاکٹر صاحب مسکرا کر چل دیئے اور دوسرے دن نرس بدل دی گئی۔ لیکن وہ میری چارپائی کے پاس سے گزرتے ہوئے مرکھنی گائے کی طرح میری طرف دیکھتی تھی۔''

ایک چائے

ایک دن علی الصبح میں لارنس گارڈنز میں سیر کر رہا تھا کہ بابائے اردو مولانا عبدالحق صاحب سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ ہم دونوں باتیں کرتے اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے کرتے مزنگ سے قریب پہنچ گئے جہاں میں رہتا تھا' مولانا موصوف المنظر میں میاں بشیر احمد صاحب مدیر ''ہمایوں'' کے یہاں مقیم تھے' گھر نزدیک ہونے کے باعث میں نے مولانا سے بڑے نرم لہجے میں جھجکتے جھجکتے عرض کی کہ ''مولانا آیئے دونوں گھر چلتے ہیں میرے اہل و عیال گھر میں نہیں کا ندھلہ گئے ہوئے ہیں' دونوں مل جل کے چائے پکائیں گے آج یوں بھی سہی بڑے دستر خوان پر تو آپ ہمیشہ ہی چائے پیتے ہیں مولانا نے بصد اشتیاق فرمایا ہاں ہاں کیا مضائقہ ہے؟ چلو بڑا مزا آئے گا' مدت ہوگئی اس بے تکلفی سے چائے پئے۔

ہم دونوں غریب خانے پر پہنچ گئے' جاتے ہی مولانا نے فرمایا ''ارے بھائی کچھ نہانے کا انتظام بھی ہے کہ نہیں؟'' میں نے عرض کی ہاں ہاں اس کونے میں خورہ پر بیٹھ کر نہالیں دو بالٹیاں پانی موجود ہے یہ سامنے پلنگ کی چادر پڑی ہے اسے تولیہ کی جگہ استعمال کریں' جب نہا چکیں یہ چولھا موجود ہے اور دیگچی میں پانی رکھ دیا ہے یہ چائے کا پیکٹ رکھا ہے آپ چائے تیار کریں۔ میں دودھ

لینے جا رہا ہوں۔

مولانا نے فرمایا آپ دودھ لائیں چائے تیار ملے گی۔ میں باورچی خانہ مولانا کے سپرد کر کے دودھ لینے کے لیے گھر سے نکل آیا جہاں سے مجھے دودھ لانا تھا حالانکہ وہ جگہ کچھ اتنی دور تو نہیں تھی لیکن جب میں آیا تو مولانا نہا دھو کر چائے سامنے رکھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے آ کے دودھ گرم کیا اور چائے دم کر دی ادھر رات کو میں نے گڑ میں سوکھی روٹیاں پکائی تھیں وہ گرم دودھ پڑتے ہی حلوے سے بڑھ کر ہو گئیں۔ مولانا نے ایک لقمے کے فوراً بعد فرمایا بہت دنوں میں یہ میٹھے ٹکڑے کھائے ہیں مزا آ گیا اب سے تیس پینتیس برس پہلے کے ایک مخلص دوست کے یہاں یہ دعوت شیراز میسر آئی تھی یا پھر آج آپ کے یہاں یہ نعمت ملی ہے۔ مولانا نے مسرت کا اظہار بھی کیا اور اس بے تکلفی کی دعوت کو سراہا بھی لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے میری ندامت پر دبیز پردہ ڈال دیا کیونکہ میں مولانا کی خوش خوری دلی میں کئی بار دیکھ چکا تھا اور دریا گنج والے دفتر میں ان کے ساتھ کئی بار ناشتہ کر چکا تھا' کہاں ملتے ہیں اب ایسے مخلص بزرگ؟

صوفی ثناءاللہ (ایک درویش)

جن دنوں میں ڈیورن روڈ لاہور کے کنارے احاطہ سندر داس میں ایک چھ آنے مہینہ کے غسلخانے میں رہتا تھا ان دنوں اس احاطے میں میرے سوا تمام لوگ راجپوتانہ کے ہندو مزدور آباد تھے۔ چندا جمعدار اس احاطے کا کرایہ وصول کر کے مالک کو دیتا تھا۔ اور جہاں مدد لگتی اسی احاطے کے مزدور کام پر جاتے جن میں ایک میں بھی تھا۔

چونکہ ان لوگوں میں کوئی میرے ذوق کا آدمی نہیں تھا اس لیے ان میں میرا اٹھنا بیٹھنا بھی کم تھا۔ عموماً میں کام سے فارغ ہو کر دروازہ بند کر کے مطالعہ کرتا رہتا تھا' جب طبیعت اکتاتی تو چپکے سے باہر سڑک پر نکل جاتا اور چہل قدمی کر کے پھر آ کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا' میری اس بے تعلقی سے وہاں کے مزدوروں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ چندا جمعدار کا استاد کوئی عبادت گزار انسان ہے۔ میری پنج وقتہ نماز کی باقاعدگی نے ان کے اس خیال کو اور بھی پختہ کر دیا تھا۔ چنانچہ جب کسی کو کوئی بخار وغیرہ ہوتا تو میرے پاس لے آتے اور میں خدا کے کلام میں سے پڑھ پڑھ کر جو اس

وقت میری سمجھ میں آتا دم کر دیا کرتا اور ان کی قوت اعتماد یا نیت انہیں تندرستی کی طرف لے آتی' مزدوروں نے اپنے اس تصور کو آہستہ آہستہ معماروں میں پہنچا دیا اور وہ بھی مجھ سے شرافت اور نرمی سے پیش آنے لگے' جوں جوں دن گزر رہے تھے یہ افواہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔

ایک دن جب میں ڈینگا سنگھ بلڈنگ میں پتائی کر رہا تھا' شام کو کام سے فارغ ہو کر گھر کی طرف چلا تو ایک سنہری داڑھی والے حسین آدمی نے سامنے سے نہایت ادب سے سلام کیا اور کہا میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں' آیئے ادھر تھوڑی دیر سبزے پر بیٹھتے ہیں' میں سیدھے سبھاؤ اس کے ساتھ ہو لیا' وہ مجھے سامنے والے پلاٹ میں لے کر بیٹھ گیا جہاں اب ''مسجد شہدا'' ہے۔

اجنبی: میرا نام ثناءاللہ ہے چھاونی میں میری سائیکلوں کی دکان ہے' اور اس میں اس قدر بچت ہے کہ میں معاش کی طرف سے بے فکر ہوں' لیکن روحانی طور پر سکون میسر نہیں میں کچھ دنوں اثناء عشری بھی رہا ہوں' بہائی بھی بعض اہل تصوف کی خدمت میں بھی دن گزارے ہیں کچھ روز تک مرزائیت کی طرف بھی رجحان رہا مگر وہی ڈھاک کے تین پات؟ کچھ حاصل نہ وصول! سکون میسر نہیں' اگر آپ دعا کر دیں یا کوئی عمل بتا دیں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا'

میں: آپ کو جو کسی نے میرے متعلق بتایا ہے یا جو آپ نے سنا ہے وہ درست نہیں' دنیا کے لوگ ذرا سی بات کو انلارج کر لیتے ہیں' آپ نے دیکھا ہے میں تو اب مزدوری سے آ رہا ہوں اور تمام دن اپنا خون ہوتے ہوتے گزرا ہے' میں تو معمولی مزدور ہوں آپ شاید غلط شخص کے پاس چلے آئے وہ کوئی اور ہوگا جس کی تلاش آپ کو لیے پھر رہی ہے' اگر میرے پاس کوئی عمل' کوئی شعبدہ یا کوئی کمال ہوتا تو مجھے چونا ڈھونے یا پتائی کرنے کی کیا پڑی تھی' میں تو ایک گناہ گار ہوں اور اعمال کی سزا بھگت رہا ہوں عقبیٰ میں چل کر نہ جانے کیا پیش آئے؟ ہاں آپ کے لیے دعا کر دوں گا خدا کی ذات ہر مشکل کو آسان کرنے والی ہے۔

ثناءاللہ: اس گفتگو سے تو آپ کا اتقاء اور بھی اجاگر ہو گیا' یہ درست ہے کہ آپ بڑی ہی جانکاہ مشقت کرتے ہیں مگر حلال روزی کمانا تو کوئی عیب نہیں مجھے تو براہ کرم کوئی ایسا عمل بتا دیں جس سے میری دلی مراد پوری ہو جائے اور وہ جائز ہے ناجائز نہیں! جب میں نے دیکھا کہ یہ تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا اور مجھے شام ہو رہی ہے تو میں نے اسے ایک درود بتا دیا جو مجھے بابو اللہ دتہ مرحوم سے

پہنچا تھا' اور تاکید کی کہ تہجد کے وقت غسل کر کے یہ عمل کریں تمہاری وہی مراد پوری ہوگی جو تمہاری روح کا تقاضا ہوگا - ناجائز کوئی مراد پوری نہیں ہوسکتی - خدا کے نام سے کوئی ناجائز بات پوری نہیں ہوتی - جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کا نام لینے سے ناجائز آرزوئیں بھی پوری ہوجاتی ہیں وہ بالکل غلط گو اور افترا پرداز ہیں -

وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا! بیس پچیس روز کے بعد میں تھکا ہارا سو رہا تھا کہ رات کے دو بجے مجھے صوفی ثنا اللہ نے آجگایا - میں نے پوچھا کیا بات ہے تم اس وقت کیوں آئے یہ سننا تھا کہ اس نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا میں نے کہا بات تو بتاؤ کیا ہے؟ اس وقت کیوں آئے کیا مصیبت پڑی - میں سمجھا کہ شاید کسی بے اعتدالی سے وظیفہ بگڑ گیا یا کوئی چیز دیکھ کر ڈر گیا -

صوفی ثنا اللہ: حضور میں تو بیعت ہونے کے لیے آیا ہوں - مجھے تو غلامی میں لے لیجے مجھے تو غلامی میں لے لیجے مجھے سکون و اطمینان کی ضرورت نہیں مجھے آپ کی بخشی ہوئی بے اطمینانی قبول ہے مجھے جو درکار تھا مل گیا -

میں: میاں میرے یہاں پیری مریدی کا کاروبار نہیں ہوتا آپ کسی مرد کامل کے ہاتھ پر بیعت کریں - میں تو اس راہ کا فقیر بھی نہیں -

وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا اور مجھے جان چھڑانا دشوار ہو گیا - مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اگر آس پاس کے لوگ یہ سوگ سہاگ سن کر بیدار ہو گئے تو اور تماشا بنے گا لیکن کوئی چھٹکارے کی صورت بھی نظر نہیں آتی تھی - آخر میں نے اسے کہا کہ آپ اس وقت تو جائیں اور میرے ہمسایوں سے نیند کا حق نہ چھینیں - اس مسئلہ پر پھر کبھی گفتگو رہے گی وہ میرے کہنے پر چلا تو گیا لیکن میری نیند ساتھ لے گیا میں صبح تک یہی سوچتا رہا کہ یہ کیا عذاب ہے اور اس سے کیسے نجات ملے گی -

ابھی دن نکلا ہی تھا اور میں مزدوری پر جانے کے لیے تیار ہی تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہا کہ ''تکیے میں آپ کو صوفی محمد حسین صاحب نے یاد فرمایا ہے' میں گیا تو صوفی ثنا اللہ بھی وہیں موجود ملے' صوفی محمد حسین صاحب نے فرمایا'' جب یہ آرزو رکھتے ہیں تو آپ انہیں بیعت کیوں نہیں کر لیتے'' میں نے عرض کی کہ حضور میں یہ پیری مریدی نہ کرتا نہ خود کو اس قابل خیال کرتا ہوں -

حضرت شاہ محمد حسین صاحب نے فرمایا' آپ اسے بیعت تو کریں آپ جس چیز کی کمی محسوس کر رہے ہیں وہ بھی خدا پوری کر دے گا۔
دیکھئے حضور آپ ذمہ داری لیتے ہیں تو میں یہ جرات کرتا ہوں ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں!

شاہ صاحب نے ایک طویل ''ہوں'' کے ساتھ کہا چلو چلو نیک کام میں زیادہ حجت اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے صوفی ثناء اللہ کو شام کا وقت دے دیا۔ میں چندا جمعدار سے چار بجے چھٹی لے کر آ گیا۔ صوفی ثناء اللہ مجھ سے پہلے موجود تھا' میں نے اسے ایک موٹر کے گیرج میں لے جا کے بیعت کے لیے بٹھا تو لیا۔ لیکن دل میں فکر مندی تھی میں نے کہا دو رکعت نفل ادا کرو اس نے نیت باندھ لی اور اس کے ساتھ دو رکعت میں نے بھی ادا کی اور خدا سے دعا کی کہ الہ العالمین میں تیرے بھروسے پر یہ قدم اٹھا رہا ہوں میری مدد فرما' تو عالم الغیب ہے کہ میرا اس میں کوئی مفاد نہیں۔ لیکن تیرے نام کی تبلیغ کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اگر میں راہ راست پر ہوں تو اس کی مدد فرما اور زبان کو تاثیر دے تا کہ تیرے اور تیرے حبیب محمد مصطفی ﷺ کے نام اور تیری دی ہوئی توفیق سے اپنا نام بلند کر سکے۔

اس کے بعد مجھے نہ خوف دہراس تھا نہ فکر مندی حالانکہ میں اس منصب کی تمام ذمہ داریاں جانتا تھا ثنا اللہ جب میرے سامنے بیٹھا تو اس پر پہلے ہی سے لرزہ سا طاری تھا' میرے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہی لرزہ براندامی میں مرید ہوا اور آخر میں جب میں نے ذرا توجہ دی تو بے ہوش ہو گیا' میں اسے اسی عالم میں چھوڑ کر چلا آیا۔ پھر نہ جانے اسے کب اور کیسے ہوش آیا ہوگا۔

دوسرے روز علی الصبح ابھی سورج نے زمین کے ڈھلوان پر نظریں نہیں ڈالی تھیں کہیں کہیں شہر کی اناریوں کے منڈیر جاگے تھے کہ ثنا اللہ آیا وہ اب بہت مسرور تھا کہنے لگا ''اب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' میں نے کہا ''میں اینٹیں ڈھوتا ہوں تم جوتا گانٹھو اور کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ یہ سن کر چل دیا اور اپنے عزیز و اقارب میں مٹھائی تقسیم کی۔

وہ ہفتے میں ایک بار میرے یہاں ضرور آتا اور باادب ہو کر بیٹھتا کچھ روز کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ زیادہ جاگتا ہے کیونکہ ہر وقت اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری بھاری رہنے لگے تھے اور پتلیاں سرخ ڈورے قبول کر رہی تھیں میں نے زیادہ بات نہیں کی صرف یہ کہا کہ دیکھو اپنی

بساط سے زیادہ عبادت بھی نقصان رساں ہوتی ہے جس پر اس نے کہا کہ اپنی بساط سے زیادہ تو انسان ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا اور جہاں تک جا سکتا ہے وہاں تک اس کی بساط ہی ہے کیا وہ ایک سانس بھی اپنی بساط سے باہر لے سکتا ہے؟

میں نے بڑے اطمینان سے کہا کہ انسان اور جانور کی نہ ایک چال ہے اور نہ ایک بساط۔

کلجگ

میں نے سب سے پہلے اس شخص کا ذکر اور اس کے کمالات کی روداد اپنے عزیز دوست مسعود جیلانی صاحب سے سنی تھی' میں مسعود جیلانی صاحب کو ایک مخلص دوست ہونے کے علاوہ محب وطن بھی خیال کرتا ہوں اور ہرگز ایسی امید نہیں رکھتا کہ وہ دروغ بافی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ اس کے باوصف اس کے کشف و کرامات کی غیر مختتم زنجیر سے دل مطمئن نہ ہوا یہی خیال کیا کہ یا تو کوئی شعبدہ باز ہے یا کوئی اپنی کم علمی کو انالارج کر کے بیان کرنے والا مجلس کا دھنی لیکن جب میں اس سے ملا تو میری بدگمانی حیرت میں بدل گئی۔ ایک میلے رنگ کا معمولی شکل و صورت کا انسان۔ جس کے پاس بیٹھنے سے مرغیوں کے ڈربوں یا طوطوں کے پنجروں جیسی بو آتی تھی وہ تھرڈ کلاس سگریٹ پیتا تھا مگر زنجیرہ پیتا تھا۔ وہ صبح کو ایک دیا سلائی جلا کر سگریٹ سلگاتا ہوگا پھر تمام دن سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا رہتا تھا۔ جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے اس پر ''لکھے نہ پڑھے نام ''محمد فاضل'' والا مقولہ صادق آتا تھا۔ نہ اردو زبان کے شین' قاف سے واقف نہ پنجابی زبان کے رس کا عادی لکھے تو غلط املاء۔ پڑھے تو غلط تلفظ نہ کھانے میں کوئی ڈھنگ نہ پہنے میں۔ نہ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز نہ بات میں لوچ مگر گردو پیش سے بے نیاز اور خوف و رجاء سے بے پروا گویا ایک وارفتہ حال اور گم گشتہ کمال انسان۔

وہ علم نجوم' رمل' جفر' مسمریزم' ہپناٹزم اور قیافہ شناسی کے علاوہ فراست الید سے بھی علیحدہ اور بلند دانائی کا انسان تھا۔ علمی قابلیت سے بے بہرہ ڈگریوں سے نابلد' ایسا مجوبہ کار بادشاہ جو درویشی کی انوٹ رکھتا تھا اس کے معتقدوں میں ایسے ایسے آدمی تھے کہ وہ کہیں بھی جا کر بیٹھ جاتا تو زندگی بھر اس کی ذات کسی پر بار نہ ہوتی۔ مگر وہ دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور رعایت سے گفتگو کرنا عیب سمجھتا تھا وہ قہر درویش بر جان درویش کی سراپا تصویر تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ جس شخص کی انگلی پکڑ لیتا

اس کے پوشیدہ سے پوشیدہ حالات و واردات اس طرح بتاتا جیسے وہ اس کی موجودگی میں واقع ہوئے ہیں اور اس کا یہ کمال اس درجہ پہ پہنچا ہوا تھا کہ صوفی ثناء اللہ تعریف میں ایک سانس، سانس تو بے شک جانور بھی لیتے ہیں لیکن انسان کی ہر سانس اپنے معبود کی شکرگزاری میں بسر ہونی چاہئے اس نے سن کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے کہا دیکھو حلال روزی کما کر اس سے بنا ہوا خون خدا کے رستے میں صرف کرنا عبودیت ہے اور بس اسی میں سب عظمتیں ہیں اس نے گھلے گھلے الفاظ میں اتنا کہا ''میں اس سے غافل نہیں'' دن تھے کہ گزرتے جا رہے تھے۔ تین چار ماہ کے بعد ایک روز ایک شخص نے آ کے بتایا کہ ثناء اللہ صاحب نے عرصہ ہوا سائیکلوں والی دکان فروخت کر دی اور ٹمپل روڈ پر جوتے گانٹھتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا اور اٹھ کر ٹمپل روڈ کی راہ لی لیکن دور ہی سے میں نے دیکھا کہ وہ تو واقعی جوتے گانٹھ رہا ہے اور اس کے گرد لوگ جمع ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ لوگوں کا ہجوم کیوں ہے؟ میں نے ادھر سے آنے والے ایک آدمی سے دریافت کیا، اس نے کہا کوئی بزرگ ہیں بے چارے، جوتے گانٹھتے ہیں کوئی اجرت دیتا ہے تو لے لیتے ہیں نہیں دیتا تو تقاضا نہیں کرتے میں نے کہا یہ اس کے گرد آدمیوں کا ہجوم کیوں ہے اس نے بتایا کہ یہ کوئی صاحب فیض درویش ہے اور یہ جو اس کے چاروں طرف کھڑے ہیں مریض ہیں، وہ کسی کو اپنے مٹی کے بادیئے میں سے پانی دیتا ہے کسی پر دم کر دیتا ہے اور اللہ فضل کر دیتا ہے میں یہ سن کر چپکے سے واپس آ گیا اور خیال کیا کہ اب یہ گھربار کے قابل نہیں رہا۔ اس کے گھر والوں کا کیا بنے گا۔ اب اس کے بچوں کی تندرستی اور بہبود کے لیے دعائیں میرا روز کا معمول ہو گیا۔ کوئی مہینے بھر کے بعد ایک شخص نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کا مرید تو ستم کرتا ہے کہ جس کٹریل میں جوتا بھگونے کا پانی رہتا ہے اسی میں سے وہی پانی وہ مختلف امراض کے لیے بھی دیتا ہے اور لوگ ایسے اندھے ہو رہے ہیں کہ کوئی اعتراض نہیں کرتا اور پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں، اس بات سے ایک طرف تو مجھے افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا اور دوسری طرف یہ خیال بھی جاگا کہ آدمی میں کس قدر قوتیں چھپی ہوئی ہیں! حالانکہ نہ تو ثناء اللہ پر کسی بزرگ کی نظر ہے نہ کسی صاحب باطن کا تصرف مگر یہ صرف ذاتی جدوجہد اور قوت ایمانی میں کس قدر بلند ہوتا جا رہا ہے کہ پورا محلہ نہیں آدھی آبادی اس کی مداح ہے، جوتا بھگونے کے ٹھیکرے میں سے پانی پلانا شرعاً جائز نہیں آخر یہ کیا تک ہے۔

شام کے وقت جب مزدور روٹی ہانڈی سے فارغ ہوتے ہیں میں نے ثناءاللہ کو بلا بھیجا' وہ آیا تو میرے قدم چھو کر بیٹھ گیا' میں نے کہا '' یہ قدم چھونا بدعت ہے بدعت '' ! میں آئندہ یہ نہ دیکھوں

ثناءاللہ: میں کیا کروں دل سے مجبور ہوں ! خود بخود میرا سر جھک جاتا ہے اور ہاتھ سر سے پہلے قدموں سے جا ملتے ہیں' ابھی اس کا ترک میرے بس کی بات نہیں رفتہ رفتہ اصلاح ہوگی۔

میں: تم لاہور چھوڑ دو' شاہدرہ تمہارے لئے موزوں جگہ رہے گی۔

ثناءاللہ: بہتر حضور !! لیکن پھر حاضری کا کیا رہے گا؟

میں: جب تک میرا خط نہ آئے اس وقت تک آنے کی زحمت نہ کرنا' موقع ہوا اور ضرورت سمجھی تو میں خود آ جاؤں گا۔

ثناءاللہ اٹھ کر سلام کر کے چلا گیا اور ایسا گیا کہ کبھی لاہور میں تھا ہی نہیں۔ سیکڑوں بار ذکر آیا' ہزاروں بار لوگوں نے دریافت کیا' میں کیا بتاتا جب کہ مجھے بھی اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔

کوئی سال بھر کے بعد میں دہلی ایک مشاعرے میں گیا تو وہاں ایک صاحب بابو عبدالستار سے ملاقات ہوئی عبدالستار کسی سرکاری دفتر میں کسی درمیانہ عہدے پر فائز تھے' کہنے لگے آپ لوگوں کی زندگی تمام کی تمام رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے اور شاعر آخر عمر تک نیکی کی طرف نہیں آتا' اور نہ اسے کسی صاحب باطن کی تلاش ہوتی ہے' میں نے جواباً کہا جناب میں گناہ گار تو ضرور ہوں لیکن درویشوں اور صاف باطن بزرگوں کی ملاقات اور خدمت کو سعادت خیال کرتا ہوں' اگر آپ کی نظر میں کوئی صاحب مقام بزرگ ہے تو مجھے ضرور لے چلیے

عبدالستار: ہاں چلیے میں ایک صاحب معرفت بزرگ کی زیارت کراتا ہوں آپ مل کر خوش ہوں گے بڑے صاحب فیض بزرگ ہیں اور ان کی بڑی دھوم ہے۔

میں: بڑی مہربانی ہوگی چلیے لے چلیے !

ہم دونوں جامع مسجد دہلی سے چل دیئے اور عبدالستار مجھے ریلوے اسٹیشن لے گیا' میں نے دریافت کیا کہ '' کیا وہ بزرگ کہیں دہلی سے باہر ہیں؟ اس نے کہا زیادہ دور نہیں ہم موٹر میں بھی جاسکتے تھے لیکن ریل کی سواری محفوظ سواری ہے اس لیے ریل گاڑی مناسب ہے۔ شاہدرہ تک تو جانا ہی ہے۔

میں خوب کہہ کر خاموش ہو گیا' تھوڑی دیر کے بعد میں نے عبدالستار سے پوچھا وہ بزرگ کہاں رہتے ہیں۔

عبدالستار: آبادی سے باہر ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں۔

میں: ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

عبدالستار: پرانے جوتے مرمت کرتے ہیں اور اس حلال روزی سے اپنا گزارہ کرتے ہیں

میں: ان کا حلیہ کیا ہے؟

عبدالستار: گورا رنگ' چوڑی پیشانی' سنہری داڑھی' میانہ قد اور سیاہ لباس یک دم میرا خیال صوفی ثناء اللہ کی طرف گیا کہ ہو نہ ہو دیوانہ ہے لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں خاموش ہی رہا' آخر ہم دونوں شاہدرہ کے اسٹیشن جا اترے اور پھر آبادی کے دوسرے سرے تک پہنچے جہاں وہ مقیم تھے' میں جھونپڑی سے ذرا فاصلے پر ٹھٹھک گیا اور عبدالستار سے کہا کہ پیر صاحب سے میرے لیے اجازت لاؤ۔ صوفی صاحب کو جب میری آمد کی خبر ملی تو وہ بجلی کی طرح تڑپ کر بھاگے وہ آ کر قدم لینا چاہتے تھے لیکن میں نے روک دیا۔ پھر میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ ثناء اللہ نے سن کر گردن جھکا لی اور دبے دبے الفاظ میں کہا ''حضور سے جو کچھ مل گیا ہے مجھے قیامت تک کو بہت ہے' حالانکہ ثناء اللہ کو جو حاصل ہوا یہ سب اس کی ذاتی محنت' مزاولت اور عبادت کی برکت ہے جس سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا' میں تو آج تک ان بلندیوں سے محروم ہوں یہ جو کچھ بھی ہے اس کی ذاتی عجز وانکساری اور اظہار عبودیت کا صلہ ہے کیونکہ خداوند کریم کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا اور بندے کی انکساری کو بڑا مقام دیتا ہے۔

ہم صوفی ثناء اللہ کی اس خانقاہ خس وخاشاک میں اچھی خاصی دیر رہے اور اس اثنا میں رہ رہ کر میں صوفی ثناء اللہ کو دیکھتا رہا' رخصت ہوئے تو دور تک صوفی صاحب احتراماً ساتھ آئے۔

یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا' یہ حالات دیکھ کر عبدالستار صاحب کے ہونٹوں پر مہر لگ گئی' میرے ہر سوال پر انہوں نے یہی کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں' میں آپ کے اس رنگ کو نہیں پا سکا تھا' میں نے ہزار یقین دلایا کہ بھائی میں تو ایک شاعر ہوں اور شاعروں کی زندگی عموماً گناہ آلود ہوتی ہے یہ تو صوفی صاحب کا اخلاق ہے کہ وہ اس تکلف سے پیش آئے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

لیکن عبدالستار شہر تک وا سطہ حیرت سے نہیں نکلے' میں مشاعرے سے لاہور آ گیا' اور میرے اردگرد کے لوگوں میں صوفی صاحب کے ذکرواذکار کی تجدید ہو گئی' بہت دنوں کے بعد یعنی تقسیم ملک کے بعد میں ایک دن اپنے کتب خانے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم - اے' پی ایچ ڈی تشریف لائے اور جیب سے ایک خط نکال کر فرمانے لگے اچھا جناب کیا آپ ہم لوگوں سے بھی پردہ کریں گے کیا ہم سے بھی کوئی راز راز رہے گا-

میں نے عرض کی جناب بات تو بتایئے کیا ہے؟ انہوں نے خط پڑھ کے سنایا اس میں لکھا تھا یہاں کراچی جیکب لائن میں ایک صاحب تصرف درویش جوتے کی مرمت کا کام کرتے ہیں اور مخلوق خدا ہے کہ ان کی زیارت اور دعا کے لیے بے تاب نظر آتی ہے- بڑے بڑے ایوان نشیں اور محلات کے مالک اس جھونپڑی میں رہنے والے درویش کے قدموں میں پائے جاتے ہیں نہ انہیں کسی سے کوئی لالچ ہے نہ آرزو' مگر ان کی تلاش میں مدتیں سرگرداں رہتی ہیں' ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت تو جناب احسان دانش سے بیعت ہیں' آپ واپسی لکھیں کہ احسان دانش کیا میدان فقر کے دھنی بھی ہیں' ہم تو آج تک انہیں ایک اچھا شاعر ہی خیال کرتے رہے یہ سن کر مجھے ایک ندامت آلود ہنسی آ گئی اور ڈاکٹر برہان صاحب کو یہ سارا قصہ کہہ سنایا وہ سوچ میں پڑ گئے' میں نے عرض کی ''ڈاکٹر صاحب کسی کو کوئی کچھ نہیں دیتا یہ تو اپنے اندر کی روشنی ہی رستے اجالتی اور راہیں تراشتی ہے' اگر اندر کا مال صاف نہ ہو تو باہر کے ہزار صیقل بھی دل کے آئینے میں جھلکار پیدا نہیں کر سکتے - کوئی علم ہو وہ انسانیت کے خمیر سے باہر کی چیز نہیں قیامت تک جس قدر علوم مشاہدے میں آئیں گے وہ سب انسان میں ودیعت ہیں صرف کواڑ کھلنے کی دیر ہے جس نے جس پہلو کے دروازے پر دستک دے دی اسے وہیں سے اس کی استعداد کے مطابق کچھ نہ کچھ مل گیا' اور یہ سب ہے خدا کے فضل و کرم پر فضل شامل حال ہو اور انسان ماحول سے غیریت کا رابطہ رکھے تو خود بخود منزلیں آسان ہو جاتی ہیں ہمارے لیے قرآن کی رہنمائی اور رسول اکرم کی اتباع زندگی کو بندگی بنانے کے لیے بہت ہے' شیخ صرف اپنے تجربات کی روشنی میں تبلیغ کے ذریعہ سے راستے تو آسان کر دیتا ہے لیکن کامیابی خدا کے بس کی بات ہے' وہی قادر ہے ہر بات پر' لیکن اس کے باوصف نہ رستہ پوچھنا جرم ہے نہ بتانا کوئی گناہ' کیونکہ یہ تو حقائق کی تبلیغ ہے جو منشائے فطرت ہے اس کے آگے

کلجگ کا ذکر ہے۔ اس کے مداحوں اور معتقدوں میں بے شمار ملک کے اعلیٰ دماغ، بہترین مدبر اونچے درجے کے سیاس، افعی قسم کے شاعر، قانون پیشہ عمال، ڈاکٹر، پروفیسر سول جج اور فوجی حکام، پولیس اور سی۔ آئی۔ اے کے بڑے بڑے دم گلے افسر اس کی روشن ضمیری اور غیبی مخبری کے قائل تھے۔ جب وہ اپنی روحانی قوتوں کا معمول بنتا تو اس وقت اس کی جہالت علم میں بدل جاتی۔ اردو، فارس اور عربی میں عالموں جیسی گفتگو کرتا اور بلیغ بلیغ استعارے اس کے بیان کو سہارا دیتے نظر آتے خوشی محمد کے متعلق کئی اخبارات اور ماہناموں میں مضامین بھی چھپے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لکھا گیا وہ اس کے کمال فن کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔

خوشی محمد دوستوں میں بے لوث، بے طمع اور مستغنی الحال درویش تھا۔ وہ اپنے کمال فن کے سامنے بڑے سے بڑے مفاد کو ہیچ سمجھتا۔ اس کے سینے میں نہ دنیا داری نے دریچہ کھولا تھا اور نہ خود غرضی نے آخور بنائی تھی، وہ ابن الوقتی سے کوسوں دور تھا۔ خون جما دینے والی سردی میں صرف ایک باریک سی چادر میں رات گزار دیتا اور ہرنوں کو کالا کر دینے والی گرمی میں پابرہنہ سفر کرتا۔

اگر کوئی اس کی کمزوری تھی تو یہ کہ وہ شاعروں، ادیبوں، ڈاکٹروں اور افسروں کو اپنا کمال فن دکھا کر سرٹیفکیٹ حاصل کرتا تھا۔ اور اسکے لیے سرٹیفکیٹ سے عظیم کوئی شے نہیں تھی۔ اب بھی اس کا وہ رجسٹر جس کے پاس ہوگا اس میں عمائدین پاکستان کے علاوہ شاہ اردن جیسے لوگوں کے سرٹیفیکیٹ ملیں گے، میرے خیال سے وہ رجسٹر حاصل کر کے اگر شائع کیا جائے تو اس کے قاری پر بھی یہ بات بے نقاب ہو جائے گی کہ شاید دنیا میں خوشی محمد جیسے انسان کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ وہ شاعروں کی بیاضوں کی ان پڑھی غزلیں اور ادیبوں کے غیر مطبوعہ مضامین کے علاوہ منصفوں کے فیصلے لفظ بلفظ سنا دیتا تھا۔ اور لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔

بعض لوگوں نے خوشی محمد کے خلاف بھی مضامین لکھے اور غالباً وہ ایسے لوگ ہیں، جو اس پاکیزہ مقولے پر کاربند ہیں کہ "اگر کوئی آسمان پر بھی اڑتا ہے اور خلاف شریعت زندگی رکھتا ہے تو اس کا وہ کمال شیطنت کا شعبدہ ہے" اور میں بھی اسی کا قائل ہوں! لیکن اس سے خوشی محمد کے کمال میں رخنہ نہیں پڑتا۔ طاقت خیر بھی ہے اور شر بھی۔ اگر ایک آدمی شیطانی قوتوں کا معمول ہے تو کیا وہ حقیقت نہیں۔ جہاں سورج کی روشنی حقیقت ہے وہیں رات کی تاریکی کو کون غیر حقیقی کہہ سکتا ہے؟ ایک زمانہ

ہو گیا‘‘ میں نے عبداللہ شاہ صاحب کی زیارت کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساحل نمائی کے منار پر گھومتی ہوئی روشنی کے پاس کھڑا ہوں- اور دریا کے سینے پر میلوں سنہری رگیں سی پھیلی ہوئی ہیں جو میرے لیے ایک مقدس تماشے سے کم نہ تھیں- لیکن میں بڑے چاؤ سے خوشی محمد سے ملا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی آنکھوں کے دریچوں سے جھٹپٹے کے وقت ایسے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں جس پر ستارے نہیں ہیں اور آٹا پیسنے والی مشین سے اڑا ہوا غبار میرے پھیپھڑوں میں بھرا جا رہا ہے-

میں نے اسے سوتے ہوئے بھی دیکھا وہ نیند میں خچر کی طرح خرخرانے لگتا اور کچھ دیر بعد اپنی خرخراہٹ سے چونک کر سانس درست کرنے لگتا لیکن پھر جب وہ لیٹ جاتا تو فوراً اسے وہی آسیبی غنودگی گھیر لیتی- اس کے خراٹوں میں کئی کئی شاخیں بھی نکلتیں اور میں سوچتا کہ یہ بیدار کیوں نہیں ہو جاتا-

خوشی محمد کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا گیا- دو چار بار لوگوں نے مجبور کیا تو وہ فوراً ہتھے سے اکھڑ گیا- اس نے انکار پر انکار کی رٹ لگا دی جیسے بچے ضد پکڑ جاتے ہیں میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ یہ جو انگلی پکڑ کر حالات بتاتا اور بڑی بڑی چھپی ہوئی باتیں بیان کر جاتا ہے- اس میں کوئی سفلی طاقت بولتی ہے جس کا تقدس اور پاکیزگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں--

کچھ دنوں لاہور میں خوشی محمد کا بہت چرچا رہا لیکن پھر اخبارات میں اس کے خلاف بیان چھپنے لگے اور وہ لاہور سے حیدر آباد (سندھ) چلا گیا- وہاں اس نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی اور دو روپے فیس لے کر دلوں کے عزائم و حالات اور پیش آنے والے حادثات کی نشان دہی کرتا تھا- تھوڑے دنوں تک تو وہ ذرا مایوس رہا پھر اس نے ایک اشتہار چھپوایا جس میں اس نے اپنے روحانی کمالات کا تعارف کرایا تھا- اشتہار تقسیم ہونا تھا کہ دنیا ٹوٹ پڑی اور پروفیسر خوشی محمد کا نام گلی گلی پہنچ گیا- دن میں بیسیوں تقدیر کے مارے جاتے اور کھڑے پاؤں اس کی باتوں سے مطمئن ہو کے آ جاتے- خوشی محمد پر کسی نے یہ بھید انہیں رکھا کہ اس نے میرے غلط حالات بتائے ہیں- انہیں دنوں میرے ایک پرانے کرم فرما رعنا اکبر آبادی کا لڑکا شکیل نامی گم ہو گیا اور دو لڑکوں سے اطلاع ملی کہ شکیل دریا کے کنارے سے دو بجے سے غائب ہے یہ خبر سنتے ہی تمام گھر میں کہرام مچ گیا- رعنا بیچارے بوکھلائے ہوئے نیم بے ہوشی کے عالم میں ان لڑکوں کے ساتھ جائے وقوع پر پہنچے تو کوئی فرد

واحد اس واقعے کا گواہ نہ ملا‘ مگر شور تھا کہ شکیل دریا میں ڈوب گیا- رعنا نے دس دس‘ پندرہ پندرہ میل تک دریا میں جال ڈلوادیئے‘ لیکن کہیں کوئی پتہ نہ چل سکا‘ مگر شور تھا کہ بڑھتا جارہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ شکیل دریا میں ڈوب گیا- حیدرآباد کے کلکٹر نے اسی دن صبح نو بجے اعلان کیا تھا کہ شکیل کو آسٹریلیا بھیجنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے مگر شکیل تو اسی دن سے بے پتہ ہو گیا‘ دوسرے روز ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کو شکیل کی والدہ اور بہنیں جو کراچی میں تھیں حیدرآباد آ گئیں پھر تو ایک قیامت خیز ہنگامہ ہو گیا یہ معلوم ہو رہا تھا آج سب کے دل خون ہو کر آنکھوں سے بہہ جائیں گے- ایک دوسرے کو سنبھالتا اور تسلی دیتا تھا‘ اور خود ہلاک ہوا جاتا تھا جو دوسروں کو صبر کی تلقین کر رہا تھا وہ خود ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا-

اسی دن رعنا صاحب کا ایک ملازم پروفیسر خوشی محمد کا ایک اشتہار لے کر آیا اور رعنا سے کہا ”اسی عامل کے پاس چلو- ممکن ہے کہ وہ شکیل کا سراغ دے!“

رعنا نے انکار کیا کہ میں ایسے لوگوں کا قائل نہیں جو اپنے کمال کا بازار میں اشتہار دیں‘ لیکن گھر کی چند بڑی بوڑھیوں نے رعنا صاحب کو خوشی محمد کے پاس جانے کے لیے مجبور کر دیا اور وہ بادل ناخواستہ اس کے پاس پہنچ گئے انہوں نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی سی کرسی پر ایک نہایت غلیظ اور کریہہ صورت انسان ٹوٹی سی میز سامنے رکھے بیٹھا ہے- میز پر میز پوش ہے نہ شرفاء کے بیٹھنے کے لیے کوئی معقول کرسی- اس کی جگہ ایک نہایت معمولی مرمت شدہ بنچ پڑی ہے جس پر نہ کوئی گدی ہے نہ گدیلا- دو دو انچ کے فاصلے سے چوڑی چوڑی پٹیاں لگی ہوئی ہیں جو خوشی محمد نے بنچ کی طرف اشارہ کیا اور رعنا صاحب طوحاً و کرحاً بنچ پر بیٹھ گئے اور کہا ”پروفیسر صاحب میں اپنے لڑکے کے متعلق دریافت کرنے آیا ہوں“ خوشی محمد نے کہا ”آپ نے مجھے بتایا کیوں؟ میں تو خود بتاتا کہ آپ کیا پوچھنے آئے ہیں؟“ رعنا نے دو روپے فیس پیش کی اور خوشی محمد نے بتانا شروع کیا ”آپ کے لڑکے کا نام شکیل ہے دریا کے کنارے سے اغوا کیا گیا ہے اور پنجاب کی طرف بھیجا گیا ہے وہ آپ کو واپس ملے گا-“

رعنا صاحب نے دل میں کہا کہ یہ مشہور سانحہ ہے اس نے کہیں سے سن لیا ہو گا یا اخبار میں پڑھ لیا ہو گا-

خوشی محمد بولا- آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے- لو میں ایسی بات بتا تا ہوں کہ آپ کو یقین کرنا ہی پڑے گا- اخبار میں شکیل کی عمر پندرہ سال چھپی ہے لیکن اس کی عمر آج پندرہ سال دو ماہ نو دن ہوتی ہے-'' رعنا صاحب نے گھر جا کر حساب لگایا تو خوشی محمد کے حساب کو لفظ بہ لفظ درست پایا- اس سے انہیں خوشی محمد کے کمال کا یقین ہو گیا اور اس سے ایک عقیدت سی پیدا ہو گئی- آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا رعنا صاحب ویسے بھی خلیق آدمی ہیں لیکن شکیل کی وجہ سے اور بھی گرویدگی بڑھ گئی اور خوشی محمد بھی رعنا کو بھائی کی طرح سمجھنے لگا خوشی محمد روز رعنا کے گھر آتا اور رات کے بارہ بارہ بجے تک نشست رہتی-

خوشی محمد نے ایک چالیس دن کا سفلی عمل کر کے ایک موکل کو اپنے تابع کیا مگر اس عمل کے دوران ایک روحانی طاقت خود بخود شریک ہو گئی جس سے سفلی عمل کی طاقتیں تو ماند پڑ گئیں اور اس روحانی طاقت نے خوشی محمد کی زبانی حالات کا انکشاف شروع کر دیا- اس نے بتایا کہ رعنا صاحب! شکیل ہماری دعاؤں سے پیدا ہوئے تھے ہم نے شکیل کو ظالموں کے پنجے سے چھڑا کر خدا کے حکم سے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے وقت مقررہ پر واپس دے دیا جائے گا-

دو روز بعد رعنا صاحب کے شناساؤں میں سے ایک شخص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ کل شکیل بیڈن روڈ پر ہماری دکان پر آیا تھا اور ایک بنیان خرید کر لے گیا- اس وقت ہم میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ شکیل گم ہو گیا- چنانچہ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ تو اس نے بتایا کہ میں تو یہیں بیڈن روڈ پر مٹھائی والی دکان کے اوپر کمرے میں رہتا ہوں جب وہ چلا گیا تو مجھے خیال آیا کہ یہ لڑکا تو وہی ہے جو گم ہو گیا تھا- کہیں یہ گھر سے ناراض ہو کر تو نہیں آ گیا- ہم کمرہ تلاش کرنے گئے تو دیکھا مٹھائی والی دکان پر تو کوئی کمرہ نہیں غالباً اس نے ہمیں اپنا مکان نہیں بتایا مگر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ بعافیت تمام ہے-

جناب رعنا لاہور آئے اور غریب خانے پر بھی تشریف لائے لیکن وہ شکیل کا کھوج لگانے میں ناکام رہے اور مایوس ہو کر واپس چلے گئے- البتہ اپنے عزیزوں سے کہہ گئے کہ اگر اب کی بار آئے تو اسے سنبھال لینا-

چند روز بعد خوشی محمد کا حکم ہوا کہ ایک نشست کا انتظام ضرور ہے اور کوئی با ہمت شخص بھی مہیا

کرو- جس میں رعنا یا شکیل کا خون شامل نہ ہو- رعنا صاحب نے کہا کہ اس میں باہمت کی کیا ضرورت ہے؟

خوشی محمد مطلب یہ ہے کہ جری اور مضبوط دل کا آدمی ہونا چاہیے جو محیر العقول واقعے سے ڈر نہ جائے-''

رعنا صاحب کی نظر صبا پر گئی اور کراچی کوارٹرز میں رعنا صاحب کے ایک خویش لطف الدین صاحب کا مکان منتخب کیا گیا- صبا صاحب کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور ایک کمرے میں خوشی محمد اور گھر کے تمام آدمی بیٹھ گئے- ایسے موقعوں پر خوشی محمد پر ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ کانپنے لگتا تھا- چنانچہ بیٹھے بیٹھے خوشی محمد کا تمام بدن تھر تھرانے لگا اور اس نے کہا ''میرے جسم میں شاہ صاحب داخل ہو رہے ہیں- ہاں بیٹھو اور سنو...... ہمیں رعنا کے خاندان سے انس ہے شکیل ہماری تحویل میں ہے ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں اور ہر وقت اس خاندان کا خیال رکھتے ہیں-''

اتنے میں صبا صاحب نے گھگیا کر کمرے سے رعنا صاحب کو آواز دی رعنا اور ان کی بیگم دوڑے تو صبا صاحب صحن میں اس انداز سے آئے جیسے وہ کسی کو پکڑنا چاہتے ہیں- سب نے دیکھا کہ دروازے کی کنڈی خود بخود کھل گئی اور صبا صاحب ہکا بکا رہ گئے' ان کا تمام جسم پسینے میں شرابور تھا اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے- لوگ انہیں کمرے میں لائے اور تھوڑی دیر آرام کے بعد دم دلا سا دے کر پوچھا کہ کیا بات تھی اس نے کہا ''اس خوشی محمد کو گولی مار دو یہ ہمیں کیا کیا دکھا رہا ہے-''

رعنا نے کہا '' کچھ بیان تو کرو کیا دیکھا؟''

صبا نے کانپتے ہوئے کہا ''حضرت شاہ صاحب شکیل کا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے سامنے آ گئے ان کے اوپر کے ہونٹ پر ایک چاند نما نشان ہے- میں نے بوکھلا کر آپ کو آواز دی اور شکیل کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ پیچھے ہٹ گئے میں آگے بڑھا تو وہ زنجیر کھول کر باہر نکل گئے- میں اس طرف لپکا تو میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے-''

خوشی محمد نے کہا ''آپ کو یہ تو اعتبار آ گیا کہ شکیل بخیریت ہے- آج صرف یہی دکھانا تھا-''
اس نشست کے بعد کی ایک نشست میں خوشی محمد کو معمول بنا کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا کہ کسی آدمی کو روہڑی بھیجا جائے جس میں رعنا یا شکیل کا خون شامل نہ ہو' پھر قبرستان میں ایک شکستہ مزار کا پتہ بتا کر

فرمایا کہ ''وہاں وہ شخص پھول چڑھائے اگر بتیاں سلگائے اور مٹھائی پر فاتحہ پڑھے۔'' چنانچہ پھر صبا صاحب کی ڈیوٹی لگی۔

صبا صاحب نہ اوہام پرست ہیں اور نہ تصوف کے دیوانے لیکن وہ شکیل کی وجہ سے آمادہ ہو گئے اور روہڑی جا کر تلاش کرتے کرتے مزار پر پہنچ گئے' شام ہو رہی تھی اور ایک ہی ٹانگے والا تھا جو انہیں لے کر جا رہا تھا۔ آسمان پر سرخ بدلیاں تھیں۔ مگر اس قدر روشنی تھی کہ اخبار کی تحریر اور انسانی خدوخال صاف نظر آتے تھے۔ انہوں نے پھول چڑھائے' اگر بتیاں سلگائیں اور فاتحہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے' فاتحہ پڑھتے پڑھتے انہیں محسوس ہوا کہ کسی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ ٹانگے والا آ گیا ہے۔ کیونکہ اسے کرایہ دینا بھول گئے تھے۔ انہوں پھر کر دیکھا تو میدان خالی تھا وہ پھر فاتحہ پڑھنے لگے لیکن چند منٹ کے بعد کندھے پر ہاتھ کا بار معلوم ہوا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص سندھی لباس میں ملبوس کھڑا ہے۔ اس نے سوال کیا ''کیا شکیل کے لیے آئے ہو''

صبا صاحب بولے۔ جی ہاں اسی کے لیے حاضر ہوا ہوں جواب دیتے دیتے صبا صاحب نے اس شخص کے چہرے کو دیکھا تو اوپر کے ہونٹ پر وہی چاند نما نشان نمایاں تھا جو وہ پہلے کمرے میں دیکھ چکے تھے۔ صبا صاحب نے جب یہ ماجرا دیکھا تو پھر پسینہ آ گیا اور کپکپی چڑھ گئی۔ شاہ صاحب نے کہا ''لو دیکھو''

صبا صاحب نے ذرا نظر اٹھائی تو شکیل بھی ان کے پیچھے سے سامنے آ گیا صبا صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' ادھر شکیل بھی رو رہا تھا اس نے روتے روتے کہا۔ دولہا بھائی اماں بہت یاد آتی ہیں مجھے ساتھ لے چلو۔'' صبا صاحب کی ہچکی بندھ گئی اور بصد لجاجت شاہ صاحب سے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں اس بچے کو پیار کر لوں؟'' شاہ صاحب بولے ''مصافحہ کر سکتے ہو۔''

صبا صاحب نے شکیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تو وہی گوشت پوست اور وہی دبازت جو عام اجسام میں ہوتی ہے شکیل کے ہاتھ میں بھی موجود تھی اتنے میں شاہ صاحب نے مسکرا کے شکیل کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا صبا صاحب کے ہاتھ کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی اور شاہ صاحب شکیل کو لے کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

صبا صاحب نے پھر فاتحہ شروع کیا لیکن کچھ ظہور میں نہیں آیا۔ فاتحہ پڑھ چکے تو دور سے آواز

آئی۔ ''سکھر کی سواری۔ سکھر کی سواری'' صبا صاحب گئے تو وہی تانگے والا تھا۔ صبا صاحب نے اس سے معافی چاہی اور اس نے جواب دیا کہ کرائے کی کوئی بات نہیں آپ تانگے پر بیٹھیں تو میں آپ کو آپ کے ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کرایہ کا کیا ہے لیا یا نہ لیا۔ ایک ہی بات ہے۔''

صبا صاحب تانگے پر بیٹھ گئے اور اس نے سکھر وہیں لا اتارا جہاں وہ مقام کرنے والے تھے۔ صبا صاحب نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے اسے کرایہ پیش کیا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ مسافر ہیں اور یہ میرا ذاتی تانگہ ہے۔ کرایہ معاف۔ صبا صاحب حیران رہ گئے اور وہ انہیں اتار کر تانگہ لے کر سرپٹ ہو لیا۔ انہوں نے رات ہی کو رعنا صاحب کو ایک خط لکھا اور اس میں بتایا کہ اس سفر کے مشاہدات سے عقل دنگ ہے بیان کے لیے الفاظ نہیں اور جذبہ اظہار بے تاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے خوشی محمد کی طرح مجھے بھی معمول قرار دے لیا ہے کل شام جو واقعہ پیش آیا وہ اس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود مجھے اپنے حواس پر اعتماد نہیں رہا جو کچھ میں نے دیکھا وہ اپنے اعتبار پر مجبور نہیں کرتا۔ ایک وجدانی کیفیت ہے جو مجھے ہوش و ادراک سمیت اپنے حلقے میں لیے ہوئے ہے۔ محسوس کرتا ہوں مگر بیان سے قاصر ہوں۔

رعنا صاحب اور صبا صاحب کو ایسے واقعات نہ جانے کتنی بار پیش آ چکے ہیں۔ ہر بار انہیں شکیل کی زندگی کا یقین دلایا گیا ہے اور اس امانت کی واپسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ''شکیل پر دنیا کا بہت بڑا حق ہے اسے ادا کرنے کے ساتھ اسے تمام اسلامی ممالک کی تنظیم کرنا ہے۔ اس کی والدہ کو یقین دلایا گیا ہے کہ شکیل کی آمد یقینی ہے تمہاری تمام آرزوئیں برآئیں گی۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اس کی آمد کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔ مگر تمہارا عامل بہت لغو ہے وہ ہماری کوئی بات تم لوگوں تک صحیح نہیں پہنچا سکتا اور بہت سی باتیں وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہم اسے بھی سدھاریں گے۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ جنہیں تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم قدرت کی پردہ دری پر قادر نہیں لیکن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شکیل کی آمد ضروری ہے اور اس کا مقام تمہارے ماحول سے بلند ہوگا۔ ہر کام منشاء خداوندی سے ہو رہا ہے۔ جس میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

اسی دوران صبا صاحب سے یہ بھی کہا گیا کہ سکھر میں جیلانی بابا کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھنا' دوسرے روز صبا صاحب جیلانی بابا کے مزار پر گئے وہ بڑے خلوص سے فاتحہ پڑھ رہے تھے کہ انہوں

نے دیکھا کہ وہی تانگے والا فاتحہ میں مشغول ہے' انہیں حیرت ہوئی کہ اس مزار سے اسے بھی عقیدت ہے فاتحہ کے بعد صبا صاحب نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور وہ سندھی تانگے والا سینے پر ہاتھ رکھے باہر آ گیا- صحن میں آ کر صبا صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم بھی اس درگاہ کے بڑے معتقد معلوم ہوتے ہو- اس نے کہا'' کیوں نہیں؟ بابا یہ تو بڑی درگاہ ہے' سندھ میں دو ہی تو درگاہیں ہیں کراچی میں عبداللہ بادشاہ کی اور سکھر میں جیلانی بابا کی- تم کبھی عبداللہ شاہ کی درگاہ گئے ہو؟''

صبا صاحب بولے'' کراچی سے آ رہا ہوں بھلا عبداللہ شاہ کی درگاہ میں کیوں نہ جاتا-''

تانگے والا: یہاں کوئی ضروری کام ہوگا-''

صبا صاحب: ضروری کام کیا- روہڑی والے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا تھا- سو پڑھ چکا ہوں-''

تانگے والا: روہڑی میں کس مزار پر فاتحہ پڑھا ہے وہ کس کا مزار ہے؟''

صبا صاحب: مزار تو ظاہر ہے کسی بڑے بزرگ کا ہوگا مگر مجھے تو فاتحہ ایک اور بزرگ کے نام سے پڑھنا تھا-''

تانگے والا: وہ کون بزرگ ہیں نام بتاؤ-''

صبا صاحب: تم سندھی ہو شاید تم ان بزرگ کے نام سے واقف نہ ہو-''

تانگے والا: میں سندھی ہوں تو کیا ہے میں پاکستان اور ہندوستان کی تمام مشہور درگاہوں کو جانتا ہوں اور یہ کہہ کر تانگے والے نے تمام بڑی بڑی درگاہوں کے نام لے دیے-

صبا صاحب: میں تو حضرت شیخ سلیم چشتی کے نام پر فاتحہ پڑھ کر آیا ہوں-''

تانگے والا: ہاں وہ بھی اچھے بزرگ ہیں-''

صبا صاحب: ارے بھائی آپ تو سب بزرگان دین سے آگاہ ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ان سب سے عقیدت ہے ورنہ آپ کو کیسے علم ہوتا-''

تانگے والا: دیکھو غور کرو معلومات کیوں نہیں ہو سکتے-''

صبا صاحب نے اس کے چہرے کو ذرا غور سے دیکھا تو لب پر وہی ہلال نما نشان موجود تھا- ان پر فوراً ایک رقت آمیز خوف طاری ہو گیا- تب اس نے کہا'' مطمئن رہو شکیل ملے گا اور ضرور ملے

گا۔''

اس قسم کے سیکڑوں مشاہدات اور اعزاء و اقرباء کے سیکڑوں خواب ہیں جن سے انسان حیرت میں گم ہو جاتا ہے اور شکیل کے والدین امید پر زندہ ہیں واللہ اعلم بالصواب یہ ماجرا کیا ہے ایسا واقعہ پہلے دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔

رعنا صاحب کے پاس اس واقعہ کا پورا فائل ہے۔ اگر کبھی وہ کتابی صورت میں آیا تو فلسفیوں عاملوں نفسیات کے ماہرین اور روحانیت کے جاننے والوں کے لیے کئی ایک سوالیے سامنے آئیں گے۔

میں اس واقعے کو سچ سمجھنے کے باوجود یقین کی حدود میں نہیں آنے دیتا تھا لیکن رعنا صاحب نے جو مجھے خط میں لکھا وہ ملاحظہ ہو۔

ایک نشست میں حضور نے فرمایا کہ شکیل اختر فکر سخن کرتا ہے اس کے شعر سنو۔''

نظر آتا ہے سب کچھ زندگی کی جلوہ گاہوں سے
میں سب کو دیکھتا ہوں چھپ کے دنیا کی نگاہوں سے

چاہنے والے میرا حال نرالا سمجھے
میں ہوں خشکی پہ مجھے ڈوبنے والا سمجھے

روشنی دل کی مجھے مل گئی اس دنیا میں
جو اندھیرا نظر آیا وہ اجالا سمجھے

کچھ طریقہ چاہیے آلام عالم کے لیے
اک نظام نو بنے اقوام عالم کے لیے

پھولوں سے دب سکے گی نہ دیوار و در کی یاد
گلزار میں بھی کرتا ہے دیوانہ گھر کی یاد

اک دن درِ حضور سے جانا تو ہے مجھے
لیکن جبیں سے جائے گی کیا سنگ در کی یاد

ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ شکیل کی آمد اس وقت ہوگی جب پاکستان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگی اور تمام عالم اسلام میں یہی عالم ہوگا وہ ایک مصلح اور فاتح کی حیثیت سے ظاہر ہوگا۔

میں شاید صبا صاحب کے بیانات کو یک طرفہ خیال کر کے مشکوک ہو جاتا لیکن ایک واقعہ مجھے پھر بزرگان دین کی حیات کی طرف لے آیا۔ رعنا صاحب نے مجھے خط میں لکھا کہ میری لڑکی مکہ شریف گئی اور وہاں قبولیت دعا کے مقام پر اس نے رو رو کر شکیل کی بازیابی کی دعائیں مانگیں لیکن کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ پھر مدینہ منورہ پہنچی اور حضور کے مزار مقدس کی جالیوں کے قریب بیٹھ کر اشک آلود آنکھوں کے ساتھ التجائیں کیں لیکن کچھ نہیں۔ آٹھویں دن واپسی کے وقت نہایت گریہ زاری سے عرض کیا کہ ''حضرت آپ کے در سے تو کوئی سائل نامراد نہیں لوٹتا کیا ایک میں ہی نامراد جاؤں گی۔'' واپسی کے لیے الٹے پاؤں لوٹی تو حضور کے پائین مزار سے ایک آواز آئی ''بہن یہاں آؤ۔'' دیکھا تو ایک آدمی بیٹھا ہے اس نے کہا یہاں کسی عورت سے بات نہیں کی جاتی مگر تم ایک ہفتے سے رو رہی ہو۔ مجھے حضور نے حکم دیا ہے کہ تمہیں بتا دوں ''تمہارا بھائی زندہ ہے اسے کبھی ذو بنے والا

نہ کہنا تم میری بہن ہو قیامت میں، ہم تم بہن بھائی کی حیثیت سے ملیں گے۔''

میری لڑکی کا کہنا یہ ہے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اسے اپنے سینے سے لگالوں وہ سو فیصد شکیل تھا' رعنا صاحب تھا' رعنا صاحب کے اس خط سے مجھے بھی یقین ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن یہ واقعہ اپنی نوعیت کا عجیب وغریب واقعہ ہے اگر رعنا صاحب مجھے اپنا فائل عنایت کر دیتے تو میں خود اسے کتابی شکل دیتا۔ دنیا میں کیسے کیسے سانحے کس کس انداز سے گزر جاتے ہیں اور ہنوز کتنے حقائق پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ اس بے علمی اور بے خبری میں خدا کو معزول کیا جا رہا ہے اور ہر طرف جہالت کا ہنگامہ ہے۔ ہندو مت نے اس دور کو کلجگ کہا تھا جس کے معنی ہیں بے وقوفی کا دور۔ کل بمعنی بے وقوفی جگ بمعنی زمانہ

یوں تو یہ واقعہ عجیب اور حیران کن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کارروائی جنوں کی معلوم ہوتی ہے' جن ایک مخلوق ہے جس کے معنی ہیں ''پوشیدہ'' انہیں یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں خود کو کسی بھی مخلوق کی صورت میں تبدیل کر لیں' وہ چرندے پرندے' درندے اور دوسرے جانوروں میں چاہے جس صورت میں منتقل ہو جائیں اور انسانی آنکھوں کو نظر آنے لگیں' لوگوں نے جنوں کو اکثر کتوں' بلیوں' بھیڑوں' بکریوں' سانپوں اور چھپکلیوں کی صورت میں دیکھا ہے' علاوہ ازیں بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کی صورت میں بھی پائے گئے ہیں۔

یوں تو وہ انسانی آنکھوں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور دکھائی نہیں دیتے لیکن جب چاہیں عجیب عجیب شکلوں میں نظر آنے لگتے ہیں جو لوگ جن کو مسخر کر لیتے ہیں وہ اپنے عامل کو لے کر ہوا میں بھی اڑتا ہے اور خود سواری بھی بن جاتا ہے' حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی ایک کتاب ''مقالات احسانی'' کے ایک حاشیے میں لکھتے ہیں کہ خود شیخ الاسلام بھی ایسی ہی الجھنوں میں مبتلا ہو گئے تھے کہ انتہائی زور صرف کرنے کے باوجود معجزے اور کہانت وسحر میں ایسا فرق نہیں بتا سکے جو دوسروں کے لیے قابل تسلیم ہو

جب پیغمبروں کی طرف سے معجزے کا ظہور ہوتا ہے تو نبوت کے منکر بے بس ہو جاتے ہیں اور خیال کر لیا جاتا ہے کہ پیغمبر سے ضرور خدائی قوتوں کا کوئی نہ کوئی گہرا رشتہ ہے۔ لیکن پیغمبر کی وفات کے بعد منکرین اعجاز اسے سحر وکہانت کہنے سے باز نہیں آتے' ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی زندگی میں کردار و

سیرت کے علاوہ عادات و اطوار کا مقابلہ ساحروں اور کاہنوں کی زندگی اور شعبدہ بازوں کے کارناموں کو سامنے لا کر پیغمبرانہ پاکیزگی اور عظمت کو بیان کیا جاتا ہے لیکن پیغمبروں اور اولیاء کے علاوہ بعض تیسرے درجے کے لوگوں سے بھی غیر معمولی باتوں کا اجراء ہوتا ہے اور سیدھے سادے عقیدت مند انہیں بھی بزرگان دین کی صف میں شمار کر لیتے ہیں حالانکہ یہ بات ہی کچھ اور ہے۔

تسخیر جن کے سلسلے میں امام ابن تیمیہ بھی اچھا درک رکھتے تھے انہوں نے اپنے اس فن کو جگہ جگہ لکھا بھی ہے، جس پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے انہیں پرکھا ہے اور اپنی منطق و دلائل کی کسوٹی پر کس کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

شیخ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ عام طور پر جنات کو اس طرح قابو میں لانا کہ بالکلیہ تابع ہو جائے یہ کسی کے بس کی بات نہیں، جنات ان ہی لوگوں کی خدمت میں رہتے ہیں جو ان کو کسی نہ کسی شکل میں معاوضہ ادا کرتے یا لالچ دیتے ہیں، وہ لالچ خواہ کسی برے کام کی شکل میں ہو یا جسے جن پسند کرے یا پھر کسی خاص قول و قرار کے زیر اثر ہو مثلاً قسم دلائی جائے یا دوسرے مخصوص عزائم پڑھے جائیں۔

ہر جن پر اس او نچی طاقت اور مقام کا جن متعین ہوتا ہے اور نچلے درجے کا جن اس لیے تابع ہو جاتا ہے کہ اس سے اوپر کا جن اس کو حکم دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ملازمین حکومت میں درجہ بندی ہوتی ہے اور ہر شخص کو اپنے سے بلند مرتبے کے ملازم کا حکم ماننا پڑتا ہے خواہ وہ اسے دل سے پسند کرتا ہو یا متنفر ہو تعمیل حکم ضروری ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک جن کو اس کا بالائی جن حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کے تابع رہو اور وہ تابع ہونے کے بجائے اسے بیمار ڈال دیتا ہے یا پھر قتل کر ڈالتا ہے کیونکہ اس شخص کے حالات، رہن سہن اور وضع قطع جن کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔

جنات عموماً تاریکی کو پسند کرتے ہیں اور ویران مقامات انہیں عزیز ہوتے ہیں ایسے مقامات میں جن خوش ہوتے ہیں جہاں نجاست اور گندگی جمع رہتی ہے اس کے علاوہ غیر آباد مساجد، مقابر، زیارت گاہیں، حماموں اور قبوں میں ان کے مستقر ملتے ہیں۔

لیکن بنی نوع جنات میں سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی وہ لطافت پسند اور نازک مزاج بھی ہوتے ہیں، لیکن شریر جن تیرہ و تاریک مکانات اور متعفن جگہوں پر رہتے ہیں، جو پہلے بیان میں

آ چکیں، یہی سبب ہے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اندھیرے میں خاموشی سے نہ جانا چاہئے اور بعض نے تو سلام بھی روا رکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت آدم سے پہلے جنوں کی مخلوق موجود تھی جن میں آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا تھا، پھر جب خدائے قدوس نے آدم کو پیدا کیا اور آدم کی اولاد میں یکے بعد دیگرے انبیاء آئے تو ہر پیغمبر کے دور میں جنات اپنے عقائد بدلتے گئے چنانچہ جنوں میں بھی عقائد و اعمال کے اعتبار سے آدمیوں کی طرح مختلف مذاہب اور عقائد کے علاوہ نیکی بدی کے خیالات اور اعمال پائے جاتے ہیں۔

آنحضور نے جب اعلان رسالت فرمایا تو بہت سے جن مسلمان ہو گئے، اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ جیسے انسانوں میں تعلقات کی نوعیت مختلف ہے اسی طرح جنوں میں بھی یہ اختلافات موجود ہیں، جیسے بہت سے لوگوں نے آنحضورﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لیا اور ایمان لے آئے بعضوں نے صلح کی راہ اختیار کر لی اور بعض کو خوف تھا اس لیے سر تسلیم خم کر لیا اور کچھ لوگوں نے منافقت برتی بالکل اسی طرح جنوں کا قضیہ بھی ہے یعنی کچھ مومن ہیں، کچھ منافق مگر مطیع بعض نے معاہدے سے مسلمان جنوں سے صلح کر لی اور بعض حربی قسم کے ایمان لانے سے خوفزدہ ہیں۔

جو جن مسلمان ہو چکے ہیں وہ مسلمان انسانوں کی اسی طرح مدد کرتے ہیں جیسے مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہے اسی طرح جو جن کافر ہیں وہ کافروں کی مدد کرتے ہیں، کچھ جن انسانوں کی طرح فسق و فجور میں مبتلا ہیں مگر ویسے وہ مسلمان ہیں اور جب کفار سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو وہ فاسق و فاجر ہونے کے باوجود مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ جنوں کے یہ افراد عقیدتاً مسلمانوں سے قریب ہوتے ہیں اور تعاون و امداد کے وقت بہت سی عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کو جن طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور بعض آدمیوں کو جان سے بھی مار ڈالتے ہیں، حسین لڑکوں اور خوبصورت عورتوں پر جنوں کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں اور یہ تسلط کبھی تو ہم بستری کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کبھی جب کوئی نادانستگی میں ان پر گندگی پھینکتا یا پیشاب پاخانہ کر دیتا ہے تو یہ سزا کے طور پر مسلط ہو جاتے ہیں جسے انتقام بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن تسلط کی وجہ جواز ضروری نہیں، بغیر وجہ بھی یہ سیکڑوں انسانوں کو دکھ دیتے اور ان سے کھیلتے ہیں، کیونکہ ان کی شیطنت انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے،

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ مخلوق آتشی کہی جاتی ہے اور ان کا نسبی سلسلہ شیطان سے جاملتا ہے' ان کی عقل بھی انسانوں کے برابر نہیں ہوتی' یہ انسانوں کے ساتھ گنواروں اور گستاخوں کی طرح سلوک روا رکھتے ہیں۔

جیسے انسانوں میں ایک دوسرے سے محبت کا سلسلہ ہو جاتا ہے اسی طرح جن بھی انسانوں سے محبت کرنے لگتے ہیں اور ان میں رقابت کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جیسے جاہل اور کم ظرف آدمیوں میں غصے کی سمائی نہیں ہوتی اسی طرح جن بھی جس عورت سے محبت کرتا ہے اس کے پاس کسی دوسرے مرد کو نہیں دیکھ سکتا' خواہ وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو جن شوہر کی طرح خدمت بھی کرتے ہیں اور ہمدردی بھی اس معاملے میں عورت اور مرد دونوں کے جذبات شدید ہوتے ہیں بعض اوقات تو قتل وغارت تک کی نوبت آجاتی ہے۔

ایک دن میرے یہاں آنے جانے والوں میں سے ایک شاعر مسمی شریف شیوہ ایک نوجوان کو میرے پاس لایا جس کو ایک جن پانچ روپے روز دیتا تھا اور ہر وقت اس پر ایک نیم بے ہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ میں نے اس سے کچھ باتیں شروع کیں تو وہ جلدی سے اٹھ کر چلا گیا' نہ معلوم اس پر کیا گزری ہوگی وہ پھر نہیں آیا۔

جن اپنے غیر معمولی کرشموں کو ارباب ایمان اور صاحب قرآن لوگوں کے سامنے نہیں دکھاتے' کہتے ہیں کہ قرآن اور حدیث کے سامنے ان کے آلات کرشمہ کند ہو جاتے ہیں' لیکن کفار اور فجار کے خاندانوں میں اپنے کارنامے دکھاتے ہیں۔ جن گھروں میں تلاوت ہوتی ہے اور اللہ کا نام بلند کیا جاتا ہے وہاں جنوں کو کرشمہ کاریوں کی جسارت نہیں ہوتی بلکہ صالحین سے جن شیطان کی طرح ڈرتا ہے۔

شیطانی جنوں کو کبھی تو وعظ و پند سے نکالا جاتا ہے' کبھی معافی سے کبھی دھمکیوں سے اور کبھی ان کی طلب کے مطابق تحفہ وتحائف سے مگر دیکھا گیا ہے کہ جن اللہ کے ذکر اور تلاوت قرآن سے دور بھاگتا ہے اور بعض ایسے ضدی ہوتے ہیں کہ سزا پائے بغیر نہیں ٹلتے! اللہ کی توحید کا اعلان اور قرآنی قوارع (تازیانے) کے سامنے یہ نہیں ٹھہرتے۔ خصوصاً آیت الکرسی'' تو اس قسم کے شیطانی اثرات کے لیے بڑا حربہ ہے' اور بھی بہت سی آیات ہیں جنہیں قوارع القرآن کا نام دیا گیا ہے' شیطانی

الجن پر ان کا خاص اثر مرتب ہوتا ہے اور جن اپنا مقام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے وہاں بھی جنات کا گزر ہرگز نہیں ہوتا، اور بھی بہت سے قوارع القرآن ہیں مثلاً افحبستم انما خلقناکم کی آیت انت خیر الراحمین تک جنات کے لیے شاہی حکم ہے، احادیث میں آیا ہے کہ اگر یہ آیت پہاڑ پر بھی پڑھی جائے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے!

جن لوگوں کے تابع جن ہوتا ہے انہیں اصطلاحاً ''مخدومین'' کہتے ہیں یہ مخدوم مسخر جنوں سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں، جنات کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ اپنے مخدم کو سیکڑوں میل اڑا کر لے جاتے ہیں اور واپس لے آتے ہیں۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک بزرگ دوست حافظ مظہر الدین صاحب کے ہاں مہمان تھا، حافظ صاحب میں ایک بلند پایہ شاعر اور نغز گو نعت گو ہونے کے ساتھ وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو بزرگان دین کی نشانیاں ہیں، وہ جس پائے کے عاشق رسول ہیں اسی درجے کے خادم خلق بھی ہیں انہیں جن نکالنے میں بھی بڑی مہارت ہے۔

ایک دن ان کے یہاں پشاور سے ایک عورت آئی جس پر جن کا سایہ تھا اس کے خاوند نے حافظ صاحب سے کوائف بیان کیے، حافظ صاحب نے اس عورت کی طرف دیکھا تو عورت نے برجستہ کہا دیکھتے کیا ہو جن ہوں جن! سن لیا؟ حافظ صاحب نے آہستہ آہستہ کچھ پڑھنا شروع کیا تو اس جن نے بلند آواز سے وہ سب سنا دیا جو حافظ صاحب پڑھ رہے تھے، پھر حافظ صاحب نے سورہ دھر شروع کی تو اس نے سورۃ دھر بھی پوری سنا دی اور کہا اب ذرا سنبھل جاؤ میں اس عورت سے نکل کر تم پر آ رہا ہوں، حافظ صاحب یہ سن کر جھلا گئے اور فرمایا تم یہاں تک گستاخ ہو؟ انہوں نے فوراً سامنے رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا اور کہا بے ایمان تو میرے مرشد کو نہیں جانتا؟ اب بھاگ کہاں بھاگتا ہے؟

چراغ کی روشنی پھیلنا تھی کہ عورت نے تڑپنا اور دہائیاں دینا شروع کر دیں حافظ صاحب نے کہا تو اب کہاں جا سکتا ہے، میں تجھے یہیں جلا کر خاک کرتا ہوں، کچھ دیر گزری تھی کہ عورت ہوش میں آ گئی اور حافظ صاحب نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کر دیا۔

میں نے حافظ صاحب سے عرض کی کہ آپ جس علم سے یہ جنات حاضر کرتے اور نکالتے ہیں

ذرا سنائیں تو سہی وہ الفاظ کیا ہیں؟ انہوں نے بسم اللہ کہہ کر وہ تسخیر کے الفاظ سنا دئے' میرا خیال ہے کہ وہ موجودہ علوم میں سے کسی کے بھی الفاظ نہیں تھے بے معنی الفاظ کا ایک دھارا سا تھا۔ میں نے حافظ صاحب سے پوچھا ''قبلہ ان کے معنی کیا ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ معنی تو میں بھی نہیں جانتا مجھے تو میرے شیخ نے جس طرح بتائے میں نے اسی طرح یاد کر لیے اور یہ اثر رکھتے ہیں' لیکن میرا قیاس یہ ہے کہ یہ ان فرشتوں کے نام ہیں جو ان جنوں پر متعین ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب بادل چھا جاتے ہیں اور گھنا سے آسمان کے حاشیے تک دب جاتے ہیں اس وقت کوئی جن حاضر نہیں ہوتا اور بعض اوقات مطلع صاف ہونے کے باوصف اور عمل پڑھنے کے باوجود جن نہیں آتا اس وقت وہ ایک جزیرے میں جا کر پناہ لے لیتا ہے جہاں عامل کا عمل کام نہیں کرتا مگر وہاں وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا چنانچہ دوسری یا تیسری نشست میں گرفتاری عمل میں آ جاتی ہے۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ مخدوم کی وفات کے بعد جو جن اس کے تابع ہوتا ہے وہ مخدوم کی اولاد کو ستائے بغیر نہیں رہتا' اس طرح عامل کا خاندان کا خاندان آسیب زدہ ہو جاتا ہے' کیونکہ جنات کی عمر انسانوں کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے حافظ صاحب سے جب میں نے اس کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا ''بحمد اللہ میں نے کبھی کسی جن کو تابع نہیں کیا میں تو خدا کے بندوں کو ان کے شر سے چھڑاتا ہوں اور اس کا معاوضہ کچھ نہیں لیتا اس لیے یہ میرے خاندان پر حملہ آور نہیں ہو سکتے۔ میں شریعت کی حدود میں کام کرتا ہوں۔

جن لوگوں سے مال چوری کر کے مخدوم کو دیتے ہیں' مگر یہ چوری اس مال کی ہوتی ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' یا زکوٰۃ نہ دی گئی ہو' کیونکہ اس قسم کے مال کو جن نہیں چراتا اور نہ صدقے کی اشیاء کو چھیڑتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ میدان کو دریا اور جھیل کو رہ گزار کی صورت میں دکھا دینا ان کا کام ہے اس کے علاوہ بھی جنات بہت سے کارنامے کرتے ہیں جن سے عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

مخدومین کے طبقے میں بعض تو ہوش و حواس میں رہتے ہیں اور بعضوں پر نیم بیہوشی سی طاری رہتی ہے' صوفیاء میں عموماً اسی قسم کے لوگوں کو خدا رسیدہ کہہ دیا جاتا ہے اور بعض نہیں اکثر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں اور ان کے شعبدوں کو معجزوں کی طرح بیان کرتے ہیں' حالانکہ چوری سے روپیہ یا دوسری کھانے پہننے کی چیزوں کا منگانا کسی شریعت میں جائز نہیں' یہ مخدوم صاحب جب کسی

سے روپیہ منگاتے ہیں اور لوگوں کے سامنے تکیے کے نیچے سے نکالتے ہیں تو معتقدین اسے دست غیب سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ محنت اور مشقت کے بغیر اس قسم کا حصول حرام ہے۔

بعض صوفیاء ایسے بھی ہیں کہ خانقاہ یا آرام گاہ میں ہونے کے باوجود دوسرے دور و دراز کے مقامات پر دیکھے گئے ہیں اور ایک جگہ بیٹھ کر مختلف شہروں کے واقعات بیان کرتے ہیں اور ان کا حلقہ ان کے اس عمل کو علم غیب سے تعبیر کرتا ہے، حالانکہ مخدومین کے لیے یہ معمولی بات ہے۔

بعض اوقات نیک، صالح اور شرعی عقیدہ رکھنے والا انسان مشکل کے وقت اپنے شیخ کو پکارتا ہے اور جن اس کے شیخ کی آواز میں اس کا جواب دیتا ہے اور مرید کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی تصوف کا ایک بلند مقام ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی کوئی مشکل پڑتی ہے یا کوئی اور ایذا رساں شے سامنے آتی ہے تو جن اسے رفع کر دیتا ہے اور مرید خیال کرتا ہے کہ یہ شیخ کی کرامت ہے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ جن شوہر کی شکل میں عورتوں کے پاس آ جاتا ہے اور عورت اسے نہیں پہچان سکتی۔ یہی نہیں کبھی کبھی جن شیخ کی صورت میں مرید کے پاس بھی آ جاتا ہے اور مرید اسے اپنی یا شیخ کی توجہ خیال کر کے از راہ عقیدت کچھ کا کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

بعض لوگ اس قسم کے واقعات مخدومین میں دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ ان پر ستاروں کی روحانیت اتر آئی ہے اور وہ کواکب کے خواص سے آگاہ ہیں، وہ بے چارے اس راز سے، بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ سب کرشمہ شیطانی جن کا ہے تاکہ ایک مسلمان مشرک ہو جائے، بعض اوقات تو یہ جن بتوں میں داخل ہو کر کفار اور نصاریٰ دونوں کو مغالطے میں ڈال دیتے ہیں اور مقصد جن کا صرف یہ ہوتا ہے کہ بت پرستی کا حلقہ وسیع ہو جائے اور بندے خدا کی طرف راغب نہ ہو سکیں۔

خضر علیہ السلام کے قصے اور ان کی ملاقاتوں کی مختلف صورتیں ایک زمانے سے مشہور خلائق ہیں اور انہیں مختلف بزرگوں کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے ان قصوں پر بھی اسی مخدومیت کے نظریہ سے وار کیا ہے، حالانکہ امام بخاری نے لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور اس دنیا کے لوگوں میں مل جل کر رہتے ہیں اور ان کے اس خیال سے بہت سے علماء و فضلاء متفق ہیں اور صوفیاء کا تو ان کی حیات پر یقین کامل ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب اصابہ میں نقل کیا

ہے کہ خضر ایک فرشتے کا نام ہے جو آدمیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے' اسی بات کو حضرت شاہ ولی اللہ نے ''انفاس العارفین'' میں لکھا ہے کہ ''خضر علیہ السلام کا ظہور بعض لوگوں کے سامنے از نیر نگہائے عالم مثال است'' اور کہیں میری نظر سے یہ بھی گزرا ہے کہ انبیاء اولیاء مثالی وجود اختیار کر کے ظاہر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں' اس لیے علامہ مناظر احسن صاحب کی نظر میں امام ابن تیمیہ کی بات کوئی وزن نہیں رکھتی' ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا چرچا اسلام کی ابتدائی صدیوں میں نہیں ملتا' او وہب بن منبہ جو پہلی صدی کے آدمی ہیں ان کی کتاب المبتداء سے ابن حجر عسقلانی نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی لوگ خضر علیہ السلام کے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ خضر تو یہود و انصاریٰ کے پاس بھی آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میں خضر ہوں اسی طرح عیسائیوں کے گرجوں میں بھی یہ خفیہ طور پر پہنچتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس جو خضر آتا ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں آتا' اسی بناء پر صوفیوں میں بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر ولی کے لیے ایک خضر ہوتا ہے' اس بات سے خیال پھر جن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' مگر ممکن یہ بھی تو ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مسافروں اور پریشان روزگار لوگوں کے لیے کچھ جنوں کے سپرد رہنمائی اور مشکل کشائی بھی کر رکھی ہو اور اس جماعت کا ہر فرد خضر کہلاتا ہو۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں اور پیغمبروں کے مزارات پر زیارت کے وقت انہوں نے دیکھا کہ قبر سے صاحب مزار باہر نکل آئے اور دیکھنے والوں نے دیکھ کر تصدیق کی لیکن یہ بھی حقیقت نہیں ہوتی یہ ایک غیر فطری بات ہے اور اسے بھی شیطانی جن کا کرشمہ سمجھنا چاہیے جو صاحب مزار کی صورت اختیار کر لیتا ہے' مگر شیطان کبھی آنحضور ﷺ کی صورت میں نہیں آ سکتا اور نہ حضرت عمر فاروق کا روپ دھار سکتا ہے بلکہ میرا تو یہ عقیدہ ہے جو لوگ صاحب حیات بعد الموت ہیں ان سے شیطان دور رہتا ہے!

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک معتقد نے علی گڑھ کی نمائش میں دکان لگائی' ایک دن قلب میں خود بخود گھبراہٹ سی محسوس ہوئی اس نے قبل از وقت ہی سامان صندوقوں میں بند کرنا شروع کر دیا' ایسے میں وہاں آگ لگ گئی اسے پریشانی ہوئی کہ ایسے بھاری بھاری صندوق کیسے اٹھائے جائیں اسی فکر کے عالم میں دیکھا کہ حضرت مولانا تھانوی آئے ہیں اور فرما رہے ہیں

''جلدی جلدی سامان اٹھاؤ! چنانچہ شیخ اور مرید دنوں نے مل کر سامان باہر نکال دیا پھر اچانک دیکھا تو شیخ غائب تھے حالانکہ اس وقت مولانا تھانہ بھون میں موجود تھے۔

جب مرید نے اس واقعے کی اطلاع شیخ کی خدمت میں پہنچائی تو ارشاد ہوا کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں! البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت ایسی صورت سے فرماتے ہیں کہ کسی لطیفہ غیبی کو کسی مانوس شکل میں ظاہر فرما دیتے ہیں اور اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس سے واقعے کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور یہ یقین بھی پختہ ہوتا ہے کہ جو ظاہر ہوتا ہے وہ اصل آدمی نہیں ہوتا' اب وہ فرشتہ بھی ہوسکتا ہے اور جن بھی اور لطیفہ غیبی میں اور کئی صورتیں نکل سکتی ہیں۔

لیکن اگر حضرت خضر کو بھی جن تصور کرلیا جائے تو اولیاء انبیاء سے جو خوارق اور کرامتیں ظہور میں آتی ہیں وہ سب جنات کے کارنامے تصور کرنا ہوں گے جو درست نہیں ان کے لیے تو علماء و صوفیاء اور فقیہوں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ اولیاء و انبیاء ہی نہیں رسول دو عالم ﷺ کے غلاموں سے سیکڑوں خلاف فہم واقعات ظہور میں آئے ہیں' جن کے پاس سے بھی جن نہیں گزر سکتا' حضرت ابراہیم پر آگ کا گلزار ہوجانا' حضرت عمر کا ''یا ساریۃ الجبل'' کہنا اور خالد بن ولید کا ''سم الفار'' پی جانا یا حضرت یونس کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلنا یہ سب حقائق ہیں' جنھیں جنات کا تعاون کسی صورت بھی نہیں کہا جاسکتا' کیا جنات کے دائرہ امکان میں یہ عظیم باتیں ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں اسے یوں سمجھئے کہ انبیاء و اولیاء اور اسی درجے کے دوسرے مقبول بارگاہ لوگوں سے جو اس قسم کی کرامتیں ظہور میں آتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی خدا کی خوشنودی یا توضیع واحدانیت کا پہلو ہوتا ہے' اس میں مخلوق کی خدمت بھی ہے یتیموں اور بیواؤں کی امداد بھی' مسکینوں کی سہولت بھی ہے اور راہ خدا کے مسافروں کی دستگیری بھی! البتہ گھٹیا قسم کے لوگ جو خلاف عقل اور حیران کن کام دکھاتے ہیں اور ان کے حلقے کے لوگ جو کفر و ضلالت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ان کی اس نیرنگ نمائی کو بزرگی اور ولایت کا کارنامہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ مخدوم کا کرشمہ اور جنات کا شعبدہ ہوتا ہے۔

میرے علم میں گولڑہ کی خانقاہ مہریہ دربار قادر بخش میں سید عبداللہ شاہ قادری کا مزار مبارک اور سید علی ہجویری کا دربار ہے جہاں لنگر جاری ہے اور آمد کے ذرائع اول تو ہیں نہیں اور جو تھوڑے بہت نظر آتے ہیں ان کی رقم ہرگز اس کی کفیل نہیں ہوسکتی یہ تو سب صاحبان مزار کے فیوض و برکات اور

خدا کے فضل و کرم کا کھلا ثبوت ہے۔

پیغمبروں سے جس قسم کے معجزے صادر ہوتے ہیں صالحین سے اسی قسم کی کرامتیں عمل میں آتی ہیں اللہ اپنے نیک بندوں کے لیے خورونوش کی اشیاء کو بھی بڑھا دیتا ہے اور خوارق انہیں روزمرہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ آنحضورﷺ کے ساتھ مختلف موقعوں پر یہ صورتیں پیش آتی رہی ہیں اور یہ بات یہیں تک نہیں رہتی بلکہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا تھا' بعض نیک اور صالح لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے مردے کو حیات تک ملی ہے۔

ایسے ایسے مشاہدات و خوارق سے پتہ چلتا ہے کہ رسول عالم جس دین کو لے کر آئے ہیں وہ سچا دین ہے اور اسی میں انسانی بہبود ہے اور اولیاء کی کرامات کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے دو جہاں ان کی خواہش اور مرضی کو پورا کرتا ہے۔

بعض وقت اولیاء اللہ خدا سے ایسی باتوں کا مطالبہ بھی کر لیتے ہیں جن کا عالم الباب کے اعتبار سے وقوع پذیر ہونا بظاہر ممکن نہیں ہوتا مگر ان کی دعاؤں کے باعث یہ غیر معمولی باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ نیک اور مقبول بندے تو ایک طرف رہے اللہ اپنے خاص بندوں کی نسبت عام بندوں کی زیادہ سنتا ہے اور دعائیں قبول کرتا ہے یہی سبب ہے کہ بزرگان دین سے جب کوئی اپنی مصیبت یا آرزو بیان کرتا ہے تو وہ اپنے علاوہ حاضرین کے ہاتھ بھی دعا کے لیے اٹھواتے ہیں کہ نہ جانے خدا کس کی دعا قبول کرے۔

تبر شاہ

تبر شاہ کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں لیکن اس کی دھوم دور دور تھی' اس نے مظفر نگر میں کالی ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے چبوترے کو اپنا مسکن بنایا ہوا تھا' وہیں ایک شاخ میں اس کا ہیبت ناک اور چمکتا ہوا تبر لٹکا رہتا اور وہیں اس کی دھونی تھی جس میں ہر وقت ایک لکڑ پڑا دھند کتا رہتا تھا' تبر شاہ ایک گبھرو صندلی رنگ کا توانا تندرست اور ہاڑ گوڑ کا مضبوط بانکا چھیلا قسم کا درویش تھا اس نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا اور ضرورت کے بغیر کبھی آبادی میں نہیں آیا' آبادی میں آتا تھا تو اس کے پیچھے سیکڑوں غریب اور بچے ایک جلوس سا بنا لیتے تھے اور وہ تھوڑی دور چل کر رکتا اور روپوں اٹھنیوں' چونیوں کی موٹھ مارتا اور چل پڑتا۔

ایک دن علی الصبح اس سے ملنے گیا' پو پھٹ چکی تھی مگر سلیٹی رنگ کا کہرا ابھی نگاہوں کے راستے روکے ہوئے تھا' گلیوں اور سڑکوں میں بھنگیوں کی جھاڑو سے اڑا ہوا گرد و غبار منڈلا رہا تھا جہاں کہیں گرد زیادہ نظر آتی میں دبتا بچتا نکل جاتا' شہر گزرا تو درختوں اور کھیتوں کے کنارے ارہر اور رواس کے چھدرے اور اونچے پودوں میں پرندوں کی چہکاریں بھری ہوئی تھیں' میں آہستہ آہستہ جنگل کی تازہ ہوا پیتا اور پیشانی پر نمی سی محسوس کرتا تبر شاہ کے چبوترے کے قریب پہنچ گیا اس نے مجھے اشارے سے قریب بلا کر دھونی کے قریب چٹائی پر بیٹھنے کا حکم دیا' میں سلام کر کے دوزانو ہو بیٹھا جو درویشوں میں اصول ہے۔

تبر شاہ کے نہ داڑھی تھی نہ مونچھ مگر گٹھا ہوا آئینے کی طرح شفاف جسم اور بازوؤں میں ادلتی بدلتی مچھلیاں اور سینے میں اس کی گمبھیر آواز بتا رہی تھی کہ وہ کوئی معمولی فقیر نہیں اور نہ معمولی آدمی' وہ ساری رات نعرے لگاتا ایک ایک میل کے دائرے میں مرکھنے بجار کی طرح پھرتا اور صبح درخت سے ٹیک لگا کر چونی غنودگی سے تھوڑا سا آرام کرتا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں شعلے کی طرح جل رہی تھیں جیسے انگارے پر ہلکی ہلکی سفید راکھ کا استر آ جائے اس کی آواز میں ایک وزنی کھرج تھی جس سے اس کا مردانہ مزاج جھانکنے لگتا تھا وہ قوالوں طوائفوں اور دوسرے موسیقاروں میں نوابوں اور راجاؤں کی طرح روپیہ

تقسیم کرتا اس کے بوریئے کے نیچے نجانے کون سا ختم نہ ہونے والا خزانہ تھا' کبھی کبھی وہ موج میں آتا تو کہتا اب ہماری شادی کا دن قریب آ رہا ہے چنانچہ سناروں کو بلا کر سیروں سونے کے زیور بنواتا اور پہنتا اور اسی عالم میں رات کو تنہا میل میل بھر کا گشت بھی کیا کرتا' جب وہ زیور پہن کر جھوم جھوم کے چلتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شادی کے دن دولہا کی سواری کا زیور سے لدا ہوا گھوڑا! اور دوسرے روز وہی ڈھاک کے تین پات نہ زیور نہ کپڑا وہی بدن پر بھبوت ملے بیٹھے ہیں۔

وہ گفتگو سے فاضل اور رکھ رکھاؤ سے خاندانی آدمی معلوم ہوتا تھا مگر اس کی فقیری کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی' اس کا رعب اس قدر تھا کہ اول تو اس کے سامنے زبان نہیں کھلتی تھی' کوئی بولتا بھی تو اپنے اغراض و مقاصد کی التجا میں ڈوبا ہوا اور پسینے میں شرابور کس کی تاب تھی کہ اس کے اور اس کی زندگی کے متعلق پوچھتا۔

میں دو تین بار اس سے ملا ہوں تو وہ مجھے ایک بادشاہ صورت فقیر اور بلند مقام کا انسان معلوم ہوا اس کے اخلاق کی گرفت اور لہجے کا جادو غریب امیر کیا سپاہی سے لے کر افسروں تک پر یکساں تھا' حالانکہ اس کے لہجے میں تحکم کا شائبہ بھی نہیں تھا' لیکن اس کی شخصیت اور چہرہ مہرہ بڑے لوگوں والا تھا' اس کے بے تکے مصارف دیکھ کر شہر میں ایک افواہ تو یہ تھی کہ یہ سی آئی ڈی کا بڑا افسر ہے دوسری یہ کہ تبر شاہ کے پاس پارس پتھر ہے جو لوہے کو سونا بنا دیتا ہے اور اس خیال پر لوگ زیادہ متفق تھے۔

میرا خیال ہے کہ تبر شاہ کو کوئی اچھا اور کامل مرشد مل گیا تھا جس نے اسے جوانی ہی میں فقر کی مقدس دولت عطا کر دی تھی۔ وہ شب بیدار بھی تھا اور سحر خیز بھی' اور فطرت کسی کو مایوس نہیں کرتی صاحبان فکر و تدبر کو تو وہ اس قدر راز دار بنا لیتی ہے کہ زمین کا محل اور ستاروں کے عزائم ذہن میں وقت سے پہلے جھلکیاں ڈالنے لگتے ہیں اور انہی جھلکیوں سے دل میں گداز اور ضمیر میں روشنی اتر آتی ہے' نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ زبان پر مستقبل کے حالات اور قلم پر نگارش کا جنوں طاری رہنے لگتا ہے۔

یہ کیفیت تو بارہا مجھ پر گزری ہے کہ لمبی جھڑی کے بعد جب ہوا چلتی ہے اور دبیز بادلوں کے جھراڑوں سے آسمانی جسم نظر آنے لگتا ہے اس وقت روح میں بانکا پن آ جاتا ہے اور سانسوں میں مختلف قسم کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں اس وقت نو جوان دوشیزاؤں کے لہراتے ہوئے آنچلوں میں

دلچسپی نہیں رہتی اور آرائشی ونمائشی ارادوں کے پاؤں سوج جاتے ہیں' دنیا بھر کی موسیقیاں' بے ہنگم چیخ پکار اور جعلی آوازیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور انسان خود کو ایک غیر مرئی لذت اور کیفیت کا امین محسوس کرنے لگتا ہے۔ تبر شاہ زانیوں اور قمار بازوں سے نفرت کرتا تھا' شروع شروع میں سٹے بازوں نے اسے گھیرا تو اس نے کئی سٹہ بازوں کو بری طرح زدوکوب کیا اس لیے لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے۔ ہاں وہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتا تھا' جس مزدور کو مزدوری میسر نہ آتی وہ تبر شاہ کے یہاں جا بیٹھتا اور شام کو تبر شاہ سے مزدوری لے کر آ جاتا' مگر وہ بیواؤں' یتیموں اور بیماروں کو مانگے بغیر اچھی اچھی رقمیں دیتا تھا' رئیس اور افسر قسم کے لوگ اس کی اس شاہ خرچی سے مرعوب تھے اور درمیانہ طبقے کے لوگ متاثر۔

تین چار ماہ کے بعد میں لاہور سے مظفر نگر تبر شاہ سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ تبر شاہ تو قتل ہو گیا' میں نے کئی لوگوں سے اس کے قتل کا سبب پوچھا' مگر جس کی جہاں تک رسائی تھی' ایک فقیر نے کہا اسے بدمعاشوں نے مل کر مارا ہے۔ انہوں نے اس کی دونوں لاتیں کئی کئی جگہ سے چیری ہوئی تھیں۔ غالباً قاتلوں نے اسے پارس پتھر کے لالچ میں قتل کر دیا' سنا ہے ایک دن پہلے اس نے کئی بدمعاشوں کو بلا کر ان کی پر تکلف دعوت کی اور کہا میرے ڈیرے سے جس کو جو چیز پسند ہو لے جائے۔ چنانچہ اس نے ڈیرا خالی کر دیا تھا اور دھونی بجھا دی تھی اس کے معنی یہ تھے کہ اسے اپنے قتل کے متعلق معلوم ہو گیا تھا میرے کانوں میں اب بھی اس کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ ''شادی کا وقت قریب آتا جا رہا ہے'' آہ کیا ہے یہ درویشی بھی۔

تبر شاہ کے قتل ہونے کے بعد ان کے مریدین و معتقدین نے ان کا باقاعدہ مزار تعمیر کیا اور اب سال بسال باقاعدگی سے ان کا عرس ہوتا ہے جس میں قوالی اور نعت خوانی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور ہر وارد و صادر میں لنگر تقسیم ہوتا ہے۔ ۱۹۵۸ء تک تبر شاہ کے خلیفہ و گدی نشین جناب عبدالغنی تھے جو مجرد تھے اور منیاری کا تھوک کا کام کرتے تھے۔ فیروز آباد اور رڑکی سے چوڑیوں کے ٹرک لا کر مظفر نگر میں دکانداروں کو دیتے تھے' اب کچھ علم نہیں کہ بقید حیات ہیں یا نہیں اگر بقید حیات ہوں تو خدائے منان طویل عمر عطا فرمائے اور خوش و خرم رکھے اور وصال ہو چکا ہے تو مغفرت فرمائے۔

شاہ ابوالقاسم رام پوری

مجھ سے بے لوث محبت کرنے والوں میں ایک شخص شاہ ابوالقاسم بھی تھے وہ رام پور کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے' علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ شب بیدار اور مرتاض قسم کے انسان تھے ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور نغز گو شاعر بھی ایسے کہ جب وہ مزے مزے میں غزل پڑھتے تو کہیں جھول نظر نہ آتا تھا۔

جوانی میں بڑے حسین وجمیل آدمی ہوں گے بڑھاپے میں بھی ان کا میدہ شہاب رنگ' سرخ باریک ہونٹ' آنکھوں میں جگار کے سرخ ڈورے اور سنہری داڑھی ان کی تبلیغی گفتگو سے انہیں ہر آدمی ولی سمجھنے پر مجبور تھا۔

جب وہ تصوف کے مسائل پر گفتگو کرتے اور اخلاقی بلندیوں سے بولتے تو ٹیڑھے سے ٹیڑھا آدمی احترام پر مجبور ہو جاتا۔ پہلے تو وہ پیسہ اخبار کی کسی گلی میں رہتے تھے۔ پھر دیال سنگھ لائبریری کی پشت پر احمد ندیم قاسمی کے مکان سے نزدیک ایک کمرے میں رہنے لگے تھے' ندیم صاحب بھی ان کا احترام کرتے تھے اور میں مطمئن تھا کہ پڑوس اچھا ہے' وہیں ان کا رشد و ہدایت کا سلسلہ تھا' یہاں آکر وہ کچھ گم سے ہو گئے تھے مگر جب وہ کوئی بات شریعت اور اخلاق کے خلاف سنتے تو تڑپ اٹھتے اور خیالات باطلہ کے رد میں بولتے بولتے پسینے میں شرابور ہو جاتے' ان کے غریب اور مفلس قسم کے لوگ مرید بھی تھے مگر ان کا یہ سلسلہ دکانداری نہیں تھا' وہ بڑے بے لوث اور سلجھے ہوئے عقائد کے انسان تھے' میں نے ہمیشہ انہیں درویش ہی سمجھا۔

درویش وہ قیمتی نوع انسانی ہے جو عجز وانکسار کی خاک دھول میں چھپی رہتی ہے اور مدتوں میں اپنا تعارف کراتی ہے جیسے سیکڑوں من کا درخت ایک بیج میں فولڈ ہوتا ہے سورج کی شعاعوں کی گرمی' زمین کی بھاپ کی نرمی' ہواؤں کا لمس اور موسموں کی لوریوں سے اپنے اصل وجود کا اظہار کرتا ہے' درویش اتنی جلدی بے نقاب نہیں ہو جاتا کہ ہر انسان آسانی سے اس کے محاسن کو سمجھ لے' وہ بے نقاب ہونے کے بعد بھی اپنے اوصاف ومحاسن اور تاب وتوانائی کو اپنے طالب کے ظرف وضمیر سے زیادہ بے نقاب نہیں کرتا اور نہ اوٹ پٹانگ دعوے کرتا ہے مگر بے فیض بھی نہیں ہوتا۔ شاہ ابوالقاسم

صاحب کا کلام بھی کسی مرید کی تحویل میں ہوگا مگر اب تک سامنے نہیں آیا اور شاہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ظفر زبیری

ایک تنومند اور خوبرو نوجوان اسلامیہ کالج کا طالب علم اور ہاکی کا نہایت اچھا کھلاڑی تھا' کھیلتے کھیلتے ایک دن گھٹنے میں گیند آ لگی دو چار ماہ تو معمولی سا درد رہا پھر رفتہ رفتہ یہ عالم ہوا کہ ٹانگ کاٹنا پڑی اس کی دلفریب جوانی میں معذوری دیکھ کر ہر شخص کو قلق ہوتا تھا۔

ظفر زبیری شعر گوئی اور ادب فہمی کا اچھا ذوق رکھتا تھا اور کالج کے زمانے سے میرا شاگرد تھا' وہ رہنے والا تو لاہور کے قریب ایک گاؤں کا تھا لیکن ماں باپ کا اس قدر لاڈلا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ گاؤں میں رہ کر اداس ہو جاتا ہے تو لاہور میں موچی دروازے کے باہر چوراہے کے نکڑ پر ''منزل'' کے نام سے ایک رستوران کرا دیا تھا تاکہ وہ معذوری کے احساس سے مغموم نہ ہو اور دل بہلا رہے۔

ظفر زبیری اپنے ریستوران میں ہر ہفتے ایک مجلس ادب کا انعقاد کرتا اس میں کبھی مشاعرہ اور کبھی نثری نشست ہوتی جس میں افسانے اور تنقیدی مضامین پڑھے جاتے' لاہور کے علمی ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان حصہ لیتے' اس بزم کے منصرم اعلیٰ جناب منیر چغتائی تھے جو شاعروں اور ادیبوں جیسی نازک مزاج مخلوق سے نمٹتے تھے اس بزم یاران ادب میں میرے ساتھ جناب اسحاق شور' ہوش ترمذی مرحوم شہرت بخاری مسیح الحسن بقا نقوی مرحوم' یوسف ظفر مرحوم' شفیق الرحمان شفا کاندہلوی' ناصر کاظمی مرحوم پیرزادہ فراغت علی شاد' مجید نشاری' اور خود ریستوران کے مالک ظفر زبیری شرکت اور خوش وقتی کرتے۔

اسی اثنا میں ظفر زبیری اپنی شاعرانہ طبیعت سے مجبور ہو کر ایک مدقوق دوست کی تیمار داری' معاونت اور دلداری کرتے کرتے خود مدقوق ہو کے راہی عدم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اسی ''منزل رستوران'' کی نشستوں میں کوئٹہ کے نواب یوسف علی خان عزیز مگسی بھی شریک ہوتے تھے' وہ طبعاً مجھ سے بہت نزدیک اور خیالات و نظریات میں ہم آہنگ تھے' وہ بلوچستان کے

لیے کوئٹہ میں ایک یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے جب وہ آتے تھے تو آدھی آدھی رات تک اسی سلسلے کی گفتگو ہوتی، وہ کچھ اس طرح کا منصوبہ رکھتے تھے کہ ہر استاد کے بنگلے کے ساتھ دو ایکڑ زمین بھی ہو جس میں وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کاشت کرے اور تفریحی ماحول بھی بنائے۔

میرا یہ مشورہ تھا کہ پہلے ہائی سکول قائم کیا جائے پھر اسے کالج بنائیں اور کالج کو ترقی دے کر یونیورسٹی کے متعلق منصوبہ بنے انہوں نے مجھ سے اسکول کے لیے کورس اور ایک ''رسالہ'' کا منصوبہ طلب کیا تھا جس پر میں نے کچھ اس قسم کا مشورہ دیا تھا اور انہوں نے پسند بھی کیا تھا۔

پہلی جماعت میں بچوں کو صرف سو الفاظ یاد کرنے اور لکھنے کے لیے دیئے جائیں۔ دوسری جماعت میں پہلی جماعت کے سو الفاظ کا اعادہ اور اس کے ساتھ سو نئے الفاظ داخل کر دیئے جائیں اسی طرح تیسری جماعت میں دوسری جماعت کے الفاظ کا اعادہ اور سو نئے الفاظ مرتب کیے جائیں اور ان سے کارآمد اخلاقی فقرے، اقوال اور واقعات ہوں اسی طرح دسویں جماعت تک عمل کیا جائے نتیجہ یہ ہوگا کہ دسویں جماعت کے طالب علم کو ایک ہزار الفاظ ایسے یاد ہوں گے جو تکرار سے مبرا ہوں گے اور آج ذہین سے ذہین طالب علم بھی تکرار کے بغیر ایک ہزار الفاظ کا مالک نہیں مگر اس قسم کا کورس تیار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں یہ اعلیٰ درجے کے ذہین اور عبقری لوگوں کا کام ہے۔

ایک ''رسالہ عصر'' کے نام سے نکالا جائے جو سال میں ایک بار چھپے جس میں ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہر جماعت کے امتحان میں اول، دوم اور سوم آنے والے طالب علموں کے حالات ان کے ماں باپ کی معاشی حالت اور اپنی رائے کے ساتھ سفارشات دفتر کو بھیجیں، اگر کوئی بچہ ماں باپ کے ناگفتہ بہ حالات کے باعث آئندہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تو اس کی آبرومندانہ امداد کی جائے تاکہ حکومت کو تعلیم سے کارآمد نوجوان مل سکیں۔

ایک ایسا ہی جریدہ کالجوں کے متعلق بھی درکار ہوگا، جس میں ہر پرنسپل اپنے کالج کے لکچراروں اور پروفیسروں کے متعلق اپنی رائے اور ان کے کام کا جائزہ لکھے۔

اسکول کے ساتھ صابون سازی، قالین بافی، بندوق سازی، نجاری جفت سازی خطاطی، طباعت، گھڑی سازی اور تصویرگری وغیرہ کے شعبے بھی قائم کیے جائیں، اگر کوئی بچہ ایک مضمون میں دو بار فیل ہو جائے تو اس سے وہ مضمون چھڑا کر اس مضمون کا وقت کسی دستکاری میں لگا دیا جائے جس

میں بچہ دلچسپی بھی لیتا ہو' اگر بچہ میٹرک تک تعلیم حاصل کر کے آگے پڑھنا نہ چاہے تو روٹی کپڑے کی محتاجی نہ ہو اور کبھی اس پر علم و عمل کی برتری کا انکشاف ہو تو حصول میں دشواری نہ رہے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ (گولڑہ شریف)

پہلی بار میں نے ان کی تعریف اور علم و عرفان کا کمال حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب سے سنا اور ان کے الفاظ ایسے دل میں اترے کہ ایک چٹیک سی لگ گئی' جب بھی فرصت ہوتی خواجہ صاحب کے الفاظ خود بخود کانوں میں گونجنے لگتے اور دیر تک رگوں میں شراب کی سی سنسناتی رہتی' لاہور میں کئی بار ان کے صاحبزادے اور جانشین حضرت غلام محی الدین عرف بابو جی سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن اس طرح ملنا نصیب نہ ہوا جس سے چہرے پر کیفیت کی موجیں چڑھنے اترنے لگتی ہیں اور بدن میں پھریریاں بے تاب ہو جاتی ہیں۔

میں نے ایک بار کھانے پر گفتگو بھی کرنا چاہی لیکن طلب کی اثبات نے نفی کی طرف ہی رخ رکھا اور میری مایوسی کے قطب نما کی سوئی میرے سامنے کانپنے لگی' مگر دل تھا کہ عقیدت میں پگھلا جا رہا تھا' اتنے میں میرے ایک جاننے والے نے کہنی مار کر مجھے مخاطب کیا اور کہا چلیے دیر ہو رہی ہے' یہاں کون کسی کے دکھ درد کو سنتا ہے اور کس کو کسی کے آنسو پونچھنے کی پڑی ہے! اگر کچھ کہنا ہے تو رسول اللہ ﷺ سے کہو اور مانگنا ہے تو خدا سے مانگو! میں نے عرض کی کہ یہ لوگ بھی تو خاصان خدا ہیں رستہ پوچھنے میں کیا بگڑتا ہے؟ ہم سے تو بہر حال انہوں نے بلند و بالا منزلیں طے کر رکھی ہیں' بزرگوں کے بات کرنے اور قریب لانے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے' یہ ضروری تو نہیں کہ جس کمرے میں بجلی کا بلب نہ ہو وہاں کرنٹ بھی نہ ہو' یہ تو بزرگوں کی نشانیاں ہیں انگوری بیل میں کیکر کی شاخ کیسے لگ سکتی ہے؟ بس تو اپنے مشرب میں مایوسی کو گناہ خیال کرتا ہوں' ہم دونوں اٹھ کر چلے آئے مگر دل کے شعلوں پر سفید راکھ جمتی رہی۔

عرصے کے بعد ایک دوست سید شفیق احمد ہمایوں جو حضرت حافظ مظہر الدین صاحب سے بیعت ہیں مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے گئے' میں نے غنیمت جانا کیونکہ حافظ صاحب کے لیے بھی آنکھیں ترس گئی تھیں چنانچہ حافظ صاحب ہی کے یہاں قیام رہا اور ان سے مل کر دل نے ایسی

مسرت محسوس کی جیسے روح نے یاقوتی پی لی ہو۔ رات کے نو دس بجے تک تو آنے جانے والوں کا ہجوم رہا ان کے بعد حافظ صاحب اوپر گئے اور میرے لیے ایک نرم ولطیف بستر ابھجوا دیا' میں زمین پر سونے اور کھری چارپائی پر بیٹھنے والا انسان کیا کہوں دل میں کیا کیا خیالات آ رہے تھے' بس یوں جانیے اسی وقت حافظ صاحب پھر تشریف لائے اور گفتگو شروع ہوئی کہ مزا ہی تو آ گیا' تقریباً ایک بجے حافظ صاحب اوپر چلے گئے اور مجھے بستر کے سپرد کر گئے' لیکن صبح تک حافظ صاحب کی باتوں کا نشہ ٹوٹنے نہ پایا۔ علی الصبح حافظ صاحب تشریف لائے اور مزاج پرسی کی' میں نے عرض کی جناب مہمان نوازی کا تو شکریہ' مگر رات بھر بستر کی اجنبی لطافت میں نیند نہیں آئی' اب میں تمام دن بالاقساط سو کر نیند پوری کروں گا' یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ناشتہ آ گیا اور وہیں پیرزادہ غلام نصیر الدین کے متعلق گفتگو چھڑ گئی' خدا کا شکر ہے ہم دونوں کا نقطہ نظر ایک ہی نکلا اور یہ توارد یقیناً بڑا ہی خوش کن تھا۔ جیسے دو منار فاصلے کے باوصف نظریں ملائے رکھتے ہیں۔

ناشتے کے بعد ہمایوں شفیق' حافظ مظہر الدین اور راقم الحروف گولڑہ روانہ ہو گئے اور ہنستے ہنساتے خانقاہ پر جا اترے' نصیر صاحب پہلے سے منتظر تھے اس خلوص اور محبت سے ملے کہ سماعی فاصلوں میں ایک کیفیت سی لپکنے لگی' کچھ دیر شعر و شاعری رہی' پیرزادہ صاحب نے میری کتاب ''جہان دانش'' میری طرف سرکاتے ہوئے کہا ''جناب میں آپ سے غافل نہیں ہوں' میں نے شرم آلود شکریہ ادا کیا' اتنے میں کھانا آ گیا اور ہم سب نے سیر ہو کر کھایا' اس کے بعد نصیر صاحب ہمیں خانقاہ دکھانے کے لیے لے گئے اور خاص خاص جگہوں کی زیارت کرائی مجھے سب سے زیادہ کیفیت وہاں محسوس ہوئی جہاں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب محوِ خواب ہیں' اس وقت ساتھیوں کے قدم بقدم چلنا مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ میرے گریبان میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹ رہے ہیں' چنانچہ میں فاتحہ بھی اپنے معلوم اور اصول کے مطابق نہ پڑھ سکا لیکن یہ تو دلوں کے معاملات ہیں محبت اور خلوص میں کوئی اصول اٹل نہیں ہوتا' جہاں مناسبت کا سوال آتا ہے وہاں کلیات کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب نصیر الدین مجھے خانقاہ کے اس حصے کی طرف لے گئے جہاں سے پہاڑ کا منظر ایک سیاہ پردے کی طرح دکھائی دے رہا تھا تو میرے قدم گڑ گئے اور روزمرہ کے رکھ رکھاؤ میں کان آ گئی' میں نے خود کو سنبھالا اور سبحان اللہ' سبحان اللہ کا ورد کرتا رہا' میری ہر نظر سرسبز چٹانوں اور شجر زاروں کی

طرف آتش بازی سے سیکڑوں گنا تیز شرارے بھر رہی تھی، میرے لیے ہر گھائی ایک نئے موسم کی ڈیوڑھی تھی، لیکن وقت کچھ ایسا تھا کہ زمین سے آسمان تک کہرے کی غنودگی بھری ہوئی تھی اس وقت آبادی کی بلڈنگوں اور حسین صورتوں کا خیال دل کے ایک گوشے میں دبکا ہوا تھا اور زندگی کی مصروفیات کا پشتارہ کمر سے کھول کر پھینک دینے کو جی چاہ رہا تھا ہم مرے مرے قدموں سے ٹہلتے ہوئے حافظ مظہر الدین صاحب کے پاس جا پہنچے وہ سامنے کے برآمدے میں تشریف فرما تھے۔

وہاں سے اٹھ کر حضرت مہر علی صاحب کی خواب گاہ دیکھی اور میرے وجدان نے میری طلب پر تصدیق ثبت کر دی، اس وقت پہاڑ کی طرف سے سیاہ بادل کے سائے کی ٹھنڈی چادر مکانوں کی چھتوں پر پھیلتی چلی آ رہی تھی اور سورج مغرب کی جانب سرخ قنات لگانے میں مصروف تھا، راستوں کے ادھر ادھر جگہ جگہ برسات کا پانی قلعی شدہ طشتریوں اور تھالوں کی طرح چمک رہا تھا۔

گولڑہ کا محل وقوع دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، وہاں مجھے نبوت کی عظمت اور توحید کی تکبیر پر متوجہ ہونے والی بے شمار پرچھائیوں کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی، جو ہم جیسا خاکی جسم تو نہیں رکھتیں لیکن تسبیح و تہلیل ان کا شعار ہے۔

گولڑہ میں جا کر اس بات کا یقین بھی آیا کہ ایسے ہی جنگلوں میں خدا کی راہیں ملتی ہیں اور ایسے ہی جھاڑ جھنکاڑ کا مطالعہ روحانی بالیدگی کا ضامن ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی ہنگامہ پرور شہر میں کوئی پیغمبر پیدا نہیں ہوا، بادلوں کی پکھالوں میں میں بھرا ہوا سمندر کا باردانہ اور اولوں کے کھنکھناتے ہوئے چلتے پھرتے تغاریبیں سے انسانی ذہن کی تربیت کرتے ہیں!

جنگل کے حسن کا نظارہ ممکن تو ہر جگہ ہے۔ اس سے ہمارے تکوینی نظام پر آب آتی ہے اور شہریوں کے چہروں پر انہی ہواؤں سے خون دوڑتا ہے، شہری آبادی اپنے بناؤ سنگھار اور تصنعات کے باوجود جنگل کے درختوں، پھولوں، شاخوں، پتوں اور موسموں کے حسن کو نگاہوں سے اوجھل اور آرزو سے معزول نہیں کر سکتی اور مزے کی بات یہ ہے کہ جس قدر گھنا جنگل ہو گا اسی قدر حسن کے اقسام نظر آتے چلے جائیں گے۔

ندی نالوں اور راجباہوں کی پٹڑی پر پگڈنڈیوں کے دونوں طرف پھیلی ہوئی زرد مٹی اور جا بجا چیونٹیوں کی قطاریں اور جھڑ بیریوں کے جھنڈ ایسا حسن رکھتے ہیں کہ شہر کے بڑے بڑے

بازاروں میں وہ دلآویزی میسر نہیں آتی۔

حافظ مظہر الدین، ہمایوں شفیق اور راقم الحروف پھرتے پھرتے دروازے پر آ گئے اور پیرزادہ صاحب نے ہمیں ایک موٹر میں بٹھا دیا، یہ وقت کچھ ایسا تھا کہ درختوں پر اداسی اترنا شروع ہو گئی تھی اور بادلوں کا زرد قافلہ آبادی کا گھیراؤ کر رہا تھا، ہم خانقاہ سے نکلے ہی تھے کہ ترشح ہونے لگا، ہم نے موٹر کے شیشے چڑھا لیے، شیشوں پر ڈھلتی ہوئی بوندوں سے کبھی چنگاریوں اور کبھی آنسوؤں کا منظر سامنے آ رہا تھا۔

مجھے راستے میں کئی بار یہ محسوس ہوا کہ ڈرائیور ابھی عمر کے اعتبار سے نیا ہے، اس نے ڈرائیوری ابھی سیکھی ہے، حافظ صاحب نے نہ جانے کیا ذکر چھیڑ رکھا تھا اور ہم مزے مزے میں سفر کا لطف لیتے جا رہے تھے کہ اچانک موٹر سڑک سے پھسل کر نیچے اتر گئی اور ڈرائیور سکڑ سکڑا کر رہ گیا سامنے ایک ادھیڑ عمر کا دیہاتی زد میں آتے آتے بچا لیکن موٹر اس کے اس قدر قریب پہنچ چکی تھی کہ وہ بوکھلا کر گر گیا گاڑی خود بخود پتھر سے لگ کر رک گئی، ہم نے از راہ ہمدردی اس دیہاتی کو اٹھایا تو وہ کانپ رہا تھا اور کچھ اس طرح چل رہا تھا جیسے کسی نالے پر رکھے ہوئے لچکیلے تختے پر چل رہا ہو۔

میں نے اسے اسی موٹر میں بٹھا کر خانقاہ پر بھیج دیا اور ہم ایک بس میں سوار ہو کر راولپنڈی حافظ صاحب کے دولت کدے پر آ اترے ادھر نصیر الدین نے اسے خوش کر کے گھر بھیج دیا۔

نصیر الدین خانقاہ میں درس و حدیث بھی دیتے ہیں اور وقتاً فوقتاً تبلیغی دورے بھی کرتے ہیں، ان کے سفر و حضر میں وہی اصول حیات بیان ہوتے ہیں جو نسل انسانی کے لئے اترے ہیں اور جن میں افراد و اجتماع کی رہبری ہوتی ہے کاش خانقاہی اداروں سے اس معیار و کردار کے نوجوان مبلغ زیادہ سے زیادہ اٹھنے لگیں۔

کیونکہ جب تک تمام قوم بلکہ تمام ملک میں اسلامی معاشرہ نہ ہو جائے اس وقت تک اسلام اور مسلمانوں کی عظمتیں داستانوں اور دیومالاؤں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، دنیا میں آج بھی ہمیں اسی جیتی جاگتی سوسائٹی کی ضرورت ہے، جس کے اصول زندگی، نظریات و افکار، اصول و ضوابط اور رد و قبول کے اقدار و معیار کے سرچشمے اسلامی منبع سے پھوٹتے ہوں اور شریعت الٰہی کے تحت جہانبانی و حکمرانی کے فرائض معطل نہ ہونے دے۔

اس میں شک نہیں کہ آج کی اسلامی تہذیب پر سیکڑوں نسلوں کی گمراہیوں اور ہزاروں علماء و فضلاء کے غلط افکار ونظریات کا ملبہ لدا ہوا ہے اور اس کی کھدائی بھی دقت طلب ہے کیونکہ آج کی نام نہاد سطح اور مدفون اسلامی تہذیب کی زمین میں صدیوں کا فاصلہ ہے اور ان خود ساختہ افکار و خیالات کے قبوں اور اقدار و معیاری گہرائی کے قبرستانوں پر مدد لگا کے سلامت اور نیک نام رہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

لیکن اگر ہم خود غرضی اور دنیا داری کو نظر انداز کر دیں تو احیائے اسلام کی راہ میں کوئی ایسی خلیج اور اندھیری گھاٹی بھی حائل نہیں جسے عبور نہ کیا جا سکے اس میں تو ہر مرحلے پر انسانوں کے دوش بدوش فرشتے بھی کام کرتے ہیں اور اس میں انسان اپنے جیسے انسانوں کے دائرے سے نکل کر صرف اللہ کی بارگاہ سے ہدایت اور روشنی پانے لگتا ہے۔

دنیا کی تمام تہذیبیں اسلامی تہذیب کے سامنے بنجر ہیں کیونکہ اسلامی تہذیب کے نظریات عمل میں دیر نہیں لگاتے اور عمل سے نتائج کے سانچے خود بخود بھرتے چلے جاتے ہیں اس میں انسان کی فکری اور بصیرتی سطح اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے گرد جو مادی حصار بندھا ہوتا ہے اس کے جوڑ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

صحابہ کے دور میں جب اس دعوت دین کے اصول کو روزمرہ میں داخل کر لیا گیا تو تاریخ انسانی گواہ ہے کہ پھر کسی دور کے معاشرے میں ایسے ایماندار جیالے اور صاحب ظرف و ضمیر انسان پیدا نہیں ہوئے اور دنیا کی تاریخ اپنے اسٹیج پر کبھی اس دور کے احیاء کا مظاہرہ نہ کر سکی۔

وفات رسولؐ سے لے کر صحابہ کے دور تک تو وہ جوہری اثرات پر تاثیر تھے مگر اس کے بعد کوئی ایسی اسلامی جماعت منصۂ شہود پر نہ آ سکی جو رسول اکرم صلعم کی وراثت کی صحیح پیروکار کہلا سکتی' اس کا سبب بھی کوئی دوسری یا اہم خامی نہیں بلکہ اسلام کے سرچشمے میں باہر سے مختلف رشد و ہدایت کے سیکڑوں سوتے آ ملے جس سے قرآن کی تعبیر اور حدیث کی تفہیم پر کوئی اچھا اثر نہ پڑا' مختلف نظریات نے ذہنوں کو گمراہ کر دیا اور برساتی پانی کی طرح اختلافات نے جگہ جگہ راہیں بنا لیں۔

ہر چند کہ پیرزادہ غلام نصیر الدین اس میں دن رات کوشاں ہیں اور مجھ جیسے سیکڑوں آدمی ان کے لیے دعا بھی کرتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ساتھ صحیح الخیال نوجوانوں اور

سال خوردہ لوگوں کی ایک جماعت ہوتا کہ علم اور تجربہ ساتھ ساتھ سفر کر سکیں۔ آج امت مسلمہ اپنے وجود کو بسار کے اور تاریخ کے دروازے سے منہ پھیر کے اتنی دور آ چکی ہے کہ اب اسے اپنے اصل منصب کی داستانیں بھی نہیں ملتیں، اور اس غفلت کے عرصے میں یورپ کے اذہان نے' قانون' کلچر اور سائنسی ایجادات کا ہنگامہ ایسا برپا کر دیا کہ اسلامی قیادت پر غیر اسلامی لوگ قابض ہو گئے جنہیں اسلامی تہذیب اور دینی روایات سے دور کا بھی واسطہ نہیں! اور اس دھاندلی کا میدان اس قدر وسیع ہو گیا اور مادی ایجادات و اختراعات کے اتنے انبار لگ گئے کہ موجودہ تہذیب کی فریب کاری اور غلط روی کی نشاندہی بھی کوئی آسان بات نہیں رہی۔

مگر قدرت جن کرداروں اور قدروں کی پشت پناہی کا وعدہ کرتی ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں' قرآن اپنے راز ان ہی سینوں میں منتقل کرتا اور اپنے دفینوں کا پتہ انہیں لوگوں کو دیتا ہے جو انسانیت کی خدمت کے جذبے سے مطالعہ کر کے اس پر عمل کی چھاپ ضروری خیال کرتے ہیں' اس جدوجہد سے ان پر یہ روشن ہو جاتا ہے کہ خالق کائنات کو انسانی زندگی کا کون سا اسلوب پسند ہے اور کون سے راستے میں انہیں بلندیاں ملیں گی:

شیخ سر عبدالقادر

سر عبدالقادر پنجاب کی مشہور شخصیت ہیں وہ نہایت اچھے ادیب بھی تھے اور ادیب گر بھی شاعر ساز بھی تھے اور شاعر پرور بھی! بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال انہیں کی ضلعت کا شکار ہیں' انہوں نے ہی ''بانگ درا'' پر دیباچہ لکھ کر انہیں روشناس کرایا تھا اور دنیائے ادب میں بنا سنوار کر لائے تھے لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے' علامہ اقبال فطری شاعر تھے اور قدرت نے انہیں یہی کام سپرد کیا تھا یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے انہیں سہارا بنایا ہو یا توفیق دی ہو آخر سبب تو کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے' وہ تو جناب حفیظ جالندھری کو بھی یورپ لے کر گئے تھے اور جگہ جگہ روشناس کرایا مگر حفیظ صاحب اقبال نہ بن سکے اور نہ اقبال کی جگہ پر کر سکے۔

اصل میں سر عبدالقادر صاحب جوہر شناس اور قدر دان انسان تھے اور ہر ابھرتے ہوئے ادیب اور شاعر پر دست شفقت رکھتے تھے' چنانچہ مجھ سے بھی وہ بڑے خلوص اور ہمدردی سے ملتے

تھے اور حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے' انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا تم میرے یہاں آتے کیوں نہیں میں شکریہ ادا کر کے خاموش ہو جاتا اور خیال کرتا کہ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں اینٹیں اور گارا ڈھونے والا مزدور ہوں تو ممکن ہے کہ اس شفقت سے بھی محروم ہو جاؤں اور میں مجبور بھی تھا مزدوری سے آکے اتنا وقت کہاں ملتا تھا کہ اپنے کرم فرماؤں کے پاس جاتا' مزدوری کے بعد کسی مزدور کے بدن میں اتنی جان نہیں رہتی کہ وہ آرام کے سوا دوسری تفریحات میں حصہ لے سکے اور یہ مزدور پر ہی منحصر نہیں ریل کے انجمن کو بھی تین سو میل کے بعد آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب کبھی مزدوری نہیں لگتی تھی تو وقت پا کر میں ضرور ان کے پاس بھی جاتا تھا اور وہ مجھ سے ماضی کے بزرگوں کی طرح شفقت سے پیش آتے جو صاحب کمال ہونے کی علامت تھی۔

وہ بڑے ادیب اور نقاد تھے اور انگریزی زبان میں بھی ان کا مقام بلند و برتر تھا' وہ مسلم لیگ سے متعلق بھی تھے اور اس میں ان کا بڑا انہماک تھا' مجھے تو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اپنی بیرسٹری کی مصروفیات میں اردو کی خدمت کے فرائض کس طرح انجام دیتے تھے' مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دور کی حکومت نے انہیں بیرسٹری کی دل دل میں کیوں دھنسا رکھا ہے' انہیں علم و تعلم میں کوئی بلند مقام کیوں نہیں دیا گیا۔

اس اردو دوست بزرگ نے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو اس دنیا سے کوچ کیا مگر پنجاب کی شکتی پوجا کرنے والی سرزمین اسے دلوں سے دور کرتی اور تذکروں کے نا قابل سمجھتی جا رہی ہے' حالانکہ سر عبدالقادر کی شخصیت ایسی تھی کہ کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو اس کی یادگار کے لیے نجانے کیا کیا جتن کئے جاتے۔

شمس العلماء مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی ماہنامہ ''مخزن'' میں سر عبدالقادر کے دست راست تھے' ''مخزن'' کی ادارت کا بار مولانا ہی کے کاندھوں پر تھا اور ''مخزن'' میں جو مضامین چھپے ہیں ان کی وجہ سے ''مخزن'' ایک حوالہ کی دستاویز ہو کر رہ گیا۔ مولانا عربی' فارسی کے منتہی اور اردو زبان کے والا و شیدا تھے انہوں نے ساری زندگی پنجاب میں اردو کی ترویج و توسیع میں تمام کر دی' ہر چند کہ ان کے مخالفین

انہیں ہر وقت ضیق میں رکھتے تھے اور رکیک سے رکیک حملوں سے بھی باز نہیں آتے تھے لیکن وہ تھے کہ صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاتے تھے ہاں کبھی کبھی جب ان کی عزت یا دیانت پر حملہ ہوتا تو آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتے۔

مولانا تاجور دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے اور یہ منصب ان کی اردو کی ترویج کے جنون کے لیے مناسب تھا چنانچہ ان کے سیکڑوں سکھ اور ہندو شاگرد آج تاریخ ادب اردو میں جگہ پائے ہوئے ملیں گے میری شعری تربیت میں بھی مولانا کا ہاتھ ایک استاد کی طرح رہا ہے اور میری روح میں ان کا احترام نقش کالحجر کی طرح ہے۔

مقامی حریفوں کی چپقلش نے ان کا اور تو کچھ نہیں بگاڑا مگر اردو زبان کا ناقابل تلافی نقصان ہو گیا' آئے دن کی دانتا کلکل نے نہ تو مولانا کو کوئی وقیع قسم کا کام کرنے کا موقع دیا اور نہ ہی حریفوں نے اپنی کوئی قیمتی اور قابل قدر یادگار چھوڑی! جو ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی نشاندہی کر سکتی۔

سر عبدالقادر کی طرح مولانا تاجور نجیب آبادی کو بھی اس سرزمین کے بے حس اور احسان فراموش لوگوں نے گمنامی کے اندھیروں میں پھینک دیا ہے اور غالباً یہ اس خطے کا خاصہ ہے۔ کیونکہ مولانا ظفر علی خان جیسے شاعر اور جید ادیب کو بھی تو انہوں نے طاق نسیان پر جگہ دے رکھی ہے۔

اب آ کر ''ادارہ تہذیب و ادب'' نے ایک تذکرے کا شوشہ نکال کر کئی لوگوں کا کلام اور حالات شائع کئے ہیں اور شباب کیرانوی ہر چند کہ فلمی دنیا کا آدمی ہو کر رہ گیا ہے' مگر اس نے اپنے رسالہ کا تاجور نمبر نکال کر وہ خدمت انجام دی ہے کہ مولانا کے لڑکے بھی یہ خدمت انجام نہیں دے سکیں گے اور شباب کیرانوی مولانا کے معمولی شاگردوں میں ہے جو کبھی کبھار مولانا کے یہاں آتے جاتے تھے۔ شباب کیرانوی کی یہ خدمت دیکھا جائے تو ادب کی خدمت ہے اور اس کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

مولانا تاجور مرحوم کے مزاحیہ مضامین جو ''بیوی سے جھڑپ'' کے نام سے چھپتے رہے ہیں اور تاریخ ادب اردو کا کچھ حصہ جو ''شاہکار'' اور ''ادبی دنیا'' میں چھپتا رہا ہے اگر کہیں فائل دستیاب ہو جائے اور اس سے انتخاب کر لیا جائے تو زبان و بیان پر ایسی کتاب' مشکل سے دستیاب ہو گی۔ مگر میں تو ان کے ایسے قدردان دیکھ رہا ہوں کہ اگر مولانا تاجور کا کہیں کوئی مضمون نظر آ جاتا ہے تو رسالہ

خرید کر جلا دیتے ہیں اور نہ جانے اس میں کیا راز ہے؟ شاید ان کج بیں لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ ابھی تو مولانا کے سیکڑوں شاگرد موجود ہیں جنہیں وقت کی گرد نے دبا رکھا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

حیدر آباد دکن کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے مہتمم اعلیٰ ہیں ان کی اردو زبان کی خدمات اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے تحقیقی شاہکار انہیں رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رکھیں گے۔

وہ اردو زبان کے بلند پایہ ادیب اور نقاد ہی نہیں تھے بلکہ اردو ادب کے معمار تھے ان کے شاگردوں نے جو ملک بھر میں اردو ادب کی خدمات انجام دیں ہیں وہ بھی زور مرحوم کی تربیت اور توجہ کا نتیجہ ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین زور قادری نے جہاں تحقیق و تدقیق سے سرزمین دکن کے مردہ آثار کو زندہ کیا وہیں اہل دکن اور خصوصاً نوجوانوں میں قوت اعتماد کی تخم ریزی بھی کی اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا بد نصیب ہوگا جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے کارناموں سے متاثر نہ ہوا ہو' مخدوم محی الدین قادری جیسا شاعر بھی ان کی ہی نگاہ التفات کا پروردہ ہے زور صاحب جہاں محقق اور نقاد تھے وہیں وہ بہترین استاد بھی تھے اور اچھے دوست بھی' افسوس کہ ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور وہ جب کشمیر میں پرنسپل تھے انہیں موت نے آدبوچا سیاسی دیواروں کے باعث مجھے ان کے مرض موت کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔

جناب اطہر ہاپوڑی

جناب معشوق حسین اطہر ہاپوڑی' فن شعر و ادب پر اس قدر حاوی تھے کہ ان سے مل کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ میری سرسری ملاقات کو ان کی شفقتوں نے اس قدر مستحکم کر دیا تھا کہ وہ جب بھی لاہور آتے تو غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے اور فرماتے احسان تمہارے پاس بیٹھ کر سکون ہوتا ہے۔ میں شرمندہ ہو جاتا۔

جب موج آتی تو اپنی زندگی کے واقعات اور بڑے بڑے جید ادیبوں کی غلطیاں بتایا کرتے

اور میں خدا کا شکر یہ ادا کرتا رہتا کہ مجھ پر کیسا استاد مہربان ہے' حقیقت یہ ہے کہ مجھے جوان کی صحبتوں سے ملا نظر دوڑاتا ہوں تو بڑے بڑے استاد اس تقسیم فیض کو بوتا نہیں رکھتے اب تو جس ادیب اور شاعر سے بات کیجیے وہ گفتگو کا پرنالہ ظرافت کی جھیل میں لا ڈالتا اور علمی رخ سے کنی کاٹ جاتا ہے وہیں سے اس کے علمی چاہ بچے سے فحشیات کے بھبکارے اور غلاظت کی سڑاند آنے لگتی ہے' جناب اطہر ہاپوڑی کی وفات کے بعد ضرورت تھی کہ ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع کر دیئے جاتے جو قیمتی معلومات کے حامل ہیں مگر غالباً اب تک ایسا نہیں ہوا وہ سرمایہ کہیں خمول میں پڑا ہے۔

میرا ایک سفر

اسلامی تعلیم کا سب سے عظیم مرکز تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں جہاں سے سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے توحید باری کی نشر و اشاعت شروع کی اور الہامی و خدائی تعلیم سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا دیا۔ یہی وہ مراکز ہیں جہاں سے حضور رسالت مآب کے پیغمبرانہ اسوہ حسنہ روحانی فیوض و برکات اور ذاتی اخلاق سے کائنات کی ترقی و بہبود اور تہذیب و تمدن کے جلووں نے ضیا پائی اور انسانیت نے ہر قدم پر شرافت کے دریچے کھول دیئے۔

اسی نبوی روشنی اور پیغمبرانہ تعلیم کی شاخیں پھیلیں تو عرب میں جگہ جگہ دار العلوم قائم ہو گئے' بغداد میں حضرت غوث الاعظم' لاہور میں حضرت علی ہجویری' اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی' دہلی میں نظام الدین اولیاء نے اسی قسم کے سیکڑوں مراکز قائم کر کے اردگرد کے علاقوں سے ہزاروں لاکھوں مسلمان پیدا کر لیے اور تعلیم رسول کو مسلمانوں کے روزمرہ میں داخل کرنے کے لیے خون پانی ایک کر دیا۔

جب تک ان مرکزوں سے فیوض و برکات کے چشمے جاری رہے توحید کے جلووں سے سینے منور اور دل مسرور ہوتے رہے اور اخلاق اسلامی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا مگر جب اسلامی توحید کی تعلیم میں فرق آیا اسی وقت سے مسلمانوں کا انحطاط شروع ہو گیا' جوں جوں توحید و رسالت کے انوار پر کفر و ضلالت اور بے عملی کے پردے پڑتے گئے۔ سینوں میں تاریکی اور ایمانوں میں اندھیرا ہوتا چلا گیا۔

میں نے اسی خیر و برکت کی ٹوہ میں مختلف جگہوں کے سفر شروع کیے کلیر میں حضرت علاؤالدین علی احمد صابر، اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی، دلی میں حضرت نظام الدین لاہور میں سید علی ہجویری، جھنگ میں سلطان باہو، پانی پت میں حضرت ابو علی قلندر بھوپال میں حضرت شاہ فتح اللہ مزنگ لاہور میں شیخ طاہر بندگی کراچی میں شاہ محمد عبداللہ غازی ٹھٹھہ میں سید محمد عبداللہ، بدایوں میں شاہ ولایت اور سلطان العارفین کے علاوہ ہفت احمد کے مزارات پر حاضری دی اور آگرے میں سید عبداللہ شاہ صاحب اور سید ابوالعلا کے مزارات پر حاضری کے شرف سے سکون ملا، کم و بیش سید عبداللہ شاہ قادری اور حضرت مہر علی شاہ صاحب کے مقابر کی زیارت سے روح کو ٹھنڈک اور دل میں گدگدی سی محسوس کی تھوڑے روز بعد انہیں روحانی شعلوں کی ٹھنڈک کی تلاش میں سندھ کے سفر پر روانہ ہو گیا، حضرت مخدوم نوح کے علاوہ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور حضرت عثمان مروندی (لال شہباز قلندر) کے مزارات پر فاتحہ خوانی کی لیکن ٹھٹھے میں سید عبداللہ شاہ اور کراچی میں غازی سید عبداللہ شاہ بخاری کے یہاں جو کیفیت پائی وہ بات میسر نہ آئی یہاں کے کسی مزار پر کوئی اچھا کتب خانہ نظر نہ آیا وہ تو اللہ سید حسام الدین راشدی کو زندہ رکھے کہ ان کی کوشش سے ان بزرگوں کے متعلق بیسیوں پچاسوں کتابیں عالم وجود میں آگئیں خود حسام الدین راشدی نے جو تذکرے لکھے اور تحقیق کی ہے وہ نہایت قابل قدر کام ہے، اس سے پہلے سندھ میں کسی نے ایسا عظیم کام نہیں کیا اور اعجاز الحق قدوسی نے تو کمال کر دیا کہ پورے ملک کے اولیاء کے تذکرے لکھ ڈالے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی قدوسی صاحب کو سید حسام الدین راشدی ہی سے روشنی اور تعاون ملا ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بھنگ اور چرس بھی چلتی دیکھی اور آگ کے بڑے الاؤ پر طواف اور دھمالی رقص بھی ملا، جس میں ایک کیفیت کی طرف تو دل ڈھوکتا تھا لیکن شرعی پابندیاں قدم گیر تھیں، میں آج بھی ان شرعی پابندیوں کو شکست کرنا گناہ عظیم خیال کرتا ہوں۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جو بزرگان دین آئے انہوں نے زبانی تبلیغ تو کی جس کا ثبوت چاروں طرف مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں موجود ہیں اور سندھی میں ہزاروں عربی کے الفاظ روزمرہ میں شامل ہیں۔ مثلاً جبل (پہاڑ) تفاوت (فرق) وغیرہ یہ سب عربی سے سندھی میں آئے ہیں لیکن یہاں کے لوگوں نے شاید سندھی زبان کی تنگ دامانی کے باعث تصنیفی و تالیفی صورت

میں بہت کم نقوش چھوڑے ہیں شاید اس وقت کی سندھی زبان اجنبیت کے احساس سے دینی تعلیم کی متحمل نہیں ہوسکی' ہاں زبانی تبلیغ بہت ہوئی جس کے آثار قدم قدم پر ملتے ہیں۔

راستے میں سیکڑوں ہزاروں میروں کے قبے نظر سے گزرے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس سرزمین کے صاحب ثروت لوگوں نے علمی ادبی اور یادگاروں کی جگہ یہ کنکروں اور پتھروں اور اعلیٰ نقش و نگار سے اپنی یادگاریں قائم کر کے زمین کے سینے کو خواہ مخواہ ملبے سے گرانبار کر دیا ہے۔

لیکن اس سفر میں ایک مقام مَیاری ایسا بھی نظر سے گزرا جہاں مسجدوں کے ہجوم نے قبوں کی بہتات کو دبا رکھا تھا' یہ گاؤں تو مختصر سا ہے لیکن اس میں مسجدوں کی تعداد یہاں کے باشندوں کے عقائد و اسلامی معاشرے کا پتہ دیتی ہے۔ میں نے اس گاؤں کی فضا میں پاکیزگی اور ہوا میں ٹھنڈک محسوس کی جیسے کیوڑے کی خوشبو سے گزر رہا ہوں' میں نے ٹھٹھے کے علاوہ چوکھنڈی کا قبرستان بھی دیکھا جو تاریخی اعتبار سے بڑا تحقیقی مضمون دے سکتا ہے۔ لیکن میروں کے قبوں سے حالات و حادثات مترشح نہیں ہوتے ہاں ٹھٹھے کے گورستان میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب کے مزار اور اورادو اشغال اور ذکر و اذکار سے قطع نظر ان کا روحانی فیض ضرور محسوس کیا اور بالکل اسی طرح عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر فضا اور ماحول میں پاکیزگی اور تقدس کی نرمی عود و عنبر کی خوشبو میں روحانی توانائی پائی ہے' حضرت عبداللہ شاہ غازی نے جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کے لیے زبان کھولی اور شاہی پر خدائی احکام کو مقدم جانا تھا جس کا صلہ یہ ہے کہ ان کی قبر بھی آج مرجع خلائق ہے ورنہ جابر حکومت کے سامنے رعایا بزدل ہو جاتی ہے اور کسی کی کوئی حمایت اور امداد نہیں کرتا' ہر آدمی اپنی سلامتی کے لیے سوچتا ہے کہ کیوں کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑائی جائے۔

شام کو قیام گاہ پر پہنچے انوار بیگ[1] صاحب نے ایک چار بیت کی محفل برپا کر دی چار بیت کو سنے زمانہ گزر چکا تھا کیونکہ یہ تو رام پور' بھوپال اور ٹونک میں رائج تھی۔ اس سے مسرت ہوئی کہ آج

۱۔ انوار بیگ صاحب چوڑی کے تاجر ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں مگران کے شعر کا مفہوم وحدت الوجود کے معروف گوشوں پر تیرتا ہے۔ میں ان کے شیخ طریقت ابوظفر صاحب سے بھی ملا ہوں۔ وہ نہایت سنجیدہ قسم کے بزرگ ہیں اور ساتھ ساتھ تو پیری مریدی بھی چلی آ رہی ہے۔ مگر ان کی وحدانیت کی تعلیم و تربیت کے علاوہ روحانی فیض میں شدت اور تاثر نہیں ابھر پاتا۔

تجدید کیف ہو جائے گی' یہ چار بیت کا جادو جگانے والے فنکاران لوگوں سے بلند ہیں جو اپنی آواز' فن اور عزت نفس کو چند سکوں یا شام کے ایک دو شراب کے جھوٹے پیالوں کے عوض بیچ ڈالتے ہیں اور عدل و حق کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ دھوم دھڑ کے اور قوت کے سائے میں قدرت کے ان عطیات و انعامات کی توہین و تذلیل کرتے ہیں جو انہیں ودیعت کیے گئے ہیں شہر کے کئی معززین اس بکاؤ مال کو پہچانتے اور حکام اس بے حرمت جنس کو تاکتے رہتے ہیں وہ ان شاعروں اور مغنیوں کو مہمانوں کی تفریح اور حکام بالا کی خوشنودی مزاج کے لیے اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے دیہات کے زمیندار اپنے بیل' گھوڑے' مرغ اور پالتو کتے نمائش گاہوں میں بھیجتے ہیں اس قسم کے فنکار ادبی دنیا کی تعریف اور تنقیص دونوں میں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں اس خسارے کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود بھی اونچے درجے کے لوگ نہیں ہوتے اس لیے خود کو پست اور کمینے لوگوں سے بلند نہیں کرتے لیکن اصل فنکار اس ماحول پر موت کو ترجیح دیتے ہیں اور کمینگی کی ہمسائیگی بھی قبول نہیں کرتے ان کے نزدیک وہ وقت فنکار کی جانکنی کی گھڑی ہوتا ہے جب ان کے گرد جمع ہونے والے سامعین سکوں کی جھنکار' ساغر کی کھنک اور فائلوں کی دھر پٹک کے علاوہ کسی آواز کی خوبی اور خرابی سے آشنا نہیں ہوتے۔

استاد مصطفی خان اور نصیر خاں کی یہ دونوں چار بیت کی پارٹیاں ان عیبوں سے پاک تھیں ان میں کوئی دکاندار تھا' کوئی چوڑی گر کوئی بیڑی بناتا تھا اور کوئی نجی فرم میں منیمی کر رہا تھا' ان کے دفوں کی آوازوں کے ساتھ ان کی آنکھیں بلندی پر ٹکٹکی لگا لیتی تھیں جیسے وہ کسی آسمان کی غیر مادی قوت کو مخاطب کر رہے ہوں اور ان کا یہ والہانہ انداز ایسا تھا کہ سبحان اللہ! انہوں نے جو چار بیت سنائے ان میں کئی تو جناب انوار بیگ صاحب کی کاوش قلم تھی اور کئی دوسرے شعراء کی انوار بیگ صاحب کے اشعار ان کے مشرب کی ترجمانی کرتے تھے ان کے الفاظ میں ان کے سینوں کا خلوص اور آواز کا سوز جھلکا دیتا اور ساحریت بھر رہا تھا' مجھ پر تو ایک کیفیت طاری ہو گئی اور ان کی موسیقی کی رفتار سے آنسو بہنے لگے۔ اتفاقاً میری نظر معاً محفل کے ایک گوشے پر پڑی تو صغیر عالم گھڑی دیکھ رہے تھے شمعون عالم اور عزیز فہیم اختر کی نیند میں ڈوبی ہوئی پتلیوں کا گلاپن پپوٹوں کو بھاری کیے ڈالتا تھا اس سے مجھے بھی وقت کا خیال آیا مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئے رات کے دو بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور میں

نے اپنی روح میں ہلکا پن محسوس کیا' کلام کی تاثیر کو ان دفوں کی تھاپوں اور ٹکوروں نے جان لیوا کر رکھا تھا اس لیے تمام محفل پر ایک اثر تھا اور ایک کیفیت جو ہر محفل میں میسر نہیں آتی - ان فنکاروں نے اس محفل کا اختتام اس پاکیزگی اور خوش اسلوبی سے کیا اور اس طرح اٹھے جیسے مراقبے سے اٹھے ہوں یا حلقے سے فارغ ہوئے ہوں-

دونوں استاد اور پارٹی کے لوگ اس لیے خوش تھے کہ انہیں سلیقے کے سامعین مل گئے تھے ورنہ جب فنکار اور اس کے گر فن کے جانچنے پرکھنے والے نہ ہوں تو پھر فنکار کو اپنی بدقسمتی کا یقین آنے لگتا ہے-

ایک حادثہ

زیادہ دن نہیں گزرے کہ میرے ایک کرم فرما منیر[1] صاحب کو ان کے چند دوستوں نے ایک جگہ مدعو کیا جو یہ جانتے تھے کہ منیر صاحب کو رقص و نغمہ میں مہارت حاصل ہے انہوں نے کہا آج یوم مئی ہے اس خوشی میں آپ اپنے رقص و نغمہ کا کمال دکھائیں -- ایک دفعہ تو منیر صاحب گھبرا گئے کہ یہاں لا کر تقدیر نے ہاتھ چھوڑ دیا ہے مگر ''قہر درویش بر جان درویش'' منیر صاحب نے گردو پیش پر نظر ڈالی اور جس سطح کے سامعین تھے اسی سطح کا راگ شروع کر دیا' جب وہ پسینے میں شرابور ہو گئے تو رقص کرتے کرتے دروازے کے قریب گئے اور جلدی سے زنجیر کھول کر بھاگ نکلے جیسے کوئی ہرن شکاری کتوں کو دیکھ پائے-

جب وہ غریب خانے پر پہنچے تو ان کے سینے میں سانسوں کی آمد و رفت گھر گھراہٹ دے رہی تھی وہ آتے ہی گاؤ تکیے کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر کے غنودہ سے ہو گئے اور بڑی دیر میں بتایا کہ آج گوہر گنیش قسم کے قدر شناسوں میں پھنس گیا تھا جن کی زبانیں آہ و واہ دونوں سے نا آشنا تھیں ان کی بلا جانے کہ موسیقی اور اس کے آداب کیا ہوتے ہیں' میں مجبوراً وہاں اپنے فن کو سنگ خشت کے ملبے میں دفن کرتا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ ان کی زبانیں تو آہ و واہ دونوں کے لیے نہیں بنیں تو میں موقع پا کے بھاگ آیا - یہ دکان پر توند پھلا کے بیٹھنے والے رقص و نغمہ کے سلوتری کیسے ہو سکتے

۱- منیر صاحب بنارس کے رہنے والے ہیں اور چل پھر کر بناری کپڑے کی تجارت کرتے ہیں-

ہیں- وہ تو دن دہاڑے لوگوں کے کیسوں سے مال نکالنے میں مشتاق ہیں-اور بیوی بچوں کے لیے بھی بجٹ بناتے ہیں غالباً یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت میں فاجروں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے- ایسے لوگوں میں فن کا اظہار اندھوں کے آگے اپنے زخموں سے پھاہے اتارنا ہے- جہاں فنکار کو اس قسم کے نااہل گھیر لیں تو فنکار کا فن نکسیر کے خون کی طرح ضائع ہو جاتا ہے-اس کی رگیں تھک جاتی ہیں اور وہ روحانی تشنج میں مبتلا ہو جاتا ہے- یہ بھی تجربہ ہے کہ جو لوگ فنکاروں کو آلہ تفریح کے طور پر استعمال کرتے ہیں وہ بڑھتے ہوئے صاحب فہم و ادراک کو ذلت اور پستی میں دھکیلنے کی فکر میں رہتے ہیں -وہ اپنی شہرت اور اقتدار کے منارے تو بلند کرتے رہتے ہیں لیکن قابل اعتماد نہیں ہوتے تو تا چشمی ان کی فطرت ہوتی ہے اور دوسروں کے علم و فن کی توہین ان کا پالیسی میٹر قرار پاتا ہے-

خانہ بر اندازان وطن

اب کی بار جس دن فوج نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا اس وقت مسلمانوں کا یہ عالم تھا جیسے بادلوں کی برفیلی چھاؤں میں گھرا ہوا خشک باغ جس کے درختوں کی جڑیں تو ہری ہوں لیکن شاخوں سے پتے چھن چکے ہوں-

عدل و صداقت سے خالی قبضہ یا بالا دستی تپتے ہوئے صحرا میں دوپہر کا دونگڑا ہے جس سے حبس کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے-اس ملک کے عوام ایک نہیں کئی حاکم ایسے دیکھ چکے تھے جن کی ذات میں عیاری' خلوص میں خباثت' قربت میں کراہت' دوستی میں عداوت اور ناراضی میں انتقال کا کوڑھ تھا وہ بلندی دے کر جرائم کراتے تھے اور منصب سپرد کرتے ہوئے استعفیٰ بھی لکھوا لیتے جس پر تاریخ کی جگہ خالی رہتی تھی تاکہ منصب چھیننے میں آسانی رہے وہ جس سے نظر پھیرتے تھے اس کے سامنے زنداں کی سلاخیں اور زنجیروں کی گرفتیں ہوتی تھیں- ان کے مقربین کی روحیں بھی نظر دوڑاتیں تو اپنے گرد کانٹوں دار تار کا حصار پاتی تھیں جن میں بجلی کا کرنٹ موجود ہو گویا ان کے اردگرد کے لوگ بھی خود کو ایک بے دیوار کے زنداں محسوس کرتے تھے یوں سمجھئے کہ ملک جھوٹے غلط اور ملک دشمن عمال کے ہاتھوں میں گھل رہا تھا-

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ عدل، صداقت اور انسان دوستی سے لبریز بغاوت اور تشدد زندگی کا زیور ہے جو کسی بھی مرطوب موسم میں کالا نہیں پڑتا اور کسی منڈی یا بازار میں اس کا بھاؤ نہیں گرتا، اسلامی آزادی تو زندگی کا شباب ہے جو صداقت سے لبریز بغاوت پر نازاں رہتا ہے اقتدار اور آزادی اگر عدل سے روگردانی کرتے ہیں تو وہ ذات لازوال کا جوہر نہیں کیونکہ عدل تو ذات الٰہی کا منشاء ہے جو تغیرات سے سکون دوام تقسیم کرتا ہے۔

یوں تو ایوب خاں کے دور سے پہلے بھی جمہوریت کے نام پر بت کی پوجا ہوتی چلی آ رہی تھی اور جو اس شوالہ کا مہنت آیا وہ جمہوریت کے نام پر عوام کو دھوکا دیتا رہا۔ ایوب خان کا زمانہ ایسا ہے کہ جس میں مفید کام ہوئے اور سن پینسٹھ کی جنگ میں اس نے مورچوں میں راتیں گزاریں۔ لیکن یہ بہائم کا خرابہ اسے بھی برداشت نہ کر سکا، کرسیوں کے طالب اور اقتدار پسند ملک دشمن لوگوں نے اسے بھی رسوائی کی دھار پر دھر لیا وہ چونکہ باغیرت انسان تھا اس لیے شام کو ریڈیو پر آیا اور اس پوری قوم کے منہ پر تھوک کر علیحدہ ہو گیا جیسے جسم سے روح جدا ہو جائے پھر کثرت وقلت کا کاروبار اس قدر چمکا کہ شر پسند اور بے ایمان اخلاق کی تمام حدود کو عبور کر گئے اور جمہوریت جمہوریت کا شور مچتا رہا۔

اس دور کے مولویوں نے اسلام اور علم دونوں کو آلہ کار بنا لیا تھا، حالانکہ علم تو وہ ہے جو اپنے بعد فہم و عمل بھی رکھتا ہو۔ بے عمل علم تو ایک ذہنی آرائش اور کاغذی تلوار سے زیادہ نہیں اور اس بے عملی سے سیکڑوں جرم و گناہ وجود میں آ جاتے ہیں یہ نفع پسند اور ناقص علم کے مولوی اپنے گناہ و جرم کو ہاتھوں کی پشت پر ابھری ہوئی رگوں کی طرح دیکھتے تو ہیں لیکن اپنے نقائص دور کرنے اور اخلاق کی درستی کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ حرص و طمع کا کھار علم کو کھا جاتا ہے جہاں علماء وقت لالچی طامع اور ضمیر فروش ہو جائیں وہاں سینوں میں علم کے خانے خالی ہو جاتے ہیں اور چونکہ عوام علماء کے تابع ہوتے ہیں اس لیے عوام میں بھی عیاری چالاکی، خوشامد اور ریاکاری آ جاتی ہے اور جب بھی کہیں بلوہ یا دھر پکڑ کی نوبت آ جاتی ہے تو علماء کتاب و سنت کے حوالے اور آیات و واقعات بکارتے پھرتے ہیں لیکن چونکہ انکی نیتیں صاف اور ضمیر بے داغ نہیں ہوتے اس لیے ان کی آوازوں کو نامانوس ہوا کے جھونکے دبوچ لیتے ہیں، اور آواز صحیح خدوخال کے ساتھ عوام تک نہیں پہنچ پاتی اور اس سے تاثیر چھن جاتی ہے

اس ماحول کی ناہمواری کے باوصف بدکردار علماء اور علمی افلاس کے مارے ہوئے دانشور جب تباہی اور بربادی کے چکر میں آ جاتے ہیں علم ان کی کوئی مدد نہیں کرتا اور تا اندہ نفرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔

ان خام کار مولویوں اور دین فروش ملاؤں نے معاشرہ ایسا مسموم کر دیا تھا کہ عبادت گزاروں پر آوازے کسے جانے لگے تھے ان کے عقائد سے آخرت کا تصور اٹھتا جا رہا تھا اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ شخص ہے جو دنیا کے لیے آخرت بیچ ڈالتا ہے اور اس سے بھی زیادہ ٹوٹے میں وہ ہے جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت داؤ پر لگا دیتا ہے۔

اس دور کے علماء اور پیشواؤں نے قرآن کو کھونٹیوں پر لٹکا دیا تھا' وہ اپنی گمراہی کے زائیدہ نظریوں اور منصوبوں کو معتبر سمجھتے تھے اور مقصد براری کے لیے قرآن کی غلط تاویلات کو روا خیال کرتے تھے' کمزوروں کے مال پر قبضہ کرنا ان کا معمول سا ہو گیا تھا اور یہ سب تھا ان کے دلوں کا کھوٹ اور ضمیر کا اندھیر۔ میری نظر میں ایک ایسا شخص ہے جو دوستوں اور رشتہ داروں کے خون سے اپنا اور اپنے بچوں کا شباب تیار کر رہا ہے اس کی نظر میں موت ہے نہ آخرت وہ دولت ہی کو سب کچھ خیال کرتا ہے اور اولاد کو بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ تقدیر خدا نہیں انسان بناتا ہے۔ دوزخ' جنت اور آخرت کے ڈھکوسلے غلط قسم کے علماء کے اختراعات ہیں لیکن یہی شخص جب عوام سے گفتگو کرتا ہے تو قدم قدم پر بزرگان دین کے حوالے اور آیات واقوال سے سماعت کے پیالے لبریز کر دیتا ہے وہ امراء اور مرتشی حکام کا جعلی احترام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اسی سلسلے کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کی نظر میں انسان کا احترام نہیں حالانکہ اللہ نے انسان کو اسی بڑائی عطا کی ہے کہ اس کا احترام لازمی اور ضروری ہے۔ شیطان اسی بے احترامی میں مارا گیا کسی مذہب وملت میں اس اشرف مخلوق کی تعظیم واحترام سے روگردانی نہیں آئی۔ آدمی کا احترام ایک ایسا فریضہ ہے کہ اگر افراد اسے خود پر لازم نہ کریں تو معاشرہ بہائم کا خرابہ ہو کے رہ جائے کسی رخ سے بھی اس پر معاشرے کا اطلاق نہ ہو اور کوئی مظلوم میزان عدل تک نہ پہنچ سکے نہ حقدار کی حق رسی ہو کیونکہ وہ حق کی معنویت کو نہیں جانتے۔ حق تو یہاں کسی مفاد کے واجب التکمیل ہونے کے شعور کا نام ہے اس طرح حقوق وفرائض معاشرتی زندگی میں باہم مربوط ہیں۔ حقوق وفرائض کی بجا آوری پر اصرار ہی تو عمرانی حیثیت سے افراد کو منسلک کرتا ہے جس کے ساتھ اختیار وبرکات کے وجوم ہوتے ہیں مشاہدے سے یہ یقین بھی راسخ ہوتا ہے کہ

حیات عمرانی میں شخصیت کا احترام ہی تو خوشگوار ماحول پیدا کرتا ہے- کیونکہ ہر انسان اپنا احترام چاہتا ہے جب تم کسی کا احترام نہیں کرو گے تو اپنا احترام کیسے اور کس سے کرا سکو گے بے تعظیمی سے زیادہ تو دنیا میں کوئی ناخوش گوار عمل ہے ہی نہیں- میں نے جب بھی نظر دوڑائی تو یہ محسوس ہوا پوری قوم اور سارا ملک کام چور ہوتا جا رہا ہے جہاں تہاں قتل و غارت' جیب تراشی' قوم فروشی' اقتصادی جانکنی اور ملک دشمنی کے اداروں کی بنیادیں اٹھ رہی ہیں جگہ جگہ خون کے تغار بن رہے ہیں اور ہڈیوں کا چونا بکھرنے والا ہے-

عوام بے چارے زندگی کی گرد وغبار سے لدی آندھی میں گرتے پڑتے اور لوٹتے پیٹتے نظر آنے لگے تھے' لیکن زمیں بوس اس لیے نہیں ہوئے تھے کہ ابھی انہیں قاعدے کے کفن دفن کی امید نہیں تھی یہ متعفن تو ہو رہے تھے مگر اپنی بدبو سے گھبراتے نہیں تھے- ان میں کچھ زندہ جسم تھے جو اس جھاڑ جھنکاڑ کے میدان کو آندھیوں کے ساتھ عبور کر گئے تھے اور کچھ کھڑے تھرتھرا رہے تھے-

ایک درِ بے بہا

ایک دن میں اپنے دوست حبیب اللہ خاں سعدی اور اشفاق علی خان کے ہمراہ جا رہا تھا میکلوڈ روڈ پر موتی مینشن کے قریب پہنچ کر اشفاق علی خان نے حبیب اللہ خان سعدی سے کہا کہ بھائی احسان دانش کو ڈاکٹر سے ملا دیا جائے۔

میں نے پوچھا ''کون ڈاکٹر؟'' اشفاق نے کہا کہ ایک باکمال اور غریب الوطن انسان ہے۔

میں: باکمال کس فن میں ہے؟ ڈاکٹری میں؟

اشفاق علی: ارے بھائی ایک مدت جرمنی میں سائنس کا پروفیسر رہا ہے۔ اب پاکستان بنا تو حب الوطنی اسے یہاں لے آئی کچھ دنوں وہ سندھ میں کسی اچھے عہدے پر مامور رہا۔ پھر چونکہ وہ نیک انسان ہے اور اس کے یہاں رشوت وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس قسم کا انسان یہاں ہر محکمے کے لیے ناقابل برداشت ہے' چنانچہ وہاں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ آج کل ایک معمولی سی دکان میں عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ عجیب وغریب انسان ہے تم ملو گے تو خوش ہو گے'' میں نے کہا۔ پھر تو ضرور چلو۔

ڈاکٹر عمر علی خان مجھے دور سے دیکھتے ہی چلایا ''ارے احسان صاحب! تم یہاں لاہور میں کہاں؟'' میں خاموش رہا کہ یہ کون شخص ہے جو بیک نظر میرا نام لے کر پکارا تھا۔''

ڈاکٹر: ارے میاں آپ کو کب یاد ہوگا؟ آپ جب عثمانیہ یونیورسٹی میں گئے تو میں وہیں موجود تھا۔ پھر جب آپ ڈاکٹر زور کے یہاں ان کی کتابیں دیکھ رہے تھے تو برابر کی کرسی پر میں ہی بیٹھا ہوا تھا' مگر آپ ہم جیسے غریب لوگوں کو کہاں یاد رکھتے ہیں اور اس بھول میں آپ حق بجانب ہیں آخر کہاں تک یاد رکھیں نہ جانے کتنے انسان آپ کی نظر سے گزرتے ہیں اور کس قدر مداح سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر کی اس گفتگو سے ذرا ندامت سی ہوئی اور میں نے خود کو ملامت کی کہ ایسے اچھے انسان سے ملا اور صورت یاد نہ رکھی' ڈاکٹر نے میری معذرت سے پہلے کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا'

جس دکان یا کمرے میں وہ مقیم تھے اس میں ایک طرف تو ڈاکٹر کی معمولی سی چارپائی تھی ایک طرف چھوٹی سی انگیٹھی اور چائے کا بنڈل' مٹی کے تیل کی بوتل اور پچکی ہوئی دیا سلائی کی ڈبیا' ایک کرسی اور میز' میز پر چھوٹی بڑی بے شمار بوتلیں اور شیشیاں جو اس کی لیبارٹری تھی۔

گفتگو اس قدر دلچسپ کہ سنئے تو سنتے ہی رہیے' فقرے فقرے میں معلومات کے ذخائر بے تکلفی گستاخی کی حدوں تک' لیکن ہر بات شعور اور دانائی سے مالا مال۔ ڈاکٹر نے فوراً نوکر سے چائے کے لیے کہا' تھوڑی دیر میں چائے آ گئی اور سب نے مل کر پی' اس دوران میں ڈاکٹر نے تین چار بار کہا ''احسان صاحب! دیکھیے اب آپ روز آئیں گے۔'' میری طبیعت گھبراتی ہے یہاں' ذرا آپ آ جایا کریں گے تو دل لگی رہے گی۔ دوسرے روز دوپہر کو میں گیا تو ڈاکٹر اور نوکر دو بدو ہو رہے تھے۔ مجھے دور سے آتا دیکھ کر جلدی جلدی نہ جانے کیا گفتگو کی اور ڈاکٹر نے اپنا کمل تہ کر کے اس کے اوپر پھینک دیا اور نوکر کمل لے کر باہر نکل آیا' تھوڑے فاصلے پر مجھ سے مڈ بھیڑ ہوئی تو میں نے نوکر سے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' نوکر نے کہا ''جناب بغیر تنخواہ کب تک ملازمت کرتا' نوکری چھوڑ آیا ہوں اور تنخواہ کی رقم میں یہ کمل لے آیا' میں نے کہا ''اس نے کمل کیوں دے دیا؟'' نوکر نے بڑے ذلت آمیز لہجے میں کہا اس کے پلے مال کہاں؟ میں تو سمجھا تھا اس کے پاس پیسے ہوں گے تو کچھ دنوں گزارا ہو جائے گا۔ وہ تو ننگا ہی نکلا چلو اتنا تو ہوا' کمل ہی سہی۔ کچھ مل تو گیا۔

نوکر کی گفتگو سے مجھے ڈاکٹر کے افلاس کا پتا چلا کہ وہ غربت اور افلاس دونوں میں مبتلا ہے اور پیسے پیسے کو تنگ ہے۔ میرے قدم گڑ گئے' میں سوچنے لگا' حالات تو یہاں اپنے بھی اچھے نہیں لیکن اس قدر برے بھی نہیں پہلے تو خیال کیا کہ اسے یہاں سے اٹھا کے اپنے گھر لے چلوں اور اپنے بزرگ کی طرح اس کی خدمت کروں' لیکن پھر خیال آیا کہ مکان کی تو ڈاکٹر کو تکلیف نہیں تکلیف تو چائے اور کھانے کی ہے' اس کا کچھ بندوبست کیا جائے' میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر اٹھ کر لپٹ گیا اور اس خندہ پیشانی سے باتیں کیں کہ دل کی کیفیت چہرے سے نمودار نہ ہونے پائے' میں بہانے سے اٹھا اور ہوٹل میں چائے کا آرڈر دے آیا' ساتھ ہی بل بھی ادا کر آیا اور پھر وہیں آ بیٹھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہاں گئے تھے؟ میں نے کہا چائے پی کر نہیں آیا تھا اس لیے چائے کے لیے آرڈر دے کر آیا ہوں۔ ڈاکٹر نے تیوری چڑھا کر کہا' مجھ سے کیوں نہیں کہا؟ میں نے کہا مجھے ضرورت تھی میں نے انتظام

کرلیا' اس میں کیا بری بات ہوگئی؟ ڈاکٹر ''اچھا'' کہہ کر خاموش ہوگیا- اتنے میں چائے آ گئی اور بڑے خوش کن ذکرواذکار کی فضا میں پی گئی-

دوسرے روز سے میں نے صبح کی چائے اور دوپہر کا کھانا ڈاکٹر کے ساتھ شروع کردیا' گھر سے روز ناشتہ دان اٹھاتا اور ڈاکٹر کے یہاں جا براجمان ہوتا' ڈاکٹر کھانا تو کھاتا لیکن کبھی کبھی اس کے لہجے سے اس کے دل کا درد ضرور ٹپکنے لگتا اور میں چپکے چپکے دل میں ایک ایسی میٹھی آنچ محسوس کرتا جو آنسوؤں کو دل سے آنکھوں کی طرف اچھال دیتی ہے-

اس افلاس کی گرفت اور کرب کی شدت کے باوجود ڈاکٹر کی جگرداری اور مردانہ پن اسی طرح قائم تھا- وہ غیرت مند زندگی بسر کرنے کا عادی تھا' ناداری کے شکنجے میں ہونے کے باوجود وہ غیرت [illegible] کو ہر قیمت پر برقرار رکھتا تھا وہ روز مجھے اپنا اور اپنے فن کا کوئی نہ کوئی کرشمہ ضرور دکھاتا اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی- ایک دن اس نے سپرٹ کے بجائے برساتی پانی سے سینٹ بنایا اور وہ اس قدر تیز اور پائدار تھا کہ ایک ہفتے تک میرے کرتے سے اس کی خوشبو آتی رہی- ان دنوں کلیم عثمانی اور ضمیر فاطمی میرے ہی خسرہ میں تھے اور انہیں میری قربت راس تھی- کبھی کبھی میں انہیں بھی ساتھ لے جاتا- یہ بھی ڈاکٹر عمر علی اور اس کے فن کے مداح ہوگئے تھے' انہیں دنوں پاکستان گورنمنٹ نے دس روپے والا گہرے گلابی رنگ کا نوٹ نیا نیا جاری کیا تھا' اور دانہ دار کاغذ کے باعث یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جعلی نہیں بن سکتا' میں جب ڈاکٹر کے پاس گیا تو دس روپے کا نیا نوٹ ڈاکٹر کو دکھایا اور کہا ''سنا ہے یہ جعلی نہیں بن سکے گا-'' یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر نے نوٹ پر ایک ہلکی سی چٹکی ماری جیسے کاغذ کی موٹائی معلوم کرتے ہیں- پھر بولے ''یہ تو تاش کے پتے کی طرح بنے گا! کل بنا کر دکھا دوں گا- چنانچہ دوسرے دن اس نے پیراشوٹ پر تین نوٹ چھاپ کر دکھائے اور کہا ''یہ لیجیے یہ کون سی مشکل بات تھی- یہ جرمنی کا نوٹ تو نہیں کہ جعلی نہ بن سکے-'' میں نے کہا ''کیا جرمنی کا نوٹ جعلی نہیں بن سکتا؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟ ڈاکٹر نے ایک پانی جیسی سیال دوا میں ایک کاغذ کو تر کر کے دھوپ میں رکھ دیا اور خشک ہونے کے بعد اس پر اپنی ربڑ کی مہر لگا دی' پھر مجھے حکم دیا کہ ذرا باہر جا کر اس کا ایک فوٹو اتروا لائیں ضرورت ہے میں بازار گیا اور ایک فوٹوگرافر سے فوٹو اتارنے کے لیے کہا فوٹوگرافر نے تین بار اس کا فوٹو لیا مگر فوٹو نہیں آیا' ہر دفعہ پلیٹ کالی ہوجاتی تھی- آخر اس نے یہ کہہ کر واپس کردیا

کہ اس کا فوٹو نہیں آتا' کاغذ کچھ خراب معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ڈاکٹر سے جا کر کہا کہ اس کا فوٹو نہیں آیا' اس بیچارے کی تین پلیٹیں خراب ہوئیں' آخر ہار کے واپس کر دیا' ڈاکٹر مسکرایا اور کہنے لگا' ہاں ٹھیک ہے آپ کو یہی بتانا مقصود تھا کہ اس کا فوٹو نہیں آتا جرمنی میں جو نوٹ بنتا ہے اس کا کاغذ پہلے اس سیال میں بھگولیا جاتا ہے جس میں میں نے یہ کاغذ کا ٹکڑا تر کیا تھا اس کے بعد نوٹ چھپتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوٹ کا فوٹو نہیں آ سکتا اور فوٹو نہیں ہو سکتا تو بلاک نہیں بن سکتا۔ اس صورت میں جعلی نوٹ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا آپ نے جب پاکستانی سکونت اختیار کر ہی لی ہے تو اپنی اسکیم کے متعلق گورنمنٹ کو کیوں نہیں لکھتے؟ لیکن وہ شخص کچھ افسران بالا کے رویے سے اس قدر دل برداشتہ تھا کہ ہر امید شکست کر بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود میرے اصرار پر اس نے پیراشوٹ پر چھپے ہوئے دو نوٹ اور اپنی اسکیم جس سے جعلی نوٹ نہیں بن سکتا' ایک درخواست نما تجویز کے ساتھ کراچی بھجوا دی کلیم نے بھی اپنے ایک رسالے میں اس کا اشتہار دیا تھا۔ لیکن کراچی سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ آیا۔ کچھ روز کے بعد پاکستان کا ایک ہوائی جہاز وہاڑی کے مقام پر گرا اور آگ لگ کر تباہ ہو گیا۔ سواریاں ایسی جلیں کہ صورتیں تک نہ پہچانی گئیں میرے ہندو دوست مرلی دھر شاد اپنی اہلیہ سمیت اور جناب یکتا دہلوی بھی اسی میں کام آئے۔ میں نے بھی مرلی دھر شاد کے لیے ایک غزل میں یہ شعر بھی کہا تھا۔

ہندو ہے ایک قلب مسلماں لیے ہوئے

اور اس کا ثبوت اس طرح ملا کہ جلی ہوئی لاشوں کو جب ورثاء نے اندازہ سے نکلوایا تو غلط فہمی میں مرلی دھر شاد کی لاش پر نماز جنازہ پڑھ دی گئی' جب سب سلام پھیر کر دعا مانگ چکے تو اس وقت معلوم ہوا کہ یہ لاش تو مرلی دھر شاد کی تھی' جب یہ خبر مجھ تک پہنچی تو مجھے مسرت ہوئی کہ واقعی وہ اپنے ایثار اور رحم دلی کے اعتبار سے بہت بلند انسان تھے' کئی غریبوں اور بیواؤں کی لڑکیوں کی شادیاں میرے معمولی سے رقعے پر مرلی دھر شاد کے روپے سے ہوئیں اور نہ جانے انہوں نے کس قدر اجسام کو عریانی سے بچایا۔

میں نے ڈاکٹر عمر علی کو اپنے دوست مرلی دھر شاد کی موت اور پاکستان کے طیارے کی تباہی کی خبر بڑے کرب سے سنائی اور اس نے صرف یہ کہا کہ ہاں بعض دفعہ جب بلندی پر نااہل لوگوں کی
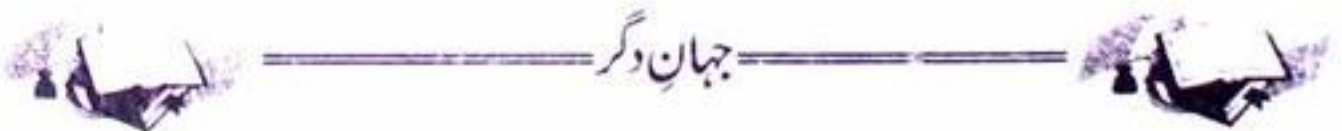
افراط ہو جاتی ہے تو اکثر شرفاء کی زندگیوں اور عصمتوں کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے؟

ڈاکٹر: کیا میرے اور آپ کے افسوس سے یہ لوگ راہ راست پر آ جائیں گے؟

میں: کون لوگ؟

ڈاکٹر: عمال حکومت

میں: اس میں عمال حکومت کا کیا قصور ہے؟

ڈاکٹر: احسان صاحب! جہاں ڈاکٹر او-اے خان ہو وہاں ہوائی جہاز میں آگ لگ جائے میں تو شرم سے گڑا جار ہا ہوں' میرے، جرمن دوست کیا کہیں گے؟

میں: کیا جرمنی کے جہاز میں آگ نہیں لگ سکتی؟

ڈاکٹر: ہرگز نہیں لگ سکتی اور معمولی خرابیاں ہوں تو انہیں مکینک فوراً درست کر لیتے ہیں- جان کا نقصان ہوتا ہے تو بہت کم' ہر سپاہی نہیں ہر آدمی پانچ پانچ سات سات کام جانتا ہے-

میں: یار ڈاکٹر! بے وقوف بنانے کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ لاہور میں اور کوئی نظر نہیں آتا! کیا یہ ممکن ہے کہ ہوائی جہاز برف میں تبدیل ہو جائے اور آگ نہ لگے؟

ڈاکٹر: آپ ہی نہیں یہاں کا ہر آدمی بیوقوف معلوم ہوتا ہے- خصوصاً ارکان حکومت آپ لوگ سائنس کو کیا جانیں؟ یہاں تو سائنس کی ہوا بھی نہیں آئی - دیکھیے میں آپ کو سمجھاؤں' عمر علی خاں اپنی میز پر سے ایک خالی پیالی اور تین چار دوسری شیشیاں اٹھا لایا اور پیالی میں پیٹرول ڈال کر بولا دیکھیے یہ پیٹرول ہے نا؟ میں نے سونگھ کر اور انگلی ڈبو کر دیکھا تو وہ واقعی پیٹرول تھا' میں نے کہا ہاں پیٹرول ہی ہے' ڈاکٹر نے اس پیٹرول میں ایک گلابی رنگ کا سفوف حل کر دیا اور مجھ سے کہا کہ اس پیٹرول میں آگ لگاؤ' میں نے آٹھ دس دیا سلائیاں پھونک کر ختم کر دیں لیکن پیٹرول میں آگ نہ لگی' میں حیران تھا کہ پیٹرول اور آگ نہ پکڑے' کمال ہے' ڈاکٹر نے بڑے طنزیہ لہجے میں زور سے کہا ''جناب یہ پانی ہو چکا ہے پانی - پیٹرول نہیں رہا- اب دیکھیے! یہ کہہ کر اس نے ایک سفید رنگ کی ٹکیا غیر سوختنی پیٹرول میں چھوڑ دی- اس ٹکیا کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بلبلے سے اٹھنے لگے' اور آہستہ آہستہ وہ حل ہو گئی اب ڈاکٹر نے دیا سلائی کی ڈبیا میری طرف پھینکتے ہوئے کہا اب دیا سلائی دکھایئے- اب یہ پیٹرول ہو گیا ہے' میرا دیا سلائی دکھانا تھا کہ پیٹرول نے بھک سے آگ پکڑ لی-

ڈاکٹر نے کہا ہمارے (یعنی جرمنی) جہازوں کے ٹینک میں غیر سوختنی پیٹرول بھرا رہتا ہے اور جس نالی سے انجمن میں آتا ہے اس نالی کے سرے پر یہ دوا لگی ہوئی ہوتی ہے جس کی یہ ٹکیا تھی جو میں نے بعد میں پیٹرول میں ڈالی چنانچہ جو پیٹرول نالی کے منہ سے گزر کر انجمن میں داخل ہوتا ہے۔ وہ پیٹرول بن جاتا ہے یعنی سوختنی ہوتا جاتا ہے اور جو ٹینک میں ہوتا ہے وہ پانی کی طرح غیر سوختنی رہتا ہے اب بتایئے آگ کے لگنے کا امکان کتنے فیصد رہ گیا؟ میں اور میرے ساتھی ششدر رہ گئے اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یہ تو بڑا ہی باکمال انسان ہے اور ہمارے ملک کو ایسے انسان پر فخر ہونا چاہئے۔ یہ تو پورے ملک کی قیمت کا اکیلا آدمی ہے۔ عمر علی اکثر کہا کرتا تھا کہ میری ناک میں بارود کی بو اور کان میں دھماکے آتے رہیں تو میں ایک ماہ تک کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں کیونکہ میرا فن میری زندگی ہے' یہ تھا ڈاکٹر کا جنون فن۔

ایک دن ڈاکٹر بولا ''لو بھائی آج ایک اور تماشا دکھائیں تمہیں۔''

میں: جی کیا تماشا؟

ڈاکٹر: ایک چیز جو آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے کیا وہ بارود کی طرح پھر بھی بھک سے اڑ سکتی ہے؟

میں: راکھ بھی کہیں بھک سے اڑی ہے؟

ڈاکٹر: جی ہاں دیکھیے۔

اس نے ایک بلاٹنگ پیپر کا اچھا خاصا بڑا ٹکڑا لے کر ایک سیال میں تر کیا اور دھوپ میں رکھ دیا جب وہ سوکھ گیا تو اس میں آگ دے دی اور وہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اب ڈاکٹر نے کہا دیکھیے یہ راکھ ظاہر ہے کہ آگ سے گزر کر بنی ہے' لیکن اگر اس کو آگ دی جائے تو یہ بھی بارود ہے۔ چنانچہ جب اس نے خاکستر کو دیا سلائی دکھائی تو بھک سے اڑ گئی اور ہم لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اس نے مجھے اپنے سائنسی ایجادات کے اس قدر کرشمے دکھائے کہ میں اس کی ناممکن بات کو بھی ممکن جاننے لگا تھا اور اس کی ناقدری سے میری روح اس قدر بے چین تھی کہ بعض اوقات ہم دونوں کے پاس جب پیسا نہ ہوتا تو مجھے اپنا تو کوئی غم نہ تھا لیکن ڈاکٹر کی ناہوت پر دل ایک قسم کا کرب سا محسوس کرتا۔

ایک دن اس نے ایک بارود بنائی اور کہنے لگا' چھ ماشے بارود ڈھائی ٹن کا دھماکہ دے گی' کہو تو

اس لکشمی مینشن کو اڑا دوں؟

میں: جناب مجھے یقین ہے مگر اس پر مصارف کیا آئیں گے؟

ڈاکٹر: ایک پاؤ پر دس بارہ آنے

میں: ہیں؟ دس بارہ آنے؟

ڈاکٹر: جی ہاں دس بارہ آنے سرکار!

میں: تو پھر ڈاکٹر اس کا اسٹاک کر لو' بارود بنانے کی درخواست دے کر اجازت لے لو' ممکن ہے کبھی کام آئے۔''

نہ جانے مجھے اس سے اتنی محبت کیوں تھی اور وہ بھی بحث و تمحیص کے بغیر میری ہر بات تسلیم کر لیتا تھا۔ چنانچہ بارود بنانے کے لیے درخواست دے دی! میں ایک مشاعرے میں چلا گیا اور پندرہ دن میں آیا دیکھا تو ڈاکٹر کا کمرہ بند ہے' خیال ہوا کہ کہیں بازار وغیرہ گیا ہوگا' دوبارہ گیا' سہ بارہ گیا مگر کوئی پتہ نہ چلا' میں نے سمجھا کہ حبیب اللہ سعدی کے ہمراہ کمالیہ چلا گیا ہے یا پھر اشفاق علی خاں کہیں لے گئے' یہ سوچ کر اچھا ہے اس کا دل بہل جائے گا اور کچھ مفلسی کا زمانہ بھی گزر جائے گا' میں خاموش ہو گیا۔

تیسرے چوتھے دن عمر علی خان کا ایک خط موصول ہوا کہ میں جیل میں ہوں' مجھ سے مل جاؤ' میرے تو پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ میں جیل میں ملنے گیا اور اسیری کا سبب دریافت کیا اس نے صرف اس قدر بتایا کہ ایک تھانیدار آیا اور مجھ سے بارود بنانے کی جگہ کا پوچھا' میں نے کہا' اسی دکان میں بناؤں گا۔ اتفاق سے سامنے بارود بنی رکھی تھی۔ اس نے کہا یہ کیوں بنائی؟ جب اجازت ابھی نہیں ملی تھی' میں نے کہا پھینک دیتا ہوں چنانچہ میں نے اٹھا کر نالی میں جھونک دی' تھانیدار مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا اور مجسٹریٹ مجھ سے بدزبانی سے پیش آیا' میں نے بھی ذرا سا اسے سخت سست کہا اور اس نے مجھے جیل بھجوا دیا' اب یہاں مجھ سے جیل والوں کا سلوک کوئی اچھا نہیں۔ اب کل سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر پرسوں کراچی لے جائیں گے' اگر یہی عالم رہا تو میں مر جاؤں گا' دوسرے دن میں نے اپنی سی کوشش کی' لیکن روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہا۔ اسی اثناء میں مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ اور ایک ہفتہ کے بعد آیا' آتے ہی میں ڈاکٹر سے ملنے جیل گیا' معلوم ہوا کہ وہ

قیدی تو مر گیا ہے۔

میں:　　کب؟

کئی روز ہو چکے ہیں میری نظر میں اس صاحب کمال کی موت ایک ایسا خواب ہے جو ٹوٹتے رہنے کے باوجود نظر سے اوجھل نہیں ہوتا اور تعبیر کا منتظر ہے' آج مجھے عمر علی کی قبر کا بھی پتا نہیں اور میرے ملک کو اس کی اشد ضرورت ہے۔

خواب ہو کر رہ گئی ہیں کیسی کیسی صحبتیں
داغ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا

(احسان دانش)

ایک افیونی

ایک دن میں گیلانی بک ڈپو میں ایک کتب فروش سے کچھ باتیں کر رہا تھا ایک ملگجے رنگ کا اترتی سی عمر کا انسان آ کر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ اچور کی طرح سوکھا سوکھا سا تھا اور لباس کے اعتبار سے نچا کھسٹا اس اصل مرغ کی طرح جو کئی پالیاں لڑ چکا ہو کہنے لگا ''کوئی کام ہو تو مجھے ضرورت ہے۔''

میں نے پوچھا ''آپ کیا کام جانتے ہیں۔'

وہ بولا'' لکھنا پڑھنا' ترجمہ' ٹائپ' انگریزی اردو دونوں!''

میں ''ترجمہ آپ کس زبان میں کریں گے''

وہ ''میں انگریزی اردو' فارسی' عربی اور ہندی سے بخوبی واقف ہوں اور ہر زبان سے ہر زبان میں ترجمہ کر سکتا ہوں۔ اکاؤنٹس کا کام بھی کر سکتا ہوں اور بی اے ایم اے تک کو ٹیوشن بھی۔''

میں نے پوچھا ''تنخواہ کیا لیں گے جناب؟

وہ بولا ''چھ آنے روز لوں گا ماہانہ تنخواہ پر کام نہیں کروں گا۔''

میں ''چھ آنے روز کے علاوہ کوئی اور شرط؟''

کہنے لگا ''اور کوئی شرط نہیں چھ آنے میری خوراک کو بہت ہیں' مسجد میں سو جاتا ہوں۔'' میں سوچنے لگا الٰہی یہ کیسا انسان ہے کہ چھ آنے یومیہ پر اس قدر مطمئن ہے۔

میں نے کہا ’’جناب آپ کے قابل کام تو میرے پاس نہیں آپ ویسے ہی دو چار روپے لے جائیں اس نے کہا ’’میں خیرات کو گناہ خیال کرتا ہوں مجھے آپ اس کرم سے معاف رکھیں۔‘‘

میں ’’جناب یہ خیرات نہیں یہ تو آپ کی نذر ہے نذر۔‘‘

وہ بولا ’’نذر تو پیروں فقیروں کو دیتے ہیں میں ان میں سے نہیں۔‘‘

میں نے کہا ’’اچھا اچھا اوپر کتابوں کا ایک بنڈل رکھا ہے وہ اتار لائیں۔‘‘ وہ فوراً زینے پر چڑھا اور بنڈل اتار لایا تھوڑی دیر ہوئی تھی وہ پھر بولا ’’اور فرمایئے کیا کروں۔‘‘

چونکہ ہر راز کی جستجو میں ایک لطف ہوتا ہے اس لیے میں نے کہا۔ ’’آپ تشریف رکھیں میں چائے منگاتا ہوں۔‘‘

وہ بولا ’’مجھے آپ کے ساتھ چائے پینے سے کیا خوشی ہو سکتی ہے؟‘‘

میں نے کہا ’’مجھے تو آپ کے ساتھ چائے پی کر مسرت ہو گی اگر آپ میری خوشی کو قبول نہیں کرتے تو اچھا میں نے جیب سے نکال کر تین روپے پیش کر دیئے اس نے میری طرف بڑی تیکھی اور گرم نظروں سے دیکھا اور اس میں سے ایک روپیہ لے کر چل دیا اور اس کا آخری فقرہ یہ تھا ’’بس اتنے ہی کی ضرورت ہے‘ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

کچھ دنوں بعد میں نے دیکھا کہ دفتر ’’اخبار تعلیم‘‘ میں وہی شخص عربی کا ایک مسودہ سامنے لیے بگٹٹ ترجمہ کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر نہ کوئی انہماک تھا نہ پریشانی! ذرا فاصلے پر ایک صاحب جو کرسی پر بیٹھے تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ ’’ان صاحب کو آپ نے کتنے پر ملازم رکھا ہے۔‘‘

انہوں نے جواب دیا ’’چھ آنے روز پر‘‘

میں نے عرض کیا ’’جناب کیا یہ ظلم نہیں ہے ایسے قابل آدمی کی آپ نے یہ قیمت لگائی انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا ’’جناب اس سے زیادہ اس کا خرچ ہے بھی تو نہیں۔‘‘

میں نے پوچھا ’’چھ آنے میں اس کا کیا بھلا ہوتا ہو گا۔‘‘

انہوں نے کہا ’’جناب چار آنے کی افیون دو آنے کی روٹی اور بس۔‘‘

میں خاموش ہو گیا پھر نہ جانے وہ ان کے یہاں کب تک رہا۔ اب تو میں اس کا نام بھی بھول گیا ہاں اتنا یاد ہے کہ وہ خود کو انبالے کا کہتا تھا۔

بھکر کا ایک مشاعرہ

بھکر کے مشاعرے میں جانا ہوا تو اراکین مشاعرہ کے جادو نے قرب و جوار کے تمام شعراء کو بھکر میں کھینچ لیا تھا اس علاقے کے شعراء پر شکیب جلالی مرحوم کا رنگ غالب تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکیب کے خیالات و تصورات کا عکس فانوس میں لٹکی ہوئی شیشے کی پہل دار قلموں پر پڑ رہا ہے۔ جس شاعر کا شعر سنئے نگاہوں میں شکیب کا مسکراتا ہوا چہرہ جھلملانے لگتا تھا۔

حالانکہ وہاں جناب رسا بریلوی اور جوہر ڈبائیوی جیسے کہنہ مشق شاعر بھی موجود تھے اور جہاں تک فن کا تعلق ہے۔ وہ اپنی جگہ سنگین ستونوں سے کم نہ تھا۔ لیکن زمانے کی روش اور حال کے تقاضے کو پہچاننے والے شاعروں کی نئی فصل بھی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے السی کے کھیت کے حاشیے پر پھلیوں کے چرخوں سے لدے پھندے کیلے کے جھنڈ جن میں جناب خلیل رام پوری جناب حیا' کرم حیدری' مرتضی برلاس' فیض جھنجھانوی' جناب نازش ڈیرہ اسماعیل خان' رشک صدیقی' منشاء پانی پتی' جوہر ڈبائیوی' اسد جعفری خلش' سیف زلفی' مظفر وارثی وغیرہ نمایاں رہے۔

آخر میں میاں عزیز احمد کی تقریر میں مختلف باذوق خاندانوں کے اشعار اور ان کے برمحل استعمال نے تفنن کے ساتھ تالیف قلوب کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ سامنے کے خودرنگ سامعین اور سرو و صنوبر جیسے اجسام عش عش کرنے لگے۔

مسیح موجود

اتوار کے دن میں پرانی کتابوں کی تلاش میں کباڑیوں کی دکانوں کی خاک چھانتا ہوں حسب معمول میں ایک کتب فروش کی دکان پر قدیم کتابوں کی تلاش میں کتابوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان عبدالسلام نامی نے آ کر اس طرح اپنا تعارف کرایا میں ہر اتوار کو اسی بازار میں آپ کو کتابیں الٹتے پلٹتے دیکھتا ہوں۔ آپ تو شاعر ہیں شاعروں کو شاعری کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کیا آپ صرف شاعری کی کتب تلاش کرتے ہیں یا اور مضامین سے بھی آپ کو دلچسپی ہے؟ مجھے اس سوال سے اس کے علم کی قامت کا اندازہ تو ہو گیا لیکن سلسلہ گفتگو کے لیے میں نے کہا اپنے متعلق آپ اور کچھ فرمایئے نام تو آپ کا معلوم ہو گیا اس نے بڑے جے

ہوئے لہجے میں کہا ''میں گورنمنٹ کالج میں فلسفے کا طالب علم ہوں اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی میرے استاد ہیں مجھے شعر و ادب سے بھی دلچسپی ہے۔'' میں نے جواباً کہا ''آپ شعر کہتے ہیں یا نثر لکھتے ہیں۔''

کہنے لگا ''شعر تو میں نہیں کہتا مگر شعر کو پسند ضرور کرتا ہوں باقی نہ میں افسانہ لکھتا ہوں نہ ناول نہ صحافی ہوں نہ مترجم میں فلسفے کا آدمی ہوں اور اپنے مضمون سے باہر نہیں جاتا۔''

''آپ سے مل کر یک گونہ مسرت ہوئی اچھا پھر کبھی ملاقات ہوگی!''

''اچھا آپ انارکلی کی طرف جا رہے ہیں مجھے بھی ادھر جانا ہے دونوں چلتے ہیں راستے میں کچھ گفتگو رہے گی!''

میں نے کہا ''میں راستے کی گفتگو کا عادی نہیں اور راستے کی گفتگو کہاں تک معتبر اور کارآمد ہو سکتی ہے؟ آیئے میرا غریب خانہ انارکلی میں ہے'' وہ بولا۔

''اچھا چلیے وہ بھی دیکھ لیں گے۔''

ہم دونوں بازار میں چلتے رہے مگر اس کی زبان قدرتیز رفتار تھی کہ اس نے میری خاموشی کو جگہ جگہ سے زخمی کر دیا وہ برابر بولتا جا رہا تھا اور اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرا کر گزرتی جا رہی تھی زینے کے قریب آ کر میں نے رخصتی کے لیے ہاتھ ملانا چاہا اس نے کہا مجھے ذرا دیر سے جانا ہے چلیے کچھ دیر آپ کے یہاں بیٹھ لوں گا۔'' میں ہاتھ کا اشارہ کر کے زینے پر چڑھ گیا وہ قریب ڈیڑھ گھنٹے میرے کمرے میں بیٹھا اور مختلف مضامین پر گفتگو کے رٹے ہوئے ٹکڑے بولتا رہا اور میں ایک معمول کی طرح سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ یا تو یہ شخص اپنی معلومات سے مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے یا پھر اسے علمی بدہضمی ہے اور اس کا ظرف وسیع نہیں پھر خیال آیا شاید ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس کے کوزے سے زیادہ بھر دیا اور اب یہ چھلکتا پھر رہا ہے خیر اس روز تو چلا گیا مگر پھر اس نے مستقل آنا شروع کر دیا اور گفتگو میں تنقید کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا۔

میں خاموشی سے تجزیہ کرتا رہا کہ کل کس مقام سے بول رہا تھا اور آج کس میٹر سے بنکار رہا ہے مگر اس کے رجحانات کا صدر دروازہ دکھائی نہ دیا عبدالسلام کا زیادہ وقت میری صحبت میں صرف ہونے لگا۔ بعض اوقات مجھے اس پر سرکاری آدمی ہونے کا گمان گزرتا مگر یقین تک نہیں پہنچتا آخر

وہ میرے یہاں رات کو سونے بھی لگا- آدمی نہایت قاعدے کا تھا مگر اس کے چہرے سے تجسس اور آنکھوں سے تشکیک کا پتہ چلتا تھا- جب اس نے مجھے چھان پھٹک کر دیکھنے کے بعد بے ضرر آدمی پایا تو نہایت احتیاط کے ساتھ جھجکتے جھکتے فرمایا ''قران میں جس کی آمد کی خبر ہے میں وہی مسیح موعود ہوں'' یہ سنتے ہی میرے تو حواس برہم ہو گئے لیکن پھر میں نے ذرا سنبھل کر تفریحاً کہا ''جناب یہ تو توارد ہو گیا مسیح موعود تو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود کو بتایا ہے یہ نبوت تو دو ملاؤں میں مرغی ہو کر رہ جائے گی-

عبدالسلام ذرا تامل کے ساتھ بولا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے کہا ''میاں مسیح موعود کی بجائے مسیح موجود کہو تو ایک بات بھی ہے-''

عبدالسلام بولا ''آپ نے درست کہا ہے مسیح موجود نہایت مناسب ہوگا بس آج سے یہی ہوگا- آپ بھی میرا تعارف اپنے دوستوں سے اسی نام سے کرایا کریں-''

پھر میں نے تفریحاً کہا ''میاں یہ تو بتاؤ مسیح علیہ السلام تو باپ کے بغیر خدا کے حکم سے پیدا ہوئے تھے تم اپنے ماں باپ کو کیسے چھپاؤ گے؟

عبدالسلام بولا ''آپ پروا نہ کریں اس رخ سے بھی سو فیصد مسیح ہوں میرا باپ بھی گوشت پوست کا انسان نہیں-''

میں نے حیرت سے ابھرتے ہوئے پوچھا ''میاں وہ کیسے؟ یہ تو عجیب وغریب بات ہے-''

عبدالسلام بولا ''میرے والد کی پہلی شادی سے کوئی اولاد نہیں تھی انہوں نے اولاد کے لیے دوسری شادی میری والدہ سے کی لیکن کئی سال میری والدہ کے بھی کوئی بچہ نہ ہوا وہ اپنی بے اولادی سے بہت مغموم رہتی تھیں میرے وطن سرسا ضلع حصار میں ایک بزرگ کا مزار ہے اور قرب و جوار کے مضافات میں لوگ اس مزار سے عقیدت رکھتے ہیں- چنانچہ وہاں فاتحہ خوانوں اور زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے- گرمیوں کی دوپہر تھی میری والدہ کو بھی اولاد کی محرومی اس مزار پر لے گئی اس وقت مزار پر خاموشی بھی تھی اور تنہائی بھی چنانچہ انہوں نے فاتحہ کے بعد خلوص دل سے رو رو کے بچے کے لیے دعا مانگی انہیں یک دم ٹھنڈا پسینہ آیا اور عجیب وغریب کیفیت طاری ہو گئی تھوڑی دیر بعد بامراد عورتوں کی طرح ایک بشاشت فرحت اور کامرانی کا احساس ہو رہا تھا وہ گھر آ کر اس خیال سے میکے

چلی گئیں کہ مبادا پہلی بیوی جلاپے میں کوئی غلط قدم اٹھائے جیسی سوتنوں کی عادت ہوتی ہے۔

''میکے ہی نو ماہ گزرنے پر میں پیدا ہو گیا لہذا میں بھی بغیر باپ کے پیدا ہوا ہوں'' میں عبدالسلام کے چہرے کو دیکھتا رہا کہ کہیں اس میں مایوسی کا رنگ تو غالب نہیں لیکن تو بہ توبہ وہ بے تکان بولتا جا رہا تھا میں نے اس واقعے کو سن کر یہ اندازہ لگایا کہ اس شخص کے دعوائے مسیحیت میں اس کی والدہ کا ہاتھ بھی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ عبدالسلام کے ماننے والوں کا بھی ایک حلقہ ہے جس میں زیادہ لوگ تو نہیں لیکن جو مرید ہیں ان میں سے کسی کے نقطے اوپر نہیں بدلے پیغمبری پر لوگوں کو مطمئن کر دینا معمولی کام نہیں لیکن چونکہ پاکستان کے مسلمان پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے کو جھوٹا بے ایمان فاتر العقل خیال کرتے ہیں اور موقع لگے تو قتل سے بھی گریز نہیں کرتے اس لیے اس کا ایک حلقہ ہے جو خفیہ انجمن کی طرح ہے اور عبدالسلام بھی ہر شخص کے سامنے اپنی رسالت کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ جب جذباتی مسلمان جمع ہوں تو کنارہ کر جاتا ہے۔ جب بھی ملاقات ہوتی ہے۔ میں اس کے اس جنون میں کمی نہیں پاتا اور دو ڈھائی ماہ ہوئے اب کی بار اس نے پیغمبری میں ایک سیاست کا دریچہ بھی کھول لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کچھ دنوں سے راجپوتوں کی برتری کی بشارت مل رہی ہے خدا انجام بخیر کرے اور اسے سیدھے راستے پر لائے میں نے اسے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر روتے بھی دیکھا ہے اور اس وقت اس میں رسالت والی ہمدردی تو نہیں مومن کا کرب ضرور ہوتا ہے۔

ایک عجیب مرض

حکیم جاوید حیات ایک طبیب اور ایسے طبیب ہیں جن کا تجربہ علم کی صورت اختیار کر گیا ہے حافظ آباد کے رہنے والے ہیں اور آٹھ دس سال سے ہر جمعہ کو لاہور آتے ہیں تو غریب خانے پر بھی تشریف لاتے ہیں اور ہفتہ بھر کی روداد سناتے ہیں' اس میں ان کے خانگی حالات بھی ہوتے ہیں اور طبی سرگذشت بھی! انہیں شعر کا ذوق بھی ہے اور نثر بھی اچھی خاصی لکھ لیتے ہیں طبیب اچھے اور انسان بہت اچھے ہیں۔

ایک جمعہ کو تشریف لائے تو فرمانے لگے اور تو سب حالات بدستور ہیں بفضل تعالیٰ ہر طرح عافیت ہے لیکن اس ہفتے ایک عجیب و غریب مریض نظر سے گزرا میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ یہ مرض ہے یا پیر فقیر کی دعا کا اثر۔''

میں متوجہ ہوا تو فرمانے لگے ''ایک ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت اپنے ایک نوجوان بیٹے کو میرے مطب میں لائی اور کہا' حکیم جی اسے غور سے دیکھئے! میں نے نبض دیکھی تو اسے معمولی قسم کا بخار تھا جسے موسمی بھی کہا جا سکتا تھا' میں نے تسلی دی اور بتایا کہ معمولی حرارت ہے' میں دوا دیتا ہوں اسے پلاؤ' انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔''

اس نے دوا تو لے لی اور اٹھ کر نوجوان کو ساتھ لے کر زینے سے اتر گئی' تھوڑی دیر میں لڑکے کو نیچے کھڑا کر کے اوپر آئی اور کہنے لگی۔'' حکیم جی آپ نے میرے بچے کو غور سے نہیں دیکھا' معمولی بخار بتا دیا' اسے معمولی بخار نہیں مرنے والا مریض ہے۔''

میں نے کہا'' بی بی تجھے کیا معلوم کہ یہ مرنے والا مریض ہے تو نہ حکیم ہے نہ ڈاکٹر تو تشخیص کیسے کر سکتی ہے۔'' اس نے کہا'' میں حکیم یا ڈاکٹر تو نہیں لیکن چھ پشت سے میرے خاندان میں یہ ہوتا آ رہا ہے کہ لڑکا جوان ہوتا ہے تو شادی کے بعد جب پہلا لڑکا ہوتا ہے تو باپ مر جاتا ہے اور بچہ یتیم ہو جاتا ہے اس میرے لڑکے کی شادی بھی ہو چکی ہے اور میں دل پکڑے پھرتی ہوں کہ اب یہ مر جائے گا رات کو ساری رات بیٹھی اس کا منہ دیکھتی اور روتی رہتی ہوں اسے ذرا غور سے دیکھیں اور موت سے

بچالیں- میں نے کہا

''مائی تجھے وہم ہے اور وہم کی دوا تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں میں نے دوا دے دی ہے'

اسے دوا پلاؤ انشاء اللہ بخار اتر جائے گا' فکر کی بات نہیں' وہ یہ سن کر چلی گئی-

دوسرے دن دوپہر کو پھر آئی اور تین' چار عزیزوں کو ساتھ لائی میں نے نبض دیکھی' اس کا بخار اتر چکا تھا' میں نے کہا''اس کا بخار اتر گیا ہے اسے اب کوئی تکلیف نہیں' آرام سے بیٹھو لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی میرے مطب میں بیٹھے بیٹھے اس نوجوان کو بخار ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک سو چار بخار ہو گیا-

میں نبض دیکھ کر گھبرا گیا اور اسے کہا کہ جس قدر جلدی ہو سکے اسے ہسپتال لے جاؤ''

چنانچہ فوراً ایک تانگہ منگوایا اور اسے اس کے عزیزوں کے ساتھ تانگے میں بٹھا دیا- وہ ہسپتال پہنچ گئے مگر بخار تھا کہ بڑھتا ہی چلا گیا اور بے ہوشی طاری ہو گئی شام نہیں ہوئی تھی کہ انتقال ہو گیا-

میں حیران ہوں کہ سائنس موجودہ دور کی ترقی کے باوجود انسانی اجسام کی رازدار نہیں ہو سکی حالانکہ ہزار ہا کتابیں ڈاکٹری پر لکھی جا چکی ہیں اور ہزار ہا کتب یونانی طب میں شائع ہو چکی ہیں اور جسم انسانی آج تک معمہ چلا آ رہا ہے-

آخر یہ کیا بیماری ہے اس کا نام کیا ہے اور اس کے اسباب و علل کیا ہیں اور اس مرض کا تدارک کیا ہے اور معالج کہاں ہیں؟

میں نے سنا تو میں بھی ششدر رہ گیا-

سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا طلسماتی مرض ہے- بچہ پیدا ہوتا ہے تو باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور چھ پشتوں سے یہ سلسلہ رکا نہیں-

میں نے یونانی طب پڑھی ہے اور حکیم کبیر الدین مرحوم سے پڑھی ہے جو تشریح میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن کبھی اس قسم کے مرض کا ذکر نہیں آیا نہ کتابوں میں اس قبیل کی کوئی بیماری نظر سے گزری' اگر کسی قاری کی سمجھ میں آ جائے تو مجھے مطلع کرے میں ممنون ہوں گا--

مسند نشین

اللہ تو لا یخل ہے ہی لیکن یہ حضرت انسان بھی کچھ کم شے نہیں - بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ عقل ان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن اس کا کیا کریں کہ مشاہدات ان کی تصدیق کرتے ہیں - اسی نوع سے ایک واقعہ سنیے:

ایک روز مجھے اچانک حد سے زیادہ بے چینی کا احساس ہوا اس کی کوئی خاص وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی - گزشتہ رات گہری نیند سویا اور صبح ہشاش بشاش بیدار ہوا تھا - بظاہر کسی سے کوئی اختلاف بھی نہیں تھا طبیعت اتنی اچاٹ ہوئی کہ مشق سخن تک کو جی نہیں چاہ رہا تھا - کافی دیر اس بلا وجہ بے چینی میں مبتلا رہنے کے بعد میرے دل میں اپنے دیرینہ دوست نیرؔ واسطی سے ملاقات کا خیال پیدا ہوا -

نیرؔ واسطی بڑی خوبیوں کا مالک اور بڑا پیارا انسان تھا خدا نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا رکھی تھی جس کا ایک زمانہ معترف ہے اور رہے گا شفا کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے محبت کرنے والا گداز بھرا دل بھی عطا کیا تھا وہ ایک ایسا انسان تھا جو غیر کے دکھ کو اپنا دکھ درد تصور کرتا تھا - یہ بات تو اب راز نہیں رہی کہ موصوف مستحق مریضوں کا علاج اپنی جیب سے کیا کرتے تھے - اس پریشانی میں صرف نیرؔ واسطی سے ملاقات کا خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا - اس کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی جا سکتی بس میرا دل اس سے ملاقات کو مچلنے لگا -

جب میں اس کے مطب میں پہنچا تو حسب توقع وہ روگی انسانوں کے دکھ دور کرنے میں مصروف تھا - مجھے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا اتفاق کی بات ہے کہ اس روز اس کے مطب میں جتنے مریض تھے ان میں اکثر اہل ثروت اور صاحب حیثیت لوگ تھے -

''حکیم صاحب'' آج تو پانچوں گھی میں ہیں - میں نے ہلکی سی چوٹ کی -

اور ''سر کڑاہی میں ہونا کوئی خوشگوار بات تو نہیں'' نیرؔ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا -

اس وقت میرا دوست ایک ٹھیکیدار صاحب کا معائنہ کر رہا تھا - جو مرض وہم میں مبتلا تھا میں

علیک سلیک کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ ایک غریب بوڑھی خاتون مطب میں داخل ہوئی اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو میرے دل میں کھٹکنے لگی - جیسے شعر میں کوئی بات ہوتے ہوتے رہ جائے - اور دل نا قابل فہم سی خلش کا شکار ہو جائے - خاتون کی ظاہری حالت واقعی نا گفتہ بہ تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس کے پھٹے پرانے کپڑے انسانی لباس کے نام پر تہمت قرار دیئے جاسکتے تھے - پہلے تو اس نے سہی سہی نظروں سے صاحب حیثیت لوگوں کو دیکھا پھر ہمت کر کے حکیم صاحب کے قریب آ گئی - وہ یوں چپ چاپ کھڑی تھی جیسے کوئی حقیر فریادی انصاف پسند مگر صاحب جلال حکمران کے دربار میں کھڑا ہو اور حرف مدعا زبان پر نہ لا سکے - اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے -

''خاتون اس کرسی پر اطمینان سے بیٹھ جائیں'' نیرؔ واسطی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اس مریض سے فارغ ہو کر میں پوری توجہ سے آپ کی بات سنتا ہوں - ٹھیکیدار کو حکیم کی بات ناگوار گزری - نیرؔ ان باتوں کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا - اس کا ہمدردانہ لب ولہجہ دیکھ کر بڑھیا کو حوصلہ ہوا اور اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا - بیٹھنے والی بات نہیں ہے جی -

''آپ کھل کر بتائیں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ میرے دوست نے بڑے نرم لہجے - میں پوچھا -

حکیم صاحب' آپ میرا مطلب ہے میرے ساتھ چلیں' اس کا اجر آپ کو خدا دے گا - بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - بیمار میں نہیں میری بیٹی ہے -

''کیا وہ یہاں نہیں آ سکتی؟'' جس مریض کو نیرؔ واسطی دیکھ رہا تھا - اس نے تلخ لہجے میں کہا -

بڑھیا کی آنکھوں میں بے بسی' بے چارگی' نا امیدی' غرض دکھوں کا میلہ سا لگ گیا اور وہ مریض کے تلخ لہجے سے خوف زدہ سی ہو گئی پھر ایک بڑی عجیب بات ہوئی نیرؔ واسطی سامنے بیٹھے ہوئے مریض کو چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا چلئے خاتون کہاں چلنا ہے -

''یار تم آرام سے بیٹھو میں مریضہ کو دیکھ آؤں' میرے دوست نے معذرت خواہانہ انداز میں مجھ سے کہا میں چونکہ نیرؔ واسطی کا مزاج شناس تھا لہذا برا منائے بغیر مسکرانے لگا - بلکہ میرے دل میں تجسس بھری ''کرید'' سی پیدا ہونے لگی -

کتنی دیر لگ جائے گی- میں نے سرسری انداز میں سوال کیا-

''یہ تو مریض کی حالت پر منحصر ہے'' نیرؔ واسطی نے جواب دیا-

میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا- انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا- ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میری تشویش اضطراب میں بدلنے لگی- چند مریض جو صرف ''وہم'' میں مبتلا تھے- انتظار کی صعوبت برداشت نہ کر سکے وردوا کے بغیر ہی اٹھ کر چلے گئے- جب میرا دوست واپس آیا تو اس کی اپنی حالت مریضوں سے بدتر تھی میں حیران سے زیادہ پریشان ہوگیا-

خیریت تو ہے نا- میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا-

فارغ ہو کر اطمینان سے بتاتا ہوں- یہ کہہ کر نیرؔ واسطی نے منتظر مریضوں کو فارغ کیا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا دوست شدید کرب میں مبتلا تھا- مریض رخصت ہوئے تو میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ لیت ولعل سے کام لینے لگا یہ بڑی حیران کن بات تھی کیوں کہ ہم بے تکلف دوست تھے اور اکثر ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ لیتے تھے- میں مصر ہوا تو وہ اپنے کرب کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگیا وہ کرب جس نے اس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی-

اصل میں نواب بیگم سے خاموش رہنے کا وعدہ کر بیٹھا ہوں- نیرؔ نے کہا-

یہ نواب بیگم کون ذات شریف ہیں- میں نے کرید جاری رکھی-

وہ مفلس خاتون جو مطب میں آئی تھی- اس نے جواب دیا اس کا تعلق ایک ریاست کے نواب خاندان سے ہے- اسی لیے میں نے اسے نواب بیگم کہا ہے اور اتفاق سے اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں اس سے زیادہ نواب خاندان کا ذکر وعدہ خلافی ہوگی- لہٰذا مجھے مجبور نہ کرنا وہ مریضہ جسے میں دیکھنے گیا تھا- نواب زادی تھی- اسی لیے وہ مطب تک نہ آسکی- میں نے طنزیہ لہجے میں کہا-

''نہیں نہیں- مطب تک نہ آسکنے کی وجہ خاندانی تفاخر نہیں کچھ اور ہے-'' نیرؔ نے نواب زادی کا دفاع کرتے ہوئے کہا- بات یہ کہ اس کے پاس لباس نہیں تھا- نیرؔ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا-

یہی تو نواب زادیوں کا المیہ ہوتا ہے- میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی'' ہر تقریب کے لیے

مناسب لباس۔“

نہیں یار۔ ماں بیٹی کے پاس اپنی ستر پوشی کے لیے صرف ایک پھٹا پرانا جوڑا ہے اب ظاہر ہے کہ کپڑوں کا ایک جوڑا بیک وقت دونوں کا ستر کیسے ڈھانپ سکتا ہے۔

یہ کہہ کر میرے دوست نیرؔ واسطی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بھی افسردہ ہو گیا۔ گردش حالات کا رونا میں بھی اکثر رویا کرتا تھا۔ لیکن تصویر کا یہ رخ بڑا ہی گھناؤنا تھا۔ اس مفلس نواب بیگم کی غیر معمولی شخصیت کا راز آشکار ہو چکا تھا۔

اس خاتون کے ساتھ جب میں اس کے ایک کمرے والے مکان پر پہنچا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ نیرؔ نے سر جھکا کر سلسلہ کلام جاری رکھا۔ میں بھی اس سے نظریں ملانے سے کترانے لگا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو ننگے فرش پر نواب زادی آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ نیرؔ نے لرزیدہ لہجے میں کہا اور اس نے اپنے جسم کو پرانے اخبار کے کاغذوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ نواب بیگم اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کر کے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور میں فرط غم اور مارے حیا کے زمین میں گڑے کا گڑا رہ گیا میں لب مرگ مریض کو بھی دیکھ کر کبھی نہیں گھبرایا۔ لیکن اس مریضہ کو دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا یہ تو ساری انسانیت کو کند چھری سے ذبح کرنے والی بات تھی۔ ہم انسانی عظمت کے نغمے الاپتے ہیں۔ مسجود ملائک کی بڑائی کے گیت گاتے ہیں مگر انسانی دکھوں کا علاج نہیں کرتے۔ اپنے پڑوسی کی خبر گیری نہیں کر سکتے احسان صاحب، خالق کائنات ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

تم نے اس برہنہ مریضہ کا علاج کیسے کیا۔ میں نے انسان دوست نیرؔ واسطی سے پوچھا۔

نواب زادی ناتوانی کا شکار تھی۔ وہ کمزوری جو فاقہ کشی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جان لیوا عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ نیرؔ نے دکھی لہجے میں جواب دیا میں مریضہ کی نبض دیکھے بغیر ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ لہٰذا خاتون سے اجازت لے کر بازار گیا اور مناسب لباس اور خوراک کا انتظام کر کے لوٹا ماں بیٹی کو تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ انہوں نے آخری کھانا کب کھایا تھا۔

تو یہ تھی تمہارے دیر میں آنے کی وجہ، میں نے اپنے عظیم دوست کو ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو- نیرّ نے کہا- میں نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا-

شام ڈھلے ہم دونوں نواب بیگم کے ''عیش محل'' گئے وہ تنگ وہ تاریک کوٹھری تو جانوروں کے رہنے کے لائق بھی نہیں تھی- وہ بات جو میرے حکیم دوست کی نگاہوں سے اوجھل رہی یا شاید اس کا ذکر اس نے عمداً نہیں کیا تھا وہ نواب زادی کا حسن جہاں سوز تھا- اس حسن کو سراہنے کے لیے ''شاعر'' ہونا ضروری نہیں تھا- نواب زادی کا حسن تو کسی بدذوق بنئے کو بھی غزل سرائی پر مجبور کرسکتا تھا-

جب ہم نواب زادی کی عیادت سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس اداس تھے- نیرّ کی حالت تو واقعی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی- اسی اضطراب میں اس نے کہا- چلو یار اس شہر خرابی سے کہیں دور چلتے ہیں- یہ تو بے درد انسانوں کا ایک مہیب جنگل بن گیا ہے-

''جس بستی میں بھی ہم جائیں گے حالات کم و بیش اسی نوعیت کے ہوں گے میں نے جواب دیا وسائل کی نامنصفانہ تقسیم سے ایسے مسائل تو ہر جگہ پیدا ہو چکے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں- جنگلوں یا بیابانوں میں جا بسیرا کریں تو حالات شاید مختلف ہوں-

مجھے خود وحشت سی ہو رہی تھی- جی چاہتا تھا کہ ہر شے چھوڑ چھاڑ کر کسی اجنبی مقام کی طرف کوچ کر جاؤں پھر اچانک میرے ذہن کے پردے پر بلند و بالا پہاڑوں کا منظر ابھرنے لگا جسے میں نے تصور کا کرشمہ خیال کیا حیران کن بات یہ ہوئی کہ مجھے سامنے والی سپاٹ سی دیوار پر پہلے برف پوش چوٹیاں دکھائی دیں پھر ایک چشمہ ابلتا ہوا نظر آیا اور آخر میں ایک عجیب و غریب غار سا دکھائی دیا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ منظر اتنا واضح تھا کہ تصوراتی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا- یہ تو کوئی نادیدہ ہاتھ مجھے کسی خاص سمت کی جانب دھکیل رہا تھا-

اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟ نیرّ نے مخاطب کیا تو دیوار کا منظر غائب ہو گیا-

تھوڑی دیر خاموش رہتے تو شاید میں تمہیں بتانے کے قابل ہو جاتا-

اچھا' اب خوابوں کی وادی سے باہر نکلو اور اٹھو سفر کی تیاری کریں- کہاں کے ارادے ہیں مولانا؟ میں نے سوال کیا-

تم شاعروں کی ایک حس شائد فالتو ہوتی ہے- جس کی مدد سے تم لوگ ان دیکھی جگہوں کی سیر کر سکتے ہو- مگر ہم سیدھے سادے انسانوں کو تو جسم کثیف کے ساتھ ہی سفر کی تکالیف برداشت

کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔

حساس دل کو تحریک دینے کے لیے ہلکا سا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور پتھر دل کو زلزلہ بھی متاثر نہیں کرسکتا۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے تو نیرؔ نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو احسان؟ خدا کی قسم بالکل یہی بات میں سوچ رہا تھا مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ عجیب بات ہے سوچا میں نے اور اظہار تمہاری زبان سے ہوا۔

ہم تو اندر کا حال بھی جان لیتے ہیں۔ میں نے مذاقاً کہا۔

اچھا پیر صاحب' اب اٹھنے والی بات کریں' نیرؔ نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا میں کوشش کے باوجود بھی اعتراض یا احتجاج نہ کرسکا بلکہ بلا سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہولیا۔ ہم سفر پر تو چل نکلے تھے مگر منزل سے ناآشنا تھے اس کی کوئی عقلی دلیل ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم تو بس بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہتے تھے۔

جب ہم نولکھا ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو راولپنڈی جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ خریدنے کا نہ وقت تھا نہ ہمیں اس کا خیال آیا ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہوگئی۔ ٹکٹ ہم نے راستے میں بنوا لیے اور طلوع آفتاب سے پہلے ہم راولپنڈی میں موجود تھے۔ ناشتہ ہمنے ریلوے اسٹیشن پر ہی کیا سورج طلوع ہوا تو ہم ایبٹ آباد کی طرف جارہے تھے۔ میں نے صرف ایک بار دبی زبان سے کہا۔ یار یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟ نیرؔ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

ایبٹ آباد میں ہم نے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا میدانی علاقوں میں موسم خوشگوار تھا مگر وہاں ہمیں سردی محسوس ہونے لگی ہم ویسے ہی منہ اٹھائے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے گرم کپڑے تک نہیں لائے تھے۔

اس سردی کا کیا علاج کیا جائے۔ نیرؔ نے کہا۔

حکیم آپ ہیں اور علاج مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں۔

کوہ پیمائی کے متعلق کیا خیال ہے۔ نیرؔ نے عجیب و غریب حل پیش کیا۔ دشوار گزار راستوں پر چڑھیں گے تو سردی خود بخود بھاگ جائے گی۔"

پہاڑ پر چڑھنے کا مجھے تو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا مگر بلندی کے سفر میں لطف آنے لگا اپنی پنک

میں ہم جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ واپسی کا ہمیں خیال ہی نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے ایک جگہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی بھی آئی اور میرے دل میں سوال پیدا ہوا یہ لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ماحول میں آخر کیوں رہ رہے ہیں؟ اس بستی میں ہم نے موٹی موٹی تنوری روٹیاں گڑ اور لسی کے ساتھ نوش جاں فرمائیں میں دل ہی دل میں مسبب الاسباب کی رزاقی پر عش عش کر اٹھا۔

سائے لمبے ہونے شروع ہوئے تو اچانک ہمارے سامنے اس قدر دل کش منظر آ گیا کہ ہم دونوں بس مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔ پہاڑی زمین کا وہ ٹکڑا جنت کو شرما رہا تھا۔ لمبے لمبے درخت پورے جاہ و جلال سے نسبتاً ہموار جگہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جن کے نام تک سے میں ناواقف تھا۔ وسیع و عریض قطعات پر لاتعداد پھول جہازی سائز چادروں کی طرح بچھے تھے وہ دل فریب منظر انسانی ہاتھوں کی صناعی کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا۔ دست قدرت کی کاریگری کا کمال یہ تھا کہ خوبصورتی کی تلاش میں نگاہوں کو ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسحور کر دینے والا حسن پلکوں پر خود آ کر دستک دینے کو بے قرار تھا۔ اتنا حسین منظر تو میں نے کبھی کسی تصویر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ قریب ہی ایک چشمہ ابل رہا تھا پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ بے اختیار اسے پینے کو دل مچلنے لگا ہم دونوں نے چلو بھر بھر کر اپنی پیاس بجھائی اچانک نیرؔ واسطی ایک طرف جا کر اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ مولانا، کیا ارادے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

احسان صاحب، اس پانی میں غسل نہ کرنا کفران نعمت ہے مجھے تو یہ آب حیات دکھائی دیتا ہے۔ یہ سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔

خود میرا دل بھی اس چشمے میں ڈبکی لگانے کو بے قرار ہو گیا۔ جب ہم نے پانی میں قدم رکھے تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا پانی کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ بہر کیف ہم کافی دیر تک پانی میں چہلیں کرتے رہے۔ جب ہم باہر نکلے تو غلطی کا احساس پچھتاوے میں بدل چکا تھا۔ ہم بری طرح ٹھٹھر رہے تھے اور سردی ہماری ہڈیوں تک میں اترنے لگی تھی۔

نیرؔ تمہارے ہونٹ تو بالکل نیلے پڑ رہے ہیں۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

تمہارا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں۔ اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی اگر ہم نے اس

سردی سے نجات حاصل نہ کی تو ناقابل تلافی نقصان کا امکان ہے۔

ہم دونوں سگریٹ نوش نہ تھے۔لہذا ماچس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ماچس ہوتی تو آگ جلا کر اپنا علاج کر سکتے تھے۔رفتہ رفتہ میرا سر درد سے پھٹنے لگے اور کانوں میں مسلسل سائیں سائیں ہونے لگی۔نیئر کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔مصیبت یہ تھی کہ قرب و جوار میں کسی انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔لیکن ہم خاموشی سے موت کو گلے لگانے کے سخت خلاف تھے۔لہذا ہم نے بھرپور جدوجہد کا فیصلہ کیا ہم اس دل کش مرگ وادی سے فوراً نکل جانا چاہتے تھے۔ہمارے سر چکرا رہے تھے ہمیں تو یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون سا علاقہ تھا ہم تو بس بے مقصد گھومتے گھومتے جانے کہاں آ گئے تھے۔رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوئی جب سورج غروب ہوا۔

سورج کو ڈوبتے دیکھ کر ہمارے دل بھی ڈوبنے لگے۔سردی کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرا بھی ہم پر حملہ آور ہونے کو تیار تھا۔غروب آفتاب کا صرف ایک فائدہ ہوا کہ عارضی طور پر ہمیں مشرق و مغرب کا اندازہ ہو گیا' عارضی اس لیے کہ ہماری سوچ برق رفتاری سے دھندلا رہی تھی۔اس وقت ہمارے ذہنوں میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا اور موت کو شکست دینی ہے' ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے' دشوار گزار راستے پر چلنے لگے۔پہلے تو ہمارے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔پھر رفتہ رفتہ دکھ درد کا احساس مٹنے لگا ہم جانتے تھے کہ وہ ہماری قوت مدافعت کی آخری حد تھی۔

''سردی کی شدت سے جب قوت مدافعت شکست کھا جائے تو خنکی خوشگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔'' نیر نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔''پہلے غنودگی طاری ہوتی ہے پھر نیند کا غلبہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔اگر ہماری آنکھیں بند ہو گئیں تو پھر کبھی نہ کھل سکیں گی۔''

میری آنکھیں تو پہلے ہی نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''خبردار! یہ جھوٹی نیند ہے۔اسے قریب نہ آنے دینا'' میرے دوست نے لرزتی آواز میں کہا۔میرے خیالات ایک جگہ تک ہی نہیں رہے تھے۔آخر میں نے نیئر کی بغل میں اپنا سر دے کر اسے سہارا دیا اور نیم تاریکی میں قدم قدم چلنے لگا۔یہ ''کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے'' والی بات

تھی- دوسرے اس عمل سے جدوجہد کا اظہار ہوتا تھا' واسطی نے بھی تھوڑی دیر بعد ایسا ہی کیا- اس کوشش کے ساتھ ساتھ ہم سرگوشیوں میں ایک دوسرے کی ڈھارس بھی بندھا رہے تھے' پہاڑ کی اندھیری رات' راستہ ناہموار اور ہم نیم جاں' سب کچھ نے مل کر وقت کا احساس مٹا دیا- جب اندھیرے کی چادر زیادہ گہری اور دبیز ہوگئی تو ایک اور مصیبت ہم پر حملہ آور ہوئی-

واسطی کو اچانک ٹھوکر لگی یا جانے کیا ہوا کہ وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گیا- میں نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہوسکا- مجھے صرف اس کے لڑھکنے کی آواز آئی- شاید وہ کسی گہرے کھڈ میں گر گیا تھا' میری ہمت جواب دینے لگی اور میں گھپ اندھیرے میں بے حس وحرکت کھڑا ہوگیا' نہ مجھے کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سجھائی...... عجیب بے بسی کا عالم تھا- آخر میں نے ہمت کرکے صرف ایک قدم اٹھایا اور میرا بھی وہی حشر ہوا جو میرے دوست کا ہوا تھا- اصل میں ہم دونوں کسی گہرے کھڈ کے کنارے پر جا پہنچے تھے' میں اس گہرے کھڈ میں گرا تو گرتا ہی چلا گیا- پستی کا وہ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا- یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زبردست ہاتھ مجھے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہا ہو- خدا خدا کرکے میں ایک جگہ رکا' مجھے پورا یقین تھا کہ میری ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں گی اور واسطی کے ہاتھ پاؤں بھی سلامت نہیں ہوں گے-

کافی دیر تک جب مجھے کچھ نہ ہوا تو میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹول کر دیکھا- دفعتاً میرا ہاتھ کسی نرم شئے سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی- ''احسان! یہ تم ہو؟'' یہ آواز میرے دوست کی تھی اور میں اس کے بالکل قریب گرا تھا- حیران کن بات یہ تھی کہ ہم دونوں زندہ سلامت تھے- اس بات کی عقلی توجیہہ ہوسکتی ہے' ہم ایک ہی جگہ سے یکساں انداز میں گرے تھے- لہٰذا ایک ہی جگہ یا قریب قریب آکر رک گئے تھے- اس کے علاوہ کھڈ میں اگی ہوئی جھاڑیوں نے ہمارا بوجھ برداشت کرکے ہمیں بچا لیا تھا' لیکن اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ان دلائل کو رد کر دیا- وہ تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ تھا جس نے دھکا دے کر ہمیں ''راہ راست'' پر لا پھینکا تھا- میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ساری رات اندھیرے میں بھٹکتے رہتے تو بھی اس جگہ نہ پہنچ پاتے جہاں ہم آگرے تھے-

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر اپنے اپنے وجود کو حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے

رہے، مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی - کوڑھ میں کھاج والی بات کے مترادف اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں، چاروں طرف دردناک چیخیں یوں گونج رہی تھیں - جیسے ہماری دفات حسرت آیات پر ہزاروں چھل پیریاں مل کر بین کر رہی ہوں - اس خوف و دہشت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ سردی کا احساس قدرے کم ہو گیا - یہ طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گزر گیا - اچانک تھوڑے فاصلے پر مجھے ہلکی سی روشنی دکھائی دی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی دم توڑتی ہوئی کرن بھی اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہے -

''وہ سامنے کیا ہے؟'' نیر واسطی نے بمشکل سرگوشی کی -

''شاید دیئے کی روشنی غار سے باہر نکل رہی ہے -'' میں نے مضبوطی سے امید کی کرن کو تھامتے ہوئے جواب دیا - اس کے بعد ہمیں خبر نہیں کہ کس طرح ہم گرتے پڑتے اس غار کے دہانے تک پہنچے...... اندر کا ماحول دیکھتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم نے موت کو شکست دے دی ہے -

وہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور ہمارے سامنے آگ کا الاؤ دہک رہا تھا - جس سے غار کا اندرونی منظر بڑا خوشگوار لگ رہا تھا، سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ الاؤ کے قریب ایک گدڑی پوش درویش بیٹھا دہکتی آگ پر لکڑیاں رکھ رہا تھا - اس نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اس آگ کے قریب بیٹھ جانے کو کہا، درویش کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے ہماری آمد کی توقع تھی اور یہ کہ ہماری موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی -

الاؤ کے قریب چٹائی پر بڑا خوبصورت مصلیٰ بچھا ہوا تھا جو گدڑی پوش کے لیے مسند کا کام دے رہا تھا، ہم آگ کے قریب قریب لیٹے تو حیرت انگیز طور پر ہماری حالت بڑی تیزی سے سنبھلنے لگی - اس کے بعد تو اس نیکی کے فرشتے نے کمال کر دکھایا -

''جناب! گرما گرم چائے حاضر ہے نوش فرمائیں'' درویش نے یہ بڑے بڑے دو عدد مگ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا...... ہم دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا - گرم چائے اس وقت واقعی ہماری اشد ضرورت تھی اور چائے بھی ایسی فرحت بخش اور لذیذ کہ پہلا گھونٹ بھرتے ہی ہماری رگوں میں حیات آور خون کی گردش تیز ہو گئی - جانے اس چائے میں درویش نے کیا ملا دیا تھا کہ مجھے اپنے جسم و جاں میں توانائی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوئے - نیر واسطی کے

چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔

''کیوں جناب! کیسی ہے طبیعت؟'' درویش نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ''بعض اوقات مسیحاؤں کو بھی مسیحائی کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔

''آپ تو واقعی آنکھوں والے دکھائی دیتے ہیں۔'' حکیم نیرؔ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

ہاں صاحب حساس دلوں کے لیے اشارہ اور وہ کیا کہتے ہیں' پتھر دل انسان کے لیے تہہ و بالا کر دینے والا زلزلہ...... واہ صاحب واہ'' اب فقیر کا روئے سخن میری جانب تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ یہ الفاظ میں نے آغاز سفر سے پہلے لاہور میں ادا کیے تھے اور سیکڑوں کوس دور' پہاڑی غار میں بیٹھا وہ رحمت کا فرشتہ میرے الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہ درویش تو قدم قدم پر ہمیں حیران کر رہا تھا۔ میری عقل اس کی وجہ بیان کرنے سے قاصر تھی...... فی الحال تو آپ حضرات آرام فرمائیں' گدڑی پوش نے بڑے رسان سے کہا ''اندر ٹھیک ہو جائے گا تو باہر بھی خیریت دکھائی دینے لگے گی۔ یہ ''ان پانی'' کا نشہ بھی کتنا ظالم ہوتا ہے۔'' اجازت ملتے ہی ہم ننگی زمین پر لم لیٹ ہو گئے اور ایسے بے سدھ ہو کر سوئے کہ صبح کی خبر لائے۔ اپنے دوست کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا' مگر ایسی میٹھی نیند کبھی نصیب نہ ہوئی تھی جو اس رات' درویش کی غار میں پتھریلی زمین پر ہوئی۔

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ایک نئے تماشے کا آغاز ہو گیا۔ جسے ہم دشوار گزار اور ویران علاقہ قرار دے چکے تھے۔ اسی علاقے سے درویش کی زیارت کرنے والوں کی آمد شروع ہو گئی' کئی معتقد اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء بھی لائے تھے۔ درویش ان اشیاء کو فوراً مہمانوں میں بانٹ دیتا اور پھر اپنی مسند کا کونہ اٹھا کر نیچے سے ایک دونی نکالتا اور آنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ (اس دور میں دونی یعنی دو آنے اتنی حقیر رقم نہیں تھی دونی کی آٹھ روٹیاں آیا کرتی تھیں۔ ایک آنے روٹی والا دور بہت بعد کا ہے) ۔ یہ دونیاں بانٹنے والا سلسلہ عصر تک جاری رہا' جانے درویش کے مصلے تلے دونیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

دن بھر فقیر کے ڈیرے پر کھانے پینے کے علاوہ چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ ہم دونوں نے اب

حیران ہونا چھوڑ دیا تھا' ہم نے کئی بار غار سے باہر جانے کی کوشش کی' مگر ہر بار اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔ نیرؔ بھی بس پہلو بدل کر رہ جاتا اور میں نے تو اس مسحور کن ماحول سے اٹھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔

عصر کے بعد لوگوں کا آنا بند ہو گیا اور ماحول پر بوجھل بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ شام ڈھلنے سے ذرا پہلے درویش نے بڑے رسان سے کہا۔ ''آپ ذرا باہر گھوم پھر آئیں طبیعت بہل جائے گی'' پھر اس نے سرسری لہجے میں کہا ''خوگرفتار پنچھیوں کا اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے ناجی۔''

ہم دونوں غار سے باہر نکلے تو ڈر خوف کا شائبہ تک ہمارے دلوں میں نہیں تھا۔ سارا علاقہ بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا' تھوڑی دور ہمیں وہ گہرا کھڈ بھی نظر آ گیا جس میں ہم دونوں گرے تھے' اس کا آغاز کافی بلندی سے ہو رہا تھا۔ اس بات کا فیصلہ کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون سا راستہ ہماری طرف آ رہا ہے اور کون سا ہم سے دور جا رہا ہے۔

''یار احسان! ہم کس گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہیں اور یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' نیرؔ نے غار کے سحر سے آزاد ہوتے ہی کہا۔ ''کیا خیال ہے گھر کو لوٹ چلیں؟''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' میں نے اپنے دوست کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں تو سہی' پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

''یہ درویش صاحب بصیرت دکھائی دیتا ہے۔'' نیرؔ واسطی نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے' مگر کئی ایک باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں'' آخر دل کی بات میرے ہونٹوں تک آ ہی گئی' یہ دونیوں والا کیا چکر ہے؟''

اس رات ہم نے بے تکلفی سے ہر موضوع پر باتیں کیں۔ غار کے اندر درجہ حرارت معتدل تھا' درویش بھی موج میں آیا لگتا تھا' اچانک نیرؔ واسطی نے دونیوں والا ذکر چھیڑ دیا اور میں نے درویش سے تعارف حاصل کرنے کی خاطر وہ دو تین سوال داغ دیئے۔ درویش تھوڑی دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر لب کشا ہوا۔

''آج سے بیس برس پیشتر' یہ راندہ درگاہ انسان اس علاقے میں خوف و دہشت کی علامت تھا۔'' مسند نشیں درویش نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا' مائیں اپنے بچوں کو میرا نام لے کر ڈرایا

کرتی تھیں- میں اس علاقے کی سیاہ راتوں کا بے تاج بادشاہ تھا' وہ

وہ بادشاہ جسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی میں کوئی تیسرے درجے کا اٹھائی گیرہ نہیں تھا' بلکہ پہلے اعلان کر کے ظلم ڈھاتا تھا اور جب یہ سراپا تقصیر انسان' زمین کا ناقابل برداشت بوجھ بن گیا تو رحمت خداوندی جوش میں آئی- میں ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا جو آپ حضرات کو پیش آئے ہیں- وہ رات بڑی ہی بھیانک تھی- جب میں گرتا پڑتا اس غار میں پہنچا- عین اس جگہ جہاں اب میں بیٹھا ہوا ہوں' میری شکل وصورت کا ایک نیک دل درویش بیٹھا تھا- اس نے مجھ سنگ دل کو اپنے سایہ عافیت میں لے لیا' تین روز تک میں ہوش وحواس سے بے گانہ رہا اور وہ نیک دل انسان میری خدمت کرتا رہا-''

''آپ کے اور ہمارے حالات' ایک جیسے تو نہ ہوئے-'' نیر واسطی نے بے باک لہجے میں کہا-'' ہم تو چائے کی ایک پیالی سے سنبھل گئے تھے-''

''آئینہ دل ایک جیسا زنگ آلود تو نہیں ہوا کرتا'' مسند نشیں نے مسکرا کر کہا'' آپ حضرات تو پہلے ہی صیقل شدہ تھے- آپ کے ساتھ تو بس رسمی سی کارروائی ہوئی ہے-''

''بہت خوب! اگر یہ رسمی کارروائی تھی تو آزمائش کسے کہتے ہیں-'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا-

''محترم! دعا کریں خدا آپ کو آزمائش میں مبتلا نہ کرے-'' مسند نشیں نے بڑے نرم لہجے میں کہا-

''حساس دل کے لیے اشارہ اور پتھر دل کے لیے تہہ و بالا کر دینے والا زلزلہ- یہ بھی تو ذہن میں رکھیے-'' یہ سنتے ہی نیر واسطی نے غور سے میری طرف دیکھا- میرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ جو واسطی کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے' یہ درویش دوسری بار دہرا رہا تھا جس کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں تھی- اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ میری اس روز کی بلاوجہ بے چینی' نیر سے ملاقات' نواب زادی کا علاج اور ہمارا سفر' سب کچھ ایک منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا- میری عقل اس کا جواب دینے سے بھی قاصر تھی-

''تیسرے روز جب میرے ہوش وحواس بجا ہوئے تو میں نے اس نیک دل انسان کو دونیاں

تقسیم کرتے ہوئے دیکھا-''مسند نشین نے آپ بیتی کا آغاز از سر نو کرتے ہوئے کہا''میرے دل میں فاسد خیالات نے اودھم مچادیا اور میں نے اس خزانے پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا' میرا منصوبہ یہ تھا کہ شب تنہائی میں اس نیک دل انسان کو قتل کر دوں گا اور خزانہ لے کر غار سے نکل جاؤں گا-میری توانائی بحال ہو چکی تھی-مگر میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں بہت کمزور ہوں' نیک دل انسان مسکرا مسکرا کر میری خدمت کرتا رہا-چوتھے روز یا شاید دہ پانچواں روز تھا' عصر کے بعد دونیاں وصول کرنے والے سب لوگ رخصت ہو گئے تو نیک دل درویش نے بڑے پیار سے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اس مسند پر بیٹھ جانے کی درخواست کی-یہی تو میرے دل کی خواہش تھی' میں نے فوراً اس جگہ پر قبضہ کرلیا اور آج بیس برس ہو گئے ہیں-میں اس نیک دل انسان کی سنت پر عمل کر رہا ہوں' حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس جانے والے کا انتظار بھی نہیں-''

یہ ناقابل یقین داستان سنانے کے بعد مسند نشین زیر لب مسکرانے لگا-میں اور نیرؔ واسطی' ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے-ماحول پر مکمل سناٹا طاری تھا' مسند نشین کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ تھی-

داستان کا یہ اختتام غیر متوقع اور چونکا دینے والا تھا' میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہو رہے تھے-مثلاً دونیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ' ایک درویش کا دوسرے انسان کو اپنی جگہ بیٹھا کر غائب ہو جانا اور مسند پر بیٹھتے ہی ایک سنگ دل ڈاکو کی کایا پلٹ جانا...... ہر بات خلاف عقل تھی' مگر کایا پلٹ جانے والا انسان ہماری آنکھوں کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ صاحب بصیرت و بصارت بن چکا تھا-میرا دل شکوک و شبہات کی آماج گاہ بن گیا-آخر حرف مدعا میری زبان پر آ ہی گیا-''یہ کیسا ذخیرہ ہے جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا؟''

''عزیزم فضول باتوں سے گریز کرنا چاہیے-''مسند نشین نے بڑے نرم لہجے میں کہا-اپنے فرض سے مجھے فرصت ملے تو میں ان باتوں کے متعلق غور کروں-''

اچانک فقیر اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرسری لہجے میں کہنے لگا-''آج ایک عرصے بعد تازہ ہوا میں گھومنے کو جی چاہتا ہے-ہوا کا نشہ بھی کتنا شدید ہوتا ہے-''پھر وہ میرے دوست سے مخاطب ہوا-''حکیم صاحب! ناگوار خاطر نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے میری جگہ پر بیٹھ جائیں-''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا- بات بالکل صاف تھی- میں چیخ چیخ کر اپنے دوست کو منع کرنا چاہتا تھا' مگر میری اپنی زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی- ادھر نیرؔ واسطی تو جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا' وہ جھٹ اٹھ کر مسند پر جا بیٹھا- میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ. نی ہو چکی تھی- درویش نے حسرت بھری نگاہ' گردو پیش پر ڈالی اور ٹہلتا ہوا غار سے نکل گیا- میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا-

جب میں نے اپنے دوست کے چہرے کو غور سے دیکھا تو حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا' میں قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ مسند نشین ہوتے ہی نیرؔ واسطی کے چہرے سے' جانے والے درویش کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی' یہ سب کچھ میری ان گناہ گار آنکھوں کے عین سامنے ہوا تھا' مگر میرا دل مان ہی نہیں رہا تھا-

انسان کا دل واقعی بڑی عجیب شے ہے' کوئی اسے معمہ کہتا ہے' کوئی دریا سمندر سے تشبیہ دیتا ہے- میرے دل میں بڑی حقیری خواہش پیدا ہوئی- اتنی حقیر کہ مجھے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی- میں اپنے دوست سے مصلی کا وہ کونا اٹھا کر دیکھنے کی درخواست کرنا چاہتا تھا جسے سرکا کر جانے والا درویش لوگوں میں دونیاں تقسیم کرتا رہا تھا-

''احسان صاحب! فضول خیالات سے پرہیز کریں-'' میرے دیرینہ دوست کی سرزنش بھری آواز مجھے سنائی دی تو میں نے چونک کر اسے دیکھا-'' گویا وہ مسند پر بیٹھتے ہی حقیقی معنوں میں درویش بن گیا تھا' ایسا درویش جو میرے اندر جھانکنے کی قدرت رکھتا تھا- شاید یہ میرا وہم تھا' مگر اس کی آواز' لب ولہجہ ہر شے بدلی بدلی سی تھی' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی آواز جانے والے درویش ہی کی آواز تھی- یہ بڑی عجیب بات تھی اور یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی-

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا رہا' آدھی رات ہوئی تو میری بے چینی کی انتہا ہوگئی- جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا' ادھر واسطی بڑے اطمینان سے مسند پر بیٹھا تھا- اس کے ہونٹ ہل رہے تھے- جیسے درود وظائف میں مشغول ہو- پھر اس نے بڑے نرم الفاظ میں مجھے سو جانے کی تلقین کی-

''مگر...... یہ...... کیسے ممکن ہے-'' میری بلند آواز غار میں گونجی-

''کیا کیسے ممکن ہے عزیزم'' واسطی نے سکون سے پوچھا۔
''بس جناب بہت ہو گئی۔ اٹھ جایئے اس مسند سے اور نکلئے اس سحر زدہ ماحول سے'' میں کوشش کے باوجود بھی آپ جناب وغیرہ کے بغیر بات نہ کر سکا۔
''جلدی کا ہے کی ہے عزیزم'' درویشانہ انداز میں جواب دیا گیا۔ ''اوپر والے کی نگاہ کرم سے ہر شے ٹھیک ہو گئی۔ ابھی نیا سورج طلوع ہو گا۔''
''اور آپ دونیاں بانٹنا شروع کر دیں گے۔'' میں اچانک پھٹ پڑا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا غار کے دہانے پر جا کھڑا ہوا' باہر گھپ اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جانے والے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا' میں افسردگی میں سر جھکا کر الاؤ کے قریب آیا اور سارے معاملے کو نظر انداز کر کے آرام سے لیٹ گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں' مگر ان میں نیند نہیں تھی۔ وہی غار تھا وہی پتھریلی زمین اور وہی دہکتے الاؤ کی سکون بخش حرارت مگر گزری ہوئی اور آج کی رات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہی فرق جو قرار اور بے قراری میں ہوتا ہے۔ میں نے آنکھیں نیم وا کر کے نئے مسند نشین کو دیکھا۔ میرے دل نے اعتراف کیا کہ واسطی کے چہرے پر اتنی رونق پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہ رونق کس نوعیت کی تھی؟ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا' وہ فتح و کامرانی کا نشہ تھا یا اطمینان قلب کا اظہار یا شاید دونوں بہر حال جو کچھ بھی تھا برا نہیں تھا۔ میرے اندر' منفی اور مثبت کے مابین کشمکش سی ہونے لگی اور یہ کشمکش رفتہ رفتہ شدت اختیار کر گئی۔
''یہ سراسر ظلم ہے'' میری آواز غار میں گونجی ''حکیم نیر واسطی' پہاڑ کے کسی گم نام غار میں دونیاں چونیاں تقسیم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ وہ کسی بڑے کام کے لیے پیدا ہوا ہے اور اپنا فریضہ بطریق احسان سر انجام دے رہا ہے۔ اس کی ضرورت بیماروں' دکھ درد میں مبتلا انسانوں کو ہے۔ نواب بیگم اور نواب زادی جیسی خواتین کو ہے۔'' مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا' ایک بات البتہ یقینی تھی کہ ہر بات میرے دل سے نکل رہی تھی۔ اور دل سے نکلنے والی بات بے اثر نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح وہ رات میں نے غار میں ٹہلتے ٹہلتے گزار دی' سورج طلوع ہوا' اندھیری رات مانند آئینہ ٹوٹ کر بکھر گئی مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد' دونیاں وصول کرنے والے حضرات' غار میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ ان میں جانے والے کے حقیقی معتقد بھی ضرور ہوں گے' جب وہ کسی غیر کو مسند پر تشریف فرما دیکھیں گے تو پھر کیا ہو گا...... اس خیال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں غار کے دہانے پر آ کر کھڑا ہو

گیا...... اچانک میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔

ایک شخص دیوانہ وار پتھروں کو پھلانگتا ہوا غار کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان کر سکھ کا سانس لیا۔ جی ہاں! وہ ہمیں چائے پلانے والا' غار کا پرانا مسند نشین درویش ہی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا' میرا دل کہتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا' بلکہ ایسا ہونا چاہئے اس یقین کی بھی کوئی عقلی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔

''چلئے شاعر صاحب' اندر چلیے' ایسا تو کبھی دیکھا نہ سنا...... یعنی حد ہوگئی'' درویش کے پسینے چھوٹ رہے تھے' چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا اپنی مسند کی طرف بڑھا۔ نیرؔ واسطی اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مسند فقیر کے لیے خالی کر دی۔

''حکیم صاحب! اس زحمت کے لیے یہ بندہ ناچیز معافی کا طلب گار ہے۔'' درویش نے مجھے گھور کر دیکھتے ہو کہا'' آپ حضرات فوراً تشریف لے جائیں' یہ جگہ آپ کے لائق نہیں' خلق خدا' کسی اور جگہ حکیم صاحب کی منتظر ہے اور یہاں بھی چند لوگ محو انتظار ہیں'' پھر اس نے ناقابل فہم سی بات کی۔'' سودا نا منظور ہوا۔''

میں نے اپنے دوست کو کلائی سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا غار سے باہر لے گیا۔ حالات کے بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ درویش اپنا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔

ہم غار سے باہر نکلے تو چند لوگ غار کی طرف آتے دکھائی دیئے جو یقیناً زیارت کے لیے آ رہے تھے۔ گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ہمیں ایک شخص ملا جو دو عدد خچروں کی لگامیں تھامے کھڑا تھا۔

''لیجیے جناب! غار نشین نے کمال مہربانی سے ہمارے لیے ''ٹیکسیوں'' کا انتظام بھی کر دیا ہے'' میں نے واسطی سے کہا۔'' یار ایک تو تم شاعر لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہو۔'' نیرؔ واسطی نے سنجیدگی سے کہا میں ان باتوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا' یہ شخص تو روزی کمانے کے لیے یہاں کھڑا ہے۔''

میں نے مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور خچروں والے سے بھاؤ تاؤ کرنے لگا وہ معمولی اجرت لے کر ہمیں ریسٹ ہاؤس تک پہنچا گیا' ہم لاہور پہنچے تو نواب بیگم بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ نواب زادی کی حالت خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی' دوسرے مریض بھی محو انتظار تھے۔

آخری سنت

میں پہلے اپنی زندگی کے رموزوں حقائق پر غور کیا کرتا تھا' لیکن جوں جوں زندگی عمر کی منزلیں مارتی گئی دل میں خود بخود ایسی سنجیدگی آتی گئی کہ دوسروں سے بات کرتے بھی الجھن محسوس ہونے لگی۔ طبیعت خود بخود موت کے رموز پر غور کرنے لگی' میں اکثر لوگوں سے موت کی اصلیت دریافت کرتا' بعض اوقات تو خوف طاری ہو جاتا اور بدن کانپنے لگتا' نماز میں خود بخود رقت طاری ہو جاتی اور یہ خیال غالب رہتا کہ کسی روز موت کا چنگل آ کر دبوچ لے گا اور میں کہیں دور پہنچ جاؤں گا۔ تشنگی کا ایک شعلہ اور محرومی کا ایک جان لیوا احساس مبری رہی سہی قوتیں بھی چھین رہا تھا مگر مایوسی نہیں تھی ہاں تکلیف کا سبب ضرور تھا۔

ایک دن میں نے محسوس کیا کہ کہیں سے کسی سیال کی بوندیں دل پر ٹپک رہی ہیں جس میں درد کی لذت اور کرب کی شیرینی ملی ہوئی ہے۔

میں نے اسی عالم میں ایک نعت کہی اور مقطع میں یہ شعر اترا۔

دانش میں خوف مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز

میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی

اس شعر کا کاغذ پر آنا تھا کہ سینے میں برفیلی ہوائیں بھر گئیں اور میں نے ایک طرح کی ایسی کیفیت محسوس کی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا' اس دن سے موت کا خوف نہ رہا اور یہ یقین ایمان کی حد تک پہنچ گیا کہ اگر موت کو سنت سمجھ لیا جائے تو موت عبادت ہو جاتی ہے اور پھر وہ کیفیت بے ثبات یا عارضی نہیں ہوتی بلکہ دائمی ہے۔

اس کے بعد میری تشنگی اس قوت کی طرف چل پڑی جو نامانوس تو ہے مگر میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کا طالب ہے۔ جس کے ملنے کی نظیر نہیں ملتی' کان اس آواز کے منتظر ہیں جس کی جھنکار ٹوٹے ہوئے دلوں میں گونجتی ہے اور ظاہری سماعت اس سے محروم ہے میری آرزوؤں نے دل کو تو تھپک کر چھوڑ دیا لیکن جہاں تک حقائق کی گفتگو کا تعلق ہے میں ابھی تک گونگا ہوں' میرے ہونٹوں میں وہ سکت نہیں

کتنی دیر لگ جائے گی- میں نے سرسری انداز میں سوال کیا-

''یہ تو مریض کی حالت پر منحصر ہے'' نیرؔ واسطی نے جواب دیا-

میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا- انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا- ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میری تشویش اضطراب میں بدلنے لگی- چند مریض جو صرف ''وہم'' میں مبتلا تھے- انتظار کی صعوبت برداشت نہ کر سکے ور دوا کے بغیر ہی اٹھ کر چلے گئے- جب میرا دوست واپس آیا تو اس کی اپنی حالت مریضوں سے بدتر تھی میں حیران سے زیادہ پریشان ہو گیا-

خیریت تو ہے نا- میں نے پرتشویش لہجے میں پوچھا-

فارغ ہو کر اطمینان سے بتاتا ہوں- یہ کہہ کر نیرؔ واسطی نے منتظر مریضوں کو فارغ کیا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا دوست شدید کرب میں مبتلا تھا- مریض رخصت ہوئے تو میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ لیت و لعل سے کام لینے لگا یہ بڑی حیران کن بات تھی کیوں کہ ہم بے تکلف دوست تھے اور اکثر ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ لیتے تھے- میں مصر ہوا تو وہ اپنے کرب کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گیا وہ کرب جس نے اس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی-

اصل میں نواب بیگم سے خاموش رہنے کا وعدہ کر بیٹھا ہوں- نیرؔ نے کہا-

یہ نواب بیگم کون ذات شریف ہیں- میں نے کرید جاری رکھی-

وہ مفلس خاتون جو مطب میں آئی تھی- اس نے جواب دیا اس کا تعلق ایک ریاست کے نواب خاندان سے ہے- اسی لیے میں نے اسے نواب بیگم کہا ہے اور اتفاق سے اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں اس سے زیادہ نواب خاندان کا ذکر وعدہ خلافی ہوگی- لہٰذا مجھے مجبور نہ کرنا وہ مریضہ جسے میں دیکھنے گیا تھا- نواب زادی تھی- اسی لیے وہ مطب تک نہ آ سکی- میں نے طنزیہ لہجے میں کہا-

''نہیں نہیں- مطب تک نہ آ سکنے کی وجہ خاندانی تفاخر نہیں کچھ اور ہے-'' نیرؔ نے نواب زادی کا دفاع کرتے ہوئے کہا- بات یہ کہ اس کے پاس لباس نہیں تھا- نیرؔ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا-

یہی تو نواب زادیوں کا المیہ ہوتا ہے- میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی'' ہر تقریب کے لیے

مناسب لباس-''
نہیں یار- ماں بیٹی کے پاس اپنی ستر پوشی کے لیے صرف ایک پھٹا پرانا جوڑا ہے اب ظاہر ہے کہ کپڑوں کا ایک جوڑا ایک وقت دونوں کا ستر کیسے ڈھانپ سکتا ہے-
یہ کہہ کر میرے دوست نیرؔ واسطی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے- میں بھی افسردہ ہو گیا- گردش حالات کا رونا میں بھی اکثر رویا کرتا تھا- لیکن تصویر کا یہ رخ بڑا ہی گھناؤنا تھا- اس مفلس نواب بیگم کی غیر معمولی شخصیت کا راز آشکار ہو چکا تھا-
اس خاتون کے ساتھ جب میں اس کے ایک کمرے والے مکان پر پہنچا تو اس کی حالت دیدنی تھی- نیرؔ نے سر جھکا کر سلسلہ کلام جاری رکھا- میں بھی اس سے نظریں ملانے سے کترانے لگا-
میں کمرے میں داخل ہوا تو ننگے فرش پر نواب زادی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی- نیرؔ نے لرزیدہ لہجے میں کہا اور اس نے اپنے جسم کو پرانے اخبار کے کاغذوں سے ڈھانپ رکھا تھا- نواب بیگم اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کر کے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور میں فرط غم اور مارے حیا کے زمین میں گڑے کا گڑا رہ گیا میں لب مرگ مریض کو بھی دیکھ کر کبھی نہیں گھبرایا- لیکن اس مریضہ کو دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا یہ تو ساری انسانیت کو کند چھری سے ذبح کرنے والی بات تھی- ہم انسانی عظمت کے نغمے الاپتے ہیں- مسجود ملائک کی بڑائی کے گیت گاتے ہیں- مگر انسانی دکھوں کا علاج نہیں کرتے- اپنے پڑوسی کی خبر گیری نہیں کر سکتے احسان صاحب، خالق کائنات ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا-
تم نے اس برہنہ مریضہ کا علاج کیسے کیا- میں نے انسان دوست نیرؔ واسطی سے پوچھا-
نواب زادی ناتوانی کا شکار تھی- وہ کمزوری جو فاقہ کشی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے- جان لیوا عذاب سے کم نہیں ہوتی- نیرؔ نے دکھی لہجے میں جواب دیا میں مریضہ کی نبض دیکھے بغیر ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا- لہٰذا خاتون سے اجازت لے کر بازار گیا اور مناسب لباس اور خوراک کا انتظام کر کے لوٹا ماں بیٹی کو تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ انہوں نے آخری کھانا کب کھایا تھا-
تو یہ تھی تمہارے دیر میں آنے کی وجہ، میں نے اپنے عظیم دوست کو ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا-

مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو- نیرؔ نے کہا- میں نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا-

شام ڈھلے ہم دونوں نواب بیگم کے ''عیش محل'' گئے وہ تنگ وہ تاریک کوٹھری تو جانوروں کے رہنے کے لائق بھی نہیں تھی- وہ بات جو میرے حکیم دوست کی نگاہوں سے اوجھل رہی یا شاید اس کا ذکر اس نے عمداً نہیں کیا تھا وہ نواب زادی کا حسن جہاں سوز تھا- اس حسن کو سراہنے کے لیے ''شاعر'' ہونا ضروری نہیں تھا- نواب زادی کا حسن تو کسی بدذوق بنئے کو بھی غزل سرائی پر مجبور کر سکتا تھا-

جب ہم نواب زادی کی عیادت سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس اداس تھے- نیرؔ کی حالت تو واقعی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی- اسی اضطراب میں اس نے کہا- چلو یار اس شہر خرابی سے کہیں دور چلتے ہیں- یہ تو بے درد انسانوں کا ایک مہیب جنگل بن گیا ہے-

''جس بستی میں بھی ہم جائیں گے حالات کم و بیش اسی نوعیت کے ہوں گے میں نے جواب دیا وسائل کی نامنصفانہ تقسیم سے ایسے مسائل تو ہر جگہ پیدا ہو چکے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں- جنگلوں یا بیابانوں میں جا بسیرا کریں تو حالات شاید مختلف ہوں-

مجھے خود وحشت سی ہو رہی تھی- جی چاہتا تھا کہ ہر شے چھوڑ چھاڑ کر کسی اجنبی مقام کی طرف کوچ کر جاؤں پھر اچانک میرے ذہن کے پردے پر بلند و بالا پہاڑوں کا منظر ابھرنے لگا جسے میں نے تصور کا کرشمہ خیال کیا حیران کن بات یہ ہوئی کہ مجھے سامنے والی سپاٹ سی دیوار پر پہلے برف پوش چوٹیاں دکھائی دیں پھر ایک چشمہ ابلتا ہوا نظر آیا اور آخر میں ایک عجیب و غریب غار سا دکھائی دیا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ منظر اتنا واضح تھا کہ تصوراتی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا- یہ تو کوئی نادیدہ ہاتھ مجھے کسی خاص سمت کی جانب دھکیل رہا تھا-

اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟ نیرؔ نے مخاطب کیا تو دیوار کا منظر غائب ہو گیا-

تھوڑی دیر خاموش رہتے تو شاید میں تمہیں بتانے کے قابل ہو جاتا-

اچھا اب خوابوں کی وادی سے باہر نکلو اور اٹھو سفر کی تیاری کریں- کہاں کے ارادے ہیں مولانا؟ میں نے سوال کیا-

تم شاعروں کی ایک حس شائد فالتو ہوتی ہے-- جس کی مدد سے تم لوگ ان دیکھی جگہوں کی سیر کر سکتے ہو- مگر ہم سیدھے سادے انسانوں کو تو جسم کثیف کے ساتھ ہی سفر کی تکالیف برداشت

کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔

حساس دل کو تحریک دینے کے لیے ہلکا سا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور پتھر دل کو زلزلہ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے تو نیرؔ نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو احسان؟ خدا کی قسم بالکل یہی بات میں سوچ رہا تھا مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ عجیب بات ہے سوچا میں نے اور اظہار تمہاری زبان سے ہوا۔

ہم تو اندر کا حال بھی جان لیتے ہیں۔ میں نے مذاقاً کہا۔

اچھا پیر صاحب اب اٹھنے والی بات کریں' نیرؔ نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا میں کوشش کے باوجود بھی اعتراض یا احتجاج نہ کر سکا بلکہ بلا سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم سفر پر تو چل نکلے تھے مگر منزل سے ناآشنا تھے اس کی کوئی عقلی دلیل ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم تو بس بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہتے تھے۔

جب ہم نولکھا ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو راولپنڈی جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ خریدنے کا نہ وقت تھا نہ ہمیں اس کا خیال آیا ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ ٹکٹ ہم نے راستے میں بنوا لیے اور طلوع آفتاب سے پہلے ہم راولپنڈی میں موجود تھے۔ ناشتہ ہمنے ریلوے اسٹیشن پر ہی کیا سورج طلوع ہوا تو ہم ایبٹ آباد کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے صرف ایک بار دبی زبان سے کہا۔ یار یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟ نیرؔ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

ایبٹ آباد میں ہم نے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا میدانی علاقوں میں موسم خوشگوار تھا مگر وہاں ہمیں سردی محسوس ہونے لگی ہم ویسے ہی منہ اٹھائے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے گرم کپڑے تک نہیں لائے تھے۔

اس سردی کا کیا علاج کیا جائے۔ نیرؔ نے کہا۔

حکیم آپ ہیں اور علاج مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں۔

کوہ پیمائی کے متعلق کیا خیال ہے۔ نیرؔ نے عجیب و غریب حل پیش کیا۔ دشوار گزار راستوں پر ترین چڑھیں گے تو سردی خود بخود بھاگ جائے گی۔''

پہاڑ پر چڑھنے کا مجھے تو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا مگر بلندی کے سفر میں لطف آنے لگا اپنی پتنگ

میں ہم جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے- واپسی کا ہمیں خیال ہی نہیں تھا- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے ایک جگہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی بھی آئی اور میرے دل میں سوال پیدا ہوا یہ لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ماحول میں آخر کیوں رہ رہے ہیں؟ اس بستی میں ہم نے موٹی موٹی تنوری روٹیاں گڑ اور لسی کے ساتھ نوش جاں فرمائیں میں دل ہی دل میں مسبب الاسباب کی رزاقی پر عش عش کرا تھا-

سائے لمبے ہونے شروع ہوئے تو اچانک ہمارے سامنے اس قدر دل کش منظر آ گیا کہ ہم دونوں بس مبہوت سے ہو کر رہ گئے- پہاڑی زمین کا وہ ٹکڑا جنت کو شرما رہا تھا- لمبے لمبے درخت پورے جاہ و جلال سے نسبتاً ہموار جگہ کو گھیرے ہوئے تھے- چند ایک ایسے بھی تھے جن کے نام تک سے میں ناواقف تھا- وسیع و عریض قطعات پر لاتعداد پھول جہازی سائز چادروں کی طرح بچھے تھے وہ دل فریب منظر انسانی ہاتھوں کی صناعی کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا- دست قدرت کی کاریگری کا کمال یہ تھا کہ خوبصورتی کی تلاش میں نگاہوں کو ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی- مسحور کر دینے والا حسن پلکوں پر خود آ کر دستک دینے کو بے قرار تھا- اتنا حسین منظر تو میں نے کبھی کسی تصویر میں بھی نہیں دیکھا تھا- قریب ہی ایک چشمہ ابل رہا تھا پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ بے اختیار اسے پینے کو دل مچلنے لگا ہم دونوں نے چلو بھر بھر کر اپنی پیاس بجھائی اچانک نیرؔ واسطی ایک طرف جا کر اپنے کپڑے اتارنے لگا- مولانا' کیا ارادے ہیں؟ میں نے پوچھا-

احسان صاحب' اس پانی میں غسل نہ کرنا کفران نعمت ہے مجھے تو یہ آب حیات دکھائی دیتا ہے- یہ سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا-

خود میرا دل بھی اس چشمے میں ڈبکی لگانے کو بے قرار ہو گیا- جب ہم نے پانی میں قدم رکھے تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا پانی کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا لگ رہا تھا- بہر کیف ہم کافی دیر تک پانی میں چہلیں کرتے رہے- جب ہم باہر نکلے تو غلطی کا احساس پچھتاوے میں بدل چکا تھا- ہم بری طرح ٹھٹھر رہے تھے اور سردی ہماری ہڈیوں تک میں اترنے لگی تھی-

نیرؔ تمہارے ہونٹ تو بالکل نیلے پڑ رہے ہیں- میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا-

تمہارا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں- اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی اگر ہم نے اس

سردی سے نجات حاصل نہ کی تو نا قابل تلافی نقصان کا امکان ہے۔

ہم دونوں سگریٹ نوش نہ تھے۔لہذا ماچس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماچس ہوتی تو آگ جلا کر اپنا علاج کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا سر درد سے پھٹنے لگے اور کانوں میں مسلسل سائیں سائیں ہونے لگی۔ نیئر کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ قرب و جوار میں کسی انسانی آبادی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔لیکن ہم خاموشی سے موت کو گلے لگانے کے سخت خلاف تھے۔لہذا ہم نے بھر پور جدوجہد کا فیصلہ کیا ہم اس دل کش مرگ وادی سے فوراً نکل جانا چاہتے تھے۔ ہمارے سر چکرا رہے تھے ہمیں تو یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون سا علاقہ تھا ہم تو بس بے مقصد گھومتے گھومتے جانے کہاں آ گئے تھے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوئی جب سورج غروب ہوا۔

سورج کو ڈوبتے دیکھ کر ہمارے دل بھی ڈوبنے لگے۔ سردی کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرا بھی ہم پر حملہ آور ہونے کو تیار تھا۔ غروب آفتاب کا صرف ایک فائدہ ہوا کہ عارضی طور پر ہمیں مشرق و مغرب کا اندازہ ہو گیا' عارضی اس لیے کہ ہماری سوچ برق رفتاری سے دھندلا رہی تھی۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا اور موت کو شکست دینی ہے' ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے' دشوار گزار راستے پر چلنے لگے۔ پہلے تو ہمارے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ دکھ درد کا احساس مٹنے لگا ہم جانتے تھے کہ وہ ہماری قوت مدافعت کی آخری حد تھی۔

''سردی کی شدت سے جب قوت مدافعت شکست کھا جائے تو خنکی خوشگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔'' نیئر نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔'' پہلے غنودگی طاری ہوتی ہے پھر نیند کا غلبہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر ہماری آنکھیں بند ہو گئیں تو پھر کبھی نہ کھل سکیں گی۔''

میری آنکھیں تو پہلے ہی نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''خبردار! یہ جھوٹی نیند ہے۔ اسے قریب نہ آنے دینا'' میرے دوست نے لرزتی آواز میں کہا۔ میرے خیالات ایک جگہ ٹک ہی نہیں رہے تھے۔ آخر میں نے نیئر کی بغل میں اپنا سر دے کر اسے سہارا دیا اور نیم تاریکی میں قدم قدم چلنے لگا۔ یہ '' کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے'' والی بات

تھی- دوسرے اس عمل سے جدوجہد کا اظہار ہوتا تھا' واسطی نے بھی تھوڑی دیر بعد ایسا ہی کیا- اس کوشش کے ساتھ ساتھ ہم سرگوشیوں میں ایک دوسرے کی ڈھارس بھی بندھا رہے تھے' پہاڑ کی اندھیری رات' راستہ ناہموار اور ہم نیم جاں' سب کچھ نے مل کر وقت کا احساس مٹا دیا- جب اندھیرے کی چادر زیادہ گہری اور دبیز ہوگئی تو ایک اور مصیبت ہم پر حملہ آور ہوئی-

واسطی کو اچانک ٹھوکر لگی یا جانے کیا ہوا کہ وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گیا- میں نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہو سکا- مجھے صرف اس کے لڑھکنے کی آواز آئی- شاید وہ کسی گہرے کھڈ میں گر گیا تھا' میری ہمت جواب دینے لگی اور میں گھپ اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا' نہ مجھے کچھ دکھائی دیتا تھا نہ بجھائی...... عجیب بے بسی کا عالم تھا- آخر میں نے ہمت کر کے صرف ایک قدم اٹھایا اور میرا بھی وہی حشر ہوا جو میرے دوست کا ہوا تھا- اصل میں ہم دونوں کسی گہرے کھڈ کے کنارے پر جا پہنچے تھے' میں اس گہرے کھڈ میں گرا تو گرتا ہی چلا گیا- پستی کا وہ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا- یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زبردست ہاتھ مجھے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہا ہو- خدا خدا کر کے میں ایک جگہ رکا' مجھے پورا یقین تھا کہ میری ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں گی اور واسطی کے ہاتھ پاؤں بھی سلامت نہیں ہوں گے-

کافی دیر تک جب مجھے کچھ نہ ہوا تو میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹول کر دیکھا- دفعتاً میرا ہاتھ کسی نرم شے سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی- ''احسان! یہ تم ہو؟'' یہ آواز میرے دوست کی تھی اور میں اس کے بالکل قریب گرا تھا- حیران کن بات یہ تھی کہ ہم دونوں زندہ سلامت تھے- اس بات کی عقلی توجیہہ ہو سکتی ہے' ہم ایک ہی جگہ سے یکساں انداز میں گرے تھے- لہذا ایک ہی جگہ یا قریب قریب آ کر رک گئے تھے- اس کے علاوہ کھڈ میں اگی ہوئی جھاڑیوں نے ہمارا بوجھ برداشت کر کے ہمیں بچا لیا تھا' لیکن اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ان دلائل کو رد کر دیا- وہ تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ تھا جس نے دھکا دے کر ہمیں ''راہ راست'' پر لا پھینکا تھا- میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ساری رات اندھیرے میں بھٹکتے رہتے تو بھی اس جگہ نہ پہنچ پاتے جہاں ہم آ گرے تھے-

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر اپنے اپنے وجود کو حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے

رہے، مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی -کوڑھ میں کھاج والی بات کے مترادف اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں، چاروں طرف دردناک چیخیں یوں گونج رہی تھیں -جیسے ہماری وفات حسرت آیات پر ہزاروں چھل پیریاں مل کر بین کر رہی ہوں -اس خوف و دہشت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ سردی کا احساس قدرے کم ہو گیا- یہ طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گزر گیا -اچانک تھوڑے فاصلے پر مجھے ہلکی سی روشنی دکھائی دی، گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی دم توڑتی ہوئی کرن بھی، اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہے-

''وہ سامنے کیا ہے؟'' نیر واسطی نے بمشکل سرگوشی کی-

''شاید دیئے کی روشنی غار سے باہر نکل رہی ہے-'' میں نے مضبوطی سے امید کی کرن کو تھامتے ہوئے جواب دیا- اس کے بعد ہمیں خبر نہیں کہ کس طرح ہم گرتے پڑتے، اس غار کے دہانے تک پہنچے...... اندر کا ماحول دیکھتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم نے موت کو شکست دے دی ہے-

وہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور ہمارے سامنے آگ کا الاؤ دہک رہا تھا- جس سے غار کا اندرونی منظر بڑا خوشگوار لگ رہا تھا، سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ الاؤ کے قریب ایک گدڑی پوش درویش بیٹھا دہکتی آگ پر لکڑیاں رکھ رہا تھا- اس نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اس آگ کے قریب بیٹھ جانے کو کہا، درویش کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے ہماری آمد کی توقع تھی اور یہ کہ ہماری موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی-

الاؤ کے قریب چٹائی پر بڑا خوبصورت مصلیٰ بچھا ہوا تھا جو گدڑی پوش کے لیے مسند کا کام دے رہا تھا، ہم آگ کے قریب قریب لیٹے تو حیرت انگیز طور پر ہماری حالت بڑی تیزی سے سنبھلنے لگی- اس کے بعد تو اس نیکی کے فرشتے نے کمال کر دکھایا-

''جناب! گرما گرم چائے حاضر ہے نوش فرمائیں'' درویش نے یہ بڑے بڑے دو عدد مگ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا...... ہم دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا -گرم چائے اس وقت واقعی ہماری اشد ضرورت تھی اور چائے بھی ایسی فرحت بخش اور لذیذ کہ پہلا گھونٹ بھرتے ہی ہماری رگوں میں حیات آور خون کی گردش تیز ہو گئی -جانے اس چائے میں درویش نے کیا ملا دیا تھا کہ مجھے اپنے جسم و جاں میں توانائی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوئے- نیر واسطی کے

چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔

''کیوں جناب! کیسی ہے طبیعت؟'' درویش نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا ''بعض اوقات مسیحاؤں کو بھی مسیحائی کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔

''آپ تو واقعی آنکھوں والے دکھائی دیتے ہیں۔'' حکیم نیئر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

ہاں صاحب حساس دلوں کے لیے اشارہ اور وہ کیا کہتے ہیں' پتھر دل انسان کے لیے تہہ و بالا کر دینے والا زلزلہ...... واہ صاحب واہ'' اب فقیر کا روئے سخن میری جانب تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ یہ الفاظ میں نے آغاز سفر سے پہلے لاہور میں ادا کئے تھے اور سیکڑوں کوس دور' پہاڑی غار میں بیٹھا وہ رحمت کا فرشتہ میرے الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہ درویش تو قدم قدم پر ہمیں حیران کر رہا تھا۔ میری عقل اس کی وجہ بیان کرنے سے قاصر تھی...... فی الحال تو آپ حضرات آرام فرمائیں' گدڑی پوش نے بڑے رسان سے کہا ''اندر ٹھیک ہو جائے گا تو باہر بھی خیریت دکھائی دینے لگے گی۔ یہ ''ان پانی'' کا نشہ بھی کتنا ظالم ہوتا ہے۔'' اجازت ملتے ہی ہم ننگی زمین پر لم لیٹ ہو گئے اور ایسے بے سدھ ہو کر سوئے کہ صبح کی خبر لائے۔ اپنے دوست کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا' مگر ایسی میٹھی نیند کبھی نصیب نہ ہوئی تھی جو اس رات' درویش کی غار میں پتھریلی زمین پر ہوئی۔

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ایک نئے تماشے کا آغاز ہو گیا۔ جسے ہم دشوار گزار اور ویران علاقہ قرار دے چکے تھے۔ اسی علاقے سے درویش کی زیارت کرنے والوں کی آمد شروع ہو گئی' کئی معتقد اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء بھی لائے تھے۔ درویش ان اشیاء کو فوراً مہمانوں میں بانٹ دیتا اور پھر اپنی مسند کا کونہ اٹھا کر نیچے سے ایک دونی نکالتا اور آنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ (اس دور میں دونی یعنی دو آنے اتنی حقیر رقم نہیں تھی' دونی کی آٹھ روٹیاں آیا کرتی تھیں۔ ایک آنے روٹی والا دور بہت بعد کا ہے) ۔ یہ دونیاں بانٹنے والا سلسلہ عصر تک جاری رہا' جانے درویش کے مصلے تلے دونیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

دن بھر فقیر کے ڈیرے پر کھانے پینے کے علاوہ چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ ہم دونوں نے اب

حیران ہونا چھوڑ دیا تھا' ہم نے کئی بار غار سے باہر جانے کی کوشش کی' مگر ہر بار اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔ نیرؔ بھی بس پہلو بدل کر رہ جاتا اور میں نے تو اس مسحور کن ماحول سے اٹھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔

عصر کے بعد لوگوں کا آنا بند ہو گیا اور ماحول پر بوجھل بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ شام ڈھلنے سے ذرا پہلے درویش نے بڑے رسان سے کہا۔ ''آپ ذرا باہر گھوم پھر آئیں طبیعت بہل جائے گی'' پھر اس نے سرسری لہجے میں کہا ''خوگرفتار پنچھیوں کا اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے نا جی۔''

ہم دونوں غار سے باہر نکلے تو ڈر خوف کا شائبہ تک ہمارے دلوں میں نہیں تھا۔ سارا علاقہ بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا' تھوڑی دور ہمیں وہ گہرا کھڈ بھی نظر آ گیا جس میں ہم دونوں گرے تھے اس کا آغاز کافی بلندی سے ہو رہا تھا۔ اس بات کا فیصلہ کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون سا راستہ ہماری طرف آ رہا ہے اور کون سا ہم سے دور جا رہا ہے۔

''یار احسان! ہم کس گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہیں اور یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' نیرؔ نے غار کے سحر سے آزاد ہوتے ہی کہا۔ ''کیا خیال ہے گھر کو لوٹ چلیں؟''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' میں نے اپنے دوست کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔'' دیکھیں تو سہی پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

''یہ درویش صاحب بصیرت دکھائی دیتا ہے۔'' نیرؔ واسطی نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے' مگر کئی ایک باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں'' آخر دل کی بات میرے ہونٹوں تک آ ہی گئی' یہ دونیوں والا کیا چکر ہے؟''

اس رات ہم نے بے تکلفی سے ہر موضوع پر باتیں کیں۔ غار کے اندر درجہ حرارت معتدل تھا' درویش بھی موج میں آیا لگتا تھا' اچانک نیرؔ واسطی نے دونیوں والا ذکر چھیڑ دیا اور میں نے درویش سے تعارف حاصل کرنے کی خاطر دو تین سوال داغ دیئے۔' درویش تھوڑی دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر لب کشا ہوا۔

''آج سے بیس برس پیشتر' یہ راندہ درگاہ انسان اس علاقے میں خوف و دہشت کی علامت تھا۔'' مسند نشیں درویش نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا'' مائیں اپنے بچوں کو میرا نام لے کر ڈرایا

کرتی تھیں۔ میں اس علاقے کی سیاہ راتوں کا بے تاج بادشاہ تھا' وہ

وہ بادشاہ جسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی میں کوئی تیسرے درجے کا اٹھائی گیرہ نہیں تھا' بلکہ پہلے اعلان کر کے ظلم ڈھاتا تھا اور جب یہ سراپا تقصیر انسان' زمین کا ناقابل برداشت بوجھ بن گیا تو رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ میں ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا جو آپ حضرات کو پیش آئے ہیں۔ وہ رات بڑی ہی بھیانک تھی۔ جب میں گرتا پڑتا اس غار میں پہنچا۔ عین اس جگہ جہاں اب میں بیٹھا ہوا ہوں' میری شکل وصورت کا ایک نیک دل درویش بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سنگ دل کو اپنے سایہ عافیت میں لے لیا' تین روز تک میں ہوش وحواس سے بے گانہ رہا اور وہ نیک دل انسان میری خدمت کرتا رہا۔''

''آپ کے اور ہمارے حالات' ایک جیسے تو نہ ہوئے۔'' نیرؔ واسطی نے بے باک لہجے میں کہا۔ ''ہم تو چائے کی ایک پیالی سے سنبھل گئے تھے۔''

''آئینہ دل ایک جیسا زنگ آلود تو نہیں ہوا کرتا'' مسند نشیں نے مسکرا کر کہا'' آپ حضرات تو پہلے ہی صیقل شدہ تھے۔ آپ کے ساتھ تو بس رسمی سی کارروائی ہوئی ہے۔''

''بہت خوب! اگر یہ رسمی کارروائی تھی تو آزمائش کسے کہتے ہیں۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''محترم! دعا کریں خدا آپ کو آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔'' مسند نشیں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''حساس دل کے لیے اشارہ اور پتھر دل کے لیے تہہ وبالا کر دینے والا زلزلہ۔ یہ بھی تو ذہن میں رکھیے۔'' یہ سنتے ہی نیرؔ واسطی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ جو واسطی کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے' یہ درویش دوسری بار دہرا رہا تھا جس کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ میری اس روز کی بلاوجہ بے چینی' نیرؔ سے ملاقات' نواب زادی کا علاج اور ہمارا سفر' سب کچھ ایک منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ میری عقل اس کا جواب دینے سے بھی قاصر تھی۔

''تیسرے روز جب میرے ہوش وحواس بجا ہوئے تو میں نے اس نیک دل انسان کو دنیاں

تقسیم کرتے ہوئے دیکھا۔'' مسند نشین نے آپ بیتی کا آغاز از سرنو کرتے ہوئے کہا' میرے دل میں فاسد خیالات نے اودھم مچادیا اور میں نے اس خزانے پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا' میرا منصوبہ یہ تھا کہ شب تنہائی میں اس نیک دل انسان کو قتل کر دوں گا اور خزانہ لے کر غار سے نکل جاؤں گا۔ میری توانائی بحال ہو چکی تھی۔ مگر میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں بہت کمزور ہوں' نیک دل انسان مسکرا مسکرا کر میری خدمت کرتا رہا۔ چوتھے روز یا شاید وہ پانچواں روز تھا' عصر کے بعد دونیاں وصول کرنے والے سب لوگ رخصت ہو گئے تو نیک دل درویش نے بڑے پیار سے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اس مسند پر بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ یہی تو میرے دل کی خواہش تھی' میں نے فوراً اس جگہ پر قبضہ کرلیا اور آج بیس برس ہو گئے ہیں۔ میں اس نیک دل انسان کی سنت پر عمل کر رہا ہوں' حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس جانے والے کا انتظار بھی نہیں۔''

یہ ناقابل یقین داستان سنانے کے بعد مسند نشین زیر لب مسکرانے لگا۔ میں اور نیئر واسطی' ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ ماحول پر مکمل سناٹا طاری تھا' مسند نشین کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ تھی۔

داستان کا یہ اختتام غیر متوقع اور چونکا دینے والا تھا' میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ مثلاً دونیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ' ایک درویش کا دوسرے انسان کو اپنی جگہ بیٹھا کر غائب ہو جانا اور مسند پر بیٹھتے ہی ایک سنگ دل ڈاکو کی کایا پلٹ جانا...... ہر بات خلاف عقل تھی' مگر کایا پلٹ جانے والا انسان ہماری آنکھوں کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ صاحب بصیرت و بصارت بن چکا تھا۔ میرا دل شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن گیا۔ آخر حرف مدعا میری زبان پر آ ہی گیا۔'' یہ کیسا [illegible]ہ ہے جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا؟''

''عزیزم فضول باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔'' مسند نشین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ اپنے فرض سے مجھے فرصت ملے تو میں ان باتوں کے متعلق غور کروں۔''

اچانک فقیر اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرسری لہجے میں کہنے لگا۔'' آج ایک عرصے بعد تازہ ہوائیں گھومنے کو جی چاہتا ہے۔ ہوا کا نشہ بھی کتنا شدید ہوتا ہے۔'' پھر وہ میرے دوست سے مخاطب ہوا۔'' حکیم صاحب! ناگوار خاطر نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے میری جگہ پر بیٹھ جائیں۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا- بات بالکل صاف تھی- میں چیخ چیخ کر اپنے دوست کو منع کرنا چاہتا تھا، مگر میری اپنی زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی- ادھر نیرٔ واسطی تو جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا، وہ جھٹ اٹھ کر مسند پر جا بیٹھا- میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ... نی ہو چکی تھی- درویش نے حسرت بھری نگاہ گردوپیش پر ڈالی اور ٹہلتا ہوا غار سے نکل گیا- میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا-

جب میں نے اپنے دوست کے چہرے کو غور سے دیکھا تو حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا، میں قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ مسند نشین ہوتے ہی نیرٔ واسطی کے چہرے سے، جانے والے درویش کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی، یہ سب کچھ میری ان گناہ گار آنکھوں کے عین سامنے ہوا تھا، مگر میرا دل مان ہی نہیں رہا تھا-

انسان کا دل واقعی بڑی عجیب شے ہے، کوئی اسے معمہ کہتا ہے، کوئی دریا سمندر سے تشبیہ دیتا ہے- میرے دل میں بڑی حقیری سی خواہش پیدا ہوئی- اتنی حقیر کہ مجھے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی- میں اپنے دوست سے مصلی کا وہ کونا اٹھا کر دیکھنے کی درخواست کرنا چاہتا تھا جسے سرکا کر جانے والا درویش لوگوں میں دونیاں تقسیم کرتا رہا تھا-

''احسان صاحب! فضول خیالات سے پرہیز کریں-'' میرے دیرینہ دوست کی سرزنش بھری آواز مجھے سنائی دی تو میں نے چونک کر اسے دیکھا- ''گویا وہ مسند پر بیٹھتے ہی حقیقی معنوں میں درویش بن گیا تھا، ایسا درویش جو میرے اندر جھانکنے کی قدرت رکھتا تھا- شاید یہ میرا وہم تھا، مگر اس کی آواز، لب ولہجہ ہر شے بدلی بدلی سی تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی آواز جانے والے درویش ہی کی آواز تھی- یہ بڑی عجیب بات تھی اور یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی-

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے انضطراب میں اضافہ ہوتا رہا، آدھی رات ہوئی تو میری بے چینی کی انتہا ہوگئی- جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا، ادھر واسطی بڑے اطمینان سے مسند پر بیٹھا تھا- اس کے ہونٹ ہل رہے تھے- جیسے درود وظائف میں مشغول ہو- پھر اس نے بڑے نرم الفاظ میں مجھے سو جانے کی تلقین کی-

''مگر........ یہ........ کیسے ممکن ہے-'' میری بلند آواز غار میں گونجی-

''کیا کیسے ممکن ہے عزیزم'' واسطی نے سکون سے پوچھا۔

''بس جناب بہت ہو گئی۔ اٹھ جایئے اس مسند سے اور نکلئے اس سحر زدہ ماحول سے'' میں کوشش کے باوجود بھی آپ جناب وغیرہ کے بغیر بات نہ کر سکا۔

''جلدی کا ہے کی ہے عزیزم'' درویشانہ انداز میں جواب دیا گیا۔ ''اوپر والے کی نگاہ کرم سے ہر شے ٹھیک ہو گئی۔ ابھی نیا سورج طلوع ہو گا۔''

''اور آپ دونیاں بانٹنا شروع کر دیں گے۔'' میں اچانک پھٹ پڑا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا غار کے دہانے پر جا کھڑا ہوا' باہر گھپ اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جانے والے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا' میں افسردگی میں سر جھکا کر الاؤ کے قریب آیا اور سارے معاملے کو نظر انداز کر کے آرام سے لیٹ گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں' مگر ان میں نیند نہیں تھی۔ وہی غار تھا وہی پتھریلی زمین اور وہی دہکتے الاؤ کی سکون بخش حرارت مگر گزری ہوئی اور آج کی رات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہی فرق جو قرار اور بے قراری میں ہوتا ہے۔ میں نے آنکھیں نیم وا کر کے نئے مسند نشین کو دیکھا۔ میرے دل نے اعتراف کیا کہ واسطی کے چہرے پر اتنی رونق پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہ رونق کس نوعیت کی تھی؟ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا' وہ فتح و کامرانی کا نشہ تھا یا اطمینان قلب کا اظہار یا شاید دونوں بہر حال جو کچھ بھی تھا برا نہیں تھا۔ میرے اندر' منفی اور مثبت کے مابین کشمکش سی ہونے لگی اور یہ کشمکش رفتہ رفتہ شدت اختیار کر گئی۔

''یہ سراسر ظلم ہے'' میری آواز غار میں گونجی ''حکیم نیرؔ واسطی' پہاڑ کے کسی گم نام غار میں دونیاں چونیاں تقسیم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ وہ کسی بڑے کام کے لیے پیدا ہوا ہے اور اپنا فریضہ بطریق احسان سرانجام دے رہا ہے۔ اس کی ضرورت بیماروں' دکھ درد میں مبتلا انسانوں کو ہے۔ نواب بیگم اور نواب زادی جیسی خواتین کو ہے۔'' مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا' ایک بات البتہ یقینی تھی کہ ہر بات میرے دل سے نکل رہی تھی۔ اور دل سے نکلنے والی بات بے اثر نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح وہ رات میں نے غار میں ٹہلتے ٹہلتے گزار دی' سورج طلوع ہوا' اندھیری رات مانند آئینہ ٹوٹ کر بکھر گئی مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد' دونیاں وصول کرنے والے حضرات' غار میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ ان میں جانے والے کے حقیقی معتقد بھی ضرور ہوں گے' جب وہ کسی غیر کو مسند پر تشریف فرما دیکھیں گے تو پھر کیا ہو گا...... اس خیال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں غار کے دہانے پر آ کر کھڑا ہو

گیا...... اچانک میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔

ایک شخص دیوانہ وار پتھروں کو پھلانگتا ہوا غار کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان کر سکھ کا سانس لیا۔ جی ہاں! وہ ہمیں چائے پلانے والا' غار کا پرانا مسند نشین درویش ہی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا' میرا دل کہتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا' بلکہ ایسا ہونا چاہئے اس یقین کی بھی کوئی عقلی توجیہہ نہیں ہوسکتی۔

''چلئے شاعر صاحب' اندر چلیے' ایسا تو کبھی دیکھا نہ سنا...... یعنی حد ہوگئی'' درویش کے پسینے چھوٹ رہے تھے' چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا اپنی مسند کی طرف بڑھا۔ نیرؔ واسطی اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مسند فقیر کے لیے خالی کردی۔

''حکیم صاحب! اس زحمت کے لیے یہ بندہ ناچیز معافی کا طلب گار ہے۔'' درویش نے مجھے گھور کر دیکھتے ہو کہا ''آپ حضرات فوراً تشریف لے جائیں' یہ جگہ آپ کے لائق نہیں' خلق خدا' کسی اور جگہ حکیم صاحب کی منتظر ہے اور یہاں بھی چند لوگ محو انتظار ہیں'' پھر اس نے ناقابل فہم سی بات کی۔ ''سودا نا منظور رہوا۔''

میں نے اپنے دوست کو کلائی سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا غار سے باہر لے گیا۔ حالات کے بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ درویش اپنا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔

ہم غار سے باہر نکلے تو چند لوگ غار کی طرف آتے دکھائی دیئے جو یقیناً زیارت کے لیے آ رہے تھے۔ گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ہمیں ایک شخص ملا جو دو عدد خچروں کی لگامیں تھامے کھڑا تھا۔

''لیجیے جناب! غار نشین نے کمال مہربانی سے ہمارے لیے ''ٹیکسیوں'' کا انتظام بھی کردیا ہے'' میں نے واسطی سے کہا۔ ''یار ایک تو تم شاعر لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہو۔'' نیرؔ واسطی نے سنجیدگی سے کہا میں ان باتوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا' یہ شخص تو روزی کمانے کے لیے یہاں کھڑا ہے۔''

میں نے مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور خچروں والے سے بھاؤ تاؤ کرنے لگا وہ معمولی اجرت لے کر ہمیں ریسٹ ہاؤس تک پہنچا گیا' ہم لاہور پہنچے تو نواب بیگم بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ نواب زادی کی حالت خطرناک حد تک خراب ہوچکی تھی' دوسرے مریض بھی محو انتظار تھے۔

آخری سنت

میں پہلے اپنی زندگی کے رموز وں حقائق پر غور کیا کرتا تھا' لیکن جوں جوں زندگی عمر کی منزلیں مارتی گئی دل میں خود بخود ایسی سنجیدگی آتی گئی کہ دوسروں سے بات کرتے بھی الجھن محسوس ہونے لگی۔ طبیعت خود بخود موت کے رموز پر غور کرنے لگی' میں اکثر لوگوں سے موت کی اصلیت دریافت کرتا' بعض اوقات تو خوف طاری ہو جاتا اور بدن کانپنے لگتا' نماز میں خود بخود رقت طاری ہو جاتی اور یہ خیال غالب رہتا کہ کسی روز موت کا چنگل آ کر دبوچ لے گا اور میں کہیں دور پہنچ جاؤں گا۔ تشنگی کا ایک شعلہ اور محرومی کا ایک جان لیوا احساس مبری رہی سہی قوتیں بھی چھین رہا تھا مگر مایوسی نہیں تھی ہاں تکلیف کا سبب ضرور تھا۔

ایک دن میں نے محسوس کیا کہ کہیں سے کسی سیال کی بوندیں دل پر ٹپک رہی ہیں جس میں درد کی لذت اور کرب کی شیرینی ملی ہوئی ہے۔

میں نے اسی عالم میں ایک نعت کہی اور مقطع میں یہ شعر اترا

دانش میں خوف مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی

اس شعر کا کاغذ پر آنا تھا کہ سینے میں برفیلی ہوائیں بھر گئیں اور میر نے ایک طرح کی ایسی کیفیت محسوس کی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا' اس دن سے موت کا خوف نہ رہا اور یہ یقین ایمان کی حد تک پہنچ گیا کہ اگر موت کو سنت سمجھ لیا جائے تو موت عبادت ہو جاتی ہے اور پھر وہ کیفیت بے ثبات یا عارضی نہیں ہوتی بلکہ دائمی ہے۔

اس کے بعد میری تشنگی اس قوت کی طرف چل پڑی جو نامانوس تو ہے مگر میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کا طالب ہے جس کے ملنے کی نظیر نہیں ملتی' کان اس آواز کے منتظر ہیں جس کی جھنکار ٹوٹے ہوئے دلوں میں گونجتی ہے اور ظاہری سماعت اس سے محروم ہے میری آرزوؤں نے دل کو تو تھپک کر چھوڑ دیا لیکن جہاں تک حقائق کی گفتگو کا تعلق ہے میں ابھی تک گونگا ہوں' میرے ہونٹوں میں وہ سکت نہیں

کہ خدا کے انعامات اور زندگی کی عظمتوں کو الفاظ میں ادا کر سکوں۔

کبھی ارادہ بھی کرتا ہوں تو الفاظ روئی کی گیند کی طرح گلے میں اٹک جاتے ہیں اس وقت زبان بند اور آنکھیں بھاری ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی سینے میں ان سنے نغموں کی کپکپاہٹ بھی محسوس تو کرتا ہوں مگر الفاظ کبھی تو دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور کبھی بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔

اب میرے سامنے ایسے مسائل رہنے لگے ہیں جو فہم و ادراک سے بہت دور ہیں لیکن یہ یقین بھی ہے کہ میں اپنی سعی و تلاش میں کامیاب ہو کر رہوں گا' یہ الگ بات ہے کہ جو مجھ پر گزرے وہ کہیں بیان نہ ہو سکے۔

ان دنوں بعض اوقات قدم قدم پر کامیابی کے ریزے بھی دل کو تسکین تو دیتے ہیں لیکن کوئی واضح تعارف نہیں ہوتا۔ اس کے باوصف میری ضدی تشنگی کے ہاتھ سے امید کا دامن نہیں نکلتا' یوں سمجھئے کہ زندگی دو بیداریوں کے ساحلوں میں خواب کے بجرے کی طرح گزر رہی ہے اور میں اکیلا غنودگی کے عالم میں چل رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں۔

علماء کرام

مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، پروفیسر محمد سرور صاحب، حضرت مولانا حافظ محمد احمد، مولانا حبیب الرحمان دیوبندی، حکیم عبدالوہاب (حکیم نابینا) مولانا رسول خان ہزاروی، مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد علی کاندھلوی، مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا حفظ الرحمان سہواروی، مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا محمد میاں صدیقی کاندھلوی، مولانا محمد نعمان، مولانا محمد مالک، مولانا حامد میاں، مولانا احمد بزرگ سورتی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا فخر الدین احمد، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا زکی کیفی مولوی محمد ولی، مولوی محمد رفیع عثمانی، مولوی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولوی سمیع اللہ صاحب، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا سید محمد میاں، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا حبیب الرحمان اعظمی، مولوی ساجد الرحمان صدیقی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا حمید اللہ صاحب، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مفتی جمیل احمد، قاری عبدالعزیز شوقی انبالوی

جب میں دیوبند ایک مشاعرے میں گیا تو میرا قیام مولانا ازہر شاہ قیصر کے یہاں رہا، مولانا ازہر شاہ قیصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری کے بڑے صاحبزادے ہیں، نثر اور نظم دونوں پر دسترس ہے اور دارالعلوم کے رسالہ ''دارالعلوم'' کو مرتب کرتے ہیں اس سے ان کے قلم کی جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، بحیثیت انسان نہایت خوش خلق، حلیم، محنتی اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں ان سے میرے تعلقات آج تک اسی ایک انداز پر چلے آرہے ہیں، وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی حضرت سید انور شاہ صاحب کی طرح اپنا مقام پیدا کرلیں گے، خدا انہیں اس دور کے فتنوں اور

مصائب سے محفوظ رکھے آمین۔ میں لگے ہاتھ ان کے والد مولانا سید انور شاہ کشمیری علیہ الرحمتہ کا ذکر بھی کرتا چلوں تو مناسب ہوگا'

مولانا سید انور شاہ کشمیری

موصوف دار العلوم دیو بند میں صدر المدرسین تھے اور حضرت شیخ الہند کے مخصوص شاگرد وہ ذہن رسا اور حافظے کے اعتبار سے ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھے' حضرت شیخ الہند جہاں مناظرے کے لیے جاتے حضرت مولانا انور شاہ صاحب ہمراہ ہوتے۔ اس وقت دار العلوم دیو بند کے کتب خانے میں قریب قریب ڈیڑھ لاکھ کتب تھیں اور مولانا موصوف کے ذہن میں وہ اسطرح محفوظ تھیں جیسے آئینے میں عکس اگر کبھی ایسا موقع آتا کہ شیخ الہند کیساتھ مولانا انور شاہ صاحب نہ ہوتے تو شیخ الہند فرماتے کہ آج میرا کتب خانہ میرے ساتھ نہیں حوالوں کے لیے دقت پیش آئے گی' کیونکہ جس مناظرے میں کتاب کے حوالے کی ضرورت پڑتی تو کتاب کا نام صفحے کا نمبر اور مصنف کی نشاندہی مولانا انور شاہ صاحب کا کام تھا۔

ویسے بھی انہیں تمام علوم معقولات ومنقولات میں دستگاہ کامل تھی' شاید یہی سبب تھا کہ آپ کے دور کا درس حدیث یادگار درس حدیث کہا جاتا ہے جو بیان وعرفان کے علاوہ ابلاغ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے آپ نے اپنی خداداد ذہانت اور حافظے کے کمال سے درس حدیث کو جامع علوم وفنون بنا رکھا تھا اور آپ کے درس نے اسلامی دنیا میں باہر کے فتنوں کے راستے بند کر رکھے تھے۔

اس گئے گزرے زمانے میں بھی جو علماء علمی اور تبلیغی سندیں لئے بیٹھے ہیں وہ زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ سے نظر آتے ہیں' مولانا انور شاہ کشمیری کو رد قادیانیت میں شغف تھا' وہ اس تحریک کو اعظم الفتن کہتے تھے' اسی سلسلے میں ان کی کئی معرکتہ الآ راء کتابیں بھی ہیں اور بعض تلامذہ کو بھی انہوں نے رد قادیانیت کی راہ پر گامزن کر دیا تھا اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق تصنیف و تالیف میں رد قادیانیت پر اصرار کیا ہے مولانا کے سامنے جب کوئی رد قادیانیت پر کوئی کتاب لاتا تو آپ سنتے اور اصلاح فرماتے اور اس کے ساتھ دعائیں بھی دیتے آپ نے گیارہ بارہ سال دار العلوم دیو بند میں درس دیا اور آپ کے دور صدر مدرسی میں آٹھ سو نو طلباء نے درس حدیث لیا اور اس فن کو تقریر وتحریر

سے دور تک پہنچا دیا۔

ان کے دریائے فیض سے علامہ اقبال بھی فیض یاب ہوئے اور میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے انہیں کے خطوط پر تبلیغ دین کی ہے کیونکہ حقیقت خواہ کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہو پرخلوص نگاہیں اور بھرپور تجسس کے علاوہ سوز و گداز سے مالا مال دل اسے پہچان لیتے ہیں اور جب تک وہ اپنی لگن میں کامیاب نہیں ہوتے بے اطمینانی کا شکار رہتے ہیں۔

عموماً ایسے لوگوں کی نیکی، خلوص، سخاوت اور محبت ہی سرمایہ حیات اور زادراہ ہوتے ہیں۔ جلوہ روحانی کے ساتھ ذہنی بلندی اور اخلاقیات کا سرمایہ انہیں لوگوں سے دستیاب ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے وجدان کی روشنی خود بخود آدمی کا ساتھ دینے لگتی ہے اور عشق خود جنوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔

مولانا انظر شاہ کشمیری

یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، نہایت ذہین اور فطین نوجوان اور زہد و اتقا کے معاملے میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بقدم چل رہے ہیں، خدا انہیں علم کی دولت سے مالا مال کرے، اور کامیاب زندگی عطا فرمائے، میں اپنے علم قیافہ کی رو سے ان میں بلندیاں دیکھ رہا ہوں، خدا کرے وہ ایسے ہی نکلیں جو میرا قیافہ ہے۔ آمین!

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

حضرت نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے اور جماعت کی حیثیت سے اس گروہ کے سربراہ جن کی کوشش اور محنتوں سے ملت میں ایسے ایسے جید عالم دین پیدا ہوئے جنہوں نے علوم القرآن اور تفہیم حدیث پر دن رات محنت کر کے فقہ، حدیث، تفسیر اور درایت سے خدا پرستی اخلاق اور اصلاح کے ساتھ قومی و ملکی امور کے قائد تیار کیے۔

عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کر کر کے دین حق کے راستے سے کانٹے صاف کیے اور رہروان راہ حق کے لیے پگڈنڈیاں نکالیں، اصول اسلامیہ اور اساسی عقائد کو عقلی دلائل سے صاف اور مستحکم کر کے تبلیغ و اشاعت کی چار دیواری کو بلندی اور وسعت دی۔

۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر جو جنگ ہوئی اس میں سپاہیانہ حیثیت سے حصہ لیا۔ معاشرے سے غلط رسم ورواج سے پھیلی ہوئی ابتری کو ختم کیا جس کی تفصیل ''سوانح قاسمی'' میں درج ہے۔

آپ سے ہزاروں انسانوں نے دینی مسائل اور تصوف کے رموز وغوامض کا عرفان پایا' تصنیف وتالیف میں بھی کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں' آپ سے سیکڑوں' ہزاروں تشنگان علم نے استفادہ کیا' آپ کو علم فقہ' حدیث اور تصوف سے شغف تھا' اس راہ کے مسافروں کو انہوں نے راہ راست پر لگا کر ایک اسلامی خدمت انجام دی ہے' بلکہ آپ سے اس دور کے علماء نے بھی تربیت پائی ہے اور انہیں دین کے معاملے میں اس قدر راسخ العقیدہ کر دیا کہ ان پر زمانے کی فتنہ پردازی کا کوئی اثر نہ ہو' گویا کفر والحاد کے راستے بند کر دیئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب میں آپ نے حضرت نانوتوی کے دوش بدوش کام کیا اور نو ماہ اسیر فرنگ بھی رہے' مگر ان کا انقلابی تصور ایک ایسا شعلہ تھا جو بجھنے کی بجائے مشتعل ہوتا چلا گیا' بالآخر ان کا مشن کامیاب ہوا۔

مولانا اشرف علی تھانوی

موصوف معروف عالم دین' فقیہ' محدث اور عارف باللہ تھے' جہاں تک دین کا تعلق ہے مولانا ہر شعبہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے' آپ نے پینتیس برس کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں قرآن و حدیث کا درس دیا اور آپ کے تلامذہ ہندوستان بھر میں تبلیغ دین کرتے رہے خود مولانا تھانوی نے بھی ہندوستان کے کونے کونے پھر کر اپنے مواعظ سے دنیا کو مستفید کیا اور جہاں تک تصنیف وتالیف کا تعلق ہے آپ نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات وتالیفات چھوڑیں' جو مختلف علوم و فنون پر ہیں' آخر میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں سے رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہا اور ہزاروں آدمی ان سے بیعت ہوئے۔

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے مستفید تھے اور آپ کے خلفاء ملک بھر میں اپنی اپنی جگہ اصلاح وتربیت میں مشغول رہے۔

آپ تفسیری مسائل اور مسائل حدیث کے بعض رموز وغوامض میں حضرت نانوتوی ہی سے رجوع کرتے تھے، روحانی تشنگی حضرت حاجی امداد اللہ مکی کے چشمے سے دور کی۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت کا لقب آپ ہی کی ذات بابرکات کو زیب دیتا ہے' آپ کی تبلیغ وتلقین اور تصنیفات و تالیفات سے ہزاروں بندگان خدا کو نیکی کا راستہ ملا اور باطن میں اجالے ہوئے' آپ جب حصول علم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اسی سال حضرت نانوتوی کا وصال ہو گیا اور موصوف حسب دلخواہ استفادہ نہیں کر سکے مگر حضرت نانوتوی کے تلامذہ مثلاً مولانا محمد یعقوب' شیخ الہند مولانا محمود احسن اور مولانا عبدالعلی سے کسب کمال کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی

آپ حضرت قاسم نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کی تبلیغ و توسیع آپ ہی کی ذات سے ہوئی۔ درس وتدریس کے علاوہ ارشاد وتلقین اور جہاد کی تبلیغ کا بے مثال کام آپ نے کیا' وہ نانوتوی علوم ورشد کو امانت خیال کرتے تھے اسی لیے زندگی بھر اسی کی توسیع و اشاعت اور تفہیم ووضاحت میں لگے رہے' حضرت نانوتوی کی کتابوں کی اعلیٰ طباعت میں بھی آپ کی سعی قابل تحسین ہے' حضرت نانوتوی کی تصانیف بھی انہی کی فکر کا نتیجہ ہیں' حجتہ الاسلام کو آپ ہی نے عنوانات دیئے اور قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا' بخاری شریف کے ابواب وتراجم پر ایک جامع اور ضخیم رسالہ لکھا' اس کے علاوہ متعدد مناظرانہ رسالے تصنیف کیے جن سے مسلمانوں کو دین پر قائم رہنے میں بے حد مدد ملی' آپ نے دیوبند میں چالیس سال درس حدیث دیا اور وہیں درس دے کر آٹھ سو ساٹھ (۸۶۰) اعلیٰ استعداد کے صاحبان علم وفن اور علمائے دین رشد وہدایت سے مسلح کر کے اطراف وجوانب میں پھیلا دیئے اور خود بھی مناظرے کر کر کے لوگوں کو گمراہی سے بچایا' آپ کو علمائے عصر نے محدث عصر تسلیم کیا اور آپ نے بیعت وارشاد سے سیکڑوں تشنگان معرفت وطریقت کو

عارف باللہ کر دیا اور یہ سلسلہ ہندوستان سے لے کر افغانستان اور عرب تک پھیلا ہوا تھا۔

ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آپ نے انقلابی تحریک چلائی جسے ریوویلٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے درج کیا گیا ہے' اگرچہ یہ تحریک راز نہ رہ سکی اور اس میں کام کرنے والے مجاہدوں سے ہندوستان کی جیلیں بھر دی گئیں' لیکن جن کے سینوں میں یہ شعلے بھڑکے ہوئے تھے انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرا کے چھوڑا' موصوف پانچ سال مالٹا میں قید رہے مگر وہاں بھی زبان وقلم تبلیغ وتحریر سے باز نہ رہ سکے اور آپ نے کئی ایک تصانیف چھوڑیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی

موصوف سکھ مت سے دائرہ اسلام میں آئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے مخصوص شاگردوں میں تھے' دیوبند سے فضیلت کے بعد جمعیت الانصار دیوبند کے ناظم بھی رہے' ذکاوت وذہانت اور بلا کا حافظہ پایا تھا' دماغ فطری طور پر سیاسی تھا' یورپ اور ایشیا کے کئی انقلاب مشاہدے کا مال تھے' یہی سبب تھا کہ سیاسی عمال کی ساخت وپرداخت اور اصول وضوابط متعین کرنے میں خاص ملکہ تھا' شاید یونہی وہ حضرت شیخ الہند کی تحریک ''ریشمی رومال'' میں پیش پیش تھے اور اسی جرم وفا میں پچیس سال جلا وطن رہے اور اسی دوران افغانستان کی آزادی کی اسکیم مکمل کر لی۔

جلاوطنی کے دوران وہ روس چلے گئے یا بھیج دیا گیا تھا واپس آئے تو مولانا تاجور مرحوم کے ایما پر کشمیر بلڈنگ میں اخبار کے دفتر میں تقریباً دو سو معززین کو مولانا کے اعزاز میں چائے دی گئی اور دو تین علامہ اقبال پر دو مقالے بھی پڑھے گئے اور مولانا عبید اللہ سندھی نے تقریر بھی کی لیکن آج تک وہ تقریر کسی اخبار یا رسالے یا مقرر و سامع نے دہرائی نہیں' مجھے اتنا یاد ہے کہ علامہ اقبال کی دو نظموں کے متعلق انہوں نے کچھ کہا تھا۔ جن میں ایک تو ''اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' اور ایک اسی قسم کی کوئی دوسری نظم تھی۔

یہ مولانا ہی کا دم تھا کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفے کو روشناس کرایا' سندھ ساگر اکیڈمی اور محمد قاسم ولی اللہی سوسائیٹی قائم کی اور ان اداروں نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت

نانوتوی کی تعلیم کو ملک کے عوام تک پہنچایا' میرے خیال سے پیغمبر کے بعد ایسے ہی علماء کی ضرورت تھی جو بندگان خدا کو عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے خبردار رکھتے' مولانا عبیداللہ سندھی نے زندگی بھر شعار رسول اور سیاست کاملہ کی تبلیغ کی ہے انہوں نے قید و بند کی صورت میں بھی اخلاق حسنہ سے زبان کو بغاوت نہیں کرنے دی' وہ ذلت وخرابی کے اندھیروں میں اعمال کی روشنیاں لیے پھرتے رہے اور روحانی تجلیوں سے اپنی مشعلوں کے دونوں سروں کو روشن رکھا' انہوں نے ہر آدمی کے کان تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور یہی بات حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ خدائے تعالیٰ پیغمبر کے بعد علماء میں سے خاص خاص عالموں کو مخلوق کی ہدایت کے لیے متعین فرماتا ہے' اور وہ اللہ جل شانہ کے احکام و رضا سے دنیا کو باخبر کرتے ہیں' غالباً یہی سبب ہے کہ مسلمان آج تک مادیات کے سامنے سربسجود نہیں ہوئے عقل انسانی اپنی جگہ حجت سہی لیکن حجت ناتمام ہے اگر وہ بلوغ و ابلاغ کے بلند منڈیروں تک رسا نہیں ہوتی اور مادہ پرست حق کے راستوں کی دھوپ اور خارزاروں کو دیکھ کر سپر انداختہ نظر آتے ہیں وہ اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ خدمت خلق اور تلاش حق ایسے میوے ہیں جو چکھنے میں کڑوے اور چبانے میں میٹھے ہوتے ہیں حالانکہ یہ مسلمہ ہے کہ مشکلات و شدائد کے پل سے گزر کر ہی عقبیٰ کے مرغزار دکھائی دیتے ہیں لیکن اسی پل پر کہیں لاشیں اور کہیں واپسی کے نقش قدم بھی نظر آتے ہیں۔

پروفیسر محمد سرور صاحب

مولانا عبیداللہ سندھی کی تبلیغ و تعلیم کے سلسلے میں پروفیسر محمد سرور قابل صد تحسین ہیں کہ مولانا سندھی کے بعد انہوں نے جوان کی تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں کتابیں لکھی ہیں ان سے بہت سے تفہیمی راستے کھلتے ہیں اور ان کا یہ مشغلہ برابر جاری ہے۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ جامعہ ملیہ دہلی میں استاد کی حیثیت سے اس ادارے کے رکن تھے وہ نہایت شریف اور محنتی انسان ہیں' انہوں نے سندھ ساگر اکیڈمی کا کتب خانہ بھی اسی خدمت کے لیے کھولا تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی تعلیمات و تفہیمات کو عالم آشنا کرائیں اور وہ اس خدمت میں بڑی حد تک کامیاب ہیں اگر حکومت ذرا بھی سرپرستی کرتی تو وہ بڑا کام کر سکتے تھے' مگر اس اکیلے آدمی نے بھی کم کام نہیں کیا یہ

اور بات ہے کہ جیسا ہونا چاہئے تھا ویسا نہیں ہوا اور نہ ان کے خیالات کا تقابلی مطالعہ عام ہوا جو ضروری بات تھی۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے فرزند ارجمند تھے ۱۸۶۲ء میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے، سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا گویا اپنی علمی زندگی کی بنیادیں کھودلیں۔ بعدازاں عربی و فارسی کی اساسی تعلیم کے لیے گلاؤٹھی ضلع بلندشہر کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے اپنے قریبی عزیز مولانا عبداللہ انبیٹھوی نے ان کی علمی بنیادیں اٹھائیں، اس کے بعد وہ مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں اپنی علمی عمارت کے دیگر حصوں کی اٹھان کے لیے مولانا احمد حسن امروہوی جیسی تعمیر ساز شخصیت کے پاس پہنچے ازاں بعد دارالعلوم دیوبند میں آکر اپنی علمی عمارت پر چھتیں ڈالیں اور پلستر کیا۔ عمارت کی کھڑکیاں دروازے، روشندان اور چپس وغیرہ کے تکمیلی خطوط اس وقت لگے جب انہوں نے دیوبند میں شیخ الہند، حضرت مولانا محمد یعقوب اور گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد سے اکتساب فیض کیا۔

۱۸۸۵ء میں ان کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، اتفاق سے ۱۸۹۲ء میں جب حضرت حاجی محمد عابد نے دارالعلوم کے اہتمام وانتظام سے اپنی معذوری پیش کرتے ہوئے استعفیٰ پیش کیا تو یکے بعد دیگرے دو اشخاص کو یہ ذمہ داری پیش کی گئی لیکن بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، بالآخر حضرت رشید احمد گنگوہی نے ۱۸۹۵ء میں موصوف کو اس عہدہ اہتمام وانتظام کے لیے منتخب کیا اور آنے والے وقت نے ثابت کردکھایا کہ واقعی حضرت گنگوہی کا انتخاب صحیح تھا۔ مدرسہ نے دارالعلوم کی شکل موصوف ہی کے دور اہتمام میں اختیار کی۔ آپ نے اپنے پینتیس سالہ دور اہتمام وانصرام میں دارالعلوم دیوبند کو معنوی اور صوری طور پر ان ترقیوں تک پہنچا دیا تھا کہ برصغیر میں اس کی نظیر نہیں ملتی تھی رہی سہی کسر مولانا حبیب الرحمان دیوبندی نے پوری کردی۔

حکومت برطانیہ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب پیش کیا جسے اس مرد حر نے اپنی غیرت کے خلاف سمجھ کر، قبول کرنے سے انکار کردیا، غالباً فرنگیوں کے ظلم وستم کی خونی داستانیں ان کے ذہن

سے ابھی محو نہیں ہوئی تھیں۔

۱۹۲۸ء میں نظام دکن دارالعلوم دیوبند میں متوقع تھے جس کی یاد دہانی کے لیے موصوف ہی حیدر آباد دکن گئے تھے' طبیعت اس سفر سے پہلے بھی ناساز تھی' مگر انہیں اپنی طبیعت کے مقابلے میں دارالعلوم کی بہتری کا خیال کہیں زیادہ تھا' لہٰذا وہاں پہنچے' اپنا مشن پورا کیا اور لوٹ لیے' مبادا اس کے کہ ان کی گاڑی ابھی حیدر آباد کی حدود عبور کرے' ان کی روح کائنات کے تمام اسٹیشن عبور کر گئی' یہ سانحہ ارتحال ۳ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ کا ہے۔ نظام دکن کے ایما پر حضرت حافظ صاحب کو حیدر آباد کے مخصوص قبرستان خطہ صالحین میں دفن کیا گیا' جو امراء مشاہیر علماء اور شیوخ کے لیے مختص تھا۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب نے مجموعی طور پر ۴۵ سال دارالعلوم کی خدمت کی جس میں ابتدائی دس سال تعلیم و تعلم میں اور بقیہ ۳۵ سال مثالی انتظام و اہتمام میں' اگر قدرت مولانا حبیب الرحمان جیسا نابغۂ وقت دارالعلوم کو نہ بخشتی تو مولانا حافظ محمد احمد کے خلا کو پر کرنا ممکن نہیں تھا۔

مولانا حبیب الرحمان دیوبندی

شہزادگی کا سور بالعموم نہیں اترتا اور اچھوں کی اولاد اکثر و بیشتر اپنے آباؤ اجداد کی اصل رقم کے سود پر زندہ رہتی ہے' لیکن کچھ مثالیں ایسی بھی دیکھنے میں آجاتی ہیں کہ پشت در پشت اولیاء اللہ کی ایک قطار معلوم ہوتی ہے' جیسے اولاد حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی اولاد حضرت مجدد الف ثانی' اولاد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی' وغیرہ انہی نظیروں میں مولانا حبیب الرحمان دیوبندی کا نام لیا جاسکتا ہے جو ولی ابن ولی تھے۔ مولانا فضل الرحمان کے اس درشہوار نے شروع سے آخر تک دارالعلوم دیوبند سے ہی فیض حاصل کیا۔ ۱۳۰۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ان کا تبحر علمی اور عربی دانی کسی تبصرہ کی محتاج نہیں' ان کی انتظامی صلاحیتیں محیر العقول تھیں' دارالعلوم دیوبند کی دن دگنی رات چوگنی ترقی میں موصوف کا بڑا ہاتھ تھا۔

۱۹۰۷ء میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد کو دارالعلوم کے انتظام و اہتمام کے سلسلے میں ایک نائب کی ضرورت محسوس ہوئی تو صرف ایک نام سامنے آیا اور وہ موصوف کا نام تھا' انکار کے باوجود موصوف کو نیابت اہتمام کا منصب عطا کیا گیا۔ انہوں نے دارالعلوم کے پھیلے ہوئے کام کے پیش نظر

اپنا رہائشی انتظام بھی دارالعلوم ہی میں کرلیا تھا- ایک مرتبہ جب نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے دورے پر تشریف لائے اور انہوں نے وہاں کے حساب کتاب کا جائزہ لیا تو اعتراف کے طور پر کہا ''کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کردیا گیا ہو'' حضرت محمد احمد صاحب بھی انتظام و اہتمام میں ستون کا مقام رکھتے تھے لیکن اس میں برق رفتاری کا عمل مولانا حبیب الرحمان ہی کی وجہ سے شروع ہوا-

اکابر دیوبند میں مولانا انور شاہ کشمیری کا مطالعہ ضرب المثل تسلیم کیا جاتا تھا' اب انہی کا قول موصوف کے متعلق ملاحظہ فرمایئے ''اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمان ہیں-''

ہر چند کہ موصوف دارالعلوم کے انتظام و انصرام میں ہمہ وقت غرق رہتے تھے' لیکن اس مصروفیت میں بھی موصوف نے ''اشاعت اسلام المعروف بہ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا-'' اور ''تعلیمات اسلام'' جیسی گرانقدر کتابیں تصنیف فرمائیں-

قیاس غالب ہے کہ موصوف اگر دارالعلوم کے اہتمام میں ڈوب نہ جاتے تو یقیناً اپنے مطالعے کے بل پر معاصرین میں کثیر التصانیف ہوتے- ۱۹۲۹ء میں انتقال فرمایا اور دارالعلوم کو انتظام و اہتمام کے وہ اصول و قواعد اور سلیقہ بخش گئے کہ دنیا بھر کی اسلامی یونیورسٹیوں کے منتظمین یہاں کا انتظام دیکھ کر چکرا جاتے ہیں-

میں تو اسے موصوف کی عظیم قربانی ہی کہوں گا انہوں نے اکابرین دیوبند کی توقیر کی خاطر اپنی فطری صلاحیت اور ٹھوس علمیت کو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی بجائے دارالعلوم دیوبند کے انتظام و اہتمام کی نذر کردیا' اس قسم کی قربانی کا تصور اس دور میں شاذ تھا اور آج ناپید ہے-

حکیم عبدالوہاب

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کچھ ایسی نابینا ہستیاں بھی پیدا کی ہیں جن کی بے بصارتی پر بصیرت قربان کردینے کو دل چاہنے لگتا ہے- انہی ہستیوں میں سے حکیم عبدالوہاب معروف بہ حکیم نابینا بھی ہیں- یوسف پور' مشرقی یو-پی کے ضلع غازی پور میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے موصوف وہیں پیدا ہوئے'

معروف سیاسی شخصیت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی تھے' بچپن ہی میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے- دس سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا' عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے قصبے ہی میں پڑھ لی تھیں' علمی پیاس بجھانے کی خاطر دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا' یہاں تک کہ ۱۳۰۰ھ میں یہاں سے فارغ التحصیل ہو گئے' موصوف کے اساتذہ کرام میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی جیسی نابغہ وقت ہستیاں شامل ہیں-

علم طب کی تعلیم حکیم محمود خان سے دہلی میں حاصل کی' فہم وادراک کے دریچے کھل جانے کے بعد موصوف نے دل کے دروازے پر دستک دی' حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اس آواز پر معاونت کے لیے بڑھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے بالآخر یہ صدر دروازہ بھی کھول دیا- ایک مرتبہ حکیم صاحب نے اپنے پیرومرشد سے التجا کی کہ حضرت دعا فرمادیں کہ میری بے بصارتی مرض وتجویز میں آڑے نہ آئے' حضرت گنگوہی نے دل سے دعا فرمائی' اس کے بعد حکیم نابینا صاحب کا بیان ہے- ''میں شیخ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں' نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ پر مریض اور مرض کی تمام کیفیت منکشف ہو جاتی ہے-

حکیم صاحب موصوف مرض اور تجویز دونوں پر مہارت تامہ رکھتے تھے- ان کی کتاب ''اسرار شریانیہ'' علم النبض پر پہلی اور آخری کتاب ہے-

ایک زمانہ تھا کہ اگر برصغیر میں کسی مطب کا نام لیا جاتا تو وہ حکیم نابینا ہی کا مطب ہوتا تھا' افسوس کہ ان کے خاندان میں اب کوئی مرد نہیں اور اس یگانہ روزگار خاندان کی کچھ بیبیاں موصوف کی کچھ پیٹنٹ دوائیں تیار کرتی ہیں جو اب بھی مریضوں کے اندھیروں کو کافی کچھ چھانٹ دیتی ہیں-

آج حکیم نابینا تاریخ نہیں بلکہ داستان معلوم ہوتا ہے- ان کا مطب' مطب سے کہیں زیادہ دینی درسگاہ تھی' اور یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ آیا اس مطب پر مریض زیادہ آتے ہیں یا علماء وعرفاء

یہ قدروں کا قلاش دور کیا یقین کرے گا کہ حکیم نابینا دیوبند (مادر علمی)' گنگوہ' (مادر باطنی) اور یوسف پور (جائے پیدائش) کے کسی مریض سے بلا امتیاز مذہب تشخیص وعلاج کا ایک بھی پیسہ قبول نہ کرتے تھے علاوہ ازیں عالم اور صوفی چاہے وہ کہیں کا ہو مفت علاج کرتے تھے-

آخر ۱۳٦۰ھ میں اللہ رب العزت نے حکیم نابینا کو ہمیشہ کے لیے بینا کر دیا- انتقال دہلی

میں ہوا - لیکن ان کے جسد خاکی تک نے گوارا نہ کیا کہ وہ شیخ سے دور رہے لہذا مرتے وقت زبان پر آخری وصیت یہ تھی کہ مرنے کے بعد مجھے گنگوہ شریف دفن کیا جائے - ان کی وصیت پوری کی گئی اور موصوف کے پیر و مرشد حضرت گنگوہی کے قرب میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آسودگی نصیب ہوگئی -

مولانا رسول خان ہزاروی

ضلع ہزارہ میں اچھڑیاں پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے' مولانا رسول خان صاحب وہیں پیدا ہوئے - قرآن' عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم وطن کے مدارس میں ہی حاصل کی' تلاطم علم انہیں دیو بند بہالے آیا اور انہوں نے ۱۳۲۰ھ میں دار العلوم میں داخلہ لے لیا اور منطق و فلسفہ کے معروف استاد حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزاروی سے تقریباً تین سال تک مستفید ہونے کے بعد ۱۳۲۳ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے -

ان کی علمی استعداد کا یہ عالم تھا کہ تعلیم سے فراغت پاتے ہی وہ مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ ضلع مظفر نگر یو پی میں صدر مدرس مقرر ہوگئے - پھر ۱۳۳۳ھ میں ان کے اساتذہ نے انہیں واپس دیو بند بلا لیا اور مدرسی عنایت کی - یہاں انہوں نے ۱۳۵۳ھ تک اپنے خاص ذوق یعنی فلسفہ و منطق کی تعلیم بھی دی اور ساتھ ساتھ دیگر دینی علوم اور حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے - ۱۳۵۳ھ میں موصوف یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد کی حیثیت سے آگئے اور ۱۹۵۴ء میں اسی درسگاہ سے ریٹائر ہوئے - تدریس چونکہ زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکی تھی لہذا جب جامعہ اشرفیہ کی طرف سے صدر مدرسی کی پیش کش ہوئی تو اسے قبول کر لیا اور جسم و جان کے اختلاط تک اسی دینی درسگاہ میں خدمت دین کرتے رہے -

ایک بات بڑے دکھ سے کہنی پڑتی ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں میں اکثر و بیشتر اساتذہ علم کے نہیں بلکہ کتابوں کے عالم ہوتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں ان کی کتاب سے ہٹ کر علم پر گفتگو ہوئی تو وہ بالکل پیدل نکلے - مولانا رسول خان ہزاروی ان اساتذہ میں سے تھے جن کا علم صرف درسی کتاب تک محدود نہیں بلکہ ان کی نظر نے علم کا احاطہ کیا ہوا ہے - انہیں یونیورسٹی اورینٹل

کالج لاہور میں بلانے کا غالب سبب یہی تھا کہ وہ واقعی علم کے ماہر تھے نہ کہ کتابوں کے۔ انہوں نے تقریباً ستر سال تدریس کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

آخر میں دیگر اکابرین علم کی طرح وہ بھی علم کی تنگ نائے سے نکل کر تصوف کے متلاطم سمندر میں غوطہ زن ہوئے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوئے یہاں تک کہ خلافت حاصل کی، شریعت وطریقت کی چہار دیواری میں ایک سو تین سال گزار کر بالآخر یہ مومن اور خدا دوست ۳ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ کو اپنے وطن اچھڑیاں ضلع ہزارہ میں واصل حق ہو گیا۔

مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی

حضرت شاہ محمد حسن متوفی ۱۳۱۲ھ کے وہ صاحبزادے تھے جسے بجا طور پر صدقہ جاریہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ مادرزاد ولی تھے (ان کے اساتذہ اور شیوخ کی شہادتیں اس کی گواہ ہیں) قرآن کریم اور فارسی کی بنیادی کتب کی تعلیم قبلہ والد صاحب ہی سے حاصل کی، علمی بلانوشی انہیں دارالعلوم تک لے آئی اور ۱۳۱۰ھ میں وہ فارسی سے سیر ہو گئے ازاں بعد عربی شروع کی اور دس سال تک اس کی غواصی میں گزار دیئے۔

۱۳۲۱ھ میں وہ عربی وفارسی کے سمندروں سے سیپیاں چننے کے عمل سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ جوہر شناس حضرت شیخ الہند کی بصیرت نے انہیں جالیا، چنانچہ جون پور کی مشہور مسجد و مدرسہ ''اٹالہ مسجد'' کے مدرسے کی صدر کی مسند پر بٹھا دیا، جہاں اہل جون پور ان کے دریائے علم وعرفان سے تقریباً سات سال تک سیراب ہو.تے رہے۔

۱۳۲۸ھ میں جب دارالعلوم دیوبند سے ایک پرچہ ''القاسم'' نکالنے کا پروگرام مرتب ہوا تو میاں صاحب کو جون پور سے واپس بلا لیا گیا اور یہ ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی لیکن میاں صاحب صرف پرچے کی حد تک محدود نہ رہے بلکہ مختلف کتابوں کی تدریس بھی ان کے سپرد رہی۔ یہ معلوم ہونا قدرے مشکل ہے کہ تدریسی کام کے لے انہیں کہا گیا تھا یا انہوں نے خود اس کی خواہش کی تھی۔ ان کے درس میں عموماً تفاسیر واحادیث کی کتابیں رہتی تھیں، میرے محترم ومکرم جناب پروفیسر علامہ نور الحسن صاحب جنہیں میاں صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، کا بیان ہے کہ میاں صاحب ہمیں

سنن ابی داؤد پڑھایا کرتے تھے' گھر سے پڑھانے کے لیے کبھی پوری کتاب نہیں لایا کرتے تھے بلکہ کتاب کا جو حصہ پڑھانا مقصود ہوتا۔ بس اتنے ہی اوراق اس انداز سے لاتے کہ ایک ہاتھ میں وہ اوراق ہوتے اور ان سے تقریباً آنکھوں کو ڈھانکے ہوئے گھر سے نکلتے اور اسی طور دارالعلوم تک آجاتے۔ درس شروع ہوتا تب بھی یہی عالم ہوتا اور بدستور آنکھوں کو انہی اوراق سے ڈھکے رہتے' میاں صاحب عقل وادراک کی گولوں سے کم اور وجدان وعرفان کی پگڈنڈیوں سے زیادہ متاثر کرتے تھے۔ درس کے دوران شدت سے یہ بات محسوس ہوتی تھی کہ میاں صاحب درس کو دل ودماغ میں انڈیل رہے ہیں۔

اہل اللہ کی یہی سنت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ خدمت خلائق کے گوشے تلاش کرتے رہتے ہیں' انہیں رخوں میں سے میاں صاحب نے ایک رخ تعویذات اور عملیات کا تھاما ہوا تھا۔ لوگ بلاامتیاز مذہب پورے برصغیر سے دیوبند آتے اور بامراد واپس لوٹتے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی بھی بزرگ کے آستانہ پر یہ نہیں دیکھا کہ وہاں غیر مسلم مہمانوں کے لیے عبادت گاہ کا اہتمام کیا گیا ہو۔ ہاں یہ میاں صاحب ہی کی لاثانی ہستی تھی جس نے اپنے ہی گھر کے ایک حصے میں ایک کمرہ اس کام کے لیے مختص کر رکھا تھا اور اس پر ''عبادت خانہ'' کا ایک بورڈ بھی آویزاں تھا میں نے اس وسعت نظری کو پورے برصغیر میں ناپید پایا ہے۔

روحانیت میں میاں صاحب بیک وقت دو چشموں سے سیراب ہوئے خاندان میں اپنے ماموں حضرت میاں جی منے شاہ صاحب سے اور باہر حضرت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے میاں صاحب کو ان دونوں مقربین الٰہی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

میں نے معتبر حضرات سے سنا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں ایک صاحب انہیں گجرات راندیر لے گئے' جہاں ان کی حویلی میں جنات نے قبضہ کر لیا تھا۔ میاں صاحب جب وہاں پہنچے تو ان کے پاس ایک جن بصورت انسان آیا جس کے ہاتھ میں بہت بڑا پنجرا تھا جس میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے جانور تھے' اس نے کہا میاں صاحب' اس حویلی میں ہم اتنے رہتے ہیں' آپ ہمیں یہاں سے نہ نکالیں' لیکن میاں صاحب پہلے سے اس حویلی کے مالک سے وعدہ کر چکے تھے اس لیے انہوں نے اس جن سے اپنی معذرت ظاہر کر دی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ میاں

صاحب کی موت کا سبب یہی جن بنے تھے- (گجرات جاتے وقت بعض قریبی دوستوں سے میاں صاحب اپنی موت کی طرف اشارہ کر گئے تھے) واللہ تعالیٰ اعلم- لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ارادت مندوں کی پرزور دعوت پر وہ ۱۳۶۳ھ میں گجرات (راندیر) تشریف لے گئے تھے اور وہیں ۲۲ محرم ۱۳۶۴ء بروز دوشنبہ حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوا اور سرزمین گجرات ہی کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی کہ وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ایک دوست کا جسد مبارک اپنے سینے میں محفوظ کر لے-

میاں صاحب نے دیوبند میں ''دار المسافرین'' نامی ایک مسافر خانے کی تعمیر بھی کرائی تھی' اور خاندانی دینی مکتب جوان کے والد ماجد کی وفات کے بعد بند ہو گیا تھا' اس کا ازسرنو اجرا کیا- آخری عمر میں انہوں نے دیوبند میں ایک بڑا معیاری دینی کتب خانہ قائم کیا تھا جہاں سے بڑی بڑی مستند کتابیں چھپیں- اپنی کم فرصتی کے پیش نظر میاں صاحب نے اس کتب خانہ کو جناب مفتی شفیع مرحوم و مغفور کو عطا کر دیا تھا' پھر جب مفتی صاحب پاکستان تشریف لے آئے تو یہ کتب خانہ بھی یہیں لے آئے تھے

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

مولانا موصوف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ مجاز اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے تلامذہ میں سے تھے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ذہانت اور تخلیقی دماغ پایا تھا' علم سے فراغت کے بعد اپنے والد محترم کے ساتھ مدینہ طیبہ چلے گئے اور اٹھارہ برس وہیں درس حدیث اور دیگر علوم و فنون پڑھائے اس مدت میں جو زندگی بسر ہوئی وہ نہایت زہد و قناعت کا دور تھا اور آپ نے نہایت شکر و تحمل سے گزارا مدینے کے دوران قیام یعنی ۱۳۱۸ھ میں آپ ہندوستان تشریف لے گئے -دو سال رہ کر پھر مدینہ واپس آئے اسی سال پھر واپسی ہو گئی-

۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حجاز ہی میں اسیر کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے- اور ۱۳۳۸ھ میں مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ ہندوستان گئے' اکابر کے ایما پر جامعہ اسلامیہ امروہہ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ عالیہ میں

صدر مدرس ہو گئے' لیکن ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر تقرر ہو گیا اور ۱۳۴۵ھ تک سلہٹ ہی میں قیام پذیر رہے پھر جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ڈابھیل تشریف لے گئے تو دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا۔

آپ اونچے درجے کے محدث اور علم حدیث کے معروف اسکالر تھے یہی قابلیت' ذہانت اور علمیت تھی کہ آپ دارالعلوم میں ۳۲ برس ناظم تعلیمات اور صدر مدرس رہے' آپ نے تصوف اور سیاست پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں اور ۴۴۸۳ طلبہ آپ سے بخاری اور ترمذی پڑھ کر دورہ حدیث سے فارغ ہوئے۔

اتنی مصروفیت کے باوصف آپ اسلام کے سیاسی رخ سے بھی غافل نہ تھے بڑی ہی تندہی سے فرائض انجام دیتے تھے' جمعیۃ العلماء ہند کے کئی بار صدر ہوئے اور کانگرس کے مشہور قائدین میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔

مولانا حسین احمد مدنی ہندوستان میں تحریک آزادی کے ایسے کارکن تھے کہ کئی بار قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں بالآخر ملک کو آزاد کرالیا میرے خیال سے ایسے عالم دین کو اسی طرح شیخ وقت' مجاہد' جری اور اولوالعزم ہونا چاہئے' کیونکہ فقیہ وہ ہے جو صوفی بھی ہو اور صوفی وہ ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کو عزیز جانے۔

اصل میں نور ہدایت بھی ایسے ہی صابر' شاکر اور قانع کے علاوہ محنتی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو حقیقت کی تلاش اور خدمت خلق میں خون پانی ایک کئے رکھتے ہیں' یہی لوگ اپنی روحانی کیفیتوں کے دجلہ فرات پر اپنے خیمے نصب رکھتے ہیں اور طرز آدمیت کی ترویج پر سوچتے رہتے ہیں' اس طرز آدمیت کی جو آبادیوں کے جرم و گناہ ختم کرتی اور زمان و مکان' سے دور سرحدوں پر مستقبل کے حرکات و سکنات کے مناظر دکھاتی رہتی ہے' اس کے سامنے شعور شرافت اور جمال انسانیت کا سرچشمہ گنگناتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے قول و عمل کے نتائج توقعات سے زیادہ اور جلدی برآمد ہوتے ہیں' اس لیے کہ خدا کی رحمت اور قدرت کی طاقت ان کی اعانت اور دستگیری کرتی ہے۔

ماورائیت کا فلسفہ ایسے ہی لوگوں کے حالات اور واقعات پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے' لیکن جب تک ابدی قوتیں اثاثہ حیات میں نہ ہوں اس وقت تک انسانی جسم کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور

زمین کی مٹی روح کے پاؤں نہیں چھوڑتی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی ۱۳۱۰ھ میں بہار کے ایک چھوٹے سے علاقے استھانواں میں پیدا ہوئے جہاں موصوف کی ننھیال رہتی تھی' لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ جو نسبت لگائی' وہ ان کی آبائی جگہ گیلانی کی نسبت سے تھی۔ جو لوگ گیلانی کی نسبت کو حضرت سیدنا عبدالقادر گیلانی سے قائم کرتے ہیں وہ درست نہیں عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا سید ابوالنصر سے پائی' علم معقولات میں ان کا خاندان پورے ہندوستان میں مشہور تھا' یہی وجہ ہے کہ ۱۳۲۴ھ میں انہیں ریاست ٹونک بھیج دیا گیا کیونکہ اس وقت معقولات کے یگانہ روزگار عالم مولانا برکات احمد وہیں مقیم تھے۔ موصوف سات سال تک اسی صحرائے معقولات کی خاک چھانتے رہے۔

ازاں بعد موصوف نے والدین بلکہ خاندان کے خلاف ضد کر کے ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیو بند میں درہ حدیث میں داخلہ لے لیا اور ۱۳۳۲ھ میں یہیں سے کتب حدیث کی سند حاصل کی۔ دوران قیام دیو بند حضرت شیخ الہند' حضرت انور شاہ کاشمیری اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے فیضانہائے نظر سے موصوف کے جتنے بھی معقولات کے قلعے تھے' ایک ایک کر کے سب مسمار ہوتے چلے گئے اور اب ذہن کی کھڑکیاں تفسیر و حدیث اور دل کے روشندان تزکیہ و احسان کی طرف کھلنے لگے۔ مولانا نے جب زمانہ طالب علمی میں ''حضرت ابو ذر غفاری'' کے عنوان سے کتاب لکھی تو اسے دیکھ کر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے بے ساختہ فرمایا تھا کہ اس کتاب کا مصنف کسی وقت اسلام کا محقق ہوگا۔

دیو بند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا کچھ عرصہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے' یہی وہ دور ہے جب انہوں نے اپنے علمی و ادبی' دینی' تحقیقی اور اجتہادی مضامین لکھ کر مشاہیر وقت سے اپنا لوہا منوالیا۔

۱۹۱۹ء میں مولانا کا اتفاقاً حیدر آباد دکن جانا ہوا۔ یہاں علامہ حمید الدین فراہی سے ان کی ملاقات ہوئی' دوران گفتگو علامہ موصوف مولانا کے علمی بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں کو پہچان گئے

اور مولانا سے اپنی خواہشوں کا یوں اظہار کیا کہ اگر آپ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت ٹیچر تشریف لے آئیں تو طلباء آپ سے اکتساب فیض کر سکیں گے، لیکن علامہ صاحب کے اس مشورے کو مولانا نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس بات کا کسی طرح اکابرین دیوبند کو علم ہو گیا۔ انہوں نے مولانا کا جامعہ عثمانیہ میں چلے جانا تبلیغ دین کے لئے انتہائی ضروری سمجھا اور وہاں چلے جانے پر زور دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں اکابرین کے کہنے پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبہ دینیات میں لیکچرار مقرر ہو گئے ازاں بعد ریڈر پھر پروفیسر اور بالآخر صدر شعبہ دینیات۔ ۱۹۴۹ء میں تدریسی زندگی کو خیر باد کہہ کر ریٹائرمنٹ لے لی۔

یہ امر یقینی تھا کہ جامعہ عثمانیہ سے وہ جیتے جی کبھی بھی ریٹائر نہ ہوتے اس لیے کہ جامعہ کی انتظامیہ ان کی اور ان کے علم و عرفان کی شیدائی تھی اور وہ خود بھی جامعہ کو اپنی ذات کا جزو لاینفک سمجھتے تھے، لیکن سقوط حیدرآباد نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ نیا اقتدار اور نئی انتظامیہ مولانا جیسے اجتہادی جرأت کے مالک مومن کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

نتیجۃً مولانا اپنے آبائی وطن گیلانی لوٹ تو آئے مگر ''آہ حیدرآباد'' اکثر و بیشتر ان کے لبوں پر رہتا تھا۔ پھر جس گاؤں میں انہوں نے آخری دن گزارے اس کی دل دوز کیفیت وہ خود بیان کرتے ہیں ''آج کل ایک گاؤں اور وہ بھی ایسے گاؤں میں آ کر مقیم ہو گیا ہوں۔ کہ جہاں شریف مسلمانوں کے صرف دو خاندان باقی رہ گئے ہیں'' پھر نوبت بہ ایں جا رسید کہ گھر تک لٹ گیا۔ مولانا کا ایک ہی فرزند تھا اور وہ بھی پاکستان میں مقیم جس کی طرف سے مولانا مطمئن نہ تھے۔ ظاہر ہے مولانا جتنے بڑے ظرف کے مالک تھے، ان کی تکلیفیں بھی اتنی ہی بڑی تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات ناقابل تسخیر مقامات انہیں تکلیفوں سے طے کرائے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۳ھ کے بعد مولانا کو قلبی دورے پڑنے لگے جبکہ سانس کی مزمن تکلیف اس پر مستزاد تھی۔ ایک وقت آیا کہ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کو ان کے حق میں انتہائی مہلک قرار دے دیا۔ لیکن نہ مولانا اس پرہیز پر پورے اتر سکتے تھے اور نہ اترے ''سوانح قاسمی'' اور تصوف پر کچھ تحقیقی مضامین اسی نازک ترین دور کی تخلیقات ہیں۔ تین سال کی سخت علالت کے بعد ۵ رجون ۱۹۵۶ء کی شب کو مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے مالک حقیقی کے پاس اتنے دبے پاؤں پہنچ گئے کہ اس کی آہٹ ان کی چارپائی سے لگی چارپائی پر ان کے چہیتے

بھائی مکارم احسن کو بھی نہ ہو سکی۔

میری ذاتی لائبریری ان کی میں دس کتابیں اور کچھ رسالوں کے نمبر موجود ہیں جن میں الفرقان لکھنو کا مجدد نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر' جیسی عرق ریزیاں بھی موجود ہیں۔مولانا کی تصانیف تبصرہ کی محتاج نہیں۔

مولانا اچھا شعر کہنے پر بھی قادر تھے اور کبھی کبھار جب شعر انہیں مجبور کر دیتا تھا تو کہہ بھی لیتے تھے مگر انہوں نے کبھی شعر کو مجبور نہیں کیا شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار دیوان کی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

حضرت مولانا گیلانی میاں اصغر حسین دیوبندی کی طرح مجذوب سالک ہو گئے تھے۔وہ اپنے آپ کو نیلے تہہ بند اور لمبے سے کرتے میں چھپانے کی جتنی کوشش کرتے' ان کی درویشی اتنی ہی آشکار ہوتی تھی۔راہ سلوک میں مولانا نے پہلے حضرت حبیب العیدروس قادری کا دامن پکڑا اور جب تشنگی دور نہ ہوئی تو ایک چشتی بزرگ مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کی غلامی اختیار کی جہاں ان کی سیری ہوگئی یہاں تک کہ اس بارگاہ سے بھی انہیں خلافت عطا ہوئی۔مگر بلانوشی کے لیے صابری کا سلسلہ مقدر تھا۔

ہر چند کہ حضرت مولانا گیلانی سلوک کے دو دو چشموں سے سیراب ہوئے تھے لیکن اپنے مقام کو اس حد تک چھپاتے تھے کہ باوجود اصرار کے پوری زندگی فرد واحد کو بھی مرید نہ کیا۔لاریب مولانا اس نوع کے عالم تھے کہ اگر لوگ انہیں اپنی بصیرت سے پہچان لیتے تو زمین پر نہ چلنے دیتے اور ان کے قدموں کو اپنے دلوں اور آنکھوں پر لیتے۔

مولانا محمد علی کاندھلوی

جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے یہ بھی کاندھلہ کی علمی روایت کے وارث ہیں۔آج کل سیالکوٹ میں شہابیہ دار العلوم کے مہتمم اعلیٰ ہیں اور سینکڑوں تشنگان علم ان کے علم و عرفان سے فیض یاب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔یوں تو کاندھلہ کے اکثر علماء کا مشغلہ درس و تدریس ہے' لیکن اس دور میں مولانا محمد علی جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے' کیونکہ مولانا موصوف عالم ہونے کے علاوہ قومی مجاہد بھی

ہیں اور اس سلسلے میں سنت یوسفی بھی ادا کر چکے ہیں۔

مولانا محمد علی تصنیف و تالیف میں بھی کم نہیں ان کی تصانیف میں کئی ایک علمی اور کارآمد کتابیں ہیں اور وہ دن رات اسی دھن میں رہتے ہیں وہ اپنی حق گوئی اور راست روی کے نشے میں قید و بند کی صعوبتوں کو بھی عبادت خیال کرتے ہیں۔ یوں تو وہ اک تنے انسان ہیں، مگر اس دھان پان مجاہد کو میں نے بڑے بڑے جیالوں سے آگے پایا ہے۔

میرے خیال سے درس گاہوں کے اساتذہ کو عملی جدو جہد میں تامل کرنا چاہیے کیونکہ یہ تو فطرت کی طرف سے تقسیم علم پر فائز ہیں ان کا کام تو دینی اور سیاسی راہوں میں چراغ روشن کرنا ہے نہ کہ جنگ و جدل میں حصہ لینا، یوں تو جنگ و جدل بھی اپنے وقت پر عبادت سے کم نہیں اور شہادت کی خلد زاروں کو یہیں سے پگڈنڈیاں نکلتی ہیں لیکن معمولی معمولی جھڑپوں میں احتیاط درکار ہے کیونکہ ان کی اسیری سے تقسیم علم کا کام رک جاتا ہے جو نہایت ضروری ہے۔

مولانا محمد علی کی کئی قابل قدر تصانیف ہیں جو موصوف کا علمی مقام متعین کرتی ہیں جن سے علم و عمل دونوں شاہراہوں میں قندیلیں آویزاں ہو جاتی ہیں۔

انہیں کے ایک چھوٹے بھائی مولوی شبیر ہیں لیکن وہ کاندھلے کی مقامی سیاست میں الجھ کر رہ گئے، نہ معلوم ان کا کیا مشغلہ ہے، بزرگوں کے نقش قدم پر ہیں یا بدک گئے؟

مولٰنا محمد یوسف بنوری

آپ صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے ان شاگردوں میں سے ہیں جنہیں حضرت شاہ صاحب کے علوم و فیوض کا امین کہا جا سکتا ہے۔ ان کا علم امانت تک ہی نہیں رہا بلکہ انہوں نے صحیح معنی میں شاہ صاحب کے علم دین کی تبلیغ و اشاعت کی ہے جہاں علمی اور ادبی دنیا میں ان کا ایک خاص مقام ہے وہیں عربی و فارسی زبان و محاورے پر اعلیٰ درجے کا عبور ہے، عربی و فارسی زبان کو مادری زبان کی طرح روانی و برجستگی سے بولتے اور پڑھاتے ہیں۔ تقریر ہو یا تحریر، تدریس ہو یا انشا پردازی آپ کے لیے کوئی راستہ مسدود نہیں، آپ نے عراق، شام، بیروت، حجاز اور مصر وغیرہ کے سفر بھی کیے۔ مصر میں علمائے دیوبند کا تعارف سب سے پہلے آپ ہی نے کرایا، اور

وہاں کے جرائد میں مضامین لکھ کر اور مختلف مقامات پر تقاریر کر کے اہل مصر پر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان میں بھی عربی زبان، علم وادب اور فکر وانشاء کے اساتذہ موجود ہیں۔

جب مصر میں علامہ طنطاوی سے ان کی گفتگو ہوئی اور تنقید وتبصرے تک بات پہنچی تو مصنف تفسیر طنطاوی نے کئی مقامات پر ان کے علم کا اعتراف کیا اور استاذ کے لقب سے یاد کیا۔ کراچی میں جب آپ پہنچے تو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نیوٹاؤن میں بے سروسامانی کے ساتھ تعلیم دینا شروع کی اور صلہ فقر وفاقہ کے سوا کچھ نہ تھا، چنانچہ فاقوں کے مرحلوں سے گزرے اور تقسیم علم میں کوشش سے رشتہ نہ توڑا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ دارالعلوم ایک انمول عمارت ہے جس میں پندرہ بیس دیگر اساتذہ بھی تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ فقہ وحدیث میں مولانا یوسف بنوری کی فکر رسا کو ان کے ہم عصر بھی سراہتے ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ومؤلف بھی ہیں اور ان میں ترمذی شریف کی شرح اپنے معیار کے اعتبار اور طرز ادا کے لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے خدا ان کے دینی عزائم اور عمر میں برکت فرمائے۔ آمین

مفتی عتیق الرحمان عثمانی

یہ حضرت مفتی اعظم مولانا الشیخ مفتی عزیز الرحمان کے فرزند رشید ہیں، دیوبند سے دستار فضیلت ملی اور حضرت سید انور شاہ کشمیری کے تلامذہ میں سے ہیں، فضیلت کے بعد درس وتدریس کے سلسلے میں لے لئے گئے اور پھر دارالافتاء میں اپنے والد بزرگوار سے تربیت لے کر افتاء نویسی میں مہارت حاصل کر لی، پھر وہیں دارالافتاء میں نائب مفتی کے منصب پر فائز ہو گئے ایک مدت ڈابھیل میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی معیت میں مدرسی کی اس کے بعد عرصہ تک کلکتے میں قیام کیا اور وہاں بھی دینی تعلیم دیتے رہے پھر دہلی میں آ کر ''ندوۃ المصنفین'' قائم کیا جو وقت اور موقعے کے اعتبار سے بہترین ادارہ ہے اس میں آئے دن اعلیٰ قسم کے علماء اور اہل قلم کی معیاری کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور آج تک اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔

مفتی عتیق الرحمان صاحب مختلف دینی اداروں کے ممبر اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں اور آزادی ہند کی تحریک کے جانباز سپاہیوں میں شمار ہوتے ہیں اور قومی کاموں میں خاص دلچسپی لیتے

ہیں' میں بھی بیسیوں باران کی صحبت بابرکت سے فیض یاب ہوا ہوں مولانا شبیر احمد عثمانی کی معیت میں ان کے یہاں کی ایک نشست مجھے اب تک یاد ہے' مفتی صاحب نہایت خلیق اور معاملہ فہم انسان واقع ہوئے ہیں غالباً یہی وصف تھا کہ وہ مولانا حفظ الرحمان سہاروی کے دست راست تھے۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب کے وصال کے بعد سے وہ جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر عامل کے عہدے پر مامور ہیں' تقریر وتحریر میں زبان وقلم نہایت موثر پایا ہے' بیرونی ممالک کی آمدورفت اور خصوصاً ان کے روس کے سفر نے تو ان میں عوام کی بہبود کے سیکڑوں دریچے کھول دیئے' موصوف کو بجا طور پر دارالعلوم دیوبند کا ممتاز فاضل کہا جاتا ہے' انہوں نے ندوۃ المصنفین قائم کر کے اکثر ایسی کتابیں شائع کی ہیں جنہیں وقت کی آواز اور موقع کی ضرورت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا حفظ الرحمان سہاروی

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے نکلتے ہوئے شاگردوں میں تھے نہایت طباع ذہین اور ذی قسم کے فاضل اور اعلیٰ درجے کے مصنفین میں تھے۔ میں دہلی جا کر جب بھی ''برہان'' کے دفتر گیا ہوں تو مولانا سے ملاقات ہوئی اور مولانا اس طرح ملے جیسے برسوں کے ترسے ہوئے ملتے ہیں وہ ابتدا میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں' پھر دارالعلوم نے مدارس بھیج دیا اور وہاں انہوں نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں معلم کی حیثیت سے رہے۔

مولانا حفظ الرحمان سہاروی اعلیٰ پائے کے مقرر اور خطیب ہونے کے علاوہ جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ بھی تھے اور کانگرس میں صف اول کے سیاست دان تسلیم کیے جاتے تھے' اسی سلسلے میں انہیں کئی بار قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں انہوں نے سیکڑوں انسانوں کو موت کے منہ سے نکالا وہ اس وقت پارلیمنٹ کے ایک جری اور بے لوث ممبر تھے ان کی خدمات سے جو فرقہ پرست آگاہ تھے وہ سب ان کا لوہا مانتے تھے' ہندوستان کی گورنمنٹ انہیں ایماندار اور پبلک معتبر سمجھتی تھی' وہ ایک جامع کمالات اور موثر شخصیت کے انسان تھے' یہی سبب تھا کہ تمام علمی' دینی اور سیاسی حلقوں میں ان کا اثر تھا'

دیوبند سے دستار فضیلت حاصل کیے انہیں ایک زمانہ ہو چکا تھا' مگر وہ عمر بھر مجلس شوریٰ کے رکن اور خاص خاص مشوروں میں شریک و دخیل رہے' خدا مغفرت کرے عجیب شخصیت تھی انکی۔

مولانا حفظ الرحمان صاحب ان لوگوں میں تھے جن کی انسانی عظمت اور بلندی کی بنیاد اعتماد نفس اور عزت نفس پر تھی' ایسے لوگوں کی زینت و آرائش قدرت خود اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے کرتی اور اظہار صداقت کے ساتھ جرات بیان اور افسون زبان سے نواز کر اپنے پیغامات کی توشیع وحصوت کا شعور کرتی ہے اور اس قسم کے لوگ قدرت کی نشان دہی سے وعدہ عبودیت کی یاد دہانی کرناتے ہیں۔

ایسے لوگ خود کو نظر انداز کر کے اور اپنی حق رسی کو پس پشت ڈال کر مستحق لوگوں کے حقوق دلوانے میں زیادہ منہمک رہتے اور اطمینان محسوس کرتے ہیں ان کا یہی اطمینان کچھ روز کے بعد ان کے لیے ابدی طمانیت ہو جاتا ہے۔

اس طبقے کے تمام افراد دنیاوی مفادات اور ذاتی اعزازات کے مقابلے میں ترویج صداقت اور خدمت خلق کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جو خود کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے اجر وانعام کی ذمہ داری قدرت پر آ جاتی ہے انہیں حیات بعد الموت کی عظمتوں کا اعتراف شکوہ وشکایت تک نہیں آنے دیتا' وہ ہر مشکل پر خاموش اور ہر مصیبت پر شکر کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ ایسی لذت ہے جو بڑے سے بڑے نشے اور حسین سے حسین خدو خال میں بھی نہیں ملتی۔ ان کی آنکھوں کے آنسو تو خشک نہیں ہوتے مگر ہونٹوں کا تبسم بھی نہیں مرجھاتا۔

مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی

مولانا موصوف فاضل دیوبند تھے اور ایسے فاضل کہ آج تک اساتذہ میں ان کی فضیلت کے چرچے ہیں' دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر ایام جوانی میں ہی لاہور چلے آئے اور یہاں آ کر منشی فاضل اور مولوی فاضل کیا جو ان کے لیے معمولی بات تھی اس کے بعد دیال سنگھ کالج میں اردو' فارسی کے پروفیسر ہو گئے' رسالہ ''مخزن'' میں بھی کام کیا اور دیگر جرائد میں بھی لکھتے رہے' پھر لاہور سے خود ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کا اجراء کیا جو موجودہ دور کی رفتار کے ساتھ چل چل کر تھک گیا۔

مولانا تاجور کے بعد ''ادبی دنیا'' کو مولانا صلاح الدین نے سنبھالا اور ان کے بعد جناب عبداللہ قریشی اس کی بقا کے ضامن کی حیثیت سے کام کرتے رہے، دیکھا جائے تو ان کی یہ خدمت اس دور میں قلمی جہاد سے کسی طرح کم نہیں تھی، جہاں مولانا تاجور اور مولانا صلاح الدین کی خدمات اردو زبان و ادب کی تاریخی خدمات میں شمار ہیں۔ وہیں عبداللہ قریشی کی خدمات بھی فراموش کر دینے کے قابل نہیں۔

مولانا تاجور کی فضیلت میں کسے کلام ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اردگرد کے ماحول نے انہیں کوئی خاص علمی و ادبی کام کرنے کی مہلت نہ دی اور دن رات وہ مخالفتوں کے طوفانوں سے لڑتے رہے، انہوں نے کئی بار بڑے بلند مقامات کی طرف قدم بڑھایا اور ''ادبی دنیا'' میں عنوانات قائم کیے اور مضامین لکھے لیکن گردو پیش کی فضا نے کوئی بات نہ چلنے دی۔

مولانا تاجور کے انتقال کے بعد حافظ نذیر احمد شباب کیرانوی نے اپنے رسالہ ''پکچر'' کا ایک ضخیم نمبر ''تاجور نمبر'' کے نام سے نکالا جس میں ان کے کئی کارآمد مضامین شائع کیے۔ اور انتخاب کلام بھی جس جس قدر دستیاب ہوا شامل کر دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایک ضخیم کتاب کے مستحق ہیں، ان کے مختلف مضامین اور اداریئے، اصلاحات اور مزاحیہ مضامین اردو ادب کا سرمایہ ہیں لیکن آج کے لوگ اس قدر سہولت پسند ہو گئے ہیں کہ کوئی کسی قسم کی تحقیق و تدقیق کی طرف قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا، حالانکہ کرنے کے یہی کام ہیں۔

اگر تگ و دو کی جائے تو مولانا تاجور نجیب آبادی کے مضامین کی ایک بہترین کتاب ہو سکتی ہے۔ میں نے ان کی زندگی ہی میں ان کی تمام تحریریں جمع کی تھیں، مگر انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میرے پاس آئے تو میں انکار نہیں کر سکا اور تمام لوازمہ ان کے سپرد کر دیا نہ معلوم وہ ان کے پاس محفوظ ہے یا کوئی صاحب لے اڑے۔

میرے ایما پر ایک تذکرہ تہذیب و ادب جناب شفیق کوٹی نے چھپوایا تھا اور اس میں مولانا کا کلام شائع کر دیا تھا، غالباً وہی کلام جناب شباب کیرانوی نے محفوظ کیا ہے، لیکن ان کا نثری ادب ابھی تشنۂ طباعت ہے، میرے خیال سے وہ اردو زبان کا اعلیٰ سرمایہ ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی

مولانا محمد ادریس صاحب دیوبند کے معتمد علیہ ہیں اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے خاص شاگرد ہیں' مولانا محمد ادریس کا حدیث' فقہ اور تفسیر میں ایک خاص مقام ہے جو بہت کم علماء کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ نے بلا کا حافظہ پایا ہے' یوں سمجھیے کہ علوم و کتب کا استحضار تام ہے' یہی سبب ہے کہ آپ بلند و برتر صاحبان تدریس میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

فضیلت سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں درس و تدریس سے منسلک رہے اور بالآخر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے' کتب تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتب حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر و بیشتر انہیں کے درس میں رہتی تھیں' میرے ہم وطن تھے اس لیے میں گاہے ماہے ملتا رہتا تھا' میرے خیال سے مولینا محمد ادریس کا اتقا بہت کم علماء میں ملے گا' اتباع سنت کا شغف اپنی حد سے متجاوز تھا اور عظمت سلف کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علوم شرقیہ کی نشر و اشاعت اور رد مذاہب باطلہ پر توجہ مرکوز رہتی تھی' اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف موجود ہیں جن میں انہوں نے محققانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان کتب کا مطالعہ قاری کو معلومات کا ایسا سامان بہم پہنچاتا ہے جو ہر مصنف کی کتاب میں نہیں ملتا۔ ان کی کتاب ''مشکوٰۃ المصابیح'' کی شرح ''التعلیق الصبیح'' پانچ جلدوں میں ہے جو ان کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے' آپ نے ممالک اسلامیہ کے سفر بھی کیے اور بیروت جا کر اپنی کتاب شرح مشکوٰۃ کو خود طبع کرایا۔ اس کے علاوہ ''سیرۃ المصطفیٰ'' کے نام سے ایک محققانہ سیرت کئی جلدوں میں لکھی ہے جس میں آزاد خیال مصنفین پر آزادی سے تنقید بھی کی ہے میرے خیال سے ان کا یہ شاہکار سیرت کی مشہور کتب پر بھاری ہے اس کے مطالعے سے کئی شکوک و شبہات بھی صاف ہو جاتے ہیں مگر کالج اور یونیورسٹی کے طلباء سیرت کے اس انداز کو اپنے مزاجوں کے مطابق نہیں پاتے جو کچھ ان کی مغرب زدگی اور کچھ جدیدیت کا تقاضا ہے۔

شاعری کاندھلے کے لوگوں کا حصہ ہے' چنانچہ مولانا ادریس صاحب بھی عربی اور فارسی میں بلا تکلف شعر کہتے ہیں۔

پاکستان بننے پر آپ نے پاکستانی سکونت اختیار کر لی تھی اور یہ اس ملک کی خوش نصیبی ہے کہ

یہاں ایسا عالم بے بدل آ کر آباد ہو گیا تھا' وہ ایک مدت جامعہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے' ہر جمعہ کو "نیلا گنبد" والی مسجد میں وعظ کرتے رہے اور سیکڑوں تشنگان علم و شعور دور دور سے آ کر مستفید ہوتے رہے' مولانا محمد ادریس کی حق شناسی انہیں حق گوئی سے نہیں روکتی تھی اس لیے وہ حکیمانہ انداز سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل سمجھا جاتے تھے۔ میں ان سے قریب ہونے کے باوصف ان سے گھبراتا تھا کیونکہ ان کی خشیت اور تقویٰ دونوں آنکھ نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ان کی حق گوئی اور حق نگاری مٹی کے الفاظ کو کندن کی جھنکار دے دیتی تھی' ان کے فکر کی بلندی اور گفتگو کی ملائمت خود بخود اپنی شیرینی سے دلوں کو متاثر کرتی چلی جاتی تھی' ان کی سیدھی سادی زبان کا لہجہ صداقت میں شرابور اور فقروں کے تاثراتی استر سلمہ ستارے سے پٹے دکھائی دیتے تھے' جب وہ معاشرے کی کجروی کو درد و کرب سے بیان کرتے تو ان کا آہنگ مرثیہ کا پیرہن اختیار کر لیتا' جس سے ان کا ہر سانس دلوں کے بند دروازوں پر دستک دیتا محسوس ہوتا تھا۔

مولانا کی علمیت اور قابلیت کے پیش نظر مصر و شام جیسے ملک ہمیشہ ان کے لیے آغوش کھولے رہے۔ مولانا کی علمی بلندیوں سے یہاں کے لوگ بہت کم واقف ہیں' ان کے متعلق تو دوسرے اسلامی ممالک میں معلوم کریں کہ مولانا محمد ادریس کس مقام کے عالم ہیں جب پتہ چلے کہ اس گوہر نایاب کا کیا مقام ہے' مگر افسوس کہ یہاں ان کی ذات کو پرکھنے اور علم کی قدر کرنے کا جو حق تھا' وہ ادا نہیں کیا گیا' مولانا واقعی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں زمین پر نہیں چلنے دینا چاہئے تھا۔ وہ پاکستان سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اسی محبت نے انہیں مولانا حسین احمد مدنی جیسی شخصیتوں سے کاٹ دیا تھا۔

مولانا محمد میاں صدیقی کاندھلوی

یہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے صاحبزادے ہیں جہاں تک تعلیم و تدریس کا تعلق ہے وہ تو کاندھلہ کی روایت ہے اور پھر مولانا محمد ادریس کا تو خاندان کا خاندان زیور علم سے آراستہ و پیراستہ ہے' مولانا محمد میاں کو عربی سے اردو ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے' عربی کی کئی مستند کتب کا ترجمہ ان کے قلم کا مرہون ہے' آج کل وہ محکمہ اوقاف میں ڈائریکٹر مطبوعات و تعلیمات ہیں اور

نہایت سلیقہ مندی اور تندہی سے کام کر رہے ہیں' نہایت خاموش' سنجیدہ اور حفظ مراتب کے انسان ہیں میں ان کے لیے دعا گو ہوں-

مولانا محمد نعمان

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے ایک صاحبزادے مولوی نعمان بھی ہیں اور وہ بھی علم و فضل سے مسلح نیلا گنبد کے عربی مدرسہ میں صدر مدرس ہیں-

مولانا محمد ملک

مولانا محمد میاں کے ایک بھائی مولینا محمد مالک بھی ہیں جو علم و عرفان میں بالکل اپنے والد مکرم کے قدم بقدم چل رہے ہیں' وہ علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور زہد و اتقا میں قابل رشک شخصیت ہیں- وہ منڈو آدم میں دارالعلوم کے مدرس اول تھے اپنے والد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے انتقال کے بعد لاہور آ گئے اور جامعہ اشرفیہ میں اپنے مرحوم والد کے منصب پر فائز ہیں- ان میں بھی عظیم المرتبت کے آثار نمایاں ہیں جو ان کے والد میں تھے' خدا انہیں صحت کے ساتھ عمر اور توفیق عطا فرمائے' آمین

مولانا حامد میاں

یہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے صاحبزادے ہیں' سادات دیوبند انہیں کے جد اعلی تھے شاہجہاں کے دور میں انہوں نے زمانہ حج سے واپسی پر دیوبند کو مسکن قرار دے لیا تھا' اب تک وہ محلہ نور پور اور سرائے پیرزادگان کہلاتا ہے-

حامد میاں صاحب کی ابتدائی تعلیم دیوبند میں ہوئی پھر ان کے والد ماجد نے انہیں مراد آباد بلا لیا اور وہیں انہوں نے قرآن حفظ کیا نیز فارسی' جغرافیہ اور حساب بھی وہیں پڑھا-

حفظ کے زمانے سے وقایہ پڑھنے تک تجوید کی مشق جاری رہی اور اس سلسلے میں مولینا قاری محمد عبداللہ صاحب استاد رہے' قاری عبداللہ صاحب نہایت ذہین طباع اور سیاسی خیال کے عالم تھے انہوں نے اس شوق میں قید و بند کی مشکلات بھی برداشت کیں وہ مراد آباد جیل میں حضرت مولانا

حسین احمد مدنی کے ساتھ اسیر رہے، حامد میاں نے ادب اور بلاغت میں مولانا عبدالحق مدنی سے استفادہ کیا کیونکہ مولانا موصوف اپنے عصر کے فصیح اللسان اور بلیغ شاعر تھے، وہ ہمیشہ عربی میں درس دیتے تھے اور انہوں نے حامد میاں کی تہہ دل سے تربیت کی، حامد میاں کی عمر سترہ سال کی تھی کہ شادی عمل میں آ گئی، ان دنوں یہ ہدایہ پڑھ رہے تھے کچھ عرصہ کے بعد ان کے والد نے انہیں دیوبند بھیج دیا اور وہیں قاضی صدرا، توضیح، تلویح اور تفسیر پڑھتے رہے، پھر درمیان سال میں مراد آباد آ گئے اور وہیں مولانا عجب نور سے علم ہیئت اور معقولات کے علاوہ دوانی اور شرح وقایہ پڑھیں۔

اس کے بعد پھر دیوبند آ گئے اور دو سال مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف اور ہدایہ آخر میں وہیں پڑھیں، دورہ کے سال ہی حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے شرف تلمذ ہوا، حامد میاں کا خیال تھا کہ حضرت سیاست پر بحث زیادہ اور علمی باتیں کم کرتے ہوں گے، لیکن جب ان سے قربت نصیب ہوئی تو اور ہی عالم نکلا، چونکہ تصوف کے مطالعے اور کتاب تکوین سے ذہن میں اہل تکوین کی جستجو بیدار ہو گئی تھی اس لیے حضرت سے بیعت ہونے پر دل مائل نہیں ہوتا تھا، لیکن وقت کے ساتھ تعلق بھی بڑھتا گیا اور حضرت کی توجہ بھی ہوئی تو اکثر خواب میں زیارت ہونے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ اختتام تعلیم پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے دست مبارک پر بیعت کے لیے مجبور ہو گئے۔

مولانا مدنی نے انہیں صرف تصوف کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ مقامات طے کرائے اور اپنے عملیات وتعویذات کی اجازت بھی دے دی۔

لاہور میں آ کر مولانا حامد میاں نے رام گلی میں ایک درس گاہ ''احیاء العلوم'' کے نام سے قائم کی اور ملی مسجد چوک انارکلی میں ایک دینی مدرسہ کھولا اور اس کے بعد ''جامعہ مدنیہ'' قائم کیا جو لاہور میں اپنے انداز کا ایک ہی دارالعلوم ہے کمال ہے اس دور میں طالب علموں کے قیام و طعام کے مصارف بھی جامعہ مدنیہ ہی اٹھاتا ہے اور یہ تمام ادارہ بنیاد سے لے کر اب تک مولانا حامد میاں کے دست مبارک سے تشکیل پایا ہے۔ میرے دل میں اس نوجوان عالم کی بڑی قدر ہے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کی عمر میں برکت اور خدمت علم دین کے جذبے میں استحکام وارزانی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

مولانا احمد بزرگ سورتی ہند

۱۲۹۸ء کے قریب بمقام سملک گجرات ہند میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں ان کے اندر کا انسان جاگ گیا تھا' اسی بنا پر وہ اوائل عمری میں بزرگ کے لقب سے معروف ہو گئے تھے- اول قرآن کریم ناظرہ پڑھا' پھر اردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کی- عربی و فارسی کی زبان کی بنیادی تعلیم کے لیے لاج پور کے مدرسہ کا رخ کیا- مشکوۃ المصابیح اور ہدایہ وغیرہ یہیں سے پڑھیں بالآخر ۱۳۱۸ھ میں اس واقعے پر چل نکلے جو دیوبند جارکتا ہے یہاں سے ۱۳۲۱ھ میں فراغت پائی-

علمی پیاس بجھانے کے بعد روحانی چشمے پر پہنچے اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف بیعت حاصل کیا اور ایک سال تک اسی در پر پڑے رہے اور مدارج سلوک طے کرتے رہے- آخر ۱۹۰۵ء میں جب مرشد کو آقائے کل نے اپنے پاس بلایا تو مرید جائے مرشد کو خالی دیکھنے کی تاب نہ لاسکا اور اپنے وطن مراجعت کر گیا- ازاں بعد وہ کچھ عرصہ جنوبی افریقہ' پھر ۱۳۳۵ھ میں جامع مسجد سورتی رنگون میں مفتی کے معزز عہدے پر تین سال تک فائز رہے- اس دوران ساتھ ساتھ وعظ اور درس قرآن کا سلسلہ بھی چلتا رہا- بالآخر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ تعلیم الدین کے مہتمم کی حیثیت سے ڈابھیل (ڈھابیل) تشریف لے آئے- علم و تقویٰ کے ساتھ ساتھ قدرت نے ان میں بے مثال انتظامی صلاحیتیں بھی تفویض کر رکھی تھیں- چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ڈھابیل کے اس معمولی سے مدرسے کو جامعہ اسلامیہ میں تبدیل کر دیا اور علامہ انور شاہ کشمیری اور دوسرے جید علماء کو ڈھابیل لانے کا سہرا موصوف ہی کے سر ہے- میں تو اسے موصوف کی کرامت ہی کہوں گا کہ اتنے قلیل عرصے میں برصغیر کے علاوہ افغانستان' بخارا' یمن تک سے طالباء علم دین جامعہ اسلامیہ ڈھابیل میں جمع ہونے لگ گئے تھے-

زندگی کے ایام میں قرآن کریم کے حفظ کی سعادت حاصل کر کے عُقبیٰ میں والدین کے سروں کے تاج کا بھی اہتمام کر دیا تھا- ۱۳۶۸ھ اور ۱۳۶۹ھ میں اوپر نیچے دو حج کیے تا کہ گناہوں کی دھول تک جسم پر نہ رہے-

آخر سال کی عمر میں ربیع الاول ۱۳۷۱ھ میں اپنی خدمات اپنے ہی جیسے برخوردار مولانا سعید

بزرگ کے کاندھوں پر رکھ' عناصر کا بوجھ اتار مائل بہ پرواز ہو گئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور علم منقح و مستحضر سے مالا مال تھے' علم کلام اور فلسفے کے علاوہ منطق اور دیگر علوم عقلیہ سے بھی بہرہ ور تھے' اپنی غیر معمولی ذہانت کے بل پر حکمت قاسمیہ کے شارح ہوئے' ڈابھیل میں شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز رہے' متکلمانہ انداز میں مسلم کی شرح کی جو اہل علم میں نا قابل فراموش کتاب ہے' حضرت شیخ الہند نے تفسیری فوائد کو ترجمے کے ساتھ شروع کیا تھا۔ جس کی مولانا شبیر احمد عثمانی نے تکمیل کی' بے مثال خطیب اور بے بدل مبلغ تھے' تبلیغ اور خطابت میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے علوم کو شرح و بسط سے بیان فرماتے تھے سیاسی شعور بلند اور قوت فیصلہ نہایت معتبر پائی تھی' ملکی معاملات کے اتار چڑھاؤ ان کی نظر میں تھے کیونکہ حضرت شیخ الہند کی تحریک ''ریشمی رومال'' میں بھی سرگرم کارکن رہے' یہی سبب تھا کہ سیاسی معاملات میں جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور آخر میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے' دیوبند میں مدرس اور مسجد فتح پوری دہلی میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے اور پھر اسی دار العلوم میں مدرس ہو کر خدمات انجام دیں۔

آزادی ملک کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان میں آ گئے اور پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے اسلامی قانون کے نفاذ میں سعی بلیغ کی اور قرارداد مقاصد پاس کرائی پاکستان انہیں بالاتفاق شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔

ایک سفر کے دوران بہاولپور کے مقام پر وفات پائی اور کراچی میں مدفون ہیں' عرصہ تک عوام و خواص ان کا سوگ مناتے رہے اور اب تک ان کے خلوص کے نقوش تابندہ ہیں۔ مجھے ان کی کئی مجلسوں میں شریک ہونے کا فخر حاصل ہے' وہ میرے اشعار کو پسند فرماتے اور دعائیں دیتے تھے' خدا انہیں غریق رحمت کرے آمین ثم آمین۔

مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے عالم روز روز پیدا نہیں ہوتے' اس میں شک نہیں کہ وہ کانگرس سے مسلم لیگ میں آئے تھے لیکن یہ تو اپنی اپنی بصیرت ہے' دنیا میں ہر انسان خوب سے خوب تر کی تلاش

میں سرگرداں ہے اور بمقدار ذوق ہر شخص کی منزل، راستہ اور طریق جستجو جدا ہے اور اسی طرح تمام کائنات میں یہ فطرت کے نمائندے اور قدرت کے مبلغین پھیلے ہوئے ہیں' جس کو جس شعبہ حیات کی تلاش ہے وہ اسی کا شارح اور ترجمان بھی ہے اور اسی شعبے کی مخلوق بھی اسے میسر آ جاتی ہے۔

ایسے لوگوں کے یہاں اعتراف علم و کمال بھی ہوتا ہے اور عجز بھی کیونکہ اپنے سے عظیم قوت کے سامنے جھکنا' احترام کرنا اور عقیدت مند ہونا ایک فطری جذبہ ہے جس کا مرکزی نقطہ حق بینی اور حق پسندی ہے' ہر چند کہ اس اعتراف اور احترام کے نام جدا جدا ہیں لیکن ان تمام صورتوں کے پیچھے وہی ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے جسے ہم کہیں درون بینی کا نام دیتے ہیں۔ کہیں حق پسندی کا لقب' مگر بات ایک ہی ہے اور نقطہ نظر وہی ذات واحد اور اس کی تخلیق ہوتی ہے۔

مولانا سید فخر الدین احمد

ہندوستان کا مردم خیز خطہ ہاپوڑ ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے یہاں پشت در پشت خدمت دین کا علم بلند ہوتا رہا۔ آباؤ اجداد عہد شاہ جہاں میں ہرات سے ہوتے ہوئے دہلی میں وارد ہوئے۔ شاہ جہاں نے ان کا میدان عمل معلوم کر کے ان کی عزت افزائی کرتے ہوئے ہاپوڑ میں ان کے لیے ایک دینی مدرسہ بنوا دیا تھا جس سے وہ مطمئن بھی تھے اور آسودہ بھی۔ مولانا سید فخر الدین احمد ۱۸۸۹ء میں بمقام اجمیر پیدا ہوئے۔ فطری ذہانت کے بل پر علوم دینیہ میں اڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ چند ہی سالوں میں گلاؤٹھی کے مشہور مدرسہ ''منبع العلوم'' تک پہنچ گئے' جہاں مولانا ماجد سے کچھ اونچے درجے کی کتابیں پڑھیں۔ استاد ان کی طبیعت کے دھارے کو دیکھتے ہوئے انہیں ساتھ دہلی لے گئے جہاں انہیں وقت کے جید علماء سے معقولات کی کتابیں پڑھوائیں۔

پھر علم کا آخری اسٹیشن آ گیا اور ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا۔ یہاں ان کے ذوق وشوق اور زیرکی کے جوہر کھلنے لگے۔ حضرت شیخ الہند کی فراست نے انہیں دورہ حدیث ایک سال کی بجائے دو سال میں مکمل کرنے کا مشورہ دیا جس کو تابع فرمان شاگرد نے بسر وچشم قبول کیا۔ بعد ازاں اس کی حکمت کو خود محسوس کیا۔

اب اس شرف کا اندازہ لگائیے کہ موصوف زمانہ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں

پڑھانے لگ گئے تھے اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند میں۔

۱۹۱۰ء میں فارغ التحصیل ہوتے ہی دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ مدرس ہو گئے اکابرین دیوبند نے جب ان میں پختگی کے تمام زاویوں کو جانچ لیا تو ۱۹۱۱ء میں انہیں مدرسہ شاہی مرادآباد بھیج دیا جہاں انہوں نے تشنگان حدیث کی اڑتالیس سال تک پیاس بجھائی۔ موصوف علم حدیث میں برصغیر کی ناک تھے۔ ان کے علم کی ثقاہت اور عمل کی نظافت کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا تقویٰ ان کے علم کا ہم جلیس تھا۔

مولٰینا محمد طیب صاحب

طیب صاحب حضرت مولانا' محمد احمد صاحب مہتمم خاص دارالعلوم کے صاحبزادے اور حضرت مولانا انورشاہ صاحب کشمیری کے چہیتے شاگرد ہیں۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے دستار فضیلت کے بعد وہیں سے درس و تدریس کا آغاز کیا اور پھر دارالعلوم کے نائب مہتمم ہوئے اس کے بعد عرصے سے مہتمم چلے آرہے ہیں۔ پورے ملک میں ان کی خطابت کی دھوم ہے اور بڑے بڑے خطیب ان کے انداز بیاں کے ثناخواں ہیں' وہ ہر خطے میں پہنچ کر دین اور دارالعلوم کے مقاصد کی تبلیغ و ترویج کرتے ہیں' متعدد کتب کے مصنف ہیں اور ایک مستقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کر رہا ہے۔

مولانا طیب شعروسخن میں بھی اپنے اسلاف کی طرح ایک خاص انداز کے مالک ہیں اور وہ دارالعلوم دیوبند کے رسالہ ''قاسم العلوم'' میں شائع ہوتے ہیں آپ متعدد مدارس کے بانی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں دارالعلوم کے ذمہ دار کارکنان میں آپ کی پہلی شخصیت ہے جنہوں نے بیرونی ممالک کے سفر کیے اور دارالعلوم کے لیے بہبود کا زیادہ سے زیادہ سامان بہم پہنچایا' ان کے زمانے میں دارالعلوم نے جو ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں' تعلیمی اور تعمیری شعبوں میں ترقی سے شعبوں اور شعبہ داروں میں بھی اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔

مولانا طیب حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز ہیں' ان کی بیعت کا سلسلہ ہند اور بیرون ہند دور دور تک پھیلا ہوا ہے اتنی مصروفیات کے باوصف درس و

تدریس کا مشغلہ بھی برابر جاری ہے' دیو بند میں آپ کی ایک باقاعدہ مجلس مذاکرہ قائم ہے جس میں مدرسے کے طلباء اور شہر کے علاوہ بیرون شہر کے تشنگان علم اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

اصل میں جب کوئی عالم اپنے جنون کار سے روحانیت کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے اس وقت ربانی قوتیں اپنی عادلانہ قوت و جولانی کے ساتھ اس کے خون میں گردش کرنے لگتی ہیں' وہ رسمی لفظیات و مخفیات کی الجھنوں سے دو چار نہیں ہوتا' اس کا رخ خود بخود ماورائیت کی طرف پھر جاتا ہے اور اسے زمین و آسمان کی درمیانی مسافتیں چاند سورج کا فاصلہ معلوم نہیں ہوتیں' وہ اپنے اندر جھانک کر خود پر حقیقت و فرائض کو آشکار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس پر کجراہ معاشرے کی اصلاح اور کج قدم مسافروں کی رہنمائی فرض ہو جاتی ہے اس وقت وہ اس خدمت خلق اور فرض کی ادائی کے لیے بے تاب رہنے لگتا ہے اور قدرت اسے راستہ دکھانے اور پگڈنڈیاں روشن کرنے کے لیے رنگ برنگ روشنیاں لیے آگے آگے چلنے لگتی ہے' جس سے نئے ارادے اور جدید مقاصد تخلیق ہوتے ہیں' اس وقت زندگی کے عمل کی تیز رفتاری اشکال و آلام کے راستوں کی پلیوں کو خیال کی رفتار سے عبور کرنے لگتی ہے اور قوت عمل پر انسان کسی غیر مرئی طاقت کا سایہ محسوس کرتا ہے اور کسی کا دبیل نہیں ہونے پاتا' اس میں روحانی قوتوں کے ساتھ قدرت جسمانی قوتیں بھی اس کے ساتھ کر دیتی ہے اور اس وقت وہ شاید فطرت کا دست راست ہوتا ہے۔

مولینا مفتی محمد شفیع صاحب

مفتی صاحب دارالعلوم دیو بند کے ان علماء میں سے ہیں جن پر دارالعلوم بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ قوی الاستعداد اور وسیع المعلومات معروف خواص و عوام ہیں' یہ منزل بہ منزل طبقہ وسطیٰ سے طبقہ اول میں آئے ہیں اور فقہ و حدیث میں امتیازی مقام رکھتے ہیں' اسی علمی بلندی کی بناء پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب مفتی اعظم دارالعلوم کے حلقہ افتاء میں شامل ہوئے اور پھر ممتاز فتویٰ نویس ثابت ہونے کے باعث مفتی اعظم کی وفات کے بعد دارالعلوم کے عہدہ افتاء پر مفتی دارالعلوم کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہند مولانا

محمود الحسن صاحب سے بیعت ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کیا اور بہت کم عرصے میں ان سے بھی خلافت حاصل کر لی اور تعلیم ظاہری کے ساتھ ساتھ تعلیم باطنی میں مشغول ہو گئے۔

تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق اول سے تھا چنانچہ' فقہ و حدیث اور فن مناظرہ میں کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں مفتی صاحب شعر و شاعری میں بھی کم استعداد نہیں رکھتے انہوں نے واقعاتی نظمیں' مراثی اور قصائد کہے ہیں جن کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

آزادی ملک کے بعد آپ نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی اور آج وہ ملک کے مشہور علماء اور مفتیوں کی صف میں نمایاں ہیں' گورنمنٹ پاکستان نے جو قانون اسلامی کی تدوین کے لیے کمیٹی بنائی اس میں آپ رکن رکین رہے' پھر آپ نے کورنگی ٹاؤن کراچی میں ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جو آج اس دور کے ممتاز دارالعلوموں میں اپنے طرز و معیار کی واحد درس گاہ ہے' میں جب بھی مفتی صاحب سے ملا ہوں میں نے انہیں ہمہ جہتی انداز کا عالم پایا ہے۔

ہر چند کہ انہیں دارالعلوم اور حکومت کے علاوہ عوام اور اپنے خانگی مسائل میں بے حد مصروفیت رہتی ہے لیکن یہ تو حرکت کائنات کی فطری گردش ہے جو ازل سے لے کر ابد تک اختتام پذیر نہیں ہوگی اور یہ جمال کائنات یا مقصد کائنات کی نو بنو ساختیں یا رنگ و صورت کا نزول و صعود مختلف ناموں سے ہوتا رہے گا' لیکن یہ حرکت اور تقسیم علم اپنی جگہ ہے اس کا فنائیت سے کوئی رشتہ نہیں بلکہ یہ انقلاب تو تغیرات کی زنجیروں کی کڑیاں ہیں۔ یہ نو بنو عالم اور مصروفیات انسانی کا تواتر ابد کی فصیلوں تک کہیں رکنے کا نام نہیں لے گا' یہ اتار چڑھاؤ کے احوال دائم و قائم اسی طرح ادلتے بدلتے رہیں گے۔ میں تو بعض دفعہ یہ بھی سوچتا ہوں کہ نجانے ابد کیا ہوگا کیونکہ اگر وہاں کوئی کسی قسم کی حرکت ہے تو وہ ابد کی تعریف سے نکل جاتا ہے اور اگر حرکت نہیں تو پھر پتھروں اور آئینوں کی طرح ایک تحیر کا انجماد ہوگا اور بس' واللہ اعلم بالصواب

مولانا زکی کیفی

یہ مفتی شفیع کے بڑے صاحبزادے تھے مفتی صاحب کے دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی زیورِ علم سے آراستہ تھے لاہور میں ادارہ اسلامیات کے مالک و مہتمم تھے جو دینی کتابوں کا بڑا ادارہ ہے۔ کیفی نہایت اچھے اور نغز گو شاعر تھے' غزل اور نظم دونوں پر انہیں عبور تھا اور دونوں میں یکساں رفتار' گزشتہ تین چار سال سے ان کا کلام ایسا شستہ اور منجھا ہوا آ رہا تھا کہ بعض اوقات سب حیران رہ جاتے تھے کہ زکی صاحب نے بڑی ترقی کر لی ہے جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے وہ اس رفتار سے چل رہے تھے کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس دور کے بڑے شاعر ہوتے مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ چٹ پٹ ہو گئے اور ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے' اب ادارہ اسلامیات کو ان کے بچے سنبھالے ہوئے ہیں خدا انہیں کامیاب کرے اور صحت عطا فرمائے آمین۔

مولوی محمد ولی

اسی طرح مولوی محمد ولی نے اسلامیات میں ایم۔ اے کر کے وہی اپنا آبائی پیشہ درس و تدریس اختیار کر لیا اور تقسیم علم میں مصروف ہیں۔

مولوی محمد رفیع

مولوی محمد رفیع صاحب درالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہو کے وہیں نائب مفتی کے عہدے پر فائز ہیں' حدیث وفقہ کے متعلق ان کی کئی کتابیں ہیں۔

مولوی محمد تقی عثمانی

محمد تقی عثمانی بھی مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے ہیں دارالعلوم کراچی سے دستار فضیلت لے کر ایم اے کیا' پھر ایل ایل بی کی ڈگری لی اور آٹھ سال سے ماہنامہ ''البلاغ'' شائع کر رہے ہیں۔
ان کی تحریروں میں سلجھاؤ کے ساتھ فکر موجود ہے اور پھر تقابلی مطالعے کے بعد مافی الضمیر کو الفاظ کا جامہ دیتے ہیں' میرے خیال سے مولانا مودودی کے بعد بہت کم علماء ایسے ہیں جن کی تحریروں میں یہ بانکپن ملتا ہے۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی جو دینی، سیاسی، علمی اور ادبی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں-۱۲۹۲ھ میں بمقام شاہ جہاں پور پیدا ہوئے-قرآن کریم اور عربی فارسی کی اساسی تعلیم اپنے وطن مالوف ہی کے مختلف اساتذہ کرام سے حاصل کی- کچھ عرصہ اپنے وطن کے مدرسہ اعزاز یہ میں درس نظامیہ کی چند کتابیں پڑھیں، پھر مولانا محمد عبدالعلی میرٹھی کی علمیت انہیں مدرسہ شاہی مراد آباد کھینچ کر لے آئی اور پھر وہی ہاتھی کا پیر یعنی دارالعلوم دیوبند جہاں سے انہوں نے ۱۳۱۲ھ میں علم سے فراغت حاصل کی-

میں نے جتنے بھی ثقہ علماء کو دیکھا ہے تحقیق کرنے پر انہیں مسجد کی روٹیوں سے بے نیاز پایا ہے- موصوف بھی انہی ثقات میں سے تھے جو کروشیے سے ٹوپیاں بن کر اس کی آمدنی سے اپنی ضروریات زندگی پوری کیا کرتے تھے-تقویٰ اسے ہی کہتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی بات عقل سے پہلے دل کو متاثر کرتی ہے-

دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد موصوف شاہ جہاں پور کے مدرسہ ''عین العلم'' میں مدرس مقرر ہو گئے اور ساتھ ہی فتویٰ نویسی کا نازک کام بھی شروع کر دیا- یہی وہ زمانہ ہے جب انہوں نے قادیانیت کے عقلی و نقلی رد میں ۱۳۲۱ھ میں ''البرہان'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ بھی جاری کیا-

ہر چند کہ مولانا شاہ جہاں پور میں بڑے مطمئن اور آسودہ تھے لیکن مولانا امین الدین صاحب کے مسلسل اصرار نے انہیں ۱۳۲۱ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی کی صدر مدرسی پر مجبور کر دیا- موصوف تادم آخر اسی معروف درس گاہ سے وابستہ رہے-

مولانا کی شخصیت بڑی بھرپور تھی- وہ محدث، فقیہ، مفتی، سیاست دان، عالم و ادیب اور عملی مجاہد تھے-ان تمام زاویہ ہائے زندگی میں موصوف کے استاد مکرم حضرت شیخ الہند کی روحانی پرکار کا بہت بڑا دخل ہے-

۱۹۱۹ھ میں علمائے برصغیر کے ساتھ مل کر ''جمعیت علمائے ہند'' کے نام سے ایک سیاسی

جماعت تشکیل دی- ایک مدت تک آپ ہی اس کے صدر رہے- مجھے یہی حقیقت لگتی ہے کہ مولانا کے بعد ''جمعیت علمائے ہند'' کی صدارت آج تک کسی اور کو زیب نہ دے سکی-

مولانا بڑے وسیع الخیال مسلمان تھے یہی وجہ ہے کہ مولانا کے شاگردوں میں ایک فہرست ان اشخاص کی بھی ہے جو غیر مسلم تھے-مولانا موصوف کا شہرہ صرف اندرون ملک ہی نہ تھا بلکہ مصر و حجاز کے اجتماعات میں جب موصوف نے مسلمانان برصغیر کی نمائندگی کی اور اپنے سیاسی اور عالمانہ خیالات کا اظہار کیا تو اہل علم حضرات ان کے گرویدہ ہو گئے-

ہر چند کہ دہلی کے مدرسہ امینیہ میں ایک عرصے سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا-لیکن یہ مدرسہ صف اول تو درکنار صف دوئم میں بھی مشکل ہی سے شمار ہوتا تھا-حضرت مفتی صاحب ہی کی جہد مسلسل کا ثمر تھا کہ مدرسہ مذکور دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے مدارس میں شمار ہونے لگا-

مولانا کے علمی و ادبی کارناموں میں ''کفایت المفتی'' جو آپ کے فتاوی کا مجموعہ ہے-اسے آپ ہی کے جوہر قابل فرزند مولانا حفیظ الرحمان واصف نے مرتب کیا ہے-اس کی نو جلدیں زیور طباعت کو پہنچ چکی ہیں-موصوف کی دوسری کتاب ''تعلیم الاسلام'' ہے- ہر چند کہ یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن میں نے بڑے بڑے ثقہ علماء اور مشائخ کے تکیوں کے نیچے اس کتاب کو پایا ہے-

مفتی صاحب تقریباً سترہ سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے بڑے سرگرم رکن رہے-اس اثنا میں آپ بڑی بڑی آزمائشوں میں مبتلا رہے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی کاموں کی بہتات اور ذمہ داریوں نے بالآخر آپ کو بستر سے لگا دیا-کئی ماہ بیمار رہنے کے بعد ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کی رات کو اس دنیا سے رشتہ توڑ لیا-

اختصار کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی کے محدث اور مفتی اعظم ہندوستان تھے، ان کی فقہی قابلیت اور نکتہ رسی سے بڑے بڑے جید علماء متاثر تھے اور ان کی غیبت میں ان کے مداح ملے، وہ تدریس و افتاء کے ساتھ ساتھ بلا کی سوجھ بوجھ اور سیاسی شعور بھی رکھتے تھے، کانگرس کی حمایت میں انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا، حضرت تھانوی جیسے مردم شناس اور عالم آشنا انسان نے فرمایا تھا کہ میں مفتی کفایت اللہ کے تدبر اور مولانا حسین احمد کے

جوش عمل کا معتقد ہوں' مفتی کفایت اللہ صاحب دہلی کے علماء میں بیک وقت مفتی بھی تھے اور مجاہد بھی' محدث بھی تھے اور فقیہ بھی' حیرت ہوتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے کیسے کیسے جوہر قابل دنیا کو دیئے ہیں-

مولوی سمیع اللہ صاحب

میں جب دہلی جاتا تھا تو کتب خانہ عزیزیہ میں مولوی سمیع اللہ صاحب سے ملاقات رہتی تھی- اور وہ مفتی کفایت اللہ صاحب کے قریبی تھے' ان سے اکثر مفتی صاحب کے علم و فضل اور ذہن رسا کے واقعات سنتا رہتا تھا' جنہیں اگر میں تفصیل سے لکھوں تو کتاب اپنی حدود سے نکل جائے گی' مولانا سمیع اللہ کا کتب خانہ ایسا تھا اور وہ اس اخلاق کے انسان تھے کہ شاعر ہو یا ادیب صحافی ہو یا معلم' دہلی کا ہو یا بیرون دہلی کا ان کی دکان پر ضرور پہنچتا تھا اور وہ حسب توفیق تواضع بھی کرتے تھے' جب کوئی مشاعرہ' مناظمہ یا مسالمہ برپا ہوتا تو اراکین مولانا سمیع اللہ صاحب کے یہاں آ بیٹھتے اور جو شاعر آتا اسے دعوت نامہ دیتے رہتے اس طرح دہلی کا ہر ادبی ہنگامہ مولانا سمیع اللہ صاحب کی دکان سے مرتب ہوتا تھا' وہ دکان دارالادب بھی تھی اور سیاسی اکھاڑہ بھی' نجانے مولانا یہ تمام مصارف کیسے اٹھاتے تھے' ان کی دکان ہی میں ایک شیلف میں کتابیں لگی رہتی تھیں اور ایک میں کھدر قسم کا کپڑا اور ان کا یہ تمام سلسلہ ادھار پر چلتا تھا' اگر کوئی کتابوں کی قیمت کا تقاضا کرتا تو اسے کپڑا اٹھوا دیتے اور کپڑے والا تقاضا کرتا تو اسے کتابیں باندھ دیتے اور ان کی تمام زندگی اسی طرح گزری' کانگرسی خیالات کے آدمی تھے' اور اسی سلسلے میں جیل بھی گئے اور مختلف صعوبتیں بھی اٹھائیں- نہ معلوم کانگرس حکومت نے کیا سلوک کیا ہوگا-

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

یہ فاضل دیوبند بھی ہیں اور ایم اے بھی' دلی یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے ہیں اور کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں پرنسپل بھی اور آج کل علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے شعبے کے صدر ہیں-

جب میں دہلی ''برہان'' کے دفتر جاتا تھا تو مولانا حفظ الرحمان سہواردی اور سعید احمد اکبر آبادی سے ضرور ملاقات ہوتی تھی جہاں وہ ایک عالم دین ہیں وہیں ایک ادیب شہیر بھی ہیں' نہایت خوش

خو' خوش کلام' خوش مزاج اور خوش فکر انسان ہیں' یہ بھی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے معتقدوں میں سے ہیں' اور انہی کے علوم کی تبلیغ کو مشغلہ حیات خیال کرتے ہیں ہندوستان کے باہر بھی متعدد ملکوں میں سفر کر کے اپنے علم و فن کی بدولت آج بین الاقوامی حیثیت کے عالم' ادیب اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

مولانا سید محمد میاں

آپ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے تلامذہ رشید سے ہیں۔ علوم درسیہ سے فراغت پا کر مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز رہے ہیں جمعیۃ العلماء ہند کے رکن تو پہلے سے تھے' حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے حکم پر جمعیۃ العلماء کے ناظم ہو گئے اور حضرت مولانا حفظ الرحمان سہواردی کی وفات کے بعد جمعیت العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے جمعیت کے سپاہی تھے اور کانگرس کے نمودار لوگوں میں سے تھے۔ کئی بار جیل گئے جو لیڈری کے لیے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کئی معیاری اور مفید کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اور ''تاریخ اسلام'' معروف و معتبر کتب ہیں آپ کو بچوں کی دینی اور اسلامی تعلیم سے شغف رہا اور اس لیے تاریخ اسلام سوال و جواب کی صورت میں لکھ کر طالب علموں کے لیے تاریخ اسلام کو آسان کر دیا ہے۔ میرے کتب خانے میں یہ کتاب موجود ہے اور میں نے اسے بے حد مفید پایا۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری

آپ کا بھی علماء میں ایک مقام تھا' آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد تھے' آزادی ملک کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند میں دیگر ارکان کے دوش بدوش کام کیا' قرآن اور حدیث پر آپ کی گہری نظر تھی اور متعدد مناظروں کی فتح یابی کے باعث عوام و خواص میں شیر پنجاب کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے' غالباً مناظروں ہی کے سبب سے ان کا میلان عدم تقلید کی طرف ہو گیا تھا' دیکھا گیا ہے کہ بعض بعض لوگ مناظرے کرتے کرتے اپنے مسلک سے بھی ہٹ جاتے ہیں لیکن آپ تھے کہ اختلاف مسلک ہو جانے کے باوجود علمائے دیو بند کے گرویدہ تھے' وہ تصنیف و تالیف کے آدمی بھی تھے' کئی کتابیں اور پمفلٹ ان کے نقش قلم کی یادگار ہیں۔

مروت اور محبت کے انسان تھے اور ایسے پرخلوص بزرگ تھے کہ جس سے وہ ملتے ٹوٹ کے ملتے اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتے' اب ایسے لوگوں کی جگہیں پر کرنا شاید وقت کے بس کی بات نہیں' مجھے اس ملک کے تمام دارالعلوموں سے یہ شکایت ہے کہ امتحانات میں' یونیورسٹیوں کی طرح مقالے کیوں نہیں لکھے جاتے - کیا ان کے بس کی بات نہیں' مجھے اس ملک کے تمام درالعلوموں سے یہ شکات ہے کہ امتحانات میں ان لوگوں کے متعلق سوالات کیوں نہیں آتے اور یونیورسٹیوں میں ان پر مقالے کیوں نہیں لکھے جاتے - کیا یونیورسٹیوں میں ایم اے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کے لیے صرف شاعر اور ادیب ہی عنوان بننے کو رہ گئے ہیں' میرے علم میں آج پبلک میں سیکڑوں آدمی ایسے ہیں کہ اگر ان کے علوم وفنون پر تھیسس لکھے جائیں تو عوام وخواص زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں-

مولانا مفتی محمد محمود صاحب

موصوف بھی فاضل دیوبند ہیں اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں لیکن ان کی وزارت کو ان کی علمی بلندی استعداد کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی خیال نہیں کرتا' ان کے علمی اقتدار کے سامنے تو تاج شاہی بھی جھلکا نہیں دیتا مگر اس اقتدار کو بھی علمی حلقے ہی جانتے ہیں' ان کے سینے میں فقہی اور قرآنی سرمائے کے ساتھ موجودہ دور کی معلومات کا ذخیرہ قابل رشک ہے-

ان کی تقریروں میں جہاں شرعی مسائل' افتائی انکشاف' ہوتے ہیں وہیں تاریخ کی بیش بہا معلومات بھی ملتی ہیں اور وہ ملک کے صاحب شعور طبقے میں وقعت واعتماد کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں' میں نے ان کے شاگردوں کو ان کے محاسن میں رطب اللسان پایا ہے اور یہ معلمانہ خصوصیت ہر معلم کا حصہ نہیں ہوتی -

مولانا حامد الانصاری غازی

آپ حضرت مولانا منصور انصاری کے صاحبزادے ہیں اور منصور انصاری حضرت انور شاہ صاحب کے عزیز شاگرد! حامد الانصاری بانی دارالعلوم دیوبند قدس سرہ کے نواسے اور میرے دوست ہیں' ادب وصحافت میں بھی انہیں ایک مقام حاصل ہے اور ان کی سیاسی معلومات بھی رشک

کے قابل ہیں' بجنور کے مشہور اخبار ''مدینہ'' کے ایک عرصہ ایڈیٹر رہے ہیں' دہلی میں ان سے پرلطف ملاقاتیں رہتی تھیں' پھر یہ دہلی سے بمبئی چلے گئے اور وہاں انہوں نے اپنا ایک مستقل اخبار ''جمہوریت'' جاری کرلیا' اس میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے سیاسی اداریئے اور علمی معلومات کے مقالات کو بڑے احترام سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے- وہ جہاں صحافی اور ادیب ہیں وہیں ایک نغز گو شاعر بھی ہیں' انہیں ان کی حذاقت نے سیاسی نشیب وفراز سے اس قدر آگاہ کردیا کہ اب وہ جمعیۃ العلماء کے صدر' دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور ادارہ مجلس قرآن (اکیڈمی قرآن عظیم) کے ممبر بھی ہیں' ان کی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' معروف تحریر ہے اور قابل مطالعہ-

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی

مولانا دارالعلوم دیوبند کے فضلا میں شمار ہوتے ہیں' علمی استعداد کے اعتبار سے مضبوط اور تقریر کے لحاظ سے افسوں نوا مقرر ہیں' رہنے والے ہزارہ کے ہیں لیکن آپ اپنی حق گوئی اور حق پسندی کے باعث ''جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان'' کے ناظم مقرر ہوئے تھے' فضیلت وشہرت کے ساتھ ان کے اعمال واشغال اعتماد واعتقادی نظر سے دیکھے جاتے ہیں' اسی علمی اور دینی تخصیص کی بنا پر مصر میں آپ کو بطور نمائندہ ''جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان سے دعوت دی گئی تھی اور وہاں عالمی موتمرین میں آپ نے علمائے عالم کو خطاب کیا-

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی

اعظم گڑھ میں ایک چھوٹا سا علاقہ مئو کے نام سے مشہور ہے' مولانا اعظمی یہیں ۱۳۱۴ھ کے قریب پیدا ہوئے- عربی وفارسی کی بنیادی تعلیم بھی یہیں سے حاصل کی- مئو سے علمی سیرابی کے بعد مولانا نے گورکھپور اور بنارس کا رخ کیا جہاں انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے قابل فخر شاگرد مولانا عبدالغفار صاحب سے اکتساب علم کیا- اسی دوران انہوں نے شوقیہ طور پر علوم شرقیہ میں عربی کے کئی امتحان بھی پاس کر ڈالے ازاں بعد الہ آباد سے فاضل ادب کا امتحان پاس کیا-

۱۳۳۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث مکمل کیا ۱۳۳۵ھ میں مختلف درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا مگر زیادہ عرصہ نہیں

گزرا تھا کہ ان کی طبیعت کے آسمان پر پورن ماشی کی رات چھا گئی اور اس زور سے جوار بھاٹا ہوا کہ مدرسی چھوڑ چھاڑ دار العلوم دیوبند کا رخ کیا اور دورہ حدیث میں شامل ہو گئے یہ دور ۱۳۳۹ھ کا ہے۔

اب مولانا کی علمیت اور قابلیت منہ سے بولنے لگی تھی اور ان کی فضیلت کناروں سے کھنڈی پڑتی تھی، یہی وجہ ہے کہ علماء کو ان کی چھان پھٹک کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑی اور انہیں ۱۳۴۰ھ میں دار العلوم مئو کا صدر مدرس بنا دیا گیا۔ یہاں انہوں نے دو سال تک حدیث اور دوسری اعلیٰ کتابوں کی تعلیم دی۔

اسی اثناء غالباً مولانا اعظمی کو یہ محسوس ہوا کہ اہل مئو کے مقابلے میں اہل بنارس کو ان کی زیادہ ضرورت ہے لہذا وہ مظہر العلوم بنارس میں صدر مدرس کی حیثیت سے چلے آئے اور کئی سال تک اپنے علم کے انمول موتی بکھیرتے رہے۔ پھر جب دیکھا کہ یہاں کا تدریسی نظام اپنے صحیح سانچے میں بیٹھ چکا ہے تو پھر اپنے آبائی مقام مئو تشریف لے آئے جہاں انہیں مفتاح العلوم کا شیخ الحدیث اور صدر مدرس بنا دیا گیا۔ اس اسامی پر وہ ۱۳۶۹ھ تک بدستور کام کرتے رہے لیکن اب طبیعت کا بہاؤ تصنیف و تالیف کی طرف ہو گیا اور یہ غلبہ اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے مفتاح العلوم کے اعلیٰ عہدے سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ مگر مقامی علماء اور شرفا کے اصرار پر اس کی سرپرستی قبول فرمائی جو اب تک ہے۔

اس دور زبوں حال میں موصوف نے انیس برس کے قریب جو کتابیں لکھی ہیں ان کے پیچھے داد و دہش نہیں بلکہ تبلیغ دین کا جذبہ کار فرما ہے۔ ان کے تقویٰ کی رفتار نے اگر ان کی علمی پرواز کو آ لیا تو بعید نہیں کہ وہ مولانا یوسف بنوری کے خلا کو پاٹ ڈالیں۔

مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی

مولانا موصوف مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے صاحبزادے ہیں، حضرت مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب پاکستان سے پہلے مدرسہ فتح پوری دہلی اور اس کے بعد بھوپال میں شیخ الحدیث اور مفتی کے عہدے پر فائز رہے اور اسی مقام پر ٹنڈو اللہ یار خاں سندھ میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا ساجد الرحمان صاحب نے بھی درس نظامی کی تکمیل ٹنڈو اللہ یار خان سے ہی کی ہے،

حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ وہ قدیم وجدید عربی علوم کے شناور ہیں' اور مولانا ظفر احمد عثمانی' مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا عبدالرشید نعمانی' مولانا محمد مالک کاندھلوی جیسے فاضلین کے شاگرد رہے ہیں- جدید عربی ادباء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین' مصطفیٰ رافعی' خلیل جبران' احمد شوقی اور احمد امین کے لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور حسن اتفاق سے شیخ محمد یوسف عطیہ سے بھی اچھا خاصا استفادہ کیا ہے اردو کے مشاہیر میں مولٰینا ابوالکلام آزاد' مولانا شبلی نعمانی' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبال سے گہری عقیدت کے باعث انہیں اور بھی پر لگ گئے ہیں' پاکستان کے متعدد جرائد میں بھی ایک عرصے سے مضامین لکھ رہے ہیں اور اب تصنیف وتالیف[1] کے علاوہ ''رشاد'' ماہنامہ کی ادارت بھی سنبھالے ہوئے ہیں' ساتھ ساتھ قطب شہید کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں' میں اس نوجوان کے لیے تہ دل سے دعا گو ہوں-

مولٰینا ابوالاعلیٰ مودودی

میں علماء کے سلسلے میں حضرت ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر نہ کروں تو اپنی نظر میں گناہگار ٹھہروں گا' کیونکہ وہ مجھ پر شفقت فرماتے ہیں' ہر چند کہ شفقت ان کا شعار ہے لیکن ان کا مجھے قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھنا باعث فخر ہے میں ان کی جماعت کا آدمی نہیں ہوں لیکن ان کا رویہ اور اخلاق ایسا ہے کہ میں جب بھی ان سے ملا ہوں' ان میں سما جانے کو جی چاہا ہے' میں نے جہاں تک ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے' میں ببانگ دہل کہتا ہوں کہ مولانا تھانوی کے بعد ایسا جید عالم دین میری نظر سے نہیں گزرا' وہ عقدہ ہائے معانی ومفہوم جو ایک زمانے سے کتابوں میں الجھے چلے آ رہے تھے مولانا

ا- عقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید از شاہ ولی اللہ' اتمام الوفا فی سیرة الخلفاء از خضری بک مشکلا تنا فی ضوء النظام اسلامی از حسن البنا- النظام القرآن از علی عنطاوی جوہری- الاسلام و نظریه دارون از محمد باشمیل- الخصائص الکبریٰ از جلال الدین سیوطی- هذا الدین از سید قطب شهید- الاسلام و مشکلات الحضارة- خصائص التصور الاسلامی فی ظلال القرآن (دو پارے) جاهلیة القرآن العشرین- هل نحن مسلمون دراسات فی النفس الانسانیه- الانسان بین المادیته والاسلام النظور و الثبات-

مودودی کے قلم سے محبوب کی زلفوں کی طرح کھلتے چلے جاتے ہیں' پیچیدہ پیچیدہ تحریریں اور باریک سے باریک مسائل معمولی پڑھے لکھے آدمی کی نظر سے سنبل وریحان کی طرح رنگ وبو دینے لگتے ہیں جس سے مدتوں کے پیاسے اور ترسے ہوئے دل مطمئن ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔

مولانا حمید اللہ صاحب

علمی سلسلے کی ایک کڑی مولانا حمید اللہ صاحب بھی ہیں جو فرانس جیسے ملک اور فرانس میں بھی پیرس جیسی جگہ بیٹھ کر دین کی خدمت اور شعور حق کی تقسیم کر رہے ہیں' مجھے میرے ایک کرم فرما عاشق عمران عباسی نے بتایا کہ انہوں نے فرانسیسی میں قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اسے صرف مولینا حمید اللہ صاحب ہی کر سکتے ہیں' انہوں نے پیرس جیسے فیشن پرست شہر میں رہتے ہوئے آج تک شیروانی اور پاجامے سے کنارہ نہیں کیا اور اس عالم میں جو وہاں ان کی قدر و منزلت ہے اسے دیکھ کر فرانسیسیوں کی حقیقت پسندی اور مردم شناسی کو داد دینا پڑتی ہے۔

مولینا حمید اللہ صاحب کی اور کئی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہمارے ملک کی عظمت ہیں' خدا انہیں عمر طویل' صحت اور توفیق تبلیغ عطا فرمائے' اور انہیں اپنے استاد مکرم جناب مناظر احسن گیلانی کے نقش قدم پر تادم آخر قائم رکھے۔آمین ثم آمین

مولانا محمد زکریا کاندھلوی

قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اور تبلیغی جماعت کے نمائندہ عالم ہیں' انہوں نے اپنی سوانح ''یاد ایام'' کے نام سے لکھی ہے جو مطالعے کے قابل ہے تبلیغی جماعت کے نصاب کی تمام کتب انہیں کے قلم کی صنعت ہیں جو کئی لاکھ چھپ چکی ہیں' مولانا زکریا ایک عالم باعمل ہیں جو کاندھلہ کے علماء کا طرہ امتیاز ہے۔

مولانا زکریا کاندھلوی کی تحریروں میں ایسا سلجھاؤ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے اور یہی تحریر کی خوبی ہے' یہ خوبی صرف تحریر میں نہیں تقریر میں بھی کامیاب رہتی ہے اور مقرر اپنے دل کی آگ کو عوام کے سینوں میں انڈیل دیتا ہے۔علمی گفتگو اور مغلق الفاظ تبلیغ دین کے سلسلے میں کند ہتھیار قرار پاتے ہیں۔مولانا زکریا کا طرز تحریر قابل تقلید ہے۔خدا انہیں تندرسی کے ساتھ تبلیغ

کے لیے عمر طویل عطا فرمائے وہ لاہور تشریف لائے تو میں کوشش کے باوجود ان سے نہیں مل سکا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور پر مکہ یا مدینہ چلے گئے ہیں۔ انشاء اللہ وہیں ملاقات ہوگی' صاف باطنی اور علم کے ساتھ عمل ان کی زندگی بن کے رہ گیا ہے۔ کاش ہمارے ملک میں ایسے علماء کی تعداد بڑھ جائے تاکہ ہمارا ملک جس نظریہ پر وجود میں آیا ہے۔ اسی نظریہ حیات سے پھولے پھلے۔

مفتی جمیل احمد

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے فیض یاب ہیں وہیں ایک عرصہ درس و تدریس میں منہمک رہے' تقسیم ملک کے بعد لاہور آ گئے اور جامعہ اشرفیہ میں مفتی کے عہدے پر فائز ہو گئے وہ فقہ بھی پڑھاتے ہیں اور حدیث بھی اور دونوں میں ان کا طرز کلام گنجلک نہیں ہوتا بلکہ جہاں عقدہ ہوتا ہے وہیں وہ اپنے طرز بیان سے شگفتگی اور سلجھاؤ پیدا کر دیتے ہیں محبت اور احترام کے قابل بزرگ ہیں۔

قاری عبدالعزیز شوقی انبالوی

شوقی صاحب خود مظاہری لکھتے تھے غالباً وہ بھی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے تربیت یافتہ تھے' بڑے خلیق اور ملنسار انسان' میں انہیں آزادی ملک سے پہلے سے جانتا تھا اور ان کے اخلاق کا گرویدہ تھا وہ نہایت اچھا شعر کہتے تھے لیکن چھپوانے میں حجاب محسوس کرتے تھے' نجانے اب ان کا کلام کہاں اور کس کی تحویل میں ہوگا۔ وہ حضرت مولانا قاری عبدالمالک جیسے حسنتر قاری کے مدرسے میں علم تجوید پڑھاتے رہے' ان کے لیے یہ سند کافی ہے۔

نقوشِ رفتگاں

حضرت اجل انبالوی، حکیم آزاد انصاری، حیرت شملوی، بہار کوٹی، لطیف انور گورداسپوری، سلیم بے تاب، ناصر کاظمی، شرقی بن شائق، شفیق کوٹی، ابر احسنی گنوری، احمد الدین اظہر، محمد عبداللہ مضطر گجراتی، ساغر صدیقی، مسیح الحسن بقا نقوی، قربان حسین شہید جہلمی، شاد قدوائی گوجرانوالہ

اجل انبالوی

اجل انبالوی صاحب کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا جب میں اپنے والد کے ساتھ انبالہ گیا اور لالہ فیروزی لال بزاز کے یہاں قیام کیا تھا، فیروزی لال میرے والد کے منہ بولے بیٹے تھے اس زمانے میں مجھے شعر کی خوبی اور معائب کا شعور نہیں تھا، میں اجل صاحب کے پاس گیا وہ کسی اور شخص کو اپنی غزل سنا رہے تھے، بعد میں مجھے جتنا شعور آتا گیا ان کے کلام کی عظمت اجاگر ہوتی گئی اور میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میں ایک بڑے شاعر سے ملا تھا، شاید مجھے میرے والد بھی وہاں اسی لیے لے گئے تھے کہ اجل صاحب بھی قاضی تھے، خیر یہ خاندانی بات اب میری نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتی -مگر اجل صاحب استاد قسم کے شاعر اور درویش منش انسان تھے ان کی زندگی اس انداز کی تھی جو ہمارے یہاں عموماً بزرگان دین کی ہوتی ہے-

اجل صاحب مجردانہ زیست گزار کے دنیا سے بے اولاد رخصت ہو گئے، ان کے بعد ان کے کلام کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا غالباً چھپا بھی نہیں، سنا ہے کہ اب اجل صاحب کے ایک عزیز شاگرد جناب تاج انبالوی ان کا کلام اشاعت کے لیے جمع کر رہے ہیں، یہ ایک خدمت ادب ہوگی اور اس کا اجر خدا کے ہاتھ ہے، بہر صورت تاج صاحب وہ کام کر رہے ہیں جو شاعروں کے چہیتے بیٹے نہیں کرتے جزاہ اللہ فی الدارین خیراً

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری سہارنپوری

حکیم آزاد انصاری صاحب سے میری ملاقات حضرت جوش ملیح آبادی کے مکان پر دہلی میں ہوئی اور ایک بار کی ملاقات عمر بھر کی ملاقات ہوگئی' آزاد انصاری صاحب ایک جید شاعر اور فن شعر و ادب کے امام تھے' جناب جوش آج تک ان کی قابلیت اور فنی معلومات کے شاہد ہیں' جناب آزاد انصاری کی شاعری اور نثر میں کوئی زیادہ فاصلہ نہ تھا' ایسا سہل ممتنع کا قادر الکلام شاعر مشکل سے ملتا ہے ان کا کلام تعقید لفظی سے پاک اور مغلق الفاظ کے بوجھ سے خالی تھا۔ وہ ۱۸۷۰ء میں بمقام ناگپور پیدا ہوئے لیکن آبائی وطن سہارنپور تھا اور بہتر سال کی عمر میں ۱۴ جنوری ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد دکن میں رحلت فرماگئے ان کی موت اردو زبان کے لیے بڑے خسارے کی بات ہے۔ ان کی عمر نے ان کے جسم کو تو لاغر و ناتواں کر دیا تھا لیکن ان کی دماغی صلاحیتیں آخری دم تک اسی طرح برقرار رہیں۔

ان کی شاعری میں سادگی اور پختگی اس قدر گتھی ہوئی تھی جس کی مثال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے یہی سبب ہے اب تک کوئی آزاد انصاری کے رنگ تغزل کی تقلید نہیں کر سکا' چھریرے بدن اور سنتے ہوئے چہرے پر خشخشی داڑھی اور عینک سے چمکتی ہوئی نکتہ رس آنکھیں اب تک میری نظر میں پھر رہی ہیں۔

حکیم آزاد انصاری پہلے بے دل کے شاگرد تھے اور پھر حالی پانی پتی سے تلمذ ہوا انہوں نے حالی کے رنگ کو اس قدر چمکایا کہ منفرد ہو کے رہ گئے آزاد انصاری کا دیوان ''معارف جمیل'' شعری دنیا کا حیران کن کارنامہ ہے۔

ان کے یہاں شگفتگی کلام حالی سے کہیں نکھری ہوئی ہے۔ فلسفہ کی گہرائی غالب سے زیادہ واضح ملتی ہے حضرت جوش غزل کے خلاف ہیں اور آزاد صاحب کی یہ رباعی ان کا جواب ہے۔

کہتے ہو کہ جچتی نہیں اب شان غزل
ممکن ہو تو ڈھا دیجیے ایوان غزل

سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر
افسوس ہے اے نمک خرامان غزل

عبدالمجید حیرت شملوی

شملے کے مشاعروں کی یادگار صحبتوں میں جہاں جناب عاصی مینائی، محمد حسن حسن امرتسری زین العابدین محشر حکیم راغب مرادآبادی، سعید الٰہ آبادی مولانا عزیز الحق تھانوی، ذوالفقار بخاری، عبداللہ منتظر ذہن میں مرتسم ہیں وہیں حیرت شملوی بھی ہیں حیرت کو میں نے پہلی بار شملے میں دیکھا اور سنا اور اسی وقت سے وہ مرے انتخاب میں آ گئے، ان کی شاعری میں سہل ممتنع کا حسن اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ شاعرانہ پاکیزگی کا ایسا آمیزہ تھا کہ مشاعرے میں کوئی فرد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا ان کی شاعری کو مقبول کرنے میں جہاں حسن بیان اور جلوہ معنی کا ہاتھ تھا وہیں ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا دلدوز تھا کہ مافی الضمیر کو خواص و عوام آسانی سے پا لیتے تھے، مجھے ایسا جادو اب تک کسی شاعر کی شاعری میں نہیں ملا، آزادی کے بعد وہ کراچی آ گئے تھے اور فالج زدگی کے عالم میں انہیں کراچی میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے قریب ایک ویران کمرے میں پناہ ملی، ان کی طرف سے حکومت بے رحم، اعزہ و اقربا بے پروا اور یار دوست بے وفا ہو گئے تھے جو اس ملک کی قدیم روایت چلی آ رہی ہے، وہ تو خیر گزری کہ ان کا کلام ''آئینہ حیرت'' کے نام سے ان کی زندگی میں چھپ چکا تھا ورنہ اس کا حشر بھی نہ جانے کیا ہوتا، غالباً ان کا بقیہ کلام ان کے ایک معتقد انیس نامی اکٹھا کر رہے ہیں خدا انہیں کامیاب کرے۔ آمین ثم آمین

بہار کوٹی صاحب

بہار کوٹی صاحب کو یوں تو میں ایک عرصے سے جانتا تھا اور ان کے مداحوں میں تھا لیکن چونکہ وہ شفیق کوٹی صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے اس سلسلے نے مجھے ان سے اور بھی قریب کر دیا تھا، میں جب بھی ان سے ملا ہوں ان کی طرف سے ایک نیا جذبۂ خلوص لے کر اٹھا ہوں، وہ سر سے پاؤں تک محبت اور شرافت کا مجسمہ تھے، بحیثیت شاعر میں نے بہت کم ایسے مخلص انسان دیکھے ہیں جن کی

زندگیوں میں میانہ تہیں نہ ہوں اور ظاہر و باطن میں شرک کو روا خیال نہ کریں۔

بہار کوٹی کی زندگی نہایت سادہ اور بغیر استر کی زندگی تھی۔ جوان سے ایک بار ملا بس ان کے محاسن کا وکیل ہوگیا' قوت زبان وقلم کا یہ عالم کہ صنف ادب کا کوئی میدان ایسا نہ تھا جہاں ان کا اشہب قلم شہگامی اختیار نہ کرتا ہو' میرے سامنے ان کا ہنستا ہوا حسین چہرہ اور غلافی آنکھیں اب بھی اسی طرح شاداب ہیں۔

حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کے مشاعرے سے رات کے دو بجے ان کا وہ معانقہ کر کے رخصت ہونا میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا' موت فطری سانحہ ضرور ہے اور ہم سب قطار میں کھڑے ہیں ہر انس پر موت کا اسٹیشن نزدیک آتا جا رہا ہے لیکن بہار کوٹی کی موت سے ادب وشعر کی دنیا کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے خدا کرے جلد ان کا مجموعہ کلام چھپ جائے ورنہ وقت اپنے آہنی قدموں سے غم کے نقوش اور احساس کی سرخیوں کو دھندلا کر دیتا ہے اور اب تک سیکڑوں کارنامے اس دھند کی دیوار میں روپوش ہوگئے ہیں۔

لطیف انور گورداس پوری

لطیف انور جب اسلامیہ کالج لاہور میں طالب علم تھے' اسی وقت سے میرے دوستوں میں تھے اور علامہ سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ رکھتے تھے' نہایت خوش گو' خوش خو اور خوش مزاج انسان تھے' لیکن چونکہ ان میں ایک معیاری شرافت تھی اس لیے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کوئی اچھا منصب نہیں مل سکا اور فوج میں چلے گئے' میدان جنگ سے فراغت ہوئی تو ریڈیو پر ایک معمولی سی جگہ مل گئی اور گزارا کرنے لگے۔

ان سے اتوار کے روز عموماً پرانی کتابوں کے بازار میں ملاقات ہوتی تھی اور وہ پہروں ناقدر دانی زمانہ کی شکایت کرتے تھے اس کے باوجود کہ انہیں قلیل تنخواہ ملتی تھی اور اہل وعیال کے مصارف بھی جان لیوا تھے انہیں مطالعے کا ذوق کتابوں کی خریداری پر بھی مجبور کرتا تھا' ان کے کلام میں برجستگی کے ساتھ بانکپن گھلا ہوا ملتا ہے' افلاس کے جبڑوں میں بھنچ کر بھی میں نے ان کی انا کو بھی دھندلا نہیں دیکھا' وہ صحیح معنی میں ایک شریف انسان اور بلند پایہ شاعر تھے اللہ ان کی روح پر رحمتیں

نازل فرمائے آمین

سلیم بے تاب

ایک نوجوان شاعر جو اظہار و ابلاغ کے فن کو لے کر پیدا ہوا تھا شاید اس لیے کہ اس کی عمر کم تھی اور مسائل زیادہ سلیم بے تاب کے کلام میں غم عشق کے ساتھ غم دوراں کی چاشنی بڑی ہی دلچسپ تھی، وہ ذہنی طور پر تندرست اور عزائم کے معاملے میں اپنے ہم عصروں سے علیحدہ تھا اس کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل بے نقاب تھے اور وہ ان کے تجربے تجربے میں ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو موٹر کے حادثے میں اللہ کو پیارا ہو گیا' اس کے کلام کا مجموعہ ''لمحوں کی زنجیر'' سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ زیادہ عمر لے کر نہیں آیا تھا' وہ دکھی دل سے بات کہتا تھا اور اس کی بات کو دکھی دل ہی سنتے اور سمجھتے تھے' ہر چند کہ یہ دور روایات کی شکست پر تلا ہوا ہے لیکن سلیم بے تاب انسانیت کا صحیح نمائندہ تھا' خدا اسے جوار رحمت عطا فرمائے ۔ آمین

ناصر کاظمی

ناصر آج ہم میں نہیں لیکن وہ ہم میں رہ گیا ہے' میں جن دنوں آپریشن کے لیے ہسپتال داخل ہوا وہ مجھ سے پہلے داخل تھا' جب اس نے میرے داخلے کے متعلق سنا تو وہ علالت کے باوجود اٹھ کر میرے کمرے میں آیا اور کئی اپنے ڈاکٹر دوستوں سے ملایا' اس وقت اس کا انداز ایسا تھا جیسے غریب الوطنی میں کوئی ہم وطن دوست اچانک نظر پڑ جائے ۔ ناصر جہاں ایک نغز گو شاعر تھا وہیں وہ ایک ایسا انسان بھی تھا جو دوستوں کو مغموم نہ ہونے دے اور ہر عالم میں اس کی مسکراہٹ شگفتہ رہے ۔

وہ ایک نازک طبع اور حساس انسان تھا جو بلند شاعری کی خصوصیت ہے ۔ اس کا کلام اس کی شاعرانہ عظمت کو گرد آلود نہیں ہونے دے گا ۔ کیونکہ وہ شاعری میں عام زندگی سے زیادہ لطیف مزاج ہو جاتا ہے ۔

ناصر کو کبوتروں کا بہت شوق تھا ۔ جب وہ میرے یہاں آتا تو شاعری سے کنارہ کر کے کبوتر بازی کی طرف گفتگو کا رخ موڑ دیتا اور پھر پہروں ان کی نسلوں اور رنگوں پر گفتگو کرتا' اصل میں یہ اس کی منہ زور جمالیاتی حس تھی جس نے اسے کبوتروں کے حسن کا فریفتہ کر دیا تھا' کیونکہ کبوتر حسین پرندہ

ہونے کے باوجود انسانوں کی طرح بے وفا نہیں ہوتا۔

میں جب اس کی وفات پر اس کے گھر گیا تو اس کی محبت اور شفقت سے محروم کبوتر اس کے گھر میں رکھے ہوئے جنازے کا طواف کر رہے تھے اور میرا دل بھر کر آ رہا تھا کہ اب کون ناصر کی طرح محبت کرے گا۔ آج یہ معصوم پرندے یتیم ہو گئے' ناصر کو جتنا کبوتروں سے شوق تھا۔ ممکن ہے اس کی روح زندگی سے زیادہ ان سے مانوس ہو گئی ہو' ناصر شعر و ادب میں اپنے رنگین اور پائدار نقوش چھوڑ کر غروب ہو گیا' مگر اس کی شفق رہتی دنیا تک اس کی یاد دلاتی رہے گی۔

شرقی بن شائق

میں ایک عرصے سے شرقی بن شائق کو شعراء کی صف میں دیکھتا چلا آ رہا تھا' شعراء میں ہر فرد اپنے حالات اور ماحول سے متاثر ہوتا ہے گردوپیش کے موافق و ناموافق حالات کا احساس ان کے بشروں پر جھلک پڑتا ہے لیکن میں نے شرقی بن شائق کے ہونٹوں پر ہمیشہ زندہ تبسم دیکھا ہے۔ حالانکہ ناہوت کے معاملے میں وہ سب کے ساتھ تھا مگر وہ اپنے غم کا پردہ رکھنا جانتا تھا وہ ایک مخلص اور سچے انسان کی طرح زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔

وہ فی البدیہہ شعر کہتا تھا اور اس کی یہی مشق و مزاولت اسے پستی سے بچائے ہوئے تھی' ایک زمانے میں جب اس کے حالات سازگار نہیں تھے اس کا یہی فن اور پختہ مشقی اس کے معاشی پہلو کی پردہ دار رہی۔ اس پر برے برے وقتوں کی یلغار رہی۔ لیکن اس کا تبسم کبھی نہیں مرجھایا۔ اس نے غربت اور ناداری دیکھی تھی۔ اس لیے وہ غریبوں اور ناداروں کے جذبات و احساسات کو سمجھتا تھا۔ وہ اپنی مفلسی کو کبھی کسی دریچے میں نہیں لایا' مرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے اہل و عیال کس مصیبت سے گزارا کرتے تھے۔

شرقی بن شائق صرف شاعر ہی نہیں تھا وہ اعلیٰ درجے کا صحافی بھی تھا چنانچہ اس نے ''نوائے وقت'' کے ادارے میں رہتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ نوائے وقت کے مالک جناب مجید نظامی نے شرقی بن شائق کے پس ماندگان کے لیے کچھ انتظام کیا ہے۔ میرے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ باقی اس کی جزاء اللہ کے اختیار کی بات ہے' شرقی بن شائق

اچھا خاصا زود گو شاعر تھا اور ممکن ہے نثر میں بھی اس کا کچھ کام ہو جو ابھی سامنے نہیں آیا۔

شفیق کوٹی مرحوم

مشاعروں کے سلسلے سے میرے یہاں جناب شفیق کوٹی کا آنا جانا ہو گیا تھا' شفیق صاحب ایک امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے' آزادی ملک کے سلسلے میں یہاں آئے تو سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گئے اور صرف تنخواہ پر اکتفا کیا جس سے عمر بھر سائیکل تک میسر نہ آئی اور تقدس کی ٹھنڈ ٹھنڈ میں پینشن تک آ گئے وہ کبھی کبھی اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کے قصے کابوس کے مریض کی طرح بیان کرتے تھے۔

شفیق کوٹی صاحب مولانا سیماب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں سے تھے' احباب میں ذکر شعر سے زیادہ مشاعروں کا انعقاد ان کی کمزوری میں شمار ہوتا تھا' کچھ دنوں جگہ میسر نہ آنے کے باعث چپکے چپکے شکاریں کی طرح لپ جھپ کرتے پھرتے اور تشنہ سے دکھائی دیتے تھے۔

شفیق کوٹی صاحب کا ایک دیوان زیور طبع سے مزین ہو چکا ہے جس پر جناب رئیس احمد جعفری مرحوم نے ایک طویل مقدمہ لکھا تھا۔ یوں تو انہوں نے احتیاطاً سید عابد علی مرحوم' ڈاکٹر عبادت بریلوی' سید وقار عظیم' اور راقم الحروف سے بھی پیش لفظ لکھوایا تھا' لیکن شاید یہ ان کی مرضی کے مطابق تحریریں نہیں تھیں اس لیے زیب دیوان نہ ہوئیں' ان کا دیوان چھپا اور جہاں انہوں نے نذر کیا سراہا گیا دوسرا دیوان زیر ترتیب تھا' غالباً ڈاکٹر فرمان فتح پوری مقدمہ لکھ رہے تھے۔

شفیق صاحب کی عمر اس قوت پچھتر سال کے لگ بھگ تھی اور جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی ان کی شاعری پر پرزے نکال رہی تھی۔ چنانچہ جوان شعر کہنا اور جوانوں جیسی گفتگو ان کا شعار ہو گیا تھا۔ اکثر شام کو غریب خانے پر تشریف لاتے اور جب تک بیٹھتے محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے۔

شفیق کوٹی صاحب کاروباری تگ و دو میں پندرہ پندرہ بیس بیس میل کا روز پیدل سفر کرتے اور اسے کاروباری ضرورت بتاتے تھے' لیکن ہم جانتے تھے کہ انہیں کاروباری ضرورت نہیں' ماشاء اللہ ان کی کراچی میں دو تین بلڈنگیں ہیں۔ ان کی پنشن کے علاوہ بلڈنگوں کا کرایہ ہی ان کی کفالت کر سکتا

ہے وہ اصل میں اپنی صحت کا تحفظ کرتے تھے' ورنہ اگر کچھ بھی نہ ہوتو ان کے بچے بھی ماشاءاللہ اچھی اچھی حیثیت کے مالک ہیں اور اپنے باپ کے ذوق کی ایسی قدر کرتے ہیں کہ ان کے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

شفیق صاحب موقع ومحل کے اعتبار سے اپنی تمام لسانی قوتوں اور ادراک کے ڈانڈوں کا رخ جدھر چاہتے موڑ دیتے تھے' غالباً یہ ان کا زندگی بھر کا دفتری تجربہ تھا جو اب زندگی پر طاری ہوگیا تھا اور کاروبار میں ایک حسن قرار پاتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ فطرت کا کیا علاج کہ بعض بعض اوقات گفتگو کا کوئی نہ کوئی پٹ ادھ کھلا رہ جاتا جس سے ان کا اندر جھلک پڑتا تھا' اسی بات سے وہ مشاعروں میں بھی کام لیتے تھے' جہاں ان کا نام پکارا گیا انہوں نے ذرا سی دیر میں سامعین کی طلب ان کے چہروں سے پڑھ لی اور مطلع پر ہی مشاعرہ شباب پر آ گیا' میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا انہیں جوار رحمت سے نوازے۔آمین ثم آمین

ابراحسنی گنوری

اردو کے مشہور شاعر اور ادیب تھے اور رسالہ ''احسن'' رامپور کے مدیر بھی ان کے دو دیوان ''نگینے'' اور ''سفینے'' شائع ہو چکے ہیں' ان کے علاوہ جناب سیماب کی کتاب' ''دستور اصلاح'' کے جواب میں ''اصلاح الاصلاح'' اور ''میری اصلاحیں'' دو حصے ان کی یادگار ہیں' شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا' لیکن آخر میں بہائی مشرب اختیار کر لیا تھا ۱۹۷۰ء میں شاید اسی سلسلے میں اپنے وطن گنور ضلع بدایوں میں قتل ہو گئے جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے وہ استادانہ مہارت رکھتے تھے اور دوستوں سے بھی ان کا سلوک اچھا تھا۔ انہوں نے اپنا غیر مطبوعہ کلام بھی چھوڑا ہوگا' نجانے اس کا کیا ہوا۔

احمد الدین اظہر

اے ڈی اظہر صاحب نہایت خوش خلق اور دوست نواز انسان تھے اور اپنی ذات میں ایک انجمن' اردو زبان سے وابستگی ان کی کوئی آج کی بات نہیں تھی' وہ جوان العمری سے اردو زبان کی اشاعت وترویج میں کوشاں تھے۔

ان کا طنزیہ اور سنجیدہ شاعری کا ایک مجموعہ ''لذت آوارگی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔اور نہ جانے بقیہ کلام کا کیا بنا؟ ان کی باغ و بہار شخصیت کا ہر دوست معترف تھا۔ وہ ایک عرصے سے میرے کرم فرما تھے اور جب ملاقات ہوتی تو پہروں صحت زبان اور آرائش تلفظ پر باتیں ہوتیں' موصوف نے ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء کو تہتر سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا مگر اپنے دوستوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا امداد سے بھی دامن کش نہیں ہوئے لیکن جب وہ آنکھیں دکھاتے تو ایک ہلکے سے تبسم کے سوا ایک لفظ نہ کہتے' مگر ان کی دونوں گنجان بھوئیں ملنے لگتیں۔ انہوں نے بڑے کرب سے ایک کتاب ''اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ کے عنوان سے کسی انگریزی اخبار میں شروع کی تھی اور میرے کتب خانے سے بھی کچھ مواد لیا تھا' لیکن خدا جانے وہ کتاب چھپی ہے یا نہیں اگر چھپ چکی ہے تو ہر چند کہ انگریزی زبان میں ہے لیکن بڑے کام کی چیز ہوگی۔

محمد عبداللہ مضطر گجراتی

پنجاب کے رہنے والے مگر اردو زبان کے عاشق' فن شعر میں جناب سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے اور مجھ سے بھی مشورہ کرتے رہے'اصل میں وہ نظم کے شاعر تھے اور موضوعی نظمیں نہایت چابک دستی سے کہتے تھے' ریلوے میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور مجموعہ کلام کی اشاعت کا ارمان دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے' وہ سرتاپا شرافت تھے' جب بھی ملتے ان میں وہی شاگردانہ طبیعت ابھر آتی اور ٹوٹ کے ملتے ان کا کلام اب نہ جانے کس کے پاس ہوگا' ان کے بچے ماشاءاللہ برسرکار ہیں خدا انہیں مضطر صاحب کا کلام چھپوانے کی توفیق عطا فرمائے آمین

ساغر صدیقی

ساغر صدیقی فطری شاعر تھا اور وقت کی آواز سے آواز ملا کر نغمے الاپتا تھا' اس کے قدر شناسوں کی بھیڑ اور مشاعروں کی داد و تحسین نے اسے کسی گھر کا نہیں رکھا تھا' وہ شانہ سازی کا نہایت اچھا کاریگر تھا' مگر تماشائیوں کی واہ واہ اور بچونگڑوں کی داد و تحسین نے اسے گم کردہ راہ کر دیا تھا' اس میں نشے کی خامی پختہ ہو گئی تھی اور اس نے اسے گداگری پر لا اتارا تھا' لیکن اس کا سوال ضرورت سے آگے نہیں تھا' وہ پس انداز کرنا حرام خیال کرتا تھا جو بڑے درویشوں کا خاصہ ہے' جب

اس کے کیسہ میں پیسہ ہوتا تو اس کے ناخنوں میں سوئیاں چبھتی رہتیں اور وہ جس قدر جلدی ہو سکتا صرف کر ڈالتا' وہ مرتے مر گیا مگر تخلیق کار چاؤ' لہجے کی گھلاوٹ اور زبان کی شیرینی اس میں قدرت کا عطیہ تھی اور فطرت انعام کی واپسی نہیں کرتی - اس کی آواز کی کھنک اور خاموشی کی معنی خیزی اسے آخری دم تک دوسرے گداگروں سے امتیاز کے طور پر جدا رکھتی رہی۔

زندگی میں اس کی یہ قدر تھی کہ وہ پیسے پیسے کو تنگ تھا اور سوالیوں کی صف میں عمر گزر گئی کسی نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا' لوگ اسے آتا دیکھ کر راستہ کاٹ جاتے تھے کیونکہ وہ ایسے ملک میں پیدا ہوا تھا جہاں شہرت اور ہر دلعزیزی کے علاوہ قدر و منزلت کے لیے مرنا شرط ہے۔

آج اس کی مٹی کے تاجر اس کا پختہ مزار بنوا رہے ہیں اور شاگرد آئے دن ساغر میموریل اور ساغر روڈ منظور کرانے میں کوشش کر رہے ہیں آئے دن اس کی یاد میں مشاعرے برپا ہو رہے ہیں اور اس پر اچھے اچھے بلند مقالے پڑھے جا رہے ہیں نہ جانے اس پردے میں اپنی شہرت مقصود ہے یا ساغر کا سوگ ساغر کا کلام اس کی مضبوط یادگار ہے' مگر ساغر کی موت پر ہنگامہ آرائی سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ مردہ قومیں مردوں کے مزار پر سہرے لٹکاتی ہیں اور زندہ قومیں اپنے زندہ لوگوں کو سراہتی اور وظائف دیتی ہیں۔

مسیح الحسن بقا نقوی

ایک روز میں دلی مسلم ہوٹل لاہور میں چائے پینے گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک سانولا سا لڑکا اسٹول پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت تھی جو میلے کچیلے لباس کے باوجود آواز دیتی تھی' اس کی پیشانی روشن' ابھری ہوئی اور فراخ تھی میں نے اسے اشارے سے بلایا اور پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ لکھ رہا ہوں' 'لڑکے نے جواب میں کہا۔

میں: کیا لکھ رہے ہو؟

لڑکا: یونہی ایک دوست کو خط لکھ رہا ہوں۔

میں: تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟

لڑکا: جی ہاں' چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے پھر والد کا انتقال ہو گیا اور تعلیم رہ گئی۔
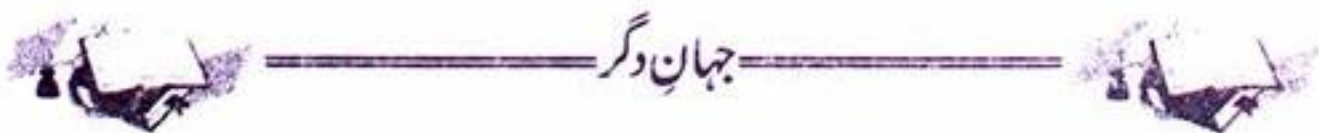
میں: تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکا: مسیح الحسن نقوی!

میں: ماشاءاللہ' نقوی' کے کیا معنی میاں؟

لڑکا: ہمارا خاندان حضرت امام نقی علیہ السلام کے سلسلے سے ہے؟

میں: دیکھو جب میں یہاں آیا کروں مجھے تم چائے پلایا کرو۔

مسیح: اچھا صاحب! ضرور

میں خود بھی وہاں روز جانے لگا اور اپنے دوسرے دوستوں سے بھی کہہ دیا کہ چائے دلی مسلم ہوٹل میں پیا کریں اور ٹپ کے بہانے سے اس لڑکے کی جو بھی ہو سکے مدد کیا کریں یہ یتیم ہے اور مجھے اس میں کچھ اشارات ملتے ہیں۔

کچھ روز تک تو یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا' ایک دن جو میں گیا تو مسیح کو وہاں نہ پایا' پوچھا تو معلوم ہوا کہ مالک نے اسے نکال دیا ہے۔

''وہ کہاں رہتا ہے''میں نے ایک بیرے سے پوچھا۔

بیرے نے کہا کہ میں نے اس کا مکان تو دیکھا نہیں لیکن وہ کہا کرتا تھا کہ میں شیرانوالہ دروازے کے باہر بجنور ہاؤس میں رہتا ہوں۔ میں بجنور ہاؤس جا کر مسیح الحسن سے ملا وہ بے روزگاری کے باعث پریشان تھا میں نے اسے تسلی دی اور اپنے ہمراہ لے آیا شام کو ایک دوست سے کہہ کر میں نے اسے تار گھر میں پیکر کی حیثیت سے ملازم کرا دیا۔

تنخواہ تو وہاں کم تھی اور کام بھی زیادہ تھا' لیکن تنخواہ کے علاوہ اسے ہر تار پر غالباً کچھ ملتا تھا' کئی تار ایسے بھی آ جاتے تھے جن کو وصول کرتے ہی لوگ تار لانے والے کو انعام واکرام سے خوش کرنا چاہتے تھے اور اس طرح ہوٹل سے کسی طرح بھی کم تنخواہ نہیں پڑتی تھی۔

ایک دن مسیح علی الصبح آیا اور بے دم ہو کر گر پڑا اس دن اس نے ساری رات پیدل پھر پھر کر تار تقسیم کیے تھے اور تھک کر چور ہو گیا تھا۔ مجھے رحم آیا مگر مجبور تھا مالی حالت میری بھی ایسی نہیں تھی کہ خاطر خواہ اس کی مدد کر سکتا۔

آٹھ نو بجے میرا ایک شاگرد سرو پرکاش دامن سائیکل پر سوار میرے پاس آیا اور کہنے لگا' استاد

میں موٹر سائیکل لینے جارہا ہوں یہ میرا سائیکل رکھا ہے میں نے کہا خدا مبارک کرے یہ سائیکل مسیح کو دے دو! اس نے بے حیل وحجت سائیکل مسیح کے حوالے کر دیا اور جا کر موٹر سائیکل خرید لایا۔

اب مسیح کو بڑا آرام ہو گیا اور میں نے اسے ادیب کے امتحان کی طرف لگا دیا' چونکہ ذہین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی کی آرزو اس نے اسی سال ادیب کر کے دوسرے سال میٹرک کا امتحان دے دیا اور پاس ہو گیا' چند روز کے بعد جہاں وہ تار بانٹتا تھا وہیں کلرک ہو گیا' اب اس میں شعر گوئی کا جذبہ بیدار ہوا' میں نے اسے بقا تخلص دے دیا اور وہ اچھے معقول قسم کے شعر کہنے لگا۔

یکا یک اس کے رویے میں تبدیلی آئی اور بے سبب آنا جانا کم ہو گیا معلوم ہوا کہ لڑکا کہیں عشق لڑا بیٹھا ہے' دریافت کیا تو اس نے صاف صاف بات بتادی کہ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے والہانہ لگاؤ رکھتی ہے۔

اسے تمہاری تنخواہ معلوم ہے؟ میں نے پوچھا

کیوں نہیں؟ وہ تو ہمارے عزیزوں میں ہے اور میری زندگی کے علاوہ گھر کے حالات سب اس کے سامنے ہیں مگر اس کے اعزا مجھ سے خوش نہیں۔ کیوں؟ میں نے پوچھا۔

بس اس لیے کہ میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ بقا نے جواب دیا'

میں: یہ تو کوئی بات نہیں اگر لڑکی بالغ ہے اور تمہیں پسند کرتی ہے تو کوئی طاقت تمہاری شادی میں حائل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ یہی ہوا کہ کئی مہینے کی ردوقدح کے بعد وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا اور میاں بیوی خوش خوش رہنے لگے۔

مسیح الحسن کا چھوٹا بھائی شمس الحسن ایک کتب خانے میں ملازم تھا بے چارہ اچانک فالج میں خود راہی عدم ہو گیا اور مسیح الحسن کو دو بچیاں اور ایک بیوہ پرورش کے لیے دے گیا۔ کتب خانہ کے مالک جناب ظہیر نے شمس الحسن کی زندگی میں بھی بڑی مدد کی اور مرنے کے بعد اس کی بیوہ اور بچوں سے بھی غفلت نہیں برتی لیکن تا بہ کے؟ ادھر مسیح الحسن کے یہاں یکے بعد دیگرے تین بچیاں ہو گئیں' اب اس کے گھر میں نو آدمی تھے اور ایک کلرک کی تنخواہ' بے چارہ بے حد پریشان رہتا تھا لیکن جب بھی وہ دوستوں میں بیٹھتا تو اس کے چہرے پر اسی طرح شادابی اپنی بہار دکھاتی۔ وہ ناگفتہ بہ حالت ہونے

کے باوصف دوستوں میں اسی طرح ہنستا بولتا جیسے دنیا کی کوئی فکر نہیں ہے حالانکہ کشمکش حیات اس کا کلیجا چھلنی کیے ڈالتی تھی آخر

انسان تو انسان ہے پتھر تو نہیں ہے۔''

اس ضبط قیامت کا نتیجہ بخار کی صورت میں نمایاں ہوا' اور اس میں وہ روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا اس کے نسبتی بھائی نے حتی الوسع اس کی خدمت کی لیکن حساس انسان جب مجبوری اور فلاکت کا شکار ہوتا ہے تو مشکل سے پنپتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے نسبتی بھائی کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں گیا ڈاکٹر مصروف تھا اور مسیح الحسن بقا باہر بینچ پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا اچانک اس نے پانی مانگا لیکن اس کے ادھر ادھر سب مریض تھے کون پانی دیتا؟ اس کا نسبتی بھائی اندر ڈاکٹر کے پاس اس کی فرصت کا انتظار کر رہا تھا مسیح الحسن کو جب پانی نہ ملا تو غشی طاری ہو گئی' مریضوں نے اندر جا کر ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر کسی مریضہ سے بات کر رہے تھے ذرا دیر سے آئے تو مسیح الحسن راہی عدم ہو چکا تھا انا للہ وانا الیہ راجعون!

سنا ہے اس کا کلام اس کی بیوہ کے پاس محفوظ ہے' وہ نہایت اچھے شعر کہتا تھا اور قدیم رنگ سے بالکل ہٹ کر اس کی ذہانت نئے نئے زاویے پیدا کرتی رہتی تھی۔

مسیح الحسن بقا حلقہ ارباب ذوق کا ممبر تھا خاصا مخلص کارکن میں نے حلقے کے سیکرٹری شہرت بخاری صاحب' سجاد باقر رضوی صاحب اور دیگر اراکین سے کہا کہ حکومت سے بقا کے بچوں کی امداد کے لیے درخواست کریں لیکن کسی نے نہ سنی۔ میرے اور ہوش ترمذی کے بار بار تقاضوں پر شہرت بخاری نے وعدہ کیا کہ ہم ضرور کوشش کریں گے لیکن ابھی تک نتیجہ معلوم نہ ہو سکا' حالانکہ ان دنوں رائٹرز گلڈ سے مرحوم ادیبوں کے پسماندگان کو امداد اور وظیفے مل رہے تھے۔ مگر وہاں بھی جب تک کسی بلندی سے اشارہ نہ ہو پستی میں حرکت نہیں ہوتی۔ میں دو سال رائٹرز گلڈ کا خزانچی رہ کر یہی مناظر دیکھتا رہا ہوں اور آج مرکزی عاملہ کا ممبر ہوں' اب تک گلڈ کا وہی اقربا نوازی کا سلسلہ برقرار ہے اور چھتنار درختوں کے سائے پودوں کو ابھرنے نہیں دیتے۔

قربان حسن شہید جہلمی

قربان حسین نام شہید تخلص جہلم کے رہنے والے تھے وہ جب اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اسی وقت سے تعارف اور آنا جانا آرہا تھا شعر گوئی کا ذوق انہیں طالبعلمی سے تھا اور مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے، ترک تعلیم کے بعد وہ فوج میں ملازم ہو گئے اور وہاں سے ریٹائرڈ ہو کر بیکو کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔

لاہور سے نکل کر کچھ روز کے بعد وہ حضرت سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہو گئے تھے، ممکن ہے ملازمت کے دوران بھی ان سے اصلاح لیتے رہے ہوں۔ جب وہ لاہور آئے تو سلسلہ اصلاح ترک ہو چکا تھا۔ غالباً فارغ الاصلاح تلامذہ میں آ گئے تھے، جن کی فہرست 'شاعر'' آگرہ کے کارواں نمبر میں چھپ چکی ہے۔لیکن قربان حسین شہید اللہ کو جلد پیارے ہو گئے اور ان کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا، دیکھیے اب اس ذخیرے کا کیا بنتا ہے۔

قربان حسین شہید رحلت کرنے سے چند ماہ پہلے اپنے کلام کا انتخاب مجھے دے گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ اگر کہیں ضرورت پڑے تو یہ انتخاب ہے، لیکن اب میں نے بے حد تلاش کیا مجھے وہ نہیں ملا نہ معلوم کہاں گیا اگر کبھی مل گیا تو وہ اس کی امانت ہے، ویسے مختلف رسالوں میں بھی ان کا کلام ملے گا، مگر اس دور میں اس غریب کے لیے کون تگ و دو کرے گا، یہ خود اپنے مزارات پر سفیدی پھیرنے میں مبتلا ہیں!

شاد قدوائی

اسی گوجرانوالہ میں ایک شاد قدوائی بھی تھے، جنہیں علامہ محوی صدیقی سے تلمذ تھا، دماغ بڑا رسا پایا تھا اور شعر بھی سوچ سمجھ کر کہتے تھے، غالباً پی۔ڈبلیو ڈی میں اوورسیر تھے اور آہستہ آہستہ اوورسیری جذبہ شعر پر غالب آ گئی مگر انہیں اس کا احساس تھا کہ میں پٹڑی سے اتر گیا ہوں، چنانچہ کئی بار مجھ سے اس کا اظہار کیا اور دنیاوی کشمکش کا رونا رویا، آخر اسی کشمکش میں راہی عدم ہو گئے، نہ جانے ان کا کلام ان کے بچوں کی تحویل میں ہے یا کسی اور کی!

یہیں گوجرانوالہ میں ایک صاحب محمد عمر طالب تھے اور ایک ان کے چھوٹے بھائی محمد اکرم اور

دونوں شاعر تھے' چھوٹا بھائی تو کالج میں تعلیم کے دوران وفات پا گیا تھا اور اچھا خاصا شعر کہتا تھا' نہ جانے اس کے کلام کا کیا حشر ہوا' البتہ محمد عمر طالب کسی بنک میں مینیجر ہو گئے تھے اور پھر اچانک معلوم ہوا کہ فوت ہو گئے' نہایت شریف' زندہ دل متواضع اور زیرک انسان تھے۔

پولس

دلاور حسین خان' صوفی عبدالستار' مشتاق حسین بخاری' چوہدری سردار محمد' نصیر' معراج حسین' این اے رضوی اسد محمود علوی نذیر احمد بوسال' میاں محمد احمد

دلاور حسین خاں جوانی میں بڑے کھلے ڈھلے کے آدمی تھے اور ان کے کردار کے دونوں رخ روشن تھے یعنی سرکار خوش خیال اور عوام خوش گمان!! پولس میں ہوتے ہوئے یہ کردار بمشکل بنتا ہے لیکن وہ مسلمان جو صاحب مطالعہ ہو اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ تفتیش جرائم کے سلسلے میں مار دھاڑ سے زیادہ نفسیاتی گفتگو سے کام نکالتا ہے' اس ڈھب کا ایک اور آدمی سردار محمد اسی محکمے میں آج بھی کام کر رہا ہے وہ جہاں تعزیرات کا حافظ ہے، وہیں اصول تفتیش بھی جانتا ہے اس کا ذکر میں کہیں اسی کتاب میں کروں گا۔

دلاور حسین خاں اچھے شریف اور زیرک انسان ہیں' ریٹائرمنٹ کے بعد تو دن رات ادبی مطالعے سے فرصت نہیں پاتے' پچھلے دنوں وہ کسی ڈائجسٹ میں اپنے حالات قلم بند کر رہے تھے اگر انہوں نے اسی کو ادبی شرائط کے ساتھ کتابی شکل دے دی تو کئی زندگیوں کو روشنی ملے گی اور انسانی زندگی کا غالباً مقصد بھی یہی ہے کہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے دوسروں کی زندگیوں کے راستے صاف کیے جائیں میں اس قسم کی تحریروں کو عبادت سے کم نہیں سمجھتا

صوفی عبدالستار

اسی پولس میں ایک صاحب صوفی عبدالستار ہیں' یوں تو وہ کانسٹبل ہیں لیکن ان کے زہد واتقا کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے عابد و مرتاض ان کے سامنے گرد ہیں پولس اور ایسا سوز و گداز کا انسان

حیرت کا مقام ہے۔

صوفی عبدالستار صاحب جب ساہیوال سے لاہور تشریف لاتے ہیں تو غریب خانے پر بھی آتے ہیں اور جتنی دیر وہ بیٹھتے ہیں میرے سینے میں ٹھنڈی خوشبوئیں داخل ہوتی رہتی ہیں اور دل اپنی دنیاوی خواہشات سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

کسی انداز سے بھی رسول مقبول ﷺ کا نام آ جائے صوفی صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے ویسے بھی وہ اپنے گناہوں کو یاد کر کے داڑھی کو آنسوؤں سے تر رکھتے ہیں اور خدا کے یہاں زبان سے زیادہ آنسوؤں کی جھنکار مقبول ہے۔ صوفی صاحب کو پولس میں دیکھ کر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ نیکی کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی ہیں خدا سے مایوسی بے معنی سی بات ہے جو خدا کو بے نیاز کہتے ہیں وہ اپنی مایوسی کا شکار ہیں اور اپنی بے عملی کو چھپانے کے لیے خدا کو بے نیاز بتاتے ہیں' اللہ کرم کرے ان پر

مشتاق حسین بخاری

بخاری میرے اس وقت کے کرم فرماؤں میں ہیں جب ۱۹۴۷ء میں جب گلی کوچوں میں نکلنا جان پر کھیلنے کے برابر تھا' ان کا ادبی ذوق انہیں مجھ تک لایا اور میں نے انہیں قابل قدر انسان پایا' اردو' فارسی اور انگریزی میں اس وقت بھی ان کی اچھی خاصی استعداد تھی مگر اب تو ماشاءاللہ ان کے مطالعے نے ان ہی کی طرح ترقی کی ہے وہ اردو اور فارسی میں رواں شعر کہتے ہیں اور رواں فارسی بولتے ہیں' غالباً یہ بسیار گو اس لیے نہیں کہ ان کے فرائض منصبی انہیں اتنی فرصت نہیں دیتے کہ شعر و ادب کو وقت دے سکیں' اب وہ ماشاءاللہ ڈی ایس پی ہیں اور جب بھی مل جاتے ہیں ادب کے علاوہ دوسری کوئی گفتگو نہیں ہوتی اور طبیعت بحال کر دیتے ہیں۔ ان سے مل کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ بیلے کے ان پھولوں میں سانس لے رہا ہوں جو رات کو کٹورے میں کلیوں سے پھول بنتے ہیں اور وہ بھیگا ہوا کپڑا بھی مہک جاتا ہے۔ جس میں کلیاں شب بھر رہی ہیں' ان کے انتخاب میں اردو اور فارسی کے ایسے ایسے نادر شعر ہیں کہ اگر وہ انتخاب چھپ جائے تو ناظرین کے ذوق کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہو' میں کبھی کبھی جب طبیعت میں اضمحلال محسوس کرتا ہوں تو ان کی طرف جا نکلتا ہوں۔

چودھری سردار محمد

ایک دن میں ان کے پاس پولس آفس جا نکلا تو معلوم ہوا کہ میاں محمد شفیع مرحوم کے داماد چودھری سردار محمد کمال بھی اسی محکمے کے ایک افسر ہیں اور ملنے کے قابل آدمی ہیں' میں اسی وقت ان سے ملا وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے غالباً ان کی اہلیہ نے یا میاں شفیع مرحوم نے ان سے میرا تذکرہ کیا ہوگا- ان سے مل کر دل باغ باغ ہوگیا انہوں نے میاں شفیع مرحوم کے اخلاق کی یاد تازہ کردی' ورنہ عموماً پولس افسر کھری طبیعت اور کھردرے مزاج کے انسان ہوتے ہیں' ان سے مل کر یقین آیا کہ بعض بعض بلندیاں اور فطری شرافتیں کسی نہ کسی رخ سے اجاگر ہو کے رہتی ہیں' میں نے ان سے گفتگو کر کے کچھ ایسے آثار پائے جو عموماً خود ساز لوگوں میں ہوتے ہیں جو معاشی نشیبوں سے ترقی کر کے اوپر جاتے ہیں اور اپنے کردار کے اعتبار سے معیاری انسان شمار ہوتے ہیں-

نظم وضبط کے معاملے میں جب بھی ان سے گفتگو ہوئی میں نے انہیں مائل بہ فکر پایا' بہت سے راز جو تشدد سے آشکار نہیں ہوتے وہ نفسیاتی گفتگو اور سوال و جواب سے ابھار لیتے ہیں اور یہ بات بہت کم پولس والوں میں پائی جاتی ہے' پولس کا عموماً تشدد علمی اور دماغی افلاس کی علامت ہے جو لوگ چودھری سردار محمد کی طرح نفسیات جرائم پر نظر رکھتے اور گناہوں کی غایت کو سمجھ لیتے ہیں انہیں تشدد کی ضرورت نہیں پڑتی -

انہیں دنوں لاہور میں اسلامی سربراہوں کی کانفرنس کا غوغا تھا اور پولس کو یہ فکر لاحق تھی کہ نظم و ضبط میں کوئی معمولی درز بھی نہ رہ جائے- ایسا نہ ہو کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے' جہاں تک ڈیوٹیوں کا تعلق ہے اس میں تو پنجاب پولس اپنی ذہانت اور چاق و چوبند رہنے میں مشہور ہے لیکن چودھری سردار محمد صاحب اس پر مطمئن نہیں تھے اور ایک ذمہ دار افسر کو مطمئن ہونا بھی نہ چاہئے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ ایسے سلوگن لکھ کر دیں جو چھپا کر جگہ جگہ آویزاں کر دیئے جائیں اور ان میں پولس اور عوام دونوں کے لیے رہنمائی کا پہلو نکلتا ہو-

میں نے دوسرے روز بہت سے سلوگن لکھ کر دیئے انہوں نے مشتاق حسین بخاری کو بھی بلوالیا اور ہم تینوں کے مشورے سے وہ طباعت کی منزلیں طے کر کے سڑکوں اور چوراہوں پر نظر آنے لگے'

خدا کا شکر ہے وہ صورت کامیاب رہی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور یہ سربراہوں کی کانفرنس کا اتنا بڑا ہنگامہ بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوگیا۔

ہر چند کہ چودھری سردار محمد صاحب گریجویشن کے علاوہ قانون کی ڈگری بھی رکھتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پولس میں کتنے لوگ اپنے مطالعے اور فکر سے کام لیتے ہیں۔ میرے خیال سے ان میں یہ سوجھ بوجھ شرافت اور فکر جدید کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے' اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات تشدد بھی کام کرتا ہے لیکن جہاں تک ممکن ہو وہ اپنے سوالات کے تانے بانے سے مسائل کے حل نکال لیتے ہیں اور ایسے ایسے عقدوں کو سلجھانے میں کامیاب ہیں۔ جو تشدد کے حلقے سے باہر رہتے ہوئے اپنا رنگ دکھاتے ہیں ویسے وہ گرمی کی دوپہر کی طرح تمازت کے خواص سے بھی واقف ہیں لیکن نرمی اور سختی کے محل پر ان کی نظر مرکوز رہتی ہے اور وقت سے غفلت ان کے یہاں خامی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی میں سخت بھی ہیں اور ضدی بھی' لیکن عام حالت میں نرم اور انتہائی خلیق ہیں اور یہ بڑے انسان اور مسلمان کی بولتی ہوئی علامت ہے۔

چودھری سردار محمد اپنے کمالات پر خاموش اور دوسروں کے کارنامے بیان کرنے میں فراخ حوصلہ انسان ہیں' ایک دن انہوں نے بر سبیل تذکرہ سنایا کہ ضلع راولپنڈی میں ایک ڈاکو مفرور تھا اور اس کی تلاش میں پولس قریب قریب ناکام ہو چکی تھی' میں نے ایک نصیر نامی کانسٹبل کو ہدایت کی کہ کسی طرح اس ڈاکو سے جا کر مل جاؤ تاکہ اس کی گرفتاری عمل میں آسکے' وہ اللہ کا نام لے کر چل کھڑا ہوا اور جانے کس طرح اس ڈاکو کا ساتھی بن کر تین ماہ تک اس کا شریک کار رہا' اور پھر راولپنڈی میں مکان لے کر رہنے لگے اور موقع دیکھ کر دوش طلب کرلی اور پولس نے آسانی سے گھیرا ڈال کر ڈاکو کو گرفتار کرلیا وہ نصیر کانسٹبل آج کل اے ایس آئی ہے' یہ واقعہ تو معمولی ہے لیکن اس افسر کا ظرف دیکھیے جو اپنے نہیں اپنے سپاہیوں کے کارنامے سناتا ہے۔

اصل میں اگر دیکھا جائے تو دفاتر میں کلرک اور پولس یا فوج میں سپاہی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں بفرض محال اگر وزارتوں کو کالعدم کر کے حکومت کلرکوں کے سپرد کردی جائے اور کانسٹبل کو اس کے جائز حقوق دیئے جائیں تو ملک میں امن وامان ہو جائے بشرطیکہ یہ چھوٹا طبقہ ایماندار ہو جائے اور بڑا حلقہ ان کے حقوق دینے میں کوتاہی نہ برتے۔ مگر کمال تو یہ ہے کہ ملک کے چھ کروڑ آدمی پولس

سے ڈرتے ہیں اور پولس چند بدمعاشوں سے لرزاں وترساں ہے' حالانکہ یہ خوف اور خطرہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پولس ڈرتی نہیں مصلحتاً خاموش رہتی ہے اگر حکومت چاہے تو اس کا علاج بھی کوئی مشکل امر نہیں'

میں اس سلسلے میں ایک اور واقعہ پیش کروں گا جس سے افسران کے تشدد اور سختی پر روشنی پڑتی ہے میرٹھ میں ایک تھانے دار کسی کنسٹبل سے ناراض ہو گیا اور دوپہر کو حکم صادر کیا کہ شام تک کوئی نہ کوئی ملزم لاؤ ورنہ پیٹی چھن جائے گی۔غریب سپاہی رات تک مارا مارا پھرا مگر کوئی مجرم نہ مل سکا سخت پریشان تھا کہ کیا کیا جائے میں کوئی مجرم نہ لے کر گیا تو نوکری نہیں رہے گی اور پھر بال بچوں کا کیا بنے گا' اسی کشمکش اور پریشانی میں وہ گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ماموں اس کے گھر مہمان ہے' وہ دل پر پتھر رکھ کر اپنے ماموں کو کسی چکر سے تھانے لے گیا اور حوالات میں بند کر دیا' تھانے دار نے شاباش دی' لیکن دوسرے روز جب ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو اس نے بتایا کہ میں تو اس کانسٹبل کا ماموں ہوں جو مجھے یہاں بند کر گیا ہے کل شام اس کے یہاں خیریت معلوم کرنے آیا تھا وہ مجھے یہاں لا کر حوالات میں بند کر گیا اور خود کہیں چلا گیا' مجسٹریٹ نے فوراً سپاہی کو بلوایا اور یہ واقعہ دریافت کیا تو کانسٹبل نے بھی صحیح صحیح بیان دے دیا اور کہا حضور میں نے سوچا کہ میں اپنے ماموں سے تو معافی مانگ لوں گا اور یہ مجھے معاف بھی کر دیں گے لیکن تھانیدار مجھ سے ناراض ہے نجانے کس مصیبت میں پھنسا دے' مجسٹریٹ نے تھانے دار کے خلاف رپورٹ کر دی اور ملزم کو باعزت بری کر دیا۔

معراج حسین

میں اس سلسلے میں اگر معراج حسین صاحب کا بھی ذکر کرتا چلوں تو بے جا نہیں ہو گا' انہوں نے سی۔ایس پی کا امتحان میرے کتب خانے میں لکھ پڑھ کر دیا تھا جس سے وہ پی ایس پی میں آ گئے' وہ بھی نہایت ذہین انسان ہیں۔اور اپنے فرائضِ منصبی کو محنت اور دیانت سے انجام دیتے ہیں' یوں دیکھنے اور بات کرنے میں نہایت نرم لہجہ کم گو اور کم آمیز معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے کارنامے ایسے ایسے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے' وہ بھی تشدد سے زیادہ تفتیش کے انسان ہیں اور دماغ سے زیادہ کام لیتے

ہیں، وہ سزا بھی دیتے ہیں تو ایسی کہ جس سے ملزم سب کچھ بتا دیتا ہے اور اس میں مار دھاڑ بھی کم ہوتی ہے، اس میں بھی ان کا فکر اور علمی مطالعہ بولتا ہے جس میں دلائل اور تجربات کی دھاریاں، گفتگو کا رنگ و روغن اور فہم و ادراک کا ہر پہلو جھلکار دینے لگتا ہے وہ ایم اے کے علاوہ قانون کی ڈگری کے بھی مالک ہیں اور محکمانہ غور و خوض سے بھی غافل نہیں، ماتحتوں میں انہیں کام لیتے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی نرمی میں قانونی سختی ملی ہوئی ہے اور لہجے میں مٹھاس کے ساتھ تلخی کی دھاریاں بھی سرسراتی ہیں ریشمیں جیسے کھنک دار الفاظ میں حاکمانہ انداز صرف انہیں کے یہاں دیکھا گیا ہے۔

این اے رضوی

نذیر احمد رضوی صاحب پولس کے آدمی ضرور تھے اور انٹیلی جنس بیورو کی ڈائرکٹری سے ریٹائر ہوئے تھے لیکن ایسا اچھا ذوق ادب پایا تھا اور شعر کے ایسے دلدادہ کہ شاذونادر ہی ایسا منجھا ہوا ادیب ملے گا، وہ محکمے سے فراغت پاکر اپنا تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے، اب وہ خط بھی لکھتے تھے تو اس میں بھی وہ صاحب طرز معلوم ہوتے تھے، ان کا تجربہ اور مطالعہ آپس میں ایسے ملے ہوئے تھے کہ ان کی تقریر اور تحریر میں فصل معلوم نہیں ہوتا اور فقروں کے چول کسے ہوئے نظر آتے ہیں وہ تلخ بات کو بھی شیریں انداز میں کہنا جانتے تھے، ادب بہت عظیم فن ہے، وہ ملنے جلنے اور بات چیت میں فرق مراتب کا بے حد خیال رکھتے تھے، پولس میں زندگی گزارنے کے باوصف ان کی انسانیت میں وہی آب و رنگ تھا، وہ دوستوں کے دوست بھی تھے، ہمدردی اور خدمت خلق کا نہایت منہ زور جذبہ انہیں ہر وقت بے تاب رکھتا تھا اور یہ بات ان میں ریٹائرمنٹ کے بعد پیدا نہیں ہوئی بلکہ ملازمت میں بھی ان کے مشغلہ حیات میں یہ عنوان اہم تھا۔

اسد محمود علوی

چند روز ہوئے میں قلعہ گوجر سنگھ کی طرف سے گزر رہا تھا، راستے میں محمد منشاء اور اس کے ایک ساتھی اکبر نامی سے مڈبھیڑ ہوگئی، وہ دونوں کچھ غمگین تھے جیسے کسی عزیز کی بیمار پرسی کر کے پلٹے ہوں، میں نے پوچھا کیا بات ہے منشاء؟ منشاء نے بڑی رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا کہ ہمارے ایک افسر اسد محمود علوی صاحب کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ میں نے کہا ارے بھائی روز تبادلے ہوتے ہیں اتنی

پریشانی کی کیا بات ہے۔اس کی آنکھیں بھر آئیں اور کہنے لگا۔جناب میرا ہی نہیں سارے عملے کا
خیال ہے کہ آج تک پولس میں ایسا ایماندار فرض شناس اور زیرک افسر نہیں آیا تھا' وہ یہاں اپنی بہت
سی نشانیاں چھوڑ گیا ہے اسے لوگ دعائیں دیتے رہیں گے۔اس کا تبادلہ پولس کے اکثر لوگوں کو شاق
گزرا ہے وہ چھوٹے لوگوں سے باپ جیسا سلوک کرتا تھا یہی سبب ہے کہ ہر شخص کو اس سے والہانہ
محبت ہے ہر چھوٹے آدمی کے لیے اس کی ذات ایک سہارا تھی اور وہ ہر ایک کی مصیبت کا حل آسانی
سے تلاش کر لیتا تھا' اس سے لوگ ڈرتے نہیں تھے اس کا احترام کرتے تھے۔

میں نے کہا دیکھو وہ اتفاق سے ایک اچھا انسان پولس افسر کی حیثیت سے آ گیا تھا تم سب
لوگ اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھو کیونکہ اس دور میں ایسے آدمی کے لیے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا
ہوتا ہے' ممکن ہے کہ وہ اپنی اسی عادلانہ فطرت کی پاداش میں تبادلے کے قابل سمجھا گیا ہو۔

منشاء یک دم بدک گیا اور کہنے لگا جناب ایسی ہی باتوں اور ایمانداری کی کارکردگی کی بدولت تو
تبادلہ ہوا ہے' آپ نے درست اندازہ لگا لیا۔وہ خاندانی آدمی ہے پست باتیں کرنا نہیں جانتا اور یہ
پولس ایسے آدمی کو آفس میں دیکھ کر کچھ لوگ خوش ہوتے اور دعائیں دیتے ہیں اور کچھ ناک بھوں
چڑھاتے ہیں میں نے کہا سب درست لیکن نیک عمل ضائع نہیں ہوتا اسے اس کا صلہ ضرور ملتا ہے مگر تم
لوگوں کے لیے نیک ہو جانا تو ایک عذاب ہے!

نذیر احمد بوسال

میرے یہاں آنے جانے والوں میں ایک شخص ہے نذیر احمد بوسال' بوسال ضلع گجرات
تحصیل پھالیہ میں ایک گاؤں ہے' وہاں کے سب لوگ اپنے نام کے ساتھ بوسال لکھتے ہیں۔نذیر احمد
اسپیشل پولس کے دفتر کا ملازم ہے اور میرے یہاں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرتا ہے چونکہ وہ طالب علم
کی صورت میں آتا ہے اس لیے مجھے اس کے آنے جانے میں کوئی اعتراض بھی نہیں' مگر جب وہ
میرے یہاں کسی آنے جانے والے سے تعارف کرتا ہے تو اس کا انداز تعارف کسی دوسری طرف
رہنمائی کرتا ہے اور میں اسے ڈانٹ دیتا ہوں' ڈانٹ ڈپٹ پر اس کے خاموش ہو جانے سے میرے
اور دیگر دوستوں کے شکوک کو تقویت تو ہوتی ہے لیکن پھر میں نہ سیاسی آدمی ہوں نہ کسی سوسائی

کا ممبر یہ اگر کچھ کارروائی کریں بھی تو میرا کیا بگاڑیں گے؟

عادت و اطوار کے اعتبار سے وہ کوئی قابل ذکر خصوصیت نہیں رکھتا اور میں نے اس کی گفتگو میں آج تک کوئی لڑائی کا دریچہ کھلتا ہوا نہیں پایا' اگر اس کی کوئی خصوصیت ہے تو یہ کہ وہ چھوٹے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوصف اپنے لڑکپن کی مصیبتوں کو نہیں بھولا' یہی سبب ہے کہ وہ جہاں بیٹھتا ہے پنواری سے لے کر تحصیل دار تک کو اور کانسٹبل سے لے کر ایس پی تک کو بے نقط سناتا ہے' ان کی بے رحمی اور سفاکی کی داستانیں اسے اس طرح ازبر ہیں اور وہ ایسے کرب سے بیان کرتا ہے کہ بعض اوقات ہم لوگ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔

اس کی اس عادت کا سبب نہ اصلاح اخلاق ہے نہ کوئی معاشرے کی بہبود بلکہ بعض حقائق انسان کو دیوانہ بنا دیتے ہیں اور ہلکے پیٹ کے آدمی تو کسی راز کو راز نہیں رکھتے۔ ابھی اس کی عمر آٹھ' دس سال ہوگی کہ اس کے باپ کو دشمنوں نے قتل کر دیا اور اس کا کوئی معاون و مددگار نہیں رہا تھا۔ مخالفین بڑے لوگ تھے وہ ہر قدم پر انہیں ستاتے تھے مگر اس کی ماں بڑی صاحب ہمت اور جیالی عورت تھی' وہ نذیر کو ساتھ لے کر راتوں کو کھیتوں میں پانی دیتی اور جب کوئی تنازعہ ہوتا تو دشمنوں کے مقابلے میں برابر لٹھ بجاتی' مگر فریاد کے لیے تھانے جاتی تو تھانے والے خالی ہاتھ دیکھ کر صبح سے شام تک اسے تھانے کے دروازے پر بٹھا دیتے اور شام کو دوسرے روز آنے کو کہہ دیتے' نذیر احمد اپنی ماں کے ساتھ چلچلاتی دھوپ اور خون جما دینے والی سردی میں برابر پھرا کرتا اور خاموشی سے دنیا کے مظالم سہتا اور دیکھتا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ وہ پولس اور مال کے محکمے کے خلاف ہی جذبہ رکھ سکتا تھا اور دنیا پر بھی ان دونوں محکموں کے نشیب و فراز اچھی طرح روشن ہیں۔ حالانکہ نذیر احمد کے پاس آج جو زمین ہے وہ ایک پولس افسر کی مہربانی سے ملی تھی اور وہ اس کی تعریف بھی کرتا ہے' لیکن دل میں تلخی کی شدت ہوتی ہے۔ تو وہ زبان کو بھی گنہگار کر دیتی ہے۔ اس نے مظالم اور ناانصافیاں بھی ایسی ایسی دیکھی ہیں کہ اگر میں انہیں تفصیل سے لکھوں تو پڑھنے والوں کو اس محکمے کے تمام آدمیوں سے بے زاری ہو جائے۔

نذیر احمد بوسال اچھا خوش پوش انسان ہے' نہ جانے اس خوش پوشی کی آڑ میں اس کا کون سا منصوبہ چل رہا ہے' وہ دیسی کپڑا استعمال نہیں کرتا' غیر ملکی اور قیمتی کپڑا پہنتا ہے اور اچھے درزی سے

سلواتا ہے' اس کے میکپ کا خرچ بھی اچھا خاصا اوراس کی حیثیت سے زیادہ ہے' اس کی آنکھیں سرمے سے خالی نہیں رہتیں اور دانتوں پر دنداسے کا استعمال مستقل ہے باتوں میں خوشبودار تیل اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے وہ معمولی صابون استعمال نہیں کرتا' دفتر سے باہر نکلتا ہے تو اسے کوئی معمولی کلرک نہیں آنکتا بلکہ افسر خیال کرتا ہے وہ ایک چرمی بیگ اور دو ایک اچھی جلد کی کتابیں بھی لے کر چلتا ہے اور دیکھنے والے مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔

میرے یہاں بھی وہ پہلے پہلے طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا' اس کا کہنا تھا کہ میں ایف اے کا امتحان دے رہا ہوں' لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ کئی برس سے یہ امتحان دینا چاہتا ہے مگر کنجوسی کے باعث کورس کی کتابیں نہیں خریدتا' تیرے میرے مطالعے سے معلومات لیتا یا مانگے تانگے کی کتاب سے کام کرتا ہے' کباڑی کی دکان سے کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کی نمائش ضروری خیال کرتا ہے۔

اس طالب علمانہ پوزیشن سے اس کا منشاء یہ بھی ہے کہ لوگ مجھے کنوارا خیال کریں' حالانکہ اس کے بیوی' بچے موجود ہیں جنہیں وہ بلی کی آنول نانول کی طرح چھپاتا ہے اور کبھی اپنے عیال دار ہونے کا اظہار نہیں کرتا' بلکہ ہر جاننے والے سے دبی زبان سے التجا کرتا ہے کہ کہیں شادی کرادیں' نہ معلوم وہ اپنی خسیس فطرت کے خلاف ایسا کیوں کرتا ہے خسیس فطرت میں نے اس لیے کہا کہ جب وہ اپنی خوراک میں دودھ شامل کرنا چاہتا ہے تو سالن منہا کر دیتا ہے اور آدھ پاؤ دودھ لے آتا ہے۔

ایک دن بڑے فخر سے کہنے لگا آج مجھے گجرات سے ایک شخص نے بیس روپے زکوٰۃ دیئے ہیں اب دو چار دن مزے سے گزریں گے۔

میں: نذیر کیا تم زکواۃ کا مال کھاتے ہو؟

نذیر: کھاتا ہوں تو کیا ہے یہ کوئی چوری ہے؟ یا ڈاکہ ہے؟

میں: ارے میاں یہ تو معذوروں' مجبوروں' یتیموں اور مسکینوں کا حق ہے!

نذیر: میں بھی تو یتیم ہوں' ماں مرگئی باپ قتل ہو گیا۔

میں: تمہاری یہ زبان زوری کام نہیں آئے گی اور اگر تم یہ زکواۃ کھاتے رہے تو یاد رکھو زکواۃ لینے

کی پوزیشن میں آجاؤ گے

نذیر: کیا یہ زکواۃ میری تنخواہ کم کرادے گی؟ سب مذہبی لوگوں نے ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں' جو ہاتھ آجائے سب روا ہے۔

میں: اچھا تو میں آج سے تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے تو خدا سے ڈر لگتا ہے اور تم پر رحم آتا ہے۔

نذیر: ڈرنے کی کوئی بات نہیں' یہ خیر وشر یونہی وہم ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جو ہمارے دفتر میں رشوت نہیں لیتا اس کی کوئی عزت نہیں نہ وہ سوسائٹی کا آدمی کہلاتا ہے نہ معقول زندگی بسر کرتا ہے۔

میں: اچھا نذیر تم یہ بتاؤ کہ تم نے کبھی اپنے گھر یا اپنی جیب سے پیٹ بھر کھانا کھایا ہے؟

نذیر: میں اسلامی زندگی رکھتا ہوں' سخت بھوک میں کھانا کھاتا ہوں اور بھوک لے کر اٹھ جاتا ہوں ہاں جب کہیں ضیافت ہوتی ہے یا مفت کا مال ہاتھ آتا ہے تو یہ بد پرہیزی ہو جاتی ہے اور وہ خدا کا انعام خیال کرتا ہوں۔

عجیب وغریب بات یہ ہے کہ نذیر کی جیب میں سیکڑوں روپے ہوتے ہیں اور وہ خربوزے سے اور بعض اوقات برف سے روٹی کھالیتا ہے۔ اور دیکھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ جانے یہ کب سے بھوکا تھا' اسے اس حد سے گزری ہوئی کفایت شعاری نے کسی سوسائٹی کا آدمی نہیں ہونے دیا اور وہ غلیل مارے کوے کی طرح تاکتا جھانکتا پھرتا ہے۔

میں کچھ دنوں پہلے یہ سمجھتا رہا کہ اسے گورنمنٹ نے مجھ پر مسلط کیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہاں کون کون آتے ہیں اور کیا کیا گفتگو ہوتی ہے لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ اس کی خساست اور خود پروری پردہ ڈھونڈتی ہے' لیکن اپنی غلط فہمی پر نظر نہیں ڈالتی۔

جب وہ کسی آدمی کی تنخواہ زیادہ سنتا ہے یا کسی کاروباری آدمی کا منافع اس کے کان میں پڑ جاتا ہے تو اس کا چہرہ اتر جاتا ہے اور وہ افسوس کے ساتھ اپنی تنخواہ سے موازنہ کرنے لگتا ہے اس وقت اس کی گفتگو میں ٹھنڈی سانسیں بھی ہوتی ہیں اور چہرے پر کرب کے آثار بھی۔

مجھے خطرہ ہے کہ اس کا یہ نقص اسے کسی سنگین جرم پر آمادہ نہ کردے کیونکہ اس کی جنم بھوم میں جرم وگناہ عام ہیں۔

ابھی چند روز ہوئے کہ نذیر رات کو دس بجے کے قریب گجرات سے آ رہا تھا کہ یکا یک دو کانسٹبل اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے اور کہا ''کہاں سے آیا ہے؟ کہاں کا ارادہ ہے؟ پاکٹ میں کتنا مال ہے؟ نذیر نے اس خیال سے کہ کہیں یہ جعلی پولس نہ ہو اپنا اصلی نام نہ بتایا اور کہا جناب میں تو غریب آدمی ہوں میرے پاس تو دو ڈھائی روپے ہوں گے' ان میں سے ایک نے زبردستی کیسہ میں ہاتھ ڈال دیا اور ایک نے ہاتھ پکڑ کر گھڑی کھول لی اور کہا بھاگ جا ماں ...... اب کبھی رات کو اس راستے نہ آنا۔

نذیر بھی پولس کا آدمی تھا اس نے ان کی پیٹیوں کے نمبر لکھ لیے اور علی الصبح دفتر میں جا کر یہ واقعہ بیان کیا' وہاں سے ٹیلیفون کیا گیا اور واقعہ بتایا گیا چنانچہ گھڑی تو وہیں دفتر میں آ گئی لیکن اور کیا ہوا کچھ نہیں!! لیکن یہ واقعہ بھی محکمے کی بدنامی کے لیے کچھ کم تو نہیں۔

میاں محمد احمد

جن دنوں میرا منجھلا لڑکا ڈاکٹر فیضان دانش گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں پڑھاتا تھا' وہ جب بھی رخصت پر گھر آتا' بس ایک ہی شخص کا ذکر خیر کرتا اور وہ بھی ایک سب انسپکٹر پولس بقول برخوردار رحیم یار خاں میں سب سے آسان پتہ اسی شخص کا تھا بس اتنا پوچھنا کافی ہوتا تھا کہ جناب اس سب انسپکٹر کو ملنا درکار ہے جو گیارہ مہینے انتیس دن لائن حاضر رہتا ہے۔ اور سال میں جس دن وہ تھانے میں آتا ہے' اس دن اردلی سے لے کر انسپکٹر تک حلال پر گزارہ کرتے ہیں اسے حرام کمائی سے اس حد تک کد ہے کہ ماتحت تو ماتحت' اس کی موجودگی میں اس سے اوپر کے افسران بھی یہ منفی جرات نہیں کر پاتے۔ ظاہر ہے ان حالات میں اس کا مستقل ٹھکانا پولس لائن ہی ہو سکتی تھی۔ اس مرد حق کا نام ہے میاں محمد احمد اس کے مرحوم والد جناب بابو فیروز صاحب بھی اسی قماش کے پولس افسر تھے میاں صاحب کی زیرکی اور تیزی طبع کے بے شمار واقعات تو برخوردار ہی کی زبانی معلوم ہوتے رہتے تھے لیکن اس کا ذاتی تجربہ اس وقت ہوا جب میرا نواسا محمد متین اغوا ہو گیا مقامی پولس نے اپنی سی بھرپور کوشش کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ بالآخر محترم آئی جی جناب قاضی اعظم صاحب اور ڈی آئی جی جناب جہاں زیب برکی صاحب سے میں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بچے کی تلاش میں

میاں صاحب موصوف کی خدمات بھی حاصل کرلیں تو مناسب ہوگا۔ انہوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی سے میری اس خواہش کا احترام کیا اور وائرلیس پر میاں صاحب کو لاہور طلب کرلیا گیا۔ وہ شخص اپنے ہی انداز سے کام کرتا تھا اور اتفاق سے ڈی ایس پی علاقہ جناب سلطان علی گاڑھا صاحب بھی جو ایک جوہرشناس شخص ہیں' انہوں نے نہ صرف میاں صاحب کے طریق کار کو سراہا بلکہ بہر طور ان کی معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور اس مخلصانہ تگ ودو کے صلے میں چند ہی روز میں بچہ کاہنہ سے ملوادیا۔ میں نے خوش ہوکر بطور انعام اس بندہ خدا کو ایک ہزار روپے پیش کرنا چاہے مگر اس نے یہ کہہ کر یہ پیسے لینے سے انکار کردیا کہ یہ تو میرا فرض تھا اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے میری حکومت مجھے ہر مہینے تنخواہ دیتی ہے۔

میاں محمد احمد کئی مرتبہ میرے یہاں تشریف لائے وہ ایک مثالی پولس افسر کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مسلمان بھی ہیں۔ ایک مرتبہ وہ میرے یہاں تشریف لائے اور میری کتاب ''جہان دانش'' کی دوسری جلد کے متعلق پوچھنے لگے۔ میں نے کہا کہ میاں صاحب اللہ سبحانہٗ تعالیٰ جب مناسب سمجھیں گے طباعت کی منزل تک پہنچادیں گے وہ بے مثیل شخص فوراً بولا ''جناب والا! میرے پاس کچھ زمین ہے' اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے بیچ کر اسے چھپوانے کی سعادت حاصل کرلوں' میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے اپنی بے وقعت زمین سے ایک وقیع قومی سرمایہ کو محفوظ کرلیا ہے۔'' یہ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے آنسو میرے اندر ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ میں کافی دیر تک اس کے اس جذبے کی تحسین کے لیے الفاظ تلاش کرتا رہا' جب خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو میں نے گفتگو کا رخ جڑی بوٹیوں کی طرف موڑ دیا اور ان کے خواص پر اظہار خیال ہونے لگا میاں صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں سے مفردات کا علم بھی پیش پیش ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں تصوف کے بعد مفردات پر ہی زیادہ کتابیں ہیں۔

کاش کہ محکمہ پولس میاں صاحب کی بے پناہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے اور ان سے وہ کام لے جس کے لیے قدرت نے انہیں پیدا کیا ہے۔ بحمد اللہ ہمارے ملک میں جواہر کی کمی نہیں البتہ جوہریوں کا کال ضرور ہے۔

چاندنی کے سائے

مولوی محمد صدیق، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبدالمالک آروی، نہال سہاروی، حافظ علی حسن پٹیالوی، جاوید حیات، حسرت بہاری، موسیٰ رضا کاظمی، مختار بخاری، حزیں صدیقی، مولانا مصطفیٰ حسین جوہر، طالب جوہری عاشق حسین اکبری، محمد اسحاق خان صاحب، سید حبیب عنایت علی شاہ ہاشمی

بعض چہروں کے نقش و نگار کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان بھولنا بھی چاہے تو وہ محو نہیں ہوتے، اس کا کوئی ایک سبب نہیں بلکہ ہر انسان کے ساتھ اس کے اوصاف، ذاتی حسن اور نقش و نگار کی جاذبیت جدا تاثیر رکھتی ہے۔

مولوی محمد صدیق

مولوی محمد صدیق کاندھلوی کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا مگر آج تک وہ چہرہ سامنے ہے، ان کی غلافی آنکھیں اور گورے رنگ پر سفید ریش ایسی خوشنما معلوم ہوتی تھی کہ آدمی خود بخود احترام پر مجبور ہو جاتے تھے، حالانکہ مجھے اس وقت صورتوں کی جانچ پرکھ کا شعور نہ تھا لیکن ان کا چہرہ اب تک ذہن میں زندہ ہے جب وہ عیدین کا خطبہ دیتے تو معلوم ہوتا کہ آسمان سے فرشتہ اتر آیا ہے اور جب مطب میں کسی مریض سے بات چیت کرتے مرض میں دوا کے بغیر شفا کی ہوائیں آتی محسوس ہوتیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

کون نہیں جانتا کہ مرحوم ماہر تعلیم تھے اور دہلی کا جامعہ ملیہ انہیں کی سعیٔ مسلسل کا نتیجہ ہے وہ دنیا کی سیاست اور تہذیب و تمدن کے رموز و غوامض کو اچھی طرح جانتے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا آخری سفر ہندوستان کی مسند صدارت سے ہوا لیکن میری نگاہوں سے یہ بات نہیں

جاتی کہ بات چیت کرتے وقت ان کے چہرے کی معصومیت اور بھی نکھر آتی جس میں فرشتوں جیسی سادہ خاطری اور مسکینوں جیسی رحم طلبی کی مٹھاس ہوتی اور ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا۔

مولانا عبدالمالک آروی

مولانا عبدالمالک آروی کی خشخشی داڑھی اور غلافی آنکھیں اور پھر ان کا طرز گفتگو پہلی بار ملنے سے دل پر نقش ہو گیا تھا' ان کے لہجے میں لوچ' بات میں نرمی' حافظے میں علمی ذخائر اور سینے میں تحقیق و تدقیق کا شعلہ تاثر دیئے بغیر نہیں رہتا تھا' ان کے مضامین کے دو مجموعے "مضامین عبدالمالک اور مقام محمود" دونوں قابل مطالعہ کتابیں ہیں' مولانا عبدالمالک آروی کا انداز تکلم ایسا تھا کہ اس پر ہزار لسانی رنگینیاں قربان' دوستوں میں بے تکلف مجلس میں ادبِ دوست' اور تنہائی میں عابد و زاہد' کیا کیا انسان زمین کے تاریک معدے میں ہضم ہو کر رہ گئے۔

نہال سیواروی

نہال مرحوم بڑے جید شاعر تھے ان کے چہرے پر ایک لاابالی پن تھا کہ خواہ مخواہ سینے سے محبت کا ابال اٹھتا تھا' ہر چند کہ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت کسی دوسرے ہی عالم میں ہیں اس دنیا سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں' ان کا مجموعہ کلام تقسیم ملک سے پہلے ہی دہلی میں چھپ چکا تھا' اس کے بعد پاکستان میں انہوں نے جو کچھ کہا اس کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں ہے اور اس کی طباعت کا کوئی انتظام کہیں ہوا ہے یا نہیں' ان کے کلام میں پختگی کے ساتھ برجستگی ایسی گتھی ہوئی تھی کہ ہر شعر ایک نیا اثر لیے اترتا معلوم ہوتا تھا' ایسی معصومیت بہت کم چہروں پر نظر آتی ہے خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

حافظ علی حسن پٹیالوی

حافظ صاحب اچھی خاصی پختہ عمر کے آدمی ہیں اور خدمت خلق کے ایسے رسیا کہ ہر روز پانچ بجے شام سے آٹھ بجے تک وہ مریضوں کی تشخیص و تجویز میں منہمک رہتے ہیں اور کسی سے ایک پیسے کے بھی طالب نہیں' وہ طبیب سے زیادہ عامل اور عامل سے زیادہ متقی ہیں' یہی سبب ہے کہ ان کی دو

اور دعا دونوں میں اثر ہے چہرے پر معصومیت اور بھولپن ایسا کہ بات کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی آٹھ نو سال کے بچے سے بات کر رہے ہیں۔

جاوید حیات

کتابی چہرے پر میدہ شہاب رنگ اور شربتی غلافی آنکھیں' انہی سے ملتی جلتی سیاہی مائل زعفرانی خشخشی داڑھی اور بھرا بھرا جسم کوئی حق پسند نظر دیکھے تو درود سے فرصت نہ ملے اور شر کے دیدبان سے دیکھے تو کف افسوس ملنے کے سوا چارہ کار نہ ہو۔

وہ ہونٹوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے کرتے جب موقع بموقع آنکھوں سے مسکرا پڑتے ہیں تو صاحب احساس کی روح سجدے کے لیے نیت باندھ لیتی ہے۔

وہ یوں تو نہایت بشاش بشاش معلوم ہوتے ہیں' لیکن کبھی کبھی گفتگو کے بعض بعض پڑاؤ پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا انسان تنہائی سے بیزار ہو کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے' ایک عرصہ ہو گیا ان کا یہ معمول ہے کہ وہ جمعرات کو میرے یہاں آتے ہیں اور جمعہ کی صبح کو اپنے مکان حافظ آباد چلے جاتے ہیں' وہ جتنے عرصے غریب خانے پر رہتے ہیں دل ان کی عقیدت کے مزے لے لے کر ہلکان ہوتا رہتا ہے۔

اللہ کی شان ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی روایات کے خاندان میں ایک ایسا شخص پیدا ہو گا جس پر ہزار زاہد و مرتاض قربان' ان کے دادا نے کسی درویش کی صحبت سے متاثر ہو کر اپنے پورے خاندان سے حلف اٹھوایا تھا کہ آج سے حلال روزی سے پیٹ پالیں گے اور غلط پیسہ گھر میں نہ آنے دیں گے۔ غالباً یہ اسی نیکی کا اثر ہے کہ اس خاندان میں جاوید حیات جیسا نیک' مخلص' محنتی اور دیانتدار انسان پیدا ہو گیا۔

جاوید حیات کو میں نے کبھی غلط گام نہیں پایا حالانکہ اس دور میں غلط راہی کے لیے سیکڑوں آسائش کے دروازے کھلے ہوئے ہیں' اس کے پیروں پر کبھی میں نے لالچ' تشدد اور خیانت کا سایہ نہیں دیکھا' حسین سے حسین چہرہ اور چمکیلے سے چمکیلا کندن اس کے ایمان میں شگاف ڈالنے سے قاصر ہے۔

جاوید حیات حافظ آباد کے مشہور طبیب ہیں اور غالباً یہ ان کے خلوص کا اثر ہے کہ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا اور روزی میں برکت عطا فرما دی ہے۔

جاوید حیات نظم اور نثر دونوں میں چلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے خیالات و تصورات ایسے نہیں کہ آج کے بازار میں رائج الوقت سکے کی طرح چل پڑیں' ان کی فکر مستقبل کے مناظر جمائے ہوئے امید کے بازوؤں سے بھریاں مارتی رہتی ہے۔ وہ ہر رخ سے ایسے معاشرے کے خواب دیکھ رہے ہیں جو پیغمبرانہ اصول و ضوابط سے وجود میں آئے اور اسی طریق فکر میں وہ رات دن غلطاں ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ روحوں کی نیکی جسموں کو بھی حسین بنا دیتی ہے اور نیتوں کی پاکیزگی چہروں میں جاذبیت بھر دیتی ہے' جاوید حیات انسانیت کا دوست خدا کی طرف سے خوش عقیدہ اور مخلوق کی طرف سے خوش خیال آدمی ہے اور اس لیے اسے زندگی کا کوئی رخ مایوس نہیں کرتا' خدا نے انسان میں یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ جب بھی چاہے روحانی پگڈنڈیوں اور تقدیس کی راہوں پر چل کے شاہراہ پر آ جائے' اس میں طبقات کی قید نہیں ملازم ہو یا آقا آجر ہو یا تاجر سب کے لیے روحانی بلندیوں کے زینے کھلے ہیں ایک ڈاکو بھی اگر چاہے تو انسانی چلن اختیار کر سکتا ہے۔

میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ روحانی فکر سے فرار' اخلاقی قدروں سے روگردانی اور بغاوت سے ہی کردار کی تمام تر ناہمواریوں اور زندگی کی گمراہیاں وجود میں آتی ہیں' جرم و گناہ کے اندھیروں میں شپرکوں جیسی زندگی بسر کرنے والے اسی لیے تاریکیوں میں ڈوبے رہتے ہیں کہ انہوں نے اندھیروں سے اجتناب اور دھندلکوں سے احتجاج نہیں کیا' وہ اپنے سینے میں رکھے ہوئے چراغ کو روشن کر کے نہیں دیکھتے' ریڈیو اور ٹیلیویژن پر سنے سنائے نتائج و اصول اور خیالات و نظریات کو زندگی میں رسم و رواج کی طرح داخل کر لیتے ہیں جس سے شب و روز کی متعفن گرمی' سردی' حبس اور تاریکی کے علاوہ مختلف قسم کی بھیانک دھند ان کا حصہ قرار پا جاتی ہے' ان میں بعض لوگ کرب سے بھی گزرتے ہیں لیکن حق بات کہنے اور خود اپنے ضمیر سے محاسبے کے لیے تیار نہیں ہوتے' حالانکہ ان کی روح مخاطبے کی منتظر رہتی ہے اور کبھی کبھی اس ویران اندھیرے میں ڈکرانے بھی لگتی ہے میں جاوید حیات کے لیے دعا گو ہوں خدا اس کی عمر دراز کرے اور اس کے بیچے آباؤ اجداد کے ماضی کے

اندھے کنویں میں نہ جھانکیں، بلکہ باپ کے نقش قدم پر چلیں آمین

حسرت بہاری

اچھی خاصی عمر کا انسان ہے اور ریلوے میں ملازم ہے لیکن تن و توش کے اعتبار سے ایسا جیسے کسی طویل بیماری نے اسے توانا اور قد آور نہ ہونے دیا ہو' جب وہ پہلے پہل میرے یہاں آ کر بیٹھا تو اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے ماضی کے کسی خاص حادثے کی یاد آ رہی ہو اور جب بولا تو اس انداز سے جیسے کسی فوجی عدالت سے چھٹکارا پا کے آیا ہو' اس کی صورت اور جسامت کے اعتبار سے اس کے کپڑے بھی ملگجے سے تھے مگر کام میں ایسا چاق و چوبند کہ اس دور کے ہزار جوان اس کے سامنے کاہل معلوم ہوں۔

اس کے اندر ایک شاعر بھی سہما بیٹھا تھا' جس سے خود حسرت بھی بے خبر تھا۔ میرے یہاں آتے اسے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ اصلاح کے لیے ایک غزل لایا' میں نے دیکھ کے اندازہ لگایا کہ اس کے اندر کا شاعر اس کی خارجی ہیئت سے زیادہ تندرست ہے میں نے اس کی تربیت شروع کر دی اور روز بروز اس کی خوبیاں اپنا اعلان کرتی گئیں دو تین سال میں وہ ایک خوش فکر شاعر ہو گیا اور آج اس کے پاس ایک اچھے خاصے مجموعے کا مواد موجود ہے' چونکہ وہ مطالعے کا رسیا ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ اگر تھوڑی بہت خامی رہی تو اسے نکال جائے گا' اگرچہ وہ اہل و عیال میں بری طرح گھرا ہوا ہے لیکن قاعدے کا آدمی ہے اور حقوق و فرائض کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح جانتا ہے' افلاس اور مصروفیت کے باعث اس کا ادبی ذوق بیمار نہیں ہو سکتا اس میں نشوونما کا وافر جذبہ موجود ہے جو ایک شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ حسرت احباب کے غم اور خوشی میں برابر کا شریک رہتا ہے۔ اور بڑا ہی پر خلوص اور مقام شناس انسان ہے۔ میرے یہاں آنے جانے والوں میں حسرت ہر رخ سے وقیع خیال کیا جاتا ہے اور سیکڑوں کہنہ مشق شاعروں سے اچھا اور بلند شعر کہتا ہے۔

موسیٰ رضا کاظمی

موسیٰ رضا کاظمی سے کلکتے کے مشاعرے کا تعلق دلی میں آ کر زندگی بھر کا تعلق ہو گیا' انہوں نے مجھے اپنے حسن اخلاق سے اس قدر گرویدہ کر لیا کہ ان کی صحبت دلی کی صحبتوں میں نعمت معلوم

ہونے لگی، کیونکہ دلی میں کاروباری ذہن اس قدر عام تھا کہ وہاں کے تعلقات پر بھی جگہ جگہ تجارت کا سایہ اور پندارِ زر کا آسیب نمایاں تھا۔ بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہاں بھی ان کے تعلقات میں وہی شادابی اور فریفتگی جوں کی توں موجود تھی، انہوں نے ہی جلال الدین صاحب سے بھی ملایا اور اس تعارف سے میرے خیال کے مطابق وہ بھی زیرک اور بلند اخلاق کے آدمی نکلے۔

عاشق حسین اکبری

موسیٰ رضا کاظمی صاحب ہی نے دلی میں اپنے ایک عزیز عاشق حسین اکبری کو بلا کر ملاقات کرائی، اکبری صاحب کا یہ عالم کہ ہزار ہا شعر از بر اور موقعے موقعے سے ان کا استعمال ان کی نکتہ فہمی کی دلیل تھا کراچی میں آ کر ان سے اور بھی نزدیکی ہوگئی اور جب وہ لاہور میں پرائز کنٹرولر ہو کر آئے تو پھر کیا تھا جس روز میں نہ جاتا وہ خود غریب خانے پر آ جاتے اور جب وہ نہ آتے تو حاضری کو فرض کی طرح ادا کرنے کو بے تاب رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے اتوار کے پروگرام میں بھی شریک ہونے لگے اتوار کے دن میرے غریب خانے پر کئی شاعر، ادیب اور ادب دوست مل کر خود کھانا پکانے کا اہتمام کرتے ہیں اور شعر و شاعری کے علاوہ افسانے اور مضامین بھی پڑھے جاتے ہیں، جناب مختار بخاری شاعری کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے اور پکوانے میں ماہر تھے گاہے گاہے حبیب دتیاوی بھی آ جاتے اور اپنی ریاستوں کی مصاحبت کے وہ قصے سناتے کہ رہے نام اللہ کا۔

ایک دن انہوں نے ایک بڑی چلبلی سی غزل سنائی لیکن دوسرے اتوار کو جناب وحید خیال نے وہی غزل اپنے نام سے سنا ڈالی، پھر کیا تھا چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور دونوں پر آوازے کسے جانے لگے، پھر معلوم ہوا کہ غزل تو افقر موہانی صاحب کے کھلیان کی ہے، لیکن مجھے یقین نہیں آیا، میں لکھنو میں افقر موہانی صاحب سے ملا ہوں وہ تو ایک وارثی سلسلے کے درویش ہیں ان کے ہاں غزل میں شوخی کی بہت کم آمیزش ہوتی ہے اور یہ ان کے فقیری منصب کے بھی خلاف ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غزل دونوں شاعروں نے اپنے ریوڑ سے خارج کر دی۔

شاعری سے قطع نظر حبیب دتیاوی ایسا سدا بہار انسان ہے کہ مغموم سے مغموم انسان اس کی گفتگو سے الجھن محسوس نہیں کرتا، وہ مخلص بھی ہے اور مردوں کی طرح وقت کا ساتھی بھی، وہ بڑ

خوبصورت جھوٹ بولتا ہے مگر صرف زیب داستاں کے لیے جس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا' بہ امر مجبوری وعدہ خلافی بھی کرتا ہے مگر اپنی خطا پر معافی سے شرماتا نہیں اگر مجھے اللہ توفیق دے تو میں عمر بھر ایسے آدمی کو آنکھوں سے دور نہ ہونے دوں۔

مختار بخاری

اسی طرح جناب مختار بخاری [1] بھی کھانا پکانے اور کھلانے کے علاوہ وہ شعر و شاعری میں بھی مشاعروں میں اپنی دھج سے الگ ہی معلوم ہوتے ہیں' لیکن اب آکر ان کی نظر کمزور ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے اور مستقل بیمار بھی رہنے لگے' جس سے ان کی مخلصی اور مفلسی دونوں دست و گریباں رہتی ہیں۔

حزیں صدیقی

اسی طرح حزیں صدیقی صاحب میرے حلقے میں سب سے اچھا اور بلند شعر کہتے ہیں' شاعری کے علاوہ قابل قدر انسان ہیں' کسی عالم میں بھی وہ کسی کو غلط مشورہ نہیں دیتے ان کے ہاں حفظ مراتب جیسی چیز ابھی تک شاداب و بیدار ہے وہ نثر اور نظم دونوں پر قادر ہیں۔ مگر اس آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے زمانے کا کیا علاج کہ یہاں نہ لیاقت کی قدر ہے نہ شرافت کی ہر بازار میں طاقت کا سکہ چل رہا ہے اور ہر فرقے کے معبد میں شکتی پوجا رواج پا گئی ہے۔ جگہ جگہ پارٹی بندیاں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا دور گروہ بندی پر اتر آیا ہے اور یہ سب کاروبار ہی اقربا پروری میں لتھڑا ہوا ہے۔ ذاتی قابلیتوں کے سہارے چھن چکے ہیں اور علم کُند ہو کر رہ گیا' ریڈیو اور ٹیلیویژن کے اداروں میں تو خاص طور پر مفاد عامہ سے نظر بچا کر اپنے اکھاڑے کے نااہلوں کو اہلیت رکھنے والوں کی جگہیں دی جارہی ہیں اور صاحبان علم ڈگریاں لیے سفارش کی بیساکھیاں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جو وزارت و قیادت کے دروازوں کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں!

حزیں صدیقی فن انسان شناسی میں بھی اسی لیے ناکام ہیں کہ ہر نازک مرحلے پر ان کا فطری

۱۔ جناب احسان دانش مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر کراچی میں انہیں برین ہیمرج ہوا اور وہ جناب احسان دانش کے انتقال سے چار پانچ روز بعد ہی راہی عدم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شرمیلا پن سنگ راہ ہو جاتا ہے اور پھر لوگوں سے ان کی شکایت سنتے سنتے کان پکنے لگتے ہیں' وہ برسوں سے میرے پاس رہ رہے ہیں لیکن مجھے دیکھ کر سبق نہیں لیتے کہ اس مردہ معاشرے میں چلاتے چلاتے میرا سر سفید ہو گیا لیکن یہاں کے افق آوازوں کو واپس نہیں کرتے یہاں بازگشت کا انتظار حماقت میں شمار ہے' یہاں کے لوگ بالکل نہیں جانتے کہ شاعر کے سامنے غائب کی شے اور دور کے مناظر قریب آ جاتے ہیں کیونکہ شاعری تو خواب اور ابدیت کا درمیانی نقش ہے' جس پر غافل اور بیدار دونوں کی نگاہیں مرکوز رہتی ہیں۔

اس ویرانہ آباد کے لوگ اپنی آرزوؤں کے نادان خالق مایوسیوں کے ہنگامے اور آنسوؤں کے طوفان لیے کشمکش کے کہرے میں تو ڈوب جاتے ہیں' لیکن ماضی کی حماقتوں کی فہرست چاک کرنا نہیں جانتے بلکہ اس کے تذکرے کو مشیخت خیال کرتے ہیں' یہ ہے اس معاشرے کی تاریخ۔

مولانا مصطفیٰ حسین جوہر

عاشق حسین اکبری نے اپنے لاہور میں قیام کے دوران میرا تعارف مولانا مصطفیٰ حسین جوہر سے کرایا' وہ بڑے پائے کے عالم اور بلا کے مقرر ہیں ان کا انداز کلام اور اسلوب بیان معانی کو دلوں سے نزدیک کر دیتا اور دور از کار مطالب کو کھوپڑیوں سے قریب لے آتا ہے۔

انہیں دنوں مولانا مصطفیٰ جوہر کے صاحبزادے طالب جوہری بھی لاہور ہی میں تعلیم پا رہے تھے اور عاشق حسین اکبری کے یہاں مقیم تھے روز کی آمد و رفت سے ان سے بھی عزیزانہ مراسم استوار ہو گئے تھے جو اب تک اسی طرح تازہ و بے داغ ہیں' آج کل وہ کراچی میں ایک کالج کے پرنسپل ہیں اور علمی سفر میں کہیں کے کہیں پہنچ گئے' میں انہیں دیکھتا ہوں تو دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

عاشق حسین اکبری اللہ کو پیارے ہو گئے' ان کے بچے زیر تعلیم ہیں' خدا انہیں کامیاب و کامران کرے' آمین۔ عاشق حسین اکبری کے بھائی شبیر حسین صاحب ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کی ایک شاخ ہیں اور خاندانی شرافت کسی عالم میں بھی ضائع نہیں ہوتی اس کے باوصف میں دعا کا قائل ہوں کیونکہ اپنا حق طلب کرنا بری بات نہیں اس کے علاوہ دعا میں کسی ٹٹ پونجیے کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا بلکہ اس ہستی کے سامنے دامن پھیلایا جاتا ہے جس کی ایک کن

سے کائنات وجود میں آ گئی اس لیے عاشق حسین اکبری کے بچوں کے لیے سلامتی ایمان تندرستی اور کامیابی کی دعا کرنا میرے فرائض میں ہے۔

محمد اسحاق خاں

محمد اسحاق خان صاحب بارُعب گورے مضبوط اور میدہ شہاب رنگ کے انسان دلاور حسین خاں ڈی ایس پی کے بھائی تھے' علی گڑھ سے گریجویشن کے بعد نہ جانے کیسی کیسی برساتیں کھائیں اور کہاں کہاں کی دیوالیاں چاٹیں کہ سر سے پاؤں تک تجربات ہو گئے تھے جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ لاہور کے روزنامہ ''سیاست'' میں نائب مدیر کے عہدے پر فائز تھے مگر تمام اخبار کا کام سنبھالتے تھے۔

ایسے لوگ عموماً مطالعے کے رسیا ہوتے ہیں وہ اکثر دفتر سے اٹھ کر میرے پاس گیلانی بک ڈپو میں آ بیٹھتے اور کتابیں پڑھتے رہتے کبھی کبھی جب موج آتی تو مجھے متوجہ کر لیتے اور پہروں ایسی گفتگو کرتے جس میں دنیا بھر کے تجربات اور مشاہدات اپنا اثر کرتے معلوم ہوتے اور میں خاموش استفادہ کرتا رہتا۔

خان صاحب سے ٹیلی فون پر جب آغا حشر گالیوں کا لین دین کرتے تو اس وقت معلوم ہوتا کہ خان صاحب اس لائن میں بھی بند نہیں بلکہ آغا حشر کے برابر کا جواب دیتے ہیں' حالانکہ آغا حشر مشہور گلیبر تھے۔

اسحاق خان صاحب پان اس قدر کھاتے تھے کہ ہر وقت ان کا منہ اگالدان بنا رہتا تھا' مگر وہ بے سلیقہ انسان نہیں تھے میں نے کبھی ان کے کپڑوں پر پان کی پیک کا دھبا نہیں دیکھا' تھوکتے تو بڑے احتیاط سے کہیں دور کونے کھدرے میں جا کر' مگر اس سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ ان کے نیفے میں ادھا لگا رہتا ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ خان صاحب آپ ہر وقت یہ انٹی میں شراب کیوں لگائے پھرتے ہیں؟ اس پر خان صاحب فرماتے' میاں احسان یہ ام الخبائث میری داشتہ ہے اسے دبی ہوئی پا کر دوسرے خبائث میرے قریب نہیں پھٹکتے! میں سن کر خاموش ہو جاتا اور یقین کرنے کو جی نہ چاہتا کہ شراب کے بعد آدمی دوسرے گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

ایک دن میں کسی کام دہلی دروازے گیا اور واپسی پر جی چاہا کہ خان صاحب سے ملتا چلوں' چنانچہ روزنامہ ''سیاست'' کے دفتر جا چڑھا۔ رمضان کا مہینہ تھا میں نے دروازہ بند دیکھ کر خیال کیا کہ شاید خان صاحب روزہ نہیں رکھتے اور کواڑ بھیڑ کر کچھ کھا پی رہے ہیں' میں نے کواڑ سے کان لگا کر سنا تو اندر سے سانسوں کی آواز اور رہ رہ کر کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ ایسی آ رہی تھی جیسے کوئی بھینس آخور میں سانی کھا رہی ہو میں نے چپڑاسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اخبار کے لیے مضمون لکھ رہے ہیں۔

میں نے اطلاع کرائی اور انہوں نے مجھے اندر بلا لیا' مگر مجھے بٹھا کے وہ پھر حسب سابق لکھنے میں جٹ گئے میں نے کئی بار اٹھنا چاہا تو انہوں نے اپنی ایک رعب دار ہوں کے ساتھ انگلی کے اشارے سے بٹھا لیا' ایک دفعہ جب میں نے اصرار کیا تو تمکنت سے بولے روزہ افطاری کے بعد جانے دوں گا! میں نے خیال کیا کہ خان صاحب شاید میرے لیے روزہ کشائی کا تکلف فرما رہے ہیں۔

لیکن جب مغرب کی اذان کے ساتھ نقارے پر چوٹ پڑی تو خان صاحب نے قلم رکھ دیا اور دراز سے بوتل نکال کر غٹ غٹا گئے اور چپڑاسی کو کہا اندر سے احسان صاحب کے لیے افطاری لا کر میز پر رکھو۔ چپڑاسی نے کچھ نمکین اور کچھ شیریں لا کر میز پر سجا دی اور خان صاحب بولے میں ابھی آتا ہوں' ان کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھنے لگے اور وہ پھنکارتے ہوئے زینے سے اتر گئے' میں نے چپڑاسی سے دریافت کیا کہ خان صاحب روز اسی طرح نماز پڑھتے ہیں' چپڑاسی نے جواب دیا۔

''میں تین سال سے یہاں ہوں اور خان صاحب کا یہی عالم ہے۔

خان صاحب نماز پڑھ کے آئے تو میں نے کہا خان صاحب یہ شراب آپ کو زندگی کے کاروبار سے روکتی نہیں؟ فرمایا یہ مجھے کیسے محکوم بنا سکتی ہے یہ تو میری داشتہ ہے جس طرح داشتائیں رہتی ہیں اسی طرح اسے میں رکھتا ہوں' زمانہ گزر گیا میں اسی طرح کا کنٹرپیل پیپا دھکیل قسم کا شرابی ہوں' مگر پچیس سال سے میری پہلی تکبیر قضا نہیں ہوئی' نشہ مجھے خود بخود مسجد کی طرف لے کر چل پڑتا ہے میرا تو سانس رکا رکا رہ گیا اور اس شرابی کی قسم سمجھ میں نہیں آئی یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی راہزن کسی کو منزل پر پہنچا دے۔

میں نے بھی روزنامہ ''سیاست'' میں کچھ روز کام کیا اور خان صاحب کو ہمیشہ چاق و چوبند اور چوکنا انسان پایا' سید حبیب[1] صاحب اور ان کے بھائی عنایت علی شاہ[2] صاحب دونوں نہایت ثقہ قسم کے آدمی تھے' مگر خان صاحب کے معاملے میں وہ بھی خاموش تھے' کیونکہ خان صاحب قلم کے دھنی عزم کے پختہ اور زبان کے پابند ہونے کے علاوہ رات رات بھر کام کرتے تھے' وہ شراب کے غلام نہیں تھے بلکہ شراب ان کی منہ بولی پتنی تھی۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

۱۔ مولانا سید حبیب صاحب نے گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو آج کل بازار میں نایاب ہے۔

۲۔ سید عنایت علی شاہ کے صاحبزادے ہاشمی فلم سازی کی طرف چل پڑے اور اس لائن میں وہ اچھے نیک نام اور محنتی ہونے کے علاوہ دوستوں کے دوست ہیں اور مستحق لوگوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔

آرٹسٹ

عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، سلطان (بنگالی آرٹسٹ) احمد خان جمیل، رضوان، بشیر موجد، جالی آرٹسٹ، غلام مصطفیٰ جمیل، اسحاق شور، شاکر علی، سلطان

نقش و نگار

عبدالرحمٰن چغتائی

عبدالرحمن چغتائی کو کون نہیں جانتا ملک میں وہی تو ایک آرٹسٹ ہے جس کے یہاں کلرنگ اور ڈرائنگ (رنگ اور خطوط) اپنا اور اپنے مصور کا مقام بتاتے ہیں اس کے رنگ ملتے ہیں تو حد فاصل معلوم نہیں ہوتے اور خط لگتے ہیں تو ان میں زندگی معلوم ہوتی ہے، انہیں دونوں راہوں پر کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں کیونکہ نہ رنگوں کی انتہا ہے نہ خطوط کی۔

صادقین

سلطان جن دنوں مشق و مزاولت میں مشغول تھا انہیں دنوں اس کے ساتھیوں میں جناب صادیقین بھی تھے، یہی صادقین جو آج پاکستان کے مشہور و معروف آرٹسٹ ہیں اور خطاط بھی! ان کے نقش قلم پاکستان کے بڑے بڑے بنکوں اور عظیم عظیم عمارتوں پر سیاحوں اور آرٹسٹوں کی نظریں ٹانک دیتے ہیں خطاطی کے ساتھ ساتھ وہ شاعر بھی ہیں اور انہوں نے اپنی رباعیات کا ایک مجموعہ شائع بھی کر دیا ہے۔ جس کی کتابت بھی انہوں نے خود ہی کی ہے، حالانکہ رباعی شاعری میں سب سے مشکل صنف ہے اور ایک رخ سے سب سے آسان کیونکہ رباعی کے چوبیس اوزان ہیں اگر

چاروں مصرعے الگ الگ وزن میں ہوں تو پھر بھی رباعی درست کہلاتی ہے' مشکل میں نے اس لیے کہا کہ ایک مصرع اپنے سے پہلے تین مصرعوں کو کارآمد بناتا ہے' یا یوں کہیے کہ تین مصرعوں پر ایک مصرع اس قدر جان لیوا ہوتا ہے کہ برچھے کا پھل اور اس کی گہرائی کو نہیں پہنچتا' صادقین اپنی رباعیات میں چاروں مصرعے برابر رکھتے ہیں جن میں ان کا عکاس ذہن کام کرتا ہے اور جزئیات بیانی ان کی خاص چیز ہے یوں سمجھئے کہ ان کی تصویروں میں جتنا گاڑھا ابہام ہے شاعری میں تفصیل بھی اس سے کم نہیں - یہی سبب ہے کہ ان کی خطاطی پر آئے دن بڑے بڑے خطاط جز بز ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ ہیں کہ اپنی روش سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے بالکل اسی طرح جیسے صاحب طرز ادیب اپنے مقررہ خطوط پر چلتے رہتے ہیں -

انہوں نے لاہور کے عجائب خانے میں اپنی نقاشی کا فن دکھایا ہے اس کی جرات و ہمت صادیقین سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی' اور میرے خیال سے یہ نئے ذہنوں اور ترقی پسند رجحانات کا کارنامہ ہے- صادقین ایک مست کمال اور مغلوب الحال فنکار ہے اور اس کی آزاد خیالی کے حدود قائم نہیں کئے جاسکتے مجھے فکر ہے کہ اس کی بادہ پیمائی اس کے فن پر غالب نہ آ جائے' ایسا آرٹسٹ روز روز پیدا نہیں ہوتا' کاش صادقین کا یہ جدید فن کسی جدید طرز تعمیر کی عمارت میں ہوتا یہ تو ایسا ہے جیسے کسی سیدانی کو سایہ پہنا دیا جائے -

احمد خاں آرٹسٹ

احمد خاں آرٹسٹ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' آج وہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں استاد ہے' اس نے اپنی تعلیم میرے غریب خانے پر مکمل کی ہے اور کمرشل آرٹ میں کسی کو اپنا مقام چھونے نہیں دیتا' اس شعبے کے اساتذہ میں اس کا نام ہے' حقیقت یہ ہے کہ اس نے تحصیل فن میں برسوں اپنا خون پانی ایک کر رکھا تھا - اس کی ابتدائی مشق کا کاغذوں کا ڈھیر ابھی تک میرے یہاں پڑا ہے' جس سے اس کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے مگر اب آ کر اس میں ایک بے پروائی آ گئی ہے جو صاحب کمال لوگوں کا خاصہ ہے لیکن میں اس بات کو اچھی علامت خیال نہیں کرتا' صاحب کمال ہو کر تو آدمی کو سچا' حلیم بردبار' انتھک اور انسانیت کا علم بردار ہو جانا چاہیے!

جمیل نقش

اگرچہ زیادہ دنوں میرے پاس نہیں رہا لیکن ابتداء اس کی بھی غریب خانے ہی سے ہوتی ہے اور آج وہ کراچی جیسے شہر میں معروف فنکار ہے اول سے اس کے ہاتھ میں ایک فطری لوچ اور قلم میں فنکارانہ رفتار اس کے مستقبل کا پتہ دے رہی تھی' میرے خیال سے شاعر کی طرح آرٹسٹ بھی پیدا ہوتا ہے اور اس میں اس کی صلاحیتیں گونگی ہو کر نہیں رہتیں۔

رضوان

میرے ایک دوست قاضی امداد انصاری جو خود بھی صاحب قلم ہیں اور نثر میں مہارت رکھتے ہیں اپنے صاحبزادے مسمی رضوان کو لائے جو اس وقت ایف ایس سی میں پڑھتا تھا اس کے والد اسے ڈاکٹری میں داخل کرانا چاہتے تھے مگر رضوان ان کا ہم خیال نہیں تھا' اس نے مجھے اپنا کچھ کام دکھایا میں نے دیکھ کر اس کے والد سے کہا اس برخوردار کے اندر تو ایک بڑا چلبلا آرٹسٹ بے تاب ہے اسے نیشنل کالج آف آرٹس میں داخل کردو۔ ڈاکٹری یہ نہیں کرے گا وہ میری اس بات پر جزبز ہوئے اور میری معروض کو بے خبری سے تعبیر کرتے ہوئے لے گئے اور میڈیکل میں بھیج دیا! نہ جانے اس درمیانی عرصے میں کیا کیا انقلاب آئے ہوں گے اور وقت کیسے گزار ہوگا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ انصاری صاحب صاحبزادے کو ساتھ لیے آرہے ہیں! فرمانے لگے احسان بھائی آپ کا اندازہ درست تھا' یہ میڈیکل میں نہیں چلتا اسے جا کر نیشنل کالج آف آرٹس ہی میں داخل کرائیں۔ میں ہنس پڑا اور رضوان کو نیشنل کالج آف آرٹس میں داخل کردیا۔

آج وہی رضوان اعلیٰ درجے کا آرکیٹیکٹ ہے اور اس نے اپنی ایک ذاتی فرم قائم کرلی ہے۔ مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اس فرم کی آمدنی پر اکتفا کرگیا اور اپنے فن میں ترقی کے زینوں پر گامزن نہ ہوا تو خسارے میں رہے گا' میں اس میں بڑی صلاحیتیں کلبلاتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں' اس کے خدوخال بھی قیافے کی رو سے اس کی بلندیوں کا پتہ دے رہے ہیں۔

بشیر موجد

یہ بھی لاہور کا مشہور آرٹسٹ ہے۔ مجھ سے اس کا تعارف سید سرفراز آرٹسٹ کے اسٹوڈیو میں ہوا تھا' اس وقت وہ ابتدائی منزلوں میں تھا اور اس کے سامنے بورڈ نویسی سے آگے کی منزل نہیں تھی' لیکن بسا اوقات اس کی باتوں میں اس کی ذہانت جھلکار دے جاتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ اگر اس کو ساز گار فضا میسر آ گئی اور یہ بورڈ نویسی کی نذر نہ ہو گیا تو کسی وقت بڑا جان لیوا فنکار ہو جائے گا' اسی تصور کے پیش نظر میں نے اسے کہا کہ میاں تم بشیر کے ساتھ موجد کا اضافہ کر لو' اس نے ایک ادھوری سی ہنسی سے کہا "اس کے معنی تو بلند ہیں' میں نے کہا یہ تو درست ہے لیکن اس کی معنویت تک ایک دن تم ضرور پہنچ جاؤ گے' محنت شرط ہے!

آج وہی موجد لاہور کا معروف آرٹسٹ ہے اور کتابوں کے سرورق بنانے میں اپنا مثل نہیں رکھتا اور چونکہ وہ نچلی سطح سے اٹھا ہے اس لیے اس کے کمال اور اس کی یافت نے اسے گمراہ نہیں ہونے دیا' وہ شریفوں کی طرح رہتا ہے اور ترقی کی سیڑھیاں اس کی نظر سے اوجھل نہیں! وہ اپنے فن کے سائے میں اپنی زندگی کو لے کر چل رہا ہے اور اس کے منصوبے کسی ارادے کو ناممکن قرار نہیں دیتے

جالی آرٹسٹ

ان کا اسٹوڈیو میرے گھر سے قریب ہے' وہ گاہے گاہے غریب خانے پر بھی آتے ہیں ایک دو بار میں بھی ان کے نگار خانے میں گیا ہوں' ان کی مشق فن بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے' وہ صحیح معنی میں قلم کا مزدور ہے اور زیادہ کمرشل آرٹ کرتا ہے' لیکن اس کے کمرشل سے فائن آرٹ کی بھی ایک مضبوط شاخ نکلی ہے اور وہ اس قدر بار آور ہو گئی کہ ان کا کمرشل آرٹ اس کے سائے میں چل رہا ہے' اس نے قائداعظم' قائد ملت فیلڈ مارشل ایوب خاں کے علاوہ علامہ ڈاکٹر اقبال کی کئی مختلف انداز کی قابل تعریف تصویریں بنائی ہیں ان کے علاوہ دیگر مشاہیر کی تصاویر کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ہے جوان کے ذوق اور محنت کا وکیل ہے۔

غلام مصطفیٰ آرٹسٹ

اس شخص کا قلم بھی معجز نگار ہے ڈاکٹر ساجد اور غلام مصطفیٰ کے ساتھ مجھے ''ٹھٹھا'' جانے کا اتفاق ہوا۔ کئی جگہ مصطفیٰ نے کار رکوا کے دیہات کے گوٹھ کے مناظر کاغذ پر بڑی چابک دستی سے منتقل کیے اور ڈاکٹر ساجد نے اپنی پسند کے مناظر کو کیمرے میں مقید کیا اور واپسی تک دونوں کے پاس اچھا خاصا ذخیرہ ہو گیا وہ ایسے بہار قلم فنکار ہیں کہ ان کے لیے دعا میں نکلتی ہیں۔ وہ گناہ کی تمام تر پونجی قلم کے خطوط سے کاغذ پر لانے میں کمال رکھتا ہے مگر یہاں کی ناقدری کا رونا کہاں تک رویا جائے یہاں تو جسے مقاصد کا توڑ جوڑ اور خوشامد کا فن نہیں آتا وہ کیسا ہی فنکار کیوں نہ ہو وہ شہرت نہیں پاتا' اس کی ایک مثال میرے سامنے ہے غلام مصطفیٰ جیسا فنکار اپنا عزیز وطن چھوڑ کر کینڈا چلا گیا' وہاں اس کے قدر دانوں کی کمی نہیں اور وہ اپنے فن کے آفاقی منازل طے کر رہا ہے۔

جمیل آرٹسٹ

کراچی کے ایک معمولی سے کوارٹر میں جمیل آرٹسٹ رہتا ہے وہ سیدھا سادا انسان کرتے پانجامے میں ملبوس ایک تھیلا ہاتھ میں لیے اکیلا مختلف مقامات پر دیکھا جاتا ہے بیک نظر اس پر آرٹسٹ ہونے کا گمان اس لیے نہیں ہوتا کہ آج کل آرٹسٹ اپنی ہیئت کذائی ہی الگ رکھتا ہے کوئی لمبے لمبے بالوں اور گھنی داڑھی نقش و نگار کی دکان سجائے پھرتا ہے کسی کے سر کے بال آسیب زدہ عورتوں کی طرح بکھرے ہوئے رہتے ہیں' کسی کی چوڑی قلمیں جیسے کالی جرابیں سکھانے کو لٹکا رکھی ہوں' لباس کی وضع قطع بھی حتی الوسع نرالی اور اٹھنے بیٹھنے کی سج دھج ایسی کہ جیسے یہ اس زمین سے باہر کی مخلوق کے فرد ہیں' لیکن جمیل اس بہروپ کا انسان نہیں' وہ فنکار ہے صحیح معنی میں فنکار' اس میں ایکٹروں والی اداکاری نہیں' اس کی خصوصیت اس کا فن ہے' لباس نہیں' وہ تمام دن ماحول سے بے نیاز خاموش مناظر سے مشورے کرتا پھرتا ہے' مگر اس کی تصویریں دیکھیے تو اعجاز! اس کا قلم بال سے باریک خط لگاتا ہے اور اس کی ہر لکیر زندہ محسوس ہوتی ہے' کاش اس پر کسی قدر شناس کی نظر پڑ جائے یا کسی حکومت کے انسان میں فن شناسی کا شعور لشکارا دے جائے۔

اسحاق شور

اسی سلسلے کی ایک کڑی جناب اسحاق شور ہیں جو میرے پرانے ساتھیوں میں ہیں وہ بیک وقت خوش نویس بھی ہیں اور مصور بھی! شاعر بھی ہیں اور فن سپاہ گری (بنوٹ) کے ماہر بھی' ان کی جوانی بھی میری طرح سکون و آرام سے نہیں گزری' لیکن ان کے فنون لطیفہ کے ذوق نے ان کے ہونٹوں پر شکایت نہیں آنے دی اور کڑے سے کڑے وقت کا احساس بھی طائرانہ رفتار سے دل کو ہوا دیتا گزر گیا' خدا کا شکر ہے کہ وہ اب پرسکون زندگی گزار رہے ہیں' ان کے بچے اچھے اچھے مقام پر برسر روزگار ہیں۔

شاکر علی

جناب اسحاق شور کے توسل سے شاکر علی سے بھی ملاقات ہوئی وہ بھی صحیح معنی میں وارفتہ کمال انسان تھے' نہایت سیدھی سادی اور لاابالی زندگی میں ایک بانکا فنکار میں نے اسی شخص کو پایا ہے وہ فنکار سے زیادہ استاد اور استاد سے بڑھ کر انسان تھے۔

مشاہدہ ہے کہ آج کل کا شاگرد بمشکل ہی استاد کو سراہتا ہے مگر شاکر علی صاحب کے کسی شاگرد کو میں نے ان کی برائی کرتے نہیں سنا' حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ تقسیم فن کے سلسلے میں ایک خاص مقام رکھتے تھے جو ہر استاد کو حاصل نہیں ہوتا۔

سلطان (بنگالی آرٹسٹ)

ایک دن میں اپنے مزنگ والے مکان میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو سولہ سترہ سال کا گہرے گندمی رنگ کا ایک لڑکا گھٹنوں تک اونچی دھوتی باندھے ہاتھ میں ایک ٹاٹ کا تھیلا لیے کھڑا ہے' میں حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے یاد کرنے اور حافظے پہ زور دینے کے باوجود اپنے جانکاروں میں مجھے کوئی یاد نہ آیا اور میں اسی طرح غلطاں و پیچاں نیچے اتر آیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے فوراً اس طرح گفتگو شروع کی میں سلطان ہوں۔ بنگالی ہوں اور بے یارو مددگار' حیدرآباد دکن جا رہا تھا۔ قاضی پیٹھ کے اسٹیشن پر ایک شخص نے میرے

حالات پوچھے اور ہمدردی سے کہنے لگا کہ حیدرآباد نہ جاؤ لاہور چلے جاؤ وہاں اچھے رہو گے۔

میں نے کہا میرا وہاں کوئی سہارا نہیں، اس نے جواب دیا کہ اگر کہیں کوئی سہارا نہیں ہے تو احسان دانش صاحب کے مکان پر چلے جانا وہ تمہارا سب انتظام کر دیں گے۔ سلطان نے یہ گفتگو اس طرح کی اور یوں دیکھتا رہا جیسے کوئی سردیوں کی دھوپ میں کھڑا ہوا سورج کی طرف دیکھ رہا ہو، میں نے اپنا کتب خانہ کھول دیا اور چائے منگالی۔ جب ذرا سلطان کا سانس درست ہوا تو میں نے پوچھا اس تھیلے میں کیا ہے؟ سلطان نے کہا برش وغیرہ ہیں، میں آرٹ اسکول کا طالب علم تھا، مجھے آرٹ سے ویسے پریم ہے۔

میں نے کہا، ذرا کچھ دکھاؤ تو سہی!

کاغذ؟ سلطان نے جواب دیا۔

میں نے اپنے لڑکے ذیشان دانش کو آواز دے کر اوپر سے ایک کاغذ کا تاؤ منگا دیا۔ سلطان نے اپنے چند منٹ میں ایک درخت کے سائے میں چرتے ہوئے گلے کی تصویر بنا دی میں نے تصویر پر غور کیا تو مجھے اس میں کچھ آثار ایسے ملے جو بڑے آرٹسٹوں کے خطوط اور قوسین میں ہوتے ہیں، میں نے سلطان سے کہا کہ دیکھو جب تمہیں بھوک لگے تو بچے کے ہاتھ اوپر سے کھانا منگوا لیا کرو اور تم یہاں بیٹھے مصوری کی مشق کرتے رہا کرو۔ میں ابھی تمہیں رنگ اور کاغذ وغیرہ لا کر دیتا ہوں۔

سلطان شکریہ ادا کر کے خاموش ہو گیا، میں کسی ضروری کام میں پھنس گیا اور شام تک اس کے لیے رنگ اور کاغذ نہ لا سکا، دوسرے دن سلطان نے مجھے یاد دہانی کرائی، میں نے تھوڑے بہت رنگ اور کاغذ لا دیئے اور سلطان نے مشق شروع کر دی، میں حسب حیثیت اسے رنگ و روغن، کاغذ اور کینوس مہیا کرتا رہا اور سلطان اپنے فن کے میدان میں قدم زن رہا، لیکن میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ میں جو کچھ امداد دے رہا ہوں وہ اس کے لیے کم ہے۔

کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد میرے دوست حبیب اللہ خان سعدی میرے یہاں تشریف لائے اور پوچھنے لگے کہ یہ جانور کہاں سے منگوایا ہے؟

میں نے کہا، یہ تمہارے ہی لیے ہے غریب الوطن اور قابل امداد ہے اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں؟ اگر اس میں کچھ جان نظر آئے تو اس کی امداد کریں اور اپنے ہمراہ لے جائیں، میں

اس کے لیے اس کے فن کی ضرورت کے مطابق سامان مہیا نہیں کر سکتا۔

حبیب اللہ سعدی ادب پسند اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں اور جہاں تک بس چلتا ہے وہ فنون لطیفہ کی ترویج میں دامے درمے قدمے سخنے ضرور حصہ لیتے ہیں۔ نہایت وضع دار قسم کے انسان ہیں، جب بھی وہ لاہور آتے ہیں میرے غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے ہیں اور اکثر اوقات اسی خانقاہ میں مقیم ہوتے ہیں۔ میرے یہاں کے قیام میں تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن وہ کبھی اپنے عزیزوں کے یہاں پر تکلف قیام کو اس خانقاہ پر ترجیح نہیں دیتے۔ وہ صوبائی اسمبلی کے رکن تھے لیکن میرے معاملے میں ان کی وضعداری بدستور تھی۔ کمالیہ ضلع لائلپور (فیصل آباد) میں حبیب اللہ سعدی صاحب کا ایک باغ ہے جو ''ہلال باغ'' کے نام سے مشہور ہے اور اپنے پھولوں اور پھلوں کے اعتبار سے ہر سال نمائش میں اول رہتا ہے۔ وہیں باغ ہی میں ان کا ایک مختصر سا بنگلہ اور ملازموں کے رہنے کے لیے کوارٹرز ہیں۔

جاتے ہوئے وہ خوشی خوشی سلطان کو اپنے ساتھ کمالیہ لے گئے اور چار سال تک اس کے رنگ، برش، کینوس اور کاغذ وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام کرتے رہے۔

جب چار سال کے بعد حبیب اللہ سعدی صاحب سلطان کو ہمراہ لائے تو سلطان کے قلم کی بہت سی تصویریں ان کے پاس تھیں۔ ہم لوگوں نے مل جل کروائی ایم سی اے بلڈنگ میں ان کی تصویروں کی ایک نمائش کرا دی۔ وقت کی بات تھی کہ اس میں سے چھ سو روپے کی تصویریں فروخت ہو گئیں۔ سلطان چھ سو روپے لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا اب کیا کروں اس روپے کا؟

میں نے کہا اس چھ سو روپے میں ایک گدھا خریدو اور ایک معمولی قسم کی سیکنڈ ہینڈ چھولداری اور ایک ڈھیلا ڈھالا زمین کو چھوتا ہوا چغہ، سر کے بال اور داڑھی اس قدر بڑھاؤ کہ تم پر نوجوان ہونے کا گمان نہ گزرے، کھانے کے لیے بھنے ہوئے چنے توبڑے میں بھر کر کشمیر کی طرف چل دو۔ جہاں کوئی اچھا منظر دکھائی پڑے وہیں پنکوا دے کر گدھے کو تو چرنے کے لیے چھوڑ دو اور خود ڈیرا لگا لو۔ جب تک اس منظر کو کاغذ پر نہ لے آؤ وہیں پڑے رہو اور سری نگر جا کے دوسرے رستے سے واپس آؤ اور پھر دکھاؤ کہ اس سفر سے تمہیں کیا ملا اور تمہاری پونجی کس معیار کی ہے۔

میری بات سنتے ہوئے اس کی پلکوں کا سکوت اور نگاہوں کی مرکزیت بتا رہی تھی کہ وہ کہیں دور

پہنچ گیا ہے۔

میں نے بات ختم کی اور وہ "اچھی بات ہے" کہہ کر باہر چلا گیا اس نے پادریوں کی تراش خراش سے علیحدہ دو چغے بنوالیے اور ایک گدھے پر کاغذ رنگ برش اور کرائے کی چھولداری وغیرہ لاد کر چلتا بنا۔ ہم روز سلطان کے متعلق سوچتے کہ خدا جانے کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا لیکن مطمئن تھے کہ وہ بڑا محنتی اور جنونی قسم کا آرٹسٹ ہے نہ جانے کیسی کیسی قیمتی تصویریں تخلیق کر رہا ہوگا۔

تین ماہ کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس پچاس کے لگ بھگ ایسے مناظر تھے جنہیں دیکھیے تو دیکھتے ہی رہیے۔ میں نے بہ نظر تعمق اس کے وہ تمام شاہکار دیکھے جنہیں بہت سے لوگ سراہتے تھے میری نظر میں ان میں سے کچھ شاہکاروں میں اس کی چابکدستی اور انہماک بولتا تھا اور اس کی فطری صلاحیتیں خاموشی کی زبان میں اپنا تعارف کراتی تھیں لیکن باقی معمولی تصویریں تھیں۔

اس نے پھر ایک نمائش کی اب کی بار بارہ یا تیرہ سو کی تصویریں فروخت ہوئیں میں فکرمند تھا کہ اب کیا کیا جائے لیکن فوراً ہی میری سمجھ میں بات آ گئی جناب حسین شہید سہروردی مجھے اچھی طرح جانتے تھے میں نے انہیں خط لکھا کہ اس آرٹسٹ کی خستہ حالی اسے میرے پاس لے آئی تھی اس وقت یہ ایک طالب علم تھا اور آج ایک چابک دست آرٹسٹ ہے جو میرا کام تھا میں نے اپنی حدود تک پورا کر دیا' یہ بنگالی ہے اور آپ ایک صاحب مقام! اپنی اس امانت کو سنبھالیے اور اسے کوئی مناسب مقام دیجیے' میں نے خط سلطان کو دے دیا اور کچھ باتیں سمجھا دیں خط لے کر سلطان کراچی روانہ ہو گیا وہاں حسین شہید سہروردی صاحب نے جب دیکھا ایک بنگالی اتنا اچھا آرٹسٹ ہے تو انہوں نے اسے پاکستانی آرٹ کے نمائندے کی حیثیت سے کسی وفد کے ساتھ ملک سے باہر روانہ کر دیا۔ اس طرح سلطان دوسرے ملکوں کی سیاحت سے کئی ماہ میں واپس آیا اس سفر میں اس کے فن میں اور بھی چار چاند لگ گئے اب وہ ایسا آرٹسٹ تھا جس پر ملک فخر کر سکتا تھا اس کی تصویریں میں نے اچھے اچھے باشعور لوگوں کے یہاں دیکھی ہیں پاکستان کے ایک سرکاری ماہنامہ "ماہ نو" میں بھی اس کی تصویریں چھپتی رہی ہیں۔

اب سلطان ایک عرصہ سے گم تھا پتہ نہیں چلتا تھا کہاں ہے؟ میری طرح اس کا ہر جاننے پہچاننے والا اس کا متلاشی نظر آتا تھا۔

جب سے سلطان آرٹسٹ بننے لگا تھا اسی وقت سے اس میں ایک بلند انسانیت نے بھی جنم لے لیا تھا' چنانچہ جب اس کے پاس کہیں سے رقم آتی تو وہ دو چار چار دوستوں کو ہمراہ لے کر اچھے اور معیاری ہوٹل میں کھانا کھاتا اور خدام کو ایک روپے سے کم انعام نہ دیتا اور جب قلاش ہوتا تو خشک روٹیاں کوٹ لیتا اور شکر ملا کر پھانکتا۔ جہاں وہ عظیم فنکار تھا وہیں وہ ایک عظیم انسان بھی ہو گیا تھا اور درویشانہ زندگی بسر کرنا بھی اس سے باہر کی بات نہیں رہی تھی اس میں وہ بننے بنانے کی خو تو نہیں تھی جو آج کل کے آرٹسٹوں کا طرہ امتیاز ہے' لیکن عورت اس کی کمزوری ضرور تھی ایک عورت اس نے کہیں دیکھی ہوئی تھی یا اپنے تصورات میں ڈھال لی ہوئی' جب وہ اس کی تعریف پر اترتا تو سننے والے اکتا جاتے اس وقت سلطان سر پکڑ کر بیٹھ جاتا اور کہتا کہ میں تمام دنیا کی اچھی بری باتیں خلوص دل سے سنتا ہوں لیکن میرے دوست میری باتوں پر ناک بھوں چڑھاتے اور ماتھوں پر شکنیں ڈالنے لگتے ہیں اگر کہیں میں ان سے سوال کرنے لگوں تو شاید کوئی قریب بھی نہیں آنے دے گا۔

ایسے موقع پر وہ کبھی کبھی اپنے سر کو ایسے جھٹکا دیتا کہ اس کے بال چوری کی طرح گرد گھوم جاتے اور وہ خاموش ہو جاتا جیسے نیند سے چونک پڑا ہو۔

سلطان ایک طویل مدت لاہور سے غائب رہا بار بار خیال ہوتا تھا کہ نہ جانے کہاں کام آ گیا مگر دریافت کے باوجود کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔

ایک دن اچانک گھر پر آ دھمکا' اب اس کے بال پہلے سے بھی زیادہ گنجان ہیں لیکن لاابالی اداؤں میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ اس کا سراپا اسی دلکشی کا حامل ہے اور ڈھیلے لباس نے اس میں اور بھی تیکھا پن پیدا کر دیا ہے' وہ وعدہ کر کے کراچی روانہ ہو گیا اور کہہ گیا کہ دو ماہ کے بعد لاہور ایک طویل مدت کے لیے آؤں گا مگر یقین کیسے آئے آرٹسٹ ہے۔ بسا اوقات اس دوران میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ سلطان رات دن آزاد خیال لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے آزادی کے سیلاب میں جزو سیلاب ہوا جا رہا ہے اس کی زندگی کی تھکن یا شاید جنسی محرومی اسے قلندری تو نہیں تکیوں میں اونگھنے والی درویشی کی طرف لے جا رہی ہے۔ جس میں انسان ہر وقت زمین سے دو میل بلند رہنا چاہتا ہے جو آرٹسٹ کو آرٹسٹ نہیں رہنے دیتی اور زندگی سے اس کی گہماگہمی چھین لیتی ہے' اب وہ کراچی میں بھی نہیں غالباً وہ زندگی کی پرپیڈ اور آرٹ کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر بنگال چلا گیا۔

صحافت پر لمحہ فکر

آزادی جمہور کے ہر چورا ہے پر دشمنان جمہور کی کمین گاہیں ہوتی ہیں وہ یہیں سے جمہور کے بہی خواہ صحافیوں کا شکار کرتی اور پریس کی آزادی کی راہوں میں پھاٹک لگاتی چلتی ہیں' جو صحافی ان کے جال کی اس پھننگ میں آجاتے ہیں ان کے سامنے اپنی شکم پری اور جسم پوشی اور دیگر اغراض حیات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا' وہ اپنی رائے کے اظہار کا حق رکھتے ہوئے بھی زبان میں تالا ڈال لیتے ہیں' ان کا ضمیر اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے' وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہر آدمی خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور موت کے رجسٹر میں سرے ہی سے رعایت کا خانہ نہیں۔

لیکن اس ہجوم میں صحافیوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو فکری طور پر اپنے ہمسایہ ملکوں کی صحافت سے کہیں آگے ہے۔ ان کی نظر میں شہری آبادی کی ترقی و تزئین' انسانیت کے بنیادی حقوق اور سیاسی ڈھانچے کے ردو بدل کی اسکیمیں رہتی ہیں' یہی سبب ہے کہ ہمارا ملک آزادی کی حقیقی قدروں اور صحافت کے مقدس فرائض سے آشنا نہیں ہونے پاتا اور تعلیم ہمارے یہاں ابھی اس معیار پر نہیں پہنچی جس سے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے اخبارات سے بہ آسانی استفادہ کیا جا سکے یہ ایک تعلیمی کمی ایسی ہے کہ جگہ جگہ معاشرے کے اس جھول کا احساس ہوتا ہے اور شدت سے ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں جس قدر خبریں چھپتی ہیں سب ٹیلی پرنٹر سے ترجمہ ہو کر پالیسیوں کی جنتری میں کھنچتی ہیں اور اس عمل سے وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں - اول تو ترجمہ ہی ایسی چیز ہے کہ اگر دوبارہ کوئی مضمون ترجمہ ہو جائے تو اصل غائب ہو جاتی ہے' پھر اس پر اخبار کی پالیسیوں اور پارٹیوں کے مفاد کے تحت خبروں کی کاٹ چھانٹ اسے اور بھی اجنبی بنا دیتی ہے - یہی مواد ہمارے عوام میں جا کر مختلف قسم کے تصورات و خیالات کو جنم دیتا ہے اور پھر اس میں ذاتیات کی عفونتیں بھر جاتی ہیں - کہیں تعصبات کی کالک سے سیاہ دھاریاں کہیں جنسیات کے بدرنگ بیل بوٹے' کہیں خیانت کے بھیانک نشیب' الغرض حقائق اور صداقت کی گردنوں کو اس طرح توڑا مروڑا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو عوام اور حکومت کی ہم خیالی سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے حالانکہ یہ معیار ہے امن عامہ کا -

پریس ٹرسٹ قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے بدخواہوں کی تحریروں اور غیر ملکی سازشوں سے عوام کو آگاہ رکھنے کے علاوہ حکومت کے مسائل سے عوام کو اور عوام کی الجھنوں اور غلط فہمیوں سے حکومت کو باخبر رکھا جائے - جس سے ملک کی سالمیت میں دراڑ نہ پڑے اور حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے - لیکن نتیجہ اس کے برخلاف اور فضا اس کے برعکس ہے اب اخبار حکومت کے مقصد و منشاء کے ترجمان تو ہیں لیکن عوام کی اجتماعی ضرورتوں اور پریشانیوں کی تفصیل و تشریح سے بالکل خالی ہوتے ہیں - ان میں ہمارے صحافی زرخرید غلاموں کی طرح بسر کرتے ہیں' حالانکہ صحافی کا یہ منصب نہیں ہوتا - صحافی کو تو روحانی دیانت خدمت خلق کی لگن بلندی کی آرزو' مقاصد کی وسعت اور نیت کی تقدیس کا رسیا ہونا چاہئے' مگر ان کے اصولوں میں قلم و قرطاس کی نمائش چم خم کے سوا کہیں غیر فانی اصولوں اٹل فیصلوں کی صورت میں تحریر کا کمال اپنا تعارف نہیں کراتا' اس قسم کے صحافی اپنے ضمیر کی آواز کو تحریر کی صورت نہیں دے سکتے' یہ آزاد صحافت اور پکی ہوئی مخلوق کا گلا گھونٹنے میں پیش پیش رہتے ہیں - اور یہ نقل ہے کمیونسٹ ملکوں کے اخبارات کی' لیکن نقل کے لیے بھی عقل درکار ہے' ان کے اخبارات میں سیاست کم اور دانائی زیادہ ہوتی ہے اور یہاں دانشوروں میں بھی دانائی کا کوسوں کھوج نہیں ملتا -

انہوں نے اغراض کے جنون اور مقاصد کے نشے میں مذہب کو بھی اس بری طرح مجروح کیا ہے کہ اس کے صحیح خدوخال بھی اپنے صحیح رنگ و روغن میں نظر نہیں آتے' گویا مذہب ان کے ہاتھ میں

ایک آلہ ہے تحصیل منصب اور تسکین طلب کا

انہوں نے عقائد کے سینے چھلنی کر دیئے' ان بہروپیوں نے عوام کے دلوں کے دروازے بند کر دیئے اور اخلاق کی کھڑکیاں تیغہ کر رہے ہیں' یہ خودغرض گروہ اور ان کے لگائے ہوئے کانٹے دار پودے اس مسخ شدہ مذہب کو مانتے تو ضرور ہیں لیکن ان میں دروغ بافی اور گاؤزوری اپنے شباب پر ہے۔

اسی قبیل کے بعض بعض رتے حقیقتوں کا خانہ ساز لباس پہنے درس گاہوں اور دارالعلوموں میں اوہام وعصبیات کی فیکٹریاں چلا رہے ہیں جن میں نقب زنی اور قفل شکنی کے آلات ڈھلتے ہیں۔اس ماحول کی پروردہ نئی نسل کے نوجوان اور یہ مخلوط الدم کھیپ چاق وچوبند تو ضرور ہوتی ہے لیکن اعتماد کے قابل نہیں' زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس قسم کے مذہبی باغیوں نے اپنے مخلص رفیقوں بلکہ معصوم اور پیاری پیاری بہو بیٹیوں کو دشمنوں کے حوالے کر دیا اور ان کی پیشانی پر ایک بھی ندامت کی شکن نہیں رینگی اور اس کی صرف نگاہیں نہیں تاریخ گواہ ہے لیکن ان تمام عیوب کے باوصف ہمارے یہاں صحافت کی کرسیوں اور ادب کی مسندوں اور با اصول اور بلند کردار لوگ آج بھی موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پر آئے دن قید وبند کی صعوبتیں ٹوٹتی رہتی ہیں لیکن اس قید وبند میں انہیں اذیت کے ساتھ ایک فرض کی ادائی کا احساس تسکین دیتا رہتا ہے اور وہ اپنا مقدس فریضہ ادا کرتے رہتے ہیں' انہیں سے صحافت میں جان اور عوام میں عزائم شاداب رہتے ہیں۔ جانوروں کی طرح خریدے جانے والے اور پنجروں میں چڑیماروں کی سیٹیوں پر بولنے والے صحافیوں کا کوئی نام تک نہیں لیتا' صحافت کے باعث مولینا ظفر علی خاں' مولانا عبدالمجید سالک' مولانا غلام رسول مہر' حمید نظامی' ابو سعید بزمی' مولانا عبدالباقی' قاضی اطہر مبارک پوری' مولانا سید حبیب' مولانا مجید حسن مدیر مدینہ سید محمد تقی نصر اللہ خاں' آغا شورش کشمیری' الطاف حسن قریشی' مجیب الرحمن شامی' مجید نظامی' زیڈ اے سلہری' الطاف گوہر' محمد صلاح الدین مدیر جسارت' نصر اللہ خاں عزیز' مسکین حجازی' فرہان زیدی' تمام کے تمام لوگ زندہ رہیں گے اور ہر اس شخص کو زندگی کا حق پہنچتا ہے جو فکر وقلم سے فرائض انسانی کو اجاگر کرتا اور نوجوانوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی تلقین کرتا اور معاشرے کو اپنے فکر وقلم سے سجاتا اور سنوارتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر

میں غلام رسول مہر کو روزنامہ ''انقلاب'' کے زمانے سے جانتا ہوں جب میں مولانا عبدالمجید سالک کے پاس اپنی کتاب ''لغات الاصلاح'' کا مسودہ لے کر گیا تھا' وہیں مہر صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں گاہے گاہے حاضر ہوتا رہا۔

اگرچہ ان کے یہاں ملازمتوں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ عہد کر چکے تھے کہ فرنگی کی غلامی کا طوق نہیں پہنیں گے' اس لیے مولانا حیدرآباد دکن کے اسلامی ماحول میں چلے گئے' لیکن لاہور کی فضا کی یاد اور یہاں کی شگفتہ صحبتوں نے انہیں پھر لاہور کھینچ لیا۔

مہر صاحب کا مطالعہ اور تصنیف و تالیف ساتھ ساتھ چلتے تھے' علی الصبح سیر کے بعد ناشتے سے فارغ ہوتے اور تقریباً نو بجے وہ تحریری کام پر بیٹھتے اور ایک بجے تک پورے انہماک سے کام کرتے پھر دوپہر کا کھانا کھا کے قیلولہ کرتے اور ظہر کی نماز کے بعد کا وقت مطالعے کو دیتے' مولانا غلام رسول مہر قابل رشک حافظے کے انسان تھے جہاں وہ ایک ادیب شہیر تھے وہیں مورخ اور محقق ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا' اس کا ثبوت ان کا وہ کام ہے جو انہوں نے یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر پہلے تو ''زمیندار'' میں کام کرتے رہے پھر مولانا عبدالمجید سالک کے اشتراک سے ''انقلاب'' کا اجراء کیا اور اس میں جو اداریئے لکھے وہ اس دور کے شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح مولانا سالک کے فکاہاتی مضامین اور ان کے اداریئے ملک بھر میں اچھی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور آج بھی ان کا ایک مقام ہے۔

صحافت کے طالب علموں کو بے لاگ آنے والے ماحول اور راستوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ایک ایسا شعور دیتا ہے جو فکر انگیز بھی ہوتا ہے اور خیال آفریں بھی۔

مولانا مہر نے عمر کا اچھا خاصا حصہ مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کی صحبت میں گزارا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مولانا محمد علی جوہر جیسے شہرہ آفاق عالم' ادیب' شاعر اور سیاس بھی مولانا مہر کے مداحوں میں تھے اور انہیں ملک کا بہترین اداریہ نگار بتاتے تھے' سید احمد شہید کی سیرت پر مولانا مہر کا ایسا کارنامہ ہے جو انہیں تاریخ میں زندہ رکھنے کا ضامن ہے۔

علامہ اقبال جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں گئے تو مولانا غلام رسول مہر کو سیکرٹری کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ اس وقت ان کی نظر میں مہر سے زیادہ کوئی آدمی نہیں بچا اور انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

مولانا مہر سے ملک بھر کے مشاہیر کی خط و کتابت تھی اور یہ بھی ان کی زیرکی کا ثبوت ہے نجانے اب وہ خط و کتابت کہاں ہوگی وہ بڑا قیمتی لٹریچر ہے جس کی موجودہ دور کو ضرورت ہے۔

مولانا مہر علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے متعلق کتابیں لکھنا چاہتے تھے لیکن آخر تک اپنے خیالات وعزائم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے البتہ ان کی کتاب سیرت رسول مقبول ﷺ ان کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔

آخر کے دنوں میں شورش کاشمیری اور راقم الحروف اور میرے ہمراہ شفیق کوئی صاحب گئے اور ان سے ملے وہ نہایت خلوص و مروت سے پیش آئے' شورش کے ساتھ ان کا فوٹو گرافر بھی تھا چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے ہمارے ساتھ فوٹو کھنچوایا ''زندگی کا کیا بھروسا ہے اچھا ہے یہ تصویر آپ لوگوں کے ساتھ کھنچ گئی (وہ تصویر ''جام نو'' کراچی کے احسان دانش نمبر میں چھپی ہے۔)

محمد صلاح الدین مدیر جسارت

کشمکش کے ریگزار سے اٹھا ہوا ایک بگولا ہے جو جس قدر بڑھتا ہے راستے کے ٹیلے اس کے سپانے سے لرزتے چلے جاتے ہیں' یوں تو ہر نم آلود نشیب سے اٹھا ہوا ہر ساونت زبان و قلم کے اعتبار سے جری اور جیالا ہوتا ہے لیکن محمد صلاح الدین میں فطری صلاحیتوں کے ساتھ حقائق فہمی اور جزئیات نگاری اپنے تنت پر نظر آتی ہے۔

پاکستان کے شعبہ صحافت میں اس دور کا بڑے سے بڑا صحافی ان کے سامنے بالشتیا معلوم ہوتا ہے' اس کے اسلوب بیان میں صداقت اور فصاحت یکجان ہو کر ایسا آہنگ پیدا کرتے ہیں جو اب تک کسی محسن صحافت کو میسر نہیں ہوا' اس کے قلم کی کاٹ تلوار سے زیادہ اپنا لوہا منواتی ہے اور اس کا انداز تحریر حریفوں کو لرزہ براندام رکھتا ہے۔ ان کی نظر کے سامنے سنگین محلات اور خس پوش جھونپڑیاں بے نقاب رہتی ہیں اور ان کی عکاسی کا ان کے قلم کو ایسا لپکا ہے کہ کہیں عجز کا پہلو نہیں ابھرتا' ان کے

اسلامی اخلاق اور روحانی نظریے کے علاوہ خیر وشر کا امتیاز اپنی بنیاد میں وحدت کی کنکریٹ رکھتا ہے اور اسی وحدت سے قوت فیصلہ کے رگ و ریشہ میں شعور حیات کے رگ و ریشے گھتے رہتے ہیں اور سیاسی دانائی کے مختلف تار اسی ایک مرکز پر جا ملتے ہیں' یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر میں ایسی جاذبیت آ جاتی ہے کہ ملک میں سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ مداح ہی نہیں ان کے غمخوار ہیں۔

ان کے صحافیانہ سوالات و جوابات اپنی اس نوعیت پر مبنی ہوتے ہیں جس سے سوال کرنے والے کے عزائم اور مافی الضمیر کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کے سوالات قاری کے دل میں خود بخود اپنے جوابات اگل دیتے ہیں' محمد صلاح الدین جب اپنی تحریر میں رمز و کنایہ استعمال کرتے ہیں تو ان کے الفاظ سے معانی کے جھرنے پھوٹ پڑتے ہیں اور شک وشبہ کے سوتے بند ہو جاتے ہیں۔

آئے دن کی قید و بند نے ان کے افکار و خیالات پر اور بھی سان رکھ دی' ایسے ادیب و صحافی ریل میں ہوں یا جیل میں اخلاقی اقدار اور سیاست کے رموز کی چھان پھٹک کرتے رہتے ہیں اور جبر و تشدد ان کے اذہان پر مہریں ثبت نہیں کر سکتا۔ کبھی جب زیادہ ہی جان پر بن جاتی ہے تو یہ سیاسی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں منہمک ہو جاتے ہیں جو اخباری سیاست سے کہیں زیادہ اور مہلک دھار والا ہتھیار ہے' القصہ یہ لوگ زمین کے طشت پر اپنا نام کندہ کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے نام سے خدا کا کام کر کے مر جاتے ہیں مگر تاریخ کی پیشانیاں ان کے عنوانات کی منتظر رہتی ہیں۔

ابراہیم جلیس

یوں تو مجھے ہر ادیب اور شاعر کے علاوہ صحافی سے ایک دلی لگاؤ ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہیں کہ میں ان کے طریق فکر اور اسلوب بیان کے علاوہ ان کے اصول حیات سے بھی متاثر ہوں اور انہیں میں ایک ابراہیم جلیس بھی ہے' یہ وہ شخص ہے جو بھوک کی شدت اور حالات کے فشار میں بھی اپنے قلم کو کرائے پر نہیں چلاتا' حالانکہ اس کینڈے کا صاحب قلم اگر ذرا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو زندگی اور حالات کی بہت سی گرفتوں کو نرم کر سکتا ہے' لیکن جلیس نے کبھی ایسا نہیں کیا' وہ غریبوں' مفلسوں اور اچھے لوگوں کا ترجمان رہا ہے' وہ قلم کے معاملے میں لگی لپٹی کا قائل نہیں' وہ جس قدر

مہذب ہے اسی قدر تحریر میں بے باک ہو جاتا ہے، زمانے کی قدر ناشناسی اور بلند منصبوں کی ناانصافی کی شکایت بھی نہیں کرتا اور معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کے سدباب کو اپنا مدعائے تحریر قرار دیئے ہوئے ہے، اس کے یہ اوصاف اس کے راستے میں رکاوٹیں بھی بنتے ہیں لیکن اس سے اس کے ضمیر کی آواز نہیں دبتی، وہ اپنی دھن کا پکا صحافی اور بے لاگ ادیب ہے، خدا اس کی عمر دراز کرے ابھی چند روز ہوئے میرا ایک دوست جو یہ مسودہ پڑھ رہا تھا کہنے لگا، جناب مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جب آپ کی ''جہاں دانش'' کو آدم جی پرائز ملا تو جلیس نے آپ کے خلاف رائے دی تھی۔'' میں نے کہا جناب آپ کا منشا کیا ہے؟ کیا میں ان کی اس بات سے اپنی رائے بدل دوں؟ ارے بھائی میری کتاب کے متعلق ان کا جو خیال ہوگا انہوں نے اس کا اظہار کر دیا میں ان کے متعلق جو رائے رکھتا ہوں اسے کیوں بدل دوں؟ اس کا اظہار کیوں نہ کروں؟

کوثر نیازی

موجودہ حکومت کے وزراء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے بعد مسٹر جے اے رحیم، جناب مبشر حسن، جناب علی محمد راشدی، جناب عزیز احمد، پیرزادہ عبدالحفیظ وغیرہ کی صف میں جناب کوثر نیازی بھی آتے ہیں جو ایک طرح میری شاعر برادری کے فرد ہیں، ان کی مستعدی، کارکردگی، زیرکی اور ہردل عزیزی اظہر من الشمس ہے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ حکومت کی ذمہ دار اسامیوں پر ایسے ہی تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہی لوگ حکومت کے ستون کہلاتے ہیں، اگر ہمارے تمام وزراء ایسے ہی کارکن، محنتی اور خیر خواہ ہوتے تو ملک کو موجودہ خسارانہ اٹھانا پڑتا، لیکن اگر بغور دیکھا اور سوچا جائے تو جناب کوثر نیازی کی تمام داد و تحسین جماعت اسلامی کو پہنچتی ہے اگر جماعت اسلامی تلوار کو ووٹ دے کر پیپلز پارٹی کی چوحدی اور حصار کو سنگین کر دیتی تو ملک کو کوثر نیازی جیسے کارکن نہ جانے کتنے دستیاب ہو سکتے اور حکومت کو موجودہ پریشانیاں نہ ہوتیں، کاش وزراء کی ٹریننگ کے لیے ایک کالج قائم کر کے مولانا مودودی کو اس کا پرنسپل مقرر کر دیا جائے تا کہ ہمیں اچھے اور مخلص وزیر مل سکیں۔

پچھلے دنوں جناب کوثر نیازی کے مجموعہ کلام ''زرگل'' پر لاہور اور بیرون لاہور کے بلند پایہ

ادیبوں اور شاعروں نے مقالات کی صورت میں کوثر نیازی صاحب کو خراج تحسین ادا کر کے ادب میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے جس میں جناب جوش ملیح آبادی، عبادت بریلوی پروفیسر حمید احمد خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی علالت کے باعث اس ہنگامے کی شرکت سے محروم رہ گیا اور نہ اب تک ''زرگل'' کی موجودہ طباعت نظر سے گزری، سنا ہے کہ اب وہ پہلی ''زرگل'' نہیں طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی معیاری کتابوں میں شمار ہے۔

ابوسعید انور

کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۹۱۶ء میں امرت سر میں پیدا ہوئے۔ اسکول کے زمانے ہی سے ان کا سیاسی رجحان ہو گیا تھا اور انہیں ایام میں گرفتاری بھی عمل میں آ چکی تھی، ۱۹۳۵ء میں جب مسجد شہید گنج کا شور اٹھا اس وقت وہ کانگرس کے بائیں بازو سے متعلق تھے پھر جلد ہی مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے اس کامریڈ کو مشرف بہ اسلام کر لیا اور یہ رفیق ابوسعید انور ہو گئے اور ان کی تقریروں کو جابجا سراہا جانے لگا ۱۹۳۶ء میں نظر بندی کے بعد ایک کانفرنس ہوئی جس کی صدارت ابوسعید انور کے حصے میں آئی، اس وقت سے یہ لاہور ہی کے ہو رہے اور ''زمیندار'' کے عملے میں داخل ہو گئے، مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک میں انہوں نے بڑے شد و مد سے حصہ لیا، اس وقت سے طلباء کے اجلاس ہوں یا کوئی قومی تحریک اس میں ابو سعید انور کا ذکر نمایاں نظر آئے گا۔

حصول پاکستان کے بعد مزدور تحریک میں انہوں نے اس جانکاہی سے کام کیا کہ ان کا نام بڑھتا ہی چلا گیا چنانچہ اسمبلی میں پہنچ گئے اور وہاں زرعی اصلاحات کا کام کیا اگرچہ یہ بڑی ہی جان جوکھوں کا کام تھا لیکن یہ تھے کہ برابر کوشاں رہے۔

۱۹۶۰ء میں جب حکومت نے پہلی بار مزدوروں اور کارخانہ داروں کے جھگڑے چکانے کے لیے عدالت قائم کی تو ابوسعید بھی اس میں ایک رکن منتخب ہوئے اور ابوسعید انور نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان کے حق کی نگرانی کی۔

شیخ خورشید احمد جب وزیر قانون ہوئے تو حکام وقت نے ان کے ذریعے ابوسعید انور کو مسلم

لیگ کنونشن میں شامل کرنا چاہا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ۱۹۶۴ء میں جب صدارتی انتخاب کا مرحلہ پیش آیا تو سیاسی جماعتوں نے حزب اختلاف قائم کر کے مادر ملت فاطمہ جناح کو صدارت کا امیدوار بنایا اس وقت ابوسعید انور متحدہ حزب اختلاف مغربی پاکستان کے صدر تھے ابوسعید انور نے اپنے پیشروؤں کی تقلید میں قید و بند سے بھی منہ نہیں موڑا اور جگر داری سے کام کرتے رہے۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں نواب دولتانہ کے صدر چنے جانے سے وہ جماعت سے کنارہ کر گئے آج بھی وہ حزب اختلاف کے ممتاز لوگوں میں شامل ہیں اور تحریک استقلال کے رکن ہیں۔

انہوں نے غریبوں کے لیے اپنی زندگی کی قوتوں کو اس بیدردی سے برتا کہ اب کچھ عرصے سے ان کی صحت کچھ اچھی نہیں رہی' وہ ملک کے خیر خواہ' غریبوں کے حامی کسانوں کے معاون اور دوستوں کے دوست ہیں' نجانے ایسے انسانوں کو موجودہ دور میں کہاں تک زندگی کا حق پہنچتا ہے؟

واحد رشیدی

میرا ایک دوست جسے گردش روزگار نے کراچی رہنے پر مجبور کر دیا ہے' نہایت سلجھا ہوا ادیب لیکن دوستی کے معاملے میں عذاب جان' خداداد کالونی کراچی میں محلے کے خوبصورت مکانوں اور قادری مسجد کے بالمقابل اس کا مکان ایسا لگتا ہے جیسے ایک خوبصورت سفید گھوڑی نے زرد رنگ کا بدنسلا بچہ دے دیا ہو بولتے ہوئے اس کی نتنت اس کی بھوؤں کو رہ رہ کے کمانیں کرتی رہتی ہے مگر جب کوئی بات اس کی طبیعت کے خلاف ہو تو وہ فوراً ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے اور اس کے چہرے کے خد و خال جلدی جلدی گردش کرنے لگتے ہیں' وہ یار باش قسم کا انسان ہے محلے بھر کے شاعر' ادیب' صوفی اور نوجوان ہڑدنگے اور شہر خبرے اس کے یہاں جمع رہتے ہیں' مجھے اس کے افلاس کی خبر ہے اس کے یہاں جب بھی بہ امر مجبوری و دلداری کھانا کھایا تو گلے سے بمشکل اترا اور پیٹ میں دیر تک گرانی کا سبب بنا رہا کیونکہ مجھے اس کی نہوت کی کیفیت ڈھیر کیے دے رہی تھی' لیکن وہ ہے کہ سب کچھ قربان کر دینے کے لیے بے تاب رہتا ہے اور کل کی پروا نہیں کرتا حالانکہ عیال دار انسان ہے۔

اس نے بیماری کی وجہ سے وقت سے پہلے پنشن لے لی' اس عمر میں انسان کڑوا اور سخت ہو جاتا ہے' ذرا ذرا سی بات پر اس کا چڑچڑا پن ابھرنے اور زبان اول فول بکنے کی عادی ہو جاتی ہے اور یہ

اسی پر نہیں بلکہ انسان کی عمر جب اتار پر آتی ہے تو ضبط و ادراک کم اور تلخی زیادہ ہونے سے انسان غلیل مارے کوے کی طرح ہو جاتا ہے اور پھر زندگی سکون و آرام سے بسر نہیں ہوتی مگر واحد عجیب و غریب انسان ہے وہ گالی کا عادی نہیں لیکن گھٹن اس کے چہرے سے نمودار ہو جاتی ہے اس وقت وہ قابل رحم معلوم ہوتا ہے' وہ ایک حساس ادیب ہونے کے باوصف ایسا ضبط اور قاعدے کا آدمی ہے کہ خواہ مخواہ اس سے محبت کو جی چاہتا ہے' ابھی پچھلے دنوں وہ ایک بڑا اہم انتخاب کر رہے تھے جس کے متعلق مجھے لکھا بھی تھا اب کراچی جاؤں تو پتہ لگے۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے کامیاب کرے۔ آمین

سلہری

شملے کے مشاعروں میں جناب سلہری سے بھی ملاقاتیں رہتی تھیں' اس وقت یہ آج کی طرح قلم کے دھنی نہیں تھے لیکن ان کی منہ زور صلاحیتیں گونگی بھی نہیں تھیں' آج وہ پاکستان کے مشہور اخبار نویس اور موقر صحافی ہیں' ملک کے صحافیوں میں وہ اپنا ایک وقیع مقام رکھتے ہیں۔ ان کا قلم بے باک اور تحریر مردانہ انداز کی ہوتی ہے' ویسے بھی دوستوں کے دوست اور ملنسار ہونے کے علاوہ صاحب بصیرت انسان ہیں خدا نے انہیں بلا کا حافظہ اور تخلیقی دماغ عطا فرمایا ہے اور خدا کا یہ انعام ان کے جتنے پر اور بھی بلاغت آثار ہو جاتا ہے' خدا انہیں عمر طویل عطا فرمائے وہ ایک عظمت ہیں قلمی دنیا کی!

شعراء

میر افق کاظمی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، رئیس امروہوی، شور (علیگ) عبدالکریم ثمر اچھروی، حبیب جالب، شہزاد احمد شہزاد، مظفر وارثی، سیف زلفی، اقبال ساجد، فیض جھنجھانوی، خورشید خاور، کلیم عثمانی، ضمیر فاطمی، ثاقب سلمانی، رشید قیصرانی، اکبر حمیدی، عبداللہ منتظر، نادم سیتاپوری

میر افق کاظمی امروہوی

افق کاظمی صاحب ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی لیکن ان کی عمر نے ان کے اعضا کو بڑی سختی سے توڑ مروڑ کے رکھ دیا ہے۔ وہ ملتان میں ایک دارالعلوم میں ہیں اور یوں سمجھئے کہ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ پرانی تہذیب کے بزرگ ہیں جب انہیں ان کے معیار کے مطابق معاشرہ نہ میسر آئے تو صرف گھبراتے ہی نہیں ان پر ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے، وہ مدت سے مریض چلے آ رہے ہیں اور اس کا سبب یہی ایک صدمہ ہے کہ اسلامی اقدار پامال ہو رہی ہیں اور لوگ اخلاق سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اور اس ضیق میں وہ اکیلے نہیں بلکہ قدیم طرز معاشرت کا ہر آدمی اس گھٹن میں مبتلا ہے، افق صاحب کی نظم و نثر پر کئی کتابیں ہیں، بہت سے پمفلٹ اور کتابچے تو میری نظر سے بھی گزرے ہیں، کاش ان کا کام ایک جگہ اکٹھا ہو کر چھپ جائے۔

حفیظ جالندھری

جناب حفیظ جالندھری پرانے اور تجربہ کار شاعر ہیں مسلمانوں میں ان کی مقبول کتاب ''شاہنامہ اسلام'' ان کا عظیم کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب ''نغمہ زار'' ان کے گیتوں، نظموں اور غزلوں کا اچھا مجموعہ ہے، اگر نگاہ تعمق سے دیکھا جائے تو جناب حفیظ جالندھری اصل میں گیت الاپتے ہیں تو گیت کے بول الگ اور موسیقی کا جادو الگ اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے۔
''نغمہ زار'' کے دور میں حفیظ صاحب نے غزلیں بھی خوب خوب کہی ہیں لیکن ان کا فن غزل

گوئی کی تکمیل سے پہلے محراب نشین ہو گیا اور یہ غزل سے دامن چھڑا کے الوہیت کے سائے میں گم ہو گئے' انہوں نے اپنے اسی دور اعتکاف میں بھی غزلیں اور گیت کہنے کی کوشش کی ہے' لیکن وہ مولوی مدن کی سی بات نہ آ سکی۔

مگر جیسے فن طب کو اب تک ماء اللحم اور چھالا ڈالنے والی دواؤں نے زندہ رکھا ہے اسی طرح حفیظ کو اس کی نظم ''رقاصہ'' اور ''ابھی تو میں جوان ہوں'' نے دائرہ خمول میں نہیں جانے دیا اور آج تک وہی دو نظمیں نوجوانوں کی دل بستگی کا باعث ہیں البتہ ''شاہنامہ اسلام'' کا احترام زبانیں سی دیتا ہے اور داد و تحسین کے بجائے درود و سلام کی آوازیں گونجتی ہیں۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ماہر القادری

ماہر القادری سے تقسیم سے پہلے مشاعروں میں سیکڑوں ملاقاتیں رہی ہیں اور قربت بھی میسر آئی ہے وہ دوستوں میں یار باش اور دشمنوں میں تیغ بے نیام ہیں جناب صابر دہلوی مرحوم اور تخشب جارچوی مرحوم کے ساتھ جو جو ہنگامے رہے اگر انہیں تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک کتاب ہو جائے گی لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔

جناب ماہر اب تو نظم اور نثر دونوں میں ماہر ہیں اور پھر قدیم زاویہ نظر سے تنقید کی طرف بھی جھکاؤ ہے لیکن ان کے طرز تنقید نے کئی لوگوں کو قابل توجہ بنا دیا ہے نہیں معلوم یہ ان کی توجہ طلبی ہے یا سازش؟

جناب ماہر کے منظومات کی کئی کتابیں چھپ کر خراج تحسین لے چکی ہیں۔ نثر کی ابھی کوئی قابل ذکر کتاب ان کے قلم سے نہیں نکلی' حلانکہ حیدر آباد دکن کے بعد یہ جس روش پر گامزن ہیں اس رخ پر سیکڑوں عنوان اور مسائل حیات تشنہ اظہار ہیں اور موجودہ معاشرے کو ان کی ضرورت بھی ہے وہ اسلامی جماعت کے حامی تو ضرور ہیں لیکن اس رخ پر ان کا کوئی کارنامہ ابھی عالم آشنا نہیں ہوا۔ اور یہ شاید خساست تو نہیں مگر احتیاط ضرور ہے۔

ان کے دوست اور شباب کے ساتھی صابر دہلوی مرحوم اور تخشب مرحوم کے متعلق بھی ان کا

کوئی خاص مضمون نظر سے نہیں گزرا' علاوہ ازیں اگر جناب ماہر اپنے اسفار پر بھی کتاب لکھیں تو سیکڑوں ادبی معرکے سامنے آئیں گے اور اس دور کے ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا' اگر مولانا یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو ان کی معیت میں جو میں نے سفر کیے ہیں ان پر مجھے کتاب لکھنا پڑے گی۔

جب میں دہلی جاتا تھا تو جناب صابر دہلوی اور نخشب جار چوی وغیرہ سے ملاقتیں رہتی تھیں بیسیوں مشاعروں میں ہمسفری رہی' نخشب نے اپنی یادگار ایک مجموعہ کلام چھوڑا' وہ اس کی زندگی بھر کی کاوش کا سرمایہ ہے' ابھی وہ ادب کے راستے میں تھا کہ اسے فلم انڈسٹری نے اچک لیا' اس کے بعد موت کی زد پر آ گیا لیکن صابر دہلوی کے کلام کا پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا کیا ہوا وہ اپنا گفتہ اپنے سینے میں لے گئے یا دوسرے سفینوں میں چلا آ رہا ہے صابر نخشب سے عمر میں بھی بڑے تھے اور زود گوئی کے باوصف شعر بھی اچھا کہتے تھے۔

رئیس امروہوی

رئیس امروہوی کراچی کے اہل قلم حضرات میں نمایاں حیثیت اور عمیق مطالعہ کے انسان ہیں۔ ان کی شاعری معاصرین سے الگ رنگ رکھتی ہے جس میں علم اور اظہار دونوں گتھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں' ان کی غزل میں بھی وہی رنگ ہے جو پڑھے لکھے متین اور شریف لوگوں کا معیار کہا جاتا ہے' ان کی نظمیں بھی معاصرین کے انداز سے جدا شان رکھتی ہیں۔ جن میں کہیں بھی عجز کا پہلو نہیں ابھرتا اور اب تو انہوں نے فکر و خیال کو گیان دھیان کی طرف موڑ دیا ہے اور ان کی تحریر و تقریر میں مابعد الطبیعیاتی اشارات و کنایات کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے لیکن ان کے اس رنگ میں متین اور سنجیدہ قسم کے لوگوں کو تو سامان تسکین ملتا ہے لیکن نوجوانوں کو ان کی توقعات کے مطابق مواد کم نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عمر میں نوجوانوں کے لیے تفنن کا سامان بہم پہنچانا خود سے شرمندہ ہونے کے مترادف ہے' نوجوانوں کے جذبات کو تو نوجوان شاعر ہی کچھ دے سکتے ہیں لیکن انقلابی شاعری جو متحرک شاعری ہے بیدار قسم کے نوجوانوں کو ٹھوکے دیتی اور ادبی یلغار کی سمتیں متعین کرتی ہے' دیکھا جائے تو یہی تعمیری بات ہے اور پھر رئیس صاحب تو ایسے قادر الکلام شاعر ہیں کہ وہ جس

رخ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، نئے آدمی معلوم نہیں ہوتے اور ہر جہت سے پختہ کار اور مرد میدان نظر آتے ہیں، ہمیشہ ان کے پیش نظر معاشرہ رہتا ہے اور وہ اس کی فلاح و بہبود پر ہی سوچتے ہیں ان کے کلام میں فکر اور برجستگی ایسے توازن کے ساتھ ملتے ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کو مسلمات کے خانے میں لے آتے ہیں، جناب رئیس امروہوی کے ٹکر کے فن کار اور دانشور ہمارے ملک میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ رئیس صاحب، صاحب تصنیف بھی ہیں اور صاحب تبلیغ بھی، میری نظر میں ان کی اخلاص کیشی بھی مسلم ہے۔

منظور حسین شور علیگ

جناب شور علیگ کو میں ناگ پور سے جانتا ہوں، وہ علی گڑھ کے تربیت یافتہ ہیں اور مشاعروں میں اپنے خاص ترنم سے شعر پڑھتے ہیں، دوسرے شاعروں کی طرح ان کا ترنم گانے کی صف میں نہیں آتا وہ تو ایک لحن ہے یا ایک آہنگ! وہ فکر و خیال کے اعتبار سے متوسط دور کے انسان ہیں اور بحر و قوافی کے گھیر سے آگے نہیں نکلتے مگر ان کے تصورات و نظریات رو بہ جدیدیت ہیں۔

وہ ترنم سے ضرور پڑھتے ہیں لیکن تاثر ان کے فکر و خیال ہی دیتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ترنم کے افسوں اور آواز کی انی سے ان کے شاعرانہ تیر و نشتر کا رخ دل ہی کی طرف رہتا ہے، میرے خیال سے یہی شاعری ہے جس میں نغمہ پسند اور فکر جو دونوں مطمئن رہتے ہیں۔

وہ نہایت شریف اور جذباتی انسان ہیں اور یہی تخصیص ان کی شاعری میں رنگینی کا نام پاتی ہے وہ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ کرنٹ لٹریچر کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسا انسان نازک مزاج بھی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ادب کے قدیم و جدید نظریات سے آگاہ ہو جاتا ہے اور غلط بات سن کر اس میں چپ رہنے کا بوتا نہیں ہوتا، یہ نازک مزاجی اسے معاشرے کے مطالب کا نہیں چھوڑتی اور وہ صرف علمی ادارے کا پرزہ ہو کے رہ جاتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کے علمی ادبی ادارے عدل و اخلاق سے دست بردار ہو گئے اور جستجو سے بغاوت کر چکے ہیں۔

عبدالکریم ثمر اچھروی

ثمر صاحب مولانا سیماب کے تلامذہ سے ہیں اور خوب شعر کہتے ہیں' وہ شاعر سے زیادہ مسلمان ہیں' اس لیے ان کے یہاں نعت کی پاکیزگی ان کا طرہ امتیاز ہے وہ چونکہ صاحب احساس انسان ہیں اس لیے ان کے یہاں اصیل جذبات اور احترام دونوں مل جل کر حسن پیدا کرتے ہیں' ثمر صاحب کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں- ان کے جذبات عمر کے ساتھ نکھرتے جا رہے ہیں' وہ دوستوں سے وفا کرتے ہیں اور فن کے شیدائی ہیں' جب عمر ضعیفی کے برزار میں آتی ہے تو انسان لڑکھڑا جاتا ہے مگر ثمر صاحب کی تخلیق کاری بالکل جوان اور تازہ دم معلوم ہوتی ہے- بحیثیت انسان وہ پرانی روایات کے آدمی ہیں اور بے حد متواضع! روزی اور مشغلے کے اعتبار سے وہ پہلے ریلوے کے کسی کارخانے میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے وہاں سے فراغت کے بعد طبابت اختیار کر لی اور شعر کے ساتھ حکمت کا نہایت موزوں پیوند لگ گیا خدا عزائم میں استقامت اور ایمان میں استحکام عطا فرمائے-

حبیب جالب

زرد شلغم جیسا رنگ' صحرائے عرب کی طرح کھوپڑی' پیشانی سے گدی تک چندیا صاف کچوری کی طرح گال اور پائپ کے تمباکو کی تھیلی کی طرح دہن' من موجی قسم کا انسان بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنے لپ جھپ کرتا جب وہ ٹی ہاؤس کی طرف جاتا ہے تو قابل دید منظر ہوتا ہے- کسی کی ہنسی اڑائی' کسی پر پھبتی کسی' کسی پر آوازہ لگایا کہیں میز پر کوئی لطیفہ چھوڑا' کہیں چلتے چلتے چٹکلا داغا غرض کہ یہ شخص اپنی دھج کا اکیلا انسان ہے-

سماج کی بے راہ روی ہو یا حکومت کی لغزش یہ اپنے گیتوں اور نظموں میں بڑی دیدہ دلیری سے رگیدتا اور صاف گوئی سے طنز وطعن کے علاوہ دل خراش تنقیص کرتا ہے-

سیدھے سادے غریب اور مخلص قسم کے انسان اسے انسان دوست خیال کر کے اس سے دکھ سکھ میں مشورہ بھی لینے لگتے ہیں- ان بے چاروں کو کیا خبر کہ یہ تو خود اپنے گھریلو ماحول کے غم میں رندھا پھرتا ہے اور جب اس کی ہڈم کورنمنٹ اپنے الاؤنس کا تقاضا کرتی ہے تو دوسروں کی جیبیں

نئو لنے کی نوبت آ جاتی ہے-

حبیب جالب کچھ اپنے کلام اور کچھ ترنم کے باعث مشاعروں اور جلسوں میں مقبول ہے' جب وہ کوئی غزل یا گیت الاپتا ہے تو موسیقی کی فنی باقاعدگی اسے اور بھی سجا دیتی ہے' وہ کہیں سروں سے باہر نہیں ہوتا- مطالعے کا آدمی نہیں مگر اس کا سماعی اکتساب اس قدر گہرا ہے کہ اس کا یہ نشیب نمایاں نہیں ہوتا-

جالب ایک بے ضرر انسان بھی ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول کو مغموم نہیں ہونے دیتا' اس میں آواز و ادا کی نقل کا اس قدر ملکہ ہے کہ جب وہ اپنے اس فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو ماضی کے مشاعروں کو شاعروں سمیت حال کے ماحول میں کھینچ لاتا ہے اور سامعین و ناظرین عش عش کر اٹھتے ہیں' اس کی شاعری کے دو مجموعے مکتبہ کارواں کچہری روڈ سے چھپ کر مقبول عوام ہو چکے ہیں' وہ مخنتی بھی ہے اور کمزور طبع بھی! پچھلے دنوں جب وہ جیل میں گیا اور اس پر قتل کا الزام لگایا گیا تو صرف مجھے ہی نہیں عوام میں سیکڑوں انسانوں کو صدمہ اور حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچا ہے-

جالب کے طریق فکر میں انحطاط نہیں اور ابھی تک اس کی روح میں وہ شعلہ ہے جو عموماً سکون کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے اور امن اس پر اعتماد نہیں کرتا- بعض اوقات جب اس کا کیسہ خالی اور جسم بے کیف ہوتا ہے تو اس کی آواز میں ایسا درد آ جاتا ہے کہ روح میں سناٹے بھر جاتے ہیں اور ہر شخص اس کی سوز میں لتھڑی ہوئی آواز سے متاثر ہوتا ہے اس وقت اس کی چیچک روئی پسینے میں ڈوب کر بہار دے جاتی ہے- میں اسے محبت اور رحم دونوں کا مستحق سمجھتا ہوں' اس کی شاعری حقائق سے پر اور درد سے معمور ہوتی ہے' مگر اس پر دوستانہ اعتبار کیسے کیا جائے اس میں لیڈروں کی چاٹ پھرت بھی تو آ گئی ہے نا-

شہزاد احمد شہزاد

ان کے یہاں غزل میں فکر بھی ہے اور تنوع بھی اس نوجوان میں پھولنے' پھلنے' بڑھنے اور پرواز کرنے کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہیں' اگر جدیدیت کی ترنگ میں یہ غلط قدم نہ ہو گیا تو اپنے معاصرین میں بڑا بانکا شاعر نکلے گا' اس کا آغاز اس کے کہنہ مشق معاصرین سے زیادہ روشن ہے'

لیکن ابھی کہیں کہیں بندشوں کے جوڑ کھڑ کھڑاتے اور الفاظ اپنی معنوی عظمتوں تک ذرا تاخیر سے رسا ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود شہزاد کا ایک مقام ہے اور اس کے اکثر اشعار اس کے تاثرات کی دستاویز ہیں' ان کے کلام کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے اور وہ ہر بلند ذوق کی میز پر دیکھا جاتا ہے' شہزاد صاحب اپنے احساسات کو الفاظ دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں' ان کے اشعار میں الفاظ و معانی کا تانا بانا مضبوط اور بے معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے فن کی عظمت اور بھی جھلکار دینے لگتی ہے' وہ شعر بھی اپنے جیسا ہی کہتے ہیں' خدا عمر دراز کرے

مظفر وارثی

اسٹیٹ بنک میں ملازم ہیں' فلمی دنیا میں بھی ان کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں اور ادبی دنیا میں بھی انہوں نے اپنی تعمیر کی نیو میں کنکریٹ بھری ہے جو کھوکھلی نہیں ان کے کلام میں ان کی اپج اور تنوع پسندی عوام و خواص میں روحوں کی ایسی غذا اور جسموں کے لیے ایسی آب و ہوا ہے جس میں تندرستی چونکتی نظر آتی ہے۔ جس مشاعرے میں یہ ہوتے ہیں اس سے شعر فہم اور نغمہ پسند حضرات دونوں مطمئن اٹھتے ہیں' ہر چند کہ ان کا مستقبل ابھی پورے طور پر سامنے نہیں لیکن اس کے باوجود وہ قد آور ہیں۔

سیف زلفی

ریلوے میں ملازم ہیں' موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق جدید غزلیں کہہ رہے ہیں ان کا تحت اللفظ زور کلام کے باعث ترنم سے کم دلکشی نہیں رکھتا اور لوگ داد و تحسین سے فضا کو لبریز کر دیتے ہیں' اس وقت یہ اپنے حسن کو سامعین سے زیادہ محسوس کرنے لگتے ہیں جب سے مکتبوں کا رواج بند ہوا ہے بنیادی اور اساسی علم اٹھ گیا اس لیے مکتبی اغلاط سے نئے لوگ بہت کم بچتے ہیں لیکن سیف زلفی کے سامنے لوح مستقبل ہے یہ اس پر اپنے لیے جو چاہیں کندہ کر لیں: میں اس نوجوان کے لیے دعا گو ہوں۔

اقبال ساجد

اقبال ساجد یوں تو تقسیم کے جوار بھاٹا میں انسانی سمندر سے نکلا ہوا کالا جھینگا معلوم ہوتا ہے سر کے بال موٹے' گہرا سرمئی رنگ بڑی بڑی چمکدار آسیب زدہ سی آنکھیں چہرے پر مالیخولیا کے آثار جو ہیولا عموماً اس احساس برتری سے ابھرتا ہے جو احساس کمتری کو چھپانے کے لیے عمل میں آتا ہے۔

اقبال ساجد سگریٹ کا ایسا دھتیا ہے کہ الامان والحفیظ' کیسی محفل اور سوسائیٹی کیوں نہ ہو وہ دوسرے لوگوں کے سگریٹ اٹھا کر سلگا لیتا ہے اور ادھر ادھر کے لوگ اس کی اس حرکت سے شرمندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ شاعرانہ برادری کا ایک فرد ہوتا ہے' میں نے اسے کئی بار ٹوکا' ڈانٹا ڈپٹا مگر وہ ایک کھسیانی ہنسی ہنس کر کسی دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے' یہی عالم اس کا چائے کے معاملے میں ہے' شاعر یا ادیب ہونا شرط نہیں' وہ جہاں ذرا سی شناسائی ہوئی فوراً چائے طلب کر لینا اس کے لے عام سی بات ہے۔

لیکن ان تمام باتوں اور حماقتوں کے باوجود وہ شاعر ہے اور اپنی ڈگر کا تنہا آدمی۔ اس کا ایک خاص رنگ اس کی ذات کے دائرے تک محدود سہی' مگر اس کا انداز کلام اپنی دھج الگ رکھتا ہے اس کا یہی وصف ہے جس نے اسے اس کے نشیبوں سمیت برداشت کے لائق رکھا ہے اور اس کی اس متعفن پستی کو درگزر کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصلاح کر لے اور مطالعے کا ہو جائے تو کار آمد شاعر ہو سکتا ہے' لیکن لونڈھیار کی داد و تحسین نے اسے ایسا غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اب وہ کھانے کمانے کو بھی شاعرانہ مسلک کی توہین خیال کرتا ہے' تساحل اس کی فطرت میں داخل ہو گیا' مجھے ڈر ہے کہ اس کی یہ سہولت پسندی اسے دوسروں کے لیے ناقابل برداشت نہ بنا دے وہ جس عالم میں ہے اسے ابھی ناقابل رحم خیال کرتا ہوں اور اس کی شاعری کا مداح اس لیے ہوں کہ اس کا انداز بیان جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی ہے تخیل و تصور عامیانہ اور ارزاں سہی لیکن اس رنگ میں وہ تنہا نظر آتا ہے' اگر چہ اب اس کی روزی کا دارومدار اس کے قلم تک محدود ہے لیکن وہ اس پر اکتفا کر گیا جو اچھی بات نہیں ہے اور اب تو اس کا جثہ بھی محنت و مشقت کے قابل نہیں رہا' رہا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا معاملہ

وہاں پہلے ہی سے گروہ بندی اور حلقہ سازی کا رواج چلا آ رہا ہے۔

میں اس سلسلے میں جناب ندیم قاسمی کو بڑا ہی جگر دار انسان سمجھتا ہوں جو اقبال ساجد کو اچھا شاعر سمجھنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں اپنی روش نہیں بدلتے اور اسے تحریر و تقریر میں جگہ دیتے ہیں۔ جزاہ اللہ فی الدارین خیرا

فیض جھنجھانوی

جناب فیض جھنجھانوی کو تو میں کاندھلے ہی سے جانتا ہوں' وہ مولوی ضیاء الاسلام کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ شریف انسان اور بڑے قاعدے کے شاعر ہیں' دہلی میں تو ان کی فیکٹری سے نہ جانے کتنے شاعر نکلے ہوں گے یہاں بھی اس چشمے سے کئی تشنگیاں سیراب ہو رہی ہیں' دہلی میں جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی ان کے اس قدر مداح تھے کہ جب وہ تعریف کرنے پر آتے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے انہیں اپنی لسانی سادہ کاری میں یہ بھی خیال نہ رہتا کہ میں جو کچھ بکا رہا ہوں اس سے میرے ممدوح کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ دہلی میں بعض اچھے اور پڑھے لکھے لوگ خواجہ صاحب کے یہاں جاتے ہوئے گھبراتے تھے اس لیے کہ خواجہ صاحب جب کسی کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو اساتذہ کرام کو بھی اپنی برہنہ گفتاری کی زد میں لے لیتے ہیں' گویا ایک فیض جھنجھانوی کے کئی بے فیض درپے آزار تھے اور فیض تھے کہ سیدھے سجاؤ استادی کی چکا چوند میں چلتے رہے' ماحول کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا! نتیجہ یہ ہوا کہ دور حاضر کے ادب کا کارواں منزلوں نکل گیا اور مداح و ممدوح دونوں جمنا پار کے لٹے پٹے قافلے کے ہراول میں رہ گئے' جو سپاٹ راستوں اور شیشے کی طرح چمچماتی سڑکوں پر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔

حالانکہ یہ دونوں ٹھس اور گٹھل ذہن کے انسان نہیں تھے' لیکن خواجہ محمد شفیع صاحب الفاظ کی تراش خراش کے طوطے مینا اڑاتے رہے اور فیض بے چارے اپنی سادگی اور فنکاری کے سرور میں پکی آبادی کے تکیے سے باہر نہ آ سکے۔ میں نے کئی بار خواجہ صاحب سے بھی کہا اور فیض صاحب کو بھی اس رفتار کے خسارے سے آگاہ کیا مگر انہوں نے میری معروض کو قابل اعتنا نہیں گردانا' فیض صاحب نے عدیم الفرصتی کو آڑ بنایا اور خواجہ صاحب ایک بے نیازانہ اونہہ کہہ کے رہ گئے۔

خورشید خاور

گہرا گندمی رنگ، چھریرا بدن آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک جوان کی شخصیت کی ترجمان ہے، خوش لباسی کے ساتھ ان کی خوش خلقی لوگوں کو اور بھی گرویدہ کر لیتی ہے اور ہمیشہ اسی ٹھسے سے رہتے ہیں غالباً یہی خوش ذوقی کالج کے طالب علموں میں بھی مقبول رکھتی ہے۔ ان کے شاگرد نہ ان سے بے تکلف ہیں نہ مرعوب بلکہ ان کی شخصیت کا ایک تاثر ہے جو مختلف اٹھتی ہوئی جوانیوں کے غول میں عزت اور احتشام کی برقراری کے ساتھ خدمت خلق پر مصر رکھتا ہے۔ جسے خاور صاحب معلمی نہیں عبادت گردانتے ہیں۔

خورشید خاور صاحب نظم ونثر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے سینے کا علم تلامذہ کے سینوں میں انڈیلنا چاہتے ہیں جو استاد کی سب سے بڑی کامیابی ہے، ان کا قول ہے کہ جو اپنے اساتذہ کا ادب نہیں کرتا اسے کسی سے ادب کرانے کا حق حاصل نہیں، غالباً یہی سبب ہے کہ ان کا ہر شاگرد حفظ مراتب سے آگاہ ہے اور آج کل حفظ مراتب ایسا وصف ہے جو بڑے بڑے عالی خاندانوں کے بچوں میں مفقود ہے مگر یہ بچوں کا قصور نہیں بلکہ ماحول کا تقاضا اور وقت کا ایما ہے جس کی آواز اور ہر ادا آدمی کو متوجہ کر لیتی ہے، تیسرا سال ہے جب میں کراچی گیا تو وہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا مواد فراہم کر رہے تھے اور دن رات پوری قوت کے ساتھ تیاری ہو رہی تھی، وہ ایک شریف خاندان کے شریف نمائندے ہیں اور شعر و ادب میں ان کی مشق و مزاولت انہیں محترم رکھتی ہے۔

کلیم عثمانی

ادب و شعر کی دنیا میں قدم رکھا ہی رہا تھا، اور اس کی شہرت کی کونپلیں ابھی زردی سے سبزی میں تبدیل نہیں ہوئی تھیں کہ نئے دور کے بدلتے ہوئے رجحانات نے اسے فلم انڈسٹری کی طرف کھینچ لیا، وہ اب فلمی گانے لکھ رہا ہے اور خوش ہے اگر وہ رنگ و نغمے کے سیلاب اور دولت کی جھلک کے فریب میں خود سے غافل نہ ہو گیا تو ادب میں اس کا ذکر ممکن ہے سنا ہے کہ وہ آج کل اپنی ذاتی پکچر بنانے کی فکر میں ہیں، خدا کامیاب کرے اب وہ ایک عیال دار انسان ہے، کہیں کہیں کسی کسی مجلس میں

ملاقات ہوتی ہے تو اس کے کلام میں مرجھاہٹ نہیں اور آواز پر باسی پن کا شبہ نہیں ہوتا، فلمی دنیا سے منسلک رہ کر یہ بات کارنامے سے کم نہیں۔

ضمیر فاطمی

ایک عرصہ تک تو ضمیر فاطمی امتحانی مصروفیات میں رہا پھر ادب میں شہرت کے زینے پر پاؤں دھرا ہی تھا کہ اس کی معاشی الجھنوں نے اسے اردو ڈائجسٹ کے ادارے سے منسلک کر دیا، مسلسل شب و روز کی محنت شاقہ اور کثرت کار سے اس کی صحت اچھی نہ رہی اور ظاہر ہے کہ غیر صحت مند انسان ایک تجارتی ادارے میں کب تک رہتا، گردوپیش کے حالات نے اسے استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔

اس کی زندگی کی مصروفیات نے اسے جتنی فرصت دی اس کے اعتبار سے جہاں تک شعر کے معیار اور ترنم کے افسوں کا تعلق ہے سیکڑوں برخود غلط شعراء سے نہیں لچتا، اور شانہ بہ شانہ چلتا ہے، دیکھیے اس کی معاشی گرفت کہاں تک اسے پرواز کی سہولتیں دیتی ہے جبکہ ایک کنبے کی کفالت ہے اور وہ تنہا کفیل! مگر اس میں شعری صلاحیتوں کی کمی نہیں اب فرصت پر بات ہے، گردوپیش کے حالات بھی شاعرانہ طبیعتوں پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اب دیکھیے جناب ضمیر کہاں تک حالات سے ساز باز کر کے کہاں تک ادب سے وابستہ رہتے ہیں۔

ثاقب سلیمانی

ثاقب سلیمانی ان کا نام عبدالواسع ہے اور ثاقب سلیمانی کے قلمی نام سے ادب میں متعارف ہیں، یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو چنیوٹ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم تو مقامی ہوئی اور مونٹ مورنسی کالج شاہ پور صدر سے گریجویشن کیا، ۱۹۴۰ء میں محکمہ آبکاری و محصولات میں ملازم ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں اکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ان کے دادا محمد بخش نور صاحب دیوان اور والد عبدالعزیز صاحب فارسی کے نغز گو شاعر تھے۔ اس لیے یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ثاقب سلیمانی صاحب کو ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ یہ شروع شروع میں جناب خیال مراد آبادی سے مشورہ سخن کرتے رہے، ان کے بعد صرف شوق کو رہنما بنایا جن دنوں مولانا تاجور نجیب آبادی ''ادبی دنیا'' نکالتے تھے میں اس میں ان کا کلام پڑھتا تھا، اور

ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ شاعری سے دیگر فنون کی طرف راغب ہو گئے تھے' انہیں مصوری' خطاطی' ناخن نگاری اور نجوم و جفر جیسے فنون میں دخل ہے اور اسی راستے کے شواہد سے وہ روحانیت کی طرف چلے' انہوں نے ہر دور میں اپنے دور سے آگے کی بات کی' محبت کے ان عملیات کو جو طالب و مطلوب کے لیے موثر تھے انہوں نے تند خو اور مرکھنے چوپاؤں کے علاوہ درندوں پر بھی آزمایا اور کامیاب پلٹے' اسی طرح مایوس العلاج مریضوں پر عملیات کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے۔ کئی بیماروں نے شفا پائی اور کئی غبی لڑکے ذہین ہو گئے۔

جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے وہ علم سیارگان میں بھی حیرت انگیز معلومات رکھتے ہیں اور اس علمی دولت سے زندگی کو سنبھالتے ہیں ان کی زندگی بڑے بڑے حیرت ناک واقعات کا مجموعہ ہے' اگر انہیں تفصیل سے بیان کیا جائے تو شاید سینہ قرطاس دم توڑ دے۔

ان کا مجموعہ کلام ''شعارِ ثاقب'' کے نام سے زیر طبع ہے' میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ثاقب سلیمانی صاحب اپنے طلسم سلیمانی کے عمل سے کسی اور دنیا کے رستے پر گامزن ہیں' خدا انہیں کامیاب کرے' غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں تو پہروں کام کی باتیں کرتے ہیں!

رشید قیصرانی

ملتان کا ایک نوجوان شاعر ہے جو بکھری ہوئی لطافتوں کو اکٹھی کر کے ان پر عمل تجسیم کرتا ہے اور رنگ برنگے مجسمے تراش کے انہیں اشعار کا نام دیتا ہے۔

عموماً ایسے شاعروں سے فطرت آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے' بعض بعض اوقات ذہن کے دائروں میں خود بخود مختلف صورتوں سے داخل ہو جاتی ہے یا پھر آواز دے کر گزر جاتی ہے' مگر ہاتھ نہیں آتی' اس کی غیر مرئی راہیں اس کے عزائم کی غمازی ضرور کرتی ہیں جسے صرف یہ شاعر ہی پڑھتا اور سمجھتا ہے' پھر اپنے الفاظ کے مختلف سائز کے سانچوں میں ڈھالتا رہتا ہے۔

ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''فصیل لب'' کے نام سے بازار آشنا ہو گیا ہے شاعروں اور ادیبوں کی نگاہیں شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد ہیں' خدا کامیاب کرے۔

اکبر حمیدی

اکبر حمیدی عام رسالوں میں چھپتا ہے اور اس کی کتاب ''لہو کی آگ'' اس کی غزل کا معیار قائم کرتی ہے۔ اکبر حمیدی مشق و مہارت سے شعر کہتے ہیں اور اس میں بعض بعض جگہ تفصیل کو اجمال کا روپ دیتے دیتے اچھے اچھے اشعار تخلیق کر جاتے ہیں' ان کا ذہن رسا اور طبیعت لطافت پسند ہے' وہ ابھی نوجوان ہیں' اگر کوئی خاص دیوار حائل نہ ہو گئی تو وقت اور تجربے کے ساتھ ترقی کرتے جائیں گے اور ان کی تخلیقات ان کی سفارش کرتی جائیں گی' مشرب میں یہی رسم و رواج چلا آرہا ہے۔

محمد عبداللہ منتظر

یہ نوجوان گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے طبیعت نہایت مناسب پائی ہے' نہایت شگفتہ شعر کہتے تھے' بسلسلہ ملازمت دہلی چلے گئے وہاں نجانے کس طرح دماغ شعر و ادب کے بجائے تجارت کی طرف چل نکلا اور مل اونر ہو گئے' ساتھ ہی ٹھیکیداری بھی وابستہ دامن رہی' دہلی سے ملازمت سے فراغت پا کے کراچی آ گئے تھے اور اب کراچی ہی میں ہیں' انہوں نے کراچی میں اپنی کئی ایک بلڈنگیں بنالیں اور شعر و ادب سے کنارہ کرتے چلے گئے' اب بھی ان دنوں کا اچھا خاصا مواد ان کے پاس ہے اور شاید نیا بھی کچھ کہا ہو' لیکن اب یہ عالم ہے کہ بات کیجیے تو نہایت سنجیدہ قسم کے تاجر اور فن معاش کے ماہر' لیکن نزدیک سے دیکھیے تو ہر وقت جنسی عفریت ان کے حلقوم پر دانت گروئے رکھتا ہے اور جذباتی گرفت سے مجبور ہیں' حالانکہ کئی شادیوں کے نتیجے میں وہ تفکرات میں بھی رندھے رہتے ہیں' مگر جنسی معاملہ اپنی جگہ ہے' میں ایک بار کراچی ملا تو معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ راہ راست پر آرہے ہیں اور گھر کے معاملات کو بھی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں' مگر مجموعہ کلام چھپوانے کی نوبت نہیں آئی۔

نادم سیتاپوری

نادم سیتاپوری ایک قلمی مزدور ہے جس کی ساری زندگی پبلشروں کے مختلف ہتھکنڈوں کی نذر ہوگئی اور اب تک سکون کا سانس نصیب نہیں ہوا' لیکن اس جبر مشیت کے باوجود وہ مردانہ واری سے جی رہا ہے اور دوستوں میں اپنی فطری گلباری سے باز نہیں آتا' میں نے زندگی میں یہ عجیب آدمی دیکھا ہے جو نہ مصائب سے بدکتا ہے اور نہ اس کے خون میں مایوسی کی لہر دوڑتی ہے' خوش ذوق' خوش خو' خوش اوقات اور خوش مزاج انسان ہے اس کی تصنیفات و تالیفات جو تحقیقی رخ پر آئی ہیں قابل تحسین کام ہے جو ہر ادیب کو کرنا چاہئے۔

شاعرات

سعیدہ اختر حیدر آبادی، نور الصباح بیگم، کنیز فاطمہ حیا لکھنوی، بسم اللہ بسمل، وحیدہ نسیم، رشیدہ سلیم سیمیں، کشور ناہید، رابعہ نہاں، سعیدہ عروج، مظہر زہرہ نگاہ، نسیم اعظم، ثریا فخری، شفیق بانو بریلوی، سیدہ پروین فنا، بیگم طیبہ محسن، جمیلہ ہاشمی، ناصر جہاں، ثریا زیبا، بیگم فیضان، خورشید بیگم، شفیق بانو، حسنہ بیگم، حشمت آراء حجاب، عرفانہ عزیز، سلطانہ مہر، ادا جعفری

سعیدہ حیدر آبادی

دسیوں بیسیوں مشاعروں میں حیدر آباد ہی سے ملاقات رہی ہے اور ہر مشاعرے میں انہیں ایک نئے انداز میں دیکھا، وہ ترنم سے پڑھتی ہیں اور ان کی بیاض میں بھی کچھ کم کلام نہیں، اب ممکن ہے چھپ بھی چکا ہو وہ ویسے بھی اپنی اور اپنے کلام کی اہمیت کو محسوس کرتی ہیں۔

بڑی ہی متواضع اور ہنس مکھ قسم کی خاتون ہیں تقسیم ملک سے پہلے وہ خاکساروں میں بھی شامل تھیں اور غالباً انہیں خواتین میں سالاری کا عہدہ بھی ملا تھا، وہ قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتی ہیں اور ہندو ہو یا مسلمان ان کے یہاں جہاں انسانی خدمت کا سوال آتا ہے وہ فراخ دل اور فراخ حوصلہ ثابت ہوتی ہیں، پہلے تو وہ مستقل بنگلور میں رہتی تھیں اب نجانے کہاں ہوں گی

نور الصباح بیگم

ولادت رام پور

ان میں حالی خاندانی کے آثار وقرائن ہنوز زندہ وتابندہ ہیں، ذوق شعر میں انہیں غزل پر عبور ہے اور طویل طویل غزلیں سناتی ہیں، میں نے ان کی بیاض ان کے پاس دیکھی اور سب ذخیرہ قابل اشاعت معلوم ہوتا ہے، ہر چند کہ ان کا بنیادی شوق ناول نگاری ہے اور انہوں نے اس میں حتی والوسع زبان اردو کی اچھی اور قابل تحسین خدمت انجام دی ہے۔

تاریخ ادب میں نظم کا باب ہو یا نثر کا نور الصباح بیگم کو نظر انداز کرتے مورخ کو دھچکا محسوس ہوگا، نور الصباح بیگم ہر چند کہ اس دور کی خاتون ہیں جب معاشرے میں شعر وشاعری کے فن میں

بڑی احتیاط برتی جاتی تھی، لیکن انہوں نے زمانے کی روش کو دیکھ کر کاروان ادب کا ساتھ نہیں چھوڑا، یہ اور بات ہے کہ صنف نازک کی رفتار صنف نازک کی رفتار ہے۔

کنیز فاطمہ حیا لکھنوی

حیا صاحبہ لکھنو کے ایک معروف ممتاز خاندان کی خاتون ہیں، آزادی ملک سے پہلے جب میں مشاعروں میں لکھنو میں آتا جاتا رہتا تھا، کئی نشستوں میں ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ نہایت خلیق، ملنسار، اور لکھنو کے رکھ رکھاؤ کا نمونہ انہی کے یہاں پایا، نہایت سنگین شعر کہتی ہیں لیکن اب تک ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا، ان کے اشعار میں حکیم آزاد انصاری کی سلاست اور اختر شیرانی کی حلاوت معلوم ہوتی ہے۔

پچھلے سال میں کراچی گیا تو ان سے طویل ملاقات رہی وہ خورد و نوش کی طرف سے تو بے فکر ہیں لیکن ان کے فکر و عمل اور انداز سخن میں ان کی ہجرت کا کرب اور وقت کا دباؤ بولتا ہے، وہ اس وقت اپنا مجموعہ چھپوانے کی فکر میں تھیں، خدا کرے ان کی عمر کا انحطاط ان کے عزائم میں حائل نہ ہو، آمین، اگر انہوں نے اپنے مجموعے سے غفلت برتی تو لکھنوی روایات کے ساتھ اردو شاعری کی ایک روشن دھاری گم ہو جائے گی۔ جس کا ایک رخ تاریخ ادب کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

بسم اللہ بسمل صابری

بسم اللہ بسمل شعبہ تعلیمات سے متعلق ہیں اور آج کل ساہیوال میں متعین ہیں یہ خود ساز قسم کی لڑکی ہے، پہلے یہ فیروز سنز کے ادارے میں تھیں اور عموماً قتیل شفائی صاحب کی معیت میں مشاعرے پڑھتی تھیں لیکن اب ایک عرصے سے اکیلی پرواز کر رہی ہیں اور ان کی خوش طبعی، خوش آوازی، خوش نگہی اور خوش خوئی نے انہیں اور بھی ہر دل عزیز کر رکھا ہے بعض اوقات ان کی بسیار گوئی پر گمشدگی کا گمان ہونے لگتا ہے اس وقت وہ قابل رحم معلوم ہوتی ہیں۔

وحیدہ نسیم

حیدر آباد دکن کی ایک فاضل خاتون ہیں جو سائنس کے شعبے میں معلمی کی خدمت انجام دے رہی ہیں' بڑی مشاقی سے شعر کہتی ہیں' ان کے یہاں غزل اور نظم دونوں میں یکساں مشق و مہارت اور فکر و احساس کا وفور پایا جاتا ہے' میں ان سے کئی بار ملا ہوں اور انہیں خلق و مروت میں بلند دیکھا ہے ان کے کلام میں ایک مہذب جدیدیت کے پرتو جا بجا ملتے ہیں - اور رجعت پسندی کی کوئی ایسی علامت نہیں پائی جاتی جو انہیں ان کی جدت کے معیار سے گرا دے کوئی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں رجعت پسند نہیں کہہ سکتا -

وحیدہ نسیم میں نثری صلاحیتیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں' عرصہ ہو گیا میں نے کس رسالے میں کوئی ضخیم نمبر دیکھا تھا جس میں انہوں نے نسوانی زبان و محاورات کی ایک اچھی خاصی فہرست دی تھی' اس کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے اس کام کو آگے بڑھایا یا ناقدری زمانہ سے گھبرا کر رکھ دیا -

نجانے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی شائع ہوا ہے یا نہیں' جہاں تک خواتین کی شاعری کا تعلق ہے وحیدہ نسیم کا مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں' پارٹی بندی اور ادب دشمنی کی بات الگ رہی -

رشیدہ سلیم سیمیں

مجھے کئی بار مشاعروں میں اس خاتون کو سننے کا اتفاق ہوا' میں ہر بار ان کی طرف سے خوش خیال اٹھا ہوں' ان کے یہاں ان سیکڑوں شاعروں سے بلند اور قاعدے کے اشعار ملتے ہیں جو شادی کے گھوڑں کی طرح بنے سنورے پھرتے ہیں - وہ بڑے ہی اطمینان اور اعتماد سے شعر پڑھتی ہیں' بہت کم عورتوں میں یہ انداز دیکھا گیا ہے -

کشور ناہید

الفلاح بلڈنگ لاہور میں نیشنل سنٹر کی ڈائریکٹر ہیں - میں انہیں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں' یوں تو وہ پہلے بھی شعر کہتی تھیں' لیکن جناب صوفی تبسم صاحب کی تربیت نے انہیں کچھ ایسے جادوں پر گامزن کر دیا جہاں ہر پگڈنڈی نئے ٹھکانے پر دم توڑتی ہے' چنانچہ وہ قدم خیال اور رجعت پسند

معاشرے پر طنز و تنقید میں بڑے بڑے جغادریوں کے پاؤں اکھاڑ دیتی ہیں۔

ان کا مجموعہ کلام ''زیرِ لب'' انعام یافتہ مجموعہ ہے' اور مشاعروں میں بھی ان کے کلام کی انفرادیت اور دساوری حیثیت منہ سے بولتی ہے' وہ لوگوں کی چہ میگوئیوں کی پروا نہیں کرتیں اور اپنے جدیدیت کے جنون میں اپنے رنگ کو کامیابی کے ساتھ لے کر چل رہی ہیں' بلکہ کہیں کہیں تو وہ اس دورِ جدید سے بھی آگے کی نشاندہی کرتی ہیں' جو فی الحال یقین سے دور اور قیاس سے نزدیک ہے۔

رابعہ نہاں

آگرہ کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں' میں ان کے خاندان بھر سے واقف ہوں اور یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ سارا خاندان شعر و ادب کی اعلیٰ اقدار سے آگاہ ہے اور ان میں اکثر صاحبِ دیوان ہیں۔ رابعہ نہاں کو میں نے مشاعروں میں بھی سنا ہے اور نجی نشستوں میں بھی دیکھا ہے ان کی متانت میں کہیں دراز نہیں کھلتی' اور معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے مفہوم اور رابعہ نہاں کے دل میں گہرا ربط ہے۔

ان کی آواز میں ایسی دل دوز کھرج ہے کہ صاحبِ احساس کے لیے ان کا ہر شعر جان لیوا معلوم ہوتا ہے' اکثر و بیشتر ان کا وہ شعر جس میں اظہارِ غم کا پہلو ہو مجھے تو ڈھیر کر کے رکھ دیتا ہے' نہ جانے اس پر کون سا ایسا صدمہ گزرا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک درد ہو کر رہ گئی ہے۔

سعیدہ عروج مظہر

سعیدہ شعبہ تعلیمات سے منسلک ہیں میں ایک مدت سے انہیں سنتا آ رہا ہوں اور جب بھی سنتا ہوں ان کے جذبے اور لہجے میں اضمحلال نہیں پاتا' یہ اپنی عمر کے ساتھ فن میں ترقی کرتی جا رہی ہیں' کہیں کہیں تو ان کے اشعار ان کے متعلق سوچتے رہنے کا مطالبہ کرتے ہیں' یہ سیدھی سادی اور خلیق کے علاوہ مخلص خاتون ہیں' جنہیں مجلسوں میں بیٹھنے کے ساتھ مجلس آرائی کا سلیقہ بھی ہے اور آدابِ حیات بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔

بڑی مصروف زندگی ہے مگر اس کے باوصف انہوں نے اپنے ذوق کی حق تلفی نہیں کی اور شعر و ادب کا دامن نہیں چھوڑا' جس طرح بھی ہو اس کے لیے وقت نکالا ہے' محنت کسی کی بھی ہو ضائع نہیں

ہوتی' چنانچہ مظہر ادب میں ناقابل فراموش خاتون ہیں۔

زہرہ نگاہ

زہرہ نگاہ شعر و ادب کے افق پر ایک ستارے کی طرح چمکی تھیں' اس لیے اور بھی سماعت و بصارت کی دنیا میں ان کی آواز گونج گئی کہ ان کی وراثت میں ان کے خاندان کا پورا نظام شمسی اپنے انوار و برکات کی جھلکیاں دے رہا تھا' جناب علی اختر مرحوم جو خود کو حیدر آبادی لکھنے لگے تھے غالباً ان کے چچا تھے اسی طرح ان کے خاندان کے اور کئی افراد ادبی ذوق کے حامل اور شرافت کے علمبردار تھے۔

شادی کے بعد زہرہ نگاہ کی آواز چہار دیواری سے بہت کم باہر نکلی' غالباً یہ ان کے شوہر کے خانگی آداب سے متعلق بات ہے جو اس معاشرے میں ایک اچھی مثال ہے لیکن فطری عطیات و انعامات پر قدغن زیادہ مضبوط نہیں ہوتا' وہ جذبہ کسی نہ کسی رنگ میں ضرور آشکار ہو کر رہتا ہے۔ اگر شعر و ادب کے جذبات کی کسی صورت سے دربندی بھی کر دی جائے تو وہ جذبات بچوں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور پھر اس کی آواز اور بھی بلند ہو جاتی ہے' نہ معلوم زہرہ نگاہ کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں اگر نہیں چھپا تو کم از کم یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

نسیم اعظم

لیڈی ڈاکٹر نسیم اعظم' صاحب دیوان شاعرہ ہیں اور شعر گوئی میں اچھا خاصا ملکہ رکھتی ہیں' ڈاکٹری کے ساتھ تخلیق شعر' یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے' لیکن یہ خصوصیت ناپید نہیں' البتہ اگر وہ اپنے بدیہہ گوئی کے دعویٰ میں بلند بانگ نہ ہوں تو ان کی بات زیادہ موثر ہو سکتی ہے کیونکہ بدیہہ گوئی میں شعر سے معنوی عمق چھن جاتا ہے اور پایاب معانی شعر کی قیمت کم کر دیتے ہیں' حالانکہ وہ ترنم کے جادو سے اپنے شعر کو مقبول کرنا جانتی ہیں لیکن میں پھر بھی صنف نازک کے لیے بلند بانگ ہونا اس کی نسوانیت کی نزاکت کے شایان شان نہیں سمجھتا' نغمہ اپنی قیمت الگ رکھتا ہے اور شعر کا معیار جدا چیز ہے' شعر کی روح ہی تو نغمہ کو بامعنی بناتی ہے۔

ثریا فخری

ثریا فخری کے والد جناب فخری پانی پتی سے جناب صادق مصور نے آزادی ملک سے برسوں پہلے میری ملاقات کرائی تھی، وہ جناب سلیم پانی پتی کے شاگرد تھے انہیں انگریزی اور اردو زبان کے لغت پر بڑا عبور تھا' زندگی کے بڑے حصے میں انہوں نے انگریزوں کو اردو زبان سکھائی تھی یعنی میر منشی تھے اس لیے انہیں دونوں زبانوں میں قابل رشک مہارت ہوگئی تھی۔ جن دنوں میں ان سے ملا ہوں وہ ان دنوں زمانے کی قدر شناسی کے شاکی تھے جو ادیبوں اور شاعروں کی روایت چلی آ رہی ہے' لیکن اس عسرت میں انہوں نے اپنے بچوں کو جو تعلیم دی تھی وہ بڑے سے بڑا رئیس زیادہ سے زیادہ مصارف اور توجہ کے باوجود نہیں دے سکتا' یہ انہیں کی تعلیم و توجہ کی برکت ہے کہ آج ثریا گورنمنٹ کالج میں لکچرر ہیں۔ اور ان کی دوسری صاحبزادی ربیعہ فخری تعلقات عامہ کے کسی بلند مقام پر فائز ہیں' فخری کا بڑا لڑکا عرفان اللہ کو پیارا ہو گیا وہ بھی ایک نابغہ قسم کا نوجوان تھا اور صحافت میں بڑی تیز رفتاری سے منزلیں مار رہا تھا' شاید اس لیے کہ اس کی منزل کی مسافت سے اس کی عمر کا وقفہ کم رہ گیا تھا' جناب فخری بھی بہت چست شعر کہتے تھے اور افلاس کی شدت نے ان کے کلام میں تلخی کی دھاریاں ڈال دی تھیں' نہ معلوم ان کا کلام اور دوسرا کام جو انہوں نے مضامین یا تحقیق کی صورت میں کیا تھا اس کا کیا حشر ہوا۔

ثریا بھی اچھا اور شگفتہ شعر کہتی ہے اور اسی طرح ربیعہ بھی کچھ کم نہیں' دونوں بہنوں کو ذوق شعر ورثے میں ملا ہے لیکن دونوں کے مجموعے ابھی نہیں چھپے' غالباً عدیم الفرصتی سنگ راہ ہے۔ صادق مصور صاحب کے بعد میرا بھی ان کے یہاں آنا جانا ہو گیا تھا' اور وہ جناب فخری کی زندگی تک رہا' اب ثریا اور ربیعہ دونوں میرا احترام کرتی ہیں ہر چند کہ ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔

شفیق بانو بریلوی

شفیق بانو بریلوی کو میں نے سب سے پہلے ڈھاکہ میں دیکھا' اس کے بعد سے مشاعروں میں مسلسل ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور شعر و شاعری پر اظہار خیالات کا موقع ملتا رہتا ہے۔

وہ ایک قدیم معاشرے کے خاندانی ماحول سے نئی روشنی اور جدید معاشرے کی طرف دریچوں

سے جھانک رہی ہے، وہ مختلف اخبارات سے بھی منسلک رہی ہے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی رکھتی ہے، لیکن اس کے خطوط سے جو میں نے اندازہ لگایا وہ یہ ہے کہ وہ نئی نسل کے نئے قافلے کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتی ہے، مگر قدم قدم پر اسے روایات اور رسم و رواج کا خیال تیز رفتار نہیں ہونے دیتا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

(غالب)

شاید اس تذبذب کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اسلامی تہذیب اور پیغمبر کے اسوہ حسنہ سے اچھی طرح آگاہ نہیں، لیکن جس قدر بھی معلومات ہیں وہ اسے غلط راہ نہیں ہونے دیتیں، مگر دور جدید کی چم خم اس کی نگاہوں کو خیرہ ضرور کرتی ہے اور وہ ایک عجیب قسم کی ضیق میں مبتلا ہے جو اس کے کلام سے بھی مترشح ہوتی ہے۔

وہ ترنم سے شعر پڑھتی ہے، اس میں شک نہیں کہ نغمہ فن شعر کے سیکڑوں عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے لیکن میں تو اس دور میں ترنم کو شکست ہوتے دیکھ رہا ہوں، شاید اب عوام کی نظر شعر کے داخلی حسن تک پہنچنے لگی ہے اور لوگ معنوی خوبیوں کو خوبیاں گرداننے لگے ہیں، یہ بھی درست ہے کہ نغمہ شعر کا زرکار لباس ہے لیکن اگر نغمے کے ساتھ شعر اور شعر کے ساتھ نغمہ بھی قاعدے کا ہو تو اس کا جادو جان لیوا ہو جاتا ہے۔

سیدہ پروین فنا

پروین فنا کے والد ایک شریف پولس افسر تھے، حالانکہ پولس افسر کے ساتھ شرافت کا لفظ بڑی مشکل سے جھالا جا سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص پولس میں ہوتے ہوئے شریف ہے وہ صحیح معنی میں شریف ہے، اسے کوئی طاقت اپنے عقائد سے نہیں ہٹا سکتی، میرے علم میں کئی پولس افسر ایسے ہیں کہ اگر ان کے اوصاف بیان کروں تو صداقت کے پیاسے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کے لیے دوڑ پڑیں گے۔

پروین فنا ہلکا پھلکا شعر کہتی ہیں، لکن شعر جس طرح ان پر وارد ہوتا ہے وہ اسے اسی انداز سے پڑھنے پر بھی قادر ہیں ان کے والد شیخوپورہ میں پولس اسٹیشن کے انچارج تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پروین کا کلام دیکھ لیا کریں تو میں نے عرض کی کہ جس روش پر وہ چل رہی ہے چلنے دیں اس شوق میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ شاعر کی نظر اپنے کلام پر بھی دشمن کی طرح پڑتی ہے۔

ان کی شادی کے بعد مجھے پروین فنا کو سننے کا بہت کم موقع ملا ہے لیکن جب بھی اتفاق ہوا میری زبان سے اس کی کامیابی کے لیے دعا نکلی ہے۔

بیگم طیبہ محسن

محسن صدیقی صاحب کراچی کے معروف وکلاء میں سے ابھرتی ہوئی شخصیت ہیں جن کا نام مقننوں اور مدبروں میں عزت سے لیا جاتا ہے، ان کے یہاں شعر و ادب کی محفلیں بھی گرم رہتی ہیں اور سیاسی پیچ و خم کے مشورے بھی ہوتے ہیں، وہ ان راہوں سے اس قدر آگاہ ہیں کہ بڑے بڑے قائدین کرام ان سے مشورت ضروری سمجھتے ہیں اور رنگین لوگوں میں اپنی رنگین طبعی کے باعث کسی دھنتر سے کم نہیں، پھر ایک قابل تعریف بات یہ ہے کہ موکلوں سے ان کا تعلق مقدمے کی حد تک نہیں رہتا۔ بلکہ ایک ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ایک دوسرے کی مسرت و غم کا شریک کر دیتا ہے۔

ان کی اہلیہ طیبہ محسن صاحبہ پڑھی لکھی اور سلیقہ مند خاتون ہیں انہیں بھی شعر و ادب کا ذوق کم نہیں، آئے دن وہ اپنے یہاں ادبی نشستیں برپا رکھتی ہیں ان کا رجحان زیادہ حمد و نعت کی طرف ہے جو عموماً شریف اور خاندانی عورتوں کا شعار ہوتا ہے۔ ان کا یہ ذوق بتاتا ہے کہ ان کی تربیت کسی نہایت شریف اور متقی گھرانے میں ہوئی ہے وہ کفر و الحاد کے خیالات سے کوسوں دور ہیں پیغمبر خدا کے اسوہ حسنہ کو زندگی کی شاہراہ خیال کرتی ہیں، قومی اور سیاسی خدمات میں وہ اپنے شوہر کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔ غالباً اس لیے کہ اسلام نے شوہر کو خدا سے دوسرا درجہ دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ طیبہ نے اپنے شوہر کی تیوری پر بل دیکھا تو اپنے شعر و ادب کے فطری ذوق سے بھی دست بردار ہو گئیں۔

وہ کراچی سے ایک اردو کا ماہنامہ نکالتی تھیں، جس میں ان کے شعری اور نثری نمونے ملتے تھے مگر اس شوہر پرستی کا کیا ٹھکانہ ہے کہ سب کچھ قربان کر دیا! میری نظر سے بہت کم ایسی عورتیں گزری

ہیں جو اس طرح نباہ کرتی ہیں، غالباً طیبہ نے یہیں سے جنت کا سودا کر لیا ہے، خدا انہیں سکون عطا فرمائے اور اس عظیم قربانی کو قبول کرے آمین!

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی بحیثیت افسانہ نگار ادبی دنیا میں شہرت رکھتی ہیں اور معاشرے میں بھی ان کا ایک بلند درجہ ہے، جہاں وہ حفظ مراتب کی قائل ہیں وہیں خدمت خلق کا جذبہ بھی رکھتی ہیں، ان کی فطرت کی صداقت اور ترقی کے ساتھ ان کا اخلاقی توازن ان کے افسانوں میں بھی اپنا تعارف کراتا ہے۔

ادبی قسم کی نشستوں میں بھی وہ شریک ہوتی ہیں اور اپنی عادت کے مطابق حق گوئی سے بھی نہیں چوکتیں، وہ ایک اچھی ادب شعار اور خلوص سرشت خاتون ہیں ان سے مل کر میں نے ہمیشہ ایک روحانی مسرت محسوس کی ہے۔

ناصر جہاں

اب سے کئی سال پہلے میں ایک شب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا، جہاں اور کئی خواتین نے اپنا کلام سنایا، وہیں ناصر جہاں نے بھی غزل پڑھی اور میں نے داد دی۔

تیسرے روز میرے مکتبہ میں تشریف لے آئیں اور تفصیلی تعارف سے معلوم ہوا کہ وہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے خاندان سے متعلق ہیں اور ان کے خاندان کا سلسلہ مرزا ناصر نذیر فراق سے جا ملتا ہے، ان کا کلام سن کر جو مجھے استعجاب سا تھا میں اس بھنور سے نکل گیا اور ان کے فن شعر کو وراثت پر محمول کر لیا،

ان کی غزلوں کا مجموعہ کے نام سے چھپ چکا ہے، مگر نہ جانے اچانک انہوں نے خود کو ناصر جہاں کے بجائے شاعر دوحید کے نام سے کیوں متعارف کرانا شروع کر دیا، غالباً ان دنوں قاسم نوری اورینٹل کالج میں پڑھتے تھے اور غالباً وہی انہیں کالج کے مشاعرے میں لائے تھے، اس کے بعد جہاں وہ مشاعرے میں ملیں قاسم نوری بھی ان کے ہمراہ ملے، میں نے دریافت کیا کہ قاسم نوری صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے تو انہوں نے بتایا کہ میرا بھانجا ہے، قاسم نوری بھی شاعر ہیں اور میں

نے ان سے جتنی غزلیں سنیں وہ نظر انداز کردینے کے قابل نہیں نہ معلوم ان کا بھی کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں۔

عموماً بعض ذہین نوجوان معاشرے کی پستیوں سے اٹھے ہوئے دھوئیں کی نذر ہو جاتے ہیں اور پھیپھڑوں کے مریض ہو کر بہت کم تندرست رہتے ہیں، میں قاسم نوری کے لیے اس کی صحت اور ایمان کے لیے دعا کرتا ہوں۔

ثریا زیبا

لاہور میں ریگل بس اسٹاپ کے قرب وجوار میں بسا اوقات ایک نوجوان مگر پاگل عورت ٹہلتی یا خاموش کسی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی نظر آتی ہے، میں نے کئی بار لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا، ایک دن اتفاق سے میں بیڈن روڈ سے آرہا تھا اور اسے چند عیسائی عورتیں گھیرے کھڑی تھیں، یہ اس سے مسلسل سوال کر رہی تھیں اور وہ کبھی کبھی کسی سوال کا جواب نہایت شائستہ انگریزی میں دے رہی تھی، اس کے لہجے میں کھنک اور آواز میں رحم طلبی ابھر ابھر کر آتی تھی، اس کے چہرے پر بجھے بجھے خدوخال ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی مزار پر صبح کے وقت بجھے ہوئے چراغ، وہ چپ رہتی تھی تو سراپا انتظار کا عالم ہوتا تھا اور بولتے ہوئے بعض بعض الفاظ گھلے گھلے سنائی دیتے تھے اور اس کی جستجو کی عادی نگاہیں چلتے پھرتے چہروں کو ٹٹولتی چلتی تھیں۔

ان عورتوں نے اپنے سوال وجواب کے نتیجے میں یہ اخذ کیا ''اسے کسی فوجی نوجوان سے محبت تھی اور جب اس جنون کا شباب تھا تو وہ اس سے وعدہ کر گیا کہ شام کو مجھے ریگل بس اسٹاپ پر ملنا آج دونوں پکچر دیکھیں گے' یہ خوشی خوشی بن سنور کر ریگل سینما کے قریب اس کے انتظار میں آ کھڑی ہوئی اور اس فوجی نوجوان کو نہ جانے کوئی حادثہ پیش آ گیا یا میدان جنگ نے آواز دے لی، جسے آج چار برس ہو رہے ہیں، کچھ روز تو یہ اسے دن رات ڈھونڈتی پھری پھر اس کی تلاش میں اپنی ذات سے بھی کوسوں نکل گئی، یہ اس دن سے اسی بس اسٹاپ کے گرد گھومتی ہے اور نہایت خاموشی سے اس کا انتظار کر رہی ہے لیکن اس کا مقصود نظر نہیں آتا، جب اس کے بدن کے کپڑے دھجیاں ہو جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی رحم کھا کر اسے کپڑے لا دیتا ہے!

جب وہ نئے کپڑے پہنتی ہے تو فوراً ریگل بس اسٹاپ کی طرف بھاگتی ہے۔ اور ناکام ہو کر وہیں دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے' وہ بولتی نہیں اس کی آنکھیں بولتی اور گفتگو کرتی ہیں لیکن اس راہ گیروں کے سیلاب میں ان کی آنکھوں کی زبان کون سمجھے' کون کسی کا دکھ بٹاتا ہے۔

اسی انداز کے مہذب احساس اور مقدس زخم کی کسک میں ثریا زیبا کے کلام میں پاتا ہوں ہر چند کہ اس نے اپنے زخموں پر مختلف رنگوں کے پھاہوں کے سیکڑوں پرت چڑھا رکھے ہیں مگر حقائق اور جدت کی کرنیں تو پتھروں سے بھی نہیں رکتیں۔

ثریا زیبا پہلے ارمان عثمانی سے اصلاح لیتی تھی اور ان کے لاہور سے چلے جانے کے بعد جناب شفیق کوٹی کو اپنا کلام دکھایا پھر مجھ سے مشورہ لینے لگی' جب وہ لاہور سے کراچی منتقل ہوئی تو جناب اعجاز الحق قدوسی اور شاید بہار کوٹی اس کی سخن آرائی کرتے رہے لیکن ان نزدیکیوں کے باوجود کوئی بھی نہ اس کے کردار کی طرف شک کا اظہار کرتا ہے اور نہ کسی اخلاقی نشیب کی شکایت کرتا ہے' بعض پایاب قسم کے شعراء میں چہ میگوئی ضرور رہتی ہے جسے معاصرانہ چشمک کہا جا سکتا ہے اور یہ صرف شعراء تک محدود نہیں اس مرض میں تو فنون لطیفہ کا ہر فرد مبتلا ہے۔

ثریا زیبا نہایت سیدھا سادہ شعر کہتی ہے اس کے اشعار کا مفہوم معنی کا ہجوم نہیں رکھتا' وہ بلند نظر سے مشاعرے میں شعر نہیں پڑھتی' وہ اس جدید دور میں قدیم رکھ رکھاؤ کی لڑکی ہے مگر جدید اصول حیات سے بھی بے بہرہ نہیں' اس کے لباس میں ایک شریفانہ تکلف اور لہجے میں ایک دلکش جھنکار ہے' وہ اشعار کے مفہوم پر مسکراہٹوں کا جھول نہیں چڑھاتی' اسے گفتگو کا سلیقہ بھی ہے اور سلیقے پر رنگ برنگ کی جھالر لگانے کا شعور بھی!

میں جب اس کے کلام کے مجموعی رجحان کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ ایک مظلوم لڑکی معلوم ہوتی ہے اس کے کلام میں بھی کسی نامعلوم شخص کی لگن اور انتظار ہے اس کی ہر غزل میں روح سوزی کے ساتھ فراق کی ایک چیخ اور وعدہ فراموشی کا ایک دلدوز شکوہ اپنی نشان دہی کرتا ہے۔

جب وہ شعر پڑھتی ہے تو سامعین سے زیادہ خود اپنے کلام سے متاثر معلوم ہوتی ہے کیونکہ دکھ کا دہرانا بھی تو ایک دکھ ہے۔

میں نے کسی سوسائٹی میں اسے بے تکلف نہیں دیکھا' وہ مجلسی آداب سے آراستہ ہونے کے

علاوہ فنکاروں کی پرستار اور متواضع خاتون ہے' وہ معمولی معاشرت ضرور رکھتی ہے لیکن اپنے افلاس کو بے پردہ نہیں کرتی نہ اس کی کوئی ضرورت بے باک دیکھی گئی ہے۔

البتہ اس کے اشعار میں ایک کرب ہے ایک کراہ ہے جو دلوں میں ایک شک کی گنجائش تو پیدا کرتی ہے لیکن کسی کو تفصیل طلبی کی جرات نہیں ہوتی' وہ اپنی آرزوؤں کا پھولوں سے لدا ہوا ایسا مزار ہے جس کے سامنے جرات گویائی سلب ہو جاتی ہے۔

جب وہ ترنم سے اشعار پڑھتی ہے تو اس کے چہرے پر احساس اور کرب کی ملی جلی کیفیت رنگ بدلتی دکھائی دیتی ہے' مگر وہ شادی کے ذکر سے اچٹتی ہے اور بے تکلف دوستی کے دعویداروں کی بات کو بھی تضیع وقت سمجھتی ہے' لیکن جب وہ کسی جوڑے کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یا پہلو بہ پہلو گزرتے دیکھتی ہے تو بعض وقت اس کی پلکوں میں سیل سی ضرور آ جاتی ہے' جیسے اس کے سامنے زریں خوابوں کا مہنجوڈرو یا آرزوؤں کا ٹیکسلا اس کی نظر میں پھر گیا ہو! نہ جانے کون سا چہرہ ہے جس کی حاضرات کے لیے وہ اپنے سینے میں ٹھنڈی سانسوں کی اگر بتیاں سلگائے پھرتی ہے' اس کے کلام کے مجموعے کو پڑھنے میں انہیں لوگوں کو لطف آئے گا جو سینے میں گداز دل اور روح میں محبت کے مہکتے ہوئے زخم رکھتے ہیں۔

بیگم فیضان

میری کتاب ''جہان دانش'' پر جناب پروفیسر عاصی کرنالی نے ایک نشست مخصوص کی تو مجھے ملتان جانا پڑا جہاں جناب عاصی کرنالی اور ان کی بیگم کو میں نے حد درجہ مختی اور مخلص پایا' دونوں شعر و ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔لیکن مجھ سے جو اول سے ان کا رویہ رہا ہے اس کے لیے میری روح ان کی ممنون ہے اسی نشست کے سلسلے میں بیگم فیضان سے بھی ملاقات ہوئی' فیضان صاحب ملتان کے مشہور وکلاء میں ایک خاص حیثیت اور مقام کے مالک ہیں اور ان کی یہ عظمت صرف وکالت کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اور ان کی بیگم قومی خدمات کے سلسلے میں مخلص اور مختی کارکن مشہور ہیں' قوم اور ملک کی بہبود میں جو کام بھی ہو وہ اس میں پیش پیش رہتے ہیں' صبح ہو یا شام رات ہو یا دن وہ دونوں حب الوطنی اور خدمت خلق میں سرشار مختلف کاموں میں جٹے رہتے ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ ایسے

جوڑے ملک اور قوم کے لیے بہت غنیمت ہیں' بہت کم شوہر بیوی کے اور بیوی شوہر کے شوق سے ہم آہنگ ہوتے ہیں' میں جناب عاصی کرنالی کا مہمان تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی کوٹھی پر ایک علمی ادبی نشست کا اہتمام کیا اور اس میں صرف شعراء و ادباء ہی کو نہیں بلایا بلکہ شہر کے معززین کو مدعو کیا اور شام پڑے یہ نشست اختتام تک پہنچی اور لوگ سبزہ زار پر چائے کے دوران فیضان اور بیگم فیضان کے اخلاق، مروت اور ذوق کی ثنا خوانی کرتے رہے۔

خورشید بیگم

یہ خورشید بیگم صاحبہ میرے دوست نواب صدیق علی خان مرحوم کی اہلیہ ہیں' انہوں نے زمانہ ہوا ایک کالج قائم کیا تھا جہاں اب تک بدستور تقسیم علم ہوتی ہے' خورشید بیگم صاحبہ بڑا اچھا رواں اور پر معنی شعر کہتی ہیں ۱۹۴۹ء سے ان کی نظمیں چھپ رہی ہیں' شعر میں درد و سوز تو فطری بات ہے لیکن ان کے یہاں فطرت کی منظر کشی بھی قابل تعریف ہے' جہاں انہوں نے جذباتی نظمیں کہی ہیں' وہیں انہوں نے اپنی ہجرت کا کرب بھی الفاظ کے ذریعے کاغذ پر انڈیل دیا ہے' میرے خیال سے عورتوں میں بہت کم عورتوں کا کلام ان سے لگا کھاتا ہے' میں نے تو جب ان کی کتاب ''شعاع خورشید'' پڑھی تو میں نے اپنے دوست نواب صدیق علی خاں سے کہا کہ یہ کتاب اپنے وقت کے بعد چھپی ہے اور اس کی ذمہ داری آپ پر ہے یا بیگم صاحبہ پر ''شعاع خورشید'' اعلیٰ قسم کے آرٹ پیپر پر نہایت اچھی کتابت اور طباعت سے منظر عام پر آئی ہے' ایسی کتابیں لائبریری میں ضرور ہونا چاہئیں اور اس کی نظمیں کورس میں!

شفیق بانو

شفیق بانو صاحبہ بڑی مشہور ناول نگار ہیں' ماڈل ٹاؤن کی ہر مجلس شعر و سخن میں ان سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی اپنی تصنیف کی فروخت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر بھی ملتی ہیں' انہیں دیکھ کر اپنے معاشرے کی بے رحمی پر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور غصے سے کانپنے لگتا ہوں اور ان کی حالت پر رحم آتا ہے اور شرم سے سر جھک جاتا ہے کہ اللہ اللہ کیا ملک ہے اور کیا معاشرہ ہے جہاں شاعر اور مصنف کو چل پھر کر اپنی کتاب خود فروخت کرنا پڑتی ہے اور پھر صنف نازک جس کا

ویسے بھی احترام فرض ہے۔

شفیق بانو ماڈل ٹاؤن کے ایک تنگ و تار کمرے میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ جناب رشید تبسم کے قرب میں یہ درویشانہ کمرہ ہے اور اس میں یہ ایک پڑھی لکھی اور ناول نگار خاتون کسی دن مری کی مری رہ جائے گی، میں رائٹرز گلڈ کے اراکین کی توجہ ادھر مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کی نظر میں یہ خاتون بھی قابل امداد نہیں پھر نہ جانے آپ کن لوگوں پر کرم فرماتے ہیں یا آپ کے کون سے شرائط ہیں جس سے آپ امداد کے تصور تک آ جائیں۔ شفیق بانو صحیح معنی میں مستحق اور اس کی ذات پر احسان علم و ادب کی پرورش ہے جو رائٹرز گلڈ کے فرائض میں بھی داخل ہے۔ اس کا اجر خدا کے ہاتھ ہے۔

ان کے کئی ایک ناول چھپ چکے ہیں اور ایسی مصنفہ کو معاش سے بے فکری ہونا لازم تھی مگر پاکستان کے پبلشر صاحبان مصنفین کو کب سکون کا سانس لینے دیتے ہیں ان کے منہ تو انسانی خون لگا ہوا ہے۔

حسنہ بیگم

بیگم حسنہ لقمان حیدر مرحوم کی اہلیہ ہیں، تعلیمی اعتبار سے تو وہ ایم اے علیگ ہیں اور ایک کالج میں لکچرر بھی ہیں، لیکن جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے وہ نہایت اچھا شعر کہتی ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ مشاعروں میں شعر سنانے کی عادی نہیں، ہاں نجی نشستوں میں کبھی کبھی ان کا سکوت ٹوٹتا ہے، اس کے علاوہ وہ نہایت چابکدست آرٹسٹ بھی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے مناظر دیکھیے تو دیکھتے ہی رہیے، ان کے ہر کمرے میں دو چار تصویریں ملیں گی ان میں کچھ مکمل کچھ نامکمل جو مصوروں کی ادا ہے۔

ان میں خانہ داری کا سلیقہ اس بلا کا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں، انگریزی کھانے ہوں یا دیسی انہیں تمام پر قابل رشک عبور ہے، اس کے علاوہ سلائی اور کڑھائی کا تو ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے، ایسی سلیقہ شعار خواتین کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں کیونکہ مغربی تعلیم رقص و غنا کا درس تو دیتی ہے مگر زندگی کے اصول اور نباہ کے طریقے بتانے سے قاصر ہے، حسنہ بیگم کے آرٹ کے نمونے تو ملتے

ہیں لیکن ابھی ان کا کوئی مجموعہ کلام سامنے نہیں آیا' حالانکہ وہ فن مصوری سے اہم بھی ہے اور باوقار بھی!

حشمت آرا حجاب

ڈاکٹر حشمت آرا حجاب بڑی نیک اور معزز خاتون ہیں' یوں تو وہ ہومیو پیتھی میں بھی مہارت رکھتی ہیں اور اپنے خاوند ڈاکٹر محمد رفیق کے دوش بدوش کام کرتی تھیں' لیکن جب سے وہ بیوہ ہوئیں اس وقت سے ان پر ایک مستقل سوگ چھایا ہوا ہے دوسرا سال ہے وہ حج بھی کر آئی ہیں اور اب وہ بالکل درویشانہ زندگی کی طرف آ گئیں ہیں- ان کے بچے برسر روزگار ہیں اور وہ ان کی کفالت بھی کرتے ہیں' لیکن وہ اپنی کمائی کو کمائی خیال کرتی ہیں' اس لیے گھر میں ایک معمولی سا مطب قائم کر رکھا ہے' چونکہ ایک عمر کا تجربہ ہے اس لیے مریضوں کا ہجوم رہتا ہے ویسے بھی ہاتھ میں شفاء ہے-

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے' وہ بڑی زود رو گو شاعرہ ہیں اور بیس پچیس شعر سے کم ان کی کوئی غزل نہیں ہوتی اور کلام سے بیاضیں بھری پڑی ہیں ابھی چھپنے کی نوبت نہیں آئی' ان کی سب سے بڑی آرزو حج کی تھی وہ اللہ نے قبول کر لی' اب وہ ہیں اور دن رات عبادت! مگر مشاعروں میں برابر شریک ہوتی ہیں' تمباکو کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ جب تک تمباکو منہ میں نہ ہو وہ صحیح بات نہیں کر سکتیں' اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہیں' بعض وقت تو ان پر آسیب زدگی کا گمان ہونے لگتا ہے- نہایت شریف اور پاکباز خاتون ہیں-

عرفانہ عزیز

عرفانہ نام' تاریخ ولادت ۱۹۴۰ء کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا' اب سرسید گرلز کالج کراچی میں لکچرر ہیں' ایک گھریلو نشست میں صرف ایک بار دیکھنے کا اتفاق ہوا' سنا ہے انہیں اوائل عمر سے شعر و شاعری کا ذوق تھا جو اب تعلیم اور عمر کی مختلف وادیوں سے گزر کر سنورا ہے ان کے والد ملک عبدالعزیز صاحب امرتسر کے رہنے والے تھے اور اپنے دور کی ادبی اور سیاسی شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے' ان کا خاندان پنجاب سے سندھ آیا اور یہیں مستقل ہو گیا- ان میں صلاحیتیں تو کم نہیں لیکن یہ دور نہ معلوم کیا چاہتا ہے-

سلطانہ مہر

بمبئی کی رہنے والی ہیں، شروع ہی سے شعروادب کا ذوق تھا' چنانچہ خود بخود شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئیں، پہلے پہلے گیت کہے جو فطرت کا تقاضا تھا جب بچپن سے نکلیں تو غزلیں کہنے لگیں' اب تک کوئی استاد نہیں صرف اپنے اعتماد پر چل رہی ہیں' نظم کے بعد جب نثر کا ذوق ہوا تو آہستہ آہستہ اس پگڈنڈی نے صحافت کے میدان میں لا اتارا' چنانچہ پہلے روزنامہ ''انجام'' میں لکھا' پھر اب تک روزنامہ ''جنگ'' میں برابر لکھ رہی ہیں'' ''داغ دل'' اور ''تاجور'' ان کے مطبوعہ ناول ہیں اور ''پھولوں کی راکھ'' بھی انہیں کے قلم کی تخلیق ہے' اچھی مگر گھریلو قسم کی خاتون ہیں' جب شعروادب کی بات آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچانک چونک پڑی ہیں نہ جانے یہ عادت ہے یا احتیاط؟

ادا جعفری

ادا جعفری کو شعر کہتے ایک زمانہ ہوگیا' اسی لیے وہ اپنے فکروخیال کو لباس دینے میں ماہر ہوگئی ہیں' یوں تو میں ایک عرصے سے انہیں پڑھ رہا تھا لیکن ان کی کتاب ''شہر درد'' سے اندازہ ہوا کہ وہ تو ایک بلند مقام حاصل کر چکی ہیں اور ان کی یہ کتاب انعامی کتابوں میں شامل ہے' لیکن میں اس انعام واکرام کی سطح سے ہٹ کر صرف شاعری کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں تو وہ ملک کی تمام عورتوں میں شاعرانہ خصوصیات کے اعتبار سے ایک ستون کی طرح ہیں' ان کے یہاں سیدھے سادے الفاظ میں معنی کا ہجوم انہیں ملک کی دیگر شاعرات سے الگ کر دیتا ہے اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے' ابھی ان کا ایک دوسرا مجموعہ بھی آ گیا ہے' اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

میرے خودساز ساتھی

مسکین علی حجازی' زاہد ملک' محمد ابراہیم' عباس احمد عباسی' شباب کیرانوی' عطاء اللہ عطش درانی'

حنیف شاہد

مسکین علی حجازی

آباؤ اجداد تحصیل نکودر ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے اور وہیں آبائی زمین تھی برصغیر کی تقسیم سے پہلے ان کے ماموں نے ان کے والدین کو موضع شادی وال میں مستقل طور پر اپنے پاس بلالیا تھا' کیونکہ انہیں اپنے رقبے کی دیکھ بھال کے لیے ایک مخلص کی ضرورت تھی' ان کے والد کو بچوں کی تعلیم کا شوق تو تھا لیکن مسکین کے دو بڑے بھائی تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے' کچھ دنوں بعد وہاں پرائمری اسکول قائم ہو گیا اور مسکین کے بڑے بھائی اسکول جانے لگے ان کی دیکھا دیکھی مسکین بھی اسکول میں داخل ہو گیا ابھی قلم اور ذہن میں صحیح رابطہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پاکستان بن گیا اور اس سے محبت کی پاداش میں ان کے خاندان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور دشمنوں سے آئے دن معرکے رہنے لگے۔

آخر ایک دن گاؤں میں افراتفری پھیل گئی اور دشمن کی فوج کے سیکڑوں مسلح سپاہی گاؤں میں در آئے اور ان سب کو ہاتھ خالی گاؤں چھوڑنا پڑا' تن کے کپڑوں کے سوا کسی کے پاس کچھ نہ تھا' بچے بوڑھے' جوان اور عورتیں سب عسرت کے ہجوم میں مشکلات سے دوچار ہوتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے اور ادھر ادھر سے اسی قسم کے مصائب زدہ لوگ اور آملے اور جالندھر تک ایک قافلے کی صورت بن گئی اور یہ بے کسوں کا قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا' راستے لاشوں سے پٹے پڑے تھے کیونکہ یہ قافلوں کی گزرگاہ تھی' دائیں بائیں بے گور و کفن لاشیں کباڑیوں کے سامان کی طرح بکھری پڑی تھیں اور ایک ایک فرلانگ بدبو مار کر رہی تھی۔ ان سے پہلے جو قافلہ گزرا تھا وہ چورنگ کر دیا گیا تھا اور تازہ خون برساتی پانی میں زمین پر جگہ جگہ سرخ پیوند سے لگا رہا تھا۔ قافلے کا ہر شخص ناتواں اور نڈھال ہو رہا تھا' بھوک پیاس کی شدت سے چہرے فق ہو رہے تھے اور قدم گڑے جا رہے تھے

صرف پاکستان کی آرزو تھی جو کشاں کشاں اس لٹے کھٹے قافلے کو لیے چلی آ رہی تھی۔

ایک رات جب سورج رات کے اندھیرے کو شفق کا چارج دے رہا تھا یہ خستہ حال قافلہ گنڈا سنگھ والا سے پاکستان میں داخل ہوا' یہاں کچھ دنوں قصور میں قیام رہا وہاں وبائی امراض نے گھیر ڈالا تو مسکین کا بڑا بھائی راہی عدم ہو گیا اور دوسرے دن والدہ بھی بیٹے کے غم میں خالق حقیقی سے جا ملیں' عزیز و اقارب کے حوصلے پست ہو گئے کیونکہ چاروں طرف مصائب کے جھکڑ چل رہے تھے' کچھ دنوں بعد زمانے کی ٹھوکروں اور زمین کی کشش نے ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں پیر محل کے قریب ایک گاؤں میں لا پھینکا۔ مسکین اپنی ماں کو یاد کر کر کے رویا کرتا اور بھائی دلاسا دیتے اسی طرح غلطان و پیچاں دن گزرنے لگے۔

جب بھارت میں چھوڑی ہوئی املاک کا معاوضہ ملنے لگا تو تھوڑی سی زمین مسکین کے والد کو بھی مل گئی اور انہوں نے اپنا آبائی پیشہ کاشتکاری شروع کر دی' مسکین کو وہیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا مگر نہ کتاب میسر تھی نہ کاغذ' پنسل' خدا خدا کر کے مسکین نے لاہور میں آ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہی مسکین حجازی آج یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں صدر شعبہ اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف میں فن صحافت کے فنی پہلوؤں پر کتاب ''ادارہ نویسی'' ہے جو اپنی نوعیت کی قابل قدر کتاب ہے دوسری ''فن ادارت'' اس فن پر بھی اب تک پاکستان میں کوئی اچھی کتاب دستیاب نہیں مشہور مورخ باری علیگ کی کتاب ''اسلام کی تاریخ و تہذیب'' کا مسودہ بھی مسکین حجازی نے ہی مدون کیا اور تاریخ ادبیات پاکستان و ہند کی جلد نمبر ۸ اور جلد نمبر ۹ میں صحافت پر دو قابل قدر باب لکھے۔

اس کے علاوہ مضامین اور مقالات جو ''زمیندار''، ''چٹان''، ''آفاق'' اور ''کوہستان'' میں سپرد قلم کیے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے وہ اور نہ جانے کیا کیا لکھیں گے؟ اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

زاہد ملک

میں انہیں ایک افسانہ نگار صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ایک عرصے سے جانتا ہوں جب وہ تعلقات عامہ میں کسی شعبے کے انچارج تھے' انہوں نے پہلے سماجی اور سیاسی تنظیموں میں حصہ لیا صرف اس بنا پر کہ وہ جہاں تک ممکن ہو ملک کے خیر خواہ ہو کر خود کو مطمئن کریں اور عوام کے حالات من وعن نظروں سے گزر جائیں- چنانچہ پھر وہ جلد ہی کسی اور شعبے میں چلے گئے' وہ ایک دیانتدار' محنتی اور محب وطن انسان ہیں اور اسی دھن میں لگے رہتے ہیں' اصل میں وہ ادیب ہیں اور ان کے قلم میں ایک تسخیری رفتار ہے جس سے وہ تصنیف وتالیف کا بھی کام لیتے ہیں لیکن ماحول کی مصروفیت اور فرض شناسی نے ان کے اس ذوق پر پردہ ڈالا ہوا ہے' نہ جانے کب نقاب اٹھے اور کب یہ جوہر جھلکار دے- ایک دن جب مسکین حجازی سے ان کے متعلق ذکر آیا تو انہوں نے میرے خیال کی تائید کی اور اس سے مجھے بھی سکون ملا-

محمد ابراہیم

مسکین حجازی اور زاہد ملک کا ایک اور ساتھی محمد ابراہیم بھی ہے-اس نے بھی آغاز حیات بڑی عسرت سے کیا ہے لیکن مسکین حجازی اور زاہد ملک نے اس کا حوصلہ پست نہیں ہونے دیا اور اس نے دن رات کی عرق ریزی سے تعلیم مکمل کر لی' اب تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوتے اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوں گے-

محمد ابراہیم میرے یہاں آنے جانے والوں میں ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ انہوں نے تحصیل علم کے معاملے میں اپنی رفتار کم نہیں کی' وہ گزشتہ حالات کو بڑے مزے لے لے کر سناتے اور وقت بے وقت پیپلز پارٹی کی خیر وبرکت پر حاشیے لگاتے رہتے ہیں- نہایت شریف اور محنتی نوجوان ہے خدا اس کی جائز آرزو پوری کرے آمین

عباس احمد عباسی

عباسی نہایت محنتی، خوش مزاج اور فکر کے خوگر انسان تھے، وہ اور ادیبوں کی طرح زندگی سے بے نیاز نہیں تھے، خود کو زندگی اور زندگی اپنے قابل بنانے کی فکر میں رہتے تھے، یہ امروہہ کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان اپنی علمی اور طبی خصوصیات کی بنا پر معروف ہے، ان کے والد حکیم فرید احمد عباسی طبیہ کالج دہلی کے پرنسپل تھے ۱۹۴۷ء میں عباس احمد عباسی نے علی گڑھ سے اردو میں ایم اے فرسٹ کلاس میں پاس کیا-

پاکستان آ کر صحافت اختیار کر لی، وہ اپنا ایک رسالہ ''احساس'' نکالنے لگے اور روزنامہ ''مغربی پاکستان'' سے بھی وابستگی ہوگئی، اس کے علاوہ دیگر اخبارات اور رسائل میں بھی مضامین لکھتے رہے، تھل پروجیکٹ اتھارٹی میں بھی کام کیا وہ رائٹرز گلڈ کراچی کے اساسی ممبر تھے، ایک زمانے میں تو رائٹرز گلڈ کے دفتر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی انہیں کے سپرد تھی! ۱۹۶۲ء میں عباسی بی بی سی لندن پروڈیوسر ہو کر چلے گئے اور پانچ سال کے بعد واپس آئے اور ۱۹۷۰ء میں انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد ہو گئے-

وسیع المشربی کے باعث دوست نوازی ان کا خاندانی طرۂ امتیاز تھا وہ اسی انسانی خدمت کو عبادت خیال کرتے تھے- سینے میں حساس دل تھا اور اپنی قلندرانہ افتادِ طبع کے باعث آفاقی اخلاق کے آدمی تھے- ۸ مارچ ۱۹۷۵ء بروز جمعہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے- اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت عطا فرمائے- آمین!

شباب کیرانوی

شباب کیرانوی تحصیل کیرانہ، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں اور مجھے اس لیے محبوب ہیں کہ یہ خود ساز قسم کے انسان ہیں- انہیں ورثے میں مصیبت اور آلام کے علاوہ کچھ نہیں ملا- انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے دست و بازو کے بل پر کیا ہے-

مولانا تاجور کے تلامذہ میں سے ہیں، انہوں نے اپنے رسالہ ''پیکر'' کا تاجور نمبر شائع کر کے بلاشبہ ایک عظیم علمی خدمت انجام دی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ اس دور زبوں کا

میں بھی شاگردی کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

زندگی کی مصروفیات کے باعث وہ شعروشاعری کی طرف زیادہ دھیان نہیں دے سکے انہوں نے فلمی لائن میں حیرت انگیز ترقی کی ہے ان کی تمام شاعرانہ صلاحیتیں فلم کی طرف منتقل ہو گئیں جو مکالموں اور گیتوں کی صورت میں برگ وبار لا رہی ہیں اور بعض بعض کہانیاں بھی انہیں کی تخلیق ہیں' میں شباب کی محنت اور اصول کار کا مداح ہوں' ممکن ہے کہ وہ اسی عالم میں اپنا کوئی خاص کارنامہ چھوڑیں' کیونکہ اگر اس شعبے میں بھی فطری صلاحیتیں بروئے کار لائی جائیں تو یہ بھی اصلاح حال کا بے خطا ہتھیار ہے۔

شباب صاحب کے کلام کا ایک مجموعہ ''موج شباب'' بھی چھپ چکا ہے اور وہ اہل ادب کی نظر میں ہے' دن رات کی جان لیوا مصروفیت کے باوصف ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت حیرت ناک بات ہے اور مسرت کا مقام ہے کہ انہوں نے نغمہ و جمال کے سیلاب اور خط و خال کے جوار بھاٹا میں ادب کی شاہراہوں سے نظر نہیں ہٹائی۔ میری نظر میں وہ جہاں قابل ستائش ہے اس سے زیادہ قابل تقلید انسان ہے۔

بہت کم لوگ ہیں جو فلمی دنیا میں رہ کر اپنی شہرت کو داغ دار نہیں ہونے دیتے اور نیکی کے دروازے کی زنجیریں کھلی رکھتے ہیں۔ میں ان کی کامیابی اور سلامت روی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

عطاء اللہ عطش درانی

یہ ایک نہایت اعلیٰ خاندان کا قابل قدر نوجوان ہے' قابل قدر میں نے اس لیے کہا کہ میں ان کے خاندان سے بخوبی واقف ہوں' عموماً جب بڑے لوگ مصائب کے جبڑوں میں آتے ہیں تو ان کے عقائد اور ایمان کی ہڈیاں چڑ مڑ ہو جاتی ہیں اور وہ ہوش کے عالم میں نہیں رہتے' عطش درانی نے اپنے نامساعد حالات کو بڑی مردانہ واری اور سینہ سپری سے جھیلا ہے اس ملک میں بڑے لوگوں کے بہت کم بچے ایسے ہوں گے جو عطش درانی جیسے حالات میں اپنی انا کو برقرار رکھ کر حالات کا مقابلہ نہیں حالات کو شکست دے رہے ہوں۔

عطش نے آلام کے ہجوم میں بے یار و مددگار رہ کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اور جن تلخ

حالات میں ان کا یہ وقت گزرا ہے وہ لوہے کے چنوں سے کم نہیں تھا جو انہیں چبانے پڑے اور پھر اس پر ادبی ذوق جو اس ماحول میں اور بھی جان لیوا چیز ہو جاتی ہے۔

انہوں نے کچھ دنوں اپنا کلام مجھے اصلاح کے لیے بھیجا میں نے ان کا دل تو نہیں توڑا لیکن بخلوص یہ مشورہ دیا کہ آپ نثر میں کوشش کریں تو شاعری سے زیادہ موزوں بات رہے گی' انہوں نے میری بات کو قبول کرلیا اور بحمد للہ اب وہ نہایت اچھے ادیب ہیں ان کے وقیع مضامین اخبارات میں آتے رہتے ہیں اور صحافت سے زیادہ ان میں تصنیف و تالیف کا ذوق پایا جاتا ہے اور وہ فطرتاً محقق واقع ہوئے ہیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو جائیں گے۔ ان کی کئی کتابیں چھپ رہی ہیں اور یہ مشغلہ میرے خیال سے انہیں ہر صورت سے مطمئن کر دے گا مگر اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے عروض کو بڑے غور سے پڑھا ہے اور اب میں شعر بھی درست کہتا ہوں' ممکن ہے کہ یہ درست ہو لیکن عروضی تو شاعر کم ہی دیکھے گئے ہیں اور کچھ ہیں بھی تو وہ بے کیف شعر کہتے ہیں جو فطری طور پر شاعر نہیں وہ علم کے بل پر کبھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ بہر صورت میں عطش سے مایوس نہیں اور تہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا اسے زندگی اور بلندی کے عزائم میں کامیاب کرے۔ آمین'

حنیف شاہد

حنیف شاہد ایک ہونہار قسم کے نوجوان ہیں عرصہ سے ان کی قلمی کاوشوں پر میری نظر ہے' یہ لاہور میں پنجاب پبلک لائبریری سے منسلک ہیں اور علمی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف و تالیف بھی نہیں رکتی' عمل کسی رخ پر کیوں نہ ہو بیکار نہیں جاتا اور کارآمد رخ پر ہو تو کیا کہنا' سونے پہ سہاگہ ہے۔

حنیف شاہد صاحب بڑے اچھے رخ پر کام کر رہے ہیں' انہوں نے اپنے قلم سے بہت سے گرد آلود چہروں کو درخشاں و تاباں کر دیا ہے اور یہی عمل ہے جس سے تعمیر و ترقی کا پہیہ رکنے نہیں پاتا اور جہاں یہ اپنے ملک کے مشاہیر کے نام زندہ رکھنے کی سعی بلیغ کر رہے ہیں وہیں ان کی تاریخ میں بھی گچ کے ردے لگتے چلے جا رہے ہیں' اس میں شک نہیں کہ جب کوئی نیا طریق فکر نئے پھول پھل لاتا ہے تو گزشتہ کارنامے ماند سے پڑ جاتے ہیں' لیکن بہت سی اقدار حیات ایسی ہیں کہ جن پر وقت کی

برودت زنگ نہیں لگا سکتی اور ہمیشہ جھمکا ر دیتے رہے ہیں۔
حنیف شاہد کا یہ کام جو وہ کر رہے ہیں ہمیشہ قوم کو بیدار کرتا رہے گا اور نوجوانوں میں نیا خون عمل کی جانب راغب رہے گا۔ حنیف شاہد کو میں مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں اور ان کی مقبولیت کے لیے دست بہ دعا بھی ہوں کہ خدا انہیں اس راہ میں کامیاب و کامران کرے۔ آمین ثم آمین

مزاح نگار

پطرس بخاری، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، سید محمد جعفری، مجید لاہوری، شیخ نذیر احمد، اسد ملتانی، محمود سرحدی، مشتاق احمد یوسفی، ظریف جبل پوری، دلاور فگار، سید ضمیر جعفری

پطرس بخاری

یوں تو ملا رموزی بھی میرے ابتدائی دور کے آدمی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ان سے متاثر نہیں ہوا۔ البتہ جب سے میرے ادبی شعور نے آنکھیں کھولی ہیں پہلا مزاح نگار میں نے پطرس بخاری کو پایا، انہوں نے ماضی کے مزاح نگاروں سے ہٹ کر الگ اپنی ایک روش نکالی تھی جوان کی اعلیٰ تعلیم اور گہرے مطالعے کا نتیجہ تھی ان کے مزاح میں جو نشتر تھے وہ آج تک کسی مزاح نگار کو میسر نہیں ہوئے اگرچہ انہوں نے ''مضامین پطرس'' لکھ کر ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا مگر اس کے بعد ان کی طویل خاموشی نے اور کوئی شاہکار نہ دیا۔ بعض معترضین نے اسے مشکوک نظر سے بھی دیکھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ پطرس بخاری بڑے ذہین، طباع اور جینیس قسم کے آدمی تھے، ان کی ذہانت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک سے باہر جا کر انہیں ''مضامین پطرس'' والا ماحول نصیب نہیں ہوا، مشاہدہ ہے کہ بعض شاہکاروں کی بنیاد میں سوسائٹی کا رجحان اور گرد و پیش کا اثر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ افسوس کہ پطرس کے بعد ایسا نادر روزگار مزاح نگار یہاں پیدا نہیں ہوا۔

شوکت تھانوی

انہیں احمد شاہ بخاری پطرس کے بعد اگر اُس ملک کا سب سے بڑا مزاح نگار کہہ دیا جائے تو کوئی بات بگڑتی نہیں ان کی مزاحیہ کتب اس کی شاہد ہیں کہ وہ ادب کے اسی رخ کے لیے پیدا ہوئے تھے ان کی ہر بات میں مزاح کا پہلو نکلتا تھا اور بعض اوقات تو وہ ایسا بے وقت مزاح اور بے ہنگم طنز کرتے تھے کہ لوگوں کی پیشانیاں شکنوں سے بھر جاتی تھیں۔

ان میں سنجیدگی اس وقت آئی جب وہ میو ہسپتال میں بستر مرگ پر پہنچ گئے، نجانے ان پر موت سے پہلے موت کے آثار کیسے منکشف ہو گئے تھے کہ اول دن سے جو شخص بیمار پرسی کو جاتا وہ اسے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے میں جب انہیں دیکھنے گیا تو وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر رونے لگے میں نے بہت دلاسا دیا لیکن شاید ان کے سامنے کچھ مناظر آ رہے تھے۔ اور وہ ذرا ذرا جاتے تھے! وہ ہر شخص سے یہی کہتے تھے کہ میں بچوں گا نہیں خدا را میرا کہا سنا معاف کر دیں حیرت ہے کہ شوکت جیسا سدا بہار آدمی جو دنیا کی مشکلات کا مذاق اڑاتا تھا اس وقت آنسوؤں سے گفتگو کرنے لگا تھا ہر چند کہ شوکت نے تاریخ ادب میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں لیکن اس کی موت دیکھنے والوں کو موت کی سختی اور شدید مشکلات پر سوچنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔

عظیم بیگ چغتائی

ایڈووکیٹ تھے چالیس سال کی عمر تک انہیں کسی نے نہیں جانا اور نہ ان کا یہ ادبی پہلو اجاگر تھا لیکن پھر یک بیک یہ لاوا اس شدت سے پھوٹا کہ خط لکھنے بیٹھتے تھے تو کتاب لکھ دیتے تھے وہ پلاٹ سے مزاح پیدا کرتے تھے اور اس میں انہوں نے مہارت کا کمال بہم پہنچا لیا تھا۔

سید محمد جعفری

طنز و مزاح لکھنے والوں میں میری سب سے پہلی ملاقات سید محمد جعفری سے ہے، سید محمد جعفری میرے اس وقت کے کرم فرما ہیں جب میں شمعہ پہاڑی (لاہور کی ایک سیر گاہ) کی چوکیداری کے

فرائض انجام دیتا تھا' اور جعفری صاحب وہاں مطالعے کے لیے آیا کرتے تھے' لیکن نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ مزاح نگار شاعر ہو جائیں گے نہ انہیں یہ اندازہ تھا کہ یہ چوکیدار کل کتابی صورت میں اپنی یادداشتیں لکھے گا' لیکن وہ اس وقت بھی میری قدر و منزلت کرتے تھے اور وہ ان کی خاندانی شرافت تھی' ان کے یہاں اپنے دور کی حکومت پر بھی طنزیہ نشتر ملتے ہیں جو ہر مزاح نگار کے بس کی بات نہیں' اس کے علاوہ دوسرے شاعروں کے متین اور سنجیدہ مصرعوں پر گرہیں لگا کر انہیں مزاحیہ بنا دینا انہیں کا حصہ ہے' جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے وہ قدیم لوگوں کی صف میں آتے ہیں اور عصر حاضر کی رنگارنگی ان کی نظر میں نہیں جچتی

مجید لاہوری

جہاں تک مجید لاہوری کا تعلق ہے اس نے فٹ پاتھ سے زندگی شروع کی اور میز کرسی مہیا کرتے کرتے ملک میں شہرت پالی - ان کے کلام میں جگہ جگہ اصلاحی طنز کے چھینٹے اس خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں کہ ہنسی تو کم آتی ہے سبق زیادہ ملتا ہے' مجید شاعر اور صحافی سے زیادہ اچھا انسان تھا وہ دوستوں کے لیے اپنے حدود سے آگے نکل کر ایثار کرتا تھا' گویا اپنی بساط سے بڑھ کر قربانی اس کی فطرت تھی! وہ مرعوب ہونا نہیں جانتا تھا' بڑے بڑے لوگوں سے اپنے اسی زعفرانی لہجے میں گفتگو کرتا اور اپنے عزائم سے خبردار کرنا اس کا شیوہ تھا -

اس کا غم اور خوشی اس کے ہونٹوں سے زیادہ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتے وہ سدا بہار قسم کا انسان سیکڑوں دوستوں کو ممنون کر کے اچانک چل بسا اور کراچی کی سرزمین اس کے بھاری بھرکم جثے کو پانی کر کے پی گئی اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ۔

کیا خوب آدمی تھا' خدا مغفرت کرے!

شیخ نذیر احمد

پڑھے لکھے انسان' فوج سے ریٹائرڈ اور پرانے معاشرے کے دلدادہ' ان کا کلام دوران ملازمت ہی کی پیداوار ہے' ان کے یہاں معیاری اور سنجیدہ مزاح ملتا ہے جو پڑھے لکھے لوگوں کو چونکاتا ہے' وہ بھی معاشرے کے نشیبوں پر نظر رکھتے ہیں' اپنی قدرت بیان سے رنگ آمیزی کرنا ان

کافن ہے ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے اور اس میں خوب خوب کہا ہے۔

اسد ملتانی

اسد ملتانی گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے قدیم عقائد اور پرانی معاشرت کے انسان، لیکن اکبر آلہ آبادی کے رنگ میں نہایت اچھا طنز اور کارآمد مزاح انہی کے یہاں ملتا ہے، عرصہ ہوا ان کا ایک مختصر سا مجموعہ انتخاب نظر سے گزرا تھا اس کے بعد ان کا کوئی مجموعہ کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔

ایک دفعہ جھنگ کے رہنے والے سید مظفر علی ظفر نے ذکر کیا تھا کہ میں ان کے کلام کے حصول کی کوشش کر رہا ہوں اگر مل گیا تو اپنے مصارف سے شائع کردوں گا نجانے ان کی یہ سعی کہاں تک کامیاب رہی شملے کے مشاعروں کے بعد بھی ان سے پرلطف ملاقاتیں رہیں۔

محمود سرحدی

مولانا تاجور کی محفل کے انسان تھے اپنے مزاح میں سیاسی نکات بیان کرنا اور انہیں سے مزاح اور طنز کا پہلو ابھارنا ان کا حصہ تھا، یہی سبب تھا کہ ان کے اشعار ایک شہر سے دوسرے شہر، دوسرے سے تیسرے شہر سفر کرتے تھے کیونکہ ان کا اثر دیرپا تھا اور زبان سلیس ہوتی تھی جب وہ بھی گفتگو پر آتے تو ہر پہلو میں یہی رنگ و خوشبو کا سیلاب موجیں مارتا رہتا محمود سرحدی سراپا خلوص اور محبت کے علاوہ قدیم اصول حیات کے انسان تھے اس اصول حیات کے جس میں حفظ مراتب کو شرافت کہا جاتا ہے ان میں ایک افغانی آن بھی تھی اور درویشانہ انکساری بھی، خدا مغفرت کرے!

مشتاق احمد یوسفی

یوسفی صاحب یوں تو ایک بنک کے بڑے عہدے پر فائز ہیں اور شکل وصورت سے بھی مزاح کے آدمی معلوم نہیں ہوتے، لیکن ان کی دو کتابوں ''خاکم بدہن'' اور ''چراغ تلے'' پڑھ کر دنیا نے انہیں اعلیٰ قسم کا مزاح نگار کہہ دیا، میں نے بھی جستہ جستہ وہ کتابیں پڑھی ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ لوگوں نے ان کتابوں کو مزاحیہ کتابیں بتا کر مصنف کی توہین کی ہے کیونکہ آج کل کے مزاحی پٹاروں میں کہیں تو فواحش کے بھپکارے ہیں کہیں پھکیوں سے عریانی بسورتی نظر آتی ہے اور جب کوئی اس قسم کا پٹارا

محفل میں لا کے پٹکا جاتا ہے تو تیسرے درجے کے لوگوں کے قہقہوں اور سانسوں سے فضا متعفن ہو جاتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے تو ادب کو ایک ایسا اسلوب تحریر دیا ہے جس میں تنقید و تحسین دونوں جھلک جھلک کر مصنف کے مقام کا تعین کرتی ہیں' ان کی تحریر میں شگفتگی اور سنجیدگی یکجان ہونے کے باوجود اپنی دھاریوں کے رنگ سے اپنی قیمت کا اعلان کرتی ہیں ان کا اسلوب بجا طور پر دل نشین بھی ہوتا ہے سنجیدہ بھی' منفرد بھی اور بین الانسانی بھی۔

ان کے یہاں دور حاضر کے مزاح کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور سرزمین کے ادب کی روح یوسفی صاحب کے قلم سے پاکستان کے لیے پروانہ راہداری دے رہی ہے۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یوسفی صاحب کے انداز بیان میں متانت اور ظرافت میں ایسا سمجھوتا ہوا ہے اور دونوں ایک دوسرے میں اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ وہ اپنا صدر دروازہ تو نہیں بتاتیں لیکن دریچوں سے ان کی مسکراہٹ کام کرتی رہتی ہے' ان کے یہاں گستاخ قہقہوں اور بے معنی مسکراہٹوں کی دستک پر دروازہ نہیں کھلتا۔

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں اسلوب گفتگو کا ایسا انداز ہے جو شرفاء کی تخصیص اور سنجیدہ و متین لوگوں کا حصہ ہے' ایسے ادب سے جہاں تاریخ ادب میں ایک نیا باب قائم ہوتا ہے وہیں شاخ تراشی کا کام بھی بند نہیں ہوتا اور شجر کاری بھی جاری رہتی ہے' الغرض یوسفی صاحب ہمارے ملک کی عظمت ہیں اس لیے نہیں کہ وہ بڑے افسر ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بڑے ادیب اور عظیم انسان ہیں۔

ظریف جبل پوری

مزاح نگار تھے مگر ان کی ملازمت کی نزاکت اور سرکاری اصول وضوابط انہیں کھل کر بات کہنے پر گھورتے تھے لیکن اس کے باوصف انہوں نے کھل کر طنز کئے ہیں' وہ حکومت کے رائج الوقت سکوں کو چٹکی لگا کر کھوٹا کھرا کرنا جانتے تھے اور اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے تھے' نشیبوں کی نشاندہی کرنا اور بات سے بات نکال کر ہی وہ مزاح کا انداز تخلیق کرتے تھے' مشاعروں میں انہیں

بڑی داد و تحسین ملتی تھی کیونکہ گرد و پیش کے حالات کی گفتگو کو طنز و مزاح کا روپ دیتے تھے' زیادہ دنوں بیمار بھی نہیں رہے ذرا سی دیر میں چٹ پٹ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دلاور فگار

دلاور فگار کو میں ایک عرصے سے جانتا ہوں' میں نے مزاح نگاروں کو عموماً ایسا دیکھا ہے کہ ان کی زندگی کی حرکات و سکنات میں بھی ایک طرح کی مسخرگی آ جاتی ہے لیکن دلاور فگار میں یہ بات نہیں' وہ صرف اسٹیج تک مزاح کے آدمی ہیں اور اسٹیج سے اتر کر قاعدے کے انسان وہ کراچی میں مقبول تو ہیں لیکن شہرت اور مقبولیت کی چکیاں ابھی کچی ہیں' وہ کراچی میں اپنی تہ کے گردان تو ضرور ہیں لیکن ملک کے دیگر مقامات پر ابھی ان کی شاعری نے چھوٹ نہیں پھینکی' وہ دوسرے پایاب شعراء کی طرح پروپیگنڈے کے انسان بھی نہیں لیکن حقیقت ہمیشہ پردے میں نہیں رہتی جہاں جہاں وہ جاتے ہیں داد و تحسین پاتے اور مقبول ہوتے ہیں مگر ان کے اردگرد وہ لوگ نہیں جنہیں ادبی پارٹی بند اور فنی جرگہ دار کہا جاتا ہے' لیکن تابہ کے دلاور فگار کا فن اس کی قوت پرواز ہے اس کی شاعری مقام پا کر رہے گی۔

سید ضمیر جعفری

کالج کے زمانے سے میرے کرم فرما ہیں یوں تو سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں لیکن مقبول عوام ان کا مزاح نگاری کا انداز ہے' ان کی کئی نظمیں تو ایسی ہیں کہ متین سے متین آدمی قہقہے پر مجبور ہو جاتا ہے ان کے یہاں کمال کی نکتہ آفرینی ہے اور انداز بیان سے شگفتگی جنم لیتی ہے شاعری اور افسری سے قطع نظر وہ بحیثیت انسان بھی قابل قدر انسان ہیں اور برے وقت میں دوستوں سے آنکھ نہیں چراتے' ضمیر جعفری کی کئی کتابیں دنیا سے خراج تحسین لے رہی ہیں۔

اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین

پنجاب یونیورسٹی

میں جب لاہور میں نو وارد تھا تو پنجاب یونیورسٹی پر مددگی ہوئی تھی اور مجھے بارہ آنے یومیہ پر بیل کی جگہ رہٹ کھینچنے کا کام ملا تھا' آج میں فاضل اردو کا پیپر سیٹر بھی ہوں اور صدر ممتحن بھی اور اسی یونیورسٹی میں ایم اے کا ممتحن بھی! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے متعلق بھی کچھ لکھ کر یہ فرض بھی ادا کر دوں۔

(احسان دانش)

پنجاب کے اہل فکر نے اپنے علمی ادبی اور ثقافتی کے علاوہ معاشی اور معاشرتی مسائل کے جائزے اور تبصرے کے لیے ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لیئنر کی سربراہی میں انجمن پنجاب کی نیو رکھی تھی' چونکہ اس میں پر خلوص لوگ شامل تھے اس لیے انجمن پنجاب میں وہ کتابیں چھپیں جو معاشرے کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں ممد و معاون نظر آئیں۔

اس انجمن میں رہتے ہوئے ڈاکٹر لیئز نے ایک اورینٹل یونیورسٹی کی اسکیم پیش کی اور اراکین انجمن پنجاب کے علاوہ یہاں کے معززین نے اس پر صاد کرتے ہوئے اس کی ایک نقل منظوری کے لیے لیفٹننٹ گورنر پنجاب کو روانہ کر دی اور گورنر صاحب کے ایماء پر ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو ایک عام جلسہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ منظور کر لیا گیا اور حکومت پنجاب نے منظوری کے لیے اپنی سفارش کے ساتھ ہندوستان کی حکومت کو روانہ کر دی' اس پر اچھی خاصی لے دے تو ہوئی لیکن بالآخر حکومت نے ایک ایسے کالج کی منظوری دے دی جس میں طالب علموں کو سندیں تو دی جائیں لیکن ڈگری دینے کا اختیار نہ ہو۔

اس وقت پنجاب اور یو۔ پی کے رہنے والے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات دیا کرتے تھے' لیکن کلکتے کے نصاب تعلیم ان علاقوں کی معاشرت اور ضروریات کے لیے کافی نہ تھے خیر انجمن پنجاب نے اس فیصلے کو اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ یہ یونیورسٹی کالج مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت کرے

گااور جب تک ملکی زبان اور کار آمد علوم کی تعلم ہوگی انگریزی اختیاری زبان کے طور پر رائج رہے گی' ایک سال کے بعد ۱۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو اس کالج کے اجراء کا اعلان ہو گیا اور ڈاکٹر لیٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج' رئیس انجمن پنجاب اور یونیورسٹی کالج کے رجسٹرار قرار پائے - انجمن پنجاب نے اورینٹل یونیورسٹی کی تحریک کے ساتھ علوم مشرقی کے احیاء کا دامن نہ چھوڑا اور ڈاکٹر لیٹنر کی رہنمائی میں اس طرف بھی جدوجہد جاری رکھتے ہوئے علوم شرقیہ کے کالج کا شگوفہ بھی چھوڑ دیا اور مئی ۱۸۷۰ء میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا -

اس طرح پنجاب یونیورسٹی کالج کے بعد یہ پہلا تدریسی ادارہ قائم ہوا' جہاں باقاعدگی سے تعلیم شروع ہو گئی' مارچ ۱۸۷۲ء تک مشرقی علوم السنہ کا یہ ادارہ اورینٹل اسکول کہلایا اور پھر یہی اورینٹل کالج ہو گیا' یونیورسٹی اسکول کے علاوہ اس میں جماعتیں بھی لگنے لگیں -

اورینٹل کالج کے مقاصد میں مشرقی علوم کی تدریسی جدوجہد کے علاوہ تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس کی اشاعت کا اہم فریضہ بھی تھا اور کئی ایک حضرات ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے' علاوہ ازیں عربی' فارسی اور سنسکرت کے رسالے بھی چھپتے تھے -

یہی سبب تھا کہ فضیلت کے اعتبار اور علمی معیار کے لحاظ سے اورینٹل کالج جدید طرز کے تعلیمی اداروں سے ہیٹا نہیں رہتا تھا' اس کی اس کامیابی کا راز اس کی سستی اور معیاری تعلیم پر تھا کیونکہ ایک طرح سے تو یہ مشرق و مغرب کے علوم کا سنگم تھا دوسرے اپنے علمی معیار اور ذہنی کارناموں سے ایک تندرست ثقافت اور زندہ رہنے والی تہذیب و تمدن کا نمونہ پیش کر رہا تھا -

ڈاکٹر لیٹنر کی سترہ سال کی جدوجہد سے ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں پنجاب کو مکمل یونیورسٹی مل گئی اور اس میں جہاں اور مفید دفعات تھیں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ایک اورینٹل فیکلٹی علیحدہ بنائی جائے گی جو اپنے مضامین کی ڈگریاں دینے کی مجاز ہوگی -

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی جس کے رجسٹرار ڈاکٹر لیٹنر تھے پہلا اور واحد ادارہ تھا جو ڈگری کے درجوں کی تعلیم کا اہتمام کرتا تھا اور یہی ادارہ تحقیق و تدریس اور تصنیف و تالیف کے اعتبار سے ایسا قیمتی اثاثہ تھا جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قیام کا کوئی خاص اثر نہ تھا' البتہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کے اضافے سے کچھ جماعتیں کالج سے علیحدہ کر دی گئیں اور کچھ جماعتیں نئی کھل گئیں -

ابتداء میں ایف اے بی اے انجینئرنگ' سائنس اور قانون کے علاوہ آیورویدک کی تعلیم بھی مشرقی زبانوں میں اسی اورینٹل کالج میں دی جاتی تھی۔ مگر ۱۸۹۰ء کے بعد اورینٹل کالج صرف مشرقی زبانوں کی تحقیق وتدریس کا مرکز رہ گیا اور رفتہ رفتہ ایک دارالعلوم ہونے کے علاوہ علوم وفنون کی اکادمی کی صورت اختیار کر گیا' حکومت کی پالیسی اور وقت کے ساتھ اس میں ترقی وتبدیلی کے مرحلے بھی آتے رہے مگر اس کا وجود غنیمت ہی سمجھا جاتا رہا۔

اورینٹل کالج کی موجودہ عمارت ۱۹۲۵ء میں تعمیر ہوئی مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور تصنیف وتالیف اور تدریس وتنظیم کے لحاظ سے ناقابل فراموش دور ہے اور یہی دور ہے جو اورینٹل کالج کی علمی ادبی حیثیت کو دوسرے ملکوں سے تسلیم کراتا ہے۔

آغاز میں بی اے' بی۔ اے۔ آنرز اور ایم اے کی جماعتوں کو تعلیم دینے کا کام اورینٹل کالج ہی کے سپرد تھا اور لاہور کے تمام کالجوں کے طلباء یہیں آکر شریک جماعت ہوتے تھے' ایم اے عربی' ایم اے سنسکرت کے بعد ایم اے فارسی کا آغاز ہوا اور تینوں زبانوں میں جماعتیں لگنے لگیں۔

پاکستان کی تحقیق وتفتیش کے محرکات میں ایک اردو زبان ہی ایسی تھی جو زیادہ سے زیادہ موثر اور مقبول قرار پاتی تھی' چنانچہ اس زبان کو اس کا اصل مقام دلانے کی جدوجہد کا آغاز بھی پنجاب یونیورسٹی سے ہوا یونیورسٹی اس پر مصر تھی کہ یہاں جو مقام انگریزی کو حاصل تھا وہ اردو زبان کا حق ہے اور یہ اس کو ملنا چاہئے۔

چنانچہ ۱۹۴۸ء میں اردو ایم اے کی جماعتوں کا آغاز ہو گیا اور ۱۹۴۹ء میں ادیب عالم اور ادیب فاضل کی جماعتیں بھی قائم ہو گئیں' چنانچہ بحمد اللہ یہاں اردو ایم اے کی تعداد دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

جو اساتذہ یا ارباب علم اورینٹل کالج سے وابستہ رہے ہیں ان کے نام علوم مشرقی کی تاریخ میں امتیازی مقامات رکھتے ہیں اور ان کی تصنیفات وتحقیقات سے ایک زمانہ آگاہ ہے' ان میں سے میں چند حضرات کے نام لکھتا ہوں۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری' شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد' شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی' ڈاکٹر عظیم احمد ایم اے پی ایچ ڈی' علامہ عبدالعزیز میمن' ڈاکٹر مولوی محمد شفیع' ڈاکٹر برکت علی قریشی' پروفیسر ڈبلیو آرنلڈ' ڈاکٹر اے سی ولنر' ڈاکٹر محمد اقبال' علامہ سر اقبال'

علامہ اولاد حسین شاداں بلگرامی، علامہ حافظ محمود شیرانی، سرشیخ عبدالقادر، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا فیوض الرحمٰن، خواجہ محمد شفیع دہلوی

میں ان میں سے ڈاکٹر برکت علی قریشی، علامہ عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال، علامہ سر محمد اقبال، علامہ شاداں بلگرامی، علامہ محمود شیرانی، سرشیخ عبدالقادر مولانا فیوض الرحمٰن، مولانا تاجور نجیب آبادی، اور خواجہ محمد شفیع دہلوی سے ملا ہوں اور یہ ہستیاں ایسی ہیں کہ ان کی فضیلت کے بیان کو ایک ایک کتاب درکار ہے، لیکن افسوس کہ وہ میری ایسی عمر اور ناداری کا ایسا وقت تھا کہ میں ان حضرات سے استفادہ نہ کر سکا، میری ذاتی الجھنیں اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ مجھے ایسے نظر آئے کہ جیسے سلیٹی رنگ کی کہر میں چلتے پھرتے چراغ

شعبہ اردو کے موجودہ اساتذہ بھی علم و فضل کے اعتبار سے کم نہیں اور ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ سرفہرست آتے ہیں جو مولف بھی ہیں اور مصنف بھی محقق بھی ہیں اور معلم بھی انہوں نے اب تک جس قدر کتابیں لکھی ہیں وہ قابل قدر تحریریں ہیں۔ ان میں معلّمی اور تحقیقی صلاحیتوں کے دوش بدوش انتظامی سلیقہ ایسا ہے کہ اس نحیف الجثہ انسان کا منہ زور جذبہ حیات اور تزئین زندگی کی فطری قابلیتیں حیران کر دیتی ہیں، وہ جہاں تقسیم علم میں پیش پیش ہیں وہیں ماحول سے نپٹنا بھی جانتے ہیں، ان کے علم و فضل میں موقع موقع سے ایسی ایسی کمیں گاہیں ہیں جن کا راز کھل جائے تو سیاسی معاصرین کا رنگ اڑ جائے میں ان سے جب بھی ملا ہوں انہیں میں نے بڑا ہی میٹھا انسان پایا ہے، اسی لیے حاضر و غائب میں ان کا مداح رہا ہوں، اگرچہ بعض وقت شکایت کے موقعے بھی نکلے لیکن میں نے اپنے احترام سے باہر قدم نہیں نکالا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اول سے ان کا رجحان تنقید و تبصرے کی طرف رہا اور صنف ادب میں ان کا قابل قدر سرمایہ چھپ کر عالم آشنا ہو چکا ہے عبادت صاحب، آج کل اورینٹل کالج کے پرنسپل ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد کالج کے جشن صد سالہ پر انہوں نے اورینٹل کالج میگزین کا جو نمبر ترتیب دیا ہے اس میں ایسی کدوکاوش اور سلیقہ مندی سے کام کیا ہے کہ

آدمی تحسین کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے- ڈاکٹر عبادت پہلے شعر بھی کہتے تھے لیکن شاید تقسیم علم کا ذوق شاعری پر حاوی آ گیا اور اس سے دست بردار ہو گئے' اب بھی جب وہ کبھی کبھی اس کہنہ شراب کے جام لنڈھاتے ہیں تو ان کے اس دور کے رجحانات کا پتہ لگتا ہے جس کو پامال کر کے آگے بڑھ آئے ہیں ڈاکٹر عبادت صاحب بڑے ہی مرنجان مرنج قسم کے آدمی ہیں' ان سے مل کر آدمی اس دور کی اخلاقی برائی کرنے میں تامل کرتا ہے' وہ شاگردوں سے بھی دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں' اور اسٹاف سے برابر کا برتاؤ رکھتے ہیں میں ان کے اخلاق اور ذوق ادب دونوں کا مداح ہوں وہ ایک شریف انسان ہیں اور اپنے فرائض کی ادائی میں ہوشیار!

ڈاکٹر محمد باقر

ڈاکٹر محمد باقر نے بھی اپنے دور میں اورینٹل کالج میں اچھا قابل قدر ادب پیدا کیا ہے- خصوصاً اورینٹل کالج کے اساتذہ کا کام جو انہوں نے یکجا کر دیا ہے یہ بڑی خدمت ہے-

مقالات منتخبہ: اورینٹل کالج میگزین وضمیمہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۰ء بہ اہتمام سید وقار عظیم صاحب

مقالات منتخبہ: اورینٹل کالج میگزین وضمیمہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۰ء بہ اہتمام ڈاکٹر عبدالشکور احسن

مقالات منتخبہ: اورینٹل کالج میگزین وضمیمہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۰ء بہ اہتمام ڈاکٹر محمد بشیر حسین

مقالات منتخبہ: اورینٹل کالج میگزین وضمیمہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۰ء بہ اہتمام ڈاکٹر محمد باقر پرنسپل

باغ دودر: بہ تصحیح و تحقیق وزیر الحسن عابدی دانش بار زبان و محاورہ ایران ۱۹۷۰ء تحقیقی' ادبی اور درسی سرمایہ: ڈاکٹر وحید قریشی ایم-اے پی ایچ ڈی' ڈی لٹ ۱۹۷۰ء

مقالہ نگاروں کی فہرست اس سے علیحدہ ہے جو اچھا خاصا دیدہ ریزی کا کام ہے ڈاکٹر محمد باقر نے ''مدار الافاضل'' کو بھی ایڈٹ کیا ہے جو ان کا کارنامہ کہا جاتا ہے اس کے علاوہ بھی ان کی اور کئی کتابیں ہیں' وہ اب بھی جرائد میں مضامین لکھتے رہتے ہیں' خوشی کی بات ہے کہ ان میں اب تک قلم کشی کا ذوق زندہ و بیدار ہے-

ڈاکٹر سردار موہن سنگھ دیوانہ ایم اے، پی ایچ ڈی

میں اس دیوانے سے عرصہ تک اس خیال سے نہ مل سکا کہ مولانا تاجور نجیب آبادی ان کے مداح تھے اور میں مولانا کے دوستوں کو بھی مولانا کی طرح ہی قابل احترام خیال کرتا تھا۔

ایک دفعہ میں سری نگر (کشمیر) مشاعرے میں گیا ہوا تھا' جناب فدا بھی پشاور سے آئے ہوئے تھے اتفاق سے مل گئے' ہم دونوں ایک باغ میں سیر کر رہے تھے کہ اچانک سردار موہن سنگھ دیوانہ سے ملاقات ہوگئی اور گفتگو ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ ایسے خلیق اور عظیم انسان نکلے کہ کئی تیس مار خاں میری نظر سے گر گئے جہاں تک ان کی فضیلت کا سوال ہے وہ تو خیر اپنی جگہ مسلم ہے لیکن بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان وہ بلند و بالا مقام رکھتے ہیں' ملاقات کو ایک زمانہ ہوگیا اور کئی ایک سکھ دوستوں کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں۔کاش یہ سیاسی دیواریں جلد مسمار ہو جائیں اور انسان ایک برادری بن کر رہنے لگیں۔

مولانا فیوض الرحمٰن صاحب

مولانا موصوف جید فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شریف النفس انسان تھے اور ان کی صحبت سے انسان کبھی اکتاتا نہیں تھا' بلکہ خود میں ایک غیر مرئی سی قوت محسوس کرتا تھا' میں نے ایسے بہت کم بزرگ دیکھے ہیں' جن کے سامنے انسان مہذب' با اخلاق' شریف اور چاق و چوبند رہنے کی سعی کرتا ہے' میں ان کے پاس جا کر کبھی مسرت سے خالی نہیں پلٹا' انہوں نے بہت سے قابل قدر مضامین لکھے ہیں لیکن وہ ہنوز مجموعے کی صورت میں نہیں آئے' موصوف دیوبند کے فاضل تھے اور ان میں وہی اخلاق واقدار بدرجہ اتم موجود تھے جو اس دارالعلوم کا طرہ امتیاز ہے۔

مخدوم غلام جیلانی صاحب ایم اے

مخدوم صاحب قدیم طرز کے استاد ہیں اور ویسے ہی شاگردوں کو رکھنا چاہتے ہیں ان کی ایک کتاب محیط الدائرہ نظر سے گزری جس میں انہوں نے عروض کی وضاحت کے لیے نہایت عرق ریزی سے کام کیا ہے ان سے کئی بار میری گفتگو ہوئی وہ کتاب کی طرح بولتے ہیں اور کتاب خوانی

میں تقریر کے اسلوب کو برقرار رکھتے ہیں'انہیں دیکھ کر قدیم اساتذہ نظر میں پھر جاتے ہیں جو دیکھنے میں سیدھے سادے اور علمی اعتبار سے طوفان ہوتے تھے'ابھی دو سال ہوئے مخدوم صاحب عروض پر ایک اور رسالہ لکھ رہے تھے' نہ معلوم مکمل ہوا یا نہیں؟

شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں' تاجور نجیب آبادی مرحوم

فاضل دیو بند تھے اور عربی مادری زبان کی طرح لکھتے اور بولتے تھے' اسی طرح فارسی میں بھی کم قابلیت کے مالک نہیں تھے مگر تمام زندگی اردو کی خدمت میں گزار دی'افسوس کہ ان کے مضامین کا اب تک کوئی مجموعہ نہیں چھپا' وہ ایک نغز گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ معیاری استاد تھے' نظم اور نثر دونوں میں انہیں قابل رشک مہارت تھی'اسی طرح طنز و مزاح کے مضامین جو انہوں نے رسالہ''ادبی دنیا''میں اور شاہکار کے کئی نمبروں میں لکھے ہیں اگر انہیں ایک جا کر دیا جائے تو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا' مگر افسوس کہ اس دور کے لوگ اپنی قبر کی چار دیواری سے فرصت نہیں پاتے - وہ تو خدا بھلا کرے شباب کیرانوی کا کہ اس نے اپنے رسالہ'' پکچر'' کا تاجور نمبر نکال کر جہاں اپنی وفاداری اور استاد پرستی کا ثبوت دیا ہے وہیں ادبی دنیا پر بھی احسان کیا ہے' اس نمبر میں مولانا تاجور کا منظوم کلام جہاں تک اسے دستیاب ہوا یکجا کر دیا لیکن ان کے نثری مضامین کے متعلق ہنوز کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا-

'' پکچر'' کے تاجور نمبر سے پہلے'' تذکرہ تہذیب وادب'' کے نام سے انجمن تہذیب وادب نے بھی جہاں تک ممکن تھا ان کا کلام اکٹھا کر کے چھاپ دیا تھا' غالباً وہی کلام اسی ترتیب سے'' پکچر'' میں آیا ہے-'' تذکرہ تہذیب وادب'' میں کئی لوگوں کا ذکر ہے مجھے نہایت کرب سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کے اشاعتی اداروں نے مولانا تاجور کے نثری سرمائے کو اب تک درخور اعتنا نہیں سمجھا اور یہ کوتاہی نہیں کوئی اور ہی بات ہے-

مولانا عبدالصمد صارم فاضل جامعہ ازہر (مصر)

میں مولانا صارم سے پہلے ان کے والد قاضی ناظم صاحب سے ملا ہوں' وہ قدیم فاضلوں جیسے فاضل اور جدید محققوں سے محقق تھے' میں جناب ناظم سہواردی سے متعارف ہوا وہ غالب کی

شرحوں پر کچھ کام کر رہے تھے اور چونکہ میرے پاس اچھی معیاری کتب کا ذخیرہ ہے اس لیے وہ کئی بار غریب خانے پر تشریف لائے اور پہروں گفتگو رہی' مجھ پر اب تک ان کی فضیلت کا اثر موجود ہے' اس کے بعد ایک دن میں مولانا تاجور کے یہاں گیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے کسی سے دوبدو ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ "وہ شخص مصر یونیورسٹی کا فاضل ہے تم اس کی فضیلت کا اندازہ نہیں لگا سکتے میں نے نہایت اچھا انسان انتخاب کیا ہے' سامنے بیٹھے ہوئے دو آدمی خاموش ہو گئے۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کس کا ذکر ہے تو انہوں نے بتایا کہ بعد الصمد صارم فاضل جامعہ ازہر کا میں نے اندازہ لگایا کہ جس کی تعریف میں مولانا اس قدر اصرار پر آجائیں وہ ضرور کوئی بڑی شے ہوں گے۔

پھر کئی روز کے بعد میں نے صارم صاحب کو اورینٹل کالج سے آتے دیکھا اور پھر گفتگو کا موقع بھی ہوا لیکن معلوم ہوا کہ یہ سوسائٹی کے آدمی نہیں' لکھنا پڑھنا ان کا بہترین مشغلہ ہے' پھر ان کی تصانیف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصروف ترین انسان ہیں اس کے علاوہ نازک مزاج بھی!

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب

سید وقار عظیم صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ جامعہ ملیہ میں استاد تھے' ان میں تصنیف و تالیف کا ذوق پہلے ہی سے موجود تھا افسانے اور ناول پر جو انہوں نے کام کیا ہے وہ کام کرنے کا تھا' خدا کا شکر ہے کہ وہ انہیں کا مرہون قلم ہوا۔ اب یہ کام آنے والی نسلوں کے لیے سود مند رہے گا۔

یونیورسٹی کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں انہوں نے لغت کی تحقیق اور جدید اصطلاحات پر جو کام شروع کیا تھا افسوس کہ وہ پورا نہ ہو سکا' جو ان کے دور میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے اس سے ان کے عزائم پر روشنی پڑتی ہے وہ لغت اور ترجمے کے شعبے میں جدید اضافہ ہے' کاش وہ کام وقار صاحب کی مرضی کے مطابق تکمیل پا سکتا۔

وقار صاحب نہایت ٹھنڈے اور میٹھے انسان ہیں' ان کے تلامذہ اور دوستوں کو میں نے ان کے معاملے میں رطب اللسان پایا ہے وہ دوستوں کے دوست بھی ہیں اور خوش اوقات بھی' کاش حکومت

ان سے کوئی ان کی قابلیت اور تجربہ کی روشنی میں کام لیتی، تعلیم کے شعبے کا انسان جب ریٹائر ہوتا ہے حقیقت میں وہ اسی وقت تو استادی کے قابل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی، ایم اے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ)

ڈاکٹر وحید قریشی بھی میرے مدتوں سے کرم فرما ہیں، ان کا ذوق ادب نہایت منہ زور واقع ہوا ہے وہ حقیقت میں جو مکھے ادیب ہیں اور صحیح قسم کے معلم، چونکہ وہ خود شاعر ہیں اس لیے شعر کے حسن و قبح کو پہچانتے ہیں، اسی طرح تذکرہ نگاری پر بھی دسترس ہے، تاریخ بھی پڑھی ہے اور انشاء و ادب کے آشنا بھی ہیں، تاریخ ادب میں وحید قریشی کا ایک مقام ہے جو ہر ادیب کو میسر نہیں ہوتا، ان کی تصنیفات و تالیفات بھی کچھ کم نہیں اور سب کارآمد اور مفید ہیں۔

سید وزیر الحسن عابدی ایسوسی ایٹ پروفیسر فارسی

جناب وزیر الحسن عابدی کی ذات اورینٹل کالج کے لیے عظمت ہے، وہ فارسی زبان و محاورے پر اس قدر عبور رکھتے ہیں کہ یہاں ان کے لگے کا استاد نظر نہیں آتا، انہوں نے غالب کی ''باغ دودر'' مرتب کر کے جس خوبی کے ساتھ اسے روشناس کرایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے، عابدی صاحب معلومات کا بحر ذخار ہیں اور ان کا کتب خانہ قابل دید!

لیکن جس معیار کا کتب خانہ ہے اور جس مقام کے عابدی صاحب ہیں اس درجے کا کام ابھی سامنے نہیں آیا، غالباً اس کا سبب اشاعتی مشکلوں کے ساتھ عدیم الفرصتی بھی ہو، لیکن میری آرزو تو یہی ہے کہ ان کا علم اور تجربہ عالم آشنا ہو اور انہیں اللہ تعالیٰ صحت و سلامتی سے رکھے آمین

ڈاکٹر میاں شکور احسن صدر شعبہ فارسی

شکور احسن صاحب گہرے مطالعے اور وسیع معلومات کے انسان ہیں ان کی تصنیف کا ایک خاص انداز ہے جو اپنے مفاہیم کے ابلاغ کو ہیرے کی طرح مختلف پہلو تراشتا ہے ان کی تحقیق و ترتیب میں اس قدر سلجھاؤ ہوتا ہے کہ فکر و خیال میں کہیں الجھاؤ نہیں پڑتا اور تحریر کی یہی سب سے اہم خوبی ہے۔

شکور احسن صاحب مرنجان مرنج قسم کے انسان ہیں، نہ ان میں پندارِ علم ہے نہ غرورِ قلم جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے وہ نہایت سادہ مگر دلکش انداز حیات رکھتے ہیں ان کی سنجیدگی میں شگفتگی اور خاموشی میں فکر کے انداز نمایاں رہتے ہیں' کیا خوب انسان ہیں۔

ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صاحب ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ عربی

رانا احسان الٰہی صاحب تحقیقی ذوق کے انسان اور بیدار دل مسلمان ہیں' میں سمجھتا ہوں آج کل درس گاہوں میں اسی قسم کے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ ایسے بحرانی دور میں اگر طالب علموں کو صحیح رہنمائی میسر نہیں آتی تو گمراہ ہو جاتے ہیں اور پھر عمر بھر راہ راست پر نہیں آتے' میں وثوق سے کہتا ہوں کہ رانا صاحب تدریس و تفویض میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں' ایسے استاد تلامذہ کے لیے ہی نہیں دوستوں اور سوسائٹی کے تمام لوگوں کے لیے مفید ہوتے ہیں' وہ بحیثیت انسان بھی وسیع ظرف اور زندہ ضمیر کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ایم اے پی ایچ ڈی

نہایت اعلیٰ درجے کے معلم اور بلند معیار کے ادیب ہیں' ان کے سینے میں تصنیف و تالیف کا ذوق بھی بیدار ہے اور تقسیم علم کا جنون بھی شور انگیز ہے' مزیدار بات یہ ہے کہ یہ اپنی خوبیوں سے آگاہ ہیں اور ایک نہ ایک کتاب کی ترتیب و تدوین ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے' ان کی تحریر میں سلجھاؤ اور ترتیب میں سلیقہ پایا جاتا ہے' ان کے مضمون میں کہیں گلجھڑ نہیں پڑنے پاتی' وہ ابھی نوجوان ہیں ان کے سامنے ہر سال کا دریچہ نئے مناظر لائے گا اور وہ وقت کے ساتھ ترقی کرتے جائیں گے' مجھے ان کا اسلوگ تحریر پسند ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی

صدیقی صاحب قدیم طرز کے بزرگ ہیں اور ان کے یہاں استادی اور شاگردی بھی قدیم انداز کی ہے' جس میں ہر وقت حفظ مراتب کا خیال اور روایتی رکھ رکھاؤ برقرار رہتا ہے وہ ادیب ہیں اور ادب سکھاتے ہیں ان کے یہاں علم کی تقسیم بھی روایتی ہے جیسا انہوں نے اپنے بزرگوں کو دیکھا'

اور ادب سکھاتے ہیں ان کے یہاں علم کی تقسیم بھی روایتی ہے جیسا انہوں نے اپنے بزرگوں کو دیکھا، سنا اور برتا، میں نے بڑے بڑے دار العلوم اسی انداز فکر اور طریق تعلیم میں رندھے ہوئے دیکھے ہیں مگر دیکھا جائے تو بنیادی تعلیم انہی درس گاہوں میں ہوتی ہے، وہاں خلاصے پڑھ کر امتحان نہیں دیئے جاتے بلکہ کتابیں دلوں پر نازل کی جاتی ہیں جو ساری عمر کام آتی ہیں۔

ایسے لوگ شاگردوں ہی کو اخلاق و ادب نہیں سکھاتے خود بھی اخلاق و روایات کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور دیکھنے سننے والوں کو بھی چونکاتے ہیں۔

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ایم اے پی ایچ ڈی

جناب ناظر حسن بھی تالیف و ترجمے کے آدمی ہیں اور جو کتب انہوں نے ترجمہ کی ہیں وہ زبان و بیان کے اعتبار سے اچھی کتابوں کی صف میں آتی ہیں۔ حافظہ اس بلا کا پایا ہے کہ اساتذہ قدیم کے سیکڑوں نہیں ہزاروں اشعار انہیں ازبر ہیں اور جب وہ انہیں موقع موقع سے استعمال کرتے ہیں تو سماعت کو گلکدہ بنا دیتے ہیں، قدیم وضع قطع کے مہذب اور محتاط انسان ہیں جو اس دور میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، جناب ناظر حسن زیدی نے پی ایچ ڈی کا مقالہ مومن پر لکھا تھا اور اس میں انہوں نے بڑی عرق ریزی کی تھی لیکن ابھی تک چھپ کر سامنے نہیں آیا، جب چھپے گا اس وقت مصنف کی طبع رسا کے جوہر کھلیں گے۔

پروفیسر سجاد باقر رضوی ایم اے

یوں تو سجاد باقر رضوی صاحب انگریزی کے آدمی ہیں، لیکن زبان و بیان اور اسلوب و انداز کے اعتبار سے اس قدر دلکش اور دلچسپ کہ ان کا ایک الگ مقام ہے جو سب سے الگ ہے، غزل میں ان کی انفرادیت مسلم ہے اور نثر میں بھی سکہ رائج الوقت۔

ان کے شاگرد بھی انہیں سراہتے ہیں اور استاد بھی، ان میں ایک استادانہ شان و شوکت اور ماہرانہ انداز حیات رچ بس گیا ہے۔ وہ مشاعروں میں بھی مقبول ہیں اور مذاکروں میں بھی، خوب آدمی ہیں۔

ڈاکٹر بشیر حسین ایم اے پی ایچ ڈی

موصوف یوں تو فارسی کے فاضل ہیں، لیکن انہوں نے مولوی محمد شفیع کے نوادر جمع کر کے ایسی علمی خدمت کی ہے جو کسی دور میں بھی قابل فراموش نہیں ہو سکتی، یہ ادیب بھی ہیں اور محقق بھی اعلیٰ درجے کے مجوز بھی ہیں اور بیدار دماغ استاد بھی، میں نے انہیں مخلص انسان پایا ہے۔ ان کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوں گی، ان میں ایک شفیق استاد کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

ڈاکٹر حافظ عبیداللہ ایم اے پی ایچ ڈی

عبیداللہ صاحب نے پریم چند پر مقالہ لکھ کر اپنی مخلصی اور ادبی بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے انہیں اس مقالے کی تیاری میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بالاقساط انہیں سے سنی جائیں تو لطف آتا ہے، ان کے مقالے کے مصائب سے ان کے شاگرد بھی آگاہ ہیں اور دوست بھی، جو ان کی زبان سے سنتا ہے وہ تہیہ کر لیتا ہے کہ کسی غیر ملکی ادیب پر مقالہ نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ یہ موجودہ پود جہاں کم علم ہے وہیں کم ہمت بھی ہے حالانکہ کم علم انسان کو جری اور جیالا ہونا چاہئے۔

میرے خیال سے تو انہیں اپنا سفر نامہ لکھنا چاہئے اس سے بہت سے سیاسی گوشے بھی بے نقاب ہوں گے اور علمی ادبی پہلو بھی جھلکنے لگیں گے، چونکہ عبیداللہ صاحب قدیم طرز فکر کے سیدھے سادے مسلمان ہیں اور فکر کے اس گوشے سے دور ہیں جس پر الحاد کا گمان گزرنے لگتا ہے، لیکن جس طرح بھی ہو سکتا ہے وہ اپنے شاگردوں کو مطمئن رکھتے ہیں، ڈاکٹر عبیداللہ ہر رخ سے مسلمان ہیں مگر ملا جیون جیسے مسلمان نہیں۔

خواجہ محمد زکریا ایم اے

ایک نوجوان معلم ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر ان کی گہری نظر ہے، وہ اپنی معلومات اور فیض مطالعہ سے اپنے تلامذہ کو مطمئن کر دیتے ہیں اور یہ استاد کے لیے بڑی کامیابی کی بات ہے۔

پچھلے سال وہ اکبر الہ آبادی پر مقالہ لکھ رہے تھے، اتفاقاً کراچی میں ملاقات ہوئی تو وہ اسی

جنون جستجو میں سرگرداں تھے‘ دوران گفتگو جو ان سے معلومات ہوئیں ان سے ان کی سعی دماغ اور کاوش قلم کا پتہ لگتا تھا‘ میرا خیال ہے کہ وہ تھیسس مکمل ہو چکا ہوگا۔ وہ خود بھی تندرست نوجوان ہیں اور افکار و خیالات بھی جوان رکھتے ہیں ایسے معلم سے کون ہوگا جو مستقبل کی امیدیں وابستہ نہیں کرے گا‘ خدا ان کی عمر دراز کرے اور نظر بد سے بچائے۔

تبسم کاشمیری ایم اے

موصوف بھی اورینٹل کالج کے اساتذہ میں سے ہیں‘ میں انہیں طالب علمی کے دور سے جانتا ہوں اور اپنے مشاہدے کی روشنی اور قیافے کے آثار پر انہیں ذہین اور فطین انسان کہہ سکتا ہوں‘ غالباً دو سال ہوئے انہوں نے مصحفی پر ایک قابل قدر تحقیق کی تھی اس مقالے میں ان کی ذہانت اور سعی بلیغ ان کا اعلیٰ تعارف کراتی ہے‘ ہونہار نوجوان ہیں خدا عمر دراز کرے بڑی خوبیوں کا نوجوان ہے۔

ڈاکٹر فیضان دانش بی-اے-آنرز‘ ایم-اے‘ پی-ایچ-ڈی

اس کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ”کلام ولی کا فنی و لسانی جائزہ“ ہے اردو زبان کے اساسی آثار و قرائن اور بنیادی مواد کی فراہمی کے ضمن میں یہ واحد مقالہ ہے جس میں لسانی تحقیق کے اصولوں پر کئی ایک قدیم بولیوں اور بکھری ہوئی پراکرتوں کے طول و عرض بھی سامنے آجاتے ہیں‘ یہ عظیم معلومات کا ذخیرہ اور ضخیم تحقیق لسانی کا شاہکار ابھی طباعت کی منزل سے نہیں گزرا‘ مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ مقالہ اردو زبان کی داغ بیل سے لے کر چار دیواری کے پھاٹک تک کے قابل ذکر حالات اور ارتقائی صورتوں کا البم ہے‘ ہمارے ملک میں اس لسانی انداز کے مقالے بہت کم لکھے گئے ہیں کیونکہ ایسے مقالوں کے لیے ملبہ آسانی سے نہیں ملتا۔

شاہ کامل القادری

ان سے میں صرف دو تین بار ملا ہوں مگر انہوں نے راز داری کا لبادہ نہیں اتارا‘ میں نے انہیں کھولنے کی کوشش بھی کی لیکن تہ در تہ لباس کہاں تک اترتے‘ براہوی زبان پر ان کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وسیع النظر اور کثیر المطالعہ ہونے کے ساتھ‘ تحقیق کے

آدمی بھی ہیں مگر اس مضمون کے بعد اس شان کا اور کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ انہوں نے تذکرہ بھی کیا تو اسی مضمون کا اور چھپوایا بھی تو یہی مضمون اب کی بار ملاقات ہوئی تو گفتگو رہے گی۔

ڈاکٹر افتخار احمد غوری ایم اے پی ایچ ڈی

موصوف ۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو گجرات میں پیدا ہوئے گزشتہ اٹھارہ سال تاریخ کے پروفیسر رہے، زبان انگریزی، فارسی اور فرانسیسی پر عبور ہے، تحقیق کے آدمی ہیں، لندن یونیورسٹی کی امداد سے برلن، پیرس اور ایمسٹرڈم کے مشہور کتب خانوں میں برسوں تحقیق میں مصروف رہے، پھر یہاں بحیثیت پرنسپل تربت (مکران[1]) میں متعین ہوگئے اور آج کل جوہر آباد گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ ذہن اور اس کے آثار پر ان کا تحقیقی کام میری نظر سے گزرا ہے۔ وہ قابل قدر لٹریچر ہے۔ بہت کم آدمیوں نے اس عرق ریزی سے کام کیا ہے آج کل اول تو لوگ کام کرتے ہی نہیں اور اگر کہیں کہیں کچھ کام ہوتا بھی ہے تو نہایت ہلکی اور پایاب قسم کی تحقیق ہوتی ہے۔ خال خال لوگ ایسے ہیں جو صحیح معنی میں تحقیق کا ذوق رکھتے اور اس کے اصول وضوابط سے آگاہ ہیں، کام کرنا تو دور کی بات ہے میں نے تو بہت کم ادیبوں اور دانشوروں کے یہاں اپنی ذاتی لائبریری دیکھی ہے ورنہ سب ماضی کے گھسے پٹے اقتباس وانتخاب سے کام کرتے اور علمی صحبتوں کی یادگاروں پر مختلف قسم کے جھول چڑھا کر لفظی لیپ جھپ میں گزارتے ہیں۔

ڈاکٹر غوری صاحب جو کام کرتے ہیں وہ محنت، دیانت اور ایمانداری سے کرتے ہیں یہی وجہ ہے آج کل کے حالات سے ان کا سمجھوتا نہیں ہوتا اور وہ اپنی علمی بصیرت اور مردانہ سیرت کی پاداش میں تبادلوں کے چکر میں پڑے رہتے ہیں، مگر میں نے کبھی انہیں محنت سے جی چراتے اور حالات

۱۔ مکران اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب وغریب علاقہ ہے اور یہاں کے رسم ورواج بھی دنیا سے الگ تھلگ ہیں، مثلاً پنجاب میں لڑکے کی شادی کی جاتی ہے تو وہ دلہن بیاہ کے اپنے گھر لاتا ہے مگر اس کے برخلاف مکران میں دلہن جا کر دولہا کو اپنے گھر لاتی ہے۔ اسی ذکری فرقے کے معتقدات عجیب وغریب ہیں انہوں نے تربت کے مقام پر اپنا خانہ کعبہ بنایا ہوا ہے اور وہاں حج ہوتا ہے، معاش اور معاشرے کا یہ حال ہے کہ گوشت یا مچھلی کو دھوپ میں سکھا کے رکھ لیتے ہیں اور تمام سال وہی ابال ابال کر کھاتے ہیں، ساتھ ہی بلوچستان کا علاقہ غبار آلود ہے کہ بعض بعض مقامات دیکھ کر وحشت ہوتی ہے یہاں کھجوروں کے درخت کو جاگیر یا جائداد خیال کیا جاتا ہے اور سوکھی روٹی کے ساتھ کھجوریں کھاتے ہیں غالباً یہی سبب ہے کہ وہاں کے لوگ آنکھوں کے مختلف امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

سے گھبراتے نہیں دیکھا وہ مرد ہیں اور مردانہ واری سے مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں۔
کئی سال ہوئے ڈاکٹر غوری لاہور میں محکمہ اوقاف کے مشیر تھے' انہیں دنوں غالباً مولانا کا ایک پمفلٹ دس ہزار کی تعداد میں اوقاف کے دفتر میں آیا اور ڈاکٹر غوری تک پہنچا' غالباً اس میں حلال کا مسئلہ تھا اور بتایا گیا تھا کہ اگر جانور کی گردن پر کوئی کافر بھی چھری پھیر دے تو جانور حلال ہوگیا' اس پر کلمہ کلام پڑھنے کی ضرورت نہیں' ڈاکٹر غوری نے اس خدشے کے پیش نظر اس کی تقسیم و تبلیغ سے انکار کر دیا کہ ملک بھر کے علماء جان کو آ جائیں گے۔
غالباً اسی قصور پر انہیں لاہور کے اوقاف سے علیحدہ کر دیا گیا اور محکمہ تعلیم نے انہیں مکران بھیج دیا' لیکن وہ تو اپنے عقیدے کے آدمی ہیں انہیں کوئی پروانہ ہوئی اور خوشی خوشی مکران چلے گئے اور پھر ایک اچھے خاصے وقفے کے بعد انہیں گوجرانوالہ گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی ملی اور آج کل وہ جوہر آباد میں پرنسپل ہیں غالباً گوجرانوالہ میں بھی کوئی اسی قسم کا واقعہ ہوا ہوگا جو ان کے عقیدے اور ایمان کے خلاف ہوگا' مگر وہ خوش ہیں اور جہاں ہوتے ہیں محنت اور دیانت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال

میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے ساتھ غالباً دو تین بار ان سے ملا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کے ساتھ اپنے مراسم بے تکلفی اور نزدیکی کے دعویداروں میں پچانوے فی صد دروغ گو ہیں- وہ اس ملک کی سوسائٹی اور انسانیت کے افلاس سے آگاہ تھے اور ان کی کم آمیزی ایک قسم کا تحفظ تھا- انہوں نے کبھی اس دور کے لوگوں میں بیٹھ کر تصویر نہیں کھنچوائی اور بڑے سے بڑے آدمی کو بے تکلفی کا موقع نہیں دیا- ان کی نظر میں مسلمانوں کی پستی کا غم بسا ہوا تھا اور وہ ہر طرف سے دور سے گرد وغبار آتا ہوا دیکھتے رہتے تھے- ان کی شاعری میں چھلکا نہیں ہوتا وہ مغز ہی مغز کہتے ہیں اس لیے ان کی شاعری صحیح معنوں میں مقصدی شاعری ہے-

خان احمد حسین خاں

خان احمد حسین احمد کو میں نے ایک دو بار ان کی آخری عمر میں دیکھا ہے- ان کے شباب اردو میں میری نظمیں تو چھپی ہیں لیکن ان سے نزدیکی نہیں تھی- اس لیے کہ میری زندگی کی مصروفیات ان دنوں میں ایسی جانکاہ تھیں کہ کسی ادیب یا شاعر سے ملنے جلنے کا وقت نہیں ملتا تھا- علاوہ ازیں میرے گھر کی تربیت ایسی تھی کہ رکھ رکھاؤ اور ادب احترام کا سلسلہ پختہ ہو کر احساس کمتری سے ملنے لگا تھا- اگرچہ وہ احساس کمتری ہرگز نہیں ہوتا مگر میرا خیال کچھ اسی قسم کا تھا-

خان احمد حسین خاں صاحب افسانہ نویس بھی تھے اور شاعر بھی' مصنف بھی تھے اور مترجم بھی ان کی تصنیفات وتالیفات میں ڈیڑھ سو کتابیں گننے میں آتی ہیں- ان میں سے سیرۃ احمدی اور آب بقا خصوصاً قابل ذکر ہیں- سیرۃ احمدی تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کی سوانح ہے اور آب بقا ان کے کلام کا مجموعہ ہے-

قاضی عبداللطیف اجل انبالوی

اجل صاحب سے میں انبالہ میں ملا ہوں وہ اساتذہ کے زمرہ کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے- ملک کی تقسیم ہوئی تو وہ راولپنڈی میں آ گئے تھے ان کے یہاں ایک معیاری کتب خانہ تھا

جسے وہ پاکستان میں لے آئے تھے- انہوں نے راولپنڈی میں وفات پائی نہ جانے ان کا کتب خانہ کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟ ان کے کتب خانے میں ادبی اور فنی کتابیں بہتات سے تھیں خدا کرے کہیں محفوظ ہوں- ان کا مجموعہ کلام نہ جانے چھپا ہے یا نہیں-

اطہرؔ ہاپوڑی

جناب معشوق علی تخلص اطہر ہاپوڑی' ذوق شعر لڑکپن ہی سے تھا- اردو' عربی' فارسی میں قابل رشک قابلیت کے مالک تھے پہلے جناب ناظرؔ اور بعد میں حضرت جلال سے اکتساب فن کیا- کچھ دنوں میرٹھ میں مقیم رہے اس کے بعد بریلی میں دو تین سال رہے اور جہاں گئے مجلس شعر و ادب کی بنیاد ڈالی انہیں فن شعر میں استادی کا درجہ حاصل تھا- جب بھی وہ لاہور آتے تو میرے کتب خانہ میں ضرور تشریف لاتے میں ان کا بزرگوں کی طرح ادب کرتا ہوں اور وہ مجھ پر والہانہ کرم فرماتے ہیں-

جناب اطہر کی شاعری میں فنی نقائص شاذ ہی مل سکیں گے کیونکہ وہ اپنے دور کے غیر معمولی ماہر فن تھے یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں اشعار میں قدیم انداز ہے مگر جہاں تک الفاظ کے استعمال اور زبان کے اعتبار سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال ہے وہ ان کے یہاں صحیح اور برمحل ہے-

انہوں نے نہ تو شاعری کم کی ہے اور نہ مضامین کم لکھے ہیں لیکن اب تک یہ لٹریچر پردۂ اخفا میں ہے نہ جانے ان کے دو ورثا سے میں یہ دولت کس کے پاس ہے اگر ان کے تنقیدی مضامین اور شاعری کتابی صورت میں نہ آئی تو ادب کا بڑا خسارہ ہوگا-

ابوالعلا چشتی جموی

جناب چشتی جموں کے رہنے والے تھے وہ شعر بھی نہایت اچھا کہتے ہیں اور نثر بھی معمولی نہیں ہوتی ان کے یہاں تحقیق و تدقیق کا ذوق بدرجہ اتم موجود ہے اور شعر و ادب کے عیوب و محاسن پر انہیں بڑا عبور ہے- جموں میں ان کی ذات سے اردو زبان کو بڑا فائدہ پہنچا ہے- وہاں جو بزم ادب قائم ہوتی تھی وہ چشتی صاحب کی سرپرستی کے بغیر نامکمل رہتی تھی ان کی ایک کتاب بھی موجود ہے جو تحقیق الفاظ پر قابل قدر کتاب ہے-

جناب اثرلکھنوی مرحوم

جعفر علی خاں اثرؔ افسر قسم کے بزرگ مگر قدیم روایات کے حامل اور شعروادب میں ایک بلند معیار جو ان کے ذوق سلیم کا پتہ دیتا ہے۔ ساری عمر سرکاری ملازمت میں گزری پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے اور اسی میں سرکار انگریزی سے خان بہادری ملی اور اس کے علاوہ بھی ایک خطاب ملا جو ایم۔ بی۔ ای کہلاتا ہے۔ ریٹائر ہوئے تو الہ آباد میں ایڈیشنل کمشنر مقرر ہو گئے اور وہاں سے ریاست جموں کشمیر میں ہوم ممبر اور وزیر تعلیم کے عہدہ پر لے لیے گئے۔ اس کے بعد اپنے وطن لکھنؤ میں چلے گئے اور خدمت شعروادب یوں تو زندگی بھر کی لیکن اب تو ان کا یہی مشغلہ ہو گیا۔

ان کے کلام کا مجموعہ ''بہاراں'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس سے پہلے بھی ایک مجموعہ اثرستان کے نام سے چھپا تھا جسے انہوں نے بعض وجوہ سے نظر انداز کر دیا تھا اس کی صحیح صورت بہاراں میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی نظموں کے دو تین مجموعے چھپے ہیں۔

ان کے کلام سے ان کی مشاقی اور قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے وہ کسی صنف سخن میں بھی عاجز نظر نہیں آتے لکھنؤ کی زبان اور محاورے بڑے استادانہ انداز سے صرف شعر کرتے ہیں اور ان کے ہر شعر سے ان کی دقت نظر کا پتا چلتا ہے۔ زمانہ کی روش کے ساتھ انہوں نے ترجمے بھی کئے ہیں اور معرا نظمیں بھی ان کے مجموعوں میں شامل ہیں کشمیر میں قیام کی بدولت کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں منظر کشی ہے ان تمام آثار سے معلوم ہوتے ہے کہ انہوں نے ہر زمانہ کا ساتھ دیا ہے اور خود کو وقت کے تقاضے کے ساتھ ڈھال لیا لیکن میں ان کی شاعری سے زیادہ ان کے وہ مضامین اردو ادب کے لیے مفید خیال کرتا ہوں جو انہوں نے زبان و بیان اور تحقیق تدقیق کی رو میں سپرد قلم کئے ہیں۔

اصغر گونڈوی

اصغر حسین نام اصغرؔ تخلص، جب مجھے قدیر لکھنوی لاہور سے پہلی بار لکھنؤ مشاعرہ میں لے گئے تو وہیں اصغر صاحب سے بھی شرف ملاقات ہوا۔ سیدھے سادے باوضع اور محتاط زندگی کے انسان تھے کسی اسکول یا کالج سے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ لیکن پھر اردو، فارسی کی طرف توجہ دی تو استاد کہلائے اس سے ثابت ہوا کہ فطری طور پر جو لوگ طباع اور ذہین پیدا ہوتے ہیں انہیں حصول تعلیم

میں دقت نہیں ہوتی البتہ پابندی سے بھاگتے ہیں۔

اصغر صاحب شروع میں گونڈہ میں چشمہ سازی کا کام کرتے تھے اور بعد میں ایک عرصہ تک رسالہ ''ہندوستانی'' الہ آباد کے مدیر رہے اس رسالے میں ان کے کئی مضامین ان کی ذہانت اور طبائع کے ضامن ہیں۔ انہوں نے ایک نفسیاتی تاریخ ادب کی تاغ بیل ڈالی جو مضامین کی صورت میں ان کے رسالہ ''ہندوستانی'' میں چھپتی رہی۔ اس کا قلمی نسخہ میں نے جگر صاحب کے پاس بھی دیکھا تھا لیکن پھر کہیں اس کا پتا نہ چل سکا کہ کہاں ہے اور چھپی بھی ہے یا نہیں۔

اصغر صاحب چونکہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت تھے اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا مسلک تصوف ہی ہونا چاہئے تھا' چنانچہ ان کے کلام میں تصوف جس فلسفیانہ انداز میں ملتا ہے وہ بہت کم لوگوں کو میسر ہے اصغر صاحب نے پہلے وجد بلگرامی سے مشورہ کلام کیا بعد ازاں سلیم لکھنوی کو غزلیں دکھائیں لیکن ان کا رنگ ایک جدا حسن لیے ہوئے ہے۔ تمام شاعری سنجیدگی اور متانت کا مرقع' شرافت میں ڈوبا ہوا انداز بیان اور مفہوم میں ایک کام کی بات جو عوام کے نقطہ نگاہ سے بچ کر ہوتی ہے وہ جس نزاکت سے جذبات کو شعر کا لباس دیتے تھے۔ اس کی مثال تک دماغ رسائی نہیں کرتا۔ وہ سنجیدہ اور متین رہتے ہوئے اس شگفتگی سے بات کہہ جاتے ہیں کہ دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے صرف اصغر کے کلام میں احساس خودی کو ساز میں ڈھال کر شعر کا نام دیا جاتا ہے۔

حضرت آزاد انصاری

جناب آزاد انصاری سے جناب جوش کے یہاں ملاقات ہوئی۔ جوش صاحب غزل کے خلاف اور آزاد صاحب غزل کی موافقت میں رطب اللسان تھے اور دونوں اپنے اپنے موقف پر ایسے ستون تھے جن کا جنبش کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔

آزاد انصاری صاحب نہایت خلیق' طباع اور قادر الکلام شاعر تھے اور خلوص ان کی روش تھی ہر شخص سے شریفانہ برتاؤ اور محبت کا اظہار ان کا شیوہ تھا لیکن حضرت جوش ملیح آبادی سے وہ ایسے بے تکلف تھے کہ کوئی دوسرا سنے تو دونوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن سمجھے مگر دونوں ایسے دوست کہ ایک دوسرے کے لیے لڑ مریں۔

آزاد کی شاعری سہل ممتنع ہے اور یہی صفت صحیح معنی میں شاعری کی تعریف پر پوری اترتی ہے۔ اشعار میں الجھن نام کو نہیں، ابہام اگر کہیں ہے تو بڑا خوشگوار اور نرمی لیے ہوئے روانی ایسی کہ کلام پڑھتے چلے جایئے نہ اغلاق نہ ثقالت، نہایت سلیس اور سادہ الفاظ میں اوزان و بحور کا حسن جادو کا کام کرتا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کے اصول وضوابط اور فن کا تعلق ہے آزاد انصاری اس سے کما حقہٗ واقف ہی نہیں بلکہ اس کے شناور تھے ان کی شاعری میں جہاں جدت خیال موجود ہے وہاں حسن خیال اور اسلوب بیان بھی نظر انداز نہیں ہوتا۔ بلاشبہ آزاد انصاری کی شاعری قابل تقلید ہے ۱۹۴۲ء میں وفات پائی اور یادگار ایک دیوان ''معارف جمیل'' بھی چھوڑا ہے۔

اعجاز الحق قدوسی

قدوسی صاحب بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور بڑے بڑے علماء فضلاء سے قریب رہے ہیں مولینا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور دوستوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں جناب جوش ملیح آبادی کی نزدیکی سے ان کے کلام میں ایک خاص بات آ گئی کہ غزلوں میں بھی ایک تسلسل ہوتا ہے۔ نظم ہو یا غزل جذبات و احساسات کے بل پر تخلیق ہوتی ہے اور ایک خاص قسم کا تیکھا پن پایا جاتا ہے۔ بحیثیت انسان بڑے بلند کردار اور وفادار انسان ہیں اور ضعیفی میں جوانی سے زیادہ کشش رکھتے ہیں۔

مسعود حسین ادیب لکھنوی

جناب ادیب لکھنوؔ کی بہت مشہور شخصیتوں میں ہیں ادب و تحقیق میں جو آپ نے کام کیا ہے اسے اردو زبان نہیں بھلا سکتی۔ مسعود حسین صاحب یونیورسٹی میں استاد ہیں اور ان کے لیے لفظ استاد زیب دیتا ہے۔ ان کی تمام تصنیفات و تالیفات ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی قابلیت اور فنکاری کا ثبوت ہیں وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور وہ گھٹیا درجے کی نہیں ہوتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تحقیق کے آدمی ہیں اور انہیں وہی کرنا چاہئے۔

امیں حزیں سیالکوٹی

خواجہ محمد مسیح پال نام اور امین حزیں تخلص، یہ خاندان کشمیر سے پنجاب میں منتقل ہوا- فارسی، عربی کی تعلیم سید میر حسن صاحب سے پائی - گلگت کے پولیٹیکل محکمہ میں ملازم رہے اور وہیں سے ترقی کر کے سرکار انگریزی سے خان بہادری کا خطاب پایا اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر اردو ادب کی خدمت میں لگ گئے- شروع شروع میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان سے متاثر رہے اور پھر اقبال کے رنگ کو اپنانے لگے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظم میں اقبال کے مقلد ہو گئے اور غزل میں غالب کی تقلید کرتے رہے-

امیں حزیں کے پیش نظر علامہ اقبال ہی کا کلام رہا اور وہ اپنے خیالات ونظریات کو بھی اسی رنگ میں بیان کرتے تھے لیکن ان کے یہاں سلاست ایسی ہے کہ یہی ایک حد فاصل ان کے اور علامہ اقبال کے کلام میں مابہ الامتیاز ہو کر رہ گئی- وہ اپنی دانست میں اقبال کی تقلید کے تحت رسمی باتوں اور معمولی روزمرہ کے خیالات سے گریز کرتے تھے-لیکن اقبال کے آسمانی نظریات کہاں سے لائیں چنانچہ پھر سیدھے سادے الفاظ میں اپنی حدود کے اندر مفید اور کارآمد باتیں نظم کر دیتے ہیں- جو معاشرہ اور ملک کے لیے مفید خیال کرتے ہیں- سب سے بڑی خصوصیت امیں حزیں کے کلام کی ان کا خلوص اور اسلامی تصورات جس سے ان کی شاعری مفید اور کارآمد شے بن گئی ہے-

ملک کے وقیع جرائد میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے اور اچھے لوگوں کے مطالعے میں رہا ہے جو ایک مجموعے کی صورت میں بھی ہے، غالباً گلبانگ حیات نام ہے-

آرزو لکھنوی

جناب انور حسین آرزو، یہ بھی لکھنؤ کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے-حضرت جلال کے شاگرد تھے بڑے ہی سادہ مزاج اور سادہ لباس اور کلام میں بھی اسی سادگی کو روا رکھا- میں آرزو سے کئی مشاعروں میں ملا اور ہر بار انہوں نے دل پر اپنے خلوص اور فنی بلندی کا ایک نیا نقش چھوڑا-عروض پر گفتگو شروع ہوئی تو ایسے ایسے نکات بیان کیے کہ سبحان اللہ- زبان کے کسی پہلو پر بات ہوئی تو ایسے رخ سے چلے کہ پوری تاریخ زبان سامنے چلتی پھرتی دکھائی دینے لگی- ان کی ایک کتاب سریلی

بانسری جو بے عطف و اضافت غزلیات کا مجموعہ ہے غالباً آخری کتاب ہے اور آئینہ ہے ان کی مہارت قابلیت اور فکری بلندی کا جب آدمی مخلص ہو اور ساتھ ہی خوددار بھی تو ظاہر ہے کہ اسے ہمیشہ معاشی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آرزو صاحب کو بھی معاشی تنگی کے باعث لکھنو کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ بمبئی میں جاکر فلم کمپنیوں کے لیے گیت اور مکالمے لکھنے لگے۔ چونکہ مسلم الثبوت استاد تھے اس لیے وہ اس میں بھی کامیاب رہے یوں تو ان کے کئی دیوان خندان آرزو اور جہاں آرزو وغیرہ ہیں لیکن اہل ادب کے لیے ان کی کتاب ''نظام اردو'' نہایت اچھی کتاب ہے۔

افق امروہوی

سید حبیب احمد افق کاظمی امروہوی ملتان میں جامعہ انوار العلوم کے ناظم اعلیٰ ہیں ان کی عربی، فارسی اور اردو میں مہارت سے کسے انکار ہو سکتا ہے وہ ملک کے علماء وفضلا کی صف کے انسان ہیں اور نہ جانے کتنے شاگردان سے استفادہ کر کے اپنے اپنے مقامات حاصل کر چکے ہیں۔ مذہبی تصورات اور قدیم تہذیب کے دلدادہ ہیں اور شاعری بھی اپنی اسی قدیم روش کی کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری تقلیدی شاعری ہے وہ غزل، نظم، نعت، قصیدہ، قطعات وغیرہ سب اصناف پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ ان کی اصلاحی نظمیں اور دوسرا کلام چھپ چکا ہے۔ ابھی فروغ محامد کے نام سے ان کا ایک نعتیہ کلام مجموعہ طبع ہوا ہے جو ان کے معتقدات اور خلوص کا آئینہ دار ہے آپ کی کئی ادبی کتابیں ہیں جن میں صحیفہ مصحفی اور انتخاب مصحفی ریسرچ کرنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔

احسن مارہروی

سید علی حسن نام احسن تخلص، مولانا احسن جہاں ایک عالی خاندان کے فرد تھے وہیں ایک شفیق استاد بھی تھے۔ مولانا کا شعر و سخن کا ذوق خاندانی ورثہ تھا اردو فارسی کے منتہی اور عبادت گزار بزرگوں میں تھے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور ہزاروں نوجوانوں کے استاذ استاد کی محبت کے شوق میں حیدرآباد چلے گئے اور کئی برس استاد کی خدمت میں رہے اور اس اثنا میں داغ کی سوانح عمری ''جلوہ داغ'' کے نام سے لکھ کر شائع کی اور فصیح اللغات کا ڈول ڈالا جو کلام داغ کے محاورات پر مشتمل ہوتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی۔ داغ کے انتقال کے بعد مولانا احسن کچھ روز لاہور میں بھی آ

کرر ہے اور پھر لالہ مسری رام کے ساتھ خمخانہ جاوید کا مسودہ لکھا کرتے تھے پھر ایک رسالہ فصیح الملک کے نام سے جاری کیا- جو غالباً ۱۹۱۰ء تک جاری رہا-

مولانا احسن مجھ پر شفقت فرماتے تھے اور میری واقعاتی نظموں کے بڑے مداح تھے چنانچہ بریلی کی اردو کانفرنس میں جو انہوں نے منظر نگاری پر مقالہ پڑھا اس میں میرے لیے ایسے فقرے لکھے ہیں جن پر مجھے فخر ہے-

جناب ارشد تھانوی

شعراء میں مشہور ہیں ان کی مشق پختہ اور خیالات بلند ہیں غزل اور نظم دونوں اصناف پر انہیں عبور ہے ان کی نظر تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی اس لیے ان کے کلام میں ایک ماہر نفسیات کا انداز بھی ہے- تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں لیکن ایک زمانہ بھوپال میں گزرا اب تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے- ان کی کئی ایک کتابیں نظم و نثر کے نمونے ہیں-

سید احتشام حسین ماہلی

لکھنو اور الہ آباد کے علاوہ کئی مشاعروں میں احتشام صاحب سے ملاقاتیں رہی ہیں- یوں تو وہ خاموش قسم کے انسان ہیں لیکن جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے وہ اساتذہ کی صف میں ہیں- بلکہ اب تو میں یہ کہوں گا کہ وہ استادگر ہیں ان کے سیکڑوں شاگرد شب و روز اردو کی خدمت میں منہمک ہیں اور انہیں ان کی شاگردی پر فخر ہے- شعر اور اس کے اردگرد کے اصول و ضوابط پر بھی ان کی بڑی ناقدانہ نظر ہے اور خود بھی بلند معیار کے شاعر ہیں لیکن شاعری سے زیادہ ان کی تنقید اردو ادب کے لیے مفید اور سودمند ہے کیونکہ ان کی تنقید تخلیق کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے-

اختر شیرانی

محمد داؤد خان' اختر شیرانی پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کے صاحبزادے تھے ان کا اصل وطن ریاست ٹونک (راجپوتانہ) تھا اور اختر کی تعلیم ٹونک ہی میں ہوئی - اختر کو اردو' فارسی پر قابل رشک عبور تھا اس کے علاوہ اختر کو فن خطاطی میں بھی اچھا خاصا درک تھا اور اس سلیقے کا پتہ ان کے ان

رسالوں سے لگتا ہے جو ان کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں۔

جب حافظ محمود شیرانی صاحب اسلامیہ کالج میں پروفیسر تھے انہوں نے اختر کو بھی لاہور بلا لیا تھا۔ لاہور میں آ کر اختر نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر میٹرک کی تیاری شروع کر دی لیکن حافظ صاحب کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور لاہور کے بعض ایسے حلقوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا جو شعر و شاعری کا شور تو مچاتے تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ ہر اٹھتی ہوئی قوت کو پامال کرتے تھے۔ علامہ تاجور جن سے وہ مستقل طور پر اصلاح لیتے تھے انہیں رات دن سمجھاتے تھے کیونکہ خود ان کو اس ماحول کا تجربہ تھا لیکن جوانی دوسروں کے تجربات پر کہاں اعتماد کرتی ہے اختر نے اپنی روش نہیں بدلی۔ انہوں نے مختلف رسالوں میں مضامین بھی لکھے جن کی وجہ سے ان کی مقبولیت بڑھ گئی لیکن جتنی ان کی مقبولیت بڑھتی گئی ان کی رنگین مگر تباہ کن صحبتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

وہ لاہور میں ہمایوں اور انتخاب کے ایڈیٹر بھی رہے اور ان کی وجہ سے وہ بڑے مقبول بھی رہے لیکن یہ مقبولیت ان کے بعض دوستوں پر گراں گزرتی چلی گئی اور وہ دن رات داد و تحسین کی موجوں میں بہا کر انہیں اس مقام پر لے آئے جہاں سے بلندیاں اوجھل ہو جاتی ہیں لیکن اختر کی ذہانت اور طباعی اس تمام سیلاب بربادی کے باوصف اپنی جگہ برقرار تھی۔ انہوں نے انہیں دنوں رسالہ ''خیالستان'' نکالا جو ان کے خیر خواہوں کی بد دیانتی کی نذر ہو گیا مگر اس کے بعد انہوں نے ''رومان'' کا اجراء کیا اور کچھ دنوں وہ بھی مقبولیت کی منازل طے کر کے یک دم غروب ہو گیا۔ پھر انہیں مولانا تاجور مرحوم نے اپنے رسالہ ''شاہکار'' کا مدیر بنا دیا لیکن اس وقت وہ ان راستوں پر گامزن ہو چکے تھے جہاں فرض کا احساس زبانی حد تک رہ جاتا ہے اور دست و پا بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہاں اسے بھی وہ کہولت بے حواسی اور غیر حاضری کے باعث علیحدہ ہو گئے۔

اختر شیرانی ایک شریف خاندان کے فرد تھے اور ان میں شریفانہ خون گردش کرتا تھا اس لیے وہ کبھی شرافت سے باغی نہیں ہوئے۔ وہ خلوص محبت اور اپنے آبائی ورثہ شعر و ادب کے ہمیشہ محافظ رہے اس سے یہ ہوا کہ لاہور ہی کے نہیں بلکہ ملک بھر کے تمام ادبی حلقے ان سے روشناس ہو گئے اور ہر طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے۔

اگر دیکھا جائے تو اختر شیرانی کی زود اعتباری، شرافت، دوستداری اور رنگین صحبتی نے علم و ادب

کے راستوں میں ان کے لیے پھاٹک لگادیئے تھے اور انہیں اس جگہ لے آئے تھے جہاں اچھے برے میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے چنانچہ خیر خواہوں سے بدگمانی اور دشمنوں سے خوش گمانی ان کا شعار ہو گیا تھا۔بعض اوقات وہ حکیم نیر واسطی سے بھی بگڑ جاتے تھے اور وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے تھے۔

اختر شیرانی کے ناؤنوش کا حلقہ انہیں ابھار ابھار کر وہاں لے آیا تھا کہ وہ ترک بادہ پر حاوی نہیں آسکتے تھے سیکڑوں بار توبہ کی مگر

توبہ تو میں نے کی تھی ساقی کو کیا ہوا تھا

مے خانہ میں جاکر توبہ کو صحیح سالم لانا وہ رندی کی توہین خیال کرتے تھے چنانچہ ان کی توبہ کے کئی عرس اسی طرح ہوئے۔

آخر کہاں تک' نقصان رساں شے کہاں تک نقصان سے باز رہتی اردو کے اس شباب نگار شاعر اور بانکے ادیب کو ۱۹۴۸ء میں موت کا پیغام مل گیا جس کی تعمیل ہر انسان کو کرنا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اختر شیرانی یوں تو ہر صنف سخن پر عبور رکھتے تھے اور ہیت کے اعتبار سے انہوں نے نظم کی کئی صورتیں ایجاد کیں۔لیکن ان کی تمام شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہے کہ وہ شاعر شباب ہے اور حسن وعشق کا بیان اس کے یہاں اس نکھار کے ساتھ ہے کہ پورے ملک میں اپنے مقام پر وہ تنہا ہے۔اظہار جذبات کے ساتھ الفاظ میں موسیقیت کی چاشنی اس کی شاعری کے خاص عنصر ہیں۔نظم ہو یا غزل' سانیٹ ہو یا منظر نگاری سب میں اس کی انفرادیت بولتی ہے۔ اختر کے یہاں تراکیب کی جدت اور الفاظ کا محل استعمال ایسا ہے کہ ہمیں آج وہ بات کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے زندگی کے بے شمار شب وروز ان کی خدمت میں گزارے ہیں اور میں اس کے لیے صرف اس فقرے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ قابل رحم انسان تھا کاش ہمارے ملک میں انسان فہمی بھی ہوتی۔

انہوں نے اپنی نظموں میں جن موضوعات کا اضافہ کیا ہے وہ ہمارے اردو ادب میں اس سے پہلے نظر نہیں آتا جہاں تک شاعری میں آہنگ کا تعلق ہے وہ اختر کے یہاں عجیب عجیب انداز سے جلوہ گر ہے جدت تشبیہ ان کی ایسی طبع زاد جلوہ گری ہے جو اختر کو صرف ہندوستان ہی نہیں دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے شاعروں سے بھی بلند کر دیتی ہے۔

اختر کی غزلیں ان کے مخصوص رنگ کی غزلیں ہیں جن میں کوئی اینچ پیچ کی بات نہیں بلکہ دل کی آواز کو شعر کے سانچوں میں ڈھالا ہوا ہے۔ وہ اپنی روش کا ایک ہی شاعر ہے جو اردو ادب میں اپنی انفرادیت سے زندہ رہے گا۔ اس کے نظم اور نثر کے آٹھ مجموعے چھپ چکے ہیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے اختر شیرانی کے جنازے میں سترہ اٹھارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے ان کے رات دن کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ان سے منہ موڑ گئے تھے ہم اس معاملہ میں حکیم نیر واسطی کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے ہمیشہ ان کی دلداری کی اور مرتے دم تک ساتھ دیا۔

اظہار میرٹھی

جناب اظہار سے میری ملاقات میرٹھ ہی میں ہوئی تھی ان دنوں وہ تمباکو کی دکان کرتے تھے بڑے مہذب اور کم آمیز قسم کے انسان ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں ان کے یہاں حسن و عشق کا اظہار بڑے شریفانہ انداز سے ہوتا ہے اور کہیں ابتذال نہیں آنے پاتا تقسیم ملک کے بعد دہلی میں صرف ایک بار ملاقات ہوئی اس وقت بھی ان کے یہاں کلام میں وہی گرمی اور شگفتگی تھی ورنہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ عمر کے ساتھ کلام کی شگفتگی سرد ہو جاتی ہے۔

الفت ایمن آبادی

یوں الفت صاحب کی نثری تحریریں بھی چھپتی تھیں، وہ حقیقت میں شاعر تھے اور اچھا خاصا شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کا کوئی مجموعہ نہیں دیکھا۔ وہ ایمن آباد کے رہنے والے تھے جو غالباً ضلع شاہدرہ میں ایک مختصر سا قریہ ہے لاہور میں اکثر ان کا آنا جانا رہتا تھا۔

امداد صابری

جناب امداد صابری دہلی کے مشہور لوگوں میں سے ہیں وہ صحیح معنی میں علمی ادبی انسان ہیں ان کی نظر ادب و تاریخ کے ایسے ایسے گوشوں پر پڑتی ہے جو عموماً اچھوتے ہوتے ہیں۔ ان کا قلم تحقیق کی سنگلاخ رہ گزاروں کا مسافر اور نظر دفتر پارینہ کی چھان بین میں طاق ہے وہ اپنی سیاسی اور دینی اعتقاد میں بھی مستحکم ہیں اور علمی و ادبی محاذ پر بھی سینہ سپر رہتے ہیں۔ وہ ادب میں موجودہ دور کی

جدیدیت کے قائل نہیں وہ علم میں اضافوں اور عمل میں صراط مستقیم کے دلدادہ ہیں۔

ابواللیث صدیقی

کراچی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ تعلیم کے زمانے سے مضامین لکھتے تھے وہی شوق اب تصنیف و تالیف میں ڈھل گیا اور تنقید و تحقیق میں انہیں ایک نمایاں مقام حاصل ہے زندگی بھر شعرو ادب سے متعلق رہے ہیں اس لیے ادبی تاریخ و تنقید پر ان کی بڑی تفصیلی نظر ہے تحقیق میں بھی ابو اللیث صاحب کا کام قابل قدر ہے ادب کے دوسرے شعبوں کی تعمیر کے بجائے صرف تحقیق کرتے ہیں کیونکہ اس ملک میں ذوق تحقیق بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور تحقیق ہی ایسا شعبہ ہے جو علوم کی قدر و قیمت بتاتا اور محقق کا معیار قائم کرتا ہے ابواللیث صاحب کی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں جو صحیح معنی میں ان کے اعلیٰ ادبی مقام کا اعلان کرتی ہیں۔

افسر امروہوی

جناب افسر امروہوی ایک جلیل القدر شاعر اور محقق ہیں انہیں مصحفی کے کلام و حیات کے علاوہ اس قدر معلومات ہیں کہ اگر چھپ جائیں تو کئی جلدیں ہو سکتی ہیں مصحفی کے تلامذہ پر ان کے پاس جس قدر مواد ہے شاید ہی اس ملک میں کسی کے یہاں موجود ہو آج کل وہ انجمن ترقی اردو میں کام کر رہے ہیں۔ تحقیقی رخ پر افسر امروہوی صاحب کا دم اس زمانے میں غنیمت ہے وہ نہایت شریف مہذب اور قدیم رکھ رکھاؤ کے انسان ہیں۔ شعر و شاعری میں بھی وہ جس رنگ میں کہتے ہیں خوب کہتے ہیں مگر ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

گورسرن ناتھ ادیب

گورسرن ناتھ ادیب سے جب میری ملاقات ہوئی اس وقت قصبہ کھاتولی ضلع مظفر نگر میں ہیڈ ماسٹر تھے اور بڑی کامیاب غزلیں کہتے تھے روش تو وہی قدیم تھی لیکن اس میں ان کی معلومات اور طبیعت کی اپج ان کی بلند معیاری کا پتہ دیتی تھی وہ بڑے خلیق اور ملنسار قسم کے انسان ہیں اور فن شعر کے مصائب و محاسن پر ان کو عبور ہے۔ ان کا شعری مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن ان کا کلام جس

قدر بھی سنا ہے وہ معمولی شاعر کا کلام نہیں تھا۔

جناب امجد حیدر آبادی

وطن حیدر آباد دکن لیکن زبان و بیان پر حیرت انگیز عبور' سادہ اور درویش صفت انسان زیادہ رباعیات کہتے تھے اور ان میں تصوف بھی ہوتا تھا' حکمت بھی' فلسفہ بھی اور اقدار حیات بھی ان کے کئی مجموعے چھپے ہیں اور مجموعوں پر کئی کتابیں آئی ہیں۔

اثر صہبائی

عبدالسمیع پال اثر صہبائی' وطن سیالکوٹ ہے اور کشمیری نژاد ہیں۔ لاہور سے ایم اے' ایل ایل بی کیا میں نے جب میدان شعر میں قدم رکھا اس وقت جناب اثر صہبائی اچھے مشہور اور ہر دل عزیز شاعر تھے۔ لاہور میں آ کر ان کی شاعری شباب پر آئی اور ملک کے وقیع رسالوں اور اخباروں میں چھپنے لگے اول اول اثر صاحب کے اشعار عام روش کے مطابق حسن و عشق کے جذبات سے پر مگر خوشگوار ہوتے تھے لیکن پھر زندگی کے کئی اہم حادثوں سے یک دم شباب کی تمام رنگینیاں اور جذبات نگاریاں حزن و ملال میں بدل گئیں۔

اثر صاحب بڑے خوش اخلاق' ملنسار اور بزرگوں کی طرح اسلامی خیالات اور وضع کے پابند تھے وہ عام شاعروں کی طرح سطحی خیالات و عمل کے آدمی نہیں تھے بلکہ محتاط قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حالانکہ اثر صاحب کی زندگی وکالت میں گزری۔ لیکن اثر صاحب جیسے شریف الطبع وکیل بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں اور غالباً یہ ان کی بچپن کی تربیت کا اثر تھا کہ علم و ادب کے شدائی اور مذہبی اقدار کے شیدائی رہے اثر صاحب جناب امین حزیں کے برادر خورد تھے۔ شروع میں جناب امین حزیں کو اپنا کلام دکھایا جوں جوں دل و دماغ نے ترقی کی انہیں بہتر سے بہتر کی تلاش بڑھتی چلی گئی اور آخر میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی شاگردی پر آ کر رکے ان سے پہلے جناب وتاتریہ کیفی اور جناب اثر لکھنوی نے بھی ان کے کلام کا بیشتر حصہ دیکھا۔ مگر وہ مولانا تاجور مرحوم کے فیض صحبت میں آ کر مطمئن ہوئے۔

وہ حسن و عشق کے پست جذبات اور عامیانہ خیالات سے گریز کرتے تھے۔ وہ پاکستان کے

ممتاز شعراء میں شمار ہونے لگے۔ آخر آخر ان کے کلام میں اسلامی فلسفہ ڈھلنے لگا تھا اور اس میں جگہ جگہ بزرگان طریقت کے اقوال علامہ اقبال کا مطالعہ اور میر و غالب کا انداز بیان اپنی جھنکار دیتا ہے۔ بلند خیالات کو سلجھا کر شعر کی صورت میں لانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں لیکن اثر صاحب کے یہاں جگہ جگہ یہ بات ملے گی۔ یوں تو کسی بھی صنف سخن میں وہ بند معلوم نہیں ہوتے لیکن وہ قطعات میں اپنے صحیح جذبات کا اظہار بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں بھی کہیں معیار سے گری ہوئی معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن ان کے قطعات خاص طور پر ان کے وہ نشتر ہیں جو دل تک اتر جاتے ہیں۔ ان کے قطعات کا ایک مجموعہ ''جام صہبائی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور مجموعہ کلام ''خمستان'' کی بھی اچھی خاصی ضخامت ہے۔ میرے علم میں ان کے اور بھی کئی مجموعے ہیں جن میں ''بام ظہور''، ''بام رفعت'' اور ''روح صہبائی'' شامل ہیں لیکن میں ان کے خمستان کو ان کا شاہکار خیال کرتا ہوں۔

عبدالحمید ارشد

عبدالحمید ارشد بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور بڑے ہی مخلص انسان ان کا مطالعہ بھی قابل قدر ہے اور مشاہدہ بھی قابل ستائش۔ ان کے اشعار میں بھی جگہ جگہ ان کے نگاہ و دل ہی کی کارفرمائی رنگ دکھا رہی ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر یکساں عبور ہے اور تحقیق میں بھی ان کے فکر رسا کی پرواز پست نہیں بلند پروازی ان کا معمول ہے اور جب یہ اپنے تجربات، مشاہدات اور مطالعات بیان کرتے ہیں اس وقت ان کی فکر کی سمتیں معلوم ہوتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ اپنی تحقیق کو کاغذ پر لا کر ملک آشنا کر دیں تو شاعری سے زیادہ مفید اور دقیع کام ہوگا۔

جناب ارشد نہایت خوش مذاق اور خوش ذوق انسان ہیں۔ ان سے مل کر سیری نہیں ہوتی ورنہ عموماً بزرگوں سے جلد طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ شاعر ہیں، ادیب ہیں، فلسفی ہیں، اور وہ سب کچھ ہیں جو انہیں ہونا چاہئے۔ بہاول پور میں ان کا دم غنیمت ہی نہیں نعمت ہے۔

فقیر موہانی

بڑے کہنہ مشق شاعر اور فن تاریخ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے شعر و ادب کے عیب و ثواب پر بھی ان کے دو ایک رسالے تقسیم کے بعد نظر سے گزرے لیکن کہیں ان کے کلام کا مجموعہ نظر نہیں آیا یوں تو سیدھے سادے اور فقیر منش تھے لیکن جہاں شعر و ادب میں اختلاف کرتے تھے وہاں وہ ایک تیغ بے نیام بھی تھے۔ ایسا باہوش، فقیر بہت کم نظر سے گزرا ہے۔

حکیم آشفتہ

جناب آشفتہ لکھنو کے مشہور لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں شاعری میں خاص ملکہ ہے جو بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ لکھنؤ میں رہ کر دہلی کی زبان پر پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور اپنی غزل میں جہاں کی زبان چاہتے ہیں قدرت کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں۔ انہیں روزمرہ اور محاورات پر عبور ہے اور مجلس آرائی ان کی زندگی کی خصوصیات میں شامل ہے۔ وہ دوستوں کے بغیر اور دوست ان کے بغیر سکون سے نہیں رہتے۔ ان کا اب تک کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

جلال الدین اکبر

چودھری جلال الدین اکبر کا مجموعہ کلام نقش ارژنگ اس وقت چھپ چکا تھا جب میری شاعری ابھی آنکھیں مل رہی تھی۔ یوں تو وہ بی۔ اے آنرز ہیں۔ لیکن ان کی اردو فارسی کی قابلیت ضرورت زمانہ کے مطابق ہے چونکہ سنٹرل ٹریننگ کالج سے وہ معلّی کی سند حاصل کر چکے تھے اس لیے انجمن حمایت اسلام نے انہیں اپنے یہاں لے لیا اب وہ انجمن کے اسلامیہ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ میری شاعری کا آغاز تھا اور جلال الدین اکبر کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اکبر صاحب کو بچپن ہی سے شعر و شاعری میں دلچسپی رہی ہو گی۔ یہی باعث ہے کہ وہ یہاں کے بڑے مقتدر اخبارات اور رسالوں میں نمایاں جگہوں پر چھپتے رہے ہیں اور تربیت بھی منصور احمد مرحوم اور سید عابد علی سے ملی جو اپنی جگہ ادبی ستونوں سے کم نہیں گنے جاتے ان کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی جو علم و ادب کے سلسلے میں پورے ملک میں مانے جاتے تھے ان سے بھی اکبر

صاحب نے خط و کتابت کے ذریعہ مشورہ سخن کیا خوش بختی سے اکبر صاحب نے جناب حاجی حافظ حاکم علی سے بھی تربیت پائی جو ایک پایہ کے بزرگ تھے اور انہوں نے اپنے وصال سے پہلے ہی اکبر صاحب کو خرقہ خلافت عطا کر دیا تھا - اب اس کا اثر ہونا چاہئے تھا وہی ہوا کہ ان کی شاعری کا رخ حسن و عشق کی معاملاتی شاعری سے ہٹ کر عرفانیات کی طرف ہو گیا اور وہ ظاہر و باطن کو ہم آہنگ کر کے شعر کہنے لگے یوں تو اکبر صاحب شاعری کی ہر صنف سے آشنا اور اس پر قادر ہیں لیکن ان کی نظم سے زیادہ غزل میں کیف و سرور ہوتا ہے ایسا کیف و سرور جو لغزشوں سے بچ کر اخلاقیات اور حسن طریقت کے محاسن کو اجاگر کرتا ہے -

اکبر صاحب کے یہاں ایک اچھوتا سا اسلوب بیان ہے جو واردات و احساسات کے اظہار کی پہلی شرط ہے ان کی شاعری میں ایک نہایت حسین دلکشی اور روانی ہے جس میں الفاظ کا در و بست بھی ہوتا ہے اور معانی کی جلوہ گری بھی -

نقش ارژنگ کے بعد اکبر صاحب کے یہاں جس قسم کا تغزل ہوا ہے وہ اہل عرفان اور صاف باطن لوگوں کے لیے بھی کیف و انبساط کا ذریعہ ہے اور اہل ادب کے لیے بھی پاکیزہ نمونہ -

جہاں تک زبان و اسلوب کا تعلق ہے وہ دہلی اور لکھنو کے اہل زبان کی تقلید میں لطافت اور سپردگی کو ان سے بڑھا کر لے گئے اور اپنے ماحول میں وہ اس رنگ کے ایسے شاعر ہیں جسے تاریخ ادب فراموش نہیں کر سکتی -

علی اختر' اختر

علی اختر صاحب سے نزدیکی کا موقع نہیں مل سکا - تاہم ملا ہوں کیونکہ ان کے صاحبزادے نظر مرحوم میرے قریبی دوستوں میں تھے - جہاں تک اختر صاحب کی شاعری کا تعلق ہے وہ ایک بلند فکر کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے جہاں تک اسلوب کا سوال ہے رنگ قدیم سے بالکل الگ تھلگ اپنی شاہراہ کے مالک تھے - کہیں کہیں جوش کی شاعری کا سایہ سا محسوس ہوتا ہے لیکن اختر کے یہاں ایک خاص قسم کی مقصدی شاعری ہے جو بہت کم شاعروں میں موجود ہے -

اپنی عمر کے لحاظ سے انہیں داغ اور امیر مینائی کے راستوں پر چلنا چاہئے تھا لیکن اختر بالکل اس

دور کے رنگ سے علیحدہ تھے۔ وہ نظم اور غزل پر دسترس ہی نہیں عبور رکھتے تھے اور ان میں کسی کی تقلید معلوم نہیں ہوتی۔

انہیں خیالات ونظریات کو قلمبند کرنے کا سلیقہ تھا الفاظ برمحل اور ترکیب نادر کے علاوہ ان کے کلام میں فاقیت پائی جاتی ہے۔لب ولہجہ میں سنجیدگی کے ساتھ اشعار میں موسیقی ایسی گتھی ہوئی ہے جو ایک عجیب طرح کا حسن بن گئی جس کا لطف صرف دماغ ودل ہی لے سکتے ہیں

ان کی نظمیں واقعاتی اور مصلحانہ ہوتی ہیں اور ان میں منظر نگاری کا کمال اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے کہیں کہیں ان کے یہاں تصوف کی سنجیدگی میں بیان کی رنگینی بھی ملتی ہے لیکن وہ ایسی نہیں کہ ہم انہیں تصوف کا شاعر کہہ سکیں وہ تو اپنے شعر کو جہاں تک بن پڑتی ہے ایک بسیط اور دلکش فضاؤں کا آئینہ بناتے ہیں۔ اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ ان کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔لیکن بحیثیت شاعر اختر کو جو مقام ملنا چاہئے تھا وہ نہیں ملا۔ غالباً یہ یا تو تقسیم ملک کی پریشانیاں اس کا سبب ہے یا پھر تعصب اور تنگ نظری۔

ابو یحییٰ امام نوشہروی

ابو یحییٰ امام نوشہروی قدیم روش کے بزرگ تھے ان کے قلم سے بیسیوں کتابیں نکلی ہیں اور ان کی ہر تحریر میں کاوش اور دقت نظر کا پتا ملتا ہے۔ جب انہیں کسی اہم کتاب کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے اور پہروں ہنسی مذاق رہتا تھا۔ وہ ضعیف العمری کے باوصف نہایت زندہ دل اور خوش ذوق انسان تھے انہوں نے تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اگر یحییٰ امام کے کام پر ایک مقالہ لکھا جائے تو اس میں بڑے کارآمد پہلو ملیں گے۔

جناب ازل لاہوری

منشی عبدالمجید ازل گورنمنٹ کے کسی محکمہ سے منسلک تھے اور حضرت داغ کے شاگرد تھے ظاہر ہے کہ ان کی مشق کس درجہ پختہ ہوگی۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جناب سراج الدین سائل نے جو داغ دہلوی کے داماد تھے انہیں جانشینی کی سند عطا فرمائی تھی بڑے ہی زود گو انسان تھے اور تمام کلام اسلاف کی پیروی میں وہی دلی کی بولی ٹھولی لئے ہوئے ہے۔ آخر عمر تک ان میں زندہ دلی باقی تھی

اور جہاں نماز روزہ کے پابند تھے وہاں شاعرانہ شوخیوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

سراج الدین آذر

سراج الدین آذر صاحب محکمہ تعلیم میں انسپکٹر تھے۔ دہلی میں بھی ان سے اکثر ملاقاتیں رہی ہیں وہ صحیح معنی میں علمی ادبی انسان تھے انہوں نے نہایت اچھی اور دقیع لائبریری جمع کی تھی جس میں خالص تحقیقی مواد یکجا کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے اور عزیز جانتے تھے علمی ادبی سلسلہ میں ان کے گرد ادباء وفضلاء کا ہجوم رہتا تھا اور وہ ان کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ نہ جانے انہوں نے کوئی کتاب بھی چھوڑی ہے یا نہیں اور ان کی لائبریری کا کیا ہوا۔

مرزا احسان احمد اعظم گڑھی

مرزا صاحب اعظم گڑھ میں وکیل ہیں اور نغز گوئی میں اپنے معاصرین سے کم نہیں وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ احسان صاحب نے جو جگر کے کلام ''داغ جگر'' پر دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مقالہ نگار بھی معمولی درجے کے نہیں۔ ان کی نظر ادب وشعر پر بڑی گہری ہے اور ادب وشعر کے عیوب ومحاسن پر بڑا عبور رکھتے ہیں۔

افسر میرٹھی

حامد اللہ میرٹھی' آپ نے ابتدائی عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم میرٹھ میں پائی اور پھر کچھ عرصہ صحافت میں رہے پھر جوبلی کالج لکھنؤ میں لیکچرار ہو گئے اور ایک طویل عرصہ درس وتدریس کی خدمات کے بعد ریٹائر ہو گئے ظاہر ہے کہ ایک عمر کے علمی ادبی مشاغل ایک ذہین طباع اور فطری شاعر کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا میں افسر صاحب کی نظموں کو پڑھتا رہا اور اس کے بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو بڑے ہی خوش خو اور خاموش قسم کے انسان نکلے۔ کم گوئی مگر درست گوئی۔ افسر صاحب بھی انہیں لوگوں میں ہیں جو ماضی کی کہنہ وفرسودہ روایات سے بچ کر چلتے ہیں اپنی راہیں الگ نکالی ہیں۔ انہوں نے گیتوں کی طرح چھوٹی بحروں میں جو نظمیں کہی ہیں وہ افسر کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں۔

انہوں نے غزلیں بھی بڑی نرم اور ملائم کہی ہیں جن میں سادگی کے باوصف شعر کے تیور اسی طرح تیکھے اور جاندار معلوم ہوتے ہیں لیکن چونکہ زندگی بھر وہ اخلاقیات اور درس وتدریس میں رہے ہیں اس لیے وہ اپنی غزل میں وہ چلبلا پن پیدا نہیں کرتے جسے عوام غزل کی جان بتاتے ہیں۔

افسر صاحب کی نظمیں ہیئتی طور پر حفیظ کی نظموں سے مشابہ ہیں لیکن حفیظ کے یہاں الفاظ میں رنگینی وموسیقی ہے اور افسر صاحب کے یہاں نغمگی اور سادگی کے گتھاؤ کے ساتھ خارجی پہلوؤں کی عکاسی کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ ان کی فنی مہارت اور مطالعہ کی کثرت اپنا پتا دیتی ہے۔ ان کے یہاں نظموں میں انسانی بہبود اور حب وطن کا ایسا حسین امتزاج ہے جو بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے۔

افسر نے بچوں کے لیے بڑی آسان اور سہل زبان میں بھی نظمیں کہی ہیں اور چونکہ وہ بچوں کی نفسیات سے آگاہ ہیں اس لیے ان میں وہی پہلو اجاگر کرتے ہیں جن کی ضرورت ہے اور اس اعتبار سے بچوں کی نظموں میں وہ ایک خاص روش کے مالک ہیں جن میں ان کا تجربہ ذہانت اور اخلاقی قدریں بروئے کار آتی ہیں انہوں نے افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ نورس اور نقد وادب ان کی اچھی خاصی ضخیم کتابیں ہیں لیکن اصل میں وہ نظم کے شاعر ہیں اور اسی صنف میں ناقابل فراموش۔

ادیب مالیگانوی

جناب ادیب، معلم ہیں اور شاعری میں اپنے سیکڑوں ہم عصروں سے اچھا شعر کہتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے۔ ان کا زیادہ کلام قدیم رنگ میں ہے لیکن جو غزلیں جدید رنگ میں ہیں ان کا بھی شاعری کی دنیا میں بلند مقام ہے، خاموش قسم کے انسان ہیں مگر ان کی شاعرانہ عظمت ان کی عالم آشنائی کو کافی ہے۔

اعجاز صدیقی

جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی حضرت سیماب اکبرآبادی کے صاحبزادے ہیں۔ ذوق شعر و ادب انہیں ورثہ میں ملا ہے نہایت صاف ستھرا اور آلائشوں سے پاک شعر کہتے ہیں ان کے یہاں پیمانے تو وہی پرانے ہیں لیکن ہر پیمانہ میں شراب نئی ہے بڑے قادرالکلام شاعر اور اعلیٰ درجے کے نثر

نگار ہیں وہ بمبئی سے ''شاعر'' نکالتے ہیں اور اس ماحول میں یہ اردو کی اتنی بڑی خدمت ہے کہ تاریخ ادب اردو اسے بھلا نہیں سکے گی۔ بلاشبہ اعجاز صدیقی اپنے دور کے بڑے اور تاریخی لوگوں میں ہیں۔

امید امیٹھوی

امید امیٹھوی لکھنؤ کے صاحب فن بزرگوں میں تھے انہیں میں نے اکثر جناب نیاز فتح پوری کے یہاں دیکھا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب رہتی تھی اور وہ کسی نہ کسی تحقیق میں مصروف پائے جاتے تھے۔ ان کی ساری زندگی تو پولیس میں گزری تھی لیکن انہوں نے ملازمت کے دوران بھی شعر و شاعری کو نہیں چھوڑا تھا۔ شعر کے عیوب و محاسن کے متعلق ان کے معلومات معمولی نہیں تھے انہوں نے اساتذہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ ان کا ایک غیر مطبوعہ تنقیدی مضمون میرے یہاں قلمی مسودات میں بھی موجود ہے جو انہوں نے یگانہ کی شاعری پر لکھا تھا۔

محمد علی اثر رام پوری

محمد علی اثر رام پوری سے میری پہلی ملاقات لاہور کے ایک مشاعرہ میں ہوئی جو یہاں نمائش کے سلسلے میں ہوا تھا اور انجمن پنجاب نے کرایا تھا اور جس کے سیکرٹری پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تھے۔ اس وقت جناب اثر کا شباب پک چکا تھا اور چونکہ رامپور کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور معانی و بیان سے آگاہی کے علاوہ روزمرہ اور محاورات پر عبور تھا اس لیے مشاعرہ میں تو انہیں داد تحسین ملنا ضروری تھی۔ جناب اثر مشاعرہ سے علیحدہ ملے تو وہ شاعر سے بھی زیادہ حسین شخصیت نکلے چنانچہ جب تک زندہ رہے ان سے وہی ملاقات رہی۔ ان کے یہاں الفاظ کا دروبست اور محاورہ کا استعمال قابل رشک تھا۔ نہ جانے ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا یا نہیں۔

ابوالفضل صدیقی صاحب

میرے دیرینہ کرم فرماؤں میں ہیں اور بڑے بے تکلف بھی ہیں لیکن میں ہمیشہ ان کے سامنے زیادہ خاموش رہتا ہوں کیونکہ بہت کم لوگ ہیں جن کی گفتگو سے استفادہ ہوتا ہے میں ایسی صرف دو تین شخصیتوں کو جانتا ہوں ان میں ابوالفضل صاحب بھی ہیں یوں تو تنقید کے آدمی بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ لیکن میں لغت کے اعتبار سے انہیں بڑا فاضل انسان خیال کرتا ہوں۔ وہ بحیثیت انسان بھی بڑے ہی قیمتی انسان ہیں اور بحیثیت دوست اس سے زیادہ ہیں جب بھی کراچی جاتا ہوں ابو الفضل صاحب سے ملاقات کو بے تاب رہتا ہوں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

ڈاکٹر احسن فاروقی حیدر آباد میں انگریزی کے پروفیسر ہیں لیکن اردو میں ایسی رواں اور چوکھی طبیعت پائی ہے کہ ادب کے کسی شعبہ میں بھی بند نہیں ہیں۔ افسانہ ہو یا ناول تنقید ہو یا تبصرہ تمام اصناف ادب پر عبور رکھتے ہیں اور کثیر التصنیف ادباء میں سے ہیں ان کے یہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کثیر الاشاعت لوگوں سے دبتے نہیں بلکہ ان کی تحریروں میں جہاں جہاں خلا ہوتے ہیں وہ انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور تحریر کا کوئی جھول ان کی نظر سے بچنے نہیں پاتا میری نظر میں وہ اپنی طرز کے واحد انسان ہیں جن کی تحریریں بے لاگ اور بلند ہوتی ہیں ان کی دسیوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور نہ جانے اور کتنی زیر قلم ہیں۔

احمق پھپھوندوی

جناب مصطفیٰ خان مداح واحمق سنجیدہ اور متین شاعری میں مداح اور ظریفانہ رنگ میں احمق تخلص کرتے تھے۔ جناب مداح کے دس بارہ مجموعے تو ضبط ہو چکے تھے وہ انگریز دشمنی میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ فن شعر پر قابل رشک عبور تھا اور سیدھے سادے انسان۔ ان کے جو مجموعے ضبطی سے بچ گئے وہ بھی مواد کے اعتبار سے کم نہیں اگر کبھی کسی نے زندہ دلی ادب یا ظریفانہ ادب پر کام کیا تو میری نظر میں اکبر کے بعد احمق ہی ایسے شاعر ہیں جنہیں کام کا شاعر کہا جا سکتا ہے اور جنہیں

حکومت نہیں خرید سکی۔

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

ایک پڑھے لکھے ذہین اور بیدار صلاحیتوں کے انسان ہیں وہ پایاب نہیں کہ شور مچائیں بلکہ گہرے ہیں جو خاموش رہتے ہیں اور اپنے عمل سے اپنے مقام کو بلند کرتے اور منواتے ہیں اردو ڈائجسٹ ان کا کارنامہ ہے اردو رسالوں میں اس شان وشوکت کا اور ایسا کامیاب جریدہ ڈاکٹر اعجاز کے دل ودماغ کی صنعت ہے جس سے ملک میں علمی ادبی ذوق کے علاوہ تہذیبی' تمدنی' سیاسی اور دینی اقدار ابھر رہی ہیں اس دور میں جبکہ دین کے خلاف مستقل جدوجہد ہو رہی ہے ڈاکٹر اعجاز کا دم رحمت الٰہی سے کم نہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں ان کے جائز ارادوں میں کامیاب فرمائے۔ آمین۔

سروپ نرائن ایمن

ایمن صاحب بڑے سلیقہ کے خوش وضع اور خوش پوش آدمی تھے اور بزم سروش سے انہیں خاص نسبت تھی۔ ہر مشاعرہ میں ان کی شمولیت لازمی اور ہر میٹنگ میں ان کا مشورہ اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے ان کی مشاعروں میں غزلیں سنی ہیں ممکن ہے کہ نظمیں بھی کہتے ہوں ان کی غزلیں اس دور کی معیاری غزلیں قرار پاتی تھیں۔ خوش خلق ہونے کے باعث ہر دل عزیز بھی تھے اور سب سے بڑی خصوصیت ان کی بے تعصبی تھی۔ ان کا کوئی مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا۔

جناب ارشد کاٹھوی

جناب ارشد کاٹھوی۔ کاٹھ ضلع میرٹھ تحصیل باغپت کے رہنے والے ہیں میں جب ان سے ملا تھا اس وقت وہ لاہور میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور پھر کراچی میں جا کر رہنے لگے۔ صنف غزل ان کا مرغوب اور پسندیدہ ادب ہے بڑی طویل طویل غزلیں کہتے ہیں اور جہاں تک فنی معلومات اور احتیاط کا تعلق ہے ان کے کلام میں وافر عنصر ہے۔

قدیم تہذیب اور قدیم معاشرت کے نیک اور پرخلوص انسان ہیں اب ریٹائرمنٹ کی زندگی

بسر کر رہے ہیں - خدا کا شکر ہے کہ ان کے بچے اب اس قابل ہیں کہ ان کی ضعیفی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا - ان کا مجموعہ کلام اب تک کوئی نہیں چھپا -

جناب رشک رام پوری

رام پور کے معززین سے تھے اور والی رام پور کے قریبی عزیز، اردو، عربی فارسی انگریزی اور جرمنی پر عبور تھا - مگر حضرت گولڑہ شریف والوں سے بیعت ہو کر انہیں کے دربار میں آ گئے اور وہیں زندگی دے دی - یہ تو ظاہر ہے کہ رام پور میں تربیت پائی تھی جہاں سے بڑے بڑے جغادری شعراء نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اس لیے کلام میں ابتذال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - جہاں تک ان کے حسن بیان کا تعلق ہے وہ سہل ممتنع میں کہتے تھے اور ان کے قلم سے جو خیال غزل کی صورت میں ڈھلتا تھا وہ ایک ان کے حسن بیان کا اعجاز تھا - ان کے شعر میں ایک بات اور ہر بات میں ایک حسن ہوتا تھا - سراپا خلوص اور درویشی کی شان رکھنے والا ایک ہی درویش تھا جس سے شاعروں کے طبقے کی آبرو میں چار چاند لگے ہوئے تھے - انا للہ وانا الیہ راجعون

اشک کپور تھلوی

مولوی ظفر حسین اشک کپور تھلوی - مجھے ان سے دو چار بار ہی ملنے کا اتفاق ہوا ہے - وہ کپور تھلہ کے معززین میں تھے اور ریاست کے تمام علمی ادبی اور ثقافتی ہنگاموں کی روح رواں تھے اردو فارسی بھی ان کی معمولی نہیں تھی - بہت کم شعر کہتے تھے مگر اچھا چا تلا اور فن کی شرائط کا بار اٹھائے ہوئے - میرا ابتدائی زمانہ تھا اور وہ جب بھی ملتے تھے اپنے شعر سناتے تھے اور کہیں کہیں جب وہ سمجھتے تھے کہ میں خاموش ہوں اور داد و تحسین کے آثار نہیں تو وہ شعر کی تشریح اور اس کے نازک نازک پہلو بھی بیان کرتے تھے اور کئی بار ان کی اس عادت سے مجھے کار آمد باتیں ملی ہیں - میں نے ان کا اچھا خاصا مجموعہ کلام دیکھا تھا لیکن نہ معلوم اب وہ کہاں ہے چھپا ہے یا ضائع ہو گیا -

امداد صابری صاحب

جناب امداد صابری دہلی کے مشہور مصنفین میں سے ہیں ان کی نظر صرف ادب اور اس کے اصناف تک ہی محدود نہیں وہ تاریخی اور سیاسی معلومات میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کی تصانیف جو تحقیق پر مبنی ہیں نہایت کارآمد ہیں اور ان سے ان کے طریق فکر اور دقت نظر کی داد دینا پڑتی ہے وہ اپنے اسلوب نگارش میں بھی ایک خاص حسن رکھتے ہیں اور قابل قدر انسان ہیں۔

ارم لکھنوی

جناب ارم لکھنوی نہایت شریف اور بلند درجے کے شاعر تھے میں انہیں لکھنؤ ہی سے جانتا تھا اور سیکڑوں مشاعروں میں مجھے ان کی معیت نصیب ہوئی وہ لکھنؤ کی زبان کا صحیح استعمال جانتے تھے اور بڑے ہی معصوم قسم کے انسان تھے وہ بچوں کی طرح بڑی پیاری پیاری باتیں کرتے مگر جب مشاعرے میں جاتے تو ایسے ایسے شعر پڑھتے کہ حیرت ہوتی جن میں جذبہ بھی ہوتا تھا اور رنگینی بھی۔ گہرائی بھی اور زبان کا لطف بھی۔

اویس احمد ادیب

جناب اویس احمد ادیب سے پہلی ملاقات کانپور میں ہوئی تھی اور میں نے وہیں اندازہ لگالیا تھا کہ یہ اگلی جماعت کے آدمی ہیں چنانچہ اب جب سے وہ پاکستان میں آئے ہیں ان کے قلم سے بڑا صحت مند ادب نکلا ہے وہ نہایت اچھے ادیب اور شاعر ہیں اور اسی درجے کے نقاد اور تبصرہ نگار بھی۔ لیکن ابھی ان کے قلم سے کوئی خاص کارنامہ نہیں نکلا لیکن ہم ناامید نہیں کیونکہ وہ حد درجہ کے محنتی اور صاحب تدبیر انسان ہیں اور ایسے آدمی ناکام نہیں رہتے۔

اعجاز الحق قدوسی اعجاز

جناب اعجاز الحق قدوسی شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی انہوں نے قریب قریب پاکستان بھر کے صوفیاء کے تذکرے لکھے ہیں۔ لیکن شاعر بھی ہیں اور ان کے اشعار میں ان کی عمران سے فریب کرتی ہے وہ جوان شعر کہتے ہیں اور یہ غالباً حضرت جوش سے نزدیکی اثر ہے مگر جوش عمر کے قریب میں

آنے والے نہیں وہ زندگی کے ہر بہروپ کو پہچانتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے مولوی نہ جانے کیوں جوانی کا دامن نہیں چھوڑتے حالانکہ جوانی سے آگے بھی رنگینیوں کی کمی نہیں قدوسی صاحب کے یہاں نہ الفاظ کی کمی ہے نہ خیالات کی وہ نثر کی طرح نظم پر حاوی ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

اسد ملتانی

جناب اسد سے میں اس دور سے آگاہ ہوں جب میں شملہ میں پہلی بار شاعر کی حیثیت سے مشاعرہ میں گیا تھا۔ وہ اس وقت نوجوان مگر بڑے سلیقہ کے شاعر تھے۔ یوں تو وہ سرکاری ملازم تھے مگر ان کے دل میں اکبرالہ آبادی کی طرح قوم اور ملک کا درد تھا وہ معاشرہ کی حالت کو اسلامی اقدار سے متوازن دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی شاعری میں ایک یہی جوہر ایسا ہے جو ہمارے ملک میں کسی شاعر کو نصیب نہیں۔

میری نظر میں اکبرالہ آبادی کے بعد مشکل سے دو تین شاعروں میں اکبر کا اصلاحی رنگ ملتا ہے جن میں اسد ملتانی بھی شامل ہیں۔

ان کے کلام کا کوئی ضخیم مجموعہ تو ابھی شائع نہیں ہوا مگر پمفلٹ کی قسم کے دو تین کتابچے میری نظر سے گزرے ہیں ان کا کلام چھپ جائے تو یہ ہمارے ادب اور معاشرہ کی بڑی خدمت ہوگی نہ معلوم مرحوم کا مجموعہ کلام کس کے پاس ہے۔

آفتاب احمد

بالغہ صف کے آدمی ہیں خصوصاً مرزا غالب کے متعلق ان کا مطالعہ حیرت انگیز ہے ویسے وہ تنقید کے آدمی ہیں اور ان کی نقد میں جان ہوتی ہے وہ اپنا ایک طرز تحریر رکھتے ہیں اور جس میں ان کی معلومات کا پتا چلتا ہے وہ چونکہ نہایت ذہین و ذکی انسان ہیں اس لیے حکومت اور ادب دونوں کے لیے مفید انسان ہیں اور پھر ان کا خلوص انہیں اور بھی ہر دل عزیز بنائے ہوئے ہے۔

احمد حسن اشک ڈھاکہ

جناب اشک پرانے کہنے والوں میں ہیں اور جملہ اصناف پر انہیں عبور ہے نظم اور غزل دونوں روایتی تصورات وتخیلات سے ہٹ کر زندگی اور اس کے گردوپیش کی عکاسی کرتی ہیں وہ جدید دور کے مقبول شاعر ہیں اور تاریخ میں ان کا اندراج کوئی انہونی بات نہیں ہوگی ان کی شاعری ان کا مقام متعین کرنے کو کافی ہے۔

اے۔ڈی۔اظہر

جناب اے ڈی اظہر حکومت کے بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے ہیں۔شعروادب کا ذوق تو انہیں پہلے ہی سے تھا لیکن عہدہ کی ذمہ داریاں انہیں سر نہیں اٹھانے دیتی تھیں ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک علمی ادارہ ''مرکزی ترقی اردو بورڈ'' کے سربراہ ہوگئے وہاں بھی انہیں تخلیق کم اور تجویز زیادہ کا مرحلہ درپیش رہا اور ترقی اردو کے لیے تالیف وترجمے کے کام کی نگرانی ان کا فرض منصبی ٹھہری لیکن ان کے گردوپیش کی آب پاشی اصولوں تک پہنچ گئی اور وہ سبک دوش کردیئے گئے وہ عرصہ سے ایک انگریزی زبان میں کتاب لکھ رہے ہیں جو ملک اور قوم کے لیے مفید ہوسکتی ہے لیکن اس کی تکمیل کی ذمہ داری تو اظہر صاحب کی مصروفیات کے ہاتھ میں ہے۔

اختر حسین اختر بریلوی

جناب اختر حسین اختر بریلوی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ جناب راحت مولائی کے قریبی دوستوں میں تھے اور انہوں نے ہی میرا تعارف کرایا تھا۔اختر صاحب نے میری کتاب دردزندگی جو ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی اس میں میری زندگی پر ایک مختصر سی تحریر بھی قلمبند کی تھی اس کے بعد ان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا وہ نہایت ذکی اور فطین آدمی تھے امید ہے کہ کہیں اچھی جگہ ہوں گے۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

جناب امن لکھنؤ کے رہنے والے مگر دہلی میں رہتے ہیں- زبان و بیان پر انہیں حیرت ناک قدرت ہے اوران کی نظم ونثر دونوں میں سلجھاؤ اور سلاست پائی جاتی ہے ان کے یہاں شاعری کے روایتی سانچے ضرور ہیں لیکن ان کے یہاں الفاظ میں معانی کا رچاؤ ایسا ہے جس کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی ان کے کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے جوان کے قلم کی جولانیوں کی یادداشت ہے جناب امن اپنے یہاں بلاغت کے مضامین کو فصاحت کا لباس دیتے ہیں- اسی مقام کے صحافی اوراسی درجے کے سیاس بھی ہیں علاوہ ازیں وہ بحیثیت انسان بھی قابل تقلید آدمی ہیں اوران کی انسان دوستی ان کے معیار انسانی کی شاہد ہے-

ابر گنوری

جناب ابر شاعر ہی نہیں شاعر گر بھی ہیں اور آج سیکڑوں شاگردان کی تربیت سے ادیب اور شاعروں کی صف میں ملتے ہیں- جناب ابر اصناف سخن میں ہر صنف پر قدرت رکھتے ہیں اس کے علاوہ شعری معائب و محاسن اور عروض وقوافی پر بھی ان کی گہری نظر ہے ان کا نثری اور شعری ادب دوش بدوش ملتا ہے اور بحیثیت انسان بڑے خلیق اور اصول کے آدمی ہیں- ان کی تصنیف و تالیف میں کئی کتابیں ہیں-

امیر احمد اللہ بدایونی

بریلی کالج کے اساتذہ میں امیر احمد اللہ صاحب نمایاں حیثیت کے مالک تھے جہاں تک مطالعہ کا تعلق ہے بہت کم لوگوں میں ایسے باقیات پائے گئے ہیں- ان کی گفتگو میں بہت سے پہلو سننے میں آتے تھے جو ادب میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں تقسیم ملک کے بعد ان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا-

امین سلونوی

جناب امین سلونوی ایک عرصہ سے لکھنؤ میں ہیں اور اب وہ سلونوی نہیں لکھنوی کہلانے کے مستحق ہیں وہ نہایت پر تکلف انسان اور باوقار صحافی ہونے کے علاوہ شعر و ادب کی ہر صنف پر حاوی ہیں۔ میں جب ان سے ملا ہوں اس وقت سے اب تک امین صاحب کے اخلاق کا سکہ دل پر روشن و معطر ہے۔ ملک کے سیاسی فاصلوں نے کیسے کیسے لوگوں میں دوری پیدا کردی ہے امین صاحب کے خلوص کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں عرصہ ہوگیا امین صاحب کی کوئی تحریر باصرہ نواز نہیں ہوئی۔ خدا کرے بعافیت ہوں۔

احمد حسن شاہ

پروفیسر احمد حسن صاحب زمیندارہ کالج گجرات میں استاد ہیں علمی، ادبی ذوق کے معاملہ میں ان سے مل کر طبیعت خوش ہوتی ہے وہ پیشہ ور استاد نہیں بلکہ سچ مچ کے استاد ہیں ان کا مطالعہ و مشاہدہ مثالی ہے اور استاد جو کچھ خود جانتا ہے اس سے زیادہ تلامذہ کو کہاں دے سکتا ہے اس لیے احمد حسن صاحب مطالعہ سے غافل نہیں عرصہ ہوا جب میں ان سے ملا تھا اس وقت وہ ایک تذکرہ مرتب کر رہے تھے جو بڑی اہم تحریر تھی نہ معلوم اس کا کیا ہوا۔ وہ زیور طبع سے بھی آراستہ ہوا یا نہیں۔

اپندر ناتھ اشک

جناب اپندر ناتھ اشک پہلے لاہور میں تھے تقسیم ملک کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب وہ لاہور میں تھے تو ان کے ادب کا آغاز ہو رہا تھا اور غالباً افسانوں کی ایک کتاب بھی چھپ چکی تھی۔ جو کسی صورت بھی اس وقت ادبی معیار سے گری ہوئی نہیں تھی لاہور کے بعد ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ سیاسی دیواریں آوازوں اور نگاہوں کو آزادی نہیں دیتیں۔

ہری چند اختر

جناب ہری چند اختر نیاز مندان لاہور میں شامل تو نہیں تھے لیکن ان کے دوستوں میں تھے۔ وہ اپنی سوسائٹی میں سب سے اچھا شعر کہتے تھے۔ تقسیم ملک ہوئی تو دلی چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

نہایت زندہ دل اور شگفتہ خو انسان واقع ہوئے تھے۔ اور شعر نہایت سوچ سمجھ کر کہتے تھے نہ جانے ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔ بفرض محال اگر نہیں چھپا تو یہ ایک علمی خیانت ہے۔ اول تو ان کی حکومت کا فرض ہے اور اگر حکومت علمی طور پر دیوالیہ ہو جائے تو ان کے دوستوں کا فرض ہے جو خیر و شر میں ان کے ساتھ تھے۔

حبیب اشعر دہلوی

جناب اشعر اطبائے دہلی کے خاندان شریفی کے ایک فرد ہیں جو اردو، فارسی اور عربی پر عبور رکھتے ہیں۔ جہاں تک حکمت یا طب کا تعلق ہے وہ نا قابل فراموش شخصیت ہیں۔ لیکن طبیب کے علاوہ ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ شخصیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی وہ نہایت منجھی ہوئی غزل کہتے ہیں اور چونکہ دہلی کے روزمرہ اور محاورات ان کے گھر کی باتیں ہیں اس لیے ان کا برمحل استعمال بھی ان کی وراثت ہے۔ حبیب اشعر صاحب کو ترجمے میں جو مہارت ہے وہ ہمارے ادیبوں کے قافلہ میں بمشکل ہی ملے گی ان کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے اور خلیل جبران کے ترجمے ان کے قلم سے اردو میں جس خوبصورتی سے آئے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

افسر سیمابی

جناب افسر سیمابی اچھے پختہ مشق انسان ہیں اور سیماب صاحب کی طرح نظم و غزل دونوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ میری نظر سے ان کی غزلیں کم اور نظمیں زیادہ گزری ہیں ان کی شاعری میں تخیل بلند اور الفاظ معنی کے مایہ دار ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ کا برمحل استعمال جانتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کو شعر کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم

جناب خلیق انجم دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اسم با مسمی ادیب تحقیق و تنقید میں ان کی نظر خوردہ گیر ہے اور ان کی تحریریں ان کی دقت نظر اور اسلوب نگارش کی طرفگی کا پتا دیتی ہیں اردو ادب کو ایسے ذہین طباع اور صاحب طرز ادیبوں کی ضرورت ہے کیونکہ اردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ ابھی تحقیق کا

محتاج ہے۔ ان کا صحیح تعارف ان کی کتابیں ہیں انہوں نے انشا پر جو کام کیا ہے وہ اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصغر سلیم

جناب اصغر سلیم کو میں بڑے زمانے سے جانتا ہوں وہ درس و تدریس کے آدمی تو ابھی ہوئے ہیں پہلے وہ حکومت کے کسی اور ادارہ میں کام کرتے تھے لیکن جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اس سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے یہ الگ بات ہے کہ کالج کی زندگی میں آکر ان کی شاعری نے ذرا جدید رنگ اختیار کر لیا ہے لیکن ان کی وہی غزلیں ان کا شاہکار ہیں جو قدیم روش پر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس روش کے انسان ہیں ان کا تقابلی مطالعہ ان کے قدیم و جدید کا خود بخود فیصلہ کر دیتا ہے۔

الطاف حسن قریشی

جناب الطاف حسن پاکستان کے مشہور و معروف رسالہ اردو ڈائجسٹ کے مدیر و منتظم ہیں ان کی نثر اور نظم کے متعلق کچھ کہنا سودمند نہ ہوگا کیونکہ دنیا کے سامنے آئے دن ان کے قلمی شاہکار اپنے رنگ دکھاتے رہتے ہیں ان کے مضامین نہایت سودمند اور دلکش ہونے کے علاوہ اپنے عنوان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

غزل کے سلسلے میں اگرچہ ان کے سانچے قدیم ہیں لیکن ان میں ایسی جدید بات کہتے ہیں کہ ان کے شعر سننے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ کاش پہلے ہم اس خیال کو شعر کا جامہ پہناتے۔

الطاف حسن ادارہ کی مصروفیات کے باوجود ادبی تحریکات اور علمی ہنگاموں میں برابر کا حصہ لیتے ہیں اردو ڈائجسٹ میں ان کے مضامین میں ایک خاص مقصد اور اشعار میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے دور حاضر کے اشارات کی جو ہمارے ادب میں ایک صحت مند اضافہ ہے۔

انیس ناگی

نوجوان ادیب اور شاعر ہے نثر میں ان کا اسلوب نگارش نہایت سنجیدہ اور متین اور نثر میں تجدید کے قائل ہیں میں ان سے آخری بار اس وقت ملا جب وہ لائل پور میں پی۔سی۔ایس کی تیاری میں

مشغول تھے اس کے بعد نہیں معلوم ان کا تقرر کہاں ہوا- وہ اصل میں تعلیم ہی کے آدمی تھے لیکن یونیورسٹی یا لاہور کے کسی اچھے کالج میں ان کے لیے جگہ نہیں نکل سکی اور تعلیمی شعبہ ایک طباع نوجوان سے محروم ہو گیا- مجھے امید ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں شعر و ادب سے غافل نہیں ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے باوصف دنیائے ادب کو کوئی انوکھا شاہکار دیں-

ارشاد کاظمی

جناب ارشاد نوجوان شاعر ہیں وکالت پیشگی کے ساتھ شاعری کا ذوق بھی ہے اور نئے دور کے شعراء کے ساتھ ہیں لیکن اپنے دور کے کئی شعراء سے اچھا کہتے ہیں- مشاعروں میں غیر مقبول شاعر نہیں انہیں ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے- ان کے یہاں ابہام ہے مگر اس قدر نہیں کہ مافی الضمیر ہی کھو جائے ارشاد کے یہاں جو ابہام ہے وہ نہایت مناسب اور حسین ہے-

پروفیسر غلام محی الدین اثر

جناب غلام محی الدین اثر گورنمنٹ کالج میں اردو شعبے کے صدر تھے- نہایت ذہین اور فطین انسان مگر عیب یہ ہے کہ دبنگ انسان ہیں جو بات کہتے ہیں بے لاگ کہتے ہیں اور جو اس قسم کا آدمی ہو اسے تو کوئی اسی قسم کا کام چاہئے چنانچہ وہ کالج میں نہیں رہ سکے اور آج کل کسی بڑی فرم میں کسی ذمہ دار عہدے پر ہیں- جناب اثر اردو اور انگریزی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں اور بڑے بڑے دھنتر ان کا لوہا مانتے ہیں مگر افسوس کہ وہ ابھی تصنیف و تالیف کی طرف نہیں آئے- ورنہ اب تک انہیں ملازمت کی ضرورت نہ ہوتی- وہ بڑی قیمتی معلومات کے آدمی ہیں-

انجم رومانی

جناب انجم رومانی دیال سنگھ کالج میں لیکچرر ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اگرچہ ہیئتی اعتبار سے ان کے یہاں کوئی ایجاد نہیں لیکن جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ معیاری غزل کہتے ہیں ان کی غزل میں اپنے حسن و عشق کی واردات کم اور زمانے کے غموں کا صدمہ زیادہ ہوتا ہے- ان کے یہاں شاعری میں مقصدی اور تعمیری پہلو نمایاں ہوتا ہے- اگرچہ ان کی آزادہ روی اور آزادہ خیالی

کناروں سے چھلک جاتی ہے لیکن ایسے اشعار بہت کم ہیں وہ ناقابل فراموش شاعر ہیں۔

افسر آذری

سروپ کرشن آذری شاعر بھی تھے اور ادیب بھی ذہین بھی تھے اور زود احساس بھی۔ اور یہی چیزیں شاعر بناتی ہیں۔ چنانچہ وہ نظم اور نثر دونوں میں اپنا اسلوب نگارش الگ تھلگ رکھتے تھے اور نئے زمانے کی چاپ سن کر اسی انداز میں ڈھل جانا ان کی فطرت تھی۔ ہر چند کہ وہ فن کے نشیب و فراز سے آگاہ تھے مگر وقت کے ساتھ جدید انداز سے چلنا ان کی فطرت میں تھا تقسیم کے بعد نہ معلوم کہاں چلے گئے۔

آزاد فتح پوری

جناب آزاد فتح پوری سے ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور وہی ملاقات اب تک چلی آتی ہے۔ وہ نہایت اچھا شعر کہتے ہیں اور بہت اچھا پڑھتے ہیں وہ دل کے واردات کو شعر میں لاکر بڑا تاثر دیتے ہیں تقسیم کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مولانا ہو گئے اور تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں ان کی تبلیغ میں بھی ان کی روح کا عکس اور دل کا شعلہ جھلملاتا ہے یہی سبب ہے کہ ان کی تبلیغ میں اثر ہے اور نظر میں کشش، خدا استقامت دے عجیب انسان ہیں۔

اشتیاق اظہر

جناب اشتیاق اظہر صاحب حکومت کے ادارۂ تعلقات عامہ میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہیں وہ ایک بلند رتبہ کے ادیب اور نغز گو شاعر ہیں ان کے کلام میں نفسیات فلسفہ اور تصوف کے بڑے مسائل ملتے ہیں اور حسن و عشق کے نہایت نازک نازک گوشے خوبصورت سے شعر کا لباس پہنتے ہیں۔ ان میں تحقیق و تدقیق کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری پر بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ خدا کرے جلد چھپ جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی ایک قابل تعریف ادیب پاکستان میں موجود ہے۔ وہ بحیثیت انسان بھی نہایت بلند اخلاق اور فرض شناس واقع ہوئے ہیں۔

آل رضا، رضا

سید آل رضا صاحب لکھنؤ کے معززین میں سے ہیں جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اس میں وہ گمنام انسان نہیں تھے بلکہ لکھنؤ اور گرد و نواح کے لوگوں میں ان کا بڑا نام تھا اور کیوں نہ ہوتا بڑے کہنہ مشق اور سوچ سمجھ کر کہنے والے شعراء میں سے ہیں جہاں تک لکھنؤ کی زبان کا تعلق ہے رضا صاحب کو اس میں بدرجہ اتم دخل و مہارت ہے وہ صرف غزل ہی کے شاعر نہیں جب وہ مرثیہ کہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی طبیعت، تہذیب، مشاقی اور زبان دانی کے پہلو نمایاں ملتے ہیں - غزل معلی کے نام سے ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ کراچی سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنا منتخب کلام شائع کیا ہے - یہ کتاب صرف آل رضا صاحب کے حسن کلام کا شاہکار نہیں بلکہ لکھنؤ بھر کی نمائندگی کرتی ہے -

اقتدا حسین

ڈاکٹر اقتدا حسین صاحب نیپل یونیورسٹی میں اردو کے صدر ہیں - اس نوجوان کو ادب کے نقد و تبصرہ اور سوانح و تذکرہ کا بہت ستھرا ذوق ملا ہے اور وہ تحقیق کے سلسلے میں بلا کے انسان ہیں ان کی کئی کتابیں اس سلسلے میں چھپ چکی ہیں جن میں "قائم چاند پوری" پر انہوں نے جو کام کیا ہے اسے مجلس ادب نے چھاپا ہے اور بڑی قابل قدر سعی ہے یہ تحقیق و تدوین دو ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے - قائم چاند پوری پر اب تک اس تفصیل کے ساتھ کسی کا کام موجود نہیں آج کل وہ "جرأت" پر کام کر رہے ہیں اور دن رات اسی تحقیق و تفتیش میں شہروں شہروں، گلیوں گلیوں پھرتے ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ جرأت پر ایسا ہی کام کریں گے جو مثالی ہوگا -

مرزا ادیب

بڑے محنتی اور سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب ہیں پہلے تو غزلیں بھی کہتے تھے نہ معلوم کیوں راستہ چھوڑ دیا - اب نثر لکھتے ہیں ان کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" نے انہیں بلند کیا اس میں جو انہوں نے ادبی اور شاعرانہ صلاحیتیں صرف کی ہیں وہ ان کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتیں - مرزا

صاحب ادیب کے علاوہ نہایت شریف انسان بھی ہیں ہر ایک سے جھک کے ملنا اور اخلاق سے پیش آنا ان کا شعار ہے۔

اے۔ آر۔ خاتون

اے۔ آر۔ خاتون صاحبہ اپنی ناول نگاری کے فن میں غیر معمولی شہرت کی خاتون ہیں اس کے باوجود کہ زندگی تیز رو ہے اور تمام دنیا کی چیزوں کی قیمت سے زیادہ وقت کی قیمت محسوس کی جا رہی ہے لیکن آج بھی ان کے ناول اسی ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

اے۔ آر۔ خاتون کے ناولوں میں گمراہی کی ترغیب نہیں ہوتی وہ ایک پرامن راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کی تحریر پر لطف اور انداز تحریر ایک خاص سانچے کی چیز ہے جس میں دلکشی بھی ہے اور راہ گری بھی۔

اختر انصاری

جناب اختر انصاری سے میں بہت نزدیک نہیں رہا صرف ایک بار انہیں دیکھا تھا لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے میں انہیں نمائندہ شاعر مانتا ہوں۔ پہلے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرر تھے اور پھر مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں لیکچرر ہو گئے۔

ان کی کتاب نغمہ روح اور ان کے قطعات کا مجموعہ میری نظر سے گزرا ہے اس کے بعد کا کلام میں نے نہیں دیکھا میں سمجھتا ہوں کہ ”نغمہ روح کی دلکشی اور جاذبیت کے بعد ہی اردو شاعروں میں قطعات کی روش سنوری اور بڑھی ہے انہوں نے جس انداز سے قطعات کہے ہیں ہر چند کہ اس میں انداز انگریزی ہے لیکن اس میں جو شاعرانہ روح کارفرما ہے وہ بالکل ہندوستانی کلچر ہے اور ان کے انداز بیان سے لوگوں کو ایک ایسا راستہ ملا ہے جس سے اور سیکڑوں شاخیں نکل گئی ہیں یہ الگ بات ہے ان میں کئی پگ ڈنڈیاں آگے چل کر خاردار جنگل میں گم ہو گئیں۔ اور کئی گندے پانی کے ڈووں میں جا گریں لیکن اختر انصاری کے اسلوب بیان کے کئی جادے بہاروں کے ہجوم سے بھی ہم آغوش ہو گئے اور بعض ادبی خوبیوں کے بڑے بڑے شہروں میں جا ملے۔ ان کی نظموں کا بھی ایک مجموعہ خندۂ سحر کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس میں اچھی خاصی نظمیں ہیں لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کا تمام تر

فن اور زور قطعات پر صرف ہوا ہے-

اختر حسین رائے پوری

جناب اختر حسین رائے پوری سے میری پہلی ملاقات ۳۴ء میں کلکتہ میں ہوئی تھی اس وقت وہ طالب علم تھے اس کے بعد انہوں نے پی-ایچ-ڈی کیا- ادبی آدمی تو وہ پہلے ہی تھے-ڈاکٹریٹ کے بعد اور بھی جوہر کھلے اور وہ ہمارے ملک کے ناقدوں کی صف میں آ گئے اور انہوں نے کئی ایک تنقیدی کتابیں لکھی ہیں جو ان کی ذہانت اور علمی ذوق کی آئینہ دار ہیں لیکن جب سے وہ پاکستان آئے ہیں اس وقت سے ان کے مضامین اور نئی کتابیں نہیں آ رہی ہیں-ممکن ہے کہ اس میں ان کے تعلیم کے شعبہ کی دفتری مصروفیات مانع ہوں مگر ادبی حلقے ان سے کچھ امیدیں وابستہ رکھتے ہیں-

احسان امروہوی

جناب احسان امروہوی بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں مجھے کئی بار انہیں سننے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی ایک کتاب بھی میری نظر سے گزری ہے یوں تو وہ شاعر ہیں اور غزل نظم میں کوئی صنف بھی ایسی نہیں جو ان کے یہاں موجود نہ ہو لیکن ان کا اصل زور قلم صرف مرثیہ میں معلوم ہوتا ہے-وہاں وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آتے ہیں اور داد دیے بن پڑتی ہے-

ایم- اسلم

میاں ایم- اسلم صاحب لاہور کے قدیم باشندے ہیں اور اپنے فن افسانہ میں محتاج تعارف نہیں لاہور کی حاسد فضا نے پہلے پہلے ان کے خلاف بہت کچھ کیا لیکن انہوں نے اپنے قلم کے زور سے خود کو منوالیا ہے-اسی رخ سے ایم-اسلم صاحب بڑے جری ادیب اور زبردست افسانہ نگار ہیں میں جتنی بار ان سے ملا ہوں بحیثیت انسان بھی میں نے انہیں بلند پایا ہے ان کے یہاں ابھی وہی پرانی اخلاقی قدریں زندہ و تابندہ ہیں جو طرۂ امتیاز تھا شرافت کا-

اختر لکھنوی

جناب اختر لکھنوی نغز گو شعراء کی صف میں آتے ہیں ان کی زبان دانی اور طرز تحریر پر اہل لکھنو بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ان کے یہاں صرف ونحو کی غلطی یا ابتذال دور دور نہیں ملتا۔ تقسیم کے بعد دوری کے باعث معلوم نہ ہو سکا کہ اب کیا رفتار ہے اور کس انداز سے شعر کہہ رہے ہیں۔

الطاف پرواز

الطاف پرواز کا زیادہ زمانہ لاہور میں گزرا ہے لیکن آج کل وہ بسلسلہ ملازمت راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

کہنہ مشق شاعر ہیں اور جملہ اصناف سخن پر عبور ہے وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نہایت اچھے صحافی بھی ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر فی البدیہہ کی حد تک مہارت ہے۔ الطاف پرواز صاحب اصل میں خود ساز قسم کے انسان ہیں اور یہ اپنی تعمیر خود کرنے والے ارباب ادب ایسے چومکھے ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی راستہ دشوار نہیں رہتا وہ مشکلات اور محنت دونوں کے عادی ہوتے ہیں اور یہ دونوں صورتیں انسان کو صرف جفاکش ہی نہیں بناتی بلکہ ادراک اور فکر کے دروازے بھی کھول دیتی ہیں۔

الطاف پرواز صاحب اپنی سعی سے بہت جلد فضا پکڑ گئے ان کے بہت سے ساتھی ابھی زرد ریت میں رینگ رہے ہیں اور اپنی رفتار کے بل پر زمین نہیں چھوڑ سکتے۔ الطاف پرواز کے کلام میں فکر بھی ہے اور احساس بھی یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا موقع اور محل سے استعمال ہو جائے تو کلام افسونی قوتیں اختیار کر لیتا ہے۔

خلوص اور نیک نیتی سے اپنے کلام میں ڈھل جانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں لیکن پرواز میں یہی بات ملتی ہے کہ ان کا شعر فکری ہو یا ہنگامی شاعر کے مافی الضمیر کی عکاسی ہوتا ہے ان کے یہاں الفاظ کے در و بست کے ساتھ ایک غنائی عنصر بھی ایسا ملتا ہے جو شعر کے اثر کو دوبالا کر دیتا ہے، ان کے مطبوعات میں ان کی خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں بحیثیت انسان بھی الطاف پرواز نہایت قابل قدر انسان ہیں۔ خدا کرے یہ زمانہ انہیں خلوص کی سزا نہ دے آمین!

قاضی اطہر مبارک پوری

قاضی اطہر مبارک پوری عربی، فارسی کے منتہی ہیں ان کی کئی کتابیں اہل علم سے خراج تحسین لے چکی ہیں۔خصوصاً ان کی کتاب ''الرجال السندھ والہند'' ہے اگر چہ یہ کتاب عربی میں ہے لیکن مصراور جرمنی وغیرہ میں اسے بہت سراہا گیا ہے۔ آج کل بمبئی میں ہیں اور روزنامہ انقلاب میں کام کررہے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں چھپتے ہیں اور ہر مضمون علمی دولت سے مالا مال ہوتا ہے قاضی اطہر مبارک پوری شاعر بھی ہیں اور بہت ہی سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں۔ان کی نظموں میں ابتذال نہیں ملتا اور انسانی اقدار ان کے ہر وقت پیش نظر رہتی ہیں اسی روشنی میں ان کا تمام لٹریچر نمو پاتا ہے۔

اسلم انصاری

ملتان کے ایک شریف خاندان کا صالح نوجوان ہے۔ایم۔اے کے بعد معلمی اختیار کی اور آج کل بہاول پور میں لیکچرر ہیں لاہور کی ادبی فضا نے ملتان کی قدامت کا ادبی لبادہ اتروا ڈالا اور لاہور میں ایسے ایسے تجربات ہوئے کہ علم کی روشنی ثانوی چیز ہوگئی اور چونکہ جذبہ شعری ودیعت ہوا تھا اس لیے یہی مواد اسلم کی شاعری کے تانے بانے میں کام آرہا ہے۔

اسلم کی فکر جدید ہے اور جدید طریق سے سوچنا ان کی عادت ہے چنانچہ ان کے اشعار میں سمبل ازم اس قدر ہے کہ شعر کی خوبصورتی سے قطع نظر خیال کی خوبصورتی کو سوچنا پڑ جاتا ہے کیونکہ ہمارے یہاں سمبل ازم میں کوئی نظام یا تدوین نہیں ہے اس لیے ہر شاعر کے سمبل کو ہر شاعر یا سامع نہیں سمجھتا اور اگر تلمیحات کی طرح سمبل کی تفہیم بھی متعین ہو جائے تو سمبل سمبل نہیں رہتا کیونکہ سمبل کا تو فائدہ یہی ہے کہ ایک کہے اور دوسرا سمجھے فری میسنوں کی طرح یہ تو ایک رازدارانہ نشان ہوتا ہے دلوں اور روحوں کے لیے یا فہم وادراک کے لیے اسلم اور اسی قسم کے دوسرے شعراء اس لیے قابل ذکر ہیں کہ یہ اس کی بنیاد ہیں جو آئندہ چل کر ادب کہلائے گا۔

اسلم کے یہاں غزل بھی ہے اس میں بھی وہ اپنا ایک نیا اسلوب رکھتے ہیں لیکن ان کا نیاپن اس میں بھی نمایاں رہتا ہے کہیں کہیں زبان کے مصنوعی پھیلاؤ تک اگر نگاہ نہیں جاتی تو یہ کوئی ایسی بات

نہیں اسلم کی عمر اور یہ بدلتا ہوا زمانہ بہت کچھ دے گا - کاش وہ مطالعہ اور تحقیق سے بغاوت نہ کریں-

بشیر احمد ارشد

جناب ارشد بھی نہایت تیز قلم اور آتش رقم قلم کار ہیں- آج کل نوائے وقت کی ادارت میں ہیں یہ دل کے کھرے اور نیت کے صاف انسان ہیں اور صحافیوں میں ان کا ایک مقام ہے ان کی تحریر میں کہیں کہیں کھرا پن ضرور ہے- مگر وہ ایسی بات ہے کہ اگر ان کی جگہ کتنا ہی ٹھنڈا آدمی ہو وہ بھی اسی طرح کھرا ہو جائے گا- جناب ارشد بات کے محل اور تحریر کے بانکپن کو اچھی طرح جانتے ہیں- وہ گویائی کی جگہ خاموشی اور خاموشی کی جگہ گویائی کو ایک صحافیانہ جرم کہتے ہیں اور ان کی کامیابی کا راز بھی اسی میں ہے-

جناب الم مظفر نگری

جناب الم مظفر نگری حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں اور اپنے علم وفضل کے بل پر تمام اصناف سخن پر حاوی ہیں- ان کی نظم اور نثر دونوں میں ان کی مشق ومزاولت اور قابلیت بولتی ہے- حضرت سیماب کے شاگردوں میں بہت کم لوگ ایسی علمی معلومات کے ملتے ہیں- کہیں کہیں ان کا مجموعہ کلام بھی میری نظر سے گزرا ہے اور اس میں وہ اپنی شخصیت اور ذکاوت سمیت جلوہ گر ہیں-

ارزش جے پوری

جناب ظہور الحسن ارزش جے پور کے رہنے والے ہیں اور کالج میں لیکچرر ہیں وہ اردو فارسی میں ملکہ رکھتے ہیں- فارسی ہی پڑھاتے ہیں- شعر بھی وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے ہیں- اور پھر اپنے کلام کو ترنم سے اور بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں وہ اب تک اپنی قدیم تہذیب کو تازہ دم اور شاداب صورت میں لیے ہوئے ہیں- ان سے مل کر ہمیں قدیم تہذیب وتمدن کا پتا چلتا ہے- وہ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی لیکن ان کی شاعری دقیانوسی نہیں ان کی شاعری میں اس دور کی روشنی ہے-

پروفیسر احسان الٰہی صاحب

جناب احسان الٰہی صاحب لائل پور میں پرنسپل تھے اور آج کل اورینٹل کالج میں استاد ہیں۔ احسان الٰہی صاحب معمولی قابلیت کے آدمی نہیں وہ بڑے گہرے مطالعے کے انسان ہیں تاریخ و سوانح پر ان کی بڑی گہری نظر ہے اور اسلامی تاریخ پر بھی ان کی نظر میں ایسے ایسے گوشے موجود ہیں جہاں ہر قاری کی نظر نہیں جاتی۔ جناب احسان الٰہی تصنیف و تالیف کے دلدادہ ہیں لیکن ابھی وہ جیسا چاہتے ہیں ویسا ماحول میسر نہیں آیا ان کے یہاں تحقیق و تدقیق کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ اس میں صحیح راستہ ملتا ہے۔

ابراہیم علی چشتی

جناب ابراہیم علی چشتی، جناب محرم علی چشتی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور آباؤاجداد کی طرح اپنی خاندانی ڈائری کو برابر لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور اردو، انگریزی کے فاضل ہیں۔ اور تصنیف و تالیف میں شغف رکھتے ہیں۔ ان کے تمام آثار و اطوار اور خد و خال بزرگوں کی طرح ہیں ان میں ملک کی بہبود اور اسلام کی تبلیغ کا جذبہ ہے۔ لیکن موجودہ فضا نے انہیں گوشہ نشین کر دیا ہے اور وہی نہیں فضائے حاضرہ سے ہر شریف انسان گرد و پیش سے کنارہ کر رہا ہے۔

احسان بی اے

جناب سید احسان علی شاہ میرے پرانے کرم فرما اور لاہور کے مشہور صحافی ہیں وہ مسلمان ہیں اور اچھے مسلمان۔ ان کے پیش نظر ملک اور قوم کی بہبود کا سوال رہتا ہے اصل میں تو وہ تصنیف و تالیف کے آدمی ہیں اور انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں لیکن یہ اخبار نویسی بھی ایک نشہ ہے اس میں پھنسا ہوا ادیب اور شاعر مشکل ہی سے نکلتا ہے میرے خیال سے تو یہ بھی ایک خامی ہے جو پختہ ہو جاتی ہے ہم سے بڑے اچھے اچھے ادیب اور شاعر ہمارے ملک کی بازاری صحافت نے چھین کر ضائع کر دیئے لیکن احسان صاحب صحافت میں بھی اپنے تصنیفی و تالیفی ذوق سے مستغنی نہیں ہوئے بلکہ ان کے سامنے اچھے اور بلند منصوبے ہیں۔

پروفیسر افتخار احمد صدیقی

جناب افتخار احمد صاحب پہلے اسلامیہ کالج میں لیکچرر تھے اور اب عرصہ سے اورینٹل کالج میں پڑھا رہے ہیں وہ ادیب سے زیادہ مسلمان ہیں۔صوم وصلوٰۃ کے عادی اور اخلاقی اقدار کے عاشق۔ وہ اپنے شاگردوں سے بچوں کا سا سلوک روا رکھتے ہیں مگر بچوں کو ڈانٹتے نہیں۔ خام عمر دوستوں کی طرح ناراض ہوتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں جہاں تک علم و آگہی کا تعلق ہے وہ ان کے قلمی شاہکاروں سے ظاہر ہے ان میں ان کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی ہے اور دوسری تالیفات بھی۔

اکرم چغتائی سیالکوٹی

جناب اکرم چغتائی ایم۔اے کے بعد تاریخ ادبیات پاکستان کے شعبہ تحقیق میں ریسرچ افسر ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ چغتائی نوجوان ادیب ہیں اور ان کا دکنیات اور اشپرینگر پر اتنا وسیع مطالعہ ہے کہ وہ اس پر فخر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ آئے دن ان کے مضامین ملک کے رفیع رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں اور بہت کم آدمی ہیں جن کا مطالعہ اردو کے اولین دور پر ہے۔ جناب اکرم چغتائی کا اگر یہی عالم رہا اور وہ اسی طرح مطالعہ کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے رخ پر اتھارٹی قرار پا جائیں آج کل وہ اپنے گھر سیالکوٹ میں ہیں مگر ان کے مضمون برابر چھپتے رہتے ہیں۔

الطاف گوہر

جناب الطاف گوہر ملک کی انتظامیہ کے ایک خاص رکن ہیں۔ کالج کے وقت سے انہیں شعر و ادب کا ذوق چلا آ رہا ہے وہ ایک صاحب فکر ادیب ہیں لیکن ان کی مصروفیت اس قدر ہے کہ وہ سر نہیں اٹھا پاتے۔ اس کے باوصف وہ ادیبوں اور شاعروں کو نوازتے رہتے ہیں اور نہ جانے کتنے ادیب اور شاعران کے فیض سے زندگیوں کو آسودگی سے گزار رہے ہیں۔ یہ بڑی خدمت ہے انسانیت کی اور قدر شناسی ہے علم کی۔ ہمارے ملک میں بہت کم لوگ اس دل و دماغ کے ہیں جو اس طرح انسانی خدمت کر رہے ہیں۔

سید امجد حسین

سید امجد حسین غالباً سیون میں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے ہیں یوں تو ہمارے یہاں مزاح نگاروں کی کمی نہیں لیکن امجد صاحب کا ایک خاص طرز تحریر ہے جو انہیں کا حصہ ہے ان کے مزاح میں فحاشی نہیں ہوتی بلکہ ایک متین اور سنجیدہ سا تاثر جو ہونٹوں پر تبسم روشن کردیتا ہے اور اسی کا نام صحیح معنی میں مزاح نگاری ہے مگر ان کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری - اگر ان کا کوئی مجموعہ چھپا ہوگا تو وہ ادب میں ایک خاص قسم کا اضافہ ہوگا -

ابو صالح اصلاحی

ابو صالح اصلاحی جناب امین احسن اصلاحی کے صاحبزادے تھے جو ہوائی جہاز کے حادثے میں دوسرے صحافیوں کے ساتھ راہی عدم ہو گئے - انا للہ وانا الیہ راجعون! میں نہ جانے کتنی بار ابو صالح سے ملا ہوں لیکن میں نے کبھی انہیں غمگین نہیں دیکھا تھا وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے اور مسکرا کے بات کرتے اب بھی اس کا ہنستا ہوا چہرہ میرے سامنے ہے افسوس کہ ابو صالح اپنی بہاروں کا شباب نہ دیکھ سکا - اس کے قلم میں بڑی جان تھی اور اس کی تحریر کا تاثر فوراً زائل ہو جانے والا نہیں تھا مگر آہ! موت اس جبر مشیت کے سامنے کون لب کشائی کر سکتا ہے -

پروفیسر احسن فاروقی

احسان صاحب طاہر فاروقی صاحب کے بھائی ہیں اور مردان میں پروفیسر ہیں نہایت خوش مذاق اور خلیق انسان ہیں - میں نے تبصرہ اور تنقید میں انہیں نہایت چاق و چوبند پایا ہے - اگر یہ ان کی استادانہ مہارت بھی قرار دے لی جائے تو پھر بھی وہ مطالعہ اور مشاہدہ کے انسان ہیں - نثر اور نظم دونوں پر انہیں عبور ہے لیکن ابھی ان کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا -

اثر گوالیاری

جناب عبدالغنی اثر گوالیاری حضرت دعا ذبائی کے شاگرد ہیں اور حیدرآباد میں مقیم ہیں - غزل گو ہیں اور ظاہر ہے کہ جناب دعا کی تربیت نے انہیں بہت کچھ دیا ہوگا - لوگوں سے تعریف سنی

ہے ان سے بالواسطہ کلام سننے کا موقع میسر نہیں آیا۔

عبدالرحمٰن آزاد

جناب عبدالرحمن آزاد بریلی کے ایک علمی اور دینی خاندان کے فرد ہیں ان کے والد جناب محسن بریلوی اپنے دور کے مشہور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح آزاد صاحب کو ذوق ادب ورثہ میں ملا ہے اور یہ جو کچھ ہیں انہیں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ فطرت کبھی بخل سے کام نہیں لیتی لیکن انسان اپنی جدوجہد میں بے پروائی برت کر نا کافی کو تقدیر کا لقب دے دیتے ہیں۔ اگرچہ جناب آزاد ان لوگوں میں نہیں لیکن عموماً شعراء کا طبقہ شاعری کے سوا کچھ نہیں کرتا اور یہ بڑا ہی افسوس ناک پہلو ہے۔ جناب آزاد سے ہمیں بہت امیدیں ہیں مگر ان کا کوئی کارنامہ نظر سے نہیں گزرا۔

منشی محمد احمد احمدؔ سہارنپوری

جناب احمد سہارنپوری بڑے پختہ گو اور نغز رقم شاعر تھے۔ یوں تو غزل بھی بہت خوب کہتے تھے اور ان کے یہاں الفاظ کا دروبست نہایت اچھا ہوتا تھا لیکن جب وہ نعت کہتے تھے وہاں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں اپنے روحانی ذوق سے بول رہے ہیں۔ ان کے کلام میں فنی عیوب اور ابتذال نہیں ہوتا تھا وہ اچھے اور سنبھل کے شعر کہنے والے شعراء میں تھے ان کے کلام کا ایک نعتیہ مجموعہ ''ہلال یثرب'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر جناب مضطر خیر آبادی کے صاحبزادے ہیں تو ہمیں اس اظہار کی ضرورت نہیں کہ انہیں ذوق شعر ورثہ میں ملا ہے جاں نثار گوالیار میں پیدا ہوئے اور اس خاندان میں ملک کے بڑے بڑے مقتدر اور مشہور لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی ایم۔ اے تک کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ بے شمار مشاعرے ہم دونوں نے ساتھ پڑھے ہیں۔ پھر ان کا تقرر وکٹوریہ کالج گوالیار میں ہو گیا لیکن دوران ملازمت بھی وہ اکثر مشاعروں میں ملتے رہے بلکہ ایک بار تو وہ خود مجھے گوالیار لے گئے اور ایک ایسی جگہ چائے پائی جہاں ہم دونوں کو چوروں کی طرح دبے پاؤں سانس روک کر جانا پڑا۔

مگر وہاں پہنچ کر محسوس ہوا کہ اگر یہ صحبت میسر نہ آتی تو میں ایک نسوانی سلیقہ کے مشاہدہ سے محروم رہ جاتا - وہ نقش آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح روشن اور تابناک ہے -

ان کی شاعری کی ابتدا تو علی گڑھ میں ہو گئی تھی لیکن جوں جوں وقت بڑھتا گیا جان نثار کی شاعری جوان ہوتی چلی گئی اور ایسے ایسے چمن تخلیق ہوئے کہ سامعین کے دل و دماغ میں آج تک مصرعوں اور شعروں کی صورت میں ان کے شاندار ماضی کا تعارف کراتے ہیں -

علی گڑھ کی زندگی میں بھی جان نثار وہاں کے ادبی مشاغل اور ادبی اداروں کی روح رواں رہے اور علی گڑھ سے آ کر وہ ملک گیر شہرت پا گئے -

جان نثار اختر شعراء کے اس گروہ سے متعلق ہیں جو ترقی پسندوں کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور جن کے ادب میں محبوب کے خط و خال سے قطع نظر ملک اور قوم کے خیالات زیادہ نمایاں ہیں - ان کی نظموں میں تو خیر ہے ہی مزے کی بات' ان کی غزلوں میں بھی ایسے ایسے نشتر موجود ہیں جو جاں نثار کے مافی الضمیر کی ترجمانی سے دوسروں کو بھی ان کے دور کا شریک بنا دیتے ہیں -

ان کے یہاں ایک حسین اور کارآمد قسم کی مقصدیت ہے جو اشعار میں ڈھل کر ایک افسوں سے کم نہیں رہی لیکن ان کی مقصدیت ان کی رومانیت پر غالب نہیں آتی وہ شکست دل کی الاپ کو بھی نغمہ بہار کی طرح پیش کرتے ہیں ان کے کلام کا ایک مجموعہ ''سلاسل'' کے نام سے چھپا تھا اس کے بعد مجھے ان کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہو سکا -

عبد العلی اظہار سہسوانی

جناب اظہار سہسوانی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے اور بڑے نغز گو شاعر تھے دہلی میں ان کے بہت سے شاگرد تھے اور جس مشاعرے میں جاتے تھے ان کے ساتھ شاعروں کا ایک ہجوم ہوتا تھا - نہایت زود گو اور زبان و بیان سے چوکس شعر کہتے تھے سنا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے اب تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی ان کے خلوص کے نقوش اب تک تابندہ ہیں اور کوئی مرطوب ہوا انہیں دھندلا نہیں کر سکتی - وہ پولیس کے آدمی تھے مگر ان کے اندر کا انسان ابھی زندہ اور باغیرت تھا -

مولانا انور صابری دیوبندی

میرے بڑے دیرینہ کرم فرما ہیں جو پہلے پہلے تو میں ان سے گھبرایا کہ یہ ناف بوس ڈاڑھے میں سے چھوٹا سا گول چہرہ کس کو جھانک رہا ہے۔ لیکن پھر جس قدر رنز دیکی ہوتی گئی ان کے جوہر کھلتے گئے اور معلوم ہوا کہ یہ مولانا تو برائے نام ہیں البتہ شاعر ہیں اور ان کی شاعری پورے آدمی کی شاعری ہے۔ شاعری کی ہر صنف پر آپ کی دسترس ہے اور جب اسٹیج پر ترنم سے شعر پڑھتے ہیں تو ہاتھ پاؤں اور تمام اعضائے جسمانی سے شعر کی تصویر بن جاتے ہیں۔ مولویوں میں مولوی رندوں میں رند صاحباں طریقت میں صاحب طریقت' شاعروں میں شاعر' ادیبوں میں ادیب اور شعبدہ بازوں میں شعبدہ باز۔

کائنات کی ہر حسین شے سے وہ عشق فرماتے ہیں اور اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ انسانی نقش ونگار کی صورت میں ہو یا سکوں کی جھنکار کے برن میں' سگرٹ کی خوشبو کے رنگ میں ہو یا آواز کے لوچ میں۔ جب شاعروں کی گہما گہمی نہیں ہوتی تو مولانا کا چہرہ اترا رہتا ہے اور طبیعت میں پڑچڑا پن آجاتا ہے۔ کیونکہ انڈیا حکومت کی طرف سے ان کا جو وظیفہ ہے ان کی قربانیوں کا حق ادا نہیں کرتا انہوں نے اس وطن پرستی کی بڑی قیمت ادا کی ہے۔

ایاز صدیقی

جناب ایاز صدیقی کا خاندان بھی رہتک علاقہ ہریانہ سے آیا تھا اور ملتان میں رہ پڑا۔ اب تک وہ ملتان ہی میں مقیم ہیں اور کسی بنک میں ملازم ہیں۔ صاف ستھرا شعر کہتے ہیں اور اعتدال پسند ہیں ان کے یہاں نہ قدامت ہی قدامت ہے اور نہ جدید رنگ میں گمراہی کی حدوں میں داخل ہوتے ہیں وہ نہایت سنبھل کر شعر کہتے ہیں جس سے اس دور کا ایک سلامت روی کا معیار قائم ہوتا ہے ہمیں ایسے نوجوانوں سے امیدیں رکھنی چاہئیں ان میں ان کی بلندی کے آثار بولتے اور ترقی کی کونپلیں اپنا اظہار کرتی ہیں۔

اختر سعید خان

اختر سعید خان جناب حامد سعید خان کے صاحبزادے ہیں وہ بھوپال میں وکالت کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ انہیں ذوق شعری ورثہ میں ملا ہے اور اچھی بلند غزل کہتے ہیں۔اختر سعید خان اور محمد سعید خاں لاہور میں بھی رہے ہیں۔ اس وقت بھی انہیں شعر کی اچھی خاصی سوجھ بوجھ تھی حالانکہ اس وقت وہ طالب علم تھے اب تو ان کی مشق کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہوگی۔

اثر چکوالی

اثر چکوالی صاحب پختہ مشق انسان تھے اور ذکاوت وفطانت بھی بلا کی تھی۔شاعرانہ اعتبار سے پنجاب کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے ان کے کلام میں دلکشی بھی تھی اور روانی بھی۔

اختر اورنیوی

جناب اختر اورنیوی شعر بھی کہتے ہیں اور ادب کی دوسری اصناف میں بھی انہیں درک تامہ ہے ان کے اشعار میں زندگی کی صداقتوں کے جلوس اور حالات و واقعات کی طرف ملکے ملکے خوشگوار اشارے ملتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعر سے زیادہ ادیب ہیں اور ادب میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ وہ اپنے یہاں تفصیل کو بار خاطر نہیں ہونے دیتے اور کام کام کی باتیں لکھتے ہیں۔ان کی نثر میں ہمہ گیری اور نظم میں نغمگی خاص اجزاء ہیں۔

آفاق صدیقی

جناب آفاق صدیقی فرخ آباد کے رہنے والے ہیں تقسیم کے بعد سے سکھر میں مقیم ہیں اصناف سخن میں غزل اور نظم دونوں پر حاوی ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں منتظم طبیعت پائی ہے اور دیوان چھپ چکا ہے۔بحیثیت انسان بھی خوب آدمی واقع ہوئے ہیں۔ شاعروں میں شاعر ہیں اور ادیبوں میں ادیب، سکھر میں ہر علمی وادبی تحریک میں ان کا حصہ ہوتا ہے۔

امید رضوی بریلوی

جناب امید رضوی بریلوی، بریلی کے علمی ادبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں نظم ہو یا غزل ان کے لیے کوئی گھر بند نہیں وہ اب بھی بریلی میں ہیں وہیں کے ایک مقامی رسالہ میں لکھتے ہیں۔ بحیثیت دوست نہایت قابل قدر انسان ہیں اور شریف الطبع واقع ہوئے ہیں۔ شروع میں وہ مجھے کراچی میں ملے تھے اس وقت وہ ایک دارالعلوم میں استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے لیکن بعد میں ان کا دینی ذوق پھر بریلی لے گیا اور اب تک وہیں ہیں۔

عبدالرحمٰن خاں آرزو

جناب آرزو بھی علی [illegible] کے ان شعراء میں تھے جنہیں شہر اور قرب و جوار میں سب جانتے پہچانتے اور ان کے شاعرانہ مقام سے آگاہ تھے ان کا مجموعہ کلام میری نظر میں نہیں آیا اور ایک دو غزلوں سے اندازہ شاید درست نہ ہوگا۔

محمد افضل، افضل امرتسری

میرے قدیم کرم فرماؤں میں ہیں تقسیم کے بعد وہ امرتسر سے لاہور آ گئے تھے اور یہاں پنجابی کالج کے پرنسپل ہیں۔ یوں تو پنجابی کے آدمی ہیں لیکن وہ اردو میں بھی کہتے ہیں اور نثر میں بھی وہ اردو کے بہت سے ادیبوں پر بھاری ہیں۔ ذوق شعر انہیں ورثہ میں ملا ہے مگر کالج کی مصروفیت انہیں ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دینے دیتی لیکن اس کے باوجود اردو کے اچھے خاصے ادیب ہیں اور ان کے کلام کا بھی مجموعہ چھپنے کے قابل ہو گیا ہوگا۔

اکبر لاہوری

جناب اکبر لاہوری مولانا تاجور کے شاگرد ہیں اردو انگریزی سے بحد تقاضا واقفیت ہے سرکاری ملازمت میں تھے اب آ کے ریٹائر ہوئے ہیں۔

نہایت شگفتہ کہنے والوں میں ہیں غزلوں سے زیادہ نظمیں کہتے ہیں ان کے یہاں ایسا مزاح ہوتا ہے جو نہایت گہرا طنز ثابت ہو، تاہم شریف اور معزز انسان ہیں اور قدیم لوگوں کی طرح ان کے

دل میں دوست دشمن دونوں کے لیے جگہ ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اسی مشاہدہ سے اپنی شاعری کا خمیر اٹھاتے ہیں - ان کے یہاں حسن و عشق کا عنصر کم اور اصلاح کا پہلو زیادہ ابھرتا ہے - نئے دوست بنانے کے عادی نہیں قدیم دوستوں سے محبت اور رکھ رکھاؤ ہے -

احمد شجاع پاشا

جالندھر کے رہنے والے ہیں علی گڑھ میں تعلیم ہوئی نظم' غزل اور افسانہ ہر سہ اصناف ادب پر حاوی ہیں - افسانہ کی دس گیارہ کتابیں ان کے قلم کی مرہون ہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں - مگر ملازمت کی مصروفیت کے باعث نظم اور غزل سے عرصہ ہوا دست بردار ہو گئے عرصہ سے افسانے کی بھی کوئی کتاب نہیں آئی اور یہ تحریر سے خالی عرصہ ان کے احساس فرائض کا غماز ہے - بحثیت انسان بھی پاشا صاحب نہایت خلیق اور اقدار انسانیت کے علمبر دار ہیں -

تقی انجم

جناب تقی انجم کالج میں لیکچرر ہیں ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت معیاری ہے وہ استاد ہیں اور فن شعر کے نشیب و فراز ان کی نظر میں رہتے ہیں - وہ اعلیٰ قسم کے شاعر ہیں مگر دوسرے کم مایہ لوگوں کی طرح بھڑ کتے نہیں وہ صاحب ظرف انسان ہیں جو شرافت کی پہلی نشانی ہے ان کے یہاں وہی کچھ نظم ہوتا ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں اور جو وہ کہنا چاہتے ہیں ظاہر ہے معیار سے گرا ہوا نہیں ہو سکتا ان کی شاعری مشعل راہ ہے نئے لکھنے والوں کے لیے جو فن کی قیود کو ضروری سمجھتے ہیں اور پایاب ہو جانا نہیں چاہتے -

ادیب سہارنپوری مرحوم

ادیب مرحوم سے میری ملاقات اندور کے مشاعرہ میں ہوئی تھی وہ اس وقت بھی شاعر تھے مگر ان میں سوز و گداز نہیں تھا جو کراچی میں آ کر پیدا ہو گیا تھا - غالباً یہ غربت کے مصائب اور دوستوں کی چشم پوشی کی دین تھی - ادیب اپنے مجموعہ ''رنگ و آہنگ'' میں اپنے خیالات اور خدوخال سمیت موجود ہے اور تاریخ ادب میں اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکے گا - ان کے یہاں ایک خاص قسم کا سوز د

گداز ہے اور قدرت نے اسے ایک اچھوتا طرز بیان ودیعت فرمایا ہے افسوس کہ ادیب ہم میں زیادہ دنوں نہ رہ سکا اور ادبی دنیا ایک عطیہ فطرت سے محروم ہوگئی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

فطری شاعر ہیں ان کے یہاں شعر و نغمہ و شبنم اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ہمیں بیک نظر الگ الگ ان کے اشعار میں ان کی نیت اور عزائم دونوں کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا ادبی اور خالص قسم کا ہے کہ اشعار کا تاثر ناظرین و سامعین کو افق تک نظر نہیں بلکہ تاثر دے کر کسی نامعلوم وسعت میں گم ہو جاتا ہے ان کے دل کی حدت اشعار میں ڈھلتی ہے اور اپنے مرکز کی طرف سورج کی وادیوں کی طرف نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے ان کے آنسو جب شعر کا لباس پہنتے ہیں تو ذہن و سماعت پر اپنے بہاؤ کی لکیریں ثبت کرتے ہوئے اپنے منبع کے فطری جادہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ان کے اشعار کا مواد ان کی گفتگو اور گفتگو کے وقت ان کے چہرے سے پڑھا جا سکتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے دلی جذبات کے ساتھ دماغ بھی برابر کا شریک معلوم ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں دماغ دل سے بڑھ جاتا ہے کیونکہ دماغ زمین پر پھیلنے کے لیے بیدار ہوا ہے اور دل ہماری دوسری دنیا کی پگڈنڈیوں کو جاگر کرتا ہے اور ایسا شاعر بڑا سخت جان ہوتا ہے اور تمام علامات بشارت ہیں ان کی کامیابی اور حیات بعد الموت کی جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔

سید آل احمد

سید آل احمد بہاولپور کے نوجوانوں میں ایک خاص رخ کے انسان ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی اور شاعری و صحافت کا آمیزہ ان کی شاعری میں نہایت حسین صورت اختیار کر لیتا ہے ان کی صحافت میں شاعری کے خدوخال ابھرتے معلوم ہوتے ہیں اور شاعری میں سیاست کی گتھیاں نکلتی نظر آتی ہیں۔ وہ فکر و خیال کے اعتبار سے جدید لکھنے والوں کی صف میں آتے ہیں اور ان کی ترقی پر بھی حدود نہیں لگائی جا سکتیں۔

اقبال عظیم

اقبال عظیم صاحب ڈھاکہ میں پروفیسر ہیں اور نہایت شستہ شعر کہتے ہیں انہیں کئی بار سننے کا اتفاق ہوا- ان کے شعر سے مشق سخن اور کثرت مطالعہ کا سراغ ملتا ہے مجھے ان کے ہاں الجھن نہیں ہوتی وہ صاف ستھرا شعر کہتے ہیں- نثر میں بھی وہ معاصرین میں کسی سے کم نہیں لیکن ان کی غزل میں بڑے بڑے لطیف اور نازک مضامین ہوتے ہیں- رنگینی اور موسیقی ان کے شعر کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور یہ بڑی بات ہے-

عبداللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ کے ادارہ سے وابستہ تھے اور تاریخ و ادب پر ان کا مطالعہ معمولی مطالعہ نہ تھا- وہ تحریر میں صاحب طرز ادیب اور تقریر میں صاحب تفویض انسان تھے- اب تو جامعہ ملیہ کی فضا میرے لیے خواب ہو کر رہ گئی ہے نہ جانے اعظمی صاحب دہی ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں وہ جہاں بھی ہوں گے مجھے امید ہے کہ بہتر حالت میں ہوں گے اس وقت ان میں بڑی زندہ اور بے تاب صلاحیتیں تھیں-

ارتضیٰ احمد قادری

جناب ارتضیٰ احمد قادری بدایوں کے رہنے والے ہیں اور آج کل اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں انہوں نے علی گڑھ سے ایم-اے کیا تھا- مجھے یاد ہے کہ انہوں نے فانی بدایونی پر ایک مقالہ لکھا تھا جو نہایت قابل قدر اور مبسوط تھا لیکن پاکستان میں آنے والوں کے لیے چاروں طرف بڑی دشواریاں تھیں لیکن جب سکوں ہوتا ہے تو دشواریاں اور مشکلات تو ادب کی تخلیق میں قوت و حیات کا حکم رکھتی ہیں-

جگناتھ آزاد

آزاد حضرت تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں- ذوق شعری تو ان کا ورثہ ہے اور جیسے یہ شاعر ہیں انہیں ایسا ہی ہونا چاہئے اب وہ فیصلہ کریں کہ انہیں لاہور سے کیا کچھ ملا ہے اور دلی نے کیا

بخشا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ انہیں لاہور اور دہلی کے راستوں سے جو کچھ ملا ہے وہی ان کی شاعری کا حسن ہے آزاد کے کلام میں ماضی کی یاد اور اوائل حال کی تلخی کچھ ایسی مقدار سے مل گئی ہیں کہ ان کے تصورات و خیالات میں افسونی قوت آ گئی۔

احمد مشتاق

احمد مشتاق صاحب نوجوان شاعر ہیں۔ خاموش اور شریف انسان اول سے شعر و ادب کا ذوق رہا ہے۔ زیادہ دن نہیں ہوئے ان کے کلام کا مجموعہ ''مجموعہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ وہ جدید ادب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن قدیم ادب والوں سے نفرت نہیں کرتے وہ اپنی کتاب میں اپنے تمام ادبی اور شاعرانہ اوصاف سمیت نظر آتے ہیں۔

ابن انشاء

جناب ابن انشاء، رائٹر گلڈ کے سرگرم کارکنان میں ہیں اور نظم و نثر دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ چونکہ جدید مطالعہ کے آدمی ہیں اس لیے ان کے یہاں بیان بھی جدید ہے اور مضمون ایسے ایسے رخ سے پیدا کرتے ہیں کہ ان کی دقت نظر اور فکری مشق و مزاولت اعلان کرتی ہے ان کا مطالعہ ان کے بہت سے ہم عصروں میں فوقیت رکھتا ہے۔ مجھے انہیں زیادہ نزدیک سے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جتنی بار ملے ہیں انہوں نے مجھ پر اپنا ایک تاثر ضرور چھوڑا ہے۔

مجید امجد صاحب

مجید امجد صاحب سے بھی میری آج کی رسم و راہ نہیں بلکہ ایک زمانے سے میں اس قیامت سے آگاہ ہوں۔ یہ یوں تو سرکاری ملازم ہیں اور مصروفیت کی دیوار بھی انہیں شعر و شاعری کی طرف آنکھ اٹھانے میں مانع رہتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فطری جذبہ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ عصر جدید کے شاعر ہیں اور شاعری میں انہوں نے ہیئت کے رنگا رنگ تجربات کئے ہیں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہیئت کے تجربہ کرنے والوں کے اشعار دیواروں کی ردو بدل کے ملبے میں دب کے رہ جاتے ہیں کیونکہ اس ملک کی موسیقی میں اس قدر گنجائش ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ شاعری کی ہر صورت کو وہ نغمہ کا

لباس دے دے اس لیے ان کی محنت کی داد انہیں کم ہی ملتی ہے اور یہی سبب ہے معرا شاعری یہاں کامیاب نہیں ہوسکی۔ یہاں کے لگے بندھے موسیقی کے اصول انہیں الاپ اور سرگم کے سانچوں میں نہیں ڈھال سکے۔ اس کے باوجود مجید امجد کے یہاں شاعری کی صورت بدلنے پر بھی حسن باقی رہتا ہے اور غنا کی کیفیت کے علاوہ بھی اس کے نغمے دلوں میں بجتے اور رقص کرتے ہیں۔

ان کے مقامی رنگ کے بہت سے ایسے ٹکڑے ملتے ہیں کہ ان پر زربفت قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے وہ احساس اور کرب ہی کو الفاظ نہیں دیتے بلکہ ہوا کی آہنوں اور آندھیوں کے خرام کو بھی زبان دیتے ہیں اور ہر وہ بات کہہ دینا چاہتے ہیں جوان کے خون میں جولان و تپاں رہتی ہے۔

مجید امجد اپنے ماضی ہی کے مطالعہ کو شاعری میں زندہ نہیں کرتے بلکہ حال کے روزمرہ اور مشاہدات کو بھی عمر ابد دے دیتے ہیں ایک وقت وہ آئے گا جب شاعروں کے کارناموں سے ان کی زندگیاں مرتب کی جائیں گی اور نفسیات کے ماہران خاموش تحریروں کے منہ میں زبان دے دیں گے اس وقت مجید امجد اور اسی قسم کے تمام شعراء کے کارنامے اپنی اپنی قیمتیں خود بتائیں گے۔

اللہ نواز خاں نواز

ان کے اجداد دور ہمایوں میں قندھار سے آکر کوہ سلیمان کے دامن میں آباد ہو گئے تھے اس علاقے مین ان کی قوم کے ہزارہا آدمی ہیں۔ سرکار انگریز نے انہیں ہر قسم کی مراعات دے کر اونریری مجسٹریٹی دے دی تھی ان کے والد اس علاقہ کے دیوانی اور فوجداری مقدمات خود فیصل کرتے تھے لیکن پاکستان بننے پر انہیں مجسٹریٹی کے اختیارات نہیں دیئے گئے اللہ نواز نے لاہور سے بی اے آنرز کیا اور پھر اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیئے گئے مگر ایک تو شاعر اور پھر افسری چنانچہ اپنی آزادہ روی کے باعث وہاں نہ رہ سکے۔ لیکن چونکہ ان کے بزرگوں کی عظمتیں غیر متعارف نہیں تھیں اس لیے پھر آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے اور یہ بھی طبیعت پر بار ہوا۔ چنانچہ پھر مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصے لینے کے جرم میں تین ماہ کے لیے نظر بند کر دیئے گئے اور راجن پور رہے۔

شروع میں جناب شاداں بلگرامی اور ی اس یگانہ سے کلام پر اصلاح چاہی مگر خود شناسی ان کی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ یہ دونوں استاد بھی انہیں مطمئن نہیں کر سکے چنانچہ غالب اور بے دل کی

روحانی شاگردی قبول کی- اگرچہ کلام میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے-لیکن طبیعت میں بلا کی افغانیت موجود ہے جوان کی پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اردو' فارسی کے علاوہ ملتانی اور پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں اوراپنے سرورانا میں ہروقت مست ہیں-

اصل میں نواز میں قوت تخلیق کا غلبہ اور شدت جذبات کا طوفان گڑبڑا جاتا ہے اوراس کے گرداب ان کے اظہار خیال میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں اگر کہیں نواز کی یہ تمام قوتیں اعتدال پر آجائیں تو وہ اپنے دور کا بے دل ہے اللہ نواز خاں لاہور کے میوہسپتال میں اچانک آ کر داخل ہوئے اورایک ہفتہ کے اندر اندر گھل کر رہ گئے اثنائے علالت میں نواز نے مجھے کئی بار بلوا کر بھیجا مگر پیغام مجھ تک نہ پہنچا آخر وہ راہی عدم ہو گئے- اناللہ وانا الیہ راجعون

لطیف انور گورداسپوری

جناب لطیف انور گورداسپوری میرے قدیم کرم فرماؤں میں ہیں جناب سیماب اکبرآبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں ہیں سیماب صاحب کے شاگردوں میں ان کا خاص مقام ہے- سیماب صاحب کی تربیت نے انہیں بہت کچھ دیا ہے- اورانور صاحب کواس کا اعتراف بھی ہے-

لطیف انور صاحب اصناف شعری کی ہر صنف پر غالب ہیں اور جہاں تک فن کا تعلق ہے اس میں انہیں قابل رشک آگاہی ہے اور کلام میں برجستگی اور کساؤ ہے جو سیماب صاحب کا طرہ امتیاز تھا-

جناب انور شعروادب میں جس مقام کے مالک ہیں وہ انہیں نہیں ملا اوراس میں ان خام قسم کے شاعروں اورادیبوں کا ہاتھ ہے جواچھے لوگوں کے سائے میں پل کرانہیں کی بیخ کنی کو شیوہ بنالیتے ہیں-

جناب انور' عسرت مگر خودداری کی زندگی بسر کرتے ہیں-انہیں دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ ناہنجار زمانہ اپنے کیسے کیسے موتیوں کو رول رہا ہے-ابھی ان کا کوئی مجموعہ کلام سامنے نہیں آیا-

راجندر کرشن احساس

راجندر کرشن شملے کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک سے پہلے وہ میرے یہاں لاہور آ گئے تھے اور تقسیم کے ہنگامے نے انہیں بمبئی جا پھینکا - مگر خدا کا شکر ہے کہ ان کی شاعری کے فطری ذوق اور ادب کے قدرتی رجحان نے انہیں بمبئی میں ایک اچھا اور بلند مقام دے دیا وہ وہاں اچھے' مطمئن اور خوش حال ہیں-

فلموں کے لیے گانے' مکالمے اور کہانیاں لکھتے ہیں اور حسن انتظام کی صلاحیت قدرت نے اس قدر دی ہے کہ اچھے اچھے لوگ ان سے مشورہ کرتے ہیں-

نہایت سلیقہ شعار اور خوش فکر قسم کے انسان ہیں ان کا خلوص اور احترام آج تک وہی ہے جو پہلے دن تھا اور غالباً یہ ان کی نیک نیتی اور خلوص دل ہی کی برکت ہے کہ وہ بمبئی میں جہاں ادیبوں اور شاعروں کے ریوڑ مارے مارے پھرتے ہیں وہاں وہ ایک عزت اور شہرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں-

انہوں نے لکھا تو بہت ہے لیکن فلمی مصروفیات انہیں ترتیب و تدوین کے عمل تک نہیں آنے دیتیں لیکن میں ان سے مایوس نہیں وہ ابھی جوان ہیں اور ان کے سامنے عمل کا میدان پڑا ہے-

ابن سائل

ابن سائل کا نام قطب الدین احمد خان ہے انہیں ذوق شعر تو ورثہ میں ملا ہے اور سوز و وجدان بھی لیکن اب تو ان پر تصوف ایسا غالب آیا ہے کہ ان کی صورت سے ڈر لگنے لگا اور ان کا ادب کرنے کو جی چاہتا ہے وہ اپنے والد حضرت سائل دہلوی کے ترنم میں غزل پڑھتے ہیں اور انہیں سن کر حضرت سائل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ابن سائل نہایت اچھے مزاج اور مذاق کے آدمی ہیں خدا کرے ان کی درویشی انہیں دنیا سے بیزار نہ کر دے آثار کچھ اسی قسم کے ہیں- ابن سائل اپنے اشعار میں روزمرہ محاورات کا زیادہ استعمال کرتے ہیں اور وہ اس سے زبان میں ایک اضافہ کر رہے ہیں جو ضروری بھی ہے اور صحت مند بھی-

اختر رضوی

جناب اختر رضوی نظم اور غزل دونوں اچھی کہتے ہیں اور انگریزی کے اثر سے سانیٹ بھی کہتے ہیں لیکن جب وہ غزل کہتے ہیں تو نہایت اچھی روایتی غزل کہتے ہیں وہ موجودہ نئی روش سے متاثر نہیں سانیٹ میں بھی وہ انگریزی دماغ سے نہیں سوچتے بلکہ صرف ہیئت تک محدود رہتے ہیں۔کوئی مجموعہ کلام نظر نہیں پڑا۔راولپنڈی میں ایک بار ملاقات ہوئی اس کے بعد موقع نہیں مل سکا۔

اقبال ارشد

نوجوان مگر پڑھے لکھے انسان، خوش خلق اور خوش گو ایسے کہ نظم ہو یا غزل دونوں پر برابر کا تسلط رکھتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب میں تقلیدی نہیں تفہیمی سوجھ بوجھ کے ساتھ ذاتی تنقید کے شعور کے حامل ملتان کے ادبی حلقوں ہی میں نہیں۔اہل علم و آگہی میں مقبول بہت کم نوجوان ہیں جن میں اقبال ارشد جیسے جوہر پائے جاتے ہیں۔دوست نواز اور بزرگ پرست ایسے کہ دشمنوں میں بھی حسن سلوک کے چرچے ہیں۔ایسے نوجوان ہی مستقبل کی امیدوں کو منور و شاداب رکھتے ہیں۔

محسن احسان

محسن احسان پشاور کے نہایت بلند ذوق اور خوش فکر شاعر ہیں۔ان کے بشرے سے ظاہر ہے کہ وہ ترقی کریں گے اور ان کے کلام سے ان کے مستقبل کی طرف روشنیاں دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ان کی صلاحیتیں مہذب اور جنون خاموش ہے اور یہی نشانی ہے روشن مستقبل کی ان کی غزلوں میں قدیم رنگ کے سانچے اور جدید رنگ کی فکری جھلکیاں عجیب بہار دیتی ہیں وہ سلامت روی سے اقدار ادب کے سائے میں منزلیں مارتے جا رہے ہیں خدا کامیاب کرے آمین۔

جناب آفاق دہلوی

سید آفاق حسین دہلوی، دلی کے مشہور اور نمودار شعراء میں ہیں اور ادب اور اس کے گرد و پیش پر ان کی گہری نظر ہے خوش گفتاری کے ساتھ خوش اخلاق بھی ہیں۔نثر اور نظم دونوں پر عبور ہے۔ان کے کلام میں رنگینی اور دلکشی اور نثر میں تخلیقی انداز ملتا ہے۔

اظہار اثر کرتپوری

جناب اظہار اثر پہلے لاہور میں تھے تقسیم سے پہلے ہی وہ دلی چلے گئے تھے اور وہیں مقیم ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں ان کا ایک خاص رنگ ہے ان کے کلام میں مناظر کی عکاسی جذبات کی تصویریں قیامت رنگ اور زندہ نظر آتی ہیں۔انہیں رقص کے فن میں بھی ایسا کمال حاصل ہے کہ اب وہ رقص کی تعلیم دیتے ہیں اور ترجمے میں ایسی مہارت ہے کہ ہر ماہ ایک ناول کا ترجمہ چھاپ کر نکال دیتے ہیں ان کا ایک رسالہ ''نرالہ جاسوس'' بھی ہے جس میں وہ سب ترجمے ہی پیش کرتے ہیں۔

ابومحمد امام الدین رام نگری

رام نگر بنارس کے رہنے والے تھے اور ایسے پختہ مشق کہ پھر شاعری کا کارخانہ اور مضامین کی فیکٹری قائم کر دی تھی لیکن اس جرم کے باوصف وہ شاعر اور ادیب تھے یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے بہت سے نئے اور جوان دماغوں کو سہولت پسندی کے رستے پہ ڈال دیا تھا جوان کے بعد نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس دروازے جھانکتے پھرے ہوں گے بہرنوع ان کے شاعر اور ادیب ہونے میں شک نہیں تھا۔ نہ معلوم یہ زندگی کی مجبوریاں تھیں یا خامیوں کی پختگی کی لیپ پوت۔

اشرف قدسی

ساہیوال کے نوجوان شاعر اور ادیب ہیں۔ آج کل ساہیوال گزٹ کی ادارت کر رہے ہیں ان کا رجحان تاریخ اور تحقیق کی طرف ہے اور میں انہیں ملک اور قوم کے لیے مفید انسان خیال کرتا ہوں ان کے حال کی جدوجہد میں مستقبل کی توانائی بول رہی ہے وہ دن دور نہیں کہ جب وہ اپنی سعی و عمل سے اپنا مقام حاصل کر لیں گے۔ان کے یہاں اخلاقی اقدار بھی بدستور ثبت پائی جاتی ہیں ان کے کلام کا ایک مجموعہ ''آہنگ وطن'' چھپ چکا ہے اور منٹگمری گزٹ کی ادارت میں ان کا کام قابل تعریف ہے۔

خان اصطفا خاں

اصطفا خاں صاحب لکھنؤ کی مشہور فرم ''اصغر علی محمد علی لکھنؤ'' کے مالک تھے۔نہایت فراخ دل اور فراخ حوصلہ رئیس جناب جگر لکھنؤ میں انہیں کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے۔آخر میں بھوپال ہاؤس میں قیام ہونے لگا تھا۔ جناب اصطفا خان کا دستر خوان وسیع تھا اور ان کے یہاں ادیب اور شعراء ہی کا جھمگھٹ رہتا تھا۔ دہلی لکھنؤ دونوں شہروں کی زبانوں پر عبور تھا اور کہنہ مشقی کے سبب بہت جلد شعر کہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام بھی کہیں میری نظر سے گزرا ہے۔

اجلال لکھنوی

جناب اجلال لکھنوی' لکھنؤ کے نغز گو شعراء میں شمار ہیں وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی نظر اصناف سخن اور اصول وضوابط پر بھی قابل تعریف ہے بااخلاق انسان ہیں اور ملنسار ایسے کہ ایک بار ان سے مل کر مذاق سلیم رکھنے والا انسان تشنگی لے کر اٹھتا ہے۔اجلال صاحب بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔اور ان کی خدمت سے اردو ادب کو بہت فائدہ کے معلومات میسر آتے ہیں۔

مسعود اختر جمال

روایتی شاعری کا ترقی پسند ایڈیشن اس نے اپنی شاعری میں ترقی پسندی کے تمام خطوط کو روایتی بندشوں میں لاکر ایسا حسین امتزاج پیش کیا ہے کہ ان کے کلام کا سوز و گداز ہر سامع اپنا سوز و گداز محسوس کرنے لگتا ہے کہیں کہیں تو وہ غزل میں ایسا ایسا نفسیاتی گوشہ ابھار جاتے ہیں کہ بڑے بڑے ادھرم داد پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ہلکا پھلکا انداز ایک آنسوؤں میں بھیگا ہوا ترنم اور ان کا شباب سے مایوس چہرہ ان کی شاعری میں اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔

اے۔ڈی اظہر

احمد الدین اظہر صاحب جہاں حساب اور انتظامی امور کے آدمی ہیں وہیں وہ ادیب اور شاعر بھی ہیں ان کی ایک کتاب 'لذت آوارگی' مارکیٹ میں آچکی ہے جو اپنے انداز بیان کی واحد کتاب ہے۔اے۔ڈی۔ اظہر صاحب عربی کے فاضل ہیں اور انہیں الفاظ کی صحت کا بہت خیال رہتا

ہے۔ان کے ادب میں ایک اسلامی روح کام کرتی ہے اور وہ اپنی طرف سے اصلاح کی طرف بڑھتے ہیں جو ایک دیندار ہونے کی دلیل ہے وہ انگریزی میں ایک کتاب ''عیسائیت کے خلاف'' ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں اگر وہ کتاب ان کے قلم سے مکمل ہوگئی تو یہ صرف اظہر صاحب کا کارنامہ نہیں ہوگا بلکہ قوم وملت کے لیے تعمیری مدار ہوگا۔ خدا کرے وہ کتاب جلد مکمل ہو جائے۔

انجم صابری

انجم صابری جناب حنیف صابری کے صاحبزادے ہیں۔ تمام خاندان دہلی سے آمد پر ملتان مقیم ہوگیا تھا اور انجم آج کل شیخوپورہ میں لیکچرر ہیں۔ انجم کو ذوق شعر ورثہ میں ملا ہے اس لیے بے تکلف شعر کہتے ہیں مگر روایتی شاعر نہیں۔ انجم موجودہ دور کے نوجوان ہیں اور موجودہ وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور تقاضوں میں ماحول کا مطالعہ بھی شامل ہے اور ہیئتی تغیر بھی جس میں اشارہ کنایہ ابہام اور علامت سبھی کچھ ہیں۔ ہونہار نوجوان ہے اور ہمیں اس سے بڑی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں۔

الطاف مشہدی

الطاف مشہدی صاحب بڑے پرانے لکھنے والے ہیں غزل اور نظم دونوں پر انہیں دسترس ہے وہ شباب اور اس کے لوازمات کو اچھی طرح نظم کرتے ہیں۔ جذبات نگاری کے ماہر ہیں اور وقت کے تقاضوں پر بھی نظر رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی مقبولیت میں کون رکاوٹ بن سکتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے ان کا وہ زور شور کچھ مدھم پڑ گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمر کے ساتھ انسان سنجیدہ ضرور ہوتا ہے اور دنیا کے غم غلط کرنے کے لیے عموماً شعراء حضرات مے خانہ کی دھند میں کھو جاتے ہیں لیکن ایسی بھی کیا گم شدگی۔ میں اپنی توقع کے خلاف الطاف مشہدی کو خمول میں پا رہا ہوں مجھے اس شخص سے بڑی امیدیں تھیں۔ خدا کرے اس کے حالات سازگار ہوں۔ بعض اوقات غم زمانہ بھی انسان کے ہونٹ سی دیتا ہے۔ الطاف مشہدی کا کلام چھپ چکا ہے اور مقبول ہے۔

ایوب رومانی

جناب ایوب رومانی نوجوان شاعر ہیں اور اچھی غزل کہتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ روایتی ہیئت شعری کے قائل ہیں لیکن اپنے تجربہ کی بنا پر متعینہ بحور اور بقید قوافی وہ اپنے اسلوب سے اسے نیا رنگ دے دیتے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں ایک باوقار شاعر ہیں۔

اشفاق احمد خاں

ملک کے مشہور ادیب ہیں اور ان کے ذہن میں ملک کے انتظامی امور اور ادبی نقشے موجود ہیں وہ جو لکھتے ہیں علم اور تجربہ کی روشنی میں لکھتے ہیں۔ لاہور کے ادبی اداروں میں کام کر چکے ہیں اور ہر ادارہ کے خلوص و مقاصد ان کی نظر میں ہیں۔ آج کل وہ مرکزی اردو بورڈ کے مہتمم ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ یہاں بھی اپنی محنت اور فکری کاوش کو بروئے کار لائیں گے اور اردو کے مرکزی بورڈ کا جو کام ہے اس کی روح اور مقصد کو سمجھ کر کوشاں رہیں گے۔

رسول بخش ارشد ملتانی

جناب ارشد نے بہت اچھا ذوق پایا ہے غزل اور نظم دونوں میں ید طولی رکھتے ہیں کبھی کبھی آزاد نظم بھی کہہ لیتے ہیں وہ ایک رسالہ ''صدائے حق'' بھی نکالتے تھے بڑے خلیق اور ملنسار آدمی ہیں۔ ان کی مجلس آرائی ملتان بھر میں مشہور ہے ان کے شعر میں رنگینی بھی ہوتی ہے اور دلکشی بھی علاوہ ازیں وہ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اور یہی مواد ان کے یہاں شعر میں ڈھل کر نشتر کا کام کرتا ہے۔

اسد اریب

ڈاکٹر اسد اریب بدایوں کے رہنے والے ہیں اور گورنمنٹ کالج میں لیکچرر ہیں۔ ان کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ اردو میں بچوں کا ادب نہایت اچھی کاوش ہے۔ انہیں شعر و ادب کا ذوق اپنے والد جناب احسن بدایونی سے ورثہ میں ملا ہے۔ جناب احسن بدایونی حضرت فخر الدین کے شاگرد تھے۔ اسد اریب نظم اور غزل دونوں پر حاوی ہیں۔ آج کل وہ ایک کتاب ''نقد انیس'' کے نام سے

مرتب کر رہے ہیں-نثر میں ان کا انداز تحریر سنجیدہ اور معنی انگیز ہوتا ہے اور غزل میں نئے دور کے بامقصد لکھنے والوں میں ہیں ابھی نوجوان ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ اردو ادب میں قابل قدر اضافے کریں گے-

اعجاز احسانی سورونوی

سید اعجاز حیدرآباد سندھ میں آ کر آباد ہوئے اور ابھی تک وہیں ہیں-اگرچہ یہاں انہیں ادب میں کوئی مقام نہ مل سکا کیونکہ ہر شعبہ میں دھڑے بندی اور جنبہ داری ہے لیکن وہ مایوس نہیں وہ مزدور قسم کے انسان ہیں اور شعر و ادب پر ان کی شکم پری کا دارومدار نہیں وہ کسی تجارتی ادارے میں حساب کتاب لکھتے ہیں اور راستی پر دارومدار ہے-غزل اور نظم دونوں برابر کہتے ہیں اور فن پر ان کی بڑی گہری نظر ہے وہ ناول پڑھنے والوں میں نہیں ہیں بلکہ ادب و تنقید اور عروض اور لغت کے رسیا ہیں اور یہ ذوق بہت اچھا ہے-

ادیب واثقی

جناب ادیب واثقی نوجوان ادیب و شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں دقت پسندی نظر نہیں آتی جو ان کی زود مشقی کا ثبوت ہے وہ یوں تو غزل بھی اچھی کہتے ہیں لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے ان کی نظم، غزل پر حاوی ہے اور وہ اس میں غزل سے زیادہ جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں- کیونکہ ان کے یہاں محل اور موقع کے اعتبار سے الفاظ کا چناؤ اور پھر اس میں غائیت کے عنصر کا شمول انہیں کا کام ہے-آج کل بہاولپور میں صحافت سے منسلک ہیں-

سلطان حسین ایمن

جناب سلطان ایمن غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی مگر چند نظموں غزلوں سے انہیں لوگ مزاح نگار سمجھنے لگے حالانکہ وہ مزاح میں اکثر پٹڑی سے اتر جاتے ہیں لیکن جب وہ سنجیدہ غزل یا نظم کہتے ہیں تو گہرا تاثر چھوڑتے ہیں-کسٹم کے ادارہ سے منسلک ہونے کے باعث یکجائی نہیں، کبھی کبھی کسی مشاعرہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے ان کے کلام کا اب تک کوئی

مجموعہ نہیں چھپ سکا۔

بشیر زیدی اسیر

جناب بشیر زیدی اسیر تخلص کرتے ہیں اور ریڈیو کے ادارے سے منسلک ہیں۔ ان کی کئی غزلیں میری نظر سے گزری ہیں اور ریڈیو کے مشاعروں میں خود ان سے ملا بھی ہوں مگر وہی بات کہ ریڈیو اور فلم کا شاعر اور ادیب اپنے ادب سے بالکل جدا شخصیت رکھتا ہے اور غالباً یہ مشغلہ کا اثر ہوتا ہے ہمیں صرف ادب تک نظر رکھنی چاہئے۔ جناب اسیر کی غزلیں ادب کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور الفاظ کا محل استعمال انہیں معلوم ہے جو شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اسماعیل انیسؔ

محمد اسماعیل انیسؔ جھانسی کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک میں جھانسی سے آ کر لاہور چھاونی میں مقیم ہو گئے اور اب تک وہیں ہیں۔ بڑی کاوش اور محنت سے شعر کہتے ہیں اور مختلف اساتذہ کی صحبتوں سے اپنی علمی کمی کو پورا کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں اگر آدمی تیسرے درجہ کا نہ ہو تو یہ دونوں خصوصیات انسان کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتی ہیں۔ انیس اپنے معاصرین میں کئی لوگوں سے کئی صورتوں میں بلند ہیں لیکن ان کی نظر سے ابھی عظمت شاعر کا مقام اوجھل ہے شاعر ہرگز آسانی سے ہاتھ آنے والی جنس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا جوہر اصل نامحرموں سے پردے کا قائل ہے۔

انیسؔ صاحب پہلے خیاطی کرتے تھے اور اچھے خاصے فنکار ہیں لیکن جب سے ان پر شاعری طاری ہوئی ہے وہ جامہ دوزی سے بغاوت کر گئے اور ایسے انداز حیات کو گوارا کر لیا جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ شاعری ہی کیا ہے جو شاعر کی مکتفی نہ ہو۔ یہ بالکل درست ہے لیکن کاش وہ اسی نظریہ کے تحت مطالعہ اور معلومات کو بھی بڑھا لیں۔

انیسؔ قدیم شاعری کے دلدادہ ہیں اور اس میں انہیں مہارت بھی ہے شاعروں میں بھی انیس داد و تحسین پاتے ہیں اور نجی مجلسوں میں بھی محروم نہیں رہتے۔ ان کی شاعری کے کئی کتابچے چھپ چکے ہیں ابھی دیوان کی نوبت نہیں آئی۔

انور بھٹی

جناب محمد انور بھٹی صاحب لاہور چھاونی میں رہتے ہیں نہایت اچھی نعت پڑھتے اور لکھتے ہیں- کئی دفعہ مجھے ان کی نعتیں سننے کا اتفاق ہوا- لاہور چھاونی میں اپنے معاصر طبقے میں ان کا کلام بڑے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے- ایک زمانے سے کہہ رہے ہیں لیکن اب تک ان کا کوئی مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا-

انور زاہدی

جناب انور زاہدی ذہین اور لسان قسم کا نوجوان ہے اس میں بڑی صلاحیتیں اشارے کرتی ہیں لیکن وہ اپنے ذہنی نکات اور لسانی مشق و مزاولت میں غلو کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اس سے ان کی فطری خوبیاں بھی ان کے لسانی الٹ پھیر میں دھندلی پڑ جاتی ہیں ورنہ وہ نظم اور نثر دونوں میں حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں- ان کا فسون نطق ان کے نقوش قلم پر حاوی ہے اس لیے ان کا کوئی مجموعہ خیال و کلام ابھی سرزد نہیں ہو سکا-

رشید احمد اشغب

جناب رشید ایل- ایل- بی کرنے کے بعد خود بخود اردو کی توسیع اور اشاعت پر تلے اور یہ ذوق ان کا جنون کی حدوں کو چھونے لگا اور انہوں نے ایک بزم ادب ترتیب دے لی اور لکھنا شروع کر دیا آج وہ نہایت اچھے افسانے لکھتے ہیں- لیکن ان کا اردو کی تبلیغ کا جذبہ اسی طرح تازہ دم ہے اور اس میں وہ دامے درمے قدمے سخنے ہر صورت سے مستعد نظر آتے ہیں- دیکھیے یہ جنون انہیں کہاں تک لے جائے-

اختر ہاشمی

جناب اختر ہاشمی کے دم سے لاہور چھاونی کی ادبی محفلیں زندہ ہیں- اردو کی ترویج و اشاعت میں جناب ہاشمی پیش پیش نظر آتے ہیں- مشاعروں میں عموماً قطعات اور غزلیں پڑھتے ہیں مگر زیادہ قطعات ہی سننے میں آئے ہیں- ان کے اشعار اس قدر لطیف اور نازک احساس کے حامل ہوتے

ہیں کہ شاعر اور شعر میں فاصلہ کا اندازہ نہیں ہوتا - جناب اختر ہاشمی کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور شاید یہ ان کی فربہی کی دین ہے ورنہ ان کی ذہنی آزادی ان کی آوارگی کے لیے کافی تھی - اب یہ آوارہ خواب تو ہیں مگر آوارہ مزاج نہیں - بہت اچھا شعر کہتے ہیں اور شعر سے زیادہ دلچسپ باتیں کرتے ہیں -

اختر رومانی

اختر رومانی نوجوان شاعر ہیں نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں آج کل کسی تمبا کو کمپنی میں کام کر رہے ہیں بڑے مہذب اور ذہین ہیں ان کے کلام میں حلاوت بھی ہے اور رنگینی بھی - وہ اپنے شعر میں غنائی حسن کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں نظم ہو یا غزل فکر اور جذبہ کے ساتھ کہتے ہیں وہ ایک تلون پسند عمر کے حصہ میں ہیں مگر ان کی سنجیدگی ضائع نہیں ہوتی اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں - وقت نے موقع دیا تو ان کی ذات سے ادب میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوگا -

انجم یوسفی

جناب انجم یوسفی دہلوی ہیں لیکن تقسیم ملک میں وطن ترک کر کے لاہور آ گئے اور سادہ کاری کرتے ہیں مزدور قسم کے انسان ہیں مگر ان میں قدرت نے دولت احساس بھر دی ہے اور ان کے یہاں شاعری میں جگہ جگہ ان کی بیداری احساس رنگ آمیزی کرتی ہے مشاعروں میں کم جاتے ہیں مگر جہاں جاتے ہیں داد و تحسین سے خالی نہیں لوٹتے -

پروفیسر اسرار احمد سہاروی (علیگ)

اسرار صاحب اسلامیہ کالج میں لیکچرر ہیں - اردو فارسی عربی کے ماہر ہیں اور قانون کی ڈگری بھی ہے - ان کی کتاب ''ادب اور اسلامی قدریں'' میری نظر سے گزری ہے - ان کا ایک ناول ''زندگی'' بھی ہے - ان کی تحریریں ان کے علمی ادبی جراثیم کی شاہد ہیں ان میں زبان و بیان کی خوبیاں اس قدر ہیں کہ بہت کم ادیبوں میں نظر آتی ہیں -

ڈاکٹر محمد الیاس ادیب شاہ پوری

جناب الیاس ادیب تخلص کرتے تھے اور دہلی میں گوردوارہ پران کا مطب تھا- لاہور میں آ کر صرف ایک بار ان سے ملاقات ہوئی وہ لاہور سے دور کہیں دیہات میں مطب کرتے ہیں- دہلی میں تو آئے دن مشاعروں میں ملتے رہتے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد انہیں بھی وہ مشکلات پیش آئیں جو عموماً وہاں سے آنے والوں کا حصہ ہے- چنانچہ ایک تو وہ لاہور میں نہ رہ سکے دوسرے سوسائٹی سے جدا ہو گئے- دیہات کی زندگی اور اہل وعیال کے خورد ونوش کی فکر نے انہیں خاموش کر دیا- وہ اب بھی نظمیں اور غزلیں لکھتے ہیں لیکن ان کا ادب رقص طاؤس ہو کر رہ گیا ہے-

اسلم یوسفی

نئے لکھنے والوں میں ہیں اس سے ہمارا مقصد وہ جدید رنگ کی شاعری نہیں جو مقصد سے دور ابہام کے جنگلوں میں رقص کرتی ہے بلکہ کہنا مقصود یہ ہے کہ صاف شعر کہتے ہیں اور نئے انداز کو اس طرح اپناتے ہیں کہ شعر کا مقصد برقرار رہے- اسلم یوسفی کے مستقبل سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں کیونکہ ان میں جذبہ اور جرأت دونوں موجود ہیں-

امجد لکھنوی

جناب امجد لکھنوی ریلوے میں ملازم تھے اور ان سے اکثر ملاقاتیں ریل کے سفر ہی میں ہوئیں- چند مشاعروں میں ان کا کلام سنا اور وہ اچھا نکھرا ہوا کلام تھا- ریلوے کے ملازموں اور دوستوں میں وہ "جج" کے نام سے مشہور تھے اور تقسیم سے پہلے کے اکثر مشاعروں میں بلوائے جاتے تھے دوست قسم کے انسان تھے اور خوش مذاقی ان کی گھٹی میں پڑی تھی-

ان کی غزلوں میں قدیم رنگ ضرور تھا مگر وہ اس حد کو عبور کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے سنا ہے کہ خانیوال میں انتقال ہوا-

جناب اختر امرتسری

جناب اختر امرتسری خوب شعر کہتے ہیں میں نے انہیں کئی مشاعروں میں سنا ہے مگر زیادہ معلومات سے محروم ہوں ان کا کوئی مجموعہ اب تک نظر سے نہیں گزرا اور تقسیم کے بعد بھی کہیں ملاقات نہیں ہوسکی۔

اقبال صفی پوری

جناب اقبال صفی پوری کراچی میں مقیم ہیں اور مشاعرے ان کی نغمہ سرائی کے بغیر سونے سونے معلوم ہوتے ہیں موسیقی کے علاوہ جو پڑھتے ہیں وہ بھی معمولی کلام معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں شاعرانہ انداز بیان ہوتا ہے جیسے ان کی غنائیت میں لیے ہوئے ہے اور کوئی دوسرا چاہے بھی تو اس وادی میں قدم نہیں رکھ سکتا اور جناب اقبال صفی پوری کی انفرادیت اپنی جگہ ہے۔

محمد محسن آثر

محسن اثر صاحب ۴۷ء میں جب انتقال آبادی کا ہنگامہ برپا ہوا تو یو۔پی سے پشاور پہنچ گئے تھے اس کے بعد کچھ روز کو لاہور آ گئے اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔ فن شعر کے حسن و قبح پر ان کی اچھی خاصی نظر ہے اور جگر صاحب سے بھی ان کی صحبتیں رہی ہیں جس سے طبیعت اور بھی شعر کی طرف مائل ہوگئی اور کلام ان پستیوں سے پاک ہوگیا جو عموماً اساتذہ سے دور رہ کر بلندیوں کے ادعا میں بدل جاتی ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی نظر سے نہیں گزرا۔

اختر ہوشیار پوری

عبدالسلام نام اختر تخلص، لاہور میں تعلیم پائی اور راولپنڈی میں وکالت کر رہے ہیں۔ یہ شاعروں میں بڑی ستھری غزلیں پڑھتے ہیں اور وکیل ہونے کے باوجود ادبی سوسائٹیوں میں نظر آتے ہیں۔ اب تو ان کی غزلوں کا اچھا ضخیم مجموعہ ہوگیا ہوگا مگر غالباً چھپا نہیں یہ رسالوں اور اخباروں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ جب مشاعروں کا تذکرہ مرتب ہوگا اس میں جناب اختر ہوشیار پوری بھی ہوں گے۔

انور جیلانی

خورشید انور جیلانی' فیروز پور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی بڑے ذہین اور طباع تھے نظم اور غزل دونوں کا ذوق تھا اور اچھا خاصا ملکہ بھی - یہ شخص تحصیل علم میں دیوانگی کی حد تک شغف رکھتا تھا ''سب جی'' تک بڑی تیز رفتاری سے چلا شاید اس لیے کہ اسے منزل پر جلد پہنچنا تھا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا نہ معلوم ان کا شعری سرمایہ کہاں ہوگا -

انور گوبندی

جناب انور گوبندی عالم آشنا اور ملنسار انسان ہیں ان کا ذوق شعری نیا نہیں - بہت سی تنقیدی برساتوں اور تبصروں کے سیلاب سے گزرے ہیں - مگر ان میں شعری تخلیق کے جراثیم بڑے توانا اور سخت جان ہیں - جناب انور برابر اپنے راستے پر گامزن ہیں اور غزلوں پہ غزلیں کہے جاتے ہیں - ان کا کوئی مجموعہ ابھی تک نظر سے نہیں گزرا -

ارمان عثمانی

جناب ارمان عثمانی دیوبند کے رہنے والے ہیں لیکن ایک عرصہ سے لاہور میں مقیم تھے اب دو تین سال سے بہاولپور چلے گئے - غزل نہایت صاف ستھری کہتے ہیں اور زود گو بھی ہیں ان کے شعر میں پرانا پن نہیں مگر جدید رنگ میں بھی یہ اس بلندی پر نہیں ہیں جہاں سے پستی نزدیک ہو جاتی ہے -

ان کا اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے اور ان کے اشعار سے ان کی قدرت شعر بھی نمایاں ہوتی ہے - خوش خلق اور یار باش انسان ہیں اور علم مجلسی میں بہت آگے ہیں -

اسد جعفری

جناب اسد جعفری کو بھی میں نے بھکر ہی میں سنا یہ بھی ادبی مراکز سے دور ہونے کے باعث اندھیرے میں ہیں رسالے اور اخبار اپنے اپنوں کو چھاپتے ہیں حالانکہ اسد صاحب بڑا پیارا شعر کہتے ہیں اور ان میں بھی ترقی کی گنجائش ہے - خیالات و تصورات کو الفاظ دینا بڑی دیر میں آتا ہے مگر اسد صاحب میں اس فن کی بڑی منہ زور صلاحیتیں ہیں اگر انہیں مطالعہ اور مشاہدہ کے مواقع بہم پہنچ گئے تو

ادب کو بہت کچھ دیں گے۔

آفتاب اکبر آبادی

جنابِ آفتاب اکبر آبادی کو میں نے کئی مشاعروں میں دیکھا اور سنا ہے بڑے تیور سے شعر پڑھتے تھے اور آواز میں ایک قسم کا ایسا کڑکا تھا جو ان کے شعر کو اور بھی روشن کر دیتا تھا۔ پرانی روش کے پرگو شاعر تھے۔ کراچی میں جا کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

غلام رسول ازہر

جناب ازہر عدالت کی جانکاہ مصروفیات کے باوصف شعر و ادب سے رشتہ قطع نہیں کرتے ان کی زبان اور قلم ادب کے دائرے میں رہتے ہیں وہ چونکہ عربی کے فاضل ہیں اس لیے ان میں قدیم اقدار کی حفاظت بدرجہ اتم موجود ہے نظم اور غزل دونوں پر انہیں عبور ہے اور ان کے اس وصف سے ان کے دوست دشمن سب آگاہ ہیں۔ ان کی کوئی کتاب ابھی میری نظر سے نہیں گزری جو کچھ ان سے سنا ہے وہ ابتذال سے پاک اور اخلاقی پستی سے معرا ہے۔

صغیر حسین اصغر

جناب اصغر کی زندگی پولیس میں گزری لیکن انہوں نے ادب کا دامن نہیں چھوڑا ان کی مشقِ سخن برابر جاری رہی اب وہ صاحب دیوان ہیں اور اس میں وہ اپنی تمام کہنہ مشقی اور سادہ کاری سمیت موجود ہیں۔ اب وہ ملازمت سے فارغ ہو چکے ہیں اور مستقل لاہور میں ہیں۔

حافظ انصر لدھیانوی

حافظ انصر صاحب لدھیانہ کے رہنے والے ہیں لیکن پشاور میں مقیم ہیں وہ نابینا ہیں مگر بینا لوگوں سے بعض اوقات اچھا شعر کہہ جاتے ہیں۔ سنا ہے زنانہ کالجوں میں معلمی کرتے ہیں۔ عربی فارسی سے بقدر ضرورت فیض یاب ہیں۔ مشاعروں میں اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ترنم سے غزل پڑھتے ہیں اور غزل معاصرین سے کم درجہ کی نہیں ہوتی۔ وہ خوش ذوق اور خوش دل انسان بھی ہیں۔

اخگر سرحدی

جناب اخگر سرحدی دیکھنے میں بڑے سیدھے سادے انسان مگر نہایت نفیس شاعر ہیں ان کے یہاں برجستگی اور روانی کے علاوہ انتخاب الفاظ کے ساتھ انداز بیان اچھوتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک کے ادباء شعراء منظم نہیں ہیں اس لیے یہاں کسی کو بھی اپنا مقام میسر نہیں آتا اور یہ معاشرہ میں اقتصادی چکی کی خوراک بنے رہتے ہیں۔

انوار ظہوری

جناب انوار ظہوری سے ان کا کلام بھی سنا اور بعض رسائل میں انہیں پڑھا بھی وہ نظم کو پڑھنے سے پہلے اس کی وجہ تسمیہ بتا کر نظم کی قیمت گرا دیتے ہیں اور صرف الفاظ کی قیمت باقی رہ جاتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ان کی کئی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ جو تشنہ طباعت ہیں ان کی تحریریں ہی عوام میں آ کر ان کا معیار قائم کر سکتی ہیں۔ ہماری تعریف و توصیف تو دوستوں کی مدح و ثنا میں شمار ہوگی۔

ابو طالب نقوی

یوں تو۔ نقوی صاحب آئی سی ایس تھے لیکن ان میں ذوق مطالعہ قابل رشک تھا۔ ان کے یہاں ایک لائبریری تھی جو ان کے ساتھ رہتی تھی اور اس میں قابل قدر علمی ادبی نوادر تھے جو اب ان کے صاحبزادے کمال نقوی کے پاس موجود ہیں۔ اے نقوی نے کئی شعراء اور ادباء کو اپنے قلم سے نوازا ہے وہ علم و ادب کے قدر شناس تھے اور کوئی صاحب علم ان سے مایوس ہو کر نہیں لوٹتا تھا۔ لاہور میں وہ میرے مکان کے سوا کسی کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جب وہ آ جاتے تھے تو پہروں ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی تھی۔ وہ سچ بولنے والے حق پسند اور حق گو انسان تھے اور آخری عمر میں آ کر وہ درویشی کی طرف راغب ہو گئے تھے اور اوراد و وظائف ان کا محبوب مشغلہ ہو گیا تھا۔

حبیب اللہ اوج

اوج صاحب دکن کے رہنے والے ہیں لیکن قلم کے ماہر اور تجربہ کے مشاق صحافی ہیں۔ ان کی تحریروں میں فصاحت اور بلاغت دونوں یکجان ملتی ہیں انہیں اپنے خامہ و فکر پر قابو ہے اور پاکستان

کے صحافیوں میں ان کا نام معیاری صحافیوں میں لیا جاتا ہے۔ بحیثیت انسان نہایت خلیق اور مرنجان و مرنج قسم کے انسان ہیں۔ ان کی شہرت میں جہاں ان کے انداز تحریر کو اہمیت حاصل ہے۔ وہیں ان کی شرافت اور اخلاق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ابھی نوجوان ہیں اور ابھی ان کے سامنے بڑے میدان ہیں۔

محمد ہارون الرشید ارشد الہ آبادی

مولانا ارشد الہ آبادی نہایت اچھے شاعر اور عربی کے فاضل انسان ہیں ان کی یوں تو کئی کتابیں ہیں لیکن ادب پر ابھی کوئی قابل ذکر کتاب نہیں اور نہ کوئی مجموعہ کلام چھپوایا ہے حالانکہ مشاعروں میں ان سے آئے دن نئی نئی غزلیں سننے میں آتی ہیں۔ جناب ارشد تقریر میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور کہیں جمعہ کے خطبے کی خدمات بھی ان کے سپرد ہیں۔

اسد پول

اسد پول خود کو جرمن نژاد کہتا تھا اس نے لاہور میں آ کر اپنے اسلام قبول کرنے کی خبر پھیلائی اور اعلان کیا کہ میں بخاری شریف کا ترجمہ انگریزی میں کروں گا حالانکہ جیسا جرمن کا باشندہ انگریزی سے واقف ہوتا ہے اس سے زیادہ پاکستان میں لاتعداد انگریزی جاننے والے موجود تھے اور ہیں لیکن اس وقت کی حکومت اور عوام نے اس سے ایسا سلوک کیا گویا ہمارے ملک میں سب جاہل آباد ہیں اور یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی چنانچہ سیکرٹریٹ میں اسے ایک دفتر سپرد کر دیا گیا اور کام شروع ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے فضائل صحابہ کا ترجمہ شروع کیا اور ہر مہینے اس کے حصص چھپتے رہے انہیں حصص کو لے کر وہ حیدر آباد دکن گیا اور میر عثمان علی خان مرحوم نے غالباً پچاس ہزار روپے کی رقم کے علاوہ تمام عربی پریس دے دیا جو لاہور منتقل ہو گیا تھا۔

فضائل صحابہ کے بعد جو بھی جلد سامنے آتی اس میں مسائل تھے مگر ان کا سلجھانا اس کے اور اس کے ساتھیوں کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ وہ اپنی بیوی کو اطلاع دیئے بغیر سامان مکمل کر کے پاکستان سے چلے گئے۔ سنا ہے ان کی بیوی نے وہ تمام پریس فروخت کیا اور پھر کسی سے شادی بھی کر لی اور جب وہ شادی راس نہ آئی تو وہ بھی چلی گئی اور ہمارے پاکستانی مسلمان بے چارے دیکھتے کے

دیکھتے رہ گئے ہاں ان کی وہ فضائل صحابہ والی جلد لائبریریوں اور علمی ادبی لوگوں کے یہاں موجود ہے۔کاش یہ کام اس وقت جناب عبداللہ یوسف علی کو دیا جاتا جو اس کے اہل تھے اور ثقہ مسلمان تھے۔

اصغر علی گھرال

اصغر علی صاحب گجرات کے رہنے والے ہیں اور وہیں وکالت کرتے ہیں عزیز بھٹی شہید پر انہوں نے کتاب لکھ کر سوانح عمریوں کے میدان میں ایک نیا باب کھولا ہے جس میں حقائق کی کثرت کے باوصف افسانہ کی جذباتیت موجود ہے۔ہمارے ملک میں سوانح نگار کہاں اتنی محنت اور تحقیق سے کام لیتے ہیں۔وہ تو مکھی پر مکھی مار کر رنگ و روغن کر دینے کے عادی ہیں۔اصغر علی صاحب نے یہ بڑا قابل قدر کام کیا ہے اہم کارنامے کرنے والے لوگوں کی زندگیاں ایسی ہی نہیں اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور زیب قلمی کی مستحق ہیں ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں تمام لائبریریوں میں موجود ہوں۔

اکمل جالندھری

جناب اکمل جالندھری پرانے لکھنے والوں میں ہیں اور خوب لکھتے ہیں ان کے دل میں ایک شاعرانہ وسعت ہے جو اشعار میں آ کر انسانیت کا پرچار کرتی ہے اور اس وقت شاعر عوام کے رسم و رواج اور مذہب و ملت سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔اصل میں انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے اور سب سے بڑا شاعر وہی ہے جو مذہبی ڈربوں سے نکل کر حقائق کی کھلی فضا سے سانس لے اس کی نظر سے پستی و بلندی کا امتیاز اوجھل ہو جائے۔اکمل کی شاعری میں اس وسیع المشربی کی جھلک ملتی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "بوئے گل" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور اس میں اکمل صاحب کامل طور پر موجود ہیں۔

اخگر مرادآبادی

جناب امداد حسین اخگر مرادآباد کے رہنے والے تھے شملہ کے مشاعروں میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھے اور ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ "رباعیات اخگر"

کے نام سے انہیں دنوں چھپا تھا- انہیں زبان پر عبور تھا اور ان کی رباعیات میں ان کی کہنہ مشقی کے علاوہ تجربہ اور مشاہدہ بھی ابھرتا ہے اور رنگینی بھی اپنے جلوے دکھاتی ہے-

سہیل اختر

سہیل اختر ڈیرہ اسماعیل خاں میں اردو پڑھاتے ہیں نہایت رکھ رکھاؤ کے انسان ہیں- کم گو ہیں مگر جب بولتے ہیں خوب بولتے ہیں اور نہایت اچھا سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں- مجلس کے انسان نہیں مگر صاحب فکر و قلم ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا- بہت ہی کم چھپتے ہیں اور اس میں بھی وہی ان کی باحیائی کار فرما ہے-

لالہ بالکشن تیرہ ابرؔ

ملتان کے مشہور لوگوں میں ہیں- میں کئی بار ان سے ملا ہوں- وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی- ملتان سے غالباً ہفت روزہ ''اقبال'' نکالتے تھے جس میں ملتان اور اس کے گرد و نواح کی ہر قسم کی خبریں چھپتیں تھیں اور ملتان کے شاعر بھی چھپتے تھے- نہایت شریف اور خلیق انسان تھے وہ میری شاعری کا اولین زمانہ تھا اور وہ میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے- سنا ہے آج کل کان پور میں وکالت کر رہے ہیں اور وہاں بھی وہ کسی ادبی انجمن کے بنیادی ارکان میں شامل ہیں- جو ان کے اور ان کے ماحول کے ادب کو شائع کرتی ہے-

راجہ اودھ نرائن

راجہ اودھ نرائن بھوپال میں وزیر تھے مجھے ان کے یہاں قیام کرنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت اچھے ادیب ہیں اور معلومات کا خزانہ سینے میں چھپائے پھرتے ہیں فارسی اور اردو میں نہایت اچھی استعداد اور کلام میں مثالی برجستگی رکھتے تھے- انہوں نے مجھے اپنی ایک غزل بھی سنائی اور فرمایا کہ میں بہت کم کہتا ہوں کیونکہ زندگی کی دوسری مصروفیات فرصت نہیں دیتیں-

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا تھانوی کو میں نے بچپن میں دیکھا جب وہ کاندھلہ تشریف لے جایا کرتے تھے اس وقت میری بے شعوری ان کی عظمت کو کہاں پا سکتی تھی جب ذرا شعور بیدار ہوا اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ مولانا کس پائے کے عالم ہیں۔ جن لوگوں نے حکیم الامت لکھا ہے وہ حق بجانب ہیں۔ ایسا عالم باعمل اور تقویٰ وطہارت کا پابند انسان اب کہاں پیدا ہوگا۔ میں کئی بار ان کے وعظ میں شریک ہوا اور ہر بار یہ آرزو لے کے اٹھا کہ اگر قسمت یاوری کرے اور وقت کچھ سہولت دے دے تو دو چار سال ان کی خدمت میں گزاروں لیکن یہ آرزو آرزو ہی رہی اور مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

صورت از بے صورتے آید برون

ابوالکلام آزاد

کلکتہ کے دوران میں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی اور محسوس کیا کہ تاثر سے زیادہ مجھ پر مرعوبیت ہے ان کے متعلق غالب کا یہ مصرع وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ صادق آتا ہے۔ جناب ابوالکلام آزاد اور محمد حسین آزاد کی تحریر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دونوں کے جوہر کھلیں مگر

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے غالبؔ

مولانا آزاد ہندوستان کی عظمت تھے اور ان کی تحریریں ہمیشہ انہیں زندہ رکھیں گی۔

حاجی اسحاق ستار سیٹھ

حاجی اسحاق ستار سیٹھ سے ان دنوں ملاقات ہوئی تھی جب وہ تقسیم سے پہلے شملہ اسمبلی میں جایا کرتے تھے۔ جب نواب صدیق علی خان نے ان سے ملاقات کرائی تو ان سے ایک طویل گفتگو رہی۔ سیاست عالم پر ان کی نظر بڑی گہری ہے میں چونکہ مزدوروں اور کسانوں کا شاعر تھا اور وہ ان کی سیاست کا ایک اہم گوشہ قرار پاتا ہے۔ اس لیے جب تک میں شملے میں رہتا ان سے اس

موضوع پر گفتگو رہا کرتی - اس کے بعد بھی نواب صدیق علی خان اور سیٹھ صاحب جب بھی لاہور تشریف لائے تو غریب خانہ پر بھی آئے اور مزدور و کسان کے موضوع پر گفتگو رہی وہ بڑے ذی ہوش اور بلند ادراک انسان ہیں اور اس پر ان کی انسان دوستی سونے پر سہاگہ ہے' وہ جہاں لیڈر رہیں وہیں ایک اچھے اور وفادار دوست بھی ہیں -

امیر الدین قدوائی

جناب امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ ہیں مگر جھوٹے مقدمات کو ہاتھ نہیں ڈالتے ظاہر ہے کہ وکالت میں ایسے آدمیوں کی گنجائش نہیں لہٰذا تمام دن اپنے گھر میں اپنی درویشی سے مذاق کرتے رہتے ہیں - وہ علم و فضل میں اپنا ثانی کم رکھتے ہیں - ایک وقت میں وہ قائد اعظم محمد علی جناح کے دست راست تھے اور پاکستان کے پرچم میں سفید پٹی کا اضافہ انہی کی تجویز سے ہوا تھا - وہ تقریر اور تحریر دونوں کے دھنی ہیں خود مجھے ان کے علم سے بہت کچھ ملا ہے اور مجھے ہنوز حسرت ہے کہ ان سے قریب رہ کر قوم و وطن کے مفاد میں کوئی کام کر سکوں' کیونکہ ان کے یہاں گفتگو اور مخاطبت میں تعلیم کم اور تفویض زیادہ ہے امیر الدین قدوائی حقیقت میں کام کے آدمی ہیں لیکن نااہلوں نے پچھلے پاؤں سے اس قدر گرد اڑائی ہوئی ہے کہ کارآمد اور مفید انسان نظر نہیں آتے اور ہر طرف جہل کا فتور شعبدوں میں مصروف ہے -

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

جناب احسان احمد شجاع آبادی بلا کے شعلہ بیان خطیب تھے اور سر سے پاؤں تک خلوص و محبت کے پیکر جب ملتے تو پٹ جاتے اور بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ قاضی احسان تحلیل ہو کر سینے میں اتر رہے ہیں - ایک دن شورش کاشمیری نے آ کر کہا کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کی یادگار بھی بیٹھ رہی ہے آؤ چلیں قاضی احسان احمد آئے ہوئے ہیں وہ بیمار ہیں اور سینے میں کینسر ہے میں اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا - نظریں ملنا تھیں کہ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ روتے روتے ہمیں تسکین دینے لگے ایک ہفتے کے اندر اندر یہ شعلہ گفتار لاہور کی خاک کا پیوند ہو گیا -

انا للہ و انا الیہ راجعون -

ڈاکٹر اکرم شامی (ہومیو)

اکرم شامی جالندھر کے رہنے والے ہیں انگریزی' اردو اور فارسی میں وہ مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ وہ ہومیو پیتھی کے فلسفے میں کتابوں سے آگے کی بات کرتے ہیں اور رات دن اس فلسفے کی شکست و ریخت اور توسیع و تعمیر ان کی گفتگو کا موضوع خاص رہتا ہے وہ ہومیو پیتھی کے تجربات نباتات اور حیوانات پر بھی کرتے ہیں۔ اور ان کی اس کوشش کے کئی ایک حیران کن نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ وہ ایک فکر لطیف اور فہم بلیغ کے نوجوان ہیں۔ میں نے ایسے باہمت' حوصلہ مند اور ان تھک کوشش کے انسان کم ہی دیکھے ہیں۔

انور سدید

ان کا ذوق ادب صحیح معنی میں ذوق ادب ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر وہ شعر بھی کہتے ہیں تو میں ان کی شاعری کا مرتبہ کم کر رہا ہوں حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کی شاعری نہیں دیکھی میں تو انہیں صرف تنقید کا انسان خیال کرتا ہوں مگر وہ شاعر بھی ہوں تو میں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ تنقید و تبصرہ ہی کی طرف رجحان رکھیں یہ سوجھ بوجھ ہمارے ملک میں بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ہمیں ایسے ادیبوں کی اشد ضرورت ہے۔

ڈاکٹر الطاف حسین ہومیو

ڈاکٹر الطاف حسین صاحب پیشہ ور ڈاکٹر نہیں بلکہ انہوں نے مخلوق خدا کی خدمت کے لیے یہ فن اختیار کیا ہے اور ان کی کئی ڈسپنسریاں خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ الطاف صاحب کی ترقی اور علمی بلندی کا راز ان کا خلوص ہے اگر وہ اس کو بھی تجارت بنا لیتے تو شاید اس قدر کامیاب اور ذی ہوش ڈاکٹر نہ بن سکتے۔ ان کی ڈاکٹری کو میں ایک طریق عبادت سمجھتا ہوں۔ ان سے ہزاروں غریب اور مفلوک الحال لوگ رات دن شفایاب ہوتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ الطاف صاحب ایک بلند اخلاق اور کم گو انسان بھی ہیں جو ڈاکٹر کے لیے نہایت ضروری ہے۔

مولانا احمد علی

لاہور کے صاحب مقام عالم اور آئینہ باطن بزرگان دین سے تھے یوں تو دیو بند کے فارغ التحصیل تھے لیکن ان کی نظر میں الفاظ سے آگے اور معانی سے بلند دنیا تھی۔ جس کی کیفیات و محسوسات کے لیے ہماری زبان میں الفاظ نہیں ملتے۔ ان کے رفقانے ان کے گرد معتقدین اور مریدین کا ہجوم کر دیا تھا اور اپنی اپنی نیت کے مطابق سب فیض یاب ہوتے تھے۔ مولانا قرآن و حدیث کے مبلغ اور اقدار شرافت کے مروج تھے۔ ان کا وصال کیا ہوا پورے لاہور میں ایک ملال کی رو دوڑ گئی۔ کیونکہ ایسا متقی اور پرہیز گار انسان مدتوں کے بعد میسر آتا ہے۔ ایسے عالم دین اور رہنمائے طریقت کے تذکرے تاریخ اور سوانحات میں تو ملتے ہیں۔ لیکن اس نعمت الٰہی سے آنکھیں ترس جاتی ہیں۔

میاں اصغر حسین (دیوبند)

میاں اصغر حسین صاحب دارالعلوم دیو بند میں استاد تھے ان کا علم و فضل اور تقویٰ مثالی تھا وہ عالم دین کے ساتھ ساتھ بہت بڑے عامل بھی تھے اور ان کے اس فن سے سیکڑوں مریض شفایاب ہوتے تھے۔ موصوف کی موت کا باعث بھی یہی عملیات بنے۔

مولانا اسد اللہ اسد

اسد صاحب مظاہر العلوم سہارنپور کے مہتمم ہیں اور نہایت شستہ شعر کہتے ہیں۔ جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے وہ ان کے اشعار کے دیدبان سے بھی معلوم ہوتا ہے اور روزمرہ کی زندگی سے بھی۔ وہ ایک عالم باعمل اور بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ نہ معلوم ان کا مجموعہ کلام چھپا ہے یا نہیں۔ تقسیم کے بعد سے ہندوستان کے شاعروں سے ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا امین احسن اصلاحی اس دور کے بڑے فاضل انسان ہیں اور ان کے پیش نظر نوجوانوں کی تربیت ہے وہ ایک مسجد میں درس دیتے ہیں اور اس دور میں اس خدمت سے بڑی کوئی خدمت

نہیں ان کے پیش نظر نہ کوئی منصب ہے نہ ان کا مقصد شہرت ہے نہ دولت وہ وہی کام کر رہے ہیں جس کی طرف مولانا مودودی کی توجہ اس انداز سے اب تک نہیں- ایک صاحب بصیرت عالم اگر اپنے جیسے تلامذہ پیدا نہیں کرتا اس کا علم بانجھ ہے اس کے بعد اس کے علم اور شہرت کی نسل قطع ہو جاتی ہے اور وہ کائنات میں ایک بلبلے کی طرح آنکھ کھول کر ختم ہو جاتا ہے-

انظر شاہ دیوبندی

انظر شاہ حضرت انور شاہ کشمیری کے صاحبزادے ہیں وہ علم و ادب کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں ان میں اسی میدان کے آثار پارہا ہوں جو ان کی وراثت ہونا چاہئے- انظر شاہ بڑے ذہین اور طباع نوجوان ہیں ان کا حال ان کے مستقبل کے فانوس سجاتا ہوا معلوم ہوتا ہے خدا انہیں سرخ آندھیوں سے بچائے- آمین

مولانا ازہر شاہ دیوبندی

ازہر شاہ مولانا انور شاہ کاشمیری کے صاحبزادے ہیں- نیکی اور پاکیزہ خیالی انہیں ورثہ میں ملی ہے- انہیں معانی و بیان روزمرہ اور محاورات پر عبور ہے اور انتخاب الفاظ کا خاص ملکہ ہے ان کا جس قدر علم ہے اسی قدر مشاہدہ بھی ہے اور پھر اپنے مافی الضمیر کو مناسب الفاظ میں ڈھالنا انہی کا کام ہے- وہ خوش خو بھی ہیں اور خوش قلم بھی وہ اپنے سینہ میں حساس دل رکھتے ہیں اور احساس کو بامعنی وزن دے کر الفاظ کا ایک تیرنگ مدون کر دیتے ہیں اور یہ اوصاف خلاف توقع نہیں دیوبند تو صاحب علم اور انسانوں کا مرکز ہے-

بے خود دہلوی

نام سید وحید الدین تخلص بے خود' اردو' فارسی کا شعور مولینا حالی پانی پتی سے پایا تھا اور فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد تھے حصول فن کے لیے کچھ عرصہ استاد کے ساتھ حیدر آباد دکن میں بھی رہے اگر چہ بیخود کا خاندان معزز اور شریف تھا لیکن یہ اپنی معاش کے لیے انگریزوں کو اردو فارسی کی تعلیم دیتے تھے- گتکا پھری کے ماہر اور کبوتروں کے شوقین ہی نہیں ماہر فن استاد تسلیم کیے جاتے تھے- وہ شاعری میں اپنے استاد داغ کا تتبع کرتے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے اور ایسے

کامیاب کہ ان کے استاد کو ان کی زبان دانی اور مہارت شعری پر ناز تھا- دلی کا روزمرہ ان کے کلام کی خصوصیات میں سے ہے اور قلعہ معلّیٰ کی زبان ان کی شاعری کا جزو اعظم ہے- بے خود کی وجہ سے دہلی کے مسلمانوں ہی میں نہیں ہندوؤں میں بھی ادب اردو کا ذوق ایسا بیدار ہوا کہ آج کے اردو دان ہندو موجودہ دور کی ہندی کو پسند نہیں کرتے اور جہاں تک روزمرہ، اصطلاح اور محاورے کا تعلق ہے وہ بے خود کے حلقے میں آج تک اسی ٹھاٹھ سے بولا جاتا ہے-

بے خود کے یہاں سلاست اور فصاحت عام فہم الفاظ میں چشموں کی طرح بہتی نظر آتی ہے اور اس سلسلے میں ان کا ایک ناول ''ننگ و ناموس'' دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے- منظوم کلام کے دو مجموعے ''گفتارِ بے خود'' اور ''گوہر شہوار'' طبع ہو چکے ہیں میں نے بچشم خود ان کے صاحبزادے محمد احمد صاحب کے پاس ان کے نام اساتذہ کے خطوط اور کئی ایک نادر مخطوطے دیکھے ہیں- جو حاصل ہو جائیں تو بڑے کام کی تحریریں ثابت ہوں گی-

بے خود موہانی

محمد احمد بے خود موہانی لکھنؤ کے شیعہ کالج میں پروفیسر تھے- عربی، فارسی کے منتہی اور اصنافِ سخن میں ہر صنف پر استادانہ نظر- سرتاپا اخلاص مگر پورے لکھنؤ سے علمی جنگ رکھتے تھے اور کسی طرح لچکتے نظر نہیں آتے تھے- اسی سلسلے میں ان کی ''منظر آئینہ''، ''جوہر آئینہ'' گنجینہ تحقیق وغیرہ کئی کتابیں قابل مطالعہ ہیں- ایک معمولی ضخامت کا دیوان بھی لکھنؤ سے چھپا ہے جس میں ان کا تمام تر کلام نہیں ہے اور نثر کی بہت سی قابل قدر تحریریں ابھی پردہ اخفا میں ہیں ایسے فاضل انسان کا سرمایہ قلم اگر عوام تک نہ پہنچے تو یہ علمی ادبی نقصان ہی نہیں انسانی اقدار کی بڑی توہین ہے-

ڈاکٹر محمد باقر

ڈاکٹر باقر صاحب اورینٹل کالج کے پرنسپل ہیں یوں تو فارسی کے آدمی ہیں لیکن وہ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی غافل نہیں اور پنجابی اکیڈمی ان کے دم سے زندہ ہے- باقر صاحب تحقیق و تدقیق کے آدمی ہیں اور ان کا اب تک کا کام تمام تر تحقیقی کام ہے- ان کی ایک کتاب ''تذکرہ شعرائے پنجاب'' میری نظر سے گزری جس میں وہ نسیم کے نام سے جلوہ افروز ہیں ان کی کتاب سے ان کے ابتدائی ذوق ادب کا پتہ چلتا ہے- وہی ذوق ترقی اب انہیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ تاریخ ان کے بغیر مکمل نہیں کہلائی جا سکتی-

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

ڈاکٹر غلام جیلانی برق بڑے پرانے لکھنے والوں میں ہیں اور فن تحریر میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے ہر چند کہ ان کی زندگی تعلیم و تعلم میں گزری ہے لیکن وہ تصنیف و تالیف یعنی اپنی فطری خصوصیات سے غافل نہیں ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ ہر لائبریری اور ہر صاحب علم کے یہاں ان کی کتابیں ملتی ہیں وہ بحیثیت انسان بھی سرتاپا خلوص ہیں میں نے ان میں وہ غرور نہیں پایا جو آج کل کے پایاں علم رکھنے والے تنگ ظرف لوگوں میں پایا جاتا ہے۔لیکن ہم ان سے علم وادب پر کسی خاص تصنیف کی امید رکھتے ہیں جو ان کی شان کے شایاں ہو۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی علیگ علم وفضل میں لاجواب انسان ہیں مگر وہ زندگی کے ہر شعبہ کو فلسفہ کی رو سے سمجھنا اور برتنا چاہتے ہیں' جس سے ہمیشہ معاشی بدحالی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کی خودداری کو بڑے سے بڑا آدمی شکست نہیں کر سکتا وہ جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو نفع پر نقصان کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسائل اسلامی اور معاشی پر ان کی گہری نظر ہے اور ہمارے ملک میں بہت کم آدمی ان کی طرح اسلامی مسائل کا حل سمجھتے اور پیش کرتے ہیں اصل میں قدرت نے انہیں کسی بڑے کام کے لیے پیدا کیا ہے مگر شاید اس کا ابھی وقت نہیں آیا کہ وہ اپنے علم وفن کو بروئے کار لاسکیں۔ آج کل سنا ہے کہ کراچی میں کسی تحقیقی ادارے میں کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس فضا میں ان پر کسی صاحب نظر اور اسلام پرست شخصیت کی نظر پڑ جائے اور وہ کوئی خاص کام انجام دے سکیں۔

بشیر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج اعظم گڑھ

جناب بشیر احمد صاحب اعظم گڑھ میں شبلی کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ اپنی تمام علمی قابلیتوں اور اپنی انتظامی صلاحیتوں سمیت بڑے پرخلوص مسلمان ہیں شبلی کالج کو باقاعدہ رکھنا اور سلیقے سے چلانا انہی کا کام تھا وہ رات دن اسی کی توسیع و تعمیر کے متعلق سوچتے اور عمل کرتے تھے انہیں دن رات کالج کا مفاد سوچنے سے فرصت نہیں تھی اور پھر کالج کا طالب علم ان سے مرعوب نہیں متاثر تھا۔ جس سے

جہاں طالب علم ان کا اثر لیتے تھے وہیں ادب بھی ملحوظ تھا۔

برق کوہاٹی

جنابِ برق کوہاٹی مولانا تاجور مرحوم کے شاگرد ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ میں بھی مولانا کے سلسلے کا شاعر ہوں اس لیے جب بھی ملتے ہیں بھائیوں جیسا برتاؤ روا رکھتے ہیں۔ وہ قدیم رنگ میں بڑی اچھی غزل کہتے ہیں اور نہایت زندہ دل اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں ان کی غزلوں میں کہیں فنی خامی اور ابتذال نہیں ملتا اور ایک خاص رنگ ہے جو کہیں سنجیدگی لیے ہوئے ہے اور کہیں تصوف کے مسائل کا بیان ہے ان کے کلام کا مجموعہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔

عبدالقیوم باقی

جناب باقی دکن کے رہنے والے ہیں اور تحقیقی دماغ پایا ہے دکن کے جرائد میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ تنقید و تبصرہ میں یہ ایک ناقابل فراموش ادیب ہیں۔ ان کے یہاں تحقیق اپنے دامن میں تاریخ کا خلاصہ لے کر چلتی ہے جس سے ادب کی رفتار کا ہر قدم خود بخود روشن ہوتا چلا جاتا ہے جس سے ادب معتبر ہوتا ہے۔

باسط بھوپالی

جناب باسط بھوپالی سے اکثر ملاقاتیں رہی ہیں وہ نوجوانی ہی میں استادانہ صلاحیتوں کے حامل تھے اور اب تو نہ جانے ان کی شاعری کس مقام پر ہوگی رسالوں میں کبھی کبھی ان کا کلام نظر پڑ جاتا ہے تو یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انہیں بھوپال کے شعراء میں بلند مقام حاصل ہے اور ان کی طرز ادا اور بھی مسحور کر دیتی ہے نہ جانے، ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں؟

بسمل سعیدی ٹونکی

جنابِ بسمل ٹونک کے رہنے والے ہیں اور آج کل دہلی میں مقیم ہیں اچھا اور منجھا ہوا مذاق ہے الفاظ کے محل استعمال اور زبان و بیاں کے عیوب و محاسن کو خوب جانتے ہیں۔ پستی اور ابتذال سے بچ کر شعر کہتے ہیں ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے۔ جس میں وہ اپنے تمام فنی کمالات سمیت دیکھے

اور پر کھے جا سکتے ہیں-خوب آدمی ہیں-

بسمل شاہ جہاں پوری

جناب بسمل شاہ جہاں پوری دلی کی پولیس میں ملازم ہیں بڑے نیک' خلیق اور خدا پرست انسان ہیں-مشاعروں میں غزل ترنم سے پڑھتے ہیں اور ان کی آواز اس قدر بلند ہے کہ دوسرے شعراء کی بلند بانگی دب کے رہ جاتی ہے- وہ شاعر سے اچھے مسلمان ہیں اور پولیس میں ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی شرافت اور نجابت کو داغدار نہیں ہونے دیا-وہ ساونتوں اور بہادروں کی طرح زندگی سے گزر رہے ہیں ان کی شہرت ان کی شاعری سے چار قدم آگے ملتی ہے مجموعہ کلام اب تک نظر سے نہیں گزرا-تقسیم کے بعد ملاقاتوں کے مواقع بھی تو نہیں رہے-

کرپال سنگھ بیدار

مولانا تاجور نجیب آبادی کے چہیتے شاگرد ہیں-نظم اور غزل دونوں میں برابر کا زور ہوتا ہے ان کا تخیل بلند اور انتخاب الفاظ قابل رشک ہوتا ہے اردو فارسی اور پنجابی پر عبور ہے اور کثرت مطالعہ نے انہیں اور بھی جلا بخش دی ہے-نہایت ذہین اور طباع قسم کے انسان ہیں اور شاید مولانا تاجور کی تربیت سے ایسے خوددار ہو گئے ہیں کہ ناروا لچک کو ذرا بھی قبول نہیں کرتے اور یہی زیور انسانیت ہے-

بشیر آذری

جناب بشیر آذری کو میں ان کی طالب علمی کے دور سے جانتا ہوں اور اب تو وہ تعلیمی بورڈ کے ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں لیکن ان کی ذکاوت اور فطانت اول ہی سے قابل دید رہی ہے-وہ نثر اور نظم دونوں پر حاوی ہیں اور ان کی تقریر و تحریر کا ایسا معیار نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے- کیونکہ وہ تو تصنیف و تالیف کے بھی آدمی ہیں اور تقریر کے بھی ان کی نظر دنیاوی علوم پر بھی ہے اور دینی پر بھی وہ ایک سچے مسلمان ہیں اور ایسے لوگوں کا وجود ایک رحمت بھی ہے اور نعمت بھی-

بسمل الہ آبادی

جناب بسمل الہ آبادی حضرت نوح ناروی کے شاگرد اور شاعروں میں مقبول شاعر تھے۔ مشاعروں میں وہ اپنے استاد حضرت نوح کی طرح پہلے استاد کی تعریف میں ایک دو قطعہ پڑھتے اور پھر جہاں مشاعرہ ہوتا اس شہر کی تعریف کرتے۔ اس کے بعد اپنی غزل شروع کرتے ان کی شاعری تربیت یافتہ شاعری تھی اس لیے زبان و بیان کی غلطی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تقسیم کے بعد نہ جانے وہ کہاں اور کس منصب پر ہوں گے عرصہ ہو گیا ملاقات نہ ہو سکی۔

باقر رضوی

جناب سجاد باقر رضوی اورینٹل کالج میں لیکچرار ہیں اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں ایم اے ہیں اگر چہ انہیں لکھنؤ کے اساتذہ کے علاوہ شرفا کی مجلسیں نصیب ہوئی ہیں مگر شاعری میں یہ ماضی کی روایتی شاعری سے علیحدہ ہیں اگر چہ اوزان کے لحاظ سے سانچے عموماً وہی ہوتے ہیں لیکن ان کا اسلوب بیان جدید ہے اور میرا خیال ہے کہ اسلوب ہی کا نام شاعری ہے۔ سجاد باقر صاحب کے یہاں ابہام بھی ہے جو اس دور کی تخصیص ہے لیکن ان کے یہاں الجھا ہوا ابہام نہیں ہوتا بلکہ اس کا مجموعی تاثر ایک اشارہ ہوتا ہے ہر شاعر کے مافی الضمیر کی طرح اور اس قسم کا ابہام بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ باقر صاحب اپنے جذبات تک ہی نہیں رہتے ان کے یہاں بڑی بلندی کے عکس جھلملاتے ہیں جس سے ان کا مطالعہ ان کی شاعری کا تغذیہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ابھی کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا۔ نہ جانے کتنے دل وہ نگاہ منتظر ہیں۔

مرتضیٰ برلاس

مرزا مرتضیٰ برلاس، مرتضیٰ تخلص کرتے ہیں۔ اصل وطن مراد آباد ہے۔ رام پور لیکن تقسیم ملک میں پاکستان کی محبت نے انہیں انڈیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور پاکستان چلے آئے علی گڑھ کے ایم ایس سی ہیں اگر یہ وہاں بھی رہتے تو سائنس کے لیے کہاں جگہ نہیں۔ انہیں اچھا خاصا عہدہ ملتا لیکن اسلام کے شیدائی اور مسلمانوں کی خیر خواہی نے ان کے پاؤں اکھاڑ دیے اور انہوں نے اپنی خدمات پاکستان

کے لیے ضروری سمجھیں اب وہ پاکستان کی انتظامیہ کے ایک رکن ہیں نہایت محنتی اور دیانتدار رکن۔

شاعری تو چونکہ ایک فطری جذبہ ہے اس لیے مصروفیت کے باوصف شعر کہتے ہیں اور شعر بھی نہایت اچھا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا۔ میں نے اس لیے کہا ہے کہ اسلامی معتقدات کے باوصف شاعری میں انہوں نے اپنا جدید رنگ اختیار کیا ہے شاید اس لیے کہ جو وہ کہنا چاہتے ہیں قدیم رنگ میں اس کی گنجائش نہیں پاتے۔ میں نے ان کی جتنی نظمیں غزلیں سنی ہیں۔ وہ ہیئت اور تاثر کے اعتبار سے جدید ہیں اور جدید بھی ایسی جو فی الواقع ہونی چاہئیں ان کے ابہام اور فلسفہ میں ڈور کا سرا الجھا ہوا نہیں ہے وہ جو کہتے ہیں اس کو دلوں تک پہنچا دیتے ہیں اور شعر کی سب سے اہم شرط یہی ہے۔ ان کے اشعار میں نیت کے خلوص اور دل کی ہوک کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ابھی نوجوان ہیں اور ان کے شاعرانہ کمال کے لیے ابھی زندگی کا وسیع میدان ہے۔

مہاراج بہادر برق

دہلی کے مشہور شاعروں میں تھے اور دہلی جیسی جگہ انہیں استاد کا درجہ حاصل تھا ان کے بہت سے شاگرد آج بھی شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور استاد کو دعائیں دیتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''دیوان برق'' کے نام سے چھپ چکا ہے جس میں وہ اپنے تمام محاسن سمیت ملتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بارکر

جناب عبدالرحمٰن بارکر میکگل یونیورسٹی کینیڈا میں لسانیات کے صدر ہیں وہ ایک عرصہ تک لاہور میں رہ کر ابتدائی اردو پر کام کرتے رہے ہیں ان کا منشاء ہے کہ اردو زبان کو پڑھانے کے لیے اس قدر آسان طریقے ایجاد کیے جائیں کہ ہر ملک کا آدمی تین ماہ میں اردو زبان سیکھ سکے اسی سلسلے میں ان کی دو کتابیں ہیں جن سے ان کی کاوش نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سے گفتگو کے مختلف اوقات میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ شخص ابتدائی اردو تک ہی نہیں ہوگا یہ کوئی اردو کا تذکرہ بھی ضرور لکھے گا۔ مگر نہ معلوم میرا یہ خواب کب تعبیر بنتا ہے بارکر بہت محنتی ریسرچ اسکالر ہیں اور ہمیں مستقبل میں جس قدر امیدیں ہوں کم ہیں۔

خان بشیر احمد خان

خان بشیر احمد خان ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں تحریک پاکستان کے سلسلے میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار عہدہ پر تھے اور پاکستان کے مخالف لوگ سر اٹھائے ہوئے تھے لیکن خان بشیر احمد خان نے پاکستان بننے میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح قربانی کی اگر اس سلسلے میں ان کے حالات قلمبند کئے جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے جس میں ان کی حیرت انگیز سعی اور قربانی کے کارنامے دوسروں کے لیے سبق ہو سکتے ہیں۔

بشیر (مالیر کوٹلہ)

بشیر صاحب ایک زمانہ سے مالیر کوٹلہ میں ریاست کے سربراہ تھے آج کل ماڈل ٹاؤن میں فراغت کی زندگی میں ہیں۔ میں نے جب بھی ان کا کلام سنا ہر صورت سے بلند اور قابل تحسین پایا۔ ان کے یہاں فنی رکھ رکھاؤ اور خیال و تصور کی بلندی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے یہاں متانت اور سنجیدگی ان کے شعر کا معیار قائم کرتی ہے بہت کم لوگوں کے یہاں ایسا مہذب انداز شعر ملتا ہے وہ بلاشبہ اپنے رنگ کے اصغر گونڈوی ہیں۔ ان کی غزل میں ایک شریفانہ روح حلول کئے ہوئے ہے وہ کہیں بھی اپنی سنجیدگی سے باہر نہیں آتے ان کی شاعری یقیناً قدیم رنگ کی حسین ترجمانی کرتی ہے۔

آقا بیدار بخت

جناب آقا بےدار بخت دارالعلوم السنہ شرقیہ کے پرنسپل اور بانی ہیں علم و فضل کے اعتبار سے ان جیسا تجربہ کار استاد مشکل ہی سے ملے گا چونکہ اول سے ادب و شعر کے استاد ہیں اس لیے فن کے ہر گوشے پر ان کی نظر ہے اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے ہیں جو ر سننے کے قابل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بحیثیت دوست بھی وہ برے انسان نہیں وہ دوستی کرنا بھی جانتے ہیں اور نبھانا بھی۔ ان کے قلم سے یوں تو کئی کتابیں نکلیں لیکن اب تک کوئی بڑا کام نہیں کیا اور یہ غالباً ان کی کثرت کار کا باعث ہے۔

بشیر احمد خان بشیر

بشیر احمد صاحب نہایت اچھا شعر کہتے تھے وہ تقسیم ملک کے سیلاب میں حیدر آباد سندھ میں آ گئے تھے اور وہیں کے اخبارات میں ان کے انتقال کی پہلی خبر چھپی یہ شاعر بھی زمانے کی قدر ناشناسی کا شکار تھا مگر آخری وقت تک انہوں نے اپنی خودداری ہاتھ سے نہ جانے دی وہ اپنی شاعرانہ عظمت اور معیار سے آگاہ تھے اور ایسے ویسے شاعر کو نظر میں نہ لاتے تھے- یہی سبب تھا کہ ان کی شہرت نہ ہو سکی اور محدود طبقے میں تعریفیں ہو کر رہ گئیں- ان کا شعری سرمایہ ان کے صاحبزادے کے پاس ہو گا کیونکہ وہ بھی شعر کہتے ہیں اور اچھا خاصا ملکہ ہے-

باسط بسوانی

جناب باسط بسوانی پرانے لوگوں میں تھے جب میں لکھنؤ گیا ہوں تو اس وقت ان کے بال سفید ہو چکے تھے- نہایت پرخلوص اور منکسر المزاج انسان تھے- قدیم رنگ میں غزلیں بھی لکھتے تھے اور نظمیں بھی شاعری میں بڑے سلیس اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے تھے- اس دور میں بچوں کے لیے ان سے اچھا لٹریچر پیدا کرنے والا کوئی شاعر نہ تھا- ان کی کتاب ''شاہد معنی'' جوان کے کلام کا مجموعہ ہے سلاست اور روزمرہ میں آج بھی لاجواب کتاب ہے- اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے-

سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی

حضرت نوح کے شاگردوں میں جناب بسمل ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں میں نے کئی مشاعروں میں انہیں سنا ہے- ان میں بالکل نوح صاحب کا رنگ نمایاں ہے- وہ نوح صاحب سے پرستش کی حد تک محبت اور احترام کرتے ہیں ان کا مصور دیوان چھپ چکا ہے- جس میں وہ اپنی تمام خوبیوں سمیت موجود ہیں- رنگ وہی قدیم ہے لیکن زبان اور محاورات بالکل اسی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں جوان کی تعلیم و تربیت میں تفویض ہوئے ہیں-

باقی صدیقی

محمد افضل باقی صدیقی، قصبہ اسہام (راولپنڈی) کے رہنے والے ہیں بچپن میں یتیم ہو گئے اس ملک میں یتیموں کی جو حالت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے چنانچہ نہ جانے کن کن مصیبتوں اور مشکلوں سے اردو اور انگریزی تعلیم ضرورت کے مطابق حاصل کی اور مختلف شہروں میں تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔فلم کمپنی میں بھی کام کیا۔فوج کے دفتر میں رہے رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے اور پھر پشاور میں ریڈیو پاکستان سے متعلق ہو گئے۔ حالانکہ وہاں شاعر اور ادیب کو جم جانا چاہئے تھا بڑے بڑے یہاں رقص و رنگ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن باقی کی سادہ خاطری اور شرافت کی گنجائش زیادہ روز نہ نکل سکی۔ اور انہیں وہاں سے بھی مایوس ہونا پڑا۔آج کل اپنے گاؤں ہی میں ہیں اور اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں ایک مجموعہ ''جام جم'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔اس کے بعد کی غزلیں دوسرے مجموعے میں شامل ہیں۔

سنبھل کر لکھنے والے اور سوچ کر کہنے والے لوگوں میں باقی صدیقی پیش پیش ہیں۔ملک کے ہر مقتدر رسالے میں ان کا کلام چھپتا ہے ان کا شمار ہم نئے دور کے بہکے ہوئے لوگوں میں نہیں کرتے۔یہ نہایت میٹھے انداز میں اپنے احساس و جذبات کا اظہار کرتے ہیں ان کا اسلوب نگارش نہایت موزوں اور مناسب ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ اہل ادب کے طبقے میں سراہے جاتے ہیں۔

باقی صدیقی نے اردو غزل کے مزاج میں ایسی ملائمت پیدا کر دی ہے کہ ان جیسی طرز ادا کا شاعر اس ماحول میں ذرا مشکل سے پیدا ہوگا۔انہوں نے قدیم شعرا کے انداز کو اپنے وقت کے اعتبار سے سجایا اور سنوارا ہے باقی کے یہاں نئے دور کا الجھا ہوا ابہام اور بے معنی ایمائیت، اشاریت اور سمبل ازم نہیں ہے وہ اشعار میں اپنے یہاں بیان غم کا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ وہ کائنات کا غم معلوم ہوتا ہے ان کے یہاں فن کی پابندی بھی ہے اور جذبات کی تصویر کشی کے ساتھ احساس کی نقش کاری بھی لیکن وہ کہیں اعتدال سے گرتے نہیں ان کی شاعری ادب و شعر میں سلامت روی کا ایک زندہ فن ہے۔

بہار کوٹی

جناب بہار کوٹی بہت پختہ مشق شاعر ہیں اور بڑے معیاری ادیب ان کا مشغلہ تعلیم و تعلم ہے اور اصناف نظم و نثر پر ان کو بڑا عبور ہے ان کے اشعار میں حیات انسانی کے مختلف پہلو مسکراتے نظر آتے ہیں اور تصوف کے مسائل بھی خوبصورتی کے حسن جلوہ ریز ہیں وہ تنقید و تبصرہ پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر بڑی دوررس ہے چونکہ ادب کے عیوب و محاسن ان پر منکشف ہیں اس لیے وہ تحقیق سے بھی بڑے اچھے انداز سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

بہزاد لکھنوی

جناب بہزاد سے میری پہلی ملاقات شملے میں ہوئی تھی اس وقت یہ خود بھی شباب پر تھے اور ان کی شاعری بھی انہی کے ساتھ قدم بقدم چل رہی تھی۔ مگر ان کی غزلیں سواری کی ایسی عادی ہوئیں کہ نغمہ کے بغیر آج تک پیدل نہیں چلتیں لیکن نغمے کا گزر ان منزلوں تک ناممکن ہے جہاں پہنچ کر شعر کو اس کا صحیح مقام ملتا ہے۔ جناب بہزاد کراچی ریڈیو میں علی الصبح نعت سرور کائنات پڑھتے ہیں اور ان کی آج کی آواز میں جوانی کی اٹھان کے بجائے ان کے دل کا سوز و گداز پایا جاتا ہے ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں وہ اپنے ماضی و حال کے نقوش سمیت ملتے ہیں۔

بشیر احمد بشیر

بشیر صاحب ساہیوال کے رہنے والے نہایت صالح اور نیک قسم کے انسان ہیں۔ بڑی صاف اور ستھری غزل کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا ذوق ادب ساہیوال میں اور کئی شاعروں کو جنم دے رہا ہے۔ ان کی غزل اس قدر مقبول ہے کہ بڑے بڑے جغادری آئینہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ حاجی بشیر صاحب زمیندار ہیں اور انہیں عوام سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں عوامی رنگ زیادہ ہے وہ کوئی الجھا ہوا گہرا فلسفہ بیان نہیں کرتے ان کے یہاں سیدھی سادی وہ غزل ہوتی ہے جو غزل کہلانے کی مستحق ہے۔

باسم میواتی

جناب باسم میواتی عرصہ ہو گیا ایک نوجوان بڑی دھوم دھام سے طلوع ہوئے تھے۔ ان کے یہاں غزل کم اور نظم زیادہ کار آمد ہوتی تھی عرصہ سے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور ان کے ذوق شعری کا دنیا نے کیا حال کیا۔

بدر اعلیٰ پوری

جناب بدر اعلیٰ پوری حضرت ابر گنوری کے شاگرد ہیں اور ریلوے دفتر میں ملازم ہیں کبھی کبھی مشاعروں میں ملاقات ہوتی ہے تو کلام سننے میں آتا ہے۔ وہ قدیم رنگ میں کہتے ہیں مگر ہم عصروں میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ بحیثیت انسان بھی بڑے مخلص انسان ہیں کوئی مطبوعہ مجموعہ کلام ابھی تک نہیں۔

بشیر منذر

بشیر منذر صاحب نے ہمیشہ اپنی زندگی تحصیل علم و ادب میں صرف کی ہے، وہ نوجوان ہیں مگر ان میں آج کل کے نوجوانوں کی آوارہ مزاجی اور آوارہ نگاہی نام کو نہیں وہ نہایت اچھی شاعری کرتے ہیں جس میں عربی فارسی کے مغلق الفاظ استعمال نہیں ہوتے بلکہ سہل ممتنع کا عمل جاری و ساری رہتا ہے وہ گیت بھی لکھتے ہیں اور نثر میں بھی معقول مہارت ہے۔ الغرض وہ ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی اہل علم بھی ہیں اور صاحب عمل بھی۔

مرزا ابیضا خان مروی

مرزا ابیضا اردو فارسی کے بڑے پختہ مشق شاعر ہیں وہ ہیں تو ایرانی نژاد لیکن ایک عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں۔ کسی گورنمنٹ کے محکمے سے متعلق تھے غالباً اب ریٹائر ہو چکے ہوں گے فارسی کا نہایت اچھا ذوق ہے، اور کیوں نہ ہو فارسی تو ان کی مادری زبان ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اردو میں بھی اچھا شعر کہتے ہیں اور بڑے ذوق سلیم کے مالک ہیں۔ امرتسر میں مرزا شیون مرحوم ان کے برادر تھے جو جوان العمری میں موت سے بھی پہلے راہی عدم ہو گئے۔

بوم میرٹھی

جناب بوم میرٹھی اپنے دور کے سب سے نکلتے ہوئے مزاح نگاروں میں تھے لیکن چونکہ غریب اور نادار قسم کے آدمی تھے اس لیے لکھے پڑھے لوگوں نے ان پر اور ان کی شاعری پر بہت کم لکھا ہے- حالانکہ وہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے انہوں نے زندگی بھر اپنے پمفلٹ چھپوا کر فروخت کیے اور اسی پر ان کا گزارہ تھا- اگر کسی کے پاس بوم کے تمام پمفلٹ موجود ہوں تو ان کی شاعری پر بڑا اچھا مقالہ ہو سکتا ہے-

بیدل پانی پتی

جناب بے دل جھنگ میں ہیں اور مشق و مہارت ان کی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اب وہ غزل ہو یا نظم اپنے لیے کوئی مشکل خیال نہیں کرتے- مشاعروں میں ان سے ملاقات ہوتی ہے- خلیق انسان ہیں- شاعری ان کا فطری جذبہ ہے اور ظاہر ہے کہ فطری شاعر کو داد و تحسین کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو مجبور ہو کر شعر کہتا ہے- ایسا شاعر تعریف اور تنقید دونوں سے متاثر نہیں ہوتا- وہ تو نقیب ہوتا ہے قدرت کا-

بشیر احمد یلدرم

جناب بشیر احمد یلدرم عربی' فارسی' اردو اور انگریزی میں یکساں عبور رکھتے ہیں- وہ نظم بھی کہتے ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں وہ نقاد بھی ہیں اور صحافی بھی' طبیعت میں شاعرانہ نزاکت بھی ہے اور جفاکشی بھی- یہی سبب ہے کہ جب طبیعت اکتاتی ہے وہ نوکری چھوڑ دیتے ہیں اور چونکہ قابل انسان ہیں- اس لیے فوراً انہیں کہیں نہ کہیں پہلے سے بہتر جگہ مل جاتی ہے- انتہا درجے کے مہذب انسان ہیں اور اس سے زیادہ مسلمان-

بسمل لکھنوی

جنابِ بسمل لکھنوی لکھنؤ سے آ کر مغلپورہ لاہور میں مقیم ہیں- لکھنؤ کی قدیم مجلسیں نظر میں ہیں اور اساتذۂ لکھنؤ کے انداز ان کے مشاہدے کی چیزیں ہیں- چنانچہ لاہور کے مشاعروں میں بھی وہ اپنا

کلام اسی ٹھاٹھ سے پڑھتے ہیں اور بعض اوقات تو خود شعر کی تشریح بن جاتے ہیں۔شعر پڑھتے ہوئے مافی الضمیر کے متعلق اشارات وکنایات سے شعر کا مفہوم بتادینا انہی کا کام ہے قابل احترام لوگوں میں ہیں یہ صورتیں پھر کہاں ملیں گی۔

بشیر ظامی

جناب بشیر یوں تو سرائیکی زبان کے آدمی ہیں اور اس میں انہوں نے سرائیکی کا لغت' قاعدہ اور صرف ونحو بھی لکھی ہے لیکن اردو میں بھی انہیں بڑی معلومات ہیں۔وہ تجربہ کار اور ذی شعور انسان ہیں۔تحقیق وتدقیق کا ذوق ان میں فطری ہے۔ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی تحقیق بڑی کارآمد ہے جسے وہ روزمرہ میں بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں۔جتنی محنت انہوں نے سرائیکی زبان کی تحقیق میں کی ہے اگر اردو پر کرتے تو بڑی کارآمد باتیں ملتیں مگر سرائیکی پر بھی ابھی کوئی کام نہیں ہوا اور ان کی یہ سعی بے مصرف نہیں ہے۔

بے کل اتساہی

جناب بے کل اتساہی نوجوان شاعر ہیں چھوٹے ٹکڑوں میں جو وہ گیت کہہ کر اپنی مترنم آواز میں پڑھتے ہیں تو فضا میں نغمہ بھر جاتا ہے اور الفاظ معانی کی طرف فکر وسماعت بغاوت کرنے لگتے ہیں۔اگرچہ ان کے یہاں فکر وخیال بھی کم نہیں لیکن نغمہ شعر کے حسن پر قادر رہتا ہے اور یہ فطری سی بات ہے الفاظ ومعانی کا جادو بھی کم نہیں ہوتا لیکن معاملہ تو کثرت کا ہے جس طرف بھی ہو۔

مسیح الحسن بقا نقوی مرحوم

یہ نوجوان شاعر اور بڑا خودساز قسم کا انسان تھا اس نے بیرے گیری سے زندگی شروع کی تھی اور چونکہ فطری شاعر تھا اس لیے اس کی شاعری تکلفات سے بری مگر تصورات واحساسات سے پر تھی۔افسوس کہ موت نے جوانی ہی میں اسے ہم سے چھین لیا۔ وہ اچھا پرگو شاعر تھا اس کے کلام کے متعلق کوئی پتہ نہ چل سکا کہ کس کے پاس رہا۔وہ ''حلقہ ارباب ذوق'' کا رکن تھا مگر موت کی دیوار حائل ہوتے ہی سب رشتے منقطع ہو گئے اور اس کا کلام فراموشی کی دھند میں آ گیا۔ حالانکہ اس کی

اشاعت ان کا فرض تھا اور جناب شہرت بخاری اس کے سیکرٹری تھے جو بقا سے بہت نزدیک تھے اور رات دن کا ساتھ تھا۔

بے دل حیدری

جناب بے دل حیدری حضرت حیدر دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں اور ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر ہیں اچھی غزل کہتے ہیں ابھی جوان ہیں اور ان کے سامنے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اب انہوں نے شاگرد کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ خدا انہیں اور ان کے شاگردوں کو ثابت قدم رکھے آمین ثم آمین

سید محمد باقر نقوی البخاری احمد پوری

سید محمد باقر نقوی کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ ان میں شروع ہی سے جذبہ شعری بے تاب ہے اور نظم و غزل پر قدرت رکھتے ہیں۔ اب تو ان کی مشق و مہارت بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ صرف جذبہ ہی کام نہیں کرتا شعر و ادب میں مطالعہ مشاہدہ اور سب سے زیادہ صالح قسم کی صحبتیں ضروری ہیں آج بھی نقوی صاحب اچھا شعر تخلیق کرتے ہیں لیکن وہ نوجوان ہیں اور ان کے سامنے علم و عمل کے کئی میدان آئیں گے اس لیے مجھے ان کے مستقبل سے مایوسی نہیں ہے۔

حسن بخت

جناب حسن بخت کے دو دیوان چھپ چکے ہیں اور تیسرا زیر ترتیب ہے۔ یہ امرتسر کے رہنے والے ہیں اور معلمی ان کا پیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ معلم کی شاعری میں اور کچھ بھی ہو اخلاق کے خلاف مواد نہیں ہوتا کیونکہ یہ مشغلہ پاکیزگی سے قریب رکھتا ہے۔ جناب حسن بخت اپنے دونوں دیوانوں میں اپنے خدو خال سمیت موجود ہیں اور گزشتہ دونوں دیوانوں کی تائید کے لیے تیسرا مجموعہ طلوع ہو رہا ہے۔ شاعری تخلیق ہی شاعر کا مقام متعین کرتی ہے اور اس کے نشیب و فراز پر مہر ثبت کرتی ہے۔

پریم ناتھ بزاز

سری نگر کے مشاعروں میں بزاز صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ ایک مخلص کارکن اور مزدوروں کسانوں کے حامی انسان ہیں۔ ان کی نظمیں قوم و وطن کو بیدار کرنے اور ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے میں معاونت کرتی تھیں اور آج بھی ایک اچھے اور ملک کے وفادار اور غیر متعصب لیڈر شمار ہوتے ہیں۔

باری علیگ

پہلی ملاقات باری صاحب سے لائل پور میں ہوئی اور دوسری ملاقات پر وہ ایسے ملے جیسے برسوں کے دوست باری کی نظر تاریخ کے ان گوشوں پر زیادہ مرکوز رہتی تھی جہاں انقلاب نے جنم لیا ہو یا غریبوں اور پس ماندہ طبقے کے حقوق کو پامال کیا گیا ہو۔ یوں تو کئی کتابیں ان کی کاوش نظم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان میں ''کمپنی کی حکومت'' میں انہوں نے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے۔ اگرچہ باری صاحب کے انتقال کے بعد اس کتاب میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ جو صحیح معنوں میں خیانت ادب ہے لیکن اس کے باوصف وہ کتاب اپنا مقام رکھتی ہے۔ باری نہایت اچھے ادیب اور اعلیٰ درجے کے سیاسی تھے لیکن اس آدم خور خطے میں ان کی کوئی قیمت نہ لگی اور انہوں نے عالم افلاس میں جان دے دی۔

بنت اے۔ آر خاتون

بنت اے۔ آر خاتون کے نام سے ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ اپنی والدہ سے سیکھا ہے اور انہی کی طرح انہوں نے بھی ناول کو اپنا کر ایک خاص رخ پیدا کر لیا ہے اب اچھے اور بلند طبقے میں ان کے ناول دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں ان کا انداز تحریر پر لطف اور مفہوم اقدار حیات سے دور نہیں جاتا۔ کسی دن وہ ملک کے مشہور و معروف ناول نگاروں میں شمار ہوں گی۔ ان کے سامنے ترقی کے بے میدان ہی میدان ہیں۔

عبدالباقی بلوچ باقی

نہایت خلیق اور ذہین انسان ہیں اور اچھا سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں وہ شعر میں بھی اپنی اسی لگن کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے سینے میں روشن ہے اور اس کی آنچ دوسرے دلوں تک بھی پہنچتی ہے۔ سیاست کی لے جب شعروادب کے نغمے پر حاوی آ گئی اور لطافت سے بات مادیت تک جا پہنچی تو قیدو بند کی صعوبت میں مبتلا ہیں۔اس سے پہلے جب وہ گولیاں لگنے پر ہسپتال میں تھے تو میں ان کے پاس گیا اور وہ اسی پرانے خلوص سے پیش آئے ان کے سینے میں شیر کا دل ہے اور زبان پر پھولوں کی نرمی۔ یہی سبب ہے کہ عوام کے دلوں میں ان کی جگہ ہے ابھی ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

ابوسعید بزمی

پہلی ملاقات بھوپال میں ہوئی تھی پھر وہ لاہور آ گئے تو عرصہ تک انہوں نے مختلف اخبارات میں کام کیا۔ اخبار 'مدینہ' بجنور کی ادارت بھی سنبھالی اور وہاں سے لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے اخبار 'احسان' کو بھی ایڈٹ کیا اور تصنیف و تالیف بھی کرتے رہے۔ انہیں دنوں میں نے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں ابوسعید بزمی سے تاریخ انقلابات عالم دو جلدوں میں اور مولانا وارث کامل سے تاریخ مجاہدین اسلام تین جلدوں میں بالمعاوضہ لکھوائیں مگر تقسیم ملک ہوگئی اور میرے حالات ایسے نہ رہے کہ ادارہ کو چلاتا چنانچہ تاریخ انقلابات عالم تو علمی پریس والوں کو دام کے دام پر فروخت کی اور تاریخ مجاہدین اسلام جناب شورش کو دام کے دام دے ڈالی جو ابھی تک التوائے اشاعت میں ہے۔ ایک اور کتاب ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں قاضی اطہر مبارک پوری سے لکھوائی جو اب تک کتابت شدہ میرے پاس ہے لیکن میں تقسیم ملک کے بعد اس قابل نہ ہو سکا کہ کوئی کتاب چھپواتا میری ذاتی تصانیف میں سے بھی اب تک کوئی کتاب طبع نہیں ہو سکی۔

ان کی ایک اور کتاب 'زندگی کے جائزے' جو افسانوں کا مجموعہ ہے' میں نے ہی چھپائی تھی۔ ان کی ایک بڑی کارآمد کتاب رنگ محل کے نام سے تھی جو ابھی تک نہیں چھپی۔ نہ جانے وہ مسودہ کس کے پاس رہ گیا۔

ابوسعید بزمی صاحب طرز صحافی تھے۔ انہیں عربی فارسی پر عبور تھا اور اردو صحافت میں جو انہوں نے لکھا ہے وہ ان کے ذوق مطالعہ اور علمی بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔

وہ پاکستان کی طرف سے صحافیوں کے ایک وفد میں امریکہ گئے تھے اور اچانک راہی عدم ہو گئے۔ جہاں میانی صاحب والے قبرستان میں لب راہ اس غریب وطن صحافی کا مزار درس عبرت دیتا ہے۔

محمد ابراہیم برق

محمد ابراہیم برق علی پور کے زمیندار ہیں میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ کالج میں طالب علم تھے انہیں اسی وقت سے علم وادب کا ذوق تھا اور یہی ذوق ان کو وزارت تعلیمات تک لے گیا۔ بڑا ہی شستہ اور ستھرا مذاق پایا ہے لیکن وزارت کے بعد انہیں ایسی مصروفیات نے گھیر لیا کہ روایتی زمینداروں کی صف میں آ گئے جو خواہ مخواہ اپنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتے ہیں اور یہ ایک علمی خیانت ہے۔

حکیم بلیغ الرحیم صاحب بلیغ

جناب بلیغ رام پور کے رہنے والے ہیں لیکن تقسیم کے بعد مردان میں جا بسے اور اب تک وہیں ہیں نہایت اچھے شاعر، اور اعلیٰ درجے کے طبیب ہیں مطالعہ کے بے حد شوق ہے اور ان کی معلومات ہی ان کی شاعری میں رنگ و روغن پیدا کرتی ہیں وہ طبی تحقیق کے سلسلے میں ایک اچھی اور وقیع کتاب کی تدوین میں کوشاں ہیں خدا کامیاب کرے۔ انہیں چاہئے کہ طبی تصنیف پیش کرنے سے پہلے اپنا مجموعہ کلام چھپوا ڈالیں۔

بیگم الما لطیفی

الما لطیفی پرانے آئی سی ایس تھے اور لاہور میں وہ فنانشل کمشنر رہے ان کی بیگم اعلیٰ پائے کی ادیبہ تھیں شملہ میں جب انہوں نے مشاعروں میں میری نظمیں سنیں تو لطیفی صاحب نے مجھے بلوا کر تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے اپنے کئی مضامین کے ترجمے سنائے اور کہا کہ میری دلی آرزو ہے کہ

آپ میرے مضامین کا منظوم ترجمہ کریں میں خود ترجمہ سنتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ ان کے مفاہیم کو اگر منظوم کر دیا جائے تو ادب میں ایک اضافہ ہوگا لیکن کچھ دنوں بعد ہی لطیفی صاحب لاہور سے چلے گئے اور وہ ملک و قوم کی بہبود کے لیے مشترکہ آرزو گونگے کا خواب ہو کر رہ گئی - کاش وہ مضامین ترجمہ ہو کر عوام تک پہنچتے - میں ان میں اپنے معاشرہ کے کئی اصلاحی پہلو دیکھ رہا تھا -

احمد شاہ پطرس بخاری

جناب پطرس بخاری لاہور کے مشہور ادیبوں میں ہیں اور مزاح نویسی اور طنز نگاری میں تو اب تک یہاں ان کا کوئی مثل نہیں ہوا - ان کی کتاب ''پطرس کے مضامین'' ان کے مزاحیہ ادب کا شاہکار ہے - بخاری صاحب شاعر بھی تھے اور نہایت اچھا شعر کہتے تھے - ان کی نظم ''دورایا'' تو کئی جگہ چھپی ہے لیکن ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا - شاید انہیں مصروفیت کا رے ایک محدود عرصہ کے بعد ادب کی تخلیق کی مہلت نہیں دی اور اتنا بڑا ادیب زمین کا پیوند ہو گیا -

پیام شاہ جہاں پوری

جناب پیام شاہ جہاں پور کے رہنے والے ہیں - لیکن تقسیم سے بہت پہلے کے لاہور میں مقیم ہیں آج کل انجمن حمایت اسلام کے اخبار کو ایڈٹ کرتے ہیں - انہیں تلخیص اور تفصیل کے فن میں کمال حاصل ہے اور نظم و نثر دونوں پر برابر کا عبور ہے - کئی کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں اور اب ان کا دماغ اور قلم دونوں تیز رد ہیں یہ دور ایسا ہے کہ راستے سونے اور پھاٹک کھلے ہیں ہمیشہ مستقبل انہی راستوں سے چارج لیتا ہے جناب پیام نثر نگار کے ساتھ پر گو شاعر بھی ہیں لیکن ان کی شاعری اب تصنیف و تالیف کی اوٹ میں آ گئی - خیر یہ کام بھی شاعری سے کم پائیدار نہیں ہے لیکن فطری انعام سے تغافل جرم ضرور ہے -

پرویز

جناب پرویز تعلیمی دور سے ہی شعر و نغمہ کے شوقین تھے اور انہوں نے جو شاعری کی وہ مایوس کن نہیں تھی لیکن ان کی وجاہت اور شخصیت انہیں ادب سے چھین کر فلمی دنیا میں لے گئی اور وہاں سے

لوٹ کر ادب کے خارزاروں میں بہت کم لوگ آتے ہیں چنانچہ وہ ابھی تک اسی فن میں ہیں-ایک ریڈیائی مشاعرہ میں ان کا کلام سنا تو مسرت ہوئی کہ ان میں ابتذال نہیں آیا اور افسوس یہ ہوا کہ کیا کار آمد انسان ادب سے چھن گیا- ان کا کوئی مجموعہ کلام بھی میری نظر سے نہیں گزرا-

پرواز جالندھری

پرواز صاحب اسماعیل آباد ملتان میں ٹیکسٹائل ملز سے متعلق ہیں خوب غزل کہتے ہیں اور جتنا اچھا کہتے ہیں اس سے اچھا پڑھتے ہیں اگرچہ ان کے ترنم میں نغمگی زیادہ ہوتی ہے لیکن ان کے اشعار کا مفہوم زیادہ معلوم نہیں ہونے دیتا اور مشاعرہ میں کامیاب رہتے ہیں-

پرواز بھی جوان ہیں اگر زمانہ نے انہیں موقع دیا اور ان میں علم کا جنون بھی بیدار ہو گیا تو ان کی شاعری ان کو سنبھالنے کے لیے کم نہیں ہے-اگر یہ لاہور میں ہوتے یا کراچی میں ان کی سکونت ہوتی تو اب تک نہ جانے کہاں کے کہاں ہوتے- غالباً ابھی یہ خود اپنی آنکھ سے اوجھل ہیں اور احساس کمتری انہیں زمین سے اٹھنے نہیں دیتا حالانکہ یہ سرتاپا پرواز ہیں-

پرویز چشتی

سیدھا سادہ ذہین اور متین قسم کا لڑکا ہے بڑا خوش خط' خوش فکر اور خوش ذوق پہلے پہلے میرا خیال تھا کہ یہ لڑکا ادب میں ترقی کرے گا نثر اور نظم دونوں میں بند نہیں تھا لیکن ماحول اور گھر کے ناسازگار حالات نے اس کی راہیں روک دیں اور اب وہ ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا میں جب بھی اس سے ملتا ہوں' مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ کیسا کار آمد نوجوان نذر شکم ہو کے رہ گیا-

جے چند پریم ملتانی

ملتان کے رہنے والے ہیں غزل کہتے ہیں اور زود گو بھی ہیں ملتان سے لالہ بالکشن تیرہ ابر ایک ہفتہ وار اخبار ''اقبال'' نکالتے تھے پریم کا کلام اس میں چھپتا تھا اور اس میں ایک قدآور شاعر کے آثار موجود تھے تقسیم کے بعد نہ جانے کہاں آباد ہوئے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی نظر سے نہیں

گزرا۔

غلام احمد پرویز

غلام احمد پرویز کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں شملے کے مشاعرہ میں شریک ہوا ان دنوں پرویز صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں کسی اچھی پوسٹ پر تھے۔ میری موجودگی میں انہوں نے ایک شخص سے گفتگو کی جو کسی سرکاری ادارہ کے صدر تھے۔ اس وقت ان کی گفتگو تو میرے معیار پر پوری نہیں اتری لیکن مقصد گفتگو جو تھا وہ ایمان افروز تھا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں بھی ایسے ایسے لوگ ہیں جو اپنے سینے میں تبلیغ کا چراغ اور ایمان کی تڑپ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل زمانہ تک ملاقات نہ ہوئی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو وہ پرویز تو دوسرے ہی پرویز ہو گئے اور انہوں نے باقاعدہ ایک جماعت کی تشکیل کر لی اور ان کی تصانیف بھی بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہیں۔ جسے دے اللہ۔

تاباں بدایونی

جناب تاباں بدایونی کو میں نے ان کی آخری عمر میں الہ آباد کے مشاعرہ میں دیکھا اور پھر کئی مشاعروں میں ملاقاتیں رہیں۔ وہ قدیم طرز کے استادوں کی صف کے انسان تھے اور مشاعروں میں زانو پر ہاتھ مار مار کر بڑے کروفر سے غزل پڑھا کرتے تھے ان سے مل کر شاعری کا وہ دور سامنے آجاتا تھا جب اردو زبان جھاڑ جھنکاڑ سے نکل کر منجھ رہی تھی۔ کوئی مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا۔

محمد یحییٰ تنہا

جناب محمد یحییٰ تنہا اردو زبان کے مشہور مورخ تھے انہوں نے اردو زبان کے تذکرہ کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھی ہیں جو تاریخ و ادب میں ایک مقام رکھتی ہیں وہ تقسیم ملک کے دوران لاہور آ گئے تھے اور صحیح معنی میں مہاجر تھے لیکن ان کی قابلیت اور شہرت کا سکہ ان کے ساتھ تھا چنانچہ وہ محکمہ آبادکاری میں عرصہ تک ایک ذمہ دار عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور وہیں ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔ تنہا صاحب شاعر بھی تھے اور مترجم بھی چنانچہ وہ منظوم ترجمہ

میں بڑی مہارت رکھتے تھے ان کے کلام کا ایک مجموعہ غالباً ''سوز و ساز'' کے نام سے چھپا تھا۔

مولانا تاجور نجیب آبادی

احسان اللہ خان نام' تاجور تخلص یہ درانی خاندان کے ایک فرد تھے جو نجیب آباد سے لاہور آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ یہ دیو بند کے فاضل اور پنجاب کے منشی فاضل اور مولوی فاضل غالباً ۱۹۱۶ء میں لاہور کے مشہور رسالہ ''مخزن'' کے مدیر ہو گئے اور پھر دیال سنگھ کالج میں اردو' فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور آخری دم تک وہ اسی کالج سے منسلک رہے اس اثنا میں رسالہ ''ہمایوں'' کے مدیر معاون بھی رہے پھر رسالہ ''ادبی دنیا'' نکالا اور اس کے بعد ''شاہکار'' جاری کیا۔ لیکن چونکہ مولانا زود اعتبار قسم کے انسان تھے اس لیے انہیں اس ادبی سعی مسلسل سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان پہنچا۔

مولانا تاجور نے جو اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے وہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی کا سرمایہ قریباً تیس ہزار روپیہ اسی اردو ادب کی خدمت پر لگا دیا اور ''اردو مرکز'' سے افسانوں' نظموں' غزلوں اور مراثی کے بیش قیمت انتخاب شائع کئے جو ہر نہج سے قابل ستائش ہیں۔

پنجاب میں مولانا نے جس قدر ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ رہتی دنیا تک رہیں گی آج کے ادباء و شعراء کا بہت بڑا حصہ جو تاریخ کا جزو اعظم ہے مولانا کی خدمات اردو کا ممنون ہے۔ مولانا کو رسا رام پوری سے شرف تلمذ تھا۔ شروع شروع کی غزلیں جمع کی تھیں لیکن وہ کوئی صاحب لے گئے اور واپس نہیں کیں۔ اس کے بعد مولانا نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ ملک کے مختلف جرائد میں چھپتے رہتے تھے۔

جب میں مولانا سے ملا ہوں اس وقت وہ ''ادبی دنیا'' نکالتے تھے چنانچہ میں نے ''ادبی دنیا'' کو حفاظت سے رکھنا شروع کر دیا اور اس کا مکمل فائل میرے یہاں لائبریری میں موجود ہے۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام کلام اور نثری مضامین میں نے ان کے لڑکے کو دے دیئے تھے جو ان کے پاس موجود ہیں۔ لیکن چونکہ بچوں میں کوئی ادبی ذوق نہیں رکھتا اس لیے وہ سرمایہ ادب بے کار دیمک کی نذر ہو جائے گا۔

ان کے بعد میں نے پھر مولانا کا کلام اکٹھا کرنا شروع کیا اور ایک ادارہ ''تہذیب وادب'' قائم کر کے ایک کتاب ''تذکرہ تہذیب وادب کے نام سے شائع کی جس میں جہاں تہذیب وادب کے دوسرے اراکین کے حالات اور کلام ہے وہیں مولانا تاجور نجیب آبادی کی بھی غزلیں موجود ہیں۔ باقی غزلیں جناب شفیق کوٹی صاحب کے یہاں محفوظ ہیں اور ان کے نثری مضامین اور مزاحیہ مضامین میرے یہاں ''ادبی دنیا'' کے فائلوں میں محفوظ ہیں مولانا کا اصلاح ادب وشعر پر بڑا کام ہے وہ ایک اچھی کتاب ہو سکتی ہے اسی طرح ان کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ بھی ایک کتابی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

مولانا نے جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب کی سرپرستی میں ایک ادارہ ''ارباب علم'' بھی قائم کیا تھا جس میں مختلف موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے تھے اور اس کی شاخیں پنجاب کے کئی شہروں میں قائم ہو گئی تھیں۔ مولانا جہاں بے مثل عالم دین تھے لاجواب شاعر اور ادیب بھی تھے جہاں وہ شفیق استاد تھے وہیں وہ باوفا قسم کے دوست بھی تھے ان کے پیش نظر ہر وقت اردو زبان کی ترویج و اشاعت تھی اور دن رات اسی دھن میں لگے رہتے تھے۔

مولانا شاعر سے زیادہ استاد تھے شعر تو وہ بہت کم کہتے تھے مگر جو کہتے تھے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور صنائع بدائع سے بچا کر! ہاں ان کے شاگرد جانتے ہیں کہ وہ کس پائے کے استاد تھے مولانا غزلوں اور نظموں دونوں صنفوں میں بلند معیار رکھتے تھے ان کے یہاں اپج تھی اور خیال کے بڑے رنگین اور مضبوط سانچے۔ برجستگی اور بے ساختگی ایسی کہ سبحان اللہ۔ مولانا کے یہاں جا کر کوئی ان سے مرعوب نہیں ہوتا تھا بلکہ متاثر ہوتا تھا۔ ان کی یاد میں شباب کیرانوی نے اپنے رسالہ ''ڈائریکٹر'' کا تاجور نمبر نکال کر بڑا کام کیا ہے اگرچہ اس میں مولانا کا تمام وکمال سرمایہ ادب نہیں اور نہ ممکن تھا تاہم یہ ایک ایسی خدمت ہے جو شباب کے نام کو بھی زندہ رکھے گی۔

مولانا کے شاگردوں کی طویل فہرست ہے جن میں خود میں بھی اپنی شمولیت کو باعث فخر خیال کرتا ہوں۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد شاید لوگ اپنی پریشانیوں میں ایسے گرفتار ہوئے کہ ادب وشعر کی طرف توجہ کم ہو گئی اور مولانا کے شاگرد بکھر کر رہ گئے میں ان کے ایک شاگرد چونی لال اور ایک خوش تر گرامی کا تذکرہ ضرور کروں گا جو مولانا کے بعد بھی حسب استطاعت مولانا کے بچوں سے غافل نہیں

رہے۔

امتیاز علی تاج

جناب امتیاز علی تاج بڑے کہنہ مشق ادیب ہیں یوں تو ان کی بہت سی کتابیں ہیں لیکن سب میں ان کا ڈرامہ ''انارکلی'' مشہور ہے اور واقعی اس کا انداز بیان اعلی اور زبان شستہ ہے اب وہ ڈرامہ پر بڑا اہم کام کر رہے ہیں جو ادب میں ایک اضافہ ہوگا۔ عرصہ ہوا غالباً ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ کالج کے رسالہ ''راوی'' میں ان کی ایک نظم ''صبح کا ستارہ'' چھپی تھی جس پر کالج سے انعام بھی ملا تھا لیکن اس کے بعد ان کا ذوق شعر زندہ رہا یا ڈراموں اور افسانوں کے انبار میں دب گیا کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

محمد دین تاثیر صاحب سے میں بہت نزدیک تو نہیں رہا لیکن جب بھی ملا ہوں وہ بڑے خلیق اور نقاد قسم کے انسان ثابت ہوئے۔ ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' انہی کی کوششوں سے مقبول عام و خاص ہوا۔ ''مخزن'' نکلا تو اس میں بھی تاثیر کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ مشورے شامل رہے۔

پھر وہ اسلامیہ کالج میں انگلش کے لیکچرار مقرر ہوئے اور پھر مستعفی ہو کر کچھ روز کسی سرکاری ملازمت میں رہے اور ملازمت راس نہ آئی تو پھر اسلامیہ کالج میں آ گئے اور غالباً ۳۴ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے لندن چلے گئے۔ ۳۶ء میں واپسی پر ایم۔اے او کالج میں پرنسپل مقرر ہو گئے اور پھر ۴۰ء میں سری نگر میں پرنسپل ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم میں تعلیمی زندگی سے ہٹ کر حکومت ہند میں ملازمت کر لی اور ۴۷ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۴۸ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اسی عہدہ پر ۵۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جناب تاثیر بہت سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اور تنقیدی مسائل میں انگریزی اردو فارسی پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ ذہانت اور طباعی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن مقامی شعراء و ادباء کی چپقلش نے انہیں ایک پارٹی کا سرگروہ بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس مقام کے انسان تھے اس کے مطابق کوئی ادبی سرمایہ اپنی یادگار میں نہ دے سکے۔ اب آ کر ایک مجموعہ ''آتشکدہ'' کے نام سے چھپا ہے نہ جانے وہ ان کے کن کن دوستوں کی سعی ہے۔ کاش ان کے

تنقیدی مضامین بھی کوئی یوں ہی یکجا کر دے!

ڈاکٹر تاثیر بڑے پائے کے ادیب اور معیاری شاعر تو تھے ہی اعلیٰ پائے کے نقاد بھی تھے اس دور اور خصوصاً ان کے حلقے کے کئی کج کلاہ شاعر ان کی تربیت سے ہی شاعر بنے اور بعض بعض تو ان کے بعد دو قدم نہیں چل سکے۔

تاثیر صاحب بڑے ہی خوش مذاق اور زندہ دل قسم کے انسان واقع ہوئے تھے اور ہر سوسائٹی میں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ فطری طور پر غزل گو تھے مگر انگریزی ادب کے مطالعہ نے انہیں نظموں کی طرف چلا دیا تھا اور وہ انگریزی انداز کی نظمیں بڑی کامیابی کے ساتھ کہتے تھے۔
جب ان کی نظر ملک کی بدحالی اور انگریزی کی سیاسی چالوں پر گئی تو لاہور میں انہوں نے ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد ڈالی لیکن علامہ اقبال کی صحبتوں نے ان میں اسلامی روح اس قدر پھونک دی تھی کہ وہ ترقی پسند مصنفین سے بھی اکتا گئے تھے اور ان کے رویہ کے شاکی تھے حقائق سے چشم پوشی کرنا ان کے قبضہ قدرت سے باہر کی بات تھی وہ اپنی نظموں اور غزلوں میں اپنے اس کرب کا اظہار بڑی دلسوزی سے کرتے تھے۔

تاثیر صاحب آخر میں بڑے شدید قسم کے مسلمان ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ مری کے ایک مشاعرہ کے سلسلے میں تاثیر صاحب اور میں ایک ہی جگہ مقیم تھے تو انہوں نے بتایا کہ جب تم میدان میں نمودار ہو رہے تھے تو میرے کئی دوستوں نے مشورہ کیا کہ یہ ایک اور نیا فتنہ اٹھا ہے اسے کیسے دبایا جائے تو ایس اے بخاری جو آپ کی نظموں کو بہت پسند کرتے تھے اور ہم لوگوں کے ساتھ تھے آپ کی حمایت کی اور کہا کہ احسان کو روکنا تمہارے بس کی بات نہیں وہ مزدور ہے تم اس کی روزی نہیں چھین سکتے اس کی نظموں میں اس کی زندگی اور تجربات بولتے ہیں وہ کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں دے گا اور اگر تم یہ عذاب لینا ہی چاہتے ہو تو صرف یہ کرو کہ اسے تنقید اور تعریف دونوں میں نظر انداز کردو۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اس پر عمل کیا اور اب بخاری صاحب ہی نہیں میں بھی آپ کے مداحوں میں ہوں۔ آپ اپنی کتابیں مجھے دے دیں میں آپ پر ایک طویل مضمون لکھوں گا اور یہ تمام باتیں بھی اسی میں آئیں گی۔ میں اپنی کتابیں تو انہیں دے آیا تھا لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی وہ کہیں رات کو دعوت میں گئے اور گھر آ کر طبیعت خراب ہوگئی اور صبح تک موت کی آغوش میں سو گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تاج محمد خیالؔ

تاج میں خیال کو میں ایک عرصہ سے جانتا تھا وہ علمی ادبی انسان تھے وہ لیکچراری سے وائس چانسلری تک پہنچے مگر تعلیم کے سلسلے میں وہ جو خواب دیکھ رہے تھے، شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے وہ ملک اور قوم کے خیر خواہ تھے اور نظام تعلیم کو از سر نو ترتیب دینا چاہتے تھے مگر اچانک ہوائی جہاز میں سقوط قلب سے راہی عدم ہو گئے وہ نہایت اچھا شعر کہتے تھے ان کے بعد ان کا ایک معمولی سا مجموعہ چھپا ہے جس میں ان کی کچھ غزلیں ہیں اس میں بھی ان کی علمی استعداد اور طباعی نمایاں ہے۔

تسکین قریشی

تسکین صاحب بڑے قاعدے کے شاعر ہیں یہ جناب جگر کے عزیز دوستوں میں تھے اور جگر صاحب ان کے بڑے مداح تھے اور اب جگر ٹرسٹ کے مہتمم تسکین صاحب ہی ہیں۔ تسکین صاحب بہت سوچ سمجھ کے شعر کہتے ہیں اور فن کی رو سے عیوب و محاسن پر ان کی نظر رہتی ہے۔ ان کے کلام میں فنی اغلاط اور پست خیالی کا دور دور پتا نہیں لگتا ان کے یہاں بے شمار محاسن ہیں ان کے چار مجموعے ''سرمایہ تسکین حصہ اول و دوم'' گلگونہ ''متاع تسکین'' چھپ چکے ہیں جن میں وہ خود اپنا تعارف کراتے ہیں۔

تجمل حسین

تجمل حسین صاحب رائٹر گلڈ کے سرگرام کارکن ہیں۔ ادب و شعر سے انہیں بے حد شغف ہے اور چونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑا گہرا ہے اس لیے ان کی تقریر اور تحریر دونوں جاندار ہوتی ہیں۔ حالانکہ تجمل حسین صاحب حکومت کی انتظامیہ میں ذمہ دار عہدہ پر ہیں لیکن دوران جنگ انہوں نے نمایاں خدمت انجام دی ہے اور ان کی تقریروں کا مجموعہ ''شہر نامہ'' کے نام سے چھپا ہے۔ جس میں تجمل صاحب اپنی خصوصی خوبیوں سمیت نمایاں ہیں اردو کی ترویج و اشاعت میں بھی میں نے تجمل صاحب کو بڑا مستعد اور دیوانہ وار کام کرتے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر تنویر علوی

جناب ڈاکٹر تنویر علوی نوجوان ادیب و شاعر ہیں لاہور میں جب وہ غریب خانہ پر تشریف لائے تو انہوں نے اپنی کئی نظمیں سنائیں وہ بلا تکلف شعر کہتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہیں۔ نثر میں انہوں نے جو ذوق پر کام کیا ہے اس سے ان کی یکسوئی اور محنت کا پتہ چلتا ہے جس تفصیل و تحقیق سے جناب تنویر نے یہ کام انجام دیا ہے اردو ادب میں ذوق پر اس تفصیل سے تا حال کوئی شاہکار نظر نہیں آتا۔ یہ کتاب ادارہ ''مجلس ادب'' لاہور سے شائع ہوئی ہے اور تنویر صاحب دہلی میں لیکچرار ہیں۔

پروفیسر تاباںؔ

پروفیسر تاباں نہایت شکیل اور ذہین نوجوان کہیں کالج میں لیکچرار تھے اور بڑا سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور شباب ہی میں راہی عدم ہو گئے جن لوگوں نے تاباں کو دیکھا ہے وہ ہرگز انہیں نہیں بھول سکتے وہ نوعمری کے باوصف قابل رشک قابلیت کے مالک تھے اور پھر دوست قسم کے انسان تھے ہر شخص سے ہنس کے ملنا اور دلداری کرنا ان کا شیوہ تھا۔

تابش دہلوی

جناب مسعود الحسن تابش دہلوی ریڈیو کے ادارہ سے منسلک ہیں لیکن میں انہیں بالکل الگ انسان محسوس کرتا ہوں وہ بلند پایہ شاعر ہیں ان کے یہاں شریفانہ جذبات اور معیاری اسلوب بیان اشعار کی صورت اختیار کرتے ہیں اور ابتذال کا دور دور تک کہیں پتا نہیں ملتا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کے شعر کہتے ہیں اور انہیں غزل کے اصول و قواعد کے علاوہ اس کے نازک پہلوؤں کا بھی علم ہے۔ اس دور میں پچ کے شعر کہنا ذرا دشوار ہے لیکن تابش کے یہاں اپنا انداز اپنی فکر اور اپنا تاثر الگ ہے۔

تابش الوری

جناب تابش الوری نوجوان شاعر ہیں ان کے اشعار میں مشاہدہ بھی بولتا ہے اور تجربہ بھی غالباً یہ ان کی غربت کی دین ہے کیونکہ جو شاعر مصائب سے دوچار نہیں ہوتا اس کے سامنے دوسروں کے غم

کہاں آسکتے ہیں۔ جناب تابش انفرادی غم تک ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے سینے میں سیکڑوں غریبوں کے دل دھڑکتے ہیں اور ان کی ندرت کلام آہوں نالوں اور فریادوں کو اشعار کا لباس دے کر قبول عام تک پہنچا دیتی ہے اور صحیح شاعری کا یہی مقصد ہے۔ ہمارے معاشرے کے امراض اور تمدن کے ناسوروں کا علاج تابش جیسے جدید شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ مجھے تابش صاحب کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے بعد اندھیرا نہیں ہے۔

شیریں تاج

یہ صاحبہ جناب حافظ محمود شیرانی کے خاندان سے متعلق ہیں، اردو فارسی میں بقدر ضرورت مہارت رکھتی ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں یکساں مشق و مہارت ہے۔ نظم سے اچھی غزل اور غزل سے اچھی نظم کہتی ہیں۔

ان کی شاعری میں ایک خاص غم اور کرب کا احساس شعر میں ڈھلتا اور متاثر کرتا ہے وہ اپنی غزلیں اور نظمیں کہیں چھپنے کے لیے نہیں بھیجتیں حالانکہ نہایت قاعدہ کا کلام ہوتا ہے شیریں کے کلام میں ایسا سوز و گداز ہے جو براہ راست روحوں پر مرتسم ہوتا معلوم ہوتا ہے وہ کم ضرور کہتی ہیں مگر جو کہتی ہیں بہتر کہتی ہیں۔

تولی حسین تولّی

جناب تولی بدایوں کے بڑے مشہور اور نغز گو شعرا میں شمار ہوتے تھے میں نے ان کی نعتیں بھی سنی ہیں اور غزلیں بھی، وہ نہایت صاف ستھری اور قواعد و قانون میں بچی تلی بات کہتے تھے اور مشاعروں میں انہیں ان کے مقام کے مطابق داد و تحسین بھی ملتی تھی۔ ان کے کلام کے مجموعے کے متعلق تقسیم ملک کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تمنا بوڑہانوی

جناب تمنا بوڑھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں اور پختہ مشق شاعر ہیں۔ انہیں بھی میں نے کئی بار سنا ہے وہ اچھا شعر کہتے ہیں بوڑھانہ میرے وطن قصبہ کاندھلہ سے تقریباً سات کوس ہے اور

وہاں بھی مشاعرے ہوتے رہتے تھے لیکن انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ غالباً ان کی عمر بسلسلہ ملازمت وطن سے باہر ہی گزری ہے وہ شاعر نہایت اچھے ہیں ان کا مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کشمیری نژاد ہیں امرتسر میں تعلیم وتربیت ہوئی اور عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا لاہور میں اردو فارسی کے استاد رہے ہیں جب یہاں سے ریٹائر ہوئے صوفی صاحب کا کلام اردو جرائد میں چھپا اور مقبول عام ہوا۔ صوفی صاحب فارسی کے آدمی تھے مگر انہوں نے اردو کو بھی اپنایا تو فارسی سے زیادہ اردو پر حاوی ہو گئے اور پھر زیادہ اردو ہی میں کہا۔ صوفی صاحب جدید رنگ کے دلدادہ نہیں روائیتی شاعری میں ان کے کلام کے اچھے اچھے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ تبسم صاحب استادانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور ان کے کلام میں وہ ناہمواری نہیں جو آج کل کے اساتذہ کا طرہ امتیاز ہے ان کے اشعار میں احساس کے علاوہ فن سے آگاہی اور اسلوب بیان بڑا ہی دلکش ہے۔

جناب تبسم ہیں تو قدیم رنگ تغزل کے رسیا لیکن انہوں نے موجودہ دور کی ضرورت اور وقت کے تقاضے کو محسوس کر کے اپنے یہاں جو طرز بیاں اختیار کیا ہے وہ قابل داد ہے آج کل کی غزلوں میں وہ بالکل پرانے اور روایت پرست انسان معلوم نہیں ہوتے بعض بعض غزلیں جو انہوں نے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں کہی ہیں اگرچہ ان کی بحریں مترنم نہیں لیکن ان کے کمال نے ان میں بھی موسیقی بھر دی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''انجمن'' سے ادب میں ان کا معیار اور مقام اور بھی بلند ہو گیا ہے۔

شیخ عبداللطیف تپش

جناب تپش کو یوں تو میں ایک عرصہ سے لاہور کی ادبی محفلوں میں دیکھتا تھا اور ان کی علمی ادبی اور شعری کاوشیں نظر سے گزرتی رہتی تھیں لیکن ان سے قربت کا موقع اس وقت ملا جب وہ پسرور میں السنہ شرقیہ کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اگرچہ ان کا درس وتدریس کا سلسلہ بھی علمی ادبی مشغلہ سے کم نہ تھا لیکن اس کے باوصف وہ

مطالعہ سے کچھ کے کچھ ہو گئے تھے اور ادبی حلقوں میں بڑی عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ پسرور سے وہ ایمرسن کالج ملتان میں آ گئے تھے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۹۴۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ تپش صاحب کی علمی بلندی کا ثبوت ہے کہ انہیں شیخ سر عبدالقادر صاحب کی دامادی کا شرف حاصل ہو گیا تھا تپش بڑے ہی ملنسار انسان واقع ہوئے تھے اور انہوں نے بالاستیعاب اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ پر گوئی پر مائل تھے لیکن مطالعہ کے اثر سے ان کی طبیعت پر یہ ہوا کہ کم گو ہو گئے اور غالباً مطالعہ کا یہی اثر ہر شخص پر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے سے بلند مصنفین اور معلفین کے شاہکاروں پر نظر ہو اور پھر خود فہمی پر بھی قدرت ہو۔

عبداللطیف تپش جناب میر محمود الحسن صاحب اثر کے شاگرد تھے یہی سبب ہے کہ وہ دہلی کی زبان اور روزمرہ پر حاوی معلوم ہوتے ہیں اور اپنے جذبات کو ایک دلکش پیرایہ بیان سے شعری صورت دے دیتے ہیں۔ تپش کے یہاں اگر کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک یاس اور محرومی کا عنصر زیادہ ملے گا۔ یہ بھی غالباً میر محمود الحسن کی دین ہے کیونکہ وہ زندگی میں ہمیشہ پریشان رہے اور پوری زندگی کلام فروشی پر گزری اس لیے وہی سوز و گداز انہوں نے تپش صاحب کو بھی تفویض کر دیا یا شاید اس سوز و گداز اور درد و کرب کا سبب یہ تھا کہ وہ ہم لوگوں سے جدا ہونے والے تھے بعض اوقات آنے والے صدمات آنے سے پہلے ہی دین و دل پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں اور انسان کو بے سبب غم رہتا ہے اور سوچنے پر بھی اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

جناب تپش کی غزلوں میں ایک سلیقہ ہے جو ان کے ایک بڑے فنکار ہونے پر دلالت کرتا ہے وہی خوشنما تراکیب اور اہل زبان جیسی برجستگی ان کے کلام کا خاصہ ہے میرے علم میں نہیں کہ ان کے کلام کا مجموعہ چھپا ہے یا نہیں۔ لیکن ان کے صاحبزادے ابوظفر حنیف جو غالباً اب بہاول پور میں لیکچرار ہیں وہ اپنے فرض کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنے والد کی کاوش قلم کو ضائع نہ ہونے دیں گے۔

تاثیر نقوی

جناب تاثیر نقوی علامہ آرزو کے قریبی عزیزوں میں ہیں وہ کچھ روز لاہور میں رہے اس کے بعد ملتان چلے گئے اور پریس وغیرہ کا کام کر رہے ہیں۔ تاثیر صاحب شاعر بھی ہیں اور خوشنویس بھی لیکن شاعری میں اپنے سیکڑوں ہم عصروں پر بھاری ہیں اور خوش نویسی میں بھی یہی حال ہے لیکن طبیعت کا تلون انہیں بے تاب رکھتا ہے وہ کہیں جم کر نہیں رہتے کیونکہ ان کے خیالات ان کے عمل سے بہت آگے رہتے ہیں اور یہ عیب قریب قریب سبھی شاعروں میں ہوتا ہے۔

تکلم انبالوی

جناب تکلم انبالوی سے دسیوں بار ملاقات ہوئی وہ تعلیم یافتہ تو اتنے نہ تھے لیکن شعر وہ تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر کہتے تھے۔ نہایت خلیق اور ملنسار لوگوں میں تھے انہوں نے اپنے کئی مجموعے چھپوائے جن میں ان کا معیار ادب خود اپنا تعارف کراتا ہے کیونکہ تصنیف میں مصنف چھپ نہیں سکتا ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں "بربط نو"، "نغمہ نو"، "صوت سرحدی" "حسن تخیل" وغیرہ

تصدق حسین تصدق

تصدق حسین صاحب کو ماڈل ٹاؤن کے مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ اپنے قویٰ کے اضمحلال کے باوصف مصرعہ طرح پر غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے سلسلے میں بہت ریاض کئے ہوئے ہیں ان کے یہاں محاورہ روزمرہ اور اصطلاح وغیرہ برمحل استعمال ہوتی ہیں اور ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں جس سے انہیں کسی رخ سے بھی کم مشق کہا جا سکے۔ مجموعہ ابھی ان کا غالباً کوئی نہیں ہے۔

تاج الدین تاج (زریں رقم) خوشنویس

تاج صاحب سے ایک طویل عرصہ قربت رہی گیلانی پریس کی ملازمت کے دور میں بھی تاج صاحب اسی بے تکلفی سے ملتے رہے وہ اپنے دور کے بہت بلند پایہ خوش نویس تھے اور کمال یہ تھا کہ وہ بے پروائی میں بھی جو کچھ لکھ دیتے تھے وہ ان کے ہم عصر توجہ سے بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ ان کا انداز

تحریر ایک الگ خوبصورتی رکھتا تھا جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا گویا ان کے قلم میں ایک چوتھی موزونیت تھی جو انہیں کا حصہ تھا۔ وہ بعض اوقات اصول خوش نویسی سے ہٹ بھی جاتے تھے مگر ان کا خیال تھا کہ موزونیت فن سے آگے کی چیز ہے۔

عبدالرشید تبسم

میرے بہت پرانے کرم فرماؤں میں ہیں شعروادب کا انہیں اول سے ذوق رہا ہے وہ ہر چند کہ ایک سرکاری دفتر میں ایک ذمہ دار عہدہ پر ہیں لیکن ہر پندرواڑہ میں ان کے یہاں مشاعرہ ہوتا ہے جس میں شعراء کا جمگھٹ ہوتا ہے اور مصرع طرح پر غزلیں پڑھی جاتی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن کے ذوق ادب کی ترقی میں تبسم کی سعی ناقابل فراموش ہے انہوں نے ان مطروحہ غزلوں کی ایک کتاب بھی چھپوائی ہے اور یہ ان کی بزم کا ایک کارنامہ ہے اور ان کے ساتھی قابل صد مبارک باد ہیں۔ تبسم صاحب کا ذاتی کوئی مجموعہ نہیں آیا۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

ماسٹر تاج الدین انصاری پرانے اور تجربہ کار سیاسی کارکن ہیں انہوں نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وہ تاریخ ہیں ایک صدی کی ان کا حافظہ ابھی تک آئینہ کی طرح ہے اور آج بھی وہ جناب شورش کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور چٹان میں برابر ان کے مضمون آتے رہتے ہیں۔ شورش جیسا لاابالی اور متلون مزاج انسان ان کا احترام بھی کرتا ہے اور اعتبار بھی اب ماسٹر صاحب کو اپنے مضامین اکٹھے کر کے کتابی صورت دینا چاہیے اس طرح دنیا زیادہ مستفید ہوتی ہے۔

مولانا تاج محمود

مولانا تاج محمود صاحب ریلوے کی جامع مسجد کے خطیب اور ایک فارسی مدرسہ کے صدر ہیں اور یہی نہیں وہ اپنے علمی ادبی ذوق کی خاطر اور قوم و وطن کی بہبود کے لیے ہفت روزہ ''لولاک'' کے مدیر ہیں ان کی تحریریں علمی نکات کی حامل اور تقریریں نکتہ آفرینی سے خالی نہیں ہوتیں وہ ایک شعلہ بیان مقرر ہیں احرار کی تبلیغ میں انہوں نے ایک زمانہ گزارا ہے اور وفاداری بشرط استواری کے قائل

نظر آتے ہیں۔

ثاقب لکھنوی

یہ حضرت بھی بزرگان لکھنؤ سے ہیں ان کا ایک ضخیم دیوان بھی ہے لیکن بحیثیت شاعر یہ لکھنؤ میں زیادہ نہیں چمک سکے اس میں شک نہیں کہ ان کی بعض غزلیں میر تقی میرؔ کے انداز میں نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں مرزا غالب کی گہرائی اور میر کی زبان نے جہاں جہاں استعمال ہو کر شعر کی صورت پائی ہے وہ ایک استاد ہی کے یہاں ملتی ہے۔

میں جناب ثاقب سے کئی بار ملا ہوں اور مجھ پر خصوصی کرم فرماتے تھے ایک بار انہوں نے سر سلطان احمد کے یہاں میری ایک نظم ''طوفانی نغمہ'' سنی تو بہت متاثر ہوئے اور ایک دوسری نشست میں انہی کے یہاں مجھے اسی قسم کی ایک طوفانی نظم سنائی اور فرمایا اس نظم کا جذبہ آپ کی نظم سے ملا تھا اور میں خصوصیت سے یہ نظم آپ کو سنانا چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے لیکن بعض بعض اوقات میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگوں سے ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اس لیے میں ذرا ان کے سامنے محتاط قسم کی گفتگو کرتا اور بڑے ادب سے رہتا۔

ان کی شاعری میں قدیم انداز بیان سے ہٹ کر ایک تصور تھا جس کا رخ زیادہ روزمرہ کی انسانی زندگی اور حیات و موت کے مسائل کی طرف تھا روائتی شاعری سے یہ لوگ آہستہ آہستہ کنارا کر رہے تھے۔ مجھے ان کا ایک شعر جو ان دنوں مجھے سنایا تھا بہت پسند ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

(ثاقب لکھنوی)

بعض بعض غزلوں میں بڑی کدو کاوش نظر آتی ہے اور بعض بعض میں غیرت مندی اور خودداری کے اظہار کی حسین دھاریاں بھی ملتی ہیں جس میں ان کے مشاہدے اور تجربے بولتے ہیں۔ لکھنو کے روزمرہ اور محاورات ان کے یہاں بڑے حسین انداز میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ثاقب کے کلام میں نگینے ملتے ہیں' وہیں نگینوں کو دھندلا کرنے والا گرد و غبار بھی ہے کاش یہ ذرا

انتخاب کی طرف توجہ دیتے تاکہ اچھے اشعار کے ساتھ معمولی اشعار بھی پڑھے جاتے۔

ابو محمد ثاقب کان پوری

جناب ابو محمد ثاقب کانپوری کو میں مدت سے جانتا ہوں کان پور کے مشاعروں میں بھی ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں وہ نہایت کم آمیز اور کم گو واقع ہوئے تھے۔ قدیم تصورات اور خیالات کے باوصف ان کی شاعری میں یبوست نہیں ملتی بلکہ ایک رچی ہوئی شگفتگی کارفرما ہے۔ ان کا کلام ''متاع درد'' چھپ چکا ہے اور اس پر اخباروں اور رسالوں نے نہایت اچھے تبصرے کیے تھے۔ تقسیم کے بعد ملاقات نہیں ہو سکی۔

عبدالکریم ثمر اچھروی

جناب عبدالکریم ثمر حضرت سیماب کے تلامذہ سے ہیں بڑے کہنہ مشق ہیں اور ان کی شاعری تغزل سے ہٹ کر نعت اور تاریخ کی طرف راغب ہوگئی۔ جس سے دنیا اور عقبیٰ دونوں پھلتے پھولتے ہیں جناب ثمر جلسوں میں اپنی تاریخی اور اسلامی نظمیں پڑھتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے اس لیے کوئی اسلامی اور اہم جلسہ جناب ثمر کی موجودگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ان کی تالیفات میں کئی کتابیں ہیں۔

ثریا فخری

ثریا فخری جناب فخری پانی پتی کی صاحبزادی ہیں اور کوئٹہ کے کسی کالج میں لیکچرار ہیں باپ کی تربیت سے ذوق شعری کی جلا ہوئی ہے۔ اور ادب کے پہلو تابناک ہوئے ہیں۔ وہ بڑی احتیاط سے غزل کہتی ہیں اور جدید رنگ کے سائے میں مضامین لاتی ہیں۔ مجموعہ ابھی کوئی شائع نہیں ہوا۔

ثاقب زیروی

محمد صدیق ثاقب زیروی سے پہلی ملاقات تقسیم ملک سے پہلے فیروز پور میں ہوئی تھی اور ان سے قریب ہو کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص ترقی کرے گا حالانکہ اس وقت ثاقب کی عمر بھی ایسی نہیں تھی مگر مشاعروں میں جو میں نے ان کی غزلیں سنیں تو شاعر اور غزل کے فاصلے میں نغمگی

اور آواز کا جادو سامعین کو داد پر مجبور کر دیتا تھا اور ارباب نظر حضرات سکوت حیرت میں گم ہو جاتے تھے۔ اب وہ ایک زمانہ سے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے ہیں لیکن مشاعروں میں اب بھی ان کا وہی دشنۂ خونریز کام کرتا ہے۔

پروفیسر بیگم ثریا سلیم

بیگم ثریا صاحبہ تقسیم کے بعد دکن سے پاکستان آ گئی تھیں وہ علم و ادب کی مالدادہ ہیں اور نظموں کی کئی بیاضیں ان کے کلام کا ذخیرہ ہے۔ وہ نہایت مہذب اور صاحب مطالعہ خاتون ہونے کے علاوہ انتظامی صلاحیتوں کی مالک بھی ہیں۔ وہ تعلیم و تربیت کے اصولوں کو اچھی طرح جانتی ہیں اور مردوں کی طرح اپنے اسٹاف کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتی ہیں اور ہر استاد کا مرتبہ ان کی نظر میں ہے ان کے یہاں مطالعہ اور مشاہدہ تو ہے ہی ان کے خیالات و تصورات اہل طریقت کی تربیت کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی کا تعارف سورج کو چراغ دکھانا ہوگا وہ اپنی طرز کے واحد شاعر ہیں۔ تاریخ ادب نے اب تک ایسا شاعر پیدا نہیں کیا وہ جو چاہتے ہیں وہی کہہ دیتے ہیں۔ شاعری جوش کا آبائی ورثہ ہے لیکن جوش نے اساتذہ کی تقلید نہیں کی انہوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ اختیار کیا اور اس میں بشمول انیس ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ فطرت صدیوں میں ایسے انسان دنیا کو دیتی ہے۔ مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ جناب جوش مجھ پر کرم فرماتے ہیں ہر چند کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہیں لیکن میں ان کے اس کرم کو حوصلہ افزائی خیال کرتا ہوں۔

انہوں نے اپنی شاعری سے اردو زبان کو اس قدر مالا مال کر دیا ہے کہ کبھی اگر جوش کے کلام کی فرہنگ لکھی گئی تو وہ بھی زبان و ادب کی ایسی خدمت ہوگی جو تاریخ میں جگہ پائے گی ان کے کلام میں جہاں تک میں نے غور کیا ہے عمل تضاد پر ان کی گہری نظر ہے اور عمل تجسیم ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب یہی خصوصیت ہے جس نے جوش کو وہ مقام دے دیا ہے کہ اب تک کسی شاعر کو میسر نہیں۔

جلیل مانک پوری

حضرت امیر مینائی کے جانشین اور نظام دکن کے استاد تھے۔ ان کے چار پانچ دیوان میری نظر سے گزرے ہیں اور جلیل صاحب ان میں اپنے تمام فنی اور علمی اعتبارات سے قابل تسلیم شاعر اور استاد فن ہیں۔ ہر چند کہ وہ قدیم انداز اور روایتی اسلوب کی شاعری کرتے تھے لیکن ان کے انداز بیان اور طرز تحریر میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں کہ سبحان اللہ ایک ایک لفظ میں ایک ایک کتاب کا مضمون انہی کے یہاں پایا جاتا ہے۔

جمیل مظہری

جناب مظہری پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں میری ملاقات ان سے ۳۴ء میں کلکتہ میں ہوئی تھی۔ جناب جمیل مظہری اور اختر حسین رائے پوری میرے کلکتہ ہی کے کرم فرما ہیں۔ جناب جمیل ہی کے دم سے مجھے کلکتہ میں جناب وحشت کلکتوی کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور وہیں جناب علامہ عیش امروہوی سے بھی شرف نیاز ہوا اور پر لطف نشستیں رہیں جو آج بھی چراغ زندگی کا کام دے رہی ہیں جناب جمیل مظہری شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی' افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نویس بھی اور بحثیت دوست وہ ان تمام محاسن سے بلند ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ باقی مجھے معلوم نہیں کہ اور کیا کیا چھپا ہے۔

جگر مراد آبادی

جناب علی سکندر جگر مراد آبادی' تعارف کے محتاج نہیں ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا اس وقت ان کے تین مجموعے موجود ہیں۔ داغ جگر' شعلہ طور' آتش گل۔

جناب جگر میرے دور کے بڑے کامیاب اور ہر دعزیز شاعر ہیں وہ اپنے بزرگوں کی روش سے بھی نہیں ہٹے اور اپنے دور کے تغزل کے تمام تر شرائط پر بھی پورے اترتے ہیں داغ کے شرگرد ہیں مگر داغ سے الگ اپنا ایک رنگ تغزل رکھتے ہیں جس میں سرشاری و سرمستی کے علاوہ ہجر و وصال کے اشعار بھی ایسے پاکیزہ اور مخصوص انداز میں ملتے ہیں جو دل تک مار کرتے ہیں۔

جناب جگر کے یہاں وہی سوز ہے جو فانی میں ملتا ہے اور وہی زبان ہے جو داغ کے سلسلے کا خاصا ہے- وہی انداز فکر ہے جو درد میں ملتا ہے اور وہی صفائی ہے جو حسرت کی شاعری میں طرۂ امتیاز کہلاتی ہے-

جناب جگر کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ آج ملک میں سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ان کے کلام سے استفادہ کرتے ہیں اور وہی انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ جگر نہیں ہو سکتے -جگر کے یہاں اغلاق اور گورکھ دھندے کی شاعری نہیں بلکہ ہمیشہ لچھے دار اور ریشم جیسی نرمی سے بات کرتے ہیں ان کے کلام میں ایک سرور بھی ہے اور والہانہ پن بھی جو غالباً ان کی سیرت سے رس کر اشعار میں آ گیا ہے-

آخر عمر میں جگر کے یہاں متانت' سنجیدگی اور انکسار آ گیا تھا وہ حج کے بعد نعت گوئی کی طرف رجوع ہو گئے تھے جو ایک صحیح مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور آخر میں تو وہ سیاست اور سماج کے مسائل پر بھی سوچنے اور کہنے لگے تھے-

ان کی غزل گوئی بادی النظر میں تو بڑی سیدھی سادی سی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ان کا ایک خاص رنگ ہے وہ غزل میں سیاست' فلسفہ' عمرانیات اور دینیات کے قائل نہیں تھے وہ کہا کرتے تھے کہ غزل کا تعلق دل کی واردات سے ہے اور یہیں تک رہنی چاہیے لیکن آخری دنوں میں خود اسی راہ پر آ گئے تھے اور چیخ اٹھے تھے کہ

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

آخر انسان کہاں تک مشاہدات اور حقائق کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اگر واقعات و حادثات کا دل پر اثر ہوتا ہے تو ان کا بیان یا اظہار بھی دل کی چیز ہو جاتی ہے اور اس کا بھی جزو شعر ہونا ضروری ہو جاتا ہے- چنانچہ آخری دور میں ان کی غزل سیاست' حکمت فلسفہ' نفسیات اور ادب سب کچھ سمیٹ کر چلنے لگی تھی اور ایسے ایسے شعر ان کے یہاں نکلنے لگے تھے کہ یہ اشاریت اور سمبل کا دور مشکل سے کہہ سکے گا مثلاً

جو کوئی سن سکے تو نکہت گل

شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے

سبحان اللہ' سبحان اللہ اگر وہ صرف یہی ایک شعر کہتے تو انہیں ادب میں جگہ دینے کے لیے یہی کافی تھا- بیساختگی' روانی اور تصوف تو پہلے ہی ان کے یہاں موجود تھا اور اس میں انہوں نے بڑے قابل قدر شعر تخلیق کئے ہیں لیکن عمر کے ساتھ ان کے ذوق نے بھی ترقی کی تھی اور زمانے کے ساتھ ان کے خیالات وتصورات بھی انہی گوشہ ہائے حیات پر مرکوز ہو گئے تھے جن پر دنیا کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں یہ الگ بات ہے کہ وہ غزل کی حدود سے باہر نہیں گئے لیکن کہنے والا ہو تو غزل بھی بڑے بڑے طوفانوں کی حامل ہو سکتی ہے- اس کا دامن نظم سے کم وسیع نہیں ہے جگر اپنے دور کے ناقابل فراموش شاعر ہیں-

جوش ملسیانی

جناب پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی' یہ بزرگ ملسیاں ضلع جالندھر کے رہنے والے ہیں- طرز وطریق نہایت سیدھا سادہ جیسا کہ بزرگوں کا ہوا کرتا تھا- لیکن جب شعروادب کی بات کی جائے تو عرش سے بولتے تھے- اردو اور فارسی میں قابل رشک مہارت اور فکر شعر میں کم درجے کا شعر ان کے لیے ہے ہی نہیں- غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر مدرسی کی اور بچوں میں ظاہر ہے کہ اخلاق کی اشاعت وترویج ہی ہو سکتی تھی- اسی مشغلہ نے انہیں با اخلاق بلکہ میں تو کہوں گا صاف باطن رکھا- صاف گوئی' صاف دلی اور صاف باطنی ان کی ایسی خوبیاں ہیں جو فوراً دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہیں-

جناب جوش ملسیانی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غیر شاعرانہ ماحول میں سیدھی سادی دیہاتی زندگی میں رہنے کے باوصف دولت علم وادب اس قدر کمائی کہ پھر تقسیم کرنے لگے چنانچہ ان کے خوشہ چینوں میں خود میں شامل ہوں اور خوش ہوں کہ کسی چھچھورے آدمی اور جعلی ادیب اور شاعر کے فریب سے دور رہا- فن شعروادب میں بہت کم لوگ ہوں گے جو جناب جوش ملسیانی کے ہم پلہ کہلائے جا سکتے ہیں اور نہ جانے کیا سبب ہے کہ داغ دہلوی کے تمام شاگرد اپنے اپنے مقام پر استاد

معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب جوش میں بھی داغ کے سلسلے کی وہی خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

یوں تو جناب جوش ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر وہ غزل ہی کے استاد ہیں۔ شاید اس لیے کہ جناب داغ دہلوی سے انہیں یہی دولت ملی ہے اور یہ ایسا کھرا سکہ ہے جو رہتی دنیا تک چلے گا۔

شروع میں مشق سخن کے طور پر انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں جو یا تو اخلاقی ہیں یا پھر فطری مناظر کی عکاسی ہے اور انہیں بھی اگر دیکھا جائے اور ترکیبوں کا حسن، الفاظ کا محل استعمال جزئیات نگاری کا اسلوب اور انداز بیان کا تیکھا پن پرکھا جائے تو جوش صاحب کی نظموں میں وہی شعور آشکار ہوتا ہے جو ترقی پا کر وہی کچھ ہوسکتا ہے جو وہ آج ہیں اور ان کی استادی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ دہلی جیسی جگہ پہنچ کر بھی ان کا وہی حال ہے کہ نئے نئے انداز سے جذبات اور خیالات کو قلمبند کرتے ہیں اور پھر زبان و بیان کا وہ حق ادا کرتے ہیں کہ کہیں حرف گیری کی گنجائش نہیں ملتی۔

دلی کی زبان کے محاورات اور استعارات کو وہ اس خوبی اور روانی سے نظم کرتے ہیں کہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ دہلی کے رہنے والے نہیں اور یہ سب استاد کی تفویض ہے۔

جوش صاحب آج کل اپنے صاحبزادے بالمکند عرش کے پاس دہلی میں مقیم ہیں اور وہاں ان کے تلامذہ کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ ''جنون و ہوش'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ایک کتاب اصلاح زبان پر بھی ملتی ہے۔

جدت میرٹھی

جناب جدت میرٹھی سے میں ان کے آخری دور میں ملا ہوں اور ان کا کلام سنا ہے۔ ان کا انداز کلام ایک اخلاقی عظمی کی یاد دلاتا تھا۔ وہ دبستان میرٹھ کے ان لوگوں میں تھے جو تنہا اپنی جگہ انجمن ہوتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ دور اپنے ماضی کے اکتساب سے انکار نہیں کر سکا۔ جدت صاحب میرٹھ سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تھے ان کا وجود اہل ادب کے لیے مغتنمات سے تھا وہ لاہور ہی میں سپرد خاک ہوئے ہیں۔

جمیل جالبی

نوجوان ہیں اور نثر و نظم دونوں میں انہیں مہارت ہے۔ ان کے کلام میں پختگی بھی ہے اور روانی بھی ان کے یہاں موقع کے مطابق الفاظ کا انتخاب و استعمال قابل رشک ہے ان کی نثر میں ایک ایسی پختگی پائی جاتی ہے جو بڑی مشق و مزاولت کے بعد پیدا ہوتی ہے ان کے حال کا رخ ادبی اور شعری لحاظ سے ایک روشن مستقبل کی طرف ہے اور کامیابی کے میدان ان کے منتظر ہیں۔

سردار کیرا سنگھ جہانگیر

سردار کیرا سنگھ جہانگیر مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے اور قدیم حالات و نظم یات کے تحت اخلاقی و اصلاحی اشعار کے علاوہ ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی تھا اور اس دور میں اس ذوق کے لوگ صاحب فکر سمجھے جاتے تھے۔ سردار کیرا سنگھ جہاں شاعر تھے وہیں مخیر انسان تھے وہ غریبوں بیواؤں اور یتیموں کی امداد کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔

جالب مرادآبادی

جناب جالب مرادآبادی سے مرادآباد میں ملاقات ہوئی تھی پھر دو ایک مشاعروں میں ملے۔ پھر پتا معلوم نہ ہو سکا۔ وہ بڑے چست شعر کہتے تھے اور فن عروض کے علاوہ معانی و بیان پر بھی ان کی اچھی خاصی نظر تھی مگر تقسیم ملک کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ انڈیا میں رہ گئے یا پاکستان چلے آئے۔

جگر گورکھپوری

جناب جگر قدیم طرز کے شاعر ضرور تھے مگر ان کے یہاں فنی بلندیاں اور زبان و بیان کی خوبیاں اس قدر تھیں کہ ان کا کلام اپنا وکیل خود تھا میں زیادہ ان سے قریب نہیں رہا اور نہ زیادہ کلام سننے کا اتفاق ہوا اور جتنا سنا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے اور قادرالکلام شاعر تھے۔

نثار جاذب ترین

کیپٹن نثار احمد خان جاذب' ڈاکٹر نثار صاحب نوجوان شاعر اور افواج پاکستان میں شعبہ صحت سے متعلق ہیں قدیم سانچوں یعنی بقید و بحر و قوافی نہایت اچھی غزل کہتے ہیں۔اس پر ان کی سحر آگیں آواز کا ترنم اسے اور بھی جان لیوا بنا دیتا ہے۔ ہر چند کہ انہیں مصروفیت کار مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی لیکن میں یہ کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ان میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے اور مطالعہ ہر عالم میں ممکن ہے۔اگر ایسا نہ ہوا تو یہ ان کا نہیں اردو زبان کا نقصان ہوگا۔

پروفیسر جلیل احمد (بہاولپور)

پروفیسر جلیل یوں تو انگریزی کے آدمی ہیں لیکن مادری زبان اردو ہونے کے علاوہ بڑے بڑے اساتذہ کے قریب رہے ہیں اس لیے اردو' فارسی میں بھی انہیں بڑی مہارت ہے انگریزی کا فاضل انسان بڑی مشکل سے مسلمان ہوتا ہے مگر جلیل صاحب نے ایک دفعہ رخ بدل لیا اور اب وہ باشرع مسلمان ہیں اور ان کا احترام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پہلے تو ان کی نظر صرف تنقید و ادب پر ہی تھی مگر اب طریقت و شریعت کا ہر گوشہ ان کی نظر پر بے نقاب ہے۔ اب ہمیں امید ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں گے ڈھب کی چیز لکھیں گے ہمیں ان سے بڑی امیدیں ہیں۔ خدا کرے وہ غلط ثابت نہ ہوں۔

ابراہیم جلیس

جناب ابراہیم جلیس اعلیٰ درجے کے ادیب اور صحافی ہیں ان کے پیدا کردہ ادب میں زندگی کو جگانے اور دماغوں کو بیدار کرنے کی قوتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔صحافت میں بھی ان کا مقام معمولی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فضا ان کی حقائق نگاری کے لیے تنگ ہے اور ابھی یہاں وہ موسم نہیں آیا کہ ہر شخص کو اپنی کہنے کا حق حاصل ہو اصل میں جلیس کو ابھی وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں حالانکہ ملک اور قوم کے لیے ایسے ادیبوں کا وجود رحمت ہوتا ہے ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں میرے الفاظ کی تائید ملے گی۔

سید محمد جعفری

سید محمد جعفری میرے ان دنوں کے کرم فرما ہیں جب میں لاہور میں شملہ پہاڑی پر چوکیداری کرتا تھا اور وہ مطالعہ کے لیے وہاں آیا کرتے تھے وہ آج بھی مجھ سے اسی خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں اور وہی نہیں ان کا سارا خاندان مجھ سے ایک خاص ربط رکھتا ہے۔ جعفری صاحب کی شاعری میں جو طنز و مزاح کا رنگ نمایاں ہے اس میں جہاں ہونٹوں پر تبسم آتا ہے وہیں معاشرہ کی اصلاح کی طرف بھی نظر جاتی ہے اور اس طرح ان کی شاعری ملک اور قوم کے لیے ایک پیغام ہے۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ انہیں چاہئے کہ اس پر ایک گہری اور ناقدانہ نظر ڈال کر جلد سے جلد چھپوا دیں۔

جابر الہ آبادی

جناب جابر الہ آبادی ریلوے کے دفتر میں مددی کے فرائض انجام دیتے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے اپنا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ نہ جانے انہیں مطالعہ کا ذوق ہے یا نہیں۔ تاہم ان کے اشعار میں ایک زندگی پائی جاتی ہے اگرچہ پرانی روایتی شاعری کرتے ہیں لیکن غزلوں میں کیفیت اور موسیقی کی دھاریاں ملتی ہیں کاش یہ روایتی دائرہ سے نکل کر جدید طریق فکر تک آجائیں۔

جمیل الزماں

جناب جمیل الزماں صاحب ادارہ تعلقات عامہ کے ایک ذمہ دار عہدہ پر ہیں قدرت نے انہیں بڑا سلجھا ہوا ذوق عطا کیا ہے انہیں اصناف سخن و ادب پر بڑا عبور ہے اور تنقید و تبصرہ کے اصول و ضوابط پر بھی بڑی گہری نظر ہے۔ وہ نہایت اچھے صحافی اور مبصر ہیں نثر نگاری میں ان کا ایک خاص انداز ہے جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے ایسے لوگوں کو تصنیف و تالیف میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کیونکہ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ جمیل الزماں صاحب سے ہمیں مایوسی نہیں ہوئی وہ کبھی نہ کبھی کوئی خاص اور کارآمد کتاب دیں گے۔

افتخار جالب

نئے لکھنے والوں میں جناب افتخار جالب بھی ایک حیثیت اور ایک مقام کے مالک ہیں۔ یہ تو الگ بات ہے کہ وہ بسیار نویس ہیں اور انسانی زندگی اس قدر تیز رو ہے کہ کسی طرف ٹھہر کر نہیں دیکھتی لیکن لٹریچر بعض اوقات اپنے مطالعہ پر مجبور کر دیتا ہے۔ افتخار جالب کے کلام سے ان کے مطالعہ اور شعور و آگہی کا پتہ ضرور چلتا ہے اور وہی چاشنی متین قسم کے لوگوں کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن ان کے ہم عصر جو افتخار جالب کو مہمل قرار دیتے ہیں۔ کبھی خود پر تنقیدی نظر نہیں ڈالتے۔

جیلانی کامران

جیلانی کامران گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار ہیں اور بڑی بلند پرواز خوبیوں کے نوجوان ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں انہیں مہارت ہے اور جدید شعر کہتے ہیں۔ ان کے شعر معانی و مطالب سے خالی نہیں ہوتے لیکن یہ ماحول اس شاعری سے آشنا نہیں اور بے مقصدی شاعری کرنے والے شعراء نے بامقصد شاعری کے رستے میں بھی پھاٹک لگا دیئے ہیں۔ جیلانی کامران کا تنقیدی شعور بھی نہایت بلند ہے۔ وہ مغربی تصورات کے سائے میں ضرور بات کرتے ہیں لیکن اپنے اسلوب نگارش سے وہ اس ماحول کے لیے بھی اسے قابل عمل بنا دیتے ہیں۔

جمیل نقوی امروہوی

جناب جمیل نقوی نہایت اچھے اور قابل قدر ادیب ہیں چونکہ انہیں لائبریری کے فن میں بڑی مہارت ہے اس لیے اگر ذوق ادب کے ساتھ معلومات کا جنون بھی ہو تو پھر کارناموں میں کھوکھلی چیز نہیں آنے پاتی۔ جمیل نقوی صاحب کا مطالعہ وسیع اور مشق و مزاولت قابل قدر ہے علاوہ ازیں وہ ابھی نوجوان ہیں اور ان کی ترقی کے انتظار میں زریں مستقبل چشم براہ ہے۔ یوں تو کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں لیکن ابھی کوئی خاص کارنامہ نہیں اور اس کے لیے عمر اور بصیرت درکار ہے جو فرصت کے انعامات ہیں۔

جعفر عباس سہارنپوری

جناب جعفر عباس صاحب' جعفر سہارن پوری اچھے اور نغز گو شعراء کی صف میں تھے میں نے اکثر انہیں مشاعروں اور پرائیویٹ نشستوں میں سنا ہے- میری نظر میں بلاشبہ اساتذہ عصر کی سطح کے آدمی تھے ان کے کلام میں پختگی اور برجستگی ایسی گتھی ہوئی ہے کہ لامحالہ زبان سے داد و تحسین نکلتی ہے- افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام نہیں چھپا- حالانکہ وہ صاحب حیثیت انسان تھے اور انہوں نے کچھ کم جائیداد نہیں چھوڑی- کاش کوئی ان کا مجموعہ چھپوادے' یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی-

جعفر شیرازی

جناب جعفر شیرازی ساہیوال میں ہیں اور بسلسلہ ملازمت کسی ادارہ سے منسلک ہیں- جدید رنگ میں بڑی مشق اور مہارت تامہ ہے- کم کہتے ہیں لیکن خوب کہتے ہیں- ان کے یہاں جدید رنگ قابل قبول ہے اور ایسے ہی لوگ اپنے خطوط کو گہرا کرتے ہیں- ان کا انداز بیان اچھوتا اور عام فہم ہے یہ اپنے اسلوب سے شعر کو شعر کرتے ہیں اور سچ پوچھئے تو اسی کا نام شاعری ہے جعفر شیرازی کی صنعت شعر قبول و مقبول ہے اور نیا تذکرہ نگار انہیں رد نہیں کرسکتا- ان کا مجموعہ کلام ''ہوا کے رنگ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے-

جمیل مہدی دیوبند

جمیل مہدی نوجوان شاعر ہیں اور وہ نہ تو قدیم روش شاعری سے ہٹے ہیں اور نہ جدید کے حسن سے منکر ہیں- چنانچہ ان کے اشعار بھی ایسے ہی رخ کے ہوتے ہیں جن میں دونوں رخ ملتے ہیں اور یہ آمیزہ اکثر اوقات کلام کو قوس قزح بنا دیتا ہے- اور ان کی شاعری کی عظمت سے نہ تو قدیم روش کے لوگ انکار کرتے ہیں اور نہ جدید دور کے جدت پسند- جمیل مہدی ابھی نوجوان ہیں ان کے لیے ترقی کے بڑے مواقع ہیں خدا کامیاب کرے- آمین

جلیل قدوائی

جناب جلیل قدوائی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ شملے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے متعلق تھے اور قریب سے انہیں دیکھنے اور پڑھنے کا موقع اس وقت ملا جب ہم دونوں نے دہلی سے دکن تک سفر ساتھ کیا وہ جہاں شاعر ہیں وہیں نثر میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور ان میں استادانہ صلاحیتیں بے تاب رہتی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں جو ان کی شاعری کا معیار قائم کرتی ہیں وہ آج کل انجمن ترقی اردو کراچی سے منسلک ہیں اور دوستوں سے آج بھی ان کا وہی خلوص ہے جو پہلی ملاقات میں تھا۔

جوہر ڈبائیوی

جوہر ڈبائیوی ضلع علی گڑھ کے رہنے والے ہیں لیکن ایک عرصہ سے بھکر میں مقیم ہیں نہایت کہنہ مشق اور زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے شاعر ہیں ہر چند کہ ان کی ضعیفی ہے لیکن ابھی تک وہ ترنم سے شعر پڑھتے ہیں ان کا مجموعہ کلام "بادہ کہن" نام سے چھپ چکا ہے جس میں ان کے استادانہ پہلو اور ماہرانہ انداز بیان جگہ جگہ نظر گیر ہو جاتا ہے۔ ان سے گفتگو کر کے بھی صاحب احساس انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے کچھ مل رہا ہے۔

معین احسن جذبی

معین احسن نام جذبی تخلص جذبی بھی میرے قدیم کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ انہوں نے عربک کالج دہلی سے بی۔اے کیا پھر تلاش معاش میں بمبئی چلے گئے اور کئی جگہوں پر ملازمتیں کیں آخر پھر علی گڑھ سے ایم اے کر کے "آج کل" کے دفتر میں آ گئے یہاں سے علیحدہ ہوئے تو علی گڑھ میں لیکچرار ہو گئے اور اب تک وہیں ہیں۔

فن کی ابتدائی منزلیں کئی ایک اساتذہ کی رہنمائی میں طے کر کے اپنا ایک علیحدہ رنگ اختیار کیا اور وہ مقبول ہوا۔ میں نے بہت سے مشاعرے جذبی کے ساتھ پڑھے ہیں وہ ہر جگہ مقبول ہوئے۔ غزل ہو یا نظم جذبی اپنے مخصوص انداز بیان سے الگ نہیں ہٹتے اور ان کا اعلیٰ درجہ کا کلام ان

کی دردناک آواز میں ڈھل کر چنگاریاں دینے لگتا ہے۔ وہ نظم میں غزل جیسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور غزلوں میں جب چاہتے ہیں راگنیوں کا لوچ بھر دیتے ہیں وہ غم روزگار میں غم عشق کی چاشنی دے کر اسے بھی قابل برداشت بنا لیتے ہیں وہ اپنے کلام میں زندگی کی قنوطیت سے بچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا دھیما دھیما ترنم اسے ابھار لاتا ہے اور اس سے ایک ایسا تاثر مرتب ہوتا ہے جو براہ راست ذہنوں پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ اپنے کلام میں زندگی کی پیچیدگیوں کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ دشمن بھی داد و تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جذبی زود گو شاعر نہیں لیکن وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور ان کا انداز بیان نہایت سنبھلا ہوا ہوتا ہے چونکہ وہ زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں اس لیے جذبات نگاری کو ان کے یہاں مناسب الفاظ کی کمی محسوس نہیں ہوتی ان کے کلام کا تاثر خلوص اور سچی عکاسی پر ہے۔

جذبی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہیں لیکن ان کے یہاں دوسرے لوگوں کی طرح اکھاڑ پچھاڑ نہیں وہ انقلاب کی بنیادیں بھی جمالیاتی مسالے سے اٹھانا چاہتے ہیں اس کے ثبوت کے لیے ''فروزاں'' میں کئی ان کی شاہکار نظمیں ملتی ہیں۔

جوہر نظامی

جوہر آباد میں رہتے ہیں اور سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں۔ غزلیں اور قطعات دونوں پر انہیں قدرت ہے لیکن غالباً ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

حسن اختر جلیل

جناب حسن اختر جلیل بھکر (میانوالی) میں ہیں اور غزل کے شاعر ہیں مگر وہ قدیم رنگ تغزل سے ہٹ کر جدید خطوں پر شاعری کرتے ہیں اور اجتہاد کی طرف راغب ہیں۔ کمال یہ ہے کہ یہ ادب کے کئی بے تاب چشمے بھکر کی بے حس اور افسردہ زمین سے ابلے ہیں جو روایات کی حدود کو درہم برہم کر کے جدید ادب کو فروغ دے رہے ہیں اور ان نئی صفوں میں ان کے تذکرے ہیں۔ جو روایات اور موسیقی دونوں کو بیان کے راستے میں پھاٹک خیال کرتے ہیں۔

جون ایلیا

جناب جون ایلیا حضرت رئیس امروہوی کے بھائی ہیں ظاہر ہے کہ ذوق ادب انہیں ورثہ میں آیا ہے۔نظم اور غزل دونوں اصناف پر انہیں عبور ہے اور اپنے رسالہ ''انشاء'' میں بھی ان کی محنت اور کاوش قابل قدر ہے اور وہ اس طرح اردو زبان کی قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جوان آدمی ہیں اور ابھی ان کے سامنے ترقی کے لیے بڑا میدان ہے میں ان کے مستقبل کے لیے دعا گو ہوں۔

جوہر دہلوی

جناب جوہر دہلی میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قرب و جوار میں رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو دہلی کی زبان کا ماہر اور محلاتی اردو کا نباض ہونا چاہئے۔عقیدہ کے اعتبار سے وہ تصوف کی طرف گامزن ہیں اور جناب صادق دہلوی کے معتقدین میں گنے جاتے ہیں۔غزل صاف کہتے ہیں اور کہیں جھول یا سلوٹ نہیں آتی۔قدیم رنگ کے شاعر ہیں اور جدید مسائل کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

جام گورکھ پوری

جناب جام گورکھ پوری دھرم پورہ لاہور میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی مشاعروں میں دکھائی دیتے ہیں اب تک جوان سے سنا اور رسالوں میں پڑھا وہ ضرور اس قابل ہے کہ انہیں سراہا جائے لیکن اس سے زیادہ ان کے کسی ادبی پہلو پر کچھ کہنا ذرا دشوار سی بات ہے کیونکہ ان سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔اور وہ بھی رواروی کو اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اچھے شاعر ہیں اور ایسے شاعر کو نظر انداز کرنا ناانصافی ہے۔

میاں جمال محمد شاہ

پئی کلیانہ ضلع کرنال میں صاحب باوقار لوگوں میں تھے تقسیم کے بعد جھنگ میں آکر آباد ہو گئے تھے جھنگ روڈ پر آستانہ جمال کے نام سے مکان ہے۔قدیم رنگ میں نہایت اچھا شعر کہتے تھے اور بڑے ہی پرگو تھے پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک درویش تھے اور

درویش بھی عبادت ریاضت کے عادی ان کا کلام ان کی اولاد کے پاس ہوگا لیکن نہیں معلوم قدرت نے انہیں یہ شعور بخشا ہے یا نہیں کہ علم اور عالم دونوں کی امانت ملک اور قوم کی امانت ہوتی ہے۔

جمیل رام پوری

تقسم کے بعد پاکستان آگئے اور لائل پور میں مقیم ہیں غزل نہایت ستھری کہتے ہیں اور زبان کے اعتبار سے ان کے اشعار میں انوکھا پن ہوتا ہے۔ وہ جذبات کے ساتھ بیان کے لیے مناسب الفاظ کا ذخیرہ بھی رکھتے ہیں۔ ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

جمیل صدیقی (ملتان)

جمیل صدیقی صاحب مولانا آزاد سبحانی صاحب کے صاحبزادے ہیں آزاد سبحانی صاحب سے صرف میں ہی نہیں ملک بھر ان کے علم و ادب اور کردار و اخلاق سے آگاہ ہے۔ جمیل صاحب کو ذوق ادب ورثہ میں ملا اور ان کی طبیعت بھی کند نہیں نثر اور نظم دونوں میں آہستہ خرام سہی مخرام تک نوبت نہیں اچھا خاصا شعر کہتے اور نثر لکھتے ہیں لیکن بنک میں ملازم ہیں اور علم الاعداد کی رٹ دن رات انہیں ضرب و تقسیم سے نہیں نکلنے دیتی اس لیے نثر ہو یا نظم بے مشقی کی نذر ہو رہی ہے اور اس چکی میں یہی نہیں ملک کی بہت سی صلاحیتیں ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں۔

جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو بڑے صاحب ذوق انسان تھے انہوں نے جو کتابیں لکھیں ہیں ان سے ان کی علمی قابلیتوں اور معلومات کا پتہ چلتا ہے وہ اردو اور انگریزی کے ایک صاحب طرز ادیب اور اونچے درجے کے صحافی تھے۔ انہیں اردو سے محبت تھی اور وہ اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے اور اس کے باوجود ہندوستان میں ان کا کوئی مخالف نہیں تھا۔ ایسا مخلص اور سیاسی رہنما ہندوستان میں اب پیدا نہیں ہوگا۔ ان کی کتابیں ان کی ادبی عظمت اور تاریخ ان کی سیاسی بصیرت کی گواہ رہے گی۔

مصطفیٰ علی جوہر

پہلی ملاقات آپ سے عاشق حسین اکبری مرحوم کے یہاں ہوئی وہاں انہوں نے ایک مختصر تقریر کی اور اس کے بعد ان سے کئی روز مسلسل ملاقاتیں رہیں وہ بڑے اچھے فاضل اور صاحب مطالعہ انسان ہیں شعروادب سے بھی انہیں بہت اچھی آگاہی ہے۔ سب سے اچھی بات ان میں یہ ہے کہ وہ دوسرے واعظین' ذاکرین اور بالشتیے علماء کی طرح پایاب اور یبوست مآب نہیں بلکہ نہایت خوش خلق' خوش ذوق' خوش طبع اور خوش مزاج بزرگ ہیں ان کی صحبت اکتادینے والی نہیں اور نہ ان کی گفتگو دل آزاری کی طرف مڑتی ہے۔ ایسے ہی مبلغ کامیاب رہتے ہیں۔

جعفر شاہ پھلواروی

مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری شریف کے ایک معزز تاریخی اور علمی خاندان کے فرد ہیں وہ خشم قسم کے مولوی نہیں بلکہ ان کی نظر موجودہ تہذیب' معاشرت اور اس کے معائب ومحاسن پر بھی ہے اور ان کے قلم سے جو کتابیں نکلی ہیں ان میں بھی ان کی جدت پسند طبیعت اور موجودہ رجحانات کی رغبت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ نہایت وسیع الخیال اور زمانہ شناس انسان ہیں وہ صرف ماضی کو نظر میں نہیں رکھتے بلکہ ان کی نظر میں حال کے تقاضے بھی ہیں اور ان پر وہ سیر حاصل تقریر وتحریر کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حکیم جلیل احمد مرحوم

حکیم جلیل احمد مرحوم ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے لاہور میں طبیہ کالج کے پرنسپل اور عربی کے منتہی لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ انتہادرجے کے خلیق اور ملنسار ہونے کے علاوہ دوستوں کے دکھ درد میں کام آنا ان کی فطرت تھی فن طب پر ان کی بیسیوں کتابیں موجود ہیں جو ان کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں اور ان کا ہنستا ہوا چہرہ ذرا سے تصور سے سامنے آجاتا ہے میں نے ایسے عظیم کردار کے بہت کم لوگ دیکھے ہیں۔

حسرت موہانی

سید مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی کے ساتھیوں میں تھے اور مصلحین قوم کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں اوائل عمری ہی سے سیاسی رجحانات تھے چنانچہ شروع شروع میں علی گڑھ کالج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے بعد انہوں نے ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا اور اپنی افتادِ طبع کے باعث صعوبت زندان بھی اٹھائی کیونکر نظریات سے چل کر عمل تک آ گئے تھے۔ چنانچہ سودیشی تحریک کے زبردست حامی تھے اور زندگی بھر اپنے وطن کی چیزیں استعمال کیں اور غیر ملکی اشیاء سے کوئی تعلق نہ رکھا۔

جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ قدامت پرست اور روایت پسند سنیوں اور طریقت کے رسیا صوفیوں کی طرح رہتے تھے ان کی آرزو اور تمنائیں محدود اور قناعت واستغنا اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ انہیں ایک درویش بھی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بڑے سادہ مزاج صلح کل، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور غرور پندار سے کوسوں دور تھے۔ وہ جہاں محب وطن تھے وہیں ایک عظیم انسان بھی تھے لکھنؤ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

مجھے ان کے ساتھ کئی ایک مشاعرے پڑھنے کا شرف رہا ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ غزل کی حد تک اور اپنی انسانیت کی اقدار کے باعث وہ غزل میں ان خطوط تک نہیں گئے جو کفر والحاد کی حدود میں آ ملتے ہیں ان کی یہی خصوصیت انہیں تاریخ ادب میں ہمیشہ کے لیے زندہ رکھے گی۔

حسرت نے غزل کے نزع میں اسے آب حیات دیا ہے ورنہ اس دور کے لکھنوی اساتذہ نے غزل کا رخ ایسے ڈھلوان کی طرف کر رکھا تھا جو زمین میں جا کر زمین کی خوراک ہو جاتا ہے۔

حسرت نے ایک معتدل انداز میں ادب کو غزل کا وہ اسلوب دیا جو اب تک اسی آب وتاب سے چلا آ رہا ہے اور تمام ترقی یافتہ ادب اسی کا سہارا لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔

شاعری میں حسرت تسلیم کے شاگرد کہلاتے ہیں۔ لیکن بعض معتبر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے ہادی علی خان وفا رام پوری سے بھی اصلاح لی ہے لیکن یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں ہے وہ نہ جانے کتنے ہی اساتذہ فن سے متاثر ہوئے ہیں اور اس کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں کہ

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

مگر اس اعتراض کے باوصف ان کی انفرادیت ضائع نہیں ہوتی ان کا رنگ شعر ایک ایسی شان رکھتا ہے کہ وہ اس دور میں تنہا معلوم ہوتے ہیں۔

حسرت کی غزل انسانی حسن اور اس کے خدوخال کی شاعری ہے اور ان کا تمام تر تصور نسوانی حسن کے تاثرات کا حامل ہے جو اس دور کے اساتذہ سے علیحدہ ایک شاہراہ ہے۔ جس کے نکاس میں حسرت کا ہاتھ بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور کے بعض بعض اساتذہ کے یہاں نسوانی حسن کا تصور ملتا ہے لیکن حسرت کے یہاں اشعار کا سانچہ ہی جدا ہے۔ جس میں حسن تو ہوتا ہے مگر ہوس کی آگ نہیں ہوتی۔

تغزل کے علاوہ حسرت کو زبان پر جو عبور تھا وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں انہوں نے ''اردو معلیٰ'' سے جو ادب کی خدمت انجام دی ہے وہ اردو دنیا میں زندہ و پائندہ رہے گی۔ ان کی غزل میں جاذبیت اس لیے بھی ہے کہ وہ زبان کے ہر گوشے اور اس کی نزاکتوں کا احساس رکھتے ہیں اور غزل کو وہی الفاظ دیتے ہیں جو غزل میں موقع اور محل کا تقاضا ہوتا ہے۔

انہوں نے اساتذہ کے دواوین کا انتخاب بھی شائع کیا اور اس عمل سے ایسے ایسے استادوں کو زندگی کے میدان میں لے آئے جنہیں زمانہ گرد و غبار کے انبار میں دفن کر چکا تھا۔ اصلاح زبان پر بھی حسرت کا کام کم نہیں ہے۔ ان کے رسالے ''معائب سخن'' محاسن سخن اور متروکات سخن ایسی یادگار ہیں جن سے اردو زبان روز بروز ترقی وصحت کی طرف گامزن ہے۔

حفیظ جالندھری

محمد حفیظ' حفیظ جالندھری جب سے شاعری کے میدان میں آئے انہیں شاعر پایا اور ایسے شاعر جو اپنے ترنم سے ایسا مسحور کرتے تھے کہ مشاعرہ باغ کی ٹہنیوں کی طرح جھومتا نظر آتا تھا۔ ان کی غزلیں بڑے اچھے اور سیدھے سادے انداز کی تھیں جو صحیح معنی میں غزل کہلا سکتی ہیں لیکن جوں جوں ملک میں تعلیم بڑھتی گئی اور لوگوں میں شعور ادب پیدا ہوتا گیا یہ تغزل سے ہٹ کر اصلاحی اور اخلاقی شاعری کی طرف آتے گئے اور پھر شاہنامہ کی مستقل تصنیف ان کا کارنامہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں وہ سائنگ پلبنی آرگنائزیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے اور عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے تقسیم ہند کے بعد حکومت پاکستان میں آزاد کشمیر کی خدمات پر مامور ہوئے اور پلبنٹی کے کام کی نگرانی کرتے رہے۔لیکن ان تمام مصروفیات کے باوصف ان کی شاعرانہ فطرت میں وہی رنگینی اور برجستگی رہی۔

حفیظ نے نہایت اچھے گیت تخلیق کیے ہیں اگر کہیں یہ صرف گیت ہی تخلیق کرتے رہتے تو ادب کی بڑی کمی پوری ہو جاتی اب بھی ان کی غزلیں اور گیت لوگوں میں اسی طرح داد پار ہے ہیں۔حفیظ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان میں بھی ان کا سلیقہ اور طباعی بولتی ہے لیکن وہ انہیں بھی چھوڑ گئے کیونکہ ان کے پیش نظر شاہ نامہ تھا جس سے دین اور دنیا دونوں میں کام چلتا ہے''نغمہ زار'' کے علاوہ حفیظ کے دو مجموعے ''سوز و ساز'' اور ''تلخابہ شیریں'' طبع ہوئے ہیں لیکن ہم انہیں شاہنامہ جیسا شاہکار خیال نہیں کرتے۔

آغا حشر کاشمیری

یوں تو آغا حشر ڈرامے کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر بھی اعلیٰ پائے کے تھے۔اس میں شک نہیں کہ انہوں نے فن ڈرامہ کو بہت کچھ دیا جس کی ہمارے ادب کو ضرورت تھی لیکن اگر وہ اتنی توجہ ادب و شعر کی طرف دیتے تو بھی اعلیٰ پایہ کے فنکار ہوتے۔ان کی شاعری معمولی درجے کی شاعری نہیں وہ کم ضرور کہتے تھے لیکن بڑے پختہ گو شاعر کی طرح کہتے تھے ان کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں ان کی شاعری میں رنگ و روغن کا کام دیتے تھے اور خیال شعر کی توانائی اور ریڑھ کی ہڈی قرار پاتا تھا۔

حسین میر کاشمیری

جناب حسین میر کاشمیری خضر صورت انسان مگر بڑے زندہ دل اور خوش مذاق کے ساتھ خوش ذوق وہ عربی کے فاضل تھے لیکن شامت اعمال انہیں صحافت میں لے آئی تھی اور وہ مختلف اخبارات میں کام کرتے تھے پیروڈی کے ماہر تھے ان سے زیادہ کلام نہ سنا نہ دیکھا اس لیے کہا نہیں جاسکتا کہ وہ نظمیں ان سے کس طرح سرزد ہو گئیں وہ تو ایک عالم تھے اور معمر ہونے کے باعث ان کی نظر میں

سیاست کے مختلف ادوار بھی تھے اور انہی کے بل پر وہ اخبارات میں چل رہے تھے۔

حمید احمد خان

جناب حمید احمد خان صاحب علم و آگہی کے اعتبار سے قابلِ رشک شخص ہیں اور چونکہ وہ ایک علمی خاندان کے فرد ہیں اس لیے اول سے اسی فضا میں رہے ہیں ان کی یہی قابلیت انہیں وائس چانسلری تک لے آئی لیکن یہ عہدہ ان کے لیے طرۂ امتیاز نہیں انہوں نے آج بھی اپنے دروازے کی تختی پر ''پروفیسر حمید احمد خان'' لکھوا رکھا ہے۔ وہ اصل میں تعلیمی انسان ہیں اور تصنیف و تالیف ان کا میدان ہے۔ وہ ملک و ملت کے خیر خواہ ہیں اور ان کا ہر خیال اور ہر نظریہ اس کی بہبود کے گرد گھومتا ہے۔ حمید احمد خان ایک خاص طرزِ نگارش کے مالک ہیں جس میں تحقیقی انداز بھی ہے اور جراتِ بیان بھی اور ایسے آزاد قلم لوگ ہمارے یہاں بہت کم نظر آتے ہیں۔

حبیب اللہ خان سعدی

جناب حبیب اللہ سعدی میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں کالج کے زمانے سے انہیں ترجموں کے علاوہ تصنیف و تالیف کا ذوق تھا لیکن کالج ہی سے وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق فوج میں چلے گئے تھے۔ لیکن وہ افسری انہیں زیادہ دنوں راس نہ آئی کیونکہ پہلے ہی سے ان کے دل و دماغ میں قوم و وطن کی بہبود کا شعلہ سرکش ہو چکا تھا اور اسی کی روشنی میں وہ خاکسار ہوگئے تھے اس قیادت کے جنون میں انہوں نے پمفلٹ تو کئی لکھے لیکن میری توقع کے مطابق ابھی تک کوئی خاص اور اہم ترجمہ یا تالیف ان کے نام سے نہیں آئی۔ ہمارے معاشرہ کے کئی پہلو مفید روشنی کے محتاج ہیں۔

مرزا حیدر بیگ

مرزا حیدر بیگ سے بمبئی میں تعارف ہوا وہ وہاں طبیب تھے اور ان کے یہاں اکثر اہلِ علم و ادب کی نشستیں رہتی تھیں وہ قدیم رنگ میں روایتی غزل ضرور کہتے تھے لیکن ان کے یہاں شعر میں عیوب نہیں تھے وہ قاعدہ کے مطابق فنی پستی و بلندی کا امتیاز رکھتے تھے۔ سنا ہے کہ بمبئی ہی میں انتقال

ہو گیا نہ جانے کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری

شیخ عبدالحفیظ سلیم حفیظ ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں اور میرے ساتھیوں میں ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا اور علمی ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے میاں بشیر احمد سیکرٹری انجمن اردو پنجاب کے ساتھ نائب معتمد کی حیثیت سے کچھ عرصہ گزارا اور آل انڈیا ریڈیو لاہور سے وابستہ ہو گئے آج کل کراچی میں مہتمم اعلیٰ کی حیثیت سے مقیم ہیں۔

حفیظ صاحب اوائل سے شعر کہتے ہیں اور اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں ریڈیو نے ان کے فن کو اور بھی چمکا دیا یوں تو انہوں نے روائتی طور پر اپنے بھائی راحل صاحب سے اکتساب فیض کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفیظ میں شاعری کے بڑے جاندار جراثیم ہیں۔

اگرچہ انہیں کالج کے زمانے میں جناب صوفی تبسم اور جناب سید احمد شاہ بخاری سے بھی اکتساب کا موقع ملا لیکن جب تک اندر کچھ نہ ہو اس وقت تک تربیت بھی بیکار رہتی ہے اور کالج میں پوری جماعت سے توجہ ہٹا کر کسی ایک طالب علم کی طرف کون ایسی محنت کرتا ہے کہ جس سے مستقبل میں پھول آ جائیں۔ یہ تو ایک فطرت کا انعام ہے جسے چاہے نواز دے۔

حفیظ یوں تو اصناف سخن میں ہر صنف پر حاوی ہیں لیکن میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ صرف غزل کے لیے پیدا ہوئے ہیں آج ہمارے پورے ماحول میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو غزل میں حفیظ کی صف میں آ سکتے ہوں۔

حفیظ کی غزل میں تغزل تو ہے ہی ان کے یہاں انداز بیاں میں ایسی ندرت ہے کہ پڑھنے والا داد و تحسین پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ سنجیدگی اور شائستگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور غم جاناں کا سہارا لے کر غم دوراں کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

انہیں اردو فارسی پر برابر کا عبور ہے اور انہوں نے دونوں زبانوں کے اساتذہ کو غور سے پڑھا ہے اس لیے ان کے یہاں اظہار خیال کا سلیقہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

وہ نظموں میں بھی کسی سے کم نہیں ان میں بھی وہ نظم کی تمام شرائط کے ساتھ نظم کہتے ہیں۔ اردو

اور فارسی کے علاوہ جہاں ہندی الفاظ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں ہندی سے بھی ان کا لگاؤ ظاہر ہوتا ہے اور موقع محل کے اعتبار سے ایسے بچے تلے الفاظ آتے ہیں کہ شاعر جو چاہتا ہے وہ کہہ کر مطمئن معلوم ہوتا ہے اور سامع جس طلب کے حامل ہوتے ہیں انہیں وہ مل جاتا ہے۔

شان الحق حقی دہلوی

حقی صاحب دہلی کے ایک علمی ادبی خاندان کے فرد ہیں اور اول سے علم و ادب ہی سے دلچسپی رہی ہے وہ آج کل انفارمیشن کے بڑے افسر ہیں لیکن ان کا علمی ادبی معیار ان کی اصل بڑائی ہے۔ وہ نثر اور نظم ہر دو پر گہری نظر رکھتے ہیں اور زبان کے معاملے میں بڑے بڑے جغادری ان کا لوہا مانتے ہیں۔ غزل میں ان کا ایک زاویہ نظر ہے اور اس میں مخدوفات کا حسن اس بلا کا ہوتا ہے کہ دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعی تاثر انسانی کردار پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے۔ القصہ ان کے یہاں وہ بے معنی اشاریت اور الجھا ہوا ابہام نہیں ہوتا جو شعر کو بجھاوت بنا دیتا ہے۔ حقی صاحب شعر کے اصول و ضوابط سے آگاہ ہیں اور زبان اردو کو اتنی تہی دامن خیال نہیں کرتے کہ حرف بیان کے لیے نئے اور نامانوس سانچے ایجاد کیے جائیں۔

حمید نظامی

جناب حمید نظامی کو میں اول سے جانتا تھا وہ خود ساز قسم کے انسان تھے اور یہ جس قدر سیلف میڈ انسان ہوتے ہیں ان میں درمیانہ درجے کے بہت کم ملتے ہیں یا تو انتہائی پست ہو جاتے ہیں یا انتہائی بلند جو خوشامد اور زبوں کاری سے ترقی کرتے ہیں وہ اخلاقی پستیوں میں اتر جاتے ہیں اور جو جدوجہد کے زینوں سے بلند ہوتے ہیں وہ چاند ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں۔ حمید نظامی صاحب ہمت، صاحب عزت، صاحب جرأت اور صاحب اوصاف انسان تھے ان کی زندگی اور ان کی صحافت ان کے لیے مشاہیر کے پہلو میں جگہ پیدا کرتی ہے اور دنیائے صحافت میں وہ اپنے علم و عمل سے ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی موت ایک نقصان سہی مگر ایسے لوگ مرتے نہیں۔ وہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

حامد سعید خان حامد

حامد سعید خان بھوپال کے اعلیٰ طبقے کے انسان تھے اور شعراء میں انہیں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نہایت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے اور خصوصاً غزل ان کا میدان تھا ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن مجھے امید ہے کہ ان کے صاحبزادوں نے ان کے کلام کو محفوظ کر لیا ہوگا۔ کیونکہ وہ خود بھی شاعر ہیں اور ادب کی قیمت کو سمجھتے ہیں۔

حامد علی خان

جناب حامد علی خان صاحب حامد کا مولد کرم آباد (پنجاب) ہے اور آپ مولانا ظفر علی خان کے برادر خورد ہیں مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد وہیں لیکچرار بھی رہے ہیں جب وہاں سے پنجاب آئے تو یہاں آ کر منشی فاضل اور ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو ہمایوں کی ادارت کے فرائض سپرد ہوئے اور جب تک یہ لاہور رہے ''ہمایوں'' ملک کے موقر جریدوں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ آپ نہایت خلوت پسند انسان ہیں اور کسی سے ایسے روابط نہیں رکھتے جو بے تکلفی کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آپ اردو سبھا لاہور کے معتمد بھی رہے ہیں اور انجمن اردو پنجاب کی طرف سے بھی نائب معتمد ہونے کی دعوت دی گئی تھی مگر آپ نے قبول نہیں کی۔

آپ نہایت جچا تلا شعر کہتے ہیں اور نہایت کامیاب ترجمہ کرتے ہیں چنانچہ ''افسانہ ہائے عشق'' انہی کے ترجمہ کیے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے جو ان کی قابلیت اور مہارت کا آئینہ دار ہے۔ ''حامد کے سو شعر'' کے نام سے ایک سو شعروں کا انتخاب بھی چھپا تھا جس پر جناب منصور احمد کا تبصرہ تھا۔

جناب حامد علی خان نہایت اچھی اور سنجیدہ غزل کہتے ہیں اور ان کی شاعری میں جدید رنگ نے جگہ نہیں پائی اور نہ ان کی غزل کو پڑھ کر جدید رنگ کی طرف طبیعت جاتی ہے جناب حامد علی خان نے اپنے کلام میں ایسے متین اور سنجیدہ گوشوں اور احساسات کو شعر میں ڈھالا ہے کہ ان کی قدرت کلام کو سراہنا پڑتا ہے۔

حامد علی خان اصل میں صحیح ادیب اور شاعر ہیں اور پھر اردو کے سلسلے میں آپ کی کوششیں بڑی

کامیاب ہیں - اردو زبان کی توسیع و اشاعت میں حامد علی خان صاحب کا بڑا ہاتھ ہے اور شاید اسی خیال سے وہ فرینکلین میں گئے ہیں اور جب سے حامد صاحب وہاں گئے ہیں اردو زبان کے اچھے اور کامیاب ترجمے شائع ہو رہے ہیں -

حمید نسیم

جناب حمید نسیم امرتسر کے رہنے والے ہیں عرصہ سے ریڈیو کے ادارہ سے منسلک ہیں غزل اور نظم انہیں دونوں پر عبور ہے پہلے پہلے تو زود گو رہے لیکن ریڈیو میں آ کر خلاف توقع کم گو ہو گئے - رسالوں اخباروں اور مشاعروں میں بہت کم ملاقات ہوتی ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ ضرور مرتب ہو چکا ہوگا کیونکہ ایک عرصہ سے کہہ رہے ہیں اور پھر علمی خاندان کے فرد ہیں میں نے ان کی جتنی غزلیں سنی ہیں انہیں ضرور چھپنا چاہیے وہ اپنی بلند خیالی کے ساتھ غنائی عنصر کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتے -

حافظ لدھیانوی

نوجوان شاعر ہیں اور کسی سرکاری ادارہ سے منسلک ہیں حافظ قرآن ہیں محنتی اور زیرک انسان ہیں غزل اور نظم دونوں میں برابر کی روانی ہے لیکن دیکھا جائے تو ان کی غزلیں نظموں سے آگے ملتی ہیں قدیم پیمانوں میں بادہ جدید ڈھال کر مشاعروں میں داد و تحسین لیتے ہیں - ان کی غزل پرانی حدود سے نکل کر نئی راہ ترقی کی طرف چل رہی ہے مگر اس میں تاثر جدید و قدیم دونوں سے زیادہ ہے ان کے شعر میں ایک سنجیدہ خیال اور نازک احساس ملتا ہے جس سے یہ اپنی کیفیت سامعین کے سینوں میں بھی منتقل کر دیتے ہیں ابھی کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا -

سید حسام الدین راشدی

جہاں تک اردو کی توسیع و اشاعت کا تعلق ہے سید حسام الدین راشدی کی ذات اس دور میں نعمت الٰہی ہے - چونکہ وہ خود علمی ادبی آدمی ہیں اس لیے شاعروں اور ادیبوں کی قدر کرتے ہیں انہوں نے اپنے قلم سے سیکڑوں مردوں کو زندہ کر دیا اور زندہ ادیبوں کو ان کا حقیقی مقام دلوایا ہے - وہ بڑے

فکر وخیال اور سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں ان میں شعور نظم کے ساتھ تنقید وتبصرہ کی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا کتب خانہ قابل دید ہے جس میں تذکرہ سوانح' تنقید و ادب اور اساتذہ کے دواوین کا بے بہا ذخیرہ ہے انہیں اردو' فارسی پر قابل رشک عبور ہے اور انگریزی میں بھی ان کی معلومات کم نہیں۔ وہ چند منٹ کی گفتگو سے اہل نظر میں اپنا تعارف کرا دیتے ہیں۔

عابد حشری

جناب عابد حشری پہلے لاہور میں تھے آج کل کراچی کے مشاعروں کو شاداب رکھتے ہیں۔ غزل کے شاعر ہیں اور عام راستوں سے بچ کے غزل کہتے ہیں اور ان کا ترنم اسے اور بھی دلآویز کر دیتا ہے انہیں خلوت وجلوت میں سننے کا اکثر اتفاق ہوا ہے ان کا اسلوب بیان اور طریق فکر ذاتی ہے اور کلام رنگینی اور دلکشی رکھتا ہے۔

حیات میرٹھی

جناب حیات بہاولپور میں مقیم ہیں اور ایک اخبار کے مدیر ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن ہے جو عموماً نازک احساس لوگوں کا جوہر ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے دل کی آواز نظم ہوتی ہے اور غزلوں میں ذہنی بیداری اپنا اعلان کرتی ہے اصناف سخن میں یہ کہیں بند نہیں۔ ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے یہ نثر میں بھی شاعری جیسے تیور رکھتے ہیں انہوں نے ایک تذکرہ بھی مرتب کیا ہے جو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے۔

حکیم نور الحسن واسطی حسنؔ

حکیم نور الحسن واسطی دہلوی حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہیں اور نواب شاہ میں مقیم ہیں غزل نظم اور مرثیہ لکھتے ہیں۔ قدیم معاشرے کے نیک لوگوں میں ہیں مجموعہ ابھی تک نہیں چھپا۔

حکیم سردار عالم حسامی مانک پوری

حسامی صاحب بڑے جید طبیب ہیں اور اعلیٰ پائے کے شاعر وادیب وہ غزل اور نظم دونوں میں مہارت رکھتے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی بلند نظری سے لکھتے ہیں انکی شاعری اگرچہ قدیم روش

کی ہے لیکن کارآمد اور اقدارِ تمدن کی محافظ! حسامی صاحب نہایت زندہ دل اور بلند ذوق انسان ہیں جوانی سے لے کر اب تک ان کی یارباشی یکساں معیار پر چلی آرہی ہے۔

حبیب تلونڈی

جناب حبیب تلونڈی بہاول نگر کے رہنے والے ہیں انہیں مشاعروں میں بہت کم دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ بہت سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔ اور ان میں وہ اغلاط نہیں پائے جاتے جن کی فن میں گنجائش نہیں وہ بہت سوجھ بوجھ کے مالک ہیں اور شاعری میں بہکتے نہیں۔ ادبی مرکزوں سے دور رہ کر بھی حبیب اچھے شعر کہتے ہیں۔

حیدر دہلوی

سید جلال الدین حیدر میرے پرانے کرم فرماؤں میں تھے وہ دہلی کے شعراء میں اپنی دھج کے تنہا شاعر تھے جو اپنی شاعری جیسی ہی خودداری بھی رکھتے تھے۔ انہیں اپنے کلام کی خوبیوں پر بڑا زعم تھا اور واقعی وہ بہت اچھا شعر کہتے تھے دہلی میں اکثر ان سے ملاقاتیں رہیں اور تقسیم کے بعد وہ لاہور آ گئے تھے لیکن یہاں کی زمین نے انہیں قبول نہیں کیا آخر دہلی شہر کا استاد کراچی کی خاک کا پیوند ہوا نہ معلوم ان کا کلام کس کے پاس ہوگا اڑتی سی خبر سنی ہے کہ مجموعہ ''صبح الہام'' کے نام سے چھپا ہے۔

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت صاحب ریاست پونچھ (کشمیر) کے رہنے والے تھے اور وہیں میٹرک تک ابتدائی تعلیم پائی اور اپنے والد سے فارسی اور عربی پڑھی اور لاہور سے بی اے کیا شروع میں کہیں معلمی کی لیکن ان کی فطرت میں تو شعر و ادب کا لاوا پرورش پا رہا تھا چنانچہ مدرسہ چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور اخبار نویسی شروع کر دی اور کلکتہ کے کئی اخباروں میں کام کیا۔ آخر میں جب وہ مولانا آزاد کے اخبار ''پیغام'' میں تھے تو مولانا ظفر علی خان کلکتہ گئے اور جب ان سے ملے تو اپنے کام کا آدمی خیال کر کے لاہور لے آئے لاہور میں انہوں نے مختلف اخبارات میں کام کیا لیکن جو انہیں ''زمیندار'' میں ظفر علی خان کی صحبت سے فیض ہوا وہ ان کے تمام عمر کام آیا۔ ریڈیو میں بھی ملازم رہے اور ریڈیو سے

دوسری جنگ عظیم ''فوجی اخبار'' کے ایڈیٹر ہو گئے- اس اخبار کی بدولت انہیں سیاحت کا موقع بھی ملا اور انگریزی صحافت نظر سے نکل گئی چنانچہ فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ مدیر ''امروز'' ہو گئے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو ریڈیو پاکستان کراچی میں قومی پروگرام کی ترتیب پر مامور ہو گئے اور پھر طبیعت کے لاابالی پن سے یہاں بھی مستعفی ہو گئے اور کمپنی میں ملازم ہو کر لاہور آ گئے- اسی اثنا میں انہیں دل کی شکایت ہو گئی مگر وہ اس علالت میں بھی لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے اور جون ۱۹۵۰ء میں راہی عدم ہو گئے-

حسرت صاحب بڑے ہی طباع اور فطین قسم کے انسان تھے شعر بھی کہتے تھے بہت کم لیکن جو کچھ کہتے تھے وہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر کہتے تھے اور حرف گیری کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے-نثر میں وہ اپنے طرز تحریر پر اس قدر حاوی تھے کہ ان کے قلم پر کوئی راستہ بند نہیں تھا- وہ اپنے فکاہی کالم کے باعث اہل سیاست میں مشہور ہوئے ''چنانچہ پنجاب کا جغرافیہ'' ان کی فکاہی مہارت کا بہت اچھا نمونہ ہے- اس کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں ہیں لیکن حسرت کا خاص رنگ اسی جغرافیہ میں نمایاں ہے حسرت کو اگرچہ ذوق شعری ورثہ میں ملا تھا لیکن انہوں نے اپنی کوئی شعری یادگار ایسی نہیں چھوڑی جو دیوان کی صورت اختیار کر لیتی - حالانکہ وہ چاہتے تو یہ چیز ان کے لیے مشکل نہیں تھی- انہوں نے بچوں کے لیے نظمیں بھی کامیاب ہی ہیں اور جو سیاسی نظمیں ہیں وہ بھی معیار سے گری ہوئی نہیں-

اصل میں حسرت صاحب غزل کے آدمی تھے اور انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ ان کی انفرادیت کی حامل ہیں- شاید ان کی صحافتی مصروفیات نے انہیں ادب سے بہت قریب نہیں ہونے دیا- میں نے خود دیکھا ہے کہ ہر ادبی حلقے میں انہیں لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں ایک استادانہ درجہ حاصل تھا لیکن حسرت صاحب بہت کم ادبی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے-

حسرت کی نظم اور نثر دونوں میں ایک سنجیدگی پائی جاتی ہے اور کمال ہے کہ وہ اپنے فکاہی کالموں میں ظرافت کو بھی ایسی متانت دے دیتے تھے کہ پڑھنے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا- اس کے باوجود کہ وہ ریاست پونچھ کے رہنے والے تھے دہلی اور لکھنؤ کی زبان پر انہیں ایسا عبور تھا کہ جب وہ اپنی تحریر میں محاورات اور روزمرہ کو استعمال کرتے تھے تو اہل زبان عش عش کر اٹھتے تھے کہیں ایک مجموعہ ان کے نثر پاروں کا میری نظر سے گزرا تھا لیکن ان کا شاعرانہ کوئی شاہکار شاید ابھی تک

نہیں چھپ سکا۔

وہ بڑے یار باش اور دوست پسند قسم کے انسان تھے اور ان کے زیر مشق کئی لوگ بڑے بڑے ادیب شاعر اور عہدہ دار ہیں لیکن ان کے تعزیتی جلسے میں بیس پچیس آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے اور افلاس دین کا یہ عالم قابل غور ہے کہ مجھ جیسے انسان کو تلاوت قرآن کی سعادت نصیب ہوئی۔حسرت صاحب کا تمام لٹریچر اگر شائع نہ ہوا تو صحافت کا ایک انوکھا طرز دنیا کی نظر سے اوجھل رہے گا۔

حیرت شملوی

جناب حیرت شملوی بہترین غزل گو شاعر تھے اور انتہائی درجے کے شریف الطبع انسان تقسیم کے بعد کراچی آ گئے تھے بیمار ہوئے تو بے یارومددگار سمندر کے ساحل پر ایک خانقاہ کے چھوٹے سے حجرے میں مقیم تھے ان کا دیوان بھی چھپا مگر وہ دیوان جو صدیوں شاعر کی زندگی کا ثبوت ہو سکتا ہے زندگی میں اس شاعر کو انسانوں کے کراچی جیسے جنگل میں رہنے کو جگہ مل سکی اور وہ بے یارومددگار فالج کی نذر ہو گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

حبیب احمد صدیقی

جناب صدیقی بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں کے انسان ہیں وہ نوجوان ہیں مگر ان کا اخلاق ایسا بلند ہے کہ ہر آدمی اچھا اثر لے کے اٹھتا ہے اور اس میں ان کی صورت سیرت اور علم برابر کے اثرات کام کرتے ہیں ہر چند انہیں افسری کی ذمہ داریاں فرصت نہیں دیتیں مگر وہ جب بھی شعر کہتے ہیں نہایت جچا تلا کہتے ہیں وہ ایک خاص انداز بیان کے مالک ہیں جو نہایت ملائم مگر گہرا اور صاف مضمون کا حامل ہوتا ہے۔صدیقی صاحب سے مل کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی ایسے آدمی سے مل رہے ہیں جو خالص علمی ادبی انسان ہے۔شاعری میں وہ مغلق الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ سہل ممتنع میں عجیب و غریب باتیں کہہ جاتے ہیں۔

حفیظ صدیقی

حفیظ صدیقی صاحب بھی احمد پور شرقیہ کے رہنے والے ہیں مشغلہ حیات کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے وہ کوئی معمولی سی تجارت کرتے ہیں اور ہر موضوع پر ان کی طبیعت انہیں اشعار دیتی ہے نہ جانے یہ عادت ان کی کتنی مشقت کا نتیجہ ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت پڑھا ہے یہ الگ بات ہے کہ معیاری کتب ہاتھ نہ آسکی ہوں اور اہل ادب کی سوسائٹی سے دور رہے ہوں۔ ذوق میں تو معیاری مطالعہ اور معیاری صحبتیں ہی دھاریں نکالتی ہیں ورنہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ شعر غلط پڑھتے ہیں۔

حرماں خیر آبادی

حرماں خیر آبادی دکن سے آکر لاہور مقیم ہوئے اور یہاں مختلف پبلشروں کے یہاں کام کرتے رہے اور پھر کراچی چلے گئے لاہور ہی میں ان کی غزلوں نظموں کا ایک مجموعہ ''دیوان حرماں خیر آبادی'' کے نام سے چھپا تھا اور اس میں ان کا کلام مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ کراچی گئے تو حالات نے انہیں مذہب بدلنے پر مجبور کر دیا اور وہ اثنا عشری ہو گئے لیکن پھر بھی ان کی مشکلات وہی رہیں اور وہ معاشی طور پر پریشان ہی رہے سیدھے سادھے آدمی تھے اور لوگ انہیں آلہ تفریح بھی بنا لیتے تھے اور وہ جب سمجھتے تو مسکرا کے رہ جاتے۔

حامد حسن قادری

پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم سے پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی اس وقت وہ آگرہ کالج میں تھے ایسے استاد بہت کم ہوتے ہیں جو سب کچھ جاننے کے باوصف اپنے معلومات کو انلارج نہیں کرتے اور طالب علموں کی طرح رہتے ہیں حامد حسن قادری صاحب کی کتاب ''داستان تاریخ اردو'' جو تاریخ ادب اردو میں معرکہ کی کتاب ہے جو ان کی محنت اور مطالعہ کے علاوہ شعور تصنیف کا پتہ بھی دیتی ہے۔ قادری صاحب سرتاپا اخلاق اور محبت تھے ان کے یہاں حفظ مراتب کا بڑا خیال تھا اور جب کوئی بات ان کی توقع کے خلاف ہو جاتی تھی تو وہ اس طرح دیکھنے لگتے تھے جیسے آندھی میں

کسی دور کی چیز کو پہچان رہے ہوں- اب اس حسن اخلاق کے لوگ دنیا میں کہاں آئیں گے- انا للہ وانا الیہ راجعون

صلاح الدین گوہر حزیں

میجر حزیں صاحب فوج سے ریٹائر ہیں اور آج کل ماڈل ٹاؤن میں مقیم ہیں میں نے بار ہا انہیں سنا ہے وہ توقع سے زیادہ اچھی غزل کہتے ہیں انہیں فارسی میں بھی مہارت ہے اور روان فارسی بولتے ہیں اور فارسی زبان میں غزلیں بھی کہتے ہیں لیکن وہ اردو غزل کے لیے شہرت رکھتے ہیں شریف انسان ہیں اور شریف خاندان کے فرد ہیں ان کے یہاں اچھی خاصی انشائی احتیاط بھی ہے- مجموعہ کلام ترتیب دے رہے ہیں-

حیا لکھنوی

کنیز فاطمہ حیا سے میں اس وقت سے متعارف ہوں جب پہلی بار لکھنؤ گیا- آپ کے والد چودھری نعمت اللہ وہاں کے مشہور بیرسٹر اور معززین لکھنؤ میں ایک خاص افتخار کے مالک تھے-

حیا کی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی جیسا کہ پہلے شرفاء کا دستور تھا- اس کے بعد انہیں لکھنؤ کے ماحول نے شعروشاعری کی طرف راغب کر دیا شروع شروع میں تو انہوں نے اساتذہ لکھنؤ کے اتباع میں قدیم رنگ کی غزلیں کہیں اور جب پختہ مشق ہو گئیں تو جدید رنگ میں آ گئیں-

لکھنؤ میں جس قدر زنانہ سوسائٹیاں اور ادارے خواہ وہ سیاسی ہوں یا ثقافتی حیا کے بغیر نا تمام رہتے تھے- لکھنؤ میں ایک ہی خاتون تھی جو خدمت قوم و وطن کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتی تھیں اور اسی سے ان کی شاعری میں تنوع آیا اور زندگی کے مختلف گوشے نظر سے گزر گئے-

لکھنؤ میں جو شعراء باہر سے آتے تھے حیا صاحبہ انہیں ضرور اپنے یہاں مدعو کرتی تھیں اور بڑی ہی خاطر و مدارت سے پیش آتی تھیں ان کے شوہر جناب عبدالرحمن صاحب وکیل بھی ان کے ساتھ شعراء و ادباء کی تواضع میں برابر کے شریف رہتے اور ان کے چچا انعام اللہ صاحب تو ان سب سے زیادہ خوش اخلاق اور متواضع قسم کے انسان تھے اور مجھ سے تو وہ بچوں کی طرح محبت کرتے تھے کیونکہ وہ مجھے مشاعروں میں سن چکے تھے اور ان پر میری شاعری کا اثر تھا- یوں تو حیا کا تمام خاندان ہی مجھے

جانتا تھا یعنی عبدالرحمن صاحب اور انعام اللہ صاحب تخصیص کے ساتھ کرم فرماتے تھے۔

حیا کی شاعری لکھنؤ کے ماہنامہ "حیا" میں چھپتی تھی اور جہاں جہاں وہ پرچہ جاتا تھا وہیں حیا کی شاعری سراہی جاتی تھی۔ میں نے حیا کی وہ بیاض خود دیکھی ہے کہ جس میں ان کی سیکڑوں نظمیں اور غزلیں تشنہ طباعت تھیں۔ لاہور میں آکر حیا بیوہ ہوگئیں اور ان پر شوہر کے انتقال کا اثر اتنا برا پڑا کہ سر سے پاؤں تک مایوسی میں ڈوب کر رہ گئیں اور پھر نہ ان کی کوئی نظم نظر سے گزری اور نہ غزل۔ خدا کرے ان کا وہ سرمایہ محفوظ ہو وہ تو ادب کی امانت ہے اور خصوصاً زبان کی ایسی خدمت ہے جو صدیوں کے لیے نقش چھوڑتی ہے۔

حیا کی شاعری پر اختر شیرانی کے علاوہ کسی شاعر کی شاعری کا اثر معلوم نہیں ہوتا ہمارے پورے ملک میں اگر کوئی اختر شیرانی کا نقش ثانی ہے تو صرف حیا لکھنوی ہے خدا کرے ان کا وہ مجموعہ کلام محفوظ ہو جو میں لکھنؤ میں دیکھ چکا ہوں۔

حفیظ میرٹھی

دہلی میں صرف ایک بار کی ملاقات ہے مگر مجھ پر انہوں نے ایسا تاثر چھوڑا کہ بہت کم لوگ اس تاثر کے ہوں گے وہ اسلامی رجحانات کے آدمی ہیں اور میں ان لوگوں میں نہیں جو اسلامی تہذیب و تمدن اور فکر و فلسفہ کو ایک معمولی اور محدود تصورات خیال کرتے ہیں میرا تو یہ خیال ہے کہ فکر و خیال میں وسعت ہی اس وقت آتی ہے جب انسان اسلامی فکر و فلسفے پر غور و فکر کرتا ہے کیونکہ اسلام ہی سب سے بعد کا اور ماڈرن مذہب ہے اس کی پہنائیاں تو بیکراں ہیں مجھے نئے دور کے تمام فلسفے اور وجدان تمام اسی انسان دوست مشرب میں ملتے ہیں۔ نہ اس میں تعصب کی گنجائش ہے نہ دشمنی کی نہ اس میں خوش فکری کی کمی ہے نہ تہذیب جذبیت کی یہ الگ بات ہے کہ حاسد اور متعصب لوگ اسے کچھ کا کچھ سمجھیں میں تو اسے انسانیت کا زیب خیال کرتا ہوں اور مسلسل تجربات کے بعد یہیں آکر دم لیا ہے۔

حفیظ صاحب میں بھی ایک ایسا عالمگیر اور انسان دوست جذبہ موجزن ہے جو انہیں زاہد خشک نہیں ہونے دیتا اور ان کا شعر براہ راست دل تک مار کرتا ہے الفاظ کا جادو اور طریق فکر کے ساتھ

پاکیزہ خیالی ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ان کا شعر سلک مروارید معلوم ہوتا ہے۔

حافظ امرتسری

محمد شریف نام ہے اور حافظ تخلص کرتے ہیں۔ دکانداری کے علاوہ عوامی کارکن ہیں۔ نہایت خوش مذاق اور سدا بہار قسم کے انسان ہیں۔

شاعری میں وہ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قلم اٹھاتے ہیں لیکن وہ غزل میں اپنی ایک الگ روش رکھتے ہیں۔ جس میں ان کے عوامی خیالات ونظریات اپنے خدوخال سمیت اجاگر ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ اس دور کے انسان ہیں اس لیے ان کے یہاں کہیں کہیں معاشرہ کی خامیاں اور سیاست کی الجھنیں بھی شعر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جو عوام میں ان کی مقبولیت کا سبب بنتی ہیں۔ ان کے یہاں ابہام بھی ہے مگر وہ ایسا نہیں کہ شعر بے معنی ہو کر رہ جائے بلکہ وہ ایک حسین اشارہ ہوتا ہے شاعر کے مافی الضمیر کی طرف۔

حافظ صاحب سات آٹھ سال سے پاکستان کا جغرافیہ نظم کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی مشاعروں میں اس کے ٹکڑے اور نجی صحبتوں میں اس کے جستہ جستہ اشعار سناتے ہیں تو اس سے ان کی قدرت کلام اور انتخاب الفاظ کا پتہ چلتا ہے۔ جب کبھی یہ منظوم جغرافیہ چھپے گا تو یہ ادب میں ایک اضافہ ہوگا اور اگر خساست سے کام نہ لیا گیا تو لائبریریوں کے علاوہ ملک بھر میں اس کے ٹکڑے کورس میں ہونے چاہئیں اور ریسرچ میں بھی۔

مجھے یقین ہے کہ حافظ صاحب کا دیوان اور یہ منظوم جغرافیہ لوگوں کو چونکا دینے کے لیے کافی ہو گا اور جس وقت دونوں کتابوں پر تبصرے ہوں گے تو حافظ صاحب کو ان کا صحیح مقام میسر آئے گا۔ حافظ صاحب شاعر ہونے کے علاوہ بڑے یار باش قسم کے انسان ہیں اور اپنی زود اعتباری کے باعث ہر دلعزیز ہیں۔

حفیظ رومانی

محمد حفیظ نام ہے اور خود کو حفیظ رومانی لکھتے ہیں۔ ذریعہ معاش ان کا دکانداری ہے اور ذوق شعر فطری ہے یہ دور جدید کے ابہام اور ایمائیت واشاریت سے خوب آگاہ ہیں لیکن اس کے باوصف

فن شعر کے اصول وضوابط کے دلدادہ ہیں اگر چہ ان کی مصروفیت انہیں کلیتاً شعر کی طرف رجوع ہونے میں مانع ہے لیکن اس کے باوصف جب بھی موقع ملتا ہے تو وہی جنون شعری طاری ہو جاتا ہے اور غزل تخلیق کر ڈالتے ہیں۔ دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ ابہام کے ملبہ میں شعر کو دبا نہیں دیتے بلکہ ان کے یہاں ایسا معتدل ابہام پایا جاتا ہے جو الجھن سے تو الگ ہے لیکن ابہام ہے۔ حفیظ مجبور ہو کر شعر نہیں کہتے بلکہ جب انہیں شعر مجبور کرتا ہے تو کہتے ہیں اور اس میں وہ زیادہ دیر نہیں لیتے۔

ان کے یہاں اچھا صاف اور نکھرا ستھرا تغزل ہے جو ہمارے عوام کی چیز ہے اور عوام ہی اسے پسند کرتے ہیں عوام ہی داد بھی دیتے ہیں یوں تو ہر جوانی شوخ چینچل اور الجھنے والی ہوتی ہے۔ لیکن حفیظ صاحب میں علمی ادبی بحث ومباحث کا جذبہ غیر معمولی ہے۔ خدا کرے حفیظ مطالعہ ادب کی طرف آئیں تاکہ انہیں اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہونے پائے ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ کئی فطری شاعر اپنے احساس خودی میں ہی پردہ کر گئے اور اب ان کی جگہ نہ جانے کن کن پستیوں کو بلندیوں کا لقب دیا جائے گا۔

مختار حبیب

مختار حبیب صاحب ایک صالح نوجوان ہیں جنہیں علم وادب کی راہوں سے بلندی کی طرف بڑھنے کا شوق ہے لیکن حالات سے مجبور ہیں وہ اے۔ جی آفس میں کلرک ہیں لیکن ان کا ذوق ادب مطمئن نہیں وہ امتحانات کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور یہ جنوں انہیں ضرور کسی نہ کسی بلند مقام پر لے جائے رہے گا کیونکہ دنیا کے تمام کے تمام لوگ خراب نہیں اس میں شرافت کے جوہر پرکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ مختار حبیب خوش فکر بھی ہیں اور خوش قلم بھی خوش ذوق بھی ہیں اور خوش خیال بھی اور یہ سب مل جل کر خوش نصیبی کا بین ثبوت۔

حزیں صدیقی

محمد عفیف نام حزیں تخلص کرتے ہیں تقسیم ملک میں رہتک سے آکر ملتان میں رہ پڑے اور اب تک وہیں بود و باش ہے ہریانی زبان پر عبور ہے اور اردو فارسی بقدر ضرورت گھر کی تعلیم سے حاصل کی ذوق شعری انہیں ورثے میں ملا ہے کیونکہ وہ رہتک کے ایک تاریخی اور علمی خاندان کے فرد ہیں

نا ساز گار حالات نے انہیں ابھی اس شہرت تک نہیں پہنچنے دیا جس کے وہ اہل بھی ہیں اور مستحق بھی وہ اپنے ذوق سلیم کی تشنگی بجھانے کے لیے لاہور میں آ گئے مگر بد قسمتی سے کبھی فلم اور کبھی ریڈیو کے لوگوں سے واسطہ رہا جہاں کبھی صلاحیتوں کو نہیں سراہا جاتا اور دوست پروری طرہ امتیاز ہے ان دونوں اداروں کو ان کی شرافت نے برداشت نہیں کیا تو لا محالہ ان سے علیحدگی ہوگئی اب وہ ایک رسالہ ''نیا پیام'' میں مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

ان کی غزل نہایت سنبھلی ہوئی ہوتی ہے ہر چند کہ وہ ہیئت شعری کے معاملہ میں ماضی سے وابستہ ہیں لیکن وہ قدیم پیانوں میں جدید شراب بھر کر جو سرور دیتے ہیں وہ کم شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں فکر بھی ہے اور گہرائی و گیرائی بھی۔

اگر انہیں فکر معاش نے ذرا بھی سہولت دی تو وہ ادب میں اپنے مقام پر ہوں گے اگر چہ یہاں ادبی شہرت اور بلندی کے راستوں میں جعلی شاعروں اور ادیبوں نے پھاٹک لگا رکھے ہیں لیکن آثار کچھ ایسے ہیں کہ مستقبل کا ادب ان اندھیروں کو پامال کر ڈالے گا۔

حسرت بہاری

حسرت حسین حسرت بہاری ضلع سارن کے رہنے والے ہیں اور تقسیم ملک کے ہنگامہ میں ریلوے کے ملازمین کی کھیپ میں لاہور آ گئے اردو فارسی کے علاوہ انگریزی پر بھی اچھا عبور ہے اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں انگریزی میں کم اردو میں زیادہ چونکہ لاہور میں دھڑے بندی کی رسم عام ہوگئی ہے اس لیے مخصوص حلقے اپنے مخصوص دوستوں کو اپنی حدوں تک سراہ سراہ کر شہرت کی بیساکھیاں دیتے ہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد جب گھن لگ جاتا ہے تو پھر زمین پر گھسٹنے لگتے ہیں۔

ادب کے گروہ بند لوگ یا حلقے اپنے احاطوں تک تو دھول اڑاتے رہتے ہیں ان کے پنجے اور دانت گھس جاتے ہیں تو اپنے مزارات کی تعمیر اور آرائش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو ایک دو الٹی سیدھی غزلیں کہہ لیتا ہے وہ خود کو ارسطو اور اپنے ارد گرد لوگوں کو دنیا خیال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایسے سیکڑوں دیوان نظر سے گزر رہے ہیں جنہیں دیوان کہنا تو لفظ دیوان کی توہین ہے ہاں اسے

اشعار کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی کم علمی سے یہ نہیں جانتے کہ مستقبل کی تند و تیز ہوا ان مزارات کو اڑا کر کہیں کا کہیں جا پھینکے گی۔ مستقبل کے لیے تو ایسے تناور اور مضبوط کے علاوہ گھنیرے اور گنجان ادب کی ضرورت ہے۔ جہاں بگولے آ کر ٹکڑے ہو جاتے ہیں آندھیاں جھک کر گزرتی ہیں۔

حسرت بڑے خاموش اور شریف قسم کے انسان ہیں لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ بڑے زود گو اور خوش ذوق قسم کے شاعر ہیں وہ آج کل کے رسمی پروپیگنڈے سے بہت دور ہیں اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شعر کہتے ہیں۔ انہیں وقت نے سہولت دی اور ان کا مجموعہ چھپا تو ادب میں ایک اچھا اور توانا اضافہ ہوگا۔ جس کو نظر انداز کرنا ان موجودہ بونوں کے بس کی بات نہ ہوگی۔

حفیظ تائب

جناب حفیظ تائب سرکاری ملازم ہیں لیکن ادب کو انہوں نے بطور عبادت اختیار کر رکھا ہے۔ شاعری میں وہ غزل کم اور نعت زیادہ کہتے ہیں اور نعت گوئی میں بھی ان کا ایک خاص انداز ہے۔ جو رجعت پسند نہیں کہلایا جا سکتا وہ اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے انسان بھی۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

حنیف صابری

محمد حنیف نام حنیف تخلص ہے یہ سابر دہلوی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور آج کل لاہور میں ہومیو پیتھی کرتے ہیں۔ شعر کا ذوق ورثہ میں پایا ہے ظاہر ہے کہ بے تکلف شعر کہتے ہوں گے۔ حنیف کو سننے سے یہ گمان نہیں ہوتا کہ وہ قدیم روش کے دلدادہ ہیں ان کے یہاں بڑا اچھا شعر جنم لیتا ہے اور شگفتگی کے ساتھ خیالات بلند اور اسلوب بیان ان کا اپنا ہوتا ہے وہ اعتدال پسند انسان ہیں اور تجربات کی بنا پر شعر تخلیق کرتے ہیں اور اس میں ان کا مشاہدہ رنگ بھرتا ہے ان کی مشق و مزاولت اگر یونہی رہی تو مستقبل میں ان کا ایک مقام ضروری ہے۔

ڈاکٹر حشمت آرا حجاب

لاہور کی نسوانی شاعری میں ڈاکٹر حشمت آرا حجاب ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر بزم میں ان کا نام اور ہر مشاعرہ میں ان کی ذات سے رونق ہوتی ہے۔ ترنم سے زیادہ ان کے تحت اللفظ میں جان ہوتی ہے ان کی نظمیں اور غزلیں بڑی طویل ہوتی ہیں اور ان میں اچھے اشعار کی بھی کمی نہیں ہوتی ان کی شاعری پڑھ کر انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے اور انہیں دیکھ کر اور اشعار سن کر گومگو کا عالم طاری ہو جاتا ہے ان جیسی قدیم روش کی نیک بخت اور اقدار نسوانی کی حامل خاتون ہمارے ملک کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہیں ابھی کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ البتہ جنگی نظمیں چھپی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی جیسا صاحب طرز ادیب اور ہندوستان اور پاکستان میں اب تک پیدا نہیں ہوا وہ حالانکہ سیلف میڈ آدمی تھے مگر ان میں وہ نشیب نہیں تھے جو اس قسم کے لوگوں میں آ جاتے ہیں وہ مسلمان تھے اور انہوں نے اپنے قلم اور زبان کے فن سے زندگی بسر کی ان کی تصانیف اور مریدین ایسی زندہ یادگاریں ہیں جو صدیوں زندہ رہیں گی۔ خواجہ صاحب بڑی خوبیوں کے انسان تھے ان کے یہاں اخلاقی اقدار بڑے زندہ و تابندہ تھے ان کے یہاں عجز و انکسار کا جذبہ بھی تھا جو کم ملتا ہے وہ اپنے دور کی ایک بولتی چالتی تاریخ تھے جنہیں زمین پی گئی۔

حسین حسان

جناب حسین حسان جامعہ ملیہ میں استاد ہیں اور بڑی سوجھ بوجھ سے شعر کہتے ہیں بچوں کے لیے لکھنا ان کا خاص فن ہے یہاں بچوں کے لیے لٹریچر پیدا کرنے والے ادیب بہت کم ہیں اس لیے ان کا کام ایک نعمت ہے۔

حمیدہ سلطان

حمیدہ سلطان سے دہلی میں ملاقات ہوئی میں ان کے یہاں ایک ادبی نشست میں بھی شریک ہوا۔ جس میں الہ آباد سے جناب فراق بھی تشریف لائے ہوئے تھے اس کے بعد لاہور میں بھی ایک

نشست میں ملاقات ہوئی - وہ ایک مہذب اور تربیت یافتہ خاتون ہیں زبان تو خیران کے گھر کی چیز ہوئی وہ قلم کے معاملہ میں بھی بہت مضبوط ہیں - ان کی انتظامی صلاحیتیں اس سے ظاہر ہے کہ دہلی میں انجمن ترقی اردو کی ساکھ کو سنبھالے ہوئے ہیں -

امیر حسن صاحب حسن

جناب حسن سے میرٹھ میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت وہ غالباً قانون گو یا نائب تحصیلدار تھے قدیم روش کے نہایت اچھے شعر کہتے تھے اور بڑے خلیق انسان واقع ہوئے تھے ادب وشعر کے گردو پیش اور عیوب ومحاسن پر ان کی نظر تھی اس لیے ان کے یہاں وہ خامیاں نہیں تھیں جو شاعری کو معیار ادب سے گرادیتی ہیں - وہ شہرت سے بے نیاز گوشہ نشین اور کم آمیز ایسے انسان تھے جنھیں نظریں ڈھونڈتی ہیں سنا جاتا ہے کہ کراچی میں موجود ہیں -

حسنہ حیدر

حسنہ صاحبہ قاعدے کی پڑھی لکھی خاتون ہیں انہوں نے ایم اے علی گڑھ سے کیا تھا اور سید لقمان حیدر صاحب کی اہلیہ ہیں آج کل کراچی کے کسی کالج میں پروفیسر ہیں نہایت اچھا شعر کہتی ہیں اور بہت ستھرا مذاق پایا ہے - یوں تو ادب اور اصناف شعری کے عیوب ومحاسن سے بخوبی آگاہ ہیں - مگر وہ تعمیری ادب تخلیق کرتی ہیں اور جدید اظہار خیال کو پسند نہیں کرتیں - ان کا شعری مجموعہ غالباً ابھی نہیں چھپا کراچی میں لیکچرار ہیں -

حافظ محمد قمر الدین

حافظ محمد قمر الدین صاحب فارسی زبان کے اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اور اردو میں بھی کہتے ہیں ان کے کلام میں تصوف کے بڑے بڑے اہم مسائل آتے ہیں جو شعر کا لباس پہن کر عام فہم ہوجاتے ہیں - لیکن تصوف کے حقائق کو اس سے زیادہ عام فہم اور عام رس ہونا چاہئے کیونکہ ہمارے ملک میں تعلیم ابھی عام نہیں ہے اور یہ مسائل عوام سے تعلق رکھتے ہیں آپ سیال شریف میں سجادہ نشین ہیں -

حامدالانصاری غازی

مولانا حامد انصاری غازی سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی اور پہلی ملاقات ایسی ہوئی کہ عمر کی ملاقات ہوگئی۔ وہ عربی فارسی میں فاضل اجل اور اردو میں نہایت بلند مرتبہ شاعر اور ادیب ہیں جہاں وہ فقہ و حدیث کے آدمی ہیں وہیں وہ ملک کے سیاسی رموز سے بھی بے خبر نہیں اور صحافت میں بھی اپنے معاصرین سے کہیں کم درجے کے صحافی ثابت نہیں ہوتے اور یہی حال ان کا شاعری میں ہے لیکن انہیں شاعر کی حیثیت سے بہت کم آدمی جانتے ہیں اور نہ وہ خود بھی اس کا اظہار کرتے ہیں شاید شاعری کے معاملہ میں وہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔

حیارام پوری

جناب حیارام پوری، نوجوان شاعر ہیں اور اسماعیل ٹیکسٹائل ملز بھگر میں ملازم ہیں۔ مزدوری کی تھکن اور افسران کی حکم برداری کی مصروفیت کے باوصف مشاعروں میں بڑی خونریز غزل پڑھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ٹیکسٹائل ملز کی بزم ادب غزل کے معاملے میں تمام ملک کے ٹیکسٹائل ملوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس میں تمام شاعر مزدور ہیں اور ان کی شاعری میں ان کا خلوص بولتا ہے۔ جناب حیا بھی انہی میں ایک ابھرتے ہوئے اجالے کی طرح ہیں۔ اگر ان پر تاریکیاں حملہ آور نہ ہو گئیں تو اس اجالے کے خدوخال نہ جانے اسے کیا نام دے دیں۔

محمد حسن صاحب حسنؔ

جناب حسن امرتسر کے رہنے والے تھے اور مستقل شملے میں رہتے تھے قدیم وضع کے پرانے بزرگ تھے اور شاعری میں تصوف پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ وہ غالباً ٹھیکیداری کرتے تھے اور اسی میں اپنی روزی کما کر صبر و شکر سے زندگی بسر کرتے وہ مشاعروں میں کم اور نجی نشستوں میں زیادہ ملتے۔ خود بھی متین تھے اور ان کے شعر بھی فن کی حدود میں ملتے ان سے زیادہ قربت کا موقع نہیں ملا مگر وہ مخلص انسان معلوم ہوتے تھے۔

مرزا حدید

جناب حدید دھرم پورہ لاہور میں رہتے ہیں اور ان کے دم سے دھرم پورہ میں اردو شاعری کا ذوق پھیل رہا ہے یہ جناب حافظ امرتسری کے شاگرد ہیں - زود گو ہیں اور طبیعت میں مزاح ہے میں نے ان کی غزلیں زیادہ نہیں سنیں لیکن جو سنی ہیں وہ اس ماحول کے بیسیوں شاعروں سے بہتر ہیں اور ابھی ان کی ترقی کے امکانات روشن ہیں -

مولوی حامد میاں

نوجوان علماء میں سے ایک نمایاں شخصیت کے مالک ہیں جہاں تک ان کے علم وفضل کا تعلق ہے وہ تو ظاہر ہے کہ ہر صاحب علم ان کے بارے میں رطب اللسان ہے سب سے بڑی بات تو یہ ہے وہ دن رات علم دین کی تبلیغ میں کوشاں ہیں اور صحابہ کی طرح جدو جہد میں زندگی گزارتے ہیں کئی دار العلوم ان کی سعی کا نتیجہ ہیں - خدا جزاء خیر عطا فرمائے - اس دور میں ان کا دم غنیمت ہی نہیں نعمت ہے - ان کی زبان اور قلم دونوں خدا کی راہ میں گامزن ہیں -

ملک حبیب احمد

جناب ملک حبیب احمد صاحب مرحوم اس وقت میرے دوست تھے جب میں لاہور میں شملہ پہاڑی پر چوکیدار تھا اور وہ کہیں وزیر یا دیوان تھے رات کے بارے ایک بجے تک ملک صاحب قاضی عبد العزیز بٹالوی اور حیات صاحب وغیرہ سب اکٹھے بیٹھتے اور زمانے بھر کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی یہ تمام لوگ مجھ سے بلند درجے کے لوگ تھے مگر نہ جانے کیوں وہ مجھ سے محبت کرتے تھے ملک حبیب احمد صاحب نے ایک دن اپنے لڑکے ملک حسیب احمد کا تعارف بھی کروایا اور وہ بھی مجھ سے اب تک اسی خلوص سے پیش آتے ہیں ملک صاحب نہایت تجربہ کار اور مخلص انسان تھے اور تجربات و معلومات کا ایک خزانہ ان کے حافظہ میں موجود تھا جس کا کچھ حصہ مجھے بھی میسر آیا -

حسن امام

حسن امام صاحب سے میری پہلی ملاقات شملے میں مسلم ہوٹل کے اس کمرے میں ہوئی جہاں نواب صدیق علی خان اور اسحاق ستار سیٹھ بھی موجود تھے حسن امام صاحب کو ملکی سیاست میں بڑا دخل رہا ہے تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے اور پاکستان میں مقیم ہیں اب ان کے وہ سیاسی ہنگامے تو نہیں لیکن وہ سیاست اچھی طرح جانتے ہیں اور اس ملک کے لیے ان کا دم غنیمت ہے جہاں عوام حکومت سے اور حکومت عوام سے بے خبر ہیں۔ اب ان کی عمر کا تقاضا گوشہ نشینی سہی لیکن اپنے معلومات اور تجربات سے وہ نوجوانوں میں زندگی اور گرمی ضرور پیدا کرتے ہیں اور یہ ان کی بڑی خدمت ہے۔

حماد رضا

جناب حماد رضا صاحب سے تعارف نیاز احمد مرحوم کی معرفت ہوا تھا ممکن ہے کہ ان کی نزدیکی سے بھی حماد کا رجحان ادب کی طرف ہوا ہو لیکن بنیادی طور پر وہ ادب پسند اور ادب شناس واقع ہوئے اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ ان کی نظر شعر و ادب کے عیوب و محاسن پر بھی ہے اچھے اشعار پسندیدگی اور ناقص اشعار پر وہ اصرار کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں اگر چہ ان کا عہدہ انہیں بہت فرصت نہیں دیتا لیکن وہ مستقل مطالعہ کے انسان ہیں اور ہم ان سے کسی خاص کارنامہ کی امید رکھتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ فوراً نہیں بلکہ کسی وقت اپنے خیالات و مشاہدات کا اظہار کریں کیونکہ عموماً بعض اوقات حال کا بیان حال میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی کیفیات کا مستقبل ہی حامل ہو سکتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی

مولانا حسین احمد مدنی کی ذات صرف دیوبند کے لیے ہی نہیں ملک بھر کے لیے ایک رحمت تھی۔ ایسا آفتاب علم روز روز طلوع نہیں ہوتا اور ایسا امام طریقت صدیوں کے بعد میسر آتا ہے۔ ایسا عالم باشرع زندگی بھر میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان کا علم اندازہ سے باہر اور اتقا حدود نطق سے وری تھا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور جنہیں شب و روز ان

کی زیارت نصیب ہوئی - ایسا یگانہ روزگار فاضل اور صاحب بصیرت عالم شاید دنیا کو دوبارہ نہ مل سکے - ان کی کتاب ''نقش حیات'' پڑھ کر ان کی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور اپنی کوتاہیوں پر کف افسوس ملنا پڑتا ہے کہ زندگی انہیں کے قدموں میں کیوں نہ گزار دی -

مولانا حفظ الرحمٰن سہاروی

مولانا حفظ الرحمٰن سہاروی مرحوم سے پہلی ملاقات ندوۃ المصنفین میں ہوئی اور اس کے بعد جب بھی وہ ملے ہیں انہیں بالکل اسی طرح پایا ان کا خلوص سدا بہار تھا اور وہ ایک عالم باعمل تھے - برہان کے دفتر میں کئی بار میں نے ان کا انہماک دیکھا ہے وہ سر تا پا علم ہونے کے باوصف عوامی انسان تھے اور سب کے کام آتے تھے - ان کی تصانیف ان کی عبادت جاریہ ہے یہی سبب ہے کہ ہر کتب خانہ میں موجود ہیں اور مخلوق کو راہ راست کی طرف راغب کر رہی ہیں - مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بحیثیت انسان بہت بلند شخصیت تھے ان کے الفاظ میں مٹھاس اور زبان میں اثر عطیہ فطرت تھا -

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

میں جب ایک اخبار کے سلسلے سے سنت یوسف کی پیروی میں کلکتہ جا رہا تھا تو مولانا حبیب الرحمٰن سے ریل گاڑی میں ملاقات ہوئی یوں تو مولانا کو میں اور مولانا مجھے بارہا دیکھ اور سن چکے تھے لیکن ہماری یہ ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی اس لیے کہ دو قیدی ملک کی آزادی پر گفتگو کرتے جا رہے تھے - ہمارے سامنے اپنی تکلیف نہیں تھی بلکہ ملک کی غلامی کو اپنی روح پر بار محسوس کر رہے تھے -

مولانا حنیف ندوی

مولانا حنیف ندوی صاحب ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہیں علمی فضیلت کے علاوہ وہ نہایت اچھے مصنف اور محقق ہیں اسلامی تاریخ و تحقیق پر کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں اس کے علاوہ سیاست عالم پر بھی ان کی اچھی نظر ہے اور اسلامی نقطہ نظر کی روشنی میں سیاسیات کے مختلف پہلوؤں پر نہایت فاضلانہ محاکمہ کرتے ہیں - میری نظر میں ایسے فاضل لوگ ہمارے یہاں زیادہ نہیں جو تمدن

اور معاشرت کے مختلف گوشوں سے آگاہ ہوں اور چوکھا مطالعہ رکھتے ہوں۔

شیخ حسام الدین

شیخ حسام الدین صاحب بڑے عوامی انسان ہیں وہ تقریر اور تحریر دونوں راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں دنیاوی معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور سیاست کے کئی رازہائے سربستہ سے انہیں آگاہی ہے وہ فطرتاً ادیب ہی نہیں محقق بھی ہیں ان کی کتاب ''غدر ۵۷ء کا دوسرا رخ'' ان کے ادبی اور سیاسی رجحان کا پتہ دیتی ہے تقسیم کے بعد ان کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری لیکن ''آزاد'' اخبار میں آج بھی وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

حسین شہید سہروردی

مشہور وکیل اور دلیر لیڈر ہونے کے علاوہ عوامی انسان تھے حالانکہ ان کی سیاست دانی نے انہیں وزیر اعظم کے عہدہ تک پہنچا دیا تھا لیکن وہ عوام میں کام کرنے کی اہلیت زیادہ رکھتے تھے اور عوام سے نزدیک ہونے میں انہیں مسرت ہوتی تھی۔ وہ دوست اور دشمن کو ایک نظر میں بھانپ لیتے تھے لیکن جہاں مراعات کا موقع آتا تھا وہاں دوست دشمن دونوں سے برابر سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کی اسی خصوصیت نے انہیں عوام اور خواص میں ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ جب ان کے انتقال کی خبر شائع ہوئی تو میں نے ان کے مخالفین کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے ہیں۔

حسن ظہیر سی۔ ایس۔ پی

بڑے ذہین اور طباع قسم کے انسان ہیں اپنے عہدے کی مصروفیت کے باوجود وہ مطالعہ سے غافل نہیں رہتے اور اہل علم و ادب کے بہی خواہ ہیں۔ لاہور میں ڈپٹی کمشنر بھی رہے ہیں اور جب تک رہے اہل شہر کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اچھے ادیبوں اور بلند مقام شاعروں کے وہ تہ دل سے قدردان تھے لیکن ہر شاعر اور ادیب ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ نجی صحبتوں میں وہ پورے ملک کے ادیبوں، شاعروں، لیڈروں اور تعلیمی لوگوں کے علم و عمل پر ناقدانہ تبصرہ کرتے تھے۔

تصدق حسین خالد

تصدق حسین خالد لاہور کے مشہور گھرانے کے فرد ہیں- یہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی علم و ادب کے شائق تھے چنانچہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہے- ایم-اے کی ڈگری کے بعد سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہو گئے اور کامیاب ہو کر چھ سات برس تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر فائز رہے اور ۱۹۳۲ء میں پنشن لے کر مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور پی ایچ ڈی کیا اور رائل اکنامکس سوسائٹی کے فیلو منتخب ہو گئے اور ۱۹۳۵ء میں بیرسٹر ہو کر اپنے وطن واپس آ گئے اور اب تک لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں-

انگلستان کی ادبی صحبتوں کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہی ہوا کہ آپ قدیم رنگ کی روائتی شاعری سے ہٹ کر آزادانہ شاعری کرنے لگے اور ان کی اس روش پر بہت سے نوجوان چل نکلے اور رفتہ رفتہ ایک سوسائیٹی سی بن گئی آپ کا شمار آج اردو کے ان شعراء میں ہے جو روایت سے بغاوت کر کے اپنے ایجاد کردہ جادہ پر گامزن ہوئے ہیں انہی کی اجاگر کی ہوئی پگڈنڈیاں آج ہنگامہ آرا ہیں اور ان کے بعد کہیں ہیئت' کہیں ایمائیت اور کہیں اشاریت کے ایسے ایسے تجدیدی تجربات ہوئے کہ آج اصل راستے کا پتہ نہیں چلتا اور شاعری کی منزل متعین نہیں ہوتی- اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری تو بڑے سلیقہ کی چیز ہے خالد صاحب نظم آزاد کے دلدادہ تھے- یہ نظم معرا کو اپنی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے ادبی مقاصد کا سانچہ بنا لیتے تھے- اور وہ کامیاب تھے اب یہ شعور ہر شخص میں تو نہیں ہوتا چنانچہ اوٹ پٹانگ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے چل نکلتا ہے نااہلوں کی بہتات نے اچھی خاصی تحریک ادب خراب کر کے رکھ دی اور اردو شاعری کے نام سے ادب میں ایسی بدعت داخل ہو گئی کہ الامان و الحفیظ-

اس میں شک نہیں کہ ابہام خالد کے یہاں بھی ہے مگر بڑا حسین روایت سے بغاوت خالد کی شاعری میں بھی موجود ہے مگر بڑی احتیاط کے ساتھ جس کا پتہ ان کی کتاب ''سرودِ نو'' سے چلتا ہے جو خالد صاحب کی نظموں کا مجموعہ ہے- شاعری کے علاوہ ان کے ترجمے اور مضامین بھی مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں اور ان میں اکثر کارآمد مواد کے حامل ہوتے ہیں-

خلیل الرحمٰن داؤدی

داؤدی صاحب ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور قدیم کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں لیکن وہ صرف تاجر ہی نہیں بلکہ وہ مصنف و مولف بھی ہیں اور کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں جس سے ان کی قابلیت اور تحقیق پسند طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایشیا کے واحد کیٹیلاگر ہیں۔ ہمارے یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کتابوں کے حسن و قبح سے داؤدی صاحب کی طرح آگاہ ہیں اور ملک میں بہت کم لکھنے والے ایسے ہیں جو ان کے انداز کے معیار پر پورے اترتے ہیں وہ اپنی تحریروں میں تاریخ معاشرت اور ادب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں جس سے محققین کے لیے آسانیاں نکلتی ہیں اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے وہ تحریریں حوالے میں آجاتی ہیں۔ داؤدی صاحب دبنگ اور کھڑتل قسم کے انسان ہیں اور یہ وصف ان کا ان کے گہرے مطالعہ کے بل پر ہے۔

خلیقی دہلوی

خلیقی دہلوی دہلی کے ایک مشہور اور عالم خاندان کے فرد تھے۔ انہیں ادب لطیف میں خاص مہارت تھی یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں ادب لطیف اپنے شباب پر معلوم ہوتا ہے۔ وہ ادب لطیف کو جس مقام پر چھوڑ گئے تھے آج بھی وہ اس سے ایک قدم بھی آگے نہیں سرکا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیقی صاحب بڑے بلند پایہ ادیب اور نہایت بلند کردار کے انسان تھے ان کی ایک کتاب ''ادبستان'' کے نام سے چھپی تھی جس میں ان کا فن اپنا تعارف خود کراتا ہے۔

خوشتر گرامی

جناب خوشتر گرامی مولانا تاجور مرحوم کے شاگردوں میں ہیں اور ایسے شاگرد خدا سب کو دے وہ مولانا کے مرنے کے بعد بھی حق شاگردی ادا کر رہے ہیں اور مولانا کی طرح رات دن اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں منہمک ہیں ان کا رسالہ ''بیسویں صدی'' ہندوستان کا سب سے مقبول رسالہ ہے اور وہ نظم و نثر دونوں میں نمایاں ہیں۔ جناب خوشتر اصل معنی میں ادیب اور شاعر ہیں اور جو فرض ادیب اور شاعر کا ہے اس سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

رام جوایا خنداںؔ

میں لاہور میں وارد ہوا ہی تھا کہ رام جوایا کا نام پڑھا اور پھر عرصہ کے بعد ملاقات بھی ہوئی۔ وہ اس دور کے مشہور شعراء میں شمار ہوتے تھے اور بحیثیت انسان بڑے شریف اور ملنسار انسان تھے مگر افسوس کہ ہماری ادبی تاریخ بھی اب سیاسی تاریخ کی طرح ناقص اور غیر معتبر ہوتی جارہی ہے۔ اس میں اکثر ایسے شاعر اور ادیب نظر انداز کردیئے گئے ہیں جو مورخین سے بلند و برتر انسان تھے۔ نہ جانے خنداں کا کوئی مجموعہ بھی شائع ہوا ہے یا نہیں۔

خمار بارہ بنکوی

سیدھا سادہ سا ترنم ریز شاعر افق ادب وشعر پر ستارے کی طرح آیا لیکن ملک میں سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا اور ادب وشعر میں نئی نئی راہیں نکل رہی تھیں ابہام اور ہیئت ایمائیت اور اشاریت کے نئے نئے دیے روشن ہو رہے تھے۔ اور یہ تھکا ماندہ شریف انسان اس فضا کا ساتھ نہیں دے سکا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اس نے غزل میں جو تری اور رنگ و بو کا آمیزہ پیش کیا ہے وہ آج کے بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر گلے را رنگ و بو دیگر است۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی حسن ضرور ہے لیکن جب فطرت کے ہر نقش میں حسن واوا مسلم ہیں تو خمار بارہ بنکوی کو اس نظر سے کیوں نہ دیکھا جائے ان کی باری آئے تو عینک اتار دی جائے یہ کہاں کا انصاف ہے۔ لیکن دھڑے بندی اور پارٹی بازی نے بھی کئی ایک ابھرتے ہوئے جلوؤں کو ٹھنڈا کردیا۔

آج بھی جب ہم غزل کو غزل کے معیار پر پرکھتے ہیں تو بہت کم لوگ اس نزاکت شعر کے حامل نظر آتے ہیں جو خمار بارہ بنکوی کے یہاں اب سے بیس بائیس برس پہلے سے موجود ہے۔

خلیق احمد خلیقؔ

جناب خلیق نہایت ذہین اور فطین قسم کے نوجوان ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ قدیم ڈگر سے ہٹ کر کہتے ہیں۔ ادیبانہ طبیعت اور فلسفیانہ دماغ پایا ہے۔ ترقی پسند طبقے کے مشہور فرد ہیں اور آج کل یو ایس آئی میں ملازم ہیں۔ نظم معرا کے علاوہ نثر میں بھی انہیں مہارت ہے لیکن زندگی اور دفتر کی

مصروفیات کے باعث اب تک اپنا کوئی شاہکار کتابی صورت میں ترتیب نہیں دے سکے جہاں تک ان کی نظم کا تعلق ہے اس کا طبع نہ ہونا ادب کے لیے خسارہ ہے۔

خیال امروہوی

خیال صاحب ایک عرصہ سے لاہور میں تھے انہیں نزدیک اور دور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ مختلف مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے ہیں اور وہ جو کچھ مشاعروں میں پڑھتے ہیں وہ ہر گز نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ لیکن بحثیت انسان لاہور میں ان کی شہرت وہ نہیں ہے جو ان غزلوں کے شاعر کی ہونی چاہیے۔ جو وہ مشاعروں میں سناتے ہیں آج کل وہ لیہ میں اردو کے لیکچرار ہیں مگر نہ معلوم ان کے ذوق شعری کا کیا حال ہے اور اس میدان میں وہ کس رفتار سے چل رہے ہیں۔ ان کے دو ایک کتابچے بھی میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بھی ان کی شاعرانہ صلاحیت گونگی نہیں ہے۔

خلیل رام پوری

جناب خلیل رام پوری بھکر میں اسماعیل پور ٹیکسٹائل ملز ادارہ میں شامل ہیں۔ چونکہ اہل زبان ہیں اور روزمرہ محاورات پر عبور ہے اس کے علاوہ مشق و مزاولت بھی کم نہیں اس لیے قادر الکلام شاعر ہیں اور بھکر کی ادبی ترقی کا دارومدار زیادہ تر انہی کے قلمی اور ذہنی ایثار پر ہے ہر سال ملز کے مشاعرہ میں ان کے دم سے اردو کی توسیع و اشاعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تصور و تخیل کے رنگ میں پوری فضا کو رنگ ڈالا ہے۔ خلیل صاحب کے یہاں جدید رنگ کی شاعری ہے اور اس میں ایک ایمائیت اور اشاریت ہے جو بیان کو حسین اور ابہام کو دلکش بنا دیتی ہے۔

پروفیسر خلیق احمد

پروفیسر خلیق بریلی کالج کے اساتذہ میں تھے اساتذہ اور تلامذہ دونوں کے تبحر علمی کے معترف تھے اور تقریر و تحریر میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ جو بہت کم استادوں میں ملتا ہے۔ وہ پڑھتے تھے زیادہ اور لکھتے تھے کم مگر جو لکھتے تھے وہ قابل قدر رہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہو

سکی - نہ جانے انہوں نے کیا کچھ لکھا ہوگا -

خیر بہوروی

جناب خیر بہوروی میرے پرانے دوستوں میں ہیں - مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ خیر بہوروی اور ناچیز دیہات میں اردو کے لیے کام کرتے رہے ہیں تو ان سے رات دن کا ساتھ رہا ہے وہ نہایت منکسر المزاج اور خوش ذوق انسان واقع ہوئے ہیں - مشاعروں میں بھی ان سے اکثر ملاقاتیں رہی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی خلوص سے ملے ہیں - وہ شاعر بھی ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں لیکن کئی کتابچوں پر تو ان کا نام نظر پڑا ہے کتابی شکل میں ان کی کوئی کاوش سامنے نہیں آئی -

عبدالعزیز خالد

جناب خالد سے میں پہلی بار ملا ہوں تو سب سے پہلا تاثر یہ ہے کہ وہ نہایت اچھے اور ثقہ قسم کے مسلمان ہیں اور اس کے بعد میں نے ان کی کتابیں دیکھیں اور ان میں سے "منحمنا" اور فارقلیط پڑھی ان سے میرا یہ تاثر یقین میں بدل گیا اور اس کے ساتھ ایک یہ شاخ پھوٹی کہ وہ عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی جاننے کے علاوہ بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں اگر کوئی ان کے الفاظ و معانی سے گزر کر ان کے قلب و نظر کے مفاہیم تک پہنچ جائے اس وقت جناب خالد کی اقدار انسانیت اور عزائم و آرزو کی وسعت اور پاکیزگی کا اندازہ ہو سکتا ہے - میرے خیال سے شعراء کے طبقے میں جناب خالد کی معلومات اور مطالعہ کا آدمی خال ہی ہوگا ان کی تمام تصانیف ان کے معیار علم و ادب کا پتہ دیتی ہیں -

پروفیسر خلوت (غلام محی الدین)

جناب خلوت سے لائل پور میں پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ اس وقت کالج میں لیکچرار تھے اس کے بعد اکثر ملاقاتیں رہیں - خلوت صاحب کو شروع سے ہی شعر و ادب سے ذوق رہا ہے - میں اکثر ان کی غزلیں اور نظمیں مشاعروں میں نجی نشستوں میں سنتا رہا ہوں - خلوت صاحب ریٹائر ہو کر مستقل طور پر لاہور میں آ گئے ہیں - تصنیف و تالیف کر رہے ہیں - ان کے رشحات قلم کتابی صورت میں آ

رہے ہیں۔خلوت صاحب کے انگریزی نظموں کے ترجمے ''سہ آتشہ'' کے نام سے چھپے ہیں اور متزادنعت کا نعت بھی لیکن ان کا مجموعہ کلام کلیات کی صورت میں نہیں آیا۔

خلیق قریشی

جناب خلیق قریشی لائل پور میں ایک روزنامہ کے مالک ہیں لیکن ان کی شہرت روزنامہ کی ممنون نہیں۔وہ شعروادب کے میدان میں اس سے بہت پہلے سے شہرت پا چکے تھے۔جناب خلیق قریشی میرے قدیم کرم فرماؤں میں سے ہیں نہایت اچھے صحافی اور اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔میں ان سے اس لیے بھی خوش ہوں اور ان کی تعریف کرتا ہوں کہ وہ ''خودساز'' قسم کے انسان ہیں انہوں نے زندگی میں بڑی جدوجہد کی ہے اور اپنے بل پر بام رفعت پر پہنچے ہیں ہمارے ملک میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اپنی زندگیاں خود بناتے ہیں جناب خلیق اپنے نام کی رعایت سے بڑے ہی خلیق ہیں اور خصوصاً اپنے احباب کے معاملے میں تو بڑے فراخ حوصلہ اور وفادار قسم کے انسان ان کی شاعری بھی ان کے اس کردار کی آئینہ دار ہے ان کی آنکھوں میں صرف بہار ہی نہیں زخم بھی ہیں اور پس ماندہ دلوں کے ناسور بھی۔ان کی تنقید صرف ان کے حسن کارکردگی کے بل پر قبول ہے ان کے نثر کے کارنامے اور شاعرانہ شاہکاروں کا مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا۔

خلش ہاشمی

خلش ہاشمی عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں اور اردو بولنے والی جماعت سے ہیں وہ ٹیوشن وغیرہ کرتے ہیں اور اسی سے ان کی شکم پری اور جسم پوشی ہوتی ہے۔سیکڑوں سے اچھا شعر کہتے ہیں لیکن کم کہتے ہیں ان کی زندگی کی مصروفیات انہیں فرصت نہیں دیتیں لیکن اس کے باوصف جب شعر کہتے ہیں تو بڑا ،چا تلا ہوا ہوتا ہے۔

خلیق ملتانی

جناب خلیق ملتانی میں شاعری کا بڑا منہ زور جذبہ ہے اور یہ قدرت کا انعام ہے لیکن ان کا بچپن بے سرپرستی جوانی بے راہروی اور ڈھلوان انہیں مصاحبت کی طرف لے گیا اور میرے خیال سے یہ

سب حالات کی ناسازگاری ہے جس کا ذمہ داران کا ماضی ہے۔قدرت نے جو کچھ انہیں دیا ہے جب ان کی شاعری میں اس جوہر کی دھاریاں لچکتی نظر آتی ہیں تو ان کی شاعرانہ قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور جب وہ رہوال چلتے ہیں تو کہیں ان کی کم ہمتی دھول اڑاتی ہے اور کہیں زمانہ کی قدرناشناسی اپنا اعلان کرتی ہے لیکن ہمیں ایسے شخص سے مایوس نہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ کسی وقت بھی کوئی کارآمد شاہکار پیش کرسکتا ہے۔

خادم کیتھلوی

جناب خادم اسکول میں معلم ہیں اور ایک عرصہ سے شعر کہتے ہیں مگر شاعری میں شاید ان کی معلمی دیوار بن گئی جسے وہ عبور نہیں کرسکتے ۔انہیں چاہئے کہ وہ بچوں کا لٹریچر پیدا کریں ہمارے ملک میں بچوں کے صالح ادب کی بڑی کمی ہے۔

خلیل مرادآبادی

سید خلیل احمد جہلم میں رہتے ہیں بڑے چابک دست طبیب اور خلیق انسان ہیں اگرچہ ان کا تمام وقت طبی تحقیق اور مطالعہ میں گزرتا ہے لیکن اس کے باوصف شعر بھی کہتے ہیں اور جہلم کی بزم ادب میں انہیں ایک مقام حاصل ہے۔طبی تصنیف و تالیف میں منہمک ہیں لیکن ابھی کوئی شعری مجموعہ نہیں آیا حالانکہ وہ زیادہ غزل ہی کہتے ہیں اور اچھا خاصا مواد مہیا ہے۔

خورشید راٹھور

خورشید راٹھور تعلیم یافتہ خاتون ہیں یہ قدامت سے گریزاں اور جدید طرز و روش کی دلدادہ ہیں ردیف و قافیہ کی شاعری نہیں کرتیں بلکہ جدید طرز کی غیر مقفی اور آزاد نظمیں کہتی ہیں اور مشاعروں میں وہی سناتی ہیں ابھی ان کا مجموعہ کلام نہیں چھپا البتہ ان کی نثری کوششیں نظر سے گزری ہیں ۔یہ ناول اور افسانہ میں بھی بند نہیں اور بڑی روانی سے لکھتی ہیں اور ان میں کام کی باتیں ہوتی ہیں۔

خار میرٹھی

جناب خار سے میرٹھ میں ملاقات ہوئی ان کا ایک مجموعہ ''سرمایہ خار'' کے نام سے چھپا ہے۔ وہ بڑے مخلص انسان اور سخت جان قومی کارکن ہیں جن دنوں ان سے ملا ہوئی وہ سر سے پاؤں تک کانگریس تھے اور ایسے لوگوں کی وفاداری مسلم ہوتی ہے۔

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

(غالبؔ)

ان کے مجموعے میں ان کا کلام ان کے معیاری شاعری اور خیالات و معتقدات کا آئینہ دار ہے اس میں ان کی زندگی بھی بولتی ہے اور شاعری بھی۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم

جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ ادارہ تھے زندگی بھر وہ دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں رہے اور وہاں وہ اپنی تصانیف و تالیفات کے سبب ایک نمایاں شخصیت رہے۔ شاعری میں بھی وہ کسی سے کچھ کم نہیں تھے میں نے دسیوں بیسیوں مشاعروں اور نشستوں میں انکی شاعری سنی ہے وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور میرے شعر سن کر دادو تحسین سے میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے میں نے ایسے غافل کو عوامی انسان بہت کم پایا ہے ان کے یہاں نہ علم پر غرور تھا اور نہ منصب پر فخر وہ ایک سیدھے سچے مسلمان تھے اور بس۔

خاطر غزنوی

محمد ابراہیم بیگ خاطرؔ اصل وطن پشاور ہے۔ اردو فارسی اور پشتو کے علاوہ انگریزی میں درک رکھتے ہیں اب ریڈیو پاکستان کے ادارہ میں ہیں۔

صوبہ سرحد کے نوجوانوں میں بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ادب کی ترویج و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے بہت کم نوجوان ایسی ان تھک کوشش کے مالک دیکھے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر تو ایسی زیادہ نہیں لیکن ان کا ادب اتنا قد آور ہے کہ معاصرین خود ان کے سلسلے میں ان

کی تعریف کرتے ہیں اور وہ حق بجانب بھی ہیں ایسے فطری شاعروں کی قدر ومنزلت ہر انسان کا فرض ہے۔

جناب خاطر نئے لکھنے والوں کی صف میں شامل ہیں اور ان کی شاعری ایک مقام رکھتی ہے خاطر نے شاعری تو غزل سے شروع کی اور اچھی غزلیں کہیں لیکن ماحول میں خاطر کی نظمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں اور شاید وہ اپنا زور طبع بھی اسی صنف پر صرف کرتے ہیں لیکن چونکہ شدید الاحساس انسان ہیں اس لیے اپنے فن کے فطری جوہر کو بلندی فکر کے صیقل سے سنوار کر نہایت لطافت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ آج سے بہت پہلے ان کی شاعری میں کچھ ایسی چنگاریاں تھیں جن کا شباب آج نمودار ہوا ہے اور آج کی شاعری میں ان کی شوخی اور رنگینی سنجیدگی کی طرف مڑ گئی ہے اور دیکھیے اس کا شباب کیا قیامت لائے۔

خاطر کے یہاں زندگی کے مختلف موضوعات پر شعر ملتے ہیں جن میں حسن وعشق کی روداد یں بھی ہیں اور انقلاب کی گرمی بھی۔ زندگی کی احتیاط بھی ہے اور اخلاقی قدروں کی حفاظت بھی وہ نہ تو عشق کے اظہار میں بھڑ کتے ہیں اور نہ سنجیدگی سے بات کہنے میں انہیں لغزش ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی وہ ادیب بھی ہیں اور مترجم بھی ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ مرے سامنے نہیں البتہ ''افسانہ'' جوان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔

خوشحال خورسند

''ملاپ'' کے مالک و مدیر ہوتے ہوئے بڑے خلیق اور خوش مذاق انسان تھے ان دنوں امر چند قیس اور میں دونوں ان کا مشاعرہ لکھا کرتے تھے فرق ذرا سا یہ تھا کہ وہ تنخواہ دار تھے اور میں بے تنخواہ۔ بہر نوع ''ملاپ'' ایک ایسا اخبار تھا جس کی شہرت تھی اور اس میں اچھے اچھے صحیح ذوق کے لوگ کام کرتے نظر آتے تھے۔ جناب ساغر سہاروی سے میرا پہلا تعارف ملاپ کے دفتر ہی میں ہوا تھا اور خورسند صاحب کا میں دل سے معترف تھا انہوں نے کئی اردو کے ادیب پیدا کیے تھے۔

خالد علیگ

جناب خالد نوجوان ہیں اور جذبات کو الفاظ کا ایسا چست لباس دیتے ہیں کہ سننے والوں کو ڈھیر کر دیتے ہیں- ان کی شاعری کی خصوصیت خلوص ہے اور ان کے سینے میں پوری قوم کا دل دھڑکتا ہے- ان کی محبت ملک اور قوم کی حالت اور معاشرے سے ہے اور ان کا احساس معاشرہ کی ذرا سی خراش کو انلارج کر کے شگاف کر دیتا ہے- جناب خالد کا وجود ملک اور قوم کی ترقی اور اصلاح میں نعمت غیر مترقبہ ہے- خدا انہیں عمر طویل عطا فرمائے اور امن دشمنوں کی گرفت سے محفوظ رکھے آمین-

آغا شیر احمد خاموش

آغا شیر احمد خاموش ملتان میں ایڈووکیٹ ہیں ان کا خاندان کبھی ہندوستان کے باہر سے آیا تھا- شعر و ادب کے دلدادہ ہیں اور معمر انسان ہونے کے باوصف اشعار میں دور جدید کا رنگ حاوی ہے- فارسی ان کی مادری زبان ہے لیکن وہ دن رات اردو کی توسیع و ترویج میں سرگرداں ہیں-

ملتان میں آئے دن کے ادبی ہنگاموں کا دارومدار جناب خاموش سے قائم ہے- ہمارے زمانے کو ایسے بزرگوں کی ضرورت ہے- جن سے نوجوان نہ جھجکیں اور وہ نوجوانوں پر اپنی بزرگانہ عظمت کا رعب نہ ڈالیں- یہی سبب ہے کہ خاموش صاحب ہر دلعزیز شخصیت ہیں وہ عرصہ سے ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جس میں اپنی زندگی کے اہم نظریات کو اقوال کی صورت میں ایک خاص رنگ سے پیش کرنا چاہتے ہیں نہ معلوم وہ کہاں تک پہنچی ہے وہ کتاب چھپ گئی تو ادب میں گراں قدر اضافہ کا باعث ہوگی-

جگندر ناتھ خمار بہل

جگندر ناتھ بہل سرخ و سپید نوجوان تھے- یہ ابھی کالج میں تھے ان کا ذوق شعری بیدار ہوا اور مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے مگر پھر معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا ذوق آگے بڑھا یا زندگی کی جدوجہد میں گم ہو گیا سنا ہے کہ امرتسر میں کسی بنک کے مینیجر ہیں-

رفیق خاور جسکانی

ملتان میں رہتے ہیں اور تحصیلدار قسم کے کسی عہدہ پر فائز ہیں۔نظم اور غزل دونوں پر برابر کا عبور ہے اور تنقیدی مضامین میں بھی بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں۔ان کی شاعری میں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ہے اور شعراء میں انہوں نے بہت جلد اپنا ایک مقام نکال لیا اور اس میں جہاں ان کے شعروادب کا افسوں ہے وہیں ان کی دوست نوازی بھی مسلم ہے۔

میں نے ان میں کوئی ایسا عیب نہیں دیکھا جو عموماً نوجوانوں میں بلندی کے احساس سے پیدا ہو جاتا ہے شریف اور باحیا قسم کے انسان ہیں اور مطالعہ کے رسیا' آج کل سنا ہے کہ کسی محکمانہ چکر میں پریشان ہیں اور راتیں دعاؤں میں گزرتی ہیں۔

خمار دہلوی

جناب خمار دہلوی سے دہلی میں تو اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن تقسیم کے بعد جب سے وہ پاکستان میں آئے ہیں ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے۔وہ ریڈیو کے ادارہ سے منسلک ہیں اس لیے اور بھی فاصلہ ہوگیا وہ اچھے اور پختہ مشق شاعر ہیں اس وقت تو وہ نظمیں بھی کہتے تھے لیکن اب نہ معلوم ان کی شاعری نے کدھر رخ کرلیا ہو۔ان کا کوئی مجموعہ بھی نظر سے نہیں گزرا۔میرا خیال ہے کہ انہوں نے ضرور ترقی کی ہوگی کیونکہ ریڈیو میں ترقی کے بہت امکانات ہوتے ہیں۔

بشیر احمد خلش دہرہ دونی

خلش صاحب دہرہ دون کے رہنے والے ہیں لیکن وہ مشاعروں میں سہارنپور تک مار کرتے تھے۔اچھا خاصا سلجھا ہوا شعر کہتے تھے اور اس وقت درمیانہ درجے کے شعراء میں گنے جاتے تھے اب تو ان کی مشق بڑھ گئی ہوگی کیونکہ ان میں ان کے مستقبل کے آثار بولتے تھے اور پھر ان کے یہاں اصلاح و مطالعہ کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

حکیم خورشید حسن خورشید سہارنپوری

قدیم رنگ میں اچھا معقول شعر کہتے تھے لیکن ضعیفی میں صحافت انہیں لے بیٹھی راتوں کو اخباروں میں کام کیا اور آنکھیں کھو بیٹھے شروع شروع میں ''نوائے پاکستان'' کے مدیر تھے اور نظم ونثر پر برابر کا عبور تھا۔ آخر عمر میں راولپنڈی چلے گئے تھے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

خلیق صدیقی سہارنپوری

لاہور میں کسی اخبار کے مدیر تھے پھر یک دم غائب ہوئے تو ان کا نام رنگون کے اخبار ''شیر'' پر چھپا۔ اس کے بعد پھر گم ہو گئے آج کل ڈاکٹر سیتا دادی ممبر پارلیمنٹ کہلاتے ہیں اور اچھوتوں کے لیڈر ہیں شعر وادب پر نہایت ستھرا انداق پایا ہے اور اخبار نویسی میں بھی سیکڑوں صحافیوں پر سبقت رکھتے تھے اور بحیثیت دوست بھی نہایت اچھے اور بھلے آدمیوں میں کہے جاسکتے ہیں ممکن ہے کہ ان کی کوئی کتاب چھپی ہو کیونکہ اچھوت قوم کا لیڈر بننے میں انہیں بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا لیکن میری نظر سے اب تک ان کا کوئی کارنامہ نہیں گزرا۔

خورشید فرید آبادی

جناب خورشید بڑے کہنہ مشق لوگوں میں ہیں میں نے جب سے شعر وشاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے انہیں شاعری میں اسی طرح دیکھا ہے وہ اب تک اسی طبیعت کے مالک ہیں اور بڑی دقت نظر اور کدو کاوش سے شعر کہتے ہیں وہ فی البدیہہ فرمائشی نظمیں بھی کہتے ہیں اور ان میں بھی وہی ان کے تغزل اور مشق ومزاولت کی شان پائی جاتی ہے۔ تقسیم کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں اور پینے پلانے والے لوگوں کی سوسائٹی کے اچھے رکن ہیں۔

خواجہ دل محمد

خواجہ دل محمد صاحب لاہور کی بڑی اہم شخصیتوں میں تھے۔ میں ان سے جب ملا ہوں جب وہ اسلامیہ کالج میں پرنسپل تھے اور جب سے مرتے دم تک وہ مہربان رہے۔ میں نے پنجاب میں آکر ایسے بے تعصب اور مخلص آدمی بہت ہی کم دیکھے ہیں۔ خواجہ صاحب ریاضی میں بلند مقام رکھتے تھے

اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے ریاضی میں پنجاب نے آج تک ایسا آدمی پیدا نہیں کیا۔ شاعری میں بھی معمولی قسم کے انسان نہیں تھے ان کی تصانیف ان کی اہمیت کے لیے بہت ہیں وہ شاعر اور ریاضی دان سے زیادہ مخلص انسان تھے میں نے انہیں ہمیشہ غیور مسلمان اور مخیّر انسان دیکھا ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

سردار موہن سنگھ دیوانہ سید کسراں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کامیابی سے حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور اورینٹل کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے ترقی کرتے کرتے ریڈر ہو گئے۔

اورینٹل کالج میں آپ انگریزی اور پنجابی ادب کی درس و تدریس کے معزز عہدے پر فائز رہے اور ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان چلے گئے اور دہرہ دون میں استاد مقرر ہوئے پھر امرتسر چلے آئے اور اب تک وہیں پنجابی زبان کی خدمت میں مشغول ہیں۔ جناب دیوانہ مختلف زبانوں کے ادب پر عبور رکھتے ہیں خاص کر اردو زبان میں انہیں اس قدر مہارت ہے کہ وہ بلاشبہ اردو کے استاد کہے جاسکتے ہیں۔ اردو غزل اور نظم دونوں میں ایسی دسترس ہے کہ پڑھنے والا انہیں ایک خاص انداز فکر و اصول شعر کا انسان سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں دیوانہ سے جتنی بار ملا ہوں متاثر ہو کے اٹھا ہوں ایک بار سری نگر میں جناب فدا علی پشاوری اور میں ان سے ملے اور کئی گھنٹے نشست رہی اس میں دیوانہ صاحب نے اس قسم کی گفتگو کی کہ میں خود کو ان سے بہت نزدیک محسوس کرنے لگا اور پھر جب بھی ملے تو بے تکلفی سے پیش آئے دیوانہ صاحب کے چہرے پر ایک نورانی تقدس کا پرتو سا تھا جسے اہل نظر ہی محسوس کر سکتے تھے۔ وہ نہایت خلوص مروت اور اخلاق کے انسان ہیں اور اردو زبان کے لیے ان کا دم غنیمت ہے۔

دیوانہ صاحب کے یہاں شباب و شعر کا ایک ایسا آمیزہ ہے کہ خال خال لوگوں میں نظر آتا ہے وہ جدید نقش گری سے کام لیتے ہیں ان کے یہاں ایک ایسا تاثر ہے جسے ہم ان کی روحانیت کا اثر کہہ سکتے ہیں وہ متعصب قسم کے انسان نہیں بلکہ ان کے مشرب میں درویشی کی رمق ہے وہ ہر آدمی

سے محبت کے قائل ہیں ان کی شاعری میں مترنم بحروں کے ساتھ الفاظ میں بھی موسیقی کے بار جھنکار دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ دیوانہ صاحب اپنی علمی ادبی کاوشوں اور شاعری میں موجودہ دور کے تقاضوں سے بھی آشنا معلوم ہوتے ہیں اور کہیں کہیں وہ جھلک بھی آ جاتی ہے لیکن ان کی وہ شباب اور بہار کی کیفیات جو ہندی کی چاشنی لیے ہوئے پنجابی معاشرے کی راہ سے اردو نظم میں داخل ہوئی ہیں۔ نہایت پر کیف اور موثر ہیں تشبیہات و استعاروات کا استعمال جانتے ہیں اور انہیں نہایت استادانہ فنکاری سے ادب وشعر میں لاتے ہیں اور اردو ادب پر انہوں نے انگریزی زبان میں ایک اچھی خاصی کتاب سپرد قلم کی ہے۔

دعاڈبائیوی

جناب دعا ڈبائیوی میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں وہ بڑے تیور کے شاعر ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں ان کے یہاں رعایت الفاظ اور زبان و بیان کے تمام محاسن بولتے ہیں۔ آج کل کراچی میں ہیں اور کسی دفتر سے منسلک ہیں شروع سے ان کے گرد شاگردوں کا ہنگامہ رہا ہے چنانچہ کراچی میں بھی ان کی رہبری کا سلسلہ اسی طرح ہے اور یہ اردو کے لیے ایک سبب ہیں ترقی اور توسیع واشاعت کا ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی دونوں اپنے شباب پر ملتی ہیں۔ معلوم نہیں کلیات چھپا ہے یا نہیں؟

رشید احمد خاں درویش میرٹھی

جناب درویش میرٹھ کے رہنے والے تھے تقسیم ملک میں دہلی سے راولپنڈی آ گئے تھے۔ ان کی ایک کتاب ''سحر حلال'' میرٹھ کے دوران میں ہی چھپی تھی۔ پختہ مشق اور نغز گو شاعر تھے سینے میں حساس دل تھا۔ غربت کے مصائب کے ساتھ تپ دق نے آلیا اور راولپنڈی ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ ایسا بانکا شاعر مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

دل لکھنوی

میں جب لکھنؤ گیا تو اس وقت دل کی عمر زیادہ نہ تھی اور زخمی صاحب کی معیت میں جب کلکتے گئے تو دل نے غزل بھی پڑھی اسی وقت سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اگر کسی اچھے استاد سے تربیت پا گیا تو اچھا شاعر ہوگا - اگرچہ دل کا ترنم اس وقت اس کے اشعار کو پر لگا دیتا تھا لیکن میری نظر نغمہ پر نہیں شعر پر رہتی ہے اس لیے دل میں اس کی ترقی کے بڑے چلبلے جراثیم محسوس کر رہا تھا - اب وہ پہلے سے بہت اچھے اور بلند شاعر ہو گئے ہوں گے - آمین!

درد سعیدی

محمد صدیق خاں درد سعیدی ٹونکی حضرت بسمل سعیدی کے تلامذہ سے تھے - ٹنڈو آدم ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا - ان کا دیوان ''شعلہ جاں'' کراچی میں سلطان حسین پبلشر نے شائع کیا ہے غزل میں روانی اور نظم میں تسلسل قائم رکھتے تھے - خدا مغفرت کرے -

سرو پر کاش دامن

سرو پر کاش دامن چنیوٹ کے ایک باوقار امیر خاندان کے چشم و چراغ ہیں تقسیم کے ہنگامے میں وہ دہلی چلے گئے تھے اور اب کسی بنک کے مینیجر ہیں - لاہور ہی میں وہ نہایت اچھا شعر کہتے تھے - غزل اور نظم دونوں میں انہیں مہارت تھی - دلی میں جا کر نہ جانے کیا گزری ہوگی کیونکہ دلی ہو یا لاہور باہر سے آنے والوں میں کوئی بھی مصائب و آلام کا شکار ہونے سے نہیں بچا - بہت سے لوگ، تو حالات کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گئے ہیں - دامن کے سرمایہ شعری کا نہ جانے کیا انجام ہوا ہوگا - کبھی ملنا ہو تو پتہ چلے -

سعید الحسن دور کانپوری

جناب دور کانپوری کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب پہلی بار لکھنؤ کے مشاعرے میں گیا اس وقت وہ نوجوان تھے اور ترنم سے پڑھتے تھے - ایک تو ان کا اپنا اسلوب اور پھر آواز مل جل کر ایک ایسا افسوں طاری کر دیتے تھے کہ سننے والے کسی اور ہی فضا میں گم ہو جاتے تھے - مگر اسی عالم میں جوانی کی

کسی خامی کا شکار ہو گئے اور آج تک اسی میں مبتلا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی مشق و مزاولت اب بڑھ کر کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہو گی لیکن وہ ادبی ماحول سے کٹ کر دور کسی دھند میں گم ہو گئے۔ کبھی کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو پرانی صحبتیں یاد آ جاتی ہیں۔

صفی حیدر دانش

جناب صفی حیدر دانش کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ بریلی کالج میں لیکچرر تھے۔ آج کل راولپنڈی میں بھی وہ کالج میں استاد ہیں۔ ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری ہے اور ظاہر ہے ایسے انسان سراپا معلومات ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جناب صفی حیدر دانش اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے قابل قدر استاد ہیں۔ قدیم ڈھب کی روائیتی شاعری ہی نہیں بلکہ اس دور سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی شاعری ان کے یہاں اپنے صحیح خدوخال سمیت ملے گی۔ ان کا بریلی کالج والا دوران کی شاعری کا شباب تھا اور اس دور میں جس مشاعرے میں جانا ہوتا تھا اس میں جناب صفی حیدر دانش کا نام ضرور سامنے آتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد جب آپ راولپنڈی میں آئے اتفاق ہے کہ ان کا دور خاتمے پر تھا اور یہ جس معاشرے کے انسان ہیں وہ معاشرہ دم توڑ رہا تھا اور جو معاشرہ اس کی جگہ لے رہا تھا وہ ان سے بالکل الگ تھلگ کی بات تھی۔ چنانچہ یہاں آ کر جب انہوں نے ماحول پر نظر ڈالی تو انہیں ایسی فضا ملی کہ جوان کے اقدار حیات کی تنقیص یا تغلیط کرتی تھی اور ہر آدمی کا یہی خاصہ ہے کہ اپنے خیالات سے ہٹ کر وہ فن کی نئی تعمیر کو مذہب کی تبدیلی کی طرح محسوس کرتے ہے چنانچہ دانش صاحب کے یہاں نئے زاویہ نگاہ یعنی دور جدید کے اسلوب بیان نے جگہ نہیں پائی جہاں تک ان کی فضیلت اور علمی تبحر کا سوال ہے وہ ناقابل فراموش ہستی ہیں اور ان کی کئی تصنیفات و تالیفات مجھ سے زیادہ ان کی ادب نوازی کی شاہد ہیں۔

حیدر دانش نے جو شاعری کی ہے وہ بھی ہرگز نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں اس سے ہمارے رجحانات کی بدلتی ہوئی اقدار بھی نمایاں ہیں اور تاریخ ادب میں ان کا ایک مقام ہے۔

حضرت دل شاہجہاں پوری

حکیم ضمیر الدین صاحب دل شاہجہاں پوری نے عربی کی درسی تعلیم کے بعد فقہ وحدیث صرف ونحو اور تفسیر کے بعد طب کی طرف رجوع کیا اور اپنے آبائی پیشہ طبابت میں مشغول ہو گئے۔

ابتداء سے شعر و شاعری سے ذوق تھا لیکن جب سے امیر مینائی سے تلمذ ہوا اچھا، صاف اور رواں شعر کہنے لگے تھے یہی ذوق انہیں استاد کی خدمت میں رام پور بھی لے گیا اور وہاں استاد کے علاوہ دیگر اساتذہ سے استفادہ کرتے رہے۔ ان کے رنگ تغزل میں لکھنؤ کے بجائے دہلی کا رنگ نمایاں ہے۔ دل صاحب کی زبان تو ضرور لکھنؤ کی ہے لیکن وہ لکھنؤ اسکول کے مقلد نہیں بلکہ دہلی کے طرز بیان اور اسلوب شعری کو اپنا صحیح راستہ خیال کرتے ہیں۔ جہاں تک فن کی واقفیت کا سوال ہے اس سے وہ خوب آگاہ ہیں اس میں نغمگی اضافہ ہے۔ ان کی کہنہ مشقی اور پختگی میں بناوٹ یا تصنع دور دور نہیں ملتا۔ وہ نہایت سادگی اور صفائی سے جذبات نگاری کرتے ہیں جس میں سوز و گداز اس کا خاص عنصر ہوتا ہے اور یہی ان کا خاص رنگ ہے کہیں کہیں جلال کے انداز کی شباہت ضرور آ جاتی ہے باقی ان پر کسی شاعر کا اثر نمایاں نہیں وہ مہذب ہیں اور مہذب جذبات و خیالات کو قلمبند کرتے ہیں۔ کہیں کہیں قافیہ کے تعاقب کی وجہ سے وہ اپنی پٹری سے اتر جاتے ہیں لیکن ایسے اشعار زیادہ نہیں ہیں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے لیکن نہیں معلوم نغمہ دل بھی اس میں شامل ہے یا نہیں!

درد نکودری

پرانے کہنے والوں میں اچھا کہنے والے ہیں۔ ان کے یہاں عموماً غزل ہوتی ہے اور جناب جوش ملسیانی کا اس سرزمین پر ایسا اثر ہے کہ بہت سے لوگ اسی رنگ میں کہتے ہیں جو داغ کا نکھرا ہوا چربہ ہے۔ درد بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں محاورہ اور روزمرہ کا استعمال عموماً برمحل ملتا ہے۔

درد کاکوروی

جناب درد کاکوروی بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں لاہور ہی میں ملاقات ہوئی تھی لیکن سنا ہے کہ اب کراچی چلے گئے ہیں جناب درد کاکوروی اس قدر جرائد اور اخبارات میں چھپے ہیں اور چھپتے ہیں کہ ان سے اخبار بیں اور جرائد پسند طبقہ اچھی طرح واقف ہے- وہ قدیم روش اور قدیم خیال کے پختہ مسلمان ہیں اور ان کی شاعری اخلاقی اقدار سے کبھی باہر نہیں ہوتی ان کی کئی کتابیں بھی ہیں لیکن کوئی مجموعہ کلام ان کا میری نظر سے نہیں گزرا-

دوست جالندھری

جناب دوست پرانے کہنے والوں میں ہیں اور لاہور میں یہ ریلیجس بک سوسائٹی سے منسلک ہیں- نظم اور غزل دونوں میں انہیں دسترس ہے اور اپنے ہم عصروں میں اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں کچھ دنوں مولانا تاجور مرحوم سے اصلاح لی ہے پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کہیں اصلاح لی ہے یا نہیں ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں-

دیا نرائن نگم

نگم صاحب رسالہ ''زمانہ'' کانپور کے مدیر و مالک تھے اور وہ جب تک رہے زمانہ نہایت خوش اسلوبی سے چلتا رہا- ''زمانہ'' نے جو اردو کی خدمت کی ہے وہ اردو زبان میں بڑا تندرست اضافہ ہے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے والوں میں جہاں نولکشور کا نام آئے گا وہیں نگم صاحب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا- جہاں وہ زبان و قلم کے دھنی تھے وہیں وہ انتہائی درجہ کے خلیق انسان بھی تھے- ہندوستان بھر کے شعراء و ادباء سے رابطہ رکھتے تھے اور وہ رابطہ خلوص پر مبنی ہوتا تھا-

ذوالفقار بخاری

بخاری صاحب کو میں ان کی شملے کی زندگی سے جانتا ہوں اور مجھے اسی وقت سے ان کی غیر معمولی ذہانت کا علم ہے- ریڈیو میں آکر انہوں نے اردو کی جو خدمت کی ہے اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں- بخاری صاحب نظم اور گیت کے بھی شاعر ہوں گے- لیکن ان کی غزل بڑی مرصع اور

چاروں طرف سے لنگر ڈالے ہوئے ہوتی ہے- زبان و بیان صاف شستہ اور الفاظ و معانی کی پرکھ خاص طور پر قابل دید ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو ایک زمانے سے اچھے شاعروں کے مجمع میں رہے اچھی علمی ادبی صحبتیں اٹھائیں اور اچھا زمانہ ملا- ان کو تو لازمی طور پر ایسا ہونا چاہئے تھا- ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا-

ذوقی (گونڈہ)

جناب ذوقی سے جب میری ملاقات ہوئی اس وقت وہ تعلیم کے شعبے سے متعلق تھے اور ان کے شباب کے ساتھ ان کی شاعری بھی شباب پر تھی ان کی نظموں میں جذبات وخیالات ہی کی عکاسی نہیں وہ مناظر فطرت کو بھی اس کی جزئیات کے ساتھ نظم کرتے ہیں- اور اس فن میں انہیں بڑا ملکہ ہے- جناب ذوقی جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے ادیب ہیں- آج کل نہ جانے کہاں ہوں گے- ان کا ہنستا ہوا چہرہ اب بھی میرے سامنے ہے-

ذکاءاللہ بسمل

جناب ذکا اللہ بسمل چکوال میں وکالت کرتے تھے ان کا رجحان فلسفے کی طرف تھا اور خوب شعر کہتے تھے لاہور کی علمی ادبی مجلسیں ان کے دم سے شاداب تھیں مگر دنیاوی مصروفیات یا پیشہ وکالت نے انہیں علم وادب سے اچک لیا اور اب ایک عرصے سے علمی فضا سے غائب ہیں-

ذاکر حسین فاروقی

جناب ذاکر حسین فاروقی بڑے فاضل آدمی ہیں- انہوں نے جناب آرزو لکھنوی کی کتابوں پر مقدمے بھی لکھے ہیں- جن میں ان کی فضیلت اور ادب آشنائی بولتی ہے پھر جناب شفیق کوٹی کے پاس ایک کتاب ''سیماب'' کا قلمی مسودہ نظر سے گزرا جو جناب سیماب اور ان کے فن پر سیر حاصل تبصرہ ہے اور جو ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی- ذاکر حسین صاحب نے اس میں بھی اپنے قلم اور اسلوب بیان کی ایسی ایسی بلندیاں پیش کی ہیں کہ وہ ایک کتاب انہیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے اور نہ جانے انہوں نے کیا کیا لکھا ہوگا جس کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا-

ذاکر دہلوی

جناب ذاکر نابینا ہیں مگر نہایت ذہین اور فطین انسان- پہلے لاہور میں تھے آج کل کراچی میں مقیم ہیں ترنم سے پڑھتے ہیں اور جو کلام وہ سناتے ہیں وہ بھی خوب ہوتا ہے-نواب سراج الدین سائل کے شاگرد ہیں اور کلام میں وہی سادگی اور غنائیت موجود ہے-ابھی مجموعہ کلام نہیں چھپا-

جب جناب ذاکر دوستوں میں بیٹھ کر بے تکلف ہو جاتے ہیں اس وقت وہ گانا بجانا بھی روا خیال کرتے ہیں- چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ''دونوں ہاتھوں سے تالی بجتی ہے'' ذاکر صاحب نے اس مثل کو غلط ثابت کر دیا وہ صرف ایک ہاتھ سے تالی بجاتے ہیں جس میں دونوں ہاتھوں کی تالی سے زیادہ غنائیت ہوتی ہے-وہ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب صحافی بھی ہیں-

ذوقی مظفر نگری

محمود حسن ذوقی مظفر نگری جیسا کہ نسبتی ٹکڑے سے ظاہر ہے مظفر نگر کے رہنے والے ہیں اور معلمی کرتے ہیں- حالانکہ ایسی زیادہ عمر نہیں مگر نظر کمزور ہونے کے باعث شاعرانہ جلت پھرت کے انسان نہیں ہیں- جہاں تک فن دانی اور رموز شناسی کا تعلق ہے وہ اس میں طاق ہیں شعر جلد بھی کہتے ہیں اور جب تک چاروں چولی برابر نہ ہو جائیں مطمئن نہیں ہوتے ان کے یہاں اسی وجہ سے فنی اسقام نہ ہونے کے برابر ہیں- نازک طبعی کے باعث مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا ہے جو ان جیسے انسان کی ادبی زندگی کے لیے مفید نہیں-

محمد شفیع ذاکر دہلوی

جناب ذاکر دہلوی' شاکر دہلوی کے قریبی عزیزوں میں ہیں اور ان میں بھی وہی دلی کی زبان کے جلوے شاعری میں چراغاں کرتے ہیں وہ شاکر دہلوی کی طرح نواب سائل کی تقلید میں اسی طرح ترنم سے غزل پڑھتے ہیں مگر ان میں وہ مولوی مدن کی سی بات نہیں اس کے لیے تو جذبے اور خلوص کی بھی تو ضرورت ہے جو کانوں کے راستے سے دلوں پر اترتا ہے-

کشمیری لال ذاکر

ذاکر صاحب نئے آدمی نہیں تھے وہ ایک زمانے سے شعر کہتے اوران میں بڑی مشق تھی- وہ اول جلول قسم کا شعر نہیں کہتے تھے بلکہ نہایت سوچ سمجھ کر! زمانہ ہوگیا- تقسیم کے بعد کچھ پتہ نہیں رہا کہ کون کہاں ہے اور آج تک دونوں ملکوں میں فاصلہ ہے کسی کے متعلق کیا کہا جائے-

ذکی وارثی

ذکی وارثی صاحب سے بھوپال کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی وہ بھوپال کے پختہ مشق لوگوں میں تھے ایک استادانہ روش اور وقیع معلومات کے انسان تھے شعری اور باسط دونوں مشہور شاعر جناب ذکی وارثی کے شاگرد ہیں- ذکی صاحب کا سلسلہ امیر مینائی سے ملتا ہے مگر وہ داغ اسکول کے شاعر تھے ان کے یہاں قدیم کلاسیکل شاعری نے ایک شگفتہ روپ دھار لیا تھا جو نہایت خوشنما معلوم ہوتا تھا-

ذرہ کانپوری

جناب ذرہ کانپوری طنز و مزاح کی شاعری کرتے ہیں اوران کی شاعری مقصد کے اعتبار سے بڑے بڑے صاحب دیوان شاعروں پر بھاری ہے- میں انہیں ایک زمانے سے جانتا ہوں وہ اپنے رنگ میں خوب خوب شعر نکالتے اور جرأت سے پڑھتے ہیں ان کے یہاں تہذیب وتمدن کے نشیبوں اور اخلاق کے ڈھلوانوں پر پھسلنے والوں پر نہایت مزیدار طنز ہوتا ہے- ان کے یہاں مزاح میں احتیاط پائی جاتی ہے اور یہ بڑی مشکل بات ہے-

راس مسعود

راس مسعود صاحب سرسید کے پوتے اور ڈاکٹر محمود کے لڑکے تھے ان کی آخر عمر بھوپال میں گزری وہ ظاہری صورت میں تو انگریزوں کے مقلد تھے لیکن ان کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور ہمیشہ ان کی نظر مسلمانوں کی بہبود پر رہتی تھی- وہ جلوت میں غیر دلچسپ لیکن خلوت میں نہایت ہنسوڑ اور خوش مذاق انسان تھے- حساس دلوں کی طرح ان کے دل پر بھی ایک غم مسلط تھا جسے بہت کم لوگ

جانتے تھے اور اس غبار کو غربا کی امداد سے ہلکا کرتے تھے۔ وہ رحم دل بھی تھے اور صاحب ضبط بھی۔

ڈاکٹر رفیق (ہومیو)

جناب رفیق احمد ہومیو پیتھی کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اس فن پر انہوں نے دسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ جس سے ان کی افتاد طبع اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ فکر اور محنت دونوں کے عادی ہیں اور ہر دو وصف ایسے ہیں جو فنکار کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ رفیق احمد صاحب کو فلسفہ ہومیو پیتھی پر قابل رشک عبور ہے وہ دوائیں خود تیار کرتے ہیں باہر کی بنی ہوئی دوا سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر رفیق صاحب نے فن ہومیو پیتھی کی نشر و اشاعت میں بھی بڑی سعی کی ہے۔ جب لاہور میں اس فن کے بہت کم لوگ تھے اس وقت انہوں نے اس کا اسکول قائم کیا ہوا تھا اور اس فن کو عوام تک پہنچانے میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔

سید ذاکر حسین برنی

جناب ذاکر حسین برنی بھکر ضلع میاں والی میں ہیں ہر چند کہ وہ قدیم شاعری کے دلدادہ ہیں لیکن جہاں تک شاعری کے اثر کا تعلق ہے وہ سامعین پر اپنا نقش ضرور چھوڑتے ہیں۔ وہ فنی قیود کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور جدید سیلاب کا شکار ہونا نہیں چاہتے۔ بلکہ ایک عام فہم اور پر مقصد شاعری کو زندگی اور معاشرے کے لیے مفید خیال کرتے ہیں۔ جناب ذاکر حسین برنی کے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی میں ایک لذت پائی جاتی ہے۔ جو پائیدار بھی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو کون نہیں جانتا کہ وہ ہندوستان کی مشہور شخصیت ہیں اور جامعہ ملیہ دہلی انہی کے دم سے وجود میں آیا ہے اور زندہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر علمی ادبی اور تعلیمی آدمی ہیں لیکن حکومت ہند انہیں اپنے مفاد کے لیے جہاں چاہے استعمال کر لیتی ہے اور چونکہ وہ بڑے ذہین اور مثالی انسان ہیں وہ ہر جگہ محنت اور خلوص سے کام کی بنا پر ہر جگہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو جاتے ہیں اور کانگریس سے ان کا نباہ ان کی عالی ظرفی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سر رضا علی

جناب سر رضا علی صاحب کی صدارت میں میں نے کئی مشاعرے پڑھے ہیں- شملے کے اکثر مشاعرے انہیں کی صدارت میں ہوتے تھے اور وہ جس شاعر پر جو فقرہ چست کرتے تھے وہ شاعر کے کلام سے زیادہ پر لطف ہوتا تھا- ایک دن مجھے ایک انگریزی ہوٹل (شاید سیسل ہوٹل) میں لے گئے غالباً وہ وہیں مقیم تھے- چائے پر انہوں نے ایسے ایسے سیکڑوں شعر سنائے کہ ان کے حافظے اور انتخاب پر حیرت ہوئی ان کی کتاب ''اعمالنامہ'' ان کی تحریر کے حسن اور اسلوب کا بہترین نمونہ ہے اگر چہ وہ ان کی سوانح ہے لیکن میں اسے ادبی تاریخ کا ایک اہم جزو خیال کرتا ہوں-

آل رضا

سید آل رضا سے میری ملاقات لکھنؤ کے مشاعروں میں ہوئی تھی وہ لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے- تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی-

رضا صاحب کو جناب آرزو لکھنوی سے شرف تلمذ ہے اگر چہ رضا صاحب لکھنؤ کے باسی نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے، لکھنؤ کے شعرا وادبا کے طبقے آل رضا کی شاعری اور ان کی ذات کو لکھنو کے لیے فخر خیال کرتے تھے- یہی نہیں بلکہ لکھنو میں ایک انجمن ''معین الادب'' تھی جس میں حضرت صفی لکھنوی بھی تھے اور حضرت ظریف بھی- لیکن اس انجمن میں نائب صدر کی حیثیت سے آل رضا کا انتخاب ہی ہوا وہی انجمن آگے چل کر ''بہار ادب'' کے نام سے موسوم ہوئی اور اس میں بھی رضا صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے- میں ''بہار ادب'' کے مشاعروں میں شریک ہوتا رہا ہوں-

جناب رضا اعلی رتبہ کے غزل گو ہیں یوں تو نظم، غزل کے علاوہ مرثیہ جیسی صنف پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطری طور پر غزل گو شاعر ہیں اور جیسے وہ خود لطیف الطبع اور پر تکلف انسان ہیں- بالکل اسی طرح وہ اپنی غزل کے آئینے میں بھی نظر آتے ہیں- شعر میں ان کے جذبات اور احساسات اس خوبی کے ساتھ ابھرتے اور نکھرتے ہیں کہ مفہوم تصویر بن کر سامنے آ جاتا ہے ان کے یہاں محل وقوع کے مطابق الفاظ کا چناؤ قابل داد ہے- رضا صاحب ایمائیت اور اشاریت میں ایسے ایسے نازک معاملات آسانی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں جو نثر میں بھی ہزار کوششوں کے باوجود

تلخی اور ناگواری سے نہیں بچ سکتے - ان کے اسلوب میں گیرائی کے ساتھ ایسی گہرائی ہے کہ اس میں انسانیت کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کی ترجمانی بڑی تفصیل سے ہو سکتی ہے - ان کی غزل عامیانہ روش اور سوقیانہ انداز بیان سے معرا ہے - جناب رضا کی غزل سے ہمیں جلال، صفی اور آرزو جیسے اساتذہ کے فن اور ان کی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے - اساتذہ قدیم کی طرح رضا صاحب بھی روحانی مسائل ہوں یا جسمانی لطافتیں اپنے شعر کے سانچوں میں ڈھال کر انہیں عام فہم اور دل نشیں کر دیتے ہیں -

زبان و بیان کے اعتبار سے رضا صاحب قابل تقلید شاعر ہیں ان کے یہاں لکھنؤ کی نزاکت بھی ہے اور دہلی کی لطافت بھی، ان کی شاعری محبوب کی طرح حسین بھی ہے اور سنجیدہ بھی اس میں تلخی کے تیور بھی ہیں اور مسکراہٹوں کے جھولے بھی -

رسا جالندھری

جناب رسا، حضرت صفی لکھنوی کے شاگرد ہیں اور ان کی پختہ مشقی انہیں استادی کے مقام پر لے آئی - نہایت اچھی غزل کہتے ہیں یوں تو ہر صنف سخن پر قادر ہیں - لیکن ان کی غزلیں اس معیار کی ہیں کہ جنہیں اساتذہ کی صف میں رکھتے ہوئے کسی قسم کی جھجھک نہیں ہونی چاہئے - زبان و بیان پر انہیں قدرت ہے اور شعری عیوب و محاسن پر گہری نظر رکھتے ہیں - وہ بحیثیت انسان بھی مخلص اور قابل قدر شخصیت ہیں -

روش صدیقی

روش صدیقی جوالا پوری اس دور میں جوان تھے جب مولانا تاجور نجیب آبادی (مرحوم) نے ''ادبی دنیا'' کا اجرا کیا تھا - روش صاحب ''ادبی دنیا'' میں مستقل لکھتے تھے - جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ان کا کلام برابر چھپتا دیکھتا تھا - جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے نہایت حسین خیال، بندشیں چست الفاظ کا دروبست ایسا کہ آدمی دیکھتا رہ جائے - ان کی شاعری کا محبوب دوسرے شعراء کے محبوب کی طرح بے پردہ نہیں بلکہ باحیا اور تہذیب و تمدن اسلامی کا پابند معلوم ہوتا ہے - ان کے یہاں کہیں بھی عشق کی بات کھلم کھلا نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک حسین طرز بیان اختیار کر لیتے ہیں ایسا

طرز بیان جو انہیں کئی اچھے شعراء سے ممتاز درجہ دے دیتا ہے۔ ان کے یہاں جب کوئی واقعاتی نظم اترتی ہے تو اس کے خدو خال بھی نہایت تیکھے اور پر اثر ہوتے ہیں۔روش صدیقی نے شاعری کے جن جن گوشوں پر خامہ فرسائی کی ہے انہیں اپنی مرصع نگاری سے جگمگا دیا ہے ان کی شاعری میں جس قدر یکسانی ہے وہ ملک کے کسی شاعر میں نہیں ملتی۔ان کے پچیس تیس برس پہلے کے اور آج کے کلام میں سر موفرق نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر کے ساتھ ان کی طبیعت میں انحطاط نہیں آیا اور ان کی شاعری ''سدا بہار'' ہے ایسی سدا بہار جس پر موسم اثر انداز نہیں ہوتے۔

رئیس احمد جعفری

جناب جعفری عربی فارسی کے فاضل اجل ہیں اور اردو، انگریزی پر بھی قدرت ہے جناب جعفری کا وجود اس ملک کے لیے نعمت ہے ایسا چوکھا مصنف بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ترجمے کے لیے بھی جعفری اپنا جواب آپ ہیں۔جناب جعفری کی قابلیت اور ادبی بلندی کا معیار تو اس وقت معلوم ہوتا ہے جب ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد سامنے ہو اور ان پر عبور بھی ہو۔جناب جعفری جیسا صاحب قلم جہاں بھی ہو وہ اپنے ماحول کے لیے نعمت خداوندی ہے بحیثیت انسان بھی جعفری صاحب قابل تعریف انسان ہیں۔

راز یوری

راز رام پوری کہنہ مشق ادیب اور نغز گو شاعر تھے اور ملک کے اچھے جرائد میں ان کا کلام چھپتا تھا۔نثر میں بھی انہیں مہارت تامہ تھی اور اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج پر بھی ان کا مطالعہ قابل رشک تھا ایک کتابچہ بھی انہوں نے اردو زبان کی تاریخ پر سپرد قلم فرمایا تھا۔مجموعہ کلام جانے چھپا ہے یا نہیں؟ آخر عمر میں ان کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا تھا اور اس میں وہ کسی بزرگ کی سوانح لکھ رہے تھے اس کا حشر بھی معلوم نہ ہو سکا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ن-م-راشد

نذر محمد راشد ایک نہایت ذہین فطین قسم کے انسان ہیں میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ ''ادبی دنیا'' میں چھپا کرتے تھے اور اختر شیرانی جیسے بلند پایہ شاعران کے مداحوں میں تھے- ان کی پہلے پہل کی غزلیں ممکن ہے کہ مولانا تاجور یا ان کے خاندان کی تربیت کا نتیجہ ہوں ان کی تعلیم ان کا مطالعہ ان کی سیر و سیاحت نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس کے بیان اور اظہار کے لیے انہیں اردو شاعری کے مروجہ سانچوں میں گنجائش نظر نہیں آتی اور اس کے لیے انہوں نے اپنے نئے سانچے تیار کیے-

راشد کی یہ ایجاد ایک بغاوت ضرور ہے لیکن مستقبل ہمارے ماضی کی تقلید کے لیے نہیں آتا بلکہ وہ حال کی اصلاح کے بعد نمودار ہوتا ہے اس لیے علمی اور ادبی بغاوت کوئی ایسا جرم نہیں جس کی انگشت نمائی انسان کو شرمندہ کر دے اور پھر ہر دور میں یہ بغاوت ہوتی چلی آئی ہے یہ کوئی نئی بدعت نہیں ہے- راشد کے یہاں نئی ترکیبیں اور تشبیہیں بکثرت ملتی ہیں جس سے ان کا اسلوب تحریر الگ سا ہو گیا ہے- وہ صرف الفاظ تک نہیں بلکہ پرانے خیالات کہنہ اسلوب فرسودہ تراکیب اور کھوسٹ قسم کے انداز بیان کی شکست و ریخت کا دلدادہ ہے اور اس میں اس قدر شدت آ گئی ہے جو بندھے ٹکے طرز اور منجمد قسم کے حالات و نظریات کو ناگوار گزرنے لگا ہے-

راشد کے یہاں نئے خیال اور جدید علوم کی جھلکیاں اس کی شاعری کی پشت پناہ ہیں چنانچہ اس کے یہاں فلسفیانہ مسائل اور نفسیاتی تحلیل شعور اور لاشعور کے نقش اس کی شاعری کے قوام میں شیرینی ہی نہیں ایک کیفیت بھی پیدا کر دیتے ہیں اور ایسا حسن بیان اپنے تنوع کے اعتبار سے ہر شاعر کے یہاں دستیاب نہیں ہوتا- میرا خیال ہے کہ اگر راشد کی شاعری کے زینے سے قاری کا ذہن اسی فضا میں پہنچ جائے جس سے راشد متاثر ہو کر شعر کہتا ہے تو اس وقت راشد کی شاعری کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے- راشد کے یہاں ابہام کا اثر بھی ہے مگر وہ اس قدر گنجلک نہیں کہ کسی مسئلے پر انسان دکھ محسوس کرنے لگے اس کے یہاں تو مختلف معاشروں کی عکاسی اور اپنے معاشرے کے خلاؤں کا احساس ہے جو بعض لوگ جلدی سمجھ لیتے ہیں اور بعض الجھ کر رہ جاتے ہیں- ان کی کتاب

''ماوراء'' میں ان کی تمام خصوصیات مدھم نہیں بلکہ ایک واضح اور روشن انداز میں ملتی ہیں انہوں نے اردو شاعری اور انگریزی سانچوں میں بھی ڈھالا ہے اور کچھ خود بھی ہیئتی تجربات کئے ہیں اب اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا کہ وہ کہاں تک ہماری شاعری کے لیے موزوں اور مفید ہیں- میں جب بھی راشد سے ملا ہوں میں نے انہیں خیالات کی الجھن میں کھویا ہوا اور ایک تفکرات کی دھند میں گھرا ہوا پایا ہے- وہ کچھ سوچتے ہیں جوان کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں کر دیتا ہے وہ لکھتے ہیں اور لکھ کر خود اپنی نگاہوں سے خود پر فیصلے کے لیے متفکر پاتے ہیں- بہرنوع وہ اس دور کے ناقابل فراموش ادیب اور جدت پسند شاعر ہیں جو تیسرے درجے کے شعرا کی سوسائٹی سے دور رہ کر خود کو سنبھالے ہوئے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کب اور کیا لکھ ڈالیں اور کیا کر ڈالیں-

رابعہ فخری

رابعہ فخری جناب فخری پانی پتی کی صاحبزادی ہیں اور راولپنڈی میں محکمہ انفارمیشن یا تعلقات عامہ سے منسلک ہیں باپ کی تربیت نے طبیعت میں ادبی ذوق پیدا کر دیا ہے اور خوب شعر کہتی ہیں مگر ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' کے مصداق ہیں کم گو، کم آمیز بس اپنے کام سے کام دفتر یا گھر وہ سوسائٹی سے گھبراتی ہیں اور تنہائی پسند ہیں ابھی کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا-

احمد رفائی

پروفیسر احمد رفائی ایم اے نصیر آباد اجمیر شریف کے رہنے والے ہیں اور سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں- غزل نہایت اچھی کہتے ہیں- حضرت جگر کی شاعری پر ان کا بہترین مقالہ ہے آج کل گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں استاد ہیں نہ معلوم ان کا یہ مقالہ چھپ گیا ہے یا نہیں- ابھی ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا-

علی احمد رفعت

جناب رفعت احمد پور شرقیہ ہفتہ وار ''دستور'' کے مدیر ہیں اور ظاہر ہے صحافت ادب کے ذوق کے بغیر نہیں پنپ سکتی چنانچہ رفعت صاحب نثر اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے ہیں- لیکن غالباً وہاں

اچھی لائبریری اور مہذب صحبتیں میسر نہیں ورنہ ہر جگہ ادب کا ذوق تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی آ جاتا ہے اور رفعت صاحب کو اتنی فرصت نہیں کہ کسی بزم ادب میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں۔

رونق جودھپوری

جناب رونق جودھ پور کے رہنے والے ہیں ''نغمہ دل'' کے نام سے انتخاب چھپ چکا ہے۔ حیدرآباد میں مقیم ہیں جناب یکتا جودھ پوری کے شاگرد ہیں غزل کہتے ہیں اور ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

خان رشید

رشید اللہ خاں اور قلمی نام خان رشید ہے حیدرآباد سندھ کی درس گاہ میں اردو ڈیپارٹمنٹ سے متعلق ہیں۔ صاحب قلم لوگوں میں ہیں ''تین مثنویاں'' میں انہوں نے بڑی کاوش اور دقت نظر سے کام لیا ہے ہمارے تعلیمی شعبوں میں ایسی ہستیوں کی بڑی کمی ہے خان رشید کی نظر تحقیق و تفحص میں بڑی دوررس ہے انہیں اب تحقیقی کام ہی کرنا چاہئے ان میں اس کی بڑی اہلیت ہے۔

رنبیر جی

رنبیر روزنامہ ''ملاپ'' کے مدیر اور نہایت سلیقے کے اخبار نویس ہیں ان کی نظر میں ہر صاحب قلم کا احترام بھی ہے اور معیار بھی وہ چند منٹ میں مد مقابل کے مبلغ علم کو بھانپ لیتے ہیں اور چند سطور لکھوا کر اخبار نویسوں کی قابلیت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انہوں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور اردو نے انہیں ان کا مقام عطا کیا ہے۔ رنبیر جی بحیثیت انسان بھی انسان دوست کہلانے کے مستحق ہیں وہ اپنے عملے میں تفریق روا نہیں رکھتے ان کی نظر ہمیشہ جوہر پر رہتی ہے۔

راحت اکبرآبادی

احسن فاروقی صاحب کی معرفت ان سے تعارف ہوا تھا۔ اس وقت وہ بھی مردان کالج میں تھے ان کے اشعار میں ان کا مستقبل بولتا تھا۔ ایک زمانہ ہوگیا وہ اب نہایت اچھے شاعر ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں تھے۔ خدا کرے ان کا ذوق تندرست ہو اور

زمانے نے ان کی راہ میں دیواریں نہ کھڑی کر دی ہوں۔

راز مراد آبادی

جناب راز حضرت جگر کے خصوصی شاگردوں میں ہیں طالب علمی کے زمانے ہی سے غزل کے دلدادہ ہیں اور عرصے تک ریڈیو میں رہے ہیں اور پھر وہاں سے واہ فیکٹری میں لیبر آفیسر ہو کے چلے گئے اب تک وہیں ہیں صاحب ذوق اور خوش خلق ہونے کے علاوہ غزل بڑی بھرپور کہتے ہیں اور پھر ترنم سے پڑھتے ہیں جس سے شعر اور جان لیوا ہو جاتا ہے وہ جدید روش کی شاعری کے قائل نہیں بلکہ روایت پسندی ان کا مشرب ہے اور اسی میں ایسا ایسا شعر کہتے ہیں کہ مشاعرہ ڈھیر ہو جاتا ہے۔

رشید رہتکی

جناب رشید ملتان میں مقیم ہیں اور بسلسلہ ملازمت بسر کر رہے ہیں۔ مشاعروں میں انہیں کئی بار سننے کا اتفاق ہوا وہ اپنی نظموں سے مشاعرے کو کشت زعفران بنا دیتے ہیں ان کی نظمیں ''سالی نامہ'' ''بیوی نامہ'' وغیرہ مشاعرہ میں ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں مگر اب تک کوئی مجموعہ نہیں چھپوا سکے اور اپنے مزاح میں غم زمانہ سے زیادہ اپنا غم اور مشکلات بیان کرتے ہیں، جس سے ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کی ترجمانی ہوتی ہے یوں تو وہ خود بھی بے چارے ''صورت ببیں حالم مپرس'' کے مصداق ہیں لیکن ان کا اسلوب ان کے خدوخال کو اور نمایاں کر دیتا ہے۔

احمد راہی

جناب احمد راہی پنجابی کے مقبول شاعر ہیں مگر اردو میں بھی وہ نئے دور کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور پنجابی زبان سے زیادہ ان کی اردو غزلیں انہیں شہرت دے رہی ہیں۔ مشاعروں کے علاوہ ریڈیو اور فلم میں بھی انہیں ایک مقام حاصل ہے اور بحیثیت انسان بھی وہ اچھے خلیق انسان ہیں۔ ان کا کوئی اردو غزلوں کا مجموعہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

راحت دہرہ دونی

جناب راحت مولائی دہرہ دونی ایک سیلون کے مالک تھے اور نہایت اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعری میں علم کم تھا اور جذبہ زیادہ ایسا بھی دیکھا ہے کہ مشاعرے میں غزل پڑھتے پڑھتے کہیں دامن و گریباں کے پرزوں کا ذکر آ گیا اور انہیں داد مل گئی تو اپنا گریبان سچ مچ چاک کر ڈالا بڑا ہی مخلص، نیک اور سیدھا سادہ شاعر تھا تپ دق میں مبتلا ہوئے اور ہفتہ عشرہ میں دنیا کو خیر باد کہہ گئے وہ بڑے زود گو تھے نہ معلوم ان کے مجموعہ کلام کا کیا ہوا ان کے لڑکوں کے پاس ہے یا کوئی اڑا لے گیا۔

رضی ترمذی

جناب رضی ترمذی ریڈیو کے ادارے سے منسلک ہیں۔ وہ روایتی شاعری بھی کرتے ہیں لیکن وہ نئی نسل کے شاعر ہیں اس لیے ان کی روایت میں بھی وہی جدید انداز پایا جاتا ہے۔ وہ سیدھی سادی بات کو بھی جدید انداز دے کر جدید رنگ کی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ غالباً ریڈیو میں محدود ہونے کے باعث زیادہ نہیں ابھر سکے۔ ان کی مصروفیت ان کی ادبی شہرت میں حائل ہو گئی۔

رشید کامل

عبدالرشید نام کامل تخلص اصل وطن میرٹھ ہے لیکن ۴۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور کو وطن بنا لیا اور یہیں سرکاری ملازمت میں ہیں اردو فارسی بقدر ضرورت ہے۔ شاعری کا جذبہ فطرت میں تھا اس لیے مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر فن شعر پر مہارت حاصل کر لی۔ نظم غزل دونوں مہارت سے کہتے ہیں ہیئت کے لحاظ سے اگرچہ انہوں نے نئے سانچے نہیں ڈھالے لیکن قدیم روش کی پابندیوں میں بڑے آزادانہ اسلوب کو عام کیا ہے اور میرے خیال سے صحیح ترقی پسندی اسی کا نام ہے۔ مجموعہ ابھی کوئی نہیں چھپا اب آ کر فلمی گانوں کی طرف راغب ہو گئے۔

رضوی خیر آبادی

نام محمد ابراہیم تخلص رضوی خیر آبادی، زمانہ تعلیم میں گوڑ گانوہ میں رہے اور ۱۹۴۶ء تک بسلسلہ ملازمت دہلی قیام رہا اور روزنامہ جمہور کی ادارت کی ۱۹۴۶ء میں مشہور ملیگ ہاؤس سے

پہلا مجموعہ کلام ''سازنو'' کے نام سے شائع ہوا اور تقسیم ملک کے ہنگاموں میں دہلی سے لاہور آ گئے پہلے قومی دواخانہ میں کام کیا اور پھر دواخانہ حکیم اجمل خاں میں مینیجر ہونے کے باوجود رسالہ ''مجلس'' نکالا جواب تک جاری ہے- ''سازنو'' کی غزلیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا احساس بیدار ہے اور زبان و بیان پر قدرت ہے حسن و عشق کے مضامین بڑے قاعدے سے نظم کرتے ہیں جس سے ان کا معیار اسلوب ابھرتا ہے دوسرا کوئی مجموعہ اب تک نہیں چھپا-

انیس احمد رشدی دہلویؔ

جناب انیس احمد رشدی دہلوی حضرت رشدی خلیقی دہلوی کے صاحبزادے ہیں عربی، فارسی کے فاضل اور انگریزی کے بھی بڑے جید ادیب ہیں- عرصہ ہوا جب یہ معلوم ہوا تھا کہ کہیں کسی باہر کے ملک میں ہیں لیکن چند روز ہوئے پتہ چلا کہ انہوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور اردو کے سلسلے میں کچھ کام کرنا چاہتے ہیں- خدا کامیاب کرے- آمین

رفعت سلطان

جناب رفعت سلطان جھنگ کے رہنے والے ہیں حضرت سلطان باہوؒ کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں محکمہ خوراک میں آفیسر ہیں- نہایت منجھا ہوا شعر کہتے ہیں- ان کے یہاں فارسی عربی کی تراکیب اور مغلق الفاظ کی بھرمار نہیں ہوتی وہ سیدھا سادہ اور عام فہم شعر کہتے ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت یہی ہے وہ اپنے دل و دماغ کو الفاظ میں ڈھال کر نغمہ سے اس میں ساحرانہ کمال دکھاتے ہیں- جناب رفعت سلطان کی طرح بہت کم لوگ اپنے شعر کو موسیقی کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو فن موسیقی پر بھی توقع سے زیادہ عبور ہے- مجموعہ کلام ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا-

رشید اختر ندوی

مولانا رشید اختر ندوی اردو فارسی اور عربی کے فاضل ہیں اور انگریزی پر بھی عبور ہے وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی وہ مورخ بھی ہیں اور مترجم بھی کوڑیوں کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی

ہیں اور وہ ہمارے ملک کے مشہور مصنفین میں ہیں زبان پر انہیں عبور ہے اور الفاظ کے محل استعمال کے لیے انہیں سعی کی ضرورت نہیں ہوتی موقع اور وقت کے مطابق الفاظ قلم سے نکلتے چلے جاتے ہیں- ہمارے ملک کے لیے رشید اختر صاحب کا وجود ایک نعمت سے کم نہیں-

رشیدہ سلیم سیمیں

رشیدہ سلیم سیمیں کو میں ایک عرصے سے سن رہا ہوں اور کئی مشاعروں میں ساتھ رہا یہ پنجابی اور اردو دونوں میں شعر کہتی ہیں اور سامعین سے دونوں پر داد و تحسین وصول کرتی ہیں- ان کے اشعار میں موجودہ دور کے ادبی تقاضوں کے مطابق وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں کہ ان کی قدرت کلام پر حیرت ہوتی ہے- عموماً یہ دیکھا ہے کہ ہر شاعر اپنی مقبول غزل ہی سناتا ہے لیکن رشیدہ میں یہ بات نہیں ان کے یہاں اس کا خیال ہے کہ ایک غزل دیر تک نہیں چلتی- ان کی غزل میں ایک ایسا ہلکا سا سوز ہوتا ہے جو سیکڑوں پردوں سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس سے ان کی شعری احتیاط کا پتہ چلتا ہے اور یہ ایک قسم کا اخفائے شعری ہے-

رضا بدخشانی

محمد رضا الحق رضا بدخشانی' پڑھے لکھے نوجوان ہیں اردو' فارسی اور اسلامیات میں طیلسانی ہیں اور آج کل انگریزی میں ایم اے کی تیاری کر رہے ہیں- پہلے کچھ دنوں مشہور مستشرق ڈاکٹر عبدالرحمان بارکر کے دست راست رہے اور یونیورسٹی کیمپس میں ریسرچ ونگ میں کام کیا- بڑے ہی محنتی نوجوان ہیں اگر انہیں زمانے نے گنجائش دی تو کبھی نہایت اچھے ادیب ہوں گے کیونکہ آلام و مصائب جہاں جان لیوا ہوتے ہیں وہاں فکر کو بلند اور نظر کو عمیق بھی کرتے ہیں- اب رہا ان کی شاعری کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ شاعری کا مواد تو مشاہدات اور تجربات سے مہیا ہوتا ہے اب فطرت جس کو جتنی گنجائش دیتی ہے- جناب رضا کو فن شعر پر عبور ہے- اس لیے ہمیں ان کی طرف سے ان کی اغلاط کی امید اور پستیوں کی توقع نہیں ہو سکتی- جو آج کل کے بلند بانگ شاعروں کا طرہ امتیاز ہے-

رشک انقلابی

سرگودہا کا ایک نوجوان شاعر ہے جسے شعر کہنے کا بے حد ملکہ ہے- خدا کا شکر ہے وہ طویل نظمیں ضرور کہتے ہیں لیکن ان کی نظمیں با مقصد ہوتی ہیں جس کا اس جدید دور میں قحط عام ہے- جناب رشک سرگودہا جیسی جگہ رہ کر بڑی کارآمد شاعری کرتے ہیں- اگر ان کا ذوق شعری اس دور میں تحصیل علم کی طرف مڑ گیا تو اس میں بڑے توانا اور پر دار جراثیم پائے جاتے ہیں- ان کی نظموں میں جوش بھی ہوتا ہے اور روانی بھی جذبہ بھی غالب ہے اور جوش بھی!

رئیس امروہوی

جناب رئیس امروہوی کے متعلق جناب شورش کاشمیری کا ایک فقرہ مجھے پسند ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک اور معاشرے کو رئیس امروہوی جیسے شعراء کی ضرورت ہے جن کی انگلیاں قوم ملک سیاست اور اخلاق کی نبضوں پر رہتی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جناب رئیس بڑے مشاق اور کہنہ مشق شاعر ہیں اور اصناف سخن میں کسی صنف میں بھی ان کے یہاں عجز کا اظہار نہیں وہ جو چاہتے ہیں بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں' وہ تفصیل اور اجمال دونوں کی سرگاہوں سے آگاہ ہیں وہ جیسے شاعر ہیں ویسے ہی صحافی بھی ہیں میں نے کم لوگوں میں رئیس امروہوی جیسا خلوص پایا ہے- وہ عظیم فنکار ہونے کے باوصف عظیم انسان بھی ہیں- ان کے کلام کا مجموعہ ''الف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور وہ مشاعروں کے علاوہ نقادوں کے پڑھنے کی چیز ہے اس میں جناب رئیس کی قدرت کلام و بیان صاف نظر آتی ہے-

ریاض رام

اس صالح نوجوان کو میں نے کئی مشاعروں میں سنا اور جب تک موقع ملا اس کی عادات و اطوار پر بھی نظر رکھی مجھے اس میں صلاحیت کلبلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جھنگ جیسے پس ماندہ علاقے میں ریاض رام ایک گل صحرا کی طرح ہے- ہر چند کہ یہ رنگ جدید کا لکھنے والا ہے لیکن اس کی شاعری میں الجھن نہیں ہے اور اگر کہیں کوئی گـــل جھـڑ معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کی عمر کا تقاضا ہے وقت

انسان کے شعور کو پختہ کرتا اور اچھے برے کی تمیز دیتا ہے علاوہ ازیں زندگی کے تجربات خیالات میں وسعت اور احساسات میں نئے نئے دریچے کھولتے ہیں انہیں دریچوں کے مشاہدات سے شاعر کو رنگینیاں اور گہرائیاں ملتی ہیں اور مشاہدات کا ہجوم ایک سمت اختیار کر لیتا ہے جو طرز یا اسلوب کے نام سے پکارا جاتا ہے- ریاض رام ابھی نوجوان ہیں اور ابھی ان کے احساس کے اکھوے نہیں چھوٹے اور خیالات کی کونپلیں زرد ہیں زمانے کی گرم وسرد ہواؤں سے جب اس نوجوان کا شعور بالغ ہوگا تو امید ہے ہمارے اردو ادب میں بھی اضافہ ہوگا-

رضی جے پوری

جناب رضی جے پوری سے موتی محل کی ایک نشست میں ملاقات ہوئی وہ قدیم روش کے لکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام کے شاعر ہیں- حیدرآباد سندھ ابھی مرکزیت کے معیار تک نہیں پہنچا اس لیے وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کے کمالات بھی وہیں تک محدود ہیں بہت کم لوگ اپنے تعلقات اور نغمے کے بل پر دوسرے شہروں تک پہنچتے ہیں- جناب رضی بلند مرتبہ شاعر ہونے کے باوجود محدود فضا میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں- لیکن حقائق چھپے نہیں رہتے اس لیے ان کے ابھرنے کا وقت قریب آ رہا ہے اب لوگ شعر کے جسم سے نغمے کا لباس اتار کر شعر کے اصل خدوخال اور صورت دستر کا مطالعہ کرتے ہیں-

ریاض گوالیاری

میں جناب جاں نثار اختر کے ساتھ جب گوالیار گیا تو سب سے پہلے ریاض صاحب سے تعارف ہوا وہ اس زمانے میں کچہری میں کام کرتے تھے- جہاں مجھے ان کی سادگی اور اخلاق نے متاثر کیا وہیں ان کے کلام نے بھی مجھ پر ایک افسونی اثر چھوڑا تھا- ان کے یہاں روانی اور پختگی کے علاوہ روزمرہ اور محاورات کا استعمال ان کے کلام کو دوبالا کر دیتا تھا افسوس کہ اس شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا ذخیرہ اب تک مجموعہ کی صورت میں نہ آ سکا

راز چاند پوری

مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں لیکن وہ شاعر بھی ہیں اور بڑا رنگین شعر کہتے ہیں۔ جہاں ان کے افسانے قابل داد ہوتے ہیں ان کا شعر بھی بُھس نہیں ہوتا وہ ماہر استادوں کے انداز کے شعر کہتے ہیں ان کا مجموعہ بھی سنا ہے چھپ چکا ہے لیکن مجھے اب تک نہیں ملا۔

حکیم راغب مرادآبادی

جناب راغب کو میں اپنے ابتدائی دور سے جانتا ہوں جب میں پہلی بار شملے کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ وہ ابتدا سے ذہین اور طباع ہیں اس کے علاوہ زود گو اور بلند فکر ہیں۔ مشاعروں میں شاعروں کا منظوم تعارف شوکت تھانوی مرحوم نے شروع کیا تھا اور ان کے بعد جناب عندلیب شادانی اور جناب راغبؔ ہی ایسے شاعر ہیں جو یہ فرض بطریق احسن انجام دیتے ہیں۔ ایسے شاعروں کے سامنے شعر خود بخود آتے رہتے ہیں اور وہ صرف ایک ذریعہ ہوتے ہیں شعر اور خیال کے درمیان جناب راغب اپنی خصوصیت کے لیے مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس خصوصیت سے بلند شاعر بھی ہیں اور معمولی شاعر نہیں جناب راغب بحیثیت دوست بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

رشیدؔ

سید رشید احمد رشید ایڈووکیٹ نواب شاہ لکھنوی ہیں اور حضرت ناطق کے صاحبزادے ہیں حضرت ناطق کے نام سے ہر صاحب ذوق آگاہ ہے۔ انہوں نے دسیوں ناول لکھے ہیں اور تاریخ ادب اردو کو نہایت اختصار اور سلیقے سے منظوم کیا ہے۔ جناب رشید کو ذوق شعری ورثے میں ملا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ادب اردو کے ہر پہلو پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔

رعنا اکبرآبادی

رعنا اکبرآبادی میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں جب بھی لاہور تشریف لاتے ہیں تو احسان نوازی فرماتے ہیں۔ حالانکہ میری نظر میں قابل احترام ہی نہیں قابل قدر شاعر ہیں ان کے ہاں شعر بڑے حسن کے ساتھ تخلیق ہوتا ہے اور معائب و محاسن پر ان کی بڑی گہری نظر ہے وہ

پراپیگنڈے کے انسان نہیں اور نہ پراپیگنڈے کے شاعروں کو قابل اعتنا گردانتے ہیں۔

اشرف ریاضؔ

جناب اشرف ریاض لائل پور کے رہنے والے ہیں اور کراچی میں کاروبار کر رہے ہیں۔ انہیں طالب علمی ہی سے شعر فہمی اور شعر گوئی کا ذوق تھا اور نہایت اچھا شعر کہتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ جدید ہوتے چلے گئے لیکن چونکہ مزاج میں اسلامی اقدار تھیں اس لیے اس مقام تک نہیں پہنچے جہاں آج کل کے ادیب خدا اور پیغمبری کے منکر ہو کر خود کو ارسطو خیال کرنے لگتے ہیں۔ اشرف ریاض آج بھی نہایت اچھا شعر کہتے ہیں لیکن نہ وہ مشاعروں میں شعر پڑھنے کے قائل ہیں اور نہ معمولی جرائد میں اشاعت کے قائل!

ریاض انور

جناب ریاض انور ملتان میں وکیل ہیں اور رائٹرز گلڈ کے سرگرم کارکن بھی۔ ابھی ریاض انور کا انتخاب مرکز میں بھی ہو چکا ہے۔ یہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ ان کے کلام پر مشرقی پاکستان کے ماحول اور مناظر کی گہری چھاپ ہے۔ یہ حضرت بھی جدید رنگ کے دلدادہ ہیں اور ان کے یہاں بھی موجودہ تحریک ابہام کا اثر ہے۔ لیکن چونکہ اب تک مرکز سے دور رہے ہیں اس لیے ابھی اتنے عالم آشنا نہیں ہوئے۔ ہمیں ان کے مستقبل سے امیدیں رکھنا چاہئیں۔

راج بلدیو راج

راج بلدیو راج یوں تو کشمیری ہیں لیکن مدت مدید سے لاہور میں مقیم تھے۔ دیال سنگھ کالج سے انہوں نے بی اے کیا تھا اور ادبی حلقوں میں ان کا شور تھا وہ غزل اور نظم دونوں میں دسترس رکھتے ہیں۔ تقسیم کے ہنگامے میں وہ دہلی چلے گئے اور وہاں سے بمبئی پہنچ گئے۔

لاہور میں ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''ناقوس'' کے نام سے چھپا تھا جو آج بھی ملتا ہے اس میں ان کے جذبات کی تصویریں اور تصورات کے خاکے اپنے تاثر سمیت محفوظ ہیں۔ وہ فطری شاعر ہیں اور بے تکلف شعر کہتے ہیں۔ اب نہ جانے غربت کے مصائب اور ترک وطن نے انہیں کیا بنا دیا۔

ہو یا ان کے جذبات کا رخ کس طرف موڑ دیا ہو- سنا ہے وہ فلم ڈائریکٹر ہیں مگر نہ معلوم اس فضا نے ان کے ادبی اور شعری رجحانات پر کیا اثر کیا ہو چونکہ وہ بیک وقت ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی کی فضا میں کامیاب رہیں گے شعر و ادب کے علاوہ اس شخص میں محنت اور دیانت دونوں ہیں اور یہ دونوں وصف ایسے ہیں کہ ہر شخص کو ان کی جستجو رہتی ہے-

احمد ریاض

اچھا ہونہار' ذہین اور بلند ہمت شاعر تھا- اسے ہمارے ملک نے اپنی روایات کے مطابق پہچانا نہیں وہ ایک بلند درجے کا صحافی اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا جس کے کہنے میں اپنے دل کے ساتھ ہزاروں غریبوں اور پسماندگان کے دل دھڑکتے تھے- مگر یہ آدم خور فضا اسے کھا گئی اور پختہ ہونے سے پہلے وہ شاخ سے نوچ دیا گیا اس کا مجموعہ کلام اس کے مرنے کے بعد چھپا جس سے اس کے ناشرین کو فائدہ پہنچا ہو گا مگر زندگی میں اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوا وہ اخبارات کے دفتروں میں بیدادرہ کر مدقوق ہو گیا اور صحیح علاج نہ ہونے کے باعث بے یار و مددگار اللہ کو پیارا ہو گیا-

رشک خلیلی امروہوی

جناب رئیس احمد رشک خلیلی دھرم پورہ کے شعراء میں ہیں اور مقامی نشستوں میں اچھی غزلیں سناتے ہیں- نقد و تبصرہ کی انجمنوں میں وہ شرکت نہیں کرتے اور نہ بڑے مشاعروں میں نظر آتے ہیں یہ ان کا احساس کمتری ہے یا شرمیلا پن؟

ریاض الوری

جناب ریاض الوری دھرم پورہ لاہور میں رہتے ہیں اور مقامی مشاعروں میں ان کا کلام سننے میں آتا ہے وہ اچھا خاصا شعر کہتے ہیں اور ذخیرہ بھی غالباً خاصا ہو گا کیونکہ ان کے ہاں غزل کی تکرار نہیں بلکہ ہر مشاعرہ میں نئی غزل سناتے ہیں رسالوں اور اخبارات میں نہیں چھپتے یہ شاید مصروفیات کا باعث ہے ورنہ اچھے اشعار تو ہر اخبار قبول کر لیتا ہے-

رشید احمد مودودی

علی گڑھ کی ملاقات کے بعد ملاقات نہیں ہوئی مگر وہ ملاقاتیں زندگی میں یاد رہیں گی بہزاد سے لے کر غالب کی غزلوں کے مصرعوں پر رنگین اور فحش تضمین کرتے رات رات بھر گزر جاتی تھی۔ ابو مسلم بے چارے مولوی ٹائپ کے انسان تنگ آ کر ناک بھوں چڑھانے لگتے مگر کون سنتا تھا جواں دل و دماغ کے نوجوانوں کا ہجوم اور شاعرانہ فضا سب کچھ بھلا دیتی تھی ابو مسلم اور رشید مودودی دونوں سے ملاقات کو دل چاہتا ہے مگر وہ نہ جانے کہاں ہوں گے۔

رشید احمد ذوقی کاندھلوی

ذوقی کاندھلہ میں ناز و نعم کے پلے ایک نہایت ذہین اور طباع نوجوان تھے اور بڑا سنبھل کے شعر کہتے تھے علماء کے خاندان سے تھے اس لیے مکتبی غلطیوں سے پاک اور رنگینیوں سے لبریز اشعار کہتے تھے خاندان والوں نے شاید ان کی مرضی کے خلاف شادی کر دی چنانچہ پہلی رات میں بیمار ہوئے اور صبح نہ دیکھی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ذوقی صاحب کا کلام کچھ تو مولوی ظہیر الحسن مرحوم کی صاحبزادی کے پاس ہے اور کچھ مولوی اظہار الحسن کے پاس ہے اب دیکھئے طباعت کی نوبت کب آئے۔

میاں محمد شفیع مرحوم

میاں محمد شفیع مرحوم قابل اعتماد دوست اور ہر دل عزیز افسر تھے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ پر خلوص مسلمان تھے میں نے انہیں فی البدیہہ شعر کہتے بھی دیکھا ہے لیکن انہوں نے کبھی خود کو شاعر نہیں کہا۔ مگر شعر کے معائب و محاسن پر ان کا عمیق مطالعہ تھا۔ میاں محمد شفیع تصنیف و تالیف کے آدمی تھے یہاں انسان شناسی ابھی نہیں آئی اس لیے یہاں اچھے انسان عموماً ضائع ہو جاتے ہیں۔ میاں محمد شفیع نے جو غدر ۱۸۵۷ء پر کتاب لکھی ہے اس کو پڑھ کر ان کے تحقیقی ذوق اور اسلوب بیان کا معیار صاحب نظر لوگوں کو چونکا دیتا ہے کاش وہ زندہ رہتے ان سے ملک اور قوم کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

خواجہ شہاب الدین

خواجہ شہاب الدین صاحب اول سے تعلیمی شعبہ سے متعلق رہے ہیں اس لیے ان میں ادب و شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کا ملکہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی فطرت میں غرور و ناز کا رذیل نہیں میں ان سے جب بھی ملا ہوں میں نے انہیں عوامی آدمی پایا ہے اور اپنے فرض منصبی کی ادائی میں انہیں مخلص دیکھا ہے۔

شانتی سروپ بھٹناگر

شانتی سروپ بھٹناگر کے جد امجد مرزا ہر گوپال تفتہ تھے جو مرزا غالبؔ کے چہیتے شاگرد تھے۔ یوں تو بھٹناگر صاحب سائنس کے آدمی تھے لیکن شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ لاہور میں ''اردو سبھا کا وجود انہیں کے دم سے قائم تھا یوں اس میں برج موہن وتاتریہ کیفی مولانا تاجور اور سر شیخ عبد القادر صاحب وغیرہ بھی شریک تھے اور راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ ممبر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن بھٹناگر صاحب سے اس ادارہ میں بڑی قوت تھی بھٹناگر صاحب کی شاعری کے ثبوت میں ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھپا ہے جو دلی سے بہت کم باہر جا سکا میں نے وہیں اس کا ایک نسخہ دیکھا تھا۔

محمد شعیبؔ

جناب شعیبؔ انتظامیہ کے ماہر حسابیات کے ناقابل فراموش انسان ہیں وہ ورلڈ بینک میں گورنر اور پاکستان میں وزیر خزانہ کی خدمت انجام دے چکے ہیں اور اب بھی ورلڈ بنک ہی کے بڑے ذمہ دار عہدے پر ہیں مگر اتنی مصروفیات کے باوجود شعر بھی نہایت اچھا کہتے ہیں مجھے نیاز احمد مرحوم کے یہاں ان سے شعر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ ذوق شعری میں بھی ایک بلند مقام شاعر ہیں اور ہرگز نظر انداز کر دیے کے قابل نہیں۔ تاریخ ادب کے شعری شعبہ میں انہیں ضرور آنا چاہئے۔

ظہور عالم شہید

لاہور کے صحافیوں میں ظہور عالم شہید نہایت اہم اور عظیم صحافی ہیں اکثر صحافیوں کا یہ اندازہ ہے کہ یہاں کی صحافت میں شہید صاحب سے بہتر انسان موجود نہیں ان کی تحریر میں متانت اور سنجیدگی کے علاوہ سیاست اور تاریخ کے ایسے ایسے گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔جن سے لوگ سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں ان کا مطالعہ وسیع اور خصوصاً اسلامی تاریخ پر معلومات قابل رشک ہیں۔ یہ خاموش طبع ضرور ہیں لیکن ان کا قلم بڑی دھواں دھار رفتار سے چلتا ہے اور ہر نقش اپنی جگہ موزوں و مناسب ملتا ہے۔

شوق چاندپوری

جناب محمد مشتاق شوق چاندپوری ضلع بجنور میں چاند پور کے رہنے والے تھے بڑے پڑھے لکھے اور خوش ذوق بزرگ کالجوں میں پروفیسری کرتے رہے اور آخر میں وقت نے ٹیچری پر بھی مجبور کر دیا۔وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے لیکن نجی نشستوں میں وہ جو کچھ سناتے تھے۔وہ ہرگز نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔وہ جولائی ۱۹۶۷ء میں راہی عدم ہو گئے ان کا مجموعہ کلام غالباً ان کے بچوں کے پاس ہوگا جو ابھی تک نہیں چھپا۔

پنڈت جیون لال شوق

تقسیم سے پہلے میں شوق صاحب سے ملا ہوں وہ وہ انگریز طرز کے افسرانہ مزاج رکھنے والے انسان ہیں۔مشاعروں میں صدارت کے مستحق بھی سمجھے جاتے ہیں اور اپنا کلام بھی سناتے ہیں وہ جو کچھ پڑھتے ہیں۔ وہ اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا اور اس میں پختگی کے علاوہ مشق و مزاولت بھی جھلکتی ہے ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔نہایت شریف طبع اور نستعلیق لوگوں میں ہیں۔آج ایسے لوگوں کا وجود ناپید ہے۔ تقسیم کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں مقیم ہیں

ڈاکٹر شفاعت احمد مرحوم

امرتسر میں مطب کرتے تھے مگر غالباً امرتسر کے رہنے والے نہیں تھے کیونکہ وہ اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے اور لکھتے تھے۔ بزم سروش کے اراکین میں ان کا ایک مقام تھا اور بہت صاف شعر کہتے تھے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے ان کی شرافت اب تک میرے دل پر نقش ہے وہ بڑے پرخلوص انسان تھے۔ امرتسر میں اردو زبان کی توسیع و ترویج کے لیے ان کا نام سرفہرست آتا تھا اور دامے درمے سخنے ایثار کے خوگر تھے۔

مولوی شمس الدین

مولانا شمس الدین لاہور میں تاجر کتب ہیں جو تاجری کے علاوہ انسانیت کے اقدار میں سیکڑوں تاجروں سے بلند ہیں۔ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی لاہور کے تاجروں میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ اور گاہکوں سے دیگر تاجروں کی طرح غرور و رعونت سے پیش نہیں آتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی دکان پر ادبا و فضلا کا ہجوم رہتا ہے اور مولانا حسب حیثیت ہر شخص کی تالیف قلوب کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کا دم لاہور میں غنیمت ہے ورنہ لاہور کے تاجروں سے تو انسان ایک بار مل کر متنفر ہو جاتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا

جناب زکریا جب جھنگ میں تھے بڑی اچھی غزلیں کہتے تھے وہ ملک کے بہترین شاعر ہوتے لیکن جب سے وہ اورینٹل کالج کی ملازمت میں آئے ہیں اس وقت سے ان سے کوئی غزل سننے میں نہیں آئی۔ جہاں انہیں مضمون نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے وہاں ان کی غزلیں بھی معیاری غزلوں کی صف میں آتی ہیں اور ان کے پاس غزلوں کا اچھا خاصا ایک مجموعے کا مواد ہوسکتا ہے لیکن ادھر ان کا رجحان ہی معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اب تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہیں اور ادھر بھی ان کا ایک وقیع مقام ہے اور صلاحیتیں محدود نہیں وہ نوجوان ہیں زندگی کے ہنگامے اور کامیابیاں ان کی منتظر ہیں۔

بشیر احمد زار

میاں بشیر احمد زار صاحب جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں کے صاحبزادے ہیں- ظاہر ہے کہ ذوق ادب ان کا ورثہ ہے اوائل عمری ہی سے شاعری کا ذوق تھا- ولایت سے واپسی پر ''ابجد خواں'' کے نام سے چھپے اور ۱۹۲۱ء میں رسالہ ہمایوں کا اجرا کیا-

میاں بشیر احمد صاحب سے مل کر کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ مزاح نگار بھی ہو سکتے ہیں لیکن میاں صاحب مزاح نگار بھی ہیں اگرچہ ان کی مزاح نگاری ان کے قریبی دوستوں تک محدود رہی ہے-

میاں بشیر احمد صاحب گردو پیش پر نظر ڈالنے کے بجائے اپنے سے قریب ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اور اکثر تو ان کی شاعری ان کے ذاتی واردات و احساسات کا آئینہ ہوتی ہے جو ان کے قلم سے بے تکلف ٹپک پڑتی ہے- مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر میاں بشیر قدیم تکلفات سے بھرپور شاعری سے دامن کش رہے ہیں وہ ایک طرح سے نئے خیالات کے انسان ہیں کہ ان پر انگریزی طرز زندگی کا اثر زیادہ ہے- ان کے تاریخی اور فلسفیانہ مضامین کا ایک نہایت خوبصورت مجموعہ بھی چھپا ہے جو لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے-

میاں صاحب میں مشرقی اور مغربی خیالات کا نہایت حسین امتزاج پایا جاتا ہے اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں میاں بشیر احمد پیش پیش رہتے ہیں- چنانچہ پنجاب میں جو اردو کی ترقی ہوئی ہے اس میں میاں صاحب کی کوششوں کو تاریخ اردو کی روح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا- مگر ایک عرصے سے کچھ گوشہ نشین قسم کے انسان ہو گئے ہیں کبھی کہیں ملاقات ہوتی ہے تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں-

زیبا ناروی

جناب زیبا ناروی' نارہ ضلع الہ آباد کے رہنے والے ہیں اور حضرت نوح کے سلسلے کی اہم کڑی ہیں اگر کوئی جناب نوح کے کلام کو اس دور میں سننا چاہے تو زیبا ناروری کو سن لے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انداز بیان اور انداز فکر کے اعتبار سے بال برابر بھی فرق نہیں ہے-

جنابِ نوح ناروی کی طرح مشاعروں میں زیبا صاحب کے کلام پر بھی تعریف و تحسین کے

ڈونگرے برستے ہیں زبان میں لوچ کا ایک زنجیرہ الفاظ کا برمحل استعمال اور دروبست ایسا ہوتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں آواز میں کڑکا اور اسلوب میں روانی کے علاوہ محاورات اور روزمرہ کا استعمال ان کے یہاں خاص بات ہے پورے پورے شعر میں الفاظ کے ٹکڑوں کا مجموعہ جو کہیں بے معنی نہیں ہونے پاتا صرف زیبا صاحب کے یہاں ملے گا۔

زیب عثمانیہ

تاجور زیب عثمانیہ لدھیانہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں قدیم روایات کے تحت گھر میں اردو فارسی ضرورت کے مطابق پڑھ کر شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا مجموعہ کلام ''متاع حرم'' ان کی ''متاع ادب ہے'' اور اس میں ان کا صحیح رنگ کھلتا ہے زبان و بیان ظاہر ہے کہ دل کش ہونا چاہئے چنانچہ ان کے یہاں الفاظ و معانی کی ہم آہنگی اور فکر و خیال کی تہذیب و تربیت کا پتہ چلتا ہے ان میں یہاں کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال کے مطالعہ اور تقلید کی جھلکیاں بھی ہیں اور ان کی طبیعت کی رنگ آمیزیاں بھی انہیں ملک و قوم کے سیاسی مسائل سے بھی لگاؤ ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کی احتیاط و تزئین سے بھی شاید یہی سبب ہے کہ لوگ ان میں اقبال کا رنگ محسوس کرتے ہیں میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ متاع حرم میں ہے۔ وہ متاع حرم ہی ہے اس میں کسی کی تقلید یا کسی کے اثر کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہاں مطالعہ کا اثر صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ اسلوب میں کہیں کہیں وہ شباہت آجائے ورنہ شاعر تو خود تقلید سے بچنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور یہی فکر اسے آہستہ آہستہ راہگری پر لے آتی ہے۔

صوفی محمد ایوب زمزم بجنوری

صوفی زمزم صاحب بجنور میں تھے اور بزم تاجور کے نام سے ایک علمی ادبی ادارہ قائم کر رکھا تھا اگرچہ اس میں زیادہ مشاعرے ہی ہوتے تھے لیکن مشاعرے بھی اپنی افادیت کے اعتبار سے بڑے کارآمد ہیں۔ جناب زمزم زیادہ غزل کہتے تھے ان سے میں نے کوئی نظم نہیں سنی۔ قدیم رنگ میں وہ اچھا خاصا کہتے تھے اور زبان کے اعتبار سے ان کا کلام اس گردونواح میں معاصرین سے کم نہیں تھا۔ مگر ان کا مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔

ثریا زیبا

میں نے ان کی غزلیں سنی بھی ہیں اور دیکھی بھی ہیں وہ سہل ممتنع میں اپنے دل کی بات کہتی ہیں جس سے مفہوم سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی اور یہی سادگی انہیں مشاعروں میں کامیاب کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے اشعار کی قوت میں ان کا ترنم بھی کام کرتا ہے لیکن دیکھا جائے تو ان کی شاعری ترنم سے علیحدہ ہوکر بھی شاعری رہتی ہے اور یہ بات ہر شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

محمد زمان غزنوی

محمد زمان غزنوی میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں یہ کالج کے زمانے ہی سے شعر کہتے ہیں۔ عمر محکمہ تعلیم ہی میں گزری ہے۔ شریف اور شگفتہ خاطر انسان ہیں اب ریٹائر ہوکر لاہور میں مقیم ہیں جناب غزنوی علم النفسیات کے بھی ماہر ہیں اور باقاعدہ انہیں غیر ملکی ماہرین نے تسلیم کیا ہے کبھی کبھی کسی مشاعرے یا نجی نشست میں ملاقات ہوتی ہے تو ان کی شاعری سننے میں آجاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مدت دراز تک غیر شاعرانہ ماحول کے باوصف ان کا ذوق ابھی زندہ ہے وہ فارسی میں بھی کہتے ہیں مگر موجودہ دور کی نئی روش سے کوسوں دور ہیں۔

تربھون ناتھ زتشی زور

جناب زور قدیم بزرگانِ ادب سے ہیں اور چونکہ کشمیری پنڈت ہیں اس لیے اردو فارسی پر عبور ان کا ورثہ ہے علاوہ ازیں انہیں جو بزرگوں کے قریب رہ کر ملا ہے وہ اخلاق و اعمال کی دولت بڑی شے ہے وہ روایتی شاعری کی جیتی جاگتی مثال اور روزمرہ و محاورات کا بے بہا خزانہ لیے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا برمحل استعمال اور چناؤ جو زور صاحب کے یہاں ملے گا اس دور کے کم لوگوں کو نصیب ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذوق غالب کی مجلس کے کسی مقتدر رکن سے مل رہا ہوں۔ ان کا مجموعہ کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔

زخمی لکھنوی

جناب زخمی لکھنوی تقسیم ملک کے بعد آئے۔ ریلوے کے ملازم ہیں اور جناب آسی الدنی کے شاگرد ہیں میں انہیں لکھنؤ سے جانتا ہوں۔ اول تو فطری ذوق پر لکھنؤ کی بودو باش اس پر ایک کامل استاد سے تربیت آخر کہاں تک شعر گوئی کا ملکہ نہ ہوتا اب تو زخمی خود استاد ہیں اور کئی ان کے شاگرد بھی ہیں ان کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا ویسے مشاعروں میں ان کی غزلیں سننے میں آتی ہیں۔ اور ان میں وہی لکھنو کا مخصوص رنگ ملتا ہے۔ جس کے باعث لکھنو مشہور ہے اور لکھنؤ کا رہنے والا فخر کرتا ہے۔

زکریا اسعدی

سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور وہیں کی نجی نشستوں میں شعر سناتے ہیں۔ میں نے انہیں سہارنپور ہی دیکھا تھا اس وقت وہ اچھا اور سلجھا ہوا شعر کہتے تھے اور ان کی بیاض میں ان کے کلام کا اچھا اور معقول ذخیرہ تھا۔ تقسیم ملک کے بعد نہ معلوم وہ بے چارے کن حالات میں ہوں گے اور ان کی شاعری کن منازل سے گزر رہی ہوگی۔ ان کا کوئی مجموعہ کلام بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

شمس الرحیم زلفی

جلال آباد ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں نئی دلی میں موتراشی کرتے ہیں انہوں نے مجھے کئی بار غزلیں سنائیں اور میں حیران رہ گیا۔ کچھ روز وہ لاہور میں بھی رہے تھے اس وقت وہ اتنا اچھا اور سجا سنورا شعر نہیں کہتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد جو میں ان سے ملا ہوں تو انہوں نے اچھی اچھی غزلیں سنائیں ایک زمانہ ہوا انڈیا گئے نہ معلوم وہ اب بھی وہیں ہوں گے یا کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ بہر نوع وہ نظر انداز نہیں ہو سکتے۔

عبد القیوم زاہد القادری

زاہد القادری صاحب اگرچہ سرکاری ملازمت میں ہیں لیکن اس مصروفیت کے باوصف خوب شعر کہتے ہیں مجلس اور مشاعروں کے انسان نہیں لیکن فطری ذوق کے تحت شعر کہنے پر مجبور ہیں اور اچھا

سنبھلا ہوا انداز ہے، ہر چند کہ ان کی روش قدیم ہے لیکن شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

زہرہ نگاہ

افق ادب پر ستارے کی طرح چمکیں اور اپنے ایک برج میں داخل ہوگئیں۔ ان کی آواز کے چراغ آج تک دلوں میں سلگ رہے ہیں اور وہ چراغ خانہ ہوگئی۔ ایک زمانہ ان کی خوشنوائی اور اشعار کے تاثر سے محروم تو ضرور ہوگیا لیکن ہم ان کی خانہ نشینی سے خوش ہیں البتہ شعری اور ادبی ذوق کی موت کے قائل نہیں انہیں جو ماحول ملا ہے۔ وہ ان کے فکر پر قدغن اور قلم پر پہرے نہیں لگا تا اگر ان کا ذوق شعر واقعی فطری ذوق شعر تھا اور ان کا ادب واقعی دل و دماغ کی کھیتی کا حاصل تھا تو وہ جس ماحول میں گئی ہیں وہاں اس کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔

مفتی زین العابدین

مفتی صاحب لائل پور کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ یہ بھی علم و فضل میں بلند مقام رکھتے ہیں اور تقریر میں دریا کی روانی ہوتی ہے۔ ان کی فضیلت کی طرح ان کا تقویٰ بھی اپنی جگہ ایک نعمت الٰہی ہے لیکن علمائے دین اور پیشوایان مذہب کو تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے یہ بھی ایک تبلیغ تو ہے ہی زبان و ادب کی خدمت بھی ہے۔

زاہر قاسمی

جناب زاہر شاہ قاسمی دیوبند کے رہنے والے ہیں پھر دیوبند میں ان کی تربیت دارالعلوم کے ماحول میں ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اردو فارسی اور عربی پر انہیں عبور ہوگا ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے خوش الحان قاری ہیں کہ سبحان اللہ ایک بار مجھے سہارنپور کے اسٹیشن پر ان کے اقتداء میں صبح کی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے نہ جانے میری وہ نماز کہاں تک مقبول ہوئی ہوگی کیونکہ میرا خیال خدا کی طرف نہیں ان کی قرأت کی طرف رہا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قرآن دل پر برس رہا ہے۔

سر سپرو

سر سپرو سے الہ آباد میں جناب ہادی مچھلی شہری کے ہمراہ ملاقات ہوئی اور پھر ایک بار غالباً محترم نجم الدین جعفری کے ساتھ! ان کی قانونی حیثیت اور سیاسی بصیرت سے کون آشنا نہیں تھا لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ تاریخ ادب بھی سینے میں لیے بیٹھے ہیں۔ انہیں سیکڑوں قدیم وجدید شاعروں کے اشعار اور حالات از بر تھے اور تنقید کے نئے نئے پہلوان کے سامنے صف بستہ رہتے تھے وہ اردو زبان کے خیر خواہ ہی نہیں تھے بلکہ اس زبان کے سوا کسی زبان کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے ثبوت میں ان کی تحریریں میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

جناب سیماب اکبرآبادی

جناب سیماب اردو' فارسی' عربی اور انگریزی میں مہارت رکھتے تھے اور شاعری ان کا آبائی ورثہ تھا۔ بیسیوں مشاعروں میں ان کا میرا ساتھ رہا اور میں نے کبھی ان کو کم درجے کا شاعر محسوس نہیں کیا وہ مسلم الثبوت قسم کے اساتذہ میں تھے۔ یہ شاگرد تو جناب داغ دہلوی کے تھے لیکن ان سے ہٹ کر انداز اختیار کیا تھا میرے خیال سے سیماب صاحب اپنے زمانے کے ایسے شاعر ہیں جو کسی قدیم شاعر کے رنگ سے متاثر نہیں تھے۔ اور اگر تھے تو ان کے کلام سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا وہ زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے ہیں۔

سنا ہے کہ ایک زمانے میں جب مولانا تاجور مرحوم نے اردو مرکز قائم کیا تھا تو جہاں ملک بھر کے اساتذہ لاہور میں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے ان میں حضرت سیماب بھی تھے اور ان کے شاگرد جناب ساغر نظامی بھی۔ لیکن یہاں ان کا زیادہ قیام نہ ہو سکا مولانا سیماب نے بہت سی کتابیں لکھیں اور سیکڑوں شاگرد کئے لیکن وہ جتنے بڑے استاد تھے اتنی شہرت انہیں نہ مل سکی میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس دن ان کے کلام پر کام شروع ہوا اس دن لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کیسا جوہر قابل گرد وغبار میں اٹکے رہ گیا ہے۔ میں سیماب کے عقیدت مندوں میں ہوں اور ہر استاد کا مقام میرے یہاں استاد کا مقام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ساغر کی وجہ سے سیماب صاحب کی شہرت میں تقدس اور وقار پیدا نہ ہو سکا اور یہی سبب ہے کہ ان کے کلام اور کام کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ کاش ساغر ان کا شاگرد نہ کہلاتا

تقسیم ملک کے بعد سیماب صاحب پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے اور ۳۱-جنوری ۱۹۵۱ء میں انہوں نے وفات پائی- اناللہ وانا الیہ راجعون!

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت سیماب کے دم سے آگرہ سکول کا نام زندہ تھا اور ان کے بعد اب تک اس سرزمین سے ایسا استاد نہیں اٹھا- تلامذہ کی کثرت نے بھی ان کے شاعرانہ محاسن اور شہرت کے ابھرتے ہوئے ستونوں کو دبایا تھا لیکن اگر دیکھا جائے تو سیماب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی- غالباً ہندوستان کے ہر ضلع میں ان کا کوئی نہ کوئی شاگرد ایسا تھا- جسے وہ فارغ الاصلاح لکھتے تھے اور کسی جگہ ایک شاعر زبان کی جو خدمت کرتا ہے وہ اس کی بساط سے زیادہ ہوتی ہے اگرچہ اس میں اس کی کوشش اور نیت شامل نہیں ہوتی لیکن جس زبان میں یا جس شخص میں انسانی جذبات کی ترجمانی کا ملکہ ہوگا وہ وہاں مقبول ہوگا اور اس کے مقلد بھی ہوں گے-

سیماب صاحب کے یہاں ندرت خیال ہی نہیں ندرت بیان بھی بدرجہ اتم موجود ہے چونکہ سیماب صاحب وارثی سلسلے سے بیعت تھے اس لیے ان کے کلام میں کئی جگہ اس کا اظہار بھی ملتا ہے اور اس سلسلہ تصوف سے ان کے کلام میں جو عمق آیا ہے وہ ہر شاعر کے یہاں نہیں ملتا ان کے یہاں وہی سوز و گداز ایک نئے روپ میں ملتا ہے جو ان کا ایک الگ انداز تحریر ہے انہوں نے جو اپنے پہلے دیوان کے شروع میں خطبات درج کیے ہیں ان کا مطالعہ سنجیدہ لوگوں کو نثر کی طرف راغب اور تحقیق کی طرف مائل کرتا ہے- کیونکہ سیماب کے کلام میں تمام سیاسی تحریکات' تصوف اور روش جدید اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہیں اور طبیعت لامحالہ اس طرف بڑھتی ہے-

سائل دہلوی

جناب سائل بزرگان شعر و ادب کی صف کے بلند پایہ شاعر تھے مجھ پر بے حد کرم فرماتے تھے حالانکہ میں ان کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں تھا وہ مجھے برابر بٹھاتے اور شفقت فرماتے تھے- جناب سائل جیسا وضع دار انسان میں نے کم دیکھا ہے وہ سرتاپا خلوص و محبت و ایثار تھے ان کے پاس بیٹھ کر میں ایک روحانی خوشی محسوس کرتا تھا جب بھی وہ شعر کی فرمائش کرتے تو میں شرمندہ ہو جاتا اور ڈرتے ڈرتے غزل سناتا اور وہ سراہ کر حوصلہ افزائی کرتے میں نے ابن سائل کے پاس کلام سائل

کے دو ضخیم رجسٹر دیکھے ہیں مگر نہ معلوم اب تک وہ زیور طبع سے کیوں آراستہ نہیں ہو سکے۔

جس کا نام اردوے معلیٰ ہے وہ دلی کے انے گنے لوگوں میں رہ گئی تھی جن میں سائل صاحب کا دم غنیمت تھا۔ ان کی بات یہ ہے کہ سائل صاحب کو علم عروض کے ساتھ ساتھ سنسکرت سے بھی شغف تھا اور وہ گفتگو میں ہندی کے اوزان و بحور کے نام اور اصطلاحات بھی بول جاتے تھے وہ غزل ہی کے استاد نہیں تھے بلکہ شاعری کے مختلف اصناف پر قادر تھے۔

سراج لکھنوی

جناب سراج لکھنوی بڑے کہنہ مشق اور پختہ و مسلم شاعر ہیں ان کا دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ جس میں ان کا فن شعر اپنی معراج کا پتہ دیتا ہے۔ میں پہلی بار لکھنو گیا تو جناب قدیر نے میرا تعارف کرایا اور وہ اسی ایک تعارف سے اس قدر نزدیک ہو گئے کہ بے تکلفی شروع ہو گئی۔ لکھنو میں اچھا شعر کہنے والے لوگ یوں تو گلی گلی میں موجود ہیں لیکن لکھنؤ کی نمائندگی کرنے والے شعراء میں جناب سراج لکھنوی کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا سیدھے سادے انداز میں بات کر کے شعر کو دل میں اتار دینا انہیں کا کام ہے۔ ہمیں لکھنؤ کی زبان اور محاورہ کا اشعار میں استعمال سراج صاحب کے یہاں بہت خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

جناب قاضی زین العابدین سجاد میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ان کا مرغوب مشغلہ علم و ادب ہے عربی اردو کا لغت لکھ کر بڑا کام کیا ہے ہمارے یہاں اگر چہ ابھی لغت نویسی صحیح طور پر نہیں آئی لیکن قاضی سجاد جیسے باہمت لوگ اگر کوشاں رہے تو شاید یہ علم ماضی کا ڈوبا ہوا سفینہ پھر ابھر آئے۔ سجاد صاحب نے لغت لکھ کر یہ یقین دلایا ہے کہ یہاں بھی کام کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ کاش اردو لغت پر کوئی کھرا آدمی تکمیل کے ساتھ کام کر ڈالے یہ میدان ابھی خالی ہے۔

اقبال سہیل مرحوم

جب میں اعظم گڑھ گیا تو جہاں دارالمصنفین کے اراکین سے مل کر یک گونہ مسرت ہوئی وہیں اقبال سہیل صاحب کے رویہ اور اخلاق سے بھی متاثر ہوا مجھے ان کے کلام سے زیادہ ان کی شخصیت میں کشش معلوم ہوئی ہر چند کہ ان کے کلام میں حکمت بھی ہے اور پاکیزگی بھی زبان پر قدرت بھی ہے اور الفاظ کی گھن گرج بھی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو شاعر کے مرتبے اور مقام کی ضامن ہوتی ہیں ان کی والہانہ انداز اور بیباکانہ طریق تنقید اور اس کے ساتھ درویشانہ استغنا یہ تمام مل جل کر ایک ایسا حسین آمیزہ بن گئے تھے کہ پہروں ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس ماحول میں رہتے ہوئے اقبال سہیل ہی کی ذات ایسی تھی جو غزل میں کنگھی چوئی' رقیب' بوسہ' جوبن اور قبر کی گفتگو سے تنفر تھی اور غزل کو وہ تہذیبی اور تمدنی بلندیوں کی عکاسی کے لیے مناسب خیال کرتے تھے۔ سفلی جذبات کے لیے نہیں وہ اپنے اشعار میں اخلاق و سیاست کی تعلیم کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کی شرائط اور اس کے مزاج سے علیحدہ نہیں جاتے تھے چنانچہ اس ماحول کی ادبی و شعری اصلاح میں اقبال سہیل مرحوم کا بڑا کام ہے۔

مولانا سہا مجددی

مولانا سہا مجددی بھوپال کے رہنے والے تھے وہ ایک عرصہ لاہور میں رہے لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور کچھ اس وقت میرا شعور بھی بیدار نہ تھا۔ ایک مدت کے بعد جب میں بھوپال کے مشاعرہ میں گیا تو ان سے ملاقات کا شرف اور بات چیت کا موقع ملا۔ وہ نہایت فاضل اور فن شناس لوگوں میں ایک تھے اگر چہ ان کا قد چھوٹا تھا لیکن وہ بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ عرصہ ہوا انہوں نے ''شرح غالب'' بھی کی تھی لیکن اس کے بعد ان کے کلام کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

حکیم احمد شجاع ساحر

مجلس قانون ساز پنجاب کے سیکرٹری رہے ہیں۔ علم و ادب پر عبور کے علاوہ افسانہ اور ڈرامے میں ان کی تاریخی حیثیت ہے اور مشق و مزاولت ان کی شاعری کو بھی اساتذہ کے برابر لے آئی۔ ان

کے کلام میں اقدار انسانیت کی حفاظت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور وہ اپنی جگہ ایک ادارہ ہیں قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے نہ جانے وہ کہاں تک پہنچی ہے۔

عبدالمجید سالک

مولانا عبدالمجید سالک بنیادا بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ تعلیم و تربیت کے بعد وہ مستقل لاہور میں قیام پذیر رہے۔ روزنامہ زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں صاحب کے معاون رہے اور ایک طویل عرصہ زمیندار ان کی کاوشوں سے اپنے معیار کو لیے چلتا رہا۔ پھر سالک صاحب تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار ہو گئے اور منٹگمری جیل میں ایک سال کے لیے بھیج دیے گئے وہاں سے رہائی پا کر زمیندار کی ادارت سنبھال لی اور صحافت کے فرائض کے ساتھ ایف اے اور بی اے کے امتحان بھی پاس کر لیے اسی اثنا میں مولانا غلام رسول مہر بھی ادارہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے اور پھر غلام رسول مہر اور جناب سالک نے مل کر ''انقلاب'' نکالا جو پاکستان بننے کے بعد تک جاری رہا۔ اس عرصے میں مولانا نے اپنی تمام قوتیں سیاسی بندوبست اور منصوبوں کے ساتھ اسی قسم کی تصنیف و تالیف میں صرف کیں اور اسی پاکستان کی تعمیر کے سلسلے میں ڈیڑھ دو سال کراچی میں حکومت پاکستان کے لیے کام کرتے رہے اور پھر لاہور آ کر کئی سال تک لاہور کے رسالوں اور اخباروں کو اپنی قلمی امداد سے نوازا۔ مولانا سالک کے طرز تحریر کا پتہ زمیندار اور انقلاب کی فائلوں سے چلتا ہے وہ بہت ہی ذہین طباع اور مفکر تھے چنانچہ کئی اہم تصنیفات و تالیفات آپ کے قلم کی رہین منت ہیں زمیندار اور انقلاب میں افکار و حوادث کے کالم پڑھنے سے ان کی طباعی اور زندہ دلی کے ساتھ ان کے قلم کی جولانیوں اور تحریر کی جاذبیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ شاعری میں مولانا سالک رسا رام پوری اور پھر جناب داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور فن شاعری کو بھی اس درجہ کمال کو پہنچایا کہ خود استادی کے مقام پر آ گئے۔ وہ نظم اور غزل دونوں صنفوں پر قدرت تامہ رکھتے تھے اور ان کے کئی شاگرد ملک کے بلند پایہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا ذاتی سرمایہ کلام اتنا نہ ہو سکا کہ کلیات کی صورت میں آ سکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں صحافتی مصروفیات کے علاوہ صاحب غرض لوگ گھیرے رکھتے تھے۔ اور انہوں نے طبیعت ایسی پائی تھی کہ ہر مصیبت زدہ انسان ان کا سہارا لیتا تھا اور وہ حتی الوسع کبھی گریز نہیں

کرتے تھے۔

مولانا کا ایک مجموعہ "راہ و رسم منزلہا" کے نام سے میری نظر سے گزرا ہے انہوں نے اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کا مقام پہنچانے کے لیے کافی ہے وہ غزل اور نظم دونوں میں ایک ماہر فن کی طرح نظر آتے ہیں اور ان کی تحریر میں ان کا تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ کے علاوہ خلوص کا جادو زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کا رویہ وہی تھا کہ جیسا قدیم لوگوں میں قاعدہ ہے یعنی ہر شخص کی ہمدردی اور امداد ان کا شعار تھا اور جس میں ذرا بھی صلاحیت پاتے تھے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے کبھی کبھی وہ اپنے نزدیک کے لوگوں پر پھبتی بھی کس دیتے تھے جس میں ان کی ذہانت کام کرتی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے اپنی کتاب "لغات الاصلاح" انہیں کے مشورہ پر شروع کی تھی کیونکہ انہوں نے خلوص اور محبت سے فرمایا تھا کہ یہ کام تمہارے سوا کسی کے بس کا نہیں نہ معلوم انہوں نے کیسے کیسے لوگوں کو ابھارنا چاہا لیکن اس خودغرض دنیا کا کیا علاج آج سالک کا وہ لوگ نام بھی نہیں لیتے اور اعتراف کو جرم خیال کرتے ہیں۔

آغا سہیل

آغا سہیل صاحب ایف سی کالج لاہور میں استاد ہیں لکھنؤ کی تعلیم و تربیت کے مہذب اور فاضل نوجوان ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر عبور ہے لیکن وہ زیادہ تاریخ و تبصرہ پر گفتگو کرتے ہیں چونکہ لکھنؤ کے بزرگوں کی صحبتیں اٹھائے ہوئے ہیں اس لیے ان کا اخلاق بلند اور گفتگو مربوط ہوتی ہے کہیں کہیں جرائد میں ان کے مضمون بھی آتے ہیں جن میں ان کی وسعت نظر اور خوردہ گیر ذہنیت آشکار ہوتی ہے۔

منور خاں ساغر

اخباری دنیا منور خاں ساغر کے نام سے نا آشنا نہیں اس سے پہلے دور کا ہر صحافی ان کی کاوش قلم سے آشنا ہے وہ ہنگامی نثر اور نظم دونوں میں یکساں رواں تھے۔ ویر بھارت، ملاپ اور دوسرے اخبارات میں ان کی نظمیں چھپتی رہی ہیں اور دوسرے مضامین میں بھی کم نہیں لیکن یہ آدم خور فضا اپنے

ماضی کے ستونوں کو بھول کر اپنی خامیوں کی تعمیر میں منہمک ہے۔

پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی

جناب سعید احمد اکبر آبادی سے میری پہلی ملاقات ندوۃ المصنفین دہلی میں ہوئی یوں تو ان کے ادارہ کا ہر رکن اپنی جگہ ایک مثالی انسان تھا مگر جہاں تک ادب اور اس کی جانچ پرکھ کا تعلق ہے اس میں سعید احمد اکبر آبادی ایک خاص اسلوب نگارش اور طریق فکر کے حامل ہیں اگر ان کی تصنیفی تالیفی قوتوں پر لکھا جائے اور ان کی تخلیقات پر روشنی ڈالی جائے تو ایک دفتر درکار ہے لیکن میں تو صرف ان کی ادبی عظمتوں اور علمی صلاحیتوں کی طرف اشارے پر اکتفا کروں گا۔ میں نے بحیثیت انسان بھی انہیں بہت سے صاحب علم حضرات سے بلند و برتر پایا ہے۔

سرور جالندھری

جناب سرور جالندھری تقسیم ملک کے بعد جالندھر سے لاہور آ گئے ہیں اور پرانے کہنے والوں میں شامل ہیں جالندھر میں ان کے بہت سے شاگرد تھے اور یہ اردو کی توسیع و ترویج میں اچھے کارکن رہے ہیں ان کا مجموعہ کلام بھی کم نہیں ہوگا لیکن نہ معلوم وہ کیوں نہیں چھپواتے۔

سجاد حیدر یلدرم

حضرت یلدرم سے میں لکھنؤ کے پہلے مشاعرے میں ملا انہیں اردو، انگریزی اور ترکی زبان پر عبور تھا۔ وہ ترکی اور انگریزی سے جو ترجمے کرتے تھے اس دور میں وہ ایک نئی سی چیز تھی۔ وہ معیاری ادیب و شاعر تھے ان کے ادب اور زبان میں بڑی متوازن روش تھی اور اچھا ادیب اور شاعر متوازن ہی رہتا ہے۔ ان کے افسانوں اور ترجموں کی کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں وہ اپنی تمام تر ادبی خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

ساغر سہواروی

جناب ساغر سہواروی اردو فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کے بے پراخبار کا دفتر چلاتا تھا انہوں نے عرصے تک ملاپ میں لکھا اور پھر انجمن حمایت اسلام میں چلے گئے تھے انہیں نظم نثر

افسانہ اور ڈرامے پر یکساں قدرت تھی- جناب کمال امروہوی اور ساغر ایک جان دو قالب کی طرح شیر وشکر تھے- بستر مرگ تک جناب کمال نے ان کا ساتھ دیا لیکن ساغر سہواروی کی شاعری اور ان کی دوسری تحریروں کا اب تک کہیں پتہ نہیں-

سروش طباطبائی

لکھنؤ میں جناب سروش طباطبائی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں نہایت سلجھا ہوا ذوق اور نظم وغزل دونوں پر حاوی' بلند اخلاق اور چہرے پر ایک خاندانی وجاہت ان کی شرافت کا پتہ دیتی ہے- سرکاری ملازمت میں تھے آج کل نہ معلوم کہاں ہوں گے لیکن ان کی صورت اب بھی میرے سامنے ہے لکھنؤ کے معاشرے کی میں نے اچھی اور مثالی شخصیت جناب سروش کو پایا' لیکن ان کا کوئی مجموعہ ابھی نظر سے نہیں گزرا- افسوس کہ سیاسی فاصلوں کی دیواریں ادبی راستوں میں بھی حائل ہوگئیں-

سلیم شاہد

سلیم شاہد نوجوان شعرا میں قابل توجہ شاعر ہیں اگر چہ ان کے یہاں اکثر سانچے قدیم ہی استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز بیاں جدید ہے یہ زندگی کے ان پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں جن سے نظر عموماً طائرانہ گزر جاتی ہے اگر چہ جدید رنگ میں مقصدی پہلو بہت کم پائے جاتے ہیں- لیکن اس میں بعض بعض نہیں اکثر باتیں چونکا دینے والی ہوتی ہیں اور جدید ادب کا شاید مقصد بھی یہی ہے اور اس دور میں نظم ہو یا نثر وہی کامیابی کا لقب پاتی ہے جو چونکا دینے والے پہلو رکھتی ہے-

آغا سرخوش

سرخوش صاحب آغا شاعر قزلباش دہلوی کے صاحبزادے ہیں اور معقول قسم کے شاعر ہیں- شاعری انہیں ورثے میں آئی ہے لیکن اپنے والد کی طرح انہیں دینی رجحان کم ہے وہ غزلیں کہتے ہیں مرثیہ منقبت یا سلام میں نے ان سے نہیں سنا اور غزلیں اپنے ہم عصروں میں اچھی اور بلند کہتے ہیں- تقسیم کے بعد میں نے ان کا کلام نہیں سنا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں-

سجاد ظہیر

سجاد ظہیر نہایت زیرک، شریف اور لکھے پڑھے انسان ہیں لاہور میں مولانا تاجور کی معیت میں ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ ایک دوست کے یہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں مقیم تھے۔ سجاد ظہیر ہی وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے ملک کے ذہنوں کو آزادی کی طرف موڑا اور ادبا و شعراء کے طبقے کے دماغوں کو بیداری دی ان کے بعد علی سردار اور مخدوم آتے ہیں۔ سجاد ظہیر بنیادی آدمی ہیں۔ ترقی پسندوں کی تحریک کامیاب ہے یا ناکام الگ بات ہے لیکن اس تحریک سے دماغوں کو کھلی فضا میں سانس لینے کا لپکا ضرور پڑا ہے۔

سجاد رضوی

سجاد رضوی صاحب بیروت میں ہیں انہوں نے لاہور ہی سے ایم اے کیا تھا۔ کچھ دنوں تو وہ لاہور ہی میں مختلف اداروں سے منسلک رہے اور پھر گنجائش دیکھ کر ایران چلے گئے۔ سجاد رضوی نظم اور نثر دونوں میں ناقابل فراموش ہیں وہ اچھے سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں اور شعر وادب کے علاوہ سیاست وصحافت میں بھی ان کے لیے ناہمواری حائل نہیں ہوتی۔ ان میں بڑی اچھی صلاحیتوں کے ساتھ قوت عمل ہے۔

سہیل بخاری

جناب سہیل بخاری، سرگودھا میں کسی سرکاری ادارے میں استاد ہیں۔ وہ جب بھی مجھے ملے ہیں میں نے ان میں شروع سے تحقیق کا رجحان پایا ہے۔ اب وہ خدا کے فضل سے نہایت اچھے ادیب اور محقق ہیں۔ ہمارے یہاں ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں لیکن محقق بہت ہی کم ہیں جب کوئی سہیل بخاری کا مضمون میرے سامنے آتا ہے مجھے مسرت ہوتی ہے لیکن اپنے حالات میں دعاؤں کے سوا کیا کرسکتا ہوں۔ انشاء اللہ ہمارے ملک میں عنقریب ایسا دور آئے گا جب ہمیں محققین کی ضرورت ہوگی اور جو آج خموشی سے اپنے تحقیقی جنون میں تیز گام ہیں انہیں بلند مقامات ملیں گے۔

سجاد باقر رضوی

جناب سجاد باقر رضوی اردو انگریزی کے ایم اے ہیں اور اورینٹل کالج میں استاد ہیں ۔ ان کے یہاں نہایت روانی اور شگفتگی ہوتی ہے اور جدید رنگ میں صاف ستھری غزلیں تخلیق کرتے ہیں چونکہ وہ اہل زبان ہیں اور اچھے خاصے مفکر اس لیے ان کی شاعری کی یہ خصوصیت انہیں موجودہ دور کے کارواں سے الگ نمایاں کرتی ہے انگریزی ادب کا مطالعہ اردو ادب میں بھی ان کے طرز نگارش کو نکھار دیتا ہے اور وہ ایک اچھے ادیب کی تعریف پر بھی پورے اترتے ہیں۔

گوری سرن لال سنبل

جناب سنبل کو شعر کا ذوق ورثے میں ملا ہے وہ نہایت خوب شعر کہتے ہیں شعر کہنے کا سلیقہ قدرت سے ملا ہے ان کے یہاں ایک حسین قرینہ اور توازن ہوتا ہے انتخاب الفاظ کے علاوہ زبان کے محاورات اور روزمرہ کا استعمال ان کے یہاں بڑی قدرت کے ساتھ ملتا ہے وہ نثر میں بھی بڑی قدرت رکھتے ہیں اور روزمرہ کا استعمال ان کے یہاں بڑی سلیقگی کے ساتھ ملتا ہے وہ نثر میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں اور تنقید و تحقیق کا شعور ان میں بدرجہ اتم موجود ہے ان سے مل کر معلوم ہوتا ہے کہ جناب سنبل کو اردو ادب کی تاریخ پر بھی عبور ہے ان میں مستقبل کے آثار بھی ابھی سے اپنا خاموش اعلان کر رہے ہیں لیکن ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

سفیر انبالوی

ڈاکٹر عبدالشکور سفیر انبالہ میں اچھا خاصا کہتے تھے ان کا کلام مشاعروں میں مقبول بھی ہوتا تھا مگر کم چھپتے تھے اسی وجہ سے وہ زیادہ شہرت نہیں پا سکے ہاں شعر اچھا کہتے تھے اور بحیثیت انسان بھی اچھے انسانوں میں تھے۔

سہیل بناری

قدیم رنگ میں کہتے ہیں اور انہیں شعر کے حسن و عیوب کے متعلق اچھی خاصی معلومات ہیں ابھی ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے جس سے ان کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے اور جہاں جہاں

انہوں نے اپنی معتقدات کے تحت شعر کہے ہیں قاری وہاں چونک کر رہ جاتا ہے اور اسے شاعر کی قادرالکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔نہایت خلیق، ملنسار اور پرانی تہذیب کے پر اخلاق انسان ہیں۔

رگھبیر داس ساحر

جناب رگھبیر داس ساحر گوجرانوالہ کے رہنے والے اور بڑے کہنہ مشق شاعر تھے لیکن ان کے یہاں وہی پرانی ڈگر تھی اور وہی قدیم مضمون کے ارد گرد رہ کر اس میں شاخیں اور پھول پھل پیدا کرتے تھے آدمی نہایت اچھے اور زود گو مگر ان کی انا ان کی شاعری سے کوسوں آگے تھی۔وہ اپنی معلومات علمی کو کچھ انلارج کر لیتے تھے جس سے ان کے قول و فعل میں تضاد آ جاتا تھا۔ حالانکہ وہ بڑے ہی مفکر قسم کے انسان تھے اور ان کی معلومات بھی اچھی خاصی تھی

ساغر صدیقی

ساغر صدیقی شانہ سازی کا استاد اور فطری شاعر مگر جوانی کی بعض خامیوں نے پختہ ہو کر اسے انشاءاللہ خاں انشاء سے بھی کچھ آگے پہنچا دیا ہے۔وہ زندگی میں ہوش کے قائل نہیں اور بقول غالب ''یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے'' کے مصداق ہیں جب لوگ انہیں مشاعروں میں پکڑ لاتے ہیں تو وہ کسی دوسری دنیا کے انسان معلوم ہوتے ہیں مگر غزل پڑھتے ہیں تو ان کے دھوئیں میں ان کی چنگاریاں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

سیف اکبرآبادی

جناب سیف اکبرآبادی آگرہ سے لاہور آ گئے تھے وہ سیماب اسکول کے آدمی تھے اور اخبارات میں لکھ کر گزارہ کرتے تھے جوانی ہی میں انہیں موت نے آ دبوچا اور وہ لاہور کی فضا میں بے یار و مددگار پیوند زمیں ہو گئے۔اصناف ادب میں وہ کہیں عاجز نہیں تھے یہی سبب تھا کہ ہر اخبار میں ان کے لیے گنجائش نکل آتی تھی نہ معلوم ان کے کلام اور مضامین کا کیا حشر ہوا۔اس پر ریسرچ ہو تو کارآمد لٹریچر دستیاب ہو سکتا ہے۔

سجاد حارث

ادریس احمد خان نام ہے لیکن اپنی تصنیف و تالیف میں خود کو سجاد حارث لکھتے ہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایم اے ہیں اور آج کل ''نیا علی گڑھ'' لاہور میں وائس پرنسپل ہیں انگریزی ادب کا قابل رشک مطالعہ ہے اور تنقیدی تبصرہ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ان کا ایک مقالہ کتابی صورت میں بھی چھپا ہے۔ جس کا نام ہے ''عوامی شاعر اور اس کا فن'' یہ مقالہ میری ذات پر ہے جس میں انہوں نے میری زندگی اور شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور اس میں وہ اپنی علمی و ادبی خوبیوں سمیت موجود ہیں۔ جناب سجاد حارث بڑے یار باش قسم کے انسان ہیں۔ اور مذہب و اخلاق کو بھی اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

سحاب قزلباش

سحاب قزلباش جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی صاحبزادی ہیں میں نے ان سے مشاعروں میں جس قدر غزلیں سنی ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام معمولی دل و دماغ کی کاوش نہیں وہ جس توجہ سے کہتی ہیں اسی ذوق وشوق سے پڑھتی بھی ہیں۔ ان کے اشعار میں رنگینی بھی ہے اور دلکشی بھی، غنائیت بھی ہے اور سلاست بھی۔

ساحل

آغا قزلباش ساحل اسائز اینڈ ٹیکسیشن میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں مرزا حاتم علی بیگ کے پوتے اور روزیر علی صبا کے نواسے ہیں۔ ذوق ادب ورثے میں پایا ہے کلام ساحل کے نام سے دیوان شائع ہو چکا ہے ان کی اہلیہ لیلیٰ مشہور افسانہ نگار ہیں القصہ خاندان بھر شعر و ادب سے ذوق رکھتا ہے۔

اقبال ساجد

یہ ۱۹۴۷ء میں ضلع سہارنپور سے آئے اور واپس آ کر شاعروں کی مجلسوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ جناب ساجد بھی ایسے طبقے سے اٹھے ہیں جہاں مناظر کی اور واردات کا قحط نہیں ہوتا اس

لیے وہی مشاہدات اور مسموعات ان کی شاعری کا سرمایہ اور ظاہر ہے کہ اسلوب بیان ہی سے شعر اپنے شاعر کا پتہ اور مقام بتاتا ہے۔ اس لیے ساجد کے یہاں اچھے اشعار بھی ہیں ہر چند کہ وہ اس دور کے خیالات و نظریات کے علاوہ مشاہدات اور طریق اظہار کو اپناتے ہیں لیکن جہاں کہیں وہ اپنی اپچ سے کام لیتے ہیں وہاں ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں کہ مفہوم فی بطن الشاعر ہو کر رہ جاتا ہے چونکہ انہیں وقت نے علمی امتیاز سے محروم رکھا ہے اور اس پر ذوق شعری میں بھی مبتلا کر دیا اس لیے ان کی تشنگی بھی ان کے ذوق میں مل کر جنون کا پیش خیمہ ہو گئی لیکن اس میں وہ ایسی بولی بھی بولتے ہیں جس کا دریچہ ایک بلند و برتر فن کی طرف بھی کھلا ہے تاہم نظر انداز کر دینے کے قابل نہ یہ ہیں نہ ان کی شاعری!

ساگر چند گورکھا

ساگر چند بھی مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگردوں میں تھے اور اس دور کے اخبار نویسوں میں نظر انداز نہیں کئے جاتے تھے۔ نثر اور نظم دونوں میں مہارت تھی۔ اپنے فرائض کی ادائی میں محنت اور دوستوں سے خلوص ان کا مشرب تھا وہ لاہور کے مختلف اخبارات میں کام کر چکے تھے اور ان کا یہ تجربہ انہیں صحافت میں روز بروز ترقی کی طرف لے جا رہا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد نہیں معلوم وہ کہاں گئے ان کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی۔

وریندر پرشاد سکسینہ

وریندر پرشاد سکسینہ سے میری ایک بار ملاقات ہوئی ہے لیکن اسی ملاقات میں انہوں نے اپنے خلوص کا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں لیکن ان کی گفتگو سے معلوم یہ ہوا کہ وہ ادب کا قدیم ذخیرہ رکھتے ہیں اور پرانے اخبارات اور رسالوں پر ان کی اچھی نظر ہے وہ اگر چاہیں تو ادب کے مختلف گوشوں پر مفید کام کر سکتے ہیں۔

سحر رومانی

محکمہ منصوبہ بندی میں سپروائزر ہیں ایم اے کے طیلسانی ہیں اور جدید نظمیں اور غزلیں بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں برابر کے ماہر ہیں انہوں نے بچوں کا لٹریچر بھی تخلیق کیا ہے

وہ اس رنگ میں نہایت ہی کامیاب ہیں جدید رنگ میں بھی وہ اپنے ہم عصروں میں خاص طرز کے مالک ہیں اور بحیثیت دوست بھی مثالی انسان ہیں-

محمد سید سید

جناب سید حضرت بے خود دہلوی کے صاحبزادے ہیں دلی میں تو بڑے مشاعرے پڑھتے تھے لیکن جب سے لائل پور آئے ہیں گوشہ نشین ہو گئے ہیں- کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے ماضی کے پردے الٹ جاتے ہیں اب وہ رنگین زندگی کے رسیا، درویشوں کی طرح خانہ نشینی کی زندگی کو روح کی تسکین بناتے ہیں- مگر جب غزل پڑھتے ہیں تو ان میں وہی شاعرانہ آن بان آ جاتی ہے جو اساتذہ میں ہوتی ہے- ان کے یہاں میں نے کئی قابل قدر مخطوطے اور کار آمد خطوط دیکھے ہیں جو اگر حاصل کر لیے جائیں تو تاریخ کا جزو بن سکتے ہیں-

سخاوت مرزا

جناب سخاوت مرزا مشہور اہل قلم میں سے ہیں پچھلے سال جب میں کراچی گیا تو حیدر آباد کالونی میں ایک کتابوں کی دکان پر ان سے ملاقات ہوئی وہ قدیم روش کے انسان ہیں اور تحقیقی مزاج پایا ہے انہوں نے جس قدر مضامین لکھے ہیں ان میں کاوش قلم لائق تحسین ہے- دکنی ادب پر جو انہوں نے وقیع لٹریچر پیدا کیا ہے وہ انہیں زندہ رکھنے کا ذمہ دار ہے ان سے مل کر میرے دل میں ان کے لیے محبت کا جذبہ پیدا ہوا کیونکہ ایسا صاحب قلم انسان اور اس قدر سیدھا سادہ، وہ قدیم تہذیب کے علم بردار ہیں اور اسی تہذیب کے متعلق عموماً ان کا قلم جاری رہتا ہے-

سہیل عظیم آبادی

جناب سہیل عظیم آبادی سے میری پہلی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی وہ اس وقت نہایت لا ابالی قسم کے آزاد منش اور آزاد خیال انسان تھے اور پھر جب بھی ان سے ملاقات ہوئی وہ اسی طرح مخلص اور اسی طرح مست خیال دکھائی دیئے- انہیں نثر اور نظم دونوں پر عبور ہے اور ان کی گم شدگی ایک حسن ہے جو ہر شاعر میں نہیں ملتی- ان میں خلوص ہے جو ان کی فطری شے معلوم ہوتی ہے وہ فن صحافت کے

بھی ماہر ہیں ان کا قلم وقت اور موقع کو پہچانتا ہے۔

سید حامد

سید حامد سے میں جب ملا اس وقت وہ بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور نہایت اچھا شعر کہتے تھے۔ شاعری کے علاوہ ان میں تنقید و تحقیق کی بھی بے پناہ صلاحیتیں ہیں وہ نثر اور نظم دونوں میں مہارت رکھتے ہیں انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ انہوں نے ادب و انشا کا نہایت اچھا ذوق پایا ہے۔ ان کی تحریریں ابتذال سے پاک اور پستی سے معرا ہوتی ہیں۔ ان سے ملاقات کو ایک زمانہ ہو گیا اب تو وہ تحریر و تقریر کے بے مثال انسان ہو گئے ہوں گے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کنور مہندر سنگھ بیدی اردو شاعروں میں ایک خاص مقام کے مالک ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے نازک نازک پہلو بھی نظم ہوتے ہیں اور تصوف کے مسائل بھی وہ بہاروں سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور پت جھڑ سے بھی۔ وہ نظم اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر وہ غزل ہی کہتے ہیں اور اس میں وہ شاعری کا حق ادا کرتے ہیں ان کے یہاں رنگینی اور خیال آرائی دونوں دوش بدوش چلتی ہیں اور اس سے ان کا کلام اور بھی جان لیوا ہو جاتا ہے۔ اقدار انسانی کے محافظ اور قدر شناس ایسے بہت کم نظر سے گزرے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے۔

تحسین سروری

جناب تحسین سروری حیدرآباد دکن کے رہنے والے ہیں اور آج کل کراچی میں انجمن ترقی اردو سے منسلک ہیں۔ نظم اور نثر دونوں بڑے سلیقے کی ہیں اور تحقیق و تفحص کا ذوق بھی قابل تعریف ہے وہ انسان کی حیثیت سے بھی شاعروں اور ادیبوں سے دور نہیں وہی والہانہ پن وہی خلوص وہی شاہ خرچی اور وہی افلاس ظاہر ہے کہ ایسا انسان نازک مزاج بھی ہوتا ہے اور سخت جان بھی وہ برابر اپنی قلمی کد و کاوش سے گزارا کر رہے ہیں اور ابھی کوئی خاص سہولت کا مقام نصیب نہیں ہوا۔

سیف زلفی

جناب زلفی ریلوے کے محکمہ سے منسلک ہیں اور نوجوان شاعر ہیں- کچھ دنوں پہلے قدیم شاعروں کی صف میں تھے مگر اب چند روز سے نئی شاعری کرتے ہیں اگر چہ ان کے سانچے وہی پرانے ہیں لیکن تابہ کے یہ ترقی کے راستے پر گامزن ہیں اور جلد قدامت سے دوری کی منزل طے کر لیں گے- ابھی چند روز ہی میں ان کے یہاں اچھی خاصی ترقی پسندی جلوہ ہوگئی ہے اور مشاعروں میں بھی زلفی صاحب کو ایک مقام حاصل ہو رہا ہے ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا-

سہیل بلگرامی

جناب سہیل بلگرامی ریلوے میں گارڈ تھے اور ریٹائر ہو کر ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے- انہیں اردو، فارسی اور انگریزی پر عبور تھا وہ ان تینوں زبانوں کے صرف ونحو سے خوب واقف تھے اور یہی سبب تھا کہ انہیں لوگ شوق سے بلاتے تھے- غزل نہایت اچھی کہتے تھے اور کہنے سے زیادہ اچھی پڑھتے تھے ان کی آواز میں ایک قسم کا کڑکا اور جھنکار تھی اور معمولی شعر کو بھی وہ اپنے انداز بیان سے حسین بنا دیتے تھے تقسیم کے بعد لاہور آ گئے تھے- یہیں ریٹائر ہوئے اور یہیں انتقال ہوا-

سبطین شاہجہانی

سبطین نوجوان ہے اور اس میں ترقی کے آثار رونما ہیں بزا محنتی اور شریف قسم کا شاعر ہے اگر چہ اس کی شاعری ابھی روایت کی پگڈنڈیوں پر چلی آ رہی ہے لیکن انداز خرام میں بگولوں کا رقص اور آندھیوں کا زور بھی پلکیں اٹھا اٹھا کر دیکھ لیتا ہے- اگر اسے علمی شغف رہا اور مطالعہ سے نہ اکتا گیا تو مستقبل کی پائداری لازم آتی ہے-

سلام مچھلی شہری

پہلے پہل فیض آباد میں ان سے ملاقات ہوئی میں باب اللہ قاسم جعفری صاحب کے یہاں مقیم تھا اور یہ ان کے اعزا میں ہیں- عرصے سے انہیں کے یہاں رہتے تھے- لیکن ان کے لا ابالی ذہن سے وہ بھی تنگ تھے کیونکہ جعفری صاحب اسکول ماسٹر تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر تعلیم سے

زمانے میں تعلیم حاصل نہ کی جائے تو یہ عمر بھر پوری نہیں ہوتی - اس لیے انہیں ان سے بہت ہمدردی تھی اور سچ پوچھیے تو ان کو برداشت کرنا جعفری صاحب ہی کا کام تھا - سلام مچھلی شہری کی کوچہ گردی کو دیکھ کر ہی کسی نے کہا تھا کہ یہ سلام مچھلی شہری نہیں بلکہ شہری مچھلی ہیں - ان کے یہاں ہیئت اور تجدد کے نئے نئے تجربے ملتے ہیں - یہ اور بات ہے کہ وہ ادب میں کیا مقام رکھتے ہیں میرے خیال سے تو کسی نقاد یا تذکرہ نویس نے بھی ان پر ابھی بھرپور نظر نہیں ڈالی اور اس کا سبب ان کی کم آمیزی کے سوا کچھ نہیں - یہی سبب ہے کہ جہاں کہیں ان کا ذکر ہوتا ہے وہ ادبی بدعت کے مرتکب بتائے جاتے ہیں اگرچہ جدید تجربات اپنے لٹریچر میں داخل کرنا ادب کو بڑھانا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اظہار کا طریق حسین اور سامع نواز ہو - سلام نظر انداز کر دینے کے قابل شاعر ہرگز نہیں ان کے یہاں بڑے اچھے اچھے رخ ملتے ہیں اور وہ موجودہ دور کے بہت سے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں -

سرور بارہ بنکوی

جناب سرور بارہ بنکوی نوجوان شاعر ہیں اور مشاعروں میں اکثر انہیں سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ ترنم سے غزل پڑھتے ہیں ان کی غزل اگرچہ یوں بھی غزل ہوتی ہے مگر نغمہ اسے اور بھی پر لگا دیتا ہے اور مشاعروں میں ہر طرف سے داد و تحسین آتی ہے - خدا کرے ان کا فلمی رجحان ان کی غزل کو نگل نہ جائے - ابھی ان کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا اور نگاہیں منتظر ہیں -

ساحل بلگرامی

جناب ساحل شروع میں لاہور میں تھے جن دنوں مولانا تاجور مرحوم نے اردو مرکز قائم کیا تھا اور ہندوستان بھر کے ادیبوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے کچھ کتابیں ترتیب دلوائی تھیں اور کچھ انتخاب کرائے تھے ساحل صاحب نے "حاجی بابا اصفہانی" کا ترجمہ کیا تھا - اس کے بعد وہ ایک عرصہ نہ جانے کہاں رہے پھر ایک مشاعرے میں لائل پور ملاقات ہوئی وہ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر تھے اور انہوں نے مرثیے بڑے کامیاب لکھے تھے نہ معلوم ان کا کلام بھی چھپا ہے یا نہیں وہ عرصہ ہوا اللہ کو پیارے ہو گئے -

سفیر حسن سفیر دہرہ دونی

دہرہ دون میں وکالت کرتے تھے- مشاعروں میں ان سے غزلیں سننے کا اتفاق ہوا ہے- وہ اچھا سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں اور دہرہ دون میں نمایاں شہرت کے مالک ہیں ان کے اشعار قدیم روش کے صاف ستھرے تصورات وخیالات کے حامل ہوتے ہیں تقسیم کے بعد حالات معلوم نہیں ہو سکے-

سحر مرادآبادی

جناب سحر حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے قریبی عزیز ہیں عرصہ ہوا ایک بار غریب خانے پر تشریف لائے تھے جگر صاحب کی قربت یا تقلید سے ان کا رنگ جگر صاحب کے اسلوب سے متا جلتا تھا اب تو ان کی مشق ومزاولت نہ جانے کہاں پہنچی ہوگی -عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی-

اقبال سہیل

جناب اقبال سہیل اعظم گڑھ کے مشہور لوگوں میں سے تھے- ان کی معلومات اور قابلیت مسلم تھی وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی وکیل بھی تھے اور مولوی بھی وہ جہاں عدالتوں اور خانقاہوں میں گٹ ٹ بولتے تھے ویسے ہی مشاعروں اور مناظروں کے دھنی بھی تھے ان کے ذہن میں الفاظ کا ذخیرہ تھا اور اس کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے تھے ان کا ایک مجموعہ کلام ''تابش سہیل'' کے نام سے چھپا ہے جو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا گواہ ہے-

سالک لکھنوی

جناب سالک سے میری ملاقات لکھنؤ کے مشاعروں میں ہوئی تھی- وہ نہایت اچھی غزل کہتے ہیں اور لکھنؤ کے طرز وادا کے اعتبار سے زبان اور بیان میں جھول نہیں ہوتا وہ حسن وعشق کے معاملات کے علاوہ زندگی اور اس کی دھوپ چھاؤں پر بھی بڑے قیمتی شعر کہتے ہیں- مشاعروں میں بھی انہیں نہایت شوق اور توجہ سے سنا جاتا ہے- ان کا کوئی مجموعہ میری نظر میں نہیں-

سیف الدین سیف

سیف الدین سیف صاحب امرتسر کے رہنے والے ہیں اور بڑے مسلمان قسم کے انسان ہیں ان کا اسلامی اصولوں سے انحراف نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیف صاحب کا خاندان اور ان کا ماحول اول سے مذہبی رہا ہے۔

سیف صاحب ملک کی مختلف اسلامی جماعتوں سے متعلق رہے ہیں اور خاکسار تحریک میں سرگرم کارکن ہونے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور دو سال تک زنداں کی صعوبتوں میں مبتلا رہے۔ جیل سے واپسی پر وہ ایف اے کر کے بی اے کے دوسرے سال تک کالج میں رہے اور وہاں بھی کسی مذہبی اختلاف پر الجھ پڑے اور نتیجے میں انہیں امتحان کی شمولیت سے روک دیا گیا اس امر کی تلخی نے سیف کو کالج سے متنفر اور تعلیم سے بددل کر دیا اور انہوں نے اپنے علم کی ترقی کا دارومدار ذاتی ذوق علم اور مطالعہ پر رکھا۔ زندگی بسر کرنے کے لیے سیف صاحب دلی شملہ اور کشمیر تک سرگرداں رہے آخر مایوس ہو کر فلم لائن اختیار کر لی اور اب وہ اسی ادارے میں ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔ اوائل عمری سے لکھتے ہیں سیف صاحب کی نظمیں اور غزلیں ملک کے باوقار اخبارات اور رسائل میں چھپنے لگی ہیں۔ خوش قسمتی سے اختر حسین رائے پوری سے نزدیک رہے اور امرتسر کی فضا میں جناب تاثیر اور فیض جیسے لوگوں کی صحبتیں میسر آ گئیں فطری جوہر پہلے ہی موجود تھے چنانچہ چمک اٹھے اور بہت جلد ادبی لوگوں میں چرچے ہونے لگے لاہور کی ادبی فضا میں یہ ایک ستارہ طلوع ہوا کہ اس کی چکاچوند نے ہر مذاق سلیم رکھنے والے شخص کو متاثر کر دیا۔ سیف صاحب کے یہاں تمام اصناف سخن میں مقبول سخن غزل ہے یوں تو وہ نظمیں گیت اور قطعات و رباعیات بھی لکھتے ہیں لیکن ان کا فطری جوہر غزل میں بڑا تابناک ہو جاتا ہے سیف کی شاعری میں جہاں غم روزگار کی پرچھائیاں معلوم ہوتی ہیں وہیں وہ غزل کے لوازم یعنی جذبات کی عکاسی سے بھی غافل نہیں ہوتے ان کے شاعری میں خلوص، فکر اور کاوش بھی کچھ ہے اور اسلوب بیان ایسا نرم اور ملائم ہے کہ مفہوم کو نظروں اور کانوں کے راستے دلوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

سیف یوں تو ہمارے نئے زمانے کے شعراء کی صف میں آتے ہیں لیکن ان کے یہاں غزل

میں جوزبان استعمال ہوتی ہے وہ ان کے معاصرین میں بمشکل کسی کے یہاں ملے گی وہ غزل کے لیے ہیں اور غزل ان کے لیے۔ غزل گوئی میں سیف کا مقام اپنی موسیقیت‘ پاکیزگی‘ ملائمت اور سہل ممتنع کے لحاظ سے اسم باسمی ہے اپنے ہر شعر میں سیف اپنے خدوخال سمیت موجود ہیں۔

ساحر لدھیانوی

عبدالحی ساحر لدھیانوی‘ جس پایہ کا شاعر ہے اسے اسی پایہ کا شاعر ہونا چاہئے تھا بلکہ اس سے بھی بلند ساحر ایک امیر کبیر باپ کا بیٹا ہے یہ ابھی لڑکپن کی منزلیں طے کر رہے تھے کہ ان کی والدہ اور والد میں کسی بات پر کشیدگی ہوگئی اور یہ مسئلہ سامنے آیا کہ وہ کس کے پاس رہیں ماں کے یا باپ کے‘ چنانچہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ والد کے یہاں ساحر کے سوا اور کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ لڑکا میرے پاس رہے بلکہ وہ ولی عہد کہلائے اور جاگیر کا مالک ٹھہرے لیکن عدالت میں جاکر ساحر نے اپنی ماں کے دامن سے جدا نہ ہونے پر اصرار کیا اور باپ کے سارے مال و منال کو ٹھکرا دیا۔ ساحر کی تعلیم اور پرورش کا تمام باران کے ماموں پر تھا۔ یہ بی اے کے دوسرے سال میں تھے کہ انہیں پتہ چلا کہ وہ وطن دوستی کے جرم میں کالج سے نکال دیئے جائیں گے۔ یہ خبر پاتے ہی ساحر لاہور چلے آئے اور اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے لیکن یہاں بھی وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے اس کے بعد ساحر نے لاہور کے کئی رسالوں میں کام کیا اور اسی اثنا میں وہ کئی بار مشاعروں وغیرہ کے سلسلے میں بمبئی بھی گئے انہیں بمبئی بہت پسند آیا۔ چنانچہ وہ لاہور سے بمبئی چلے گئے۔

جن دنوں ساحر کا معاملہ عدالت میں تھا اور انہوں نے والدہ کے دامن کے لیے باپ کی جاگیر کو ٹھکرا دیا تھا میں ایک مشاعرہ میں شمولیت کے لیے لدھیانہ گیا ہوا تھا میں نے جب یہ معاملہ سنا تو مجھے ساحر سے ایک دلی انسیت ہوگئی میری آرزو تھی میں ساحر کو اپنے گھر لے آؤں اور اس کی تعلیم و تربیت کروں لیکن مجھے میرے ایک دوست عبدالرحمان نے کہا کہ ساحر کے ماموں وغیرہ بھی معمولی درجے کے آدمی نہیں وہ ہرگز تمہاری اس بات کو نہیں مانیں گے میں خاموش ہوگیا لیکن ساحر جب بھی میرے سامنے آیا میرے دل میں اس کی وہی محبت زندہ ہوگئی جو پہلے دن مرتسم ہوئی تھی مجھے خوشی ہے کہ آج ساحر بمبئی میں ایک باعزت زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ آج بھی میری دعاؤں میں ہے۔ چونکہ

ساحر کے فن کی بنیاد خلوص پر ہے اس لیے اس سے جو شعر تخلیق ہوتا ہے وہ مشاہدہ اور تجربہ کے رنگ و روغن سے مزین ہوتا ہے اور یہی شعر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ مخلص انسان ہے اور مخلص انسان جو بات کہتا ہے وہ سچائی کے ساتھ کہتا ہے۔

ساحر کے یہاں سیاسی اور سماجی احساس کے اشعار بھی ہیں اور رومانی نقش کاری بھی لیکن ان کے یہاں نہ تو جذباتی دھند لکے ہیں اور نہ سیاسی ناہمواریاں اس کا دماغ کھلی فضا میں سانس لیتا ہے اور اس کا دل حقائق کو محسوس کرتا ہے۔ اس کے ہر تصور اور تخیل میں شاعری کے نئے نئے دریچے کھلتے ہیں اور ان میں جھانکنے سے وہی کچھ دکھائی دیتا ہے جو ساحر دکھانا چاہتا ہے وہ اپنے اسلوب بیان اور طریق اظہار کا منفرد شاعر ہے۔ وہ نہایت نرمی سے اشارات و کنایات کے پردے میں بات کہتا ہے اور اس میں ایسا رچاؤ ہوتا ہے کہ کھری سے کھری طبیعت اس پر مائل ہوتی ہے۔ ساحر کی تلخی میں مٹھاس کا احساس ہوتا ہے اور نغمے میں نالہ و شیون تیرتے محسوس ہوتے ہیں اور ابھی ساحر کے سامنے بڑا میدان ہے اس کے شاعرانہ فن میں آج ملک کا کوئی شخص بھی احاطے کی داغ بیل نہیں لگا سکتا۔

ساغر نظامی

جب میں نے ساغر نظامی کو دیکھا تو وہ ایک چھیل چھبیلا نوجوان تھا اگرچہ یہ اپنی عمر کے اعتبار سے کئی سنگ میل چھوڑ چکے تھے لیکن ان کے خد و خال اب بھی دعوت نظارہ دیتے تھے اور اس سے زیادہ ان کی لچھے دار تقریر ادب و شعر کے آثار سے بھرپور ہوتی تھی۔ مشاعروں میں ان کا ترنم اور ترنم کے ساتھ بناؤ سنگھار اور لباس کا تنوع لوگوں کو انہی کی طرف متوجہ رکھتا تھا۔ میں نے ان کا ترنم بار ہا سنا مناسب جگہ پر ٹھہراؤ اور موقع موقع کی مناسب اداکاری پبلک کے ہونٹوں پر مہر لگا دیتی تھی۔ شروع شروع کے زمانے میں جب یہ ساغر سیمابی تھے ترنم کے علاوہ بھی اشعار میں جان موجود تھی۔ لیکن ان کے بعد یہ پہلے ساغر نہ رہے اب ان کا کلام دو حصوں میں آسانی سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ساغر سیمابی کا دور اور ایک ساغر نظامی کا۔ ساغر سیمابی کا دور ایسا ہے کہ اس میں کچھ سیپیوں کے خول ملتے ہیں جن کی رنگین جھنکار کہیں کہیں احساس کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ ممکن ہے بعد کے دور میں بھی ساغر نے کچھ اشعار معیاری کہے ہوں میں نے عرصے سے ان کا کلام نہیں دیکھا ان کی شاعری میں

الفاظ کی کمی اور رنگوں کا قحط نہیں ہوتا لیکن ان کے خیالات وتصورات کا کینوس وسیع نہیں ہوتا وہ پتھر کے بے جان اصنام تراشتے ہیں اس پتھر کے جو شرار سے محروم ہوتا ہے۔ تاہم شاعر ہیں شباب کے شاعر اور اب تو وطن کے شاعر۔ جب کہیں ساغر کا نام آتا ہے تو سیماب مرحوم کا نام خودبخود زبان پر آجاتا ہے اور اس غلط شہرت سے دونوں طرف بڑا نقصان پہنچا ہے لیکن کیا ہوسکتا ہے۔

''خود کردہ را علاجے نیست''

ساقی الحسینی

جناب ساقی الحسینی گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں لیکچرر ہیں اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر اچھی معلومات رکھتے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں انہیں مہارت تامہ ہے الفاظ کے دروبست اور محاورات واصطلاحات ان کے یہاں بڑے سلیقے سے استعمال ہوتے ہیں۔ تنقید ادب اور تذکرہ وسوانح پر بھی ان کی اچھی نظر ہے القصہ معیاری ادیب بھی ہیں اور نغز گو شاعر بھی اور ابھی ان کی عمر ایسی نہیں کہ ترقی پر پھاٹک لگ جائے ان کے سامنے تو میدان ہی میدان ہیں بس جرأت رفتار کی ضرورت ہے مستقبل منتظر ہے۔

نواب سجاد علی خاں سجاد

سجاد صاحب نواب لیاقت علی شہید کے بھائی ہیں اچھی اور معیاری مجلسوں نے انہیں ایک اچھے مذاق کی طرف رجوع کردیا۔ وہ نہایت اچھی غزل کہتے ہیں ہر چند ان کا انداز قدیم ہے لیکن ہم قدیم انداز کی پاکیزگی اور حسن کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اچھا شعر تو ہر صورت میں اچھا ہوتا ہے کرنال میں سجاد صاحب کے دم سے اردو کی مجلسیں ہوتی تھیں جو اشاعت وتبلیغ کا سچا اور ہمدرد حلقہ قرار پاتا تھا۔ ان کا مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

سوز شاہجہاں پوری

جناب سوز شاہجہاں پوری کو میں لکھنؤ سے جانتا ہوں لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی وہ اسی طرح اپنا کلام پڑھتے جیسا کہ آج کراچی میں پڑھتے ہیں۔ ان کے رنگ میں ایسی پختگی ہے کہ لکھنؤ کی

غزلوں اور آج کی غزلوں میں امتیاز نہیں ہوتا جیسی دلچسپی اس وقت تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ اس وقت وہ کسی اسکول میں ٹیچر تھے نہ معلوم کراچی میں کیا کر رہے ہیں مشاعروں میں ان سے ایسی تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی کہ ذرا کھل کر گفتگو ہوتی اور کچھ معلومات بہم پہنچتے - بہرنوع وہ بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور مشق ہی آدمی کو کام کا انسان بناتی ہے۔

ساحر کپورتھلوی

سوہن لال نام ساحر تخلص' پڑھا لکھا انسان کپورتھلہ ریاست کے پولیس کا ذمہ دار افسر' مگر نہایت آزاد اور روانسان۔ نہایت خوش پوش' خوش گلو اور خوش گو یار باش قسم کا ہر دلعزیز انسان۔مشاعرہ میں شعر پڑھتے ہیں تو شعر کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔قدیم روش کا دلدادہ ہونے کے باوجود نئے انداز سے شعر کہتے ہیں۔وہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بات دلوں تک پہنچا دینے میں شعر کے جادو سے کام لینے والا جادو گر ہے۔ سرتاپا خلوص' تمام محبت' ایثار گفتگو کیجیے۔تو پھولوں کا تختہ ذرا گہرائی سے چھیڑیئے تو آنسوؤں کا آبشار' ہوش ہو یا بے خودی اسے دل میں بٹھانے کو جی چاہتا ہے۔ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

سر سلطان احمد

سر سلطان احمد صاحب سے شملہ سے ملاقات شروع ہوئی اور پھر نہ جانے کیوں بالواسطہ نصف خاندان سے تعلقات استوار ہوتے چلے آئے۔اس سلسلے میں جناب موسیٰ امن کاظمی' عاشق حسین اکبری' جمیل مظہری' نظر بیگ' سید حسن صاحب وغیرہ سب شامل ہیں۔ سر سلطان صاحب بڑے اچھے صاحب قلم لوگوں میں تھے ان کی تحریر نہایت بڑے لوگوں کی تحریر جیسی تھی اور وہ دل و دماغ کے اعتبار سے بلند انسان تھے۔ادیبوں اور شاعروں کا احترام اور حوصلہ افزائی ان کا شعار تھا اور خود خوب خوب شعر سنایا کرتے تھے۔

ساحر قدوائی

بریلی کے شرفاء سے ہیں تقسیم ملک کے وقت لاہور آ گئے لیکن لاہور انہیں راس نہ آیا اور لائل پور چلے گئے وہاں ان کا دواخانہ ہے اور نہایت اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں کامیابی سے کہتے ہیں اور نثر بھی اسی مہارت سے لکھتے ہیں عرصہ سے ان کی طبی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ادب سے کٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی غزل یا نظم کہتے ہیں تو دوستوں تک محدود رکھتے ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم آتے ہیں اور اس کا سبب ان کی مصروفیات کے علاوہ کچھ نہیں۔ ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

ہیرانند سوز

نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اگرچہ سرکاری محکمہ سے منسلک ہیں لیکن ان کے افسانے ایک معیاری ادیب کے افسانے ہوتے ہیں جن میں امراء اور حکام کی عیاریاں اور پس ماندہ طبقے کی سادہ خاطری کے علاوہ ان کے کردار بھی بولتے ہیں۔ سوز چونکہ سچے انسان ہیں اس لیے ان کا لٹریچر بھی حقیقت پر مبنی اور ادب کی شرائط پر پورا اترتا ہے۔ ان کی کتاب ''کاغذ کی دیوار'' افسانہ کی دنیا میں نمائندہ کتاب کہی جا سکتی ہے۔

ٹیکا رام سخن

ٹیکا رام سخن اچھے کہنہ مشق شاعر تھے انہوں نے ایک کتاب ''تحریک آزادی'' نثر میں لکھی تھی جو ضبطی میں آ گئی تھی اس کتاب میں سخن نے انگریز کے دور سے پہلے کی کئی تحریکوں کا ذکر کیا ہے اور اچھی قابل قدر کتاب ہے شعر میں بھی وہ اکثر سیاسی خیالات ہی کو شعر کا جامہ پہنایا کرتے تھے اور ان کا کلام مختلف اخبارات کی زینت ہوتا تھا۔

محمد اقبال سہیل

ساہیوال کے رہنے والے ہیں اور ''الندوہ'' مکہ مکرمہ میں سیاسی کالم لکھتے ہیں علاوہ ازیں بیروت میں انٹرنیشنل پریس آرگنائزیشن میں ریسرچ فیلو کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ نوجوان ادیب اور صحافی بہت کم ایسے ہوتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''مشرق وسطیٰ کے سیاسی تصورات'' عربی زبان میں ہے جس کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا۔ خلیق اور ملنسار انسان ہیں اور حالات واقعات کو سجا سنوار کر بیان کرتے ہیں۔

سرفراز حسین زیدی

علی گڑھ سے ایم اے ایل ایل بی کیا ۱۹۴۸ء میں لاہور آ گئے اور پولیس میں کورٹ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے اور غالباً وہیں سے ریٹائر ہوں گے۔ اچھا خاصا شعر کہتے ہیں لیکن پولیس کی مصروفیات نے شاعرانہ صلاحیتوں پر ڈاکہ مار رکھا ہے اس کے باوصف ان کے پاس غزلوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جو غالباً ریٹائر ہونے کے بعد چھپے گی۔

سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو مشرقی خواتین میں واحد خاتون تھیں جن کے ادب و شعر کا چرچا ملک بھر میں تھا ہر چند کہ وہ شعر انگریزی میں کہتی تھیں لیکن اردو ان کی مادری زبان تھی اور ایسی سلیس اردو بولتی تھیں کہ بڑے بڑے صاحب زبان چکر کھا جاتے تھے۔ ان کی نظر سیاست سے زیادہ ادب پر مرکوز تھی اور یوں سمجھئے کہ غیر منقسم ہندوستان کی ایک عظمت مجسم تھیں۔ اخلاق بلند بات مختصر مگر پر معنی۔ تحریر نہایت شستہ مگر وسیع مفہوم کی حامل۔ ایسی خواتین بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ میں ان سے کئی بار ملا اور ہر بار ان میں نئی جاذبیت محسوس کی۔

مولوی سمیع اللہ

مولوی سمیع اللہ صاحب جامع مسجد دہلی یا یوں کہیے کہ اردو بازار کے ایک مشہور بزرگ ہیں جو نیا شخص کہیں سے وارد ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح سمیع اللہ صاحب کی دکان پر ضرور پہنچتا ہے اور کمال یہ ہے کہ وہاں سے دل برداشتہ نہیں اٹھتا وہ انتہا درجے کے متواضع انسان واقع ہوئے ہیں اگر ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا تو ادھار سے بھی دریغ نہیں کرتے ان کی دکان میں جا کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ مولانا کپڑا بیچتے ہیں یا کتابیں جہاں تک میرا مشاہدہ ہے وہاں تک تو یہی نظر سے گزرا ہے کہ کتابوں کے تاجر جب ان سے اپنی کتابوں کے دام طلب کرتے ہیں تو وہ نہایت عجز وانکساری کے ساتھ انہیں قیمت میں کھدر ناپ دیتے ہیں اور کھدر والے آتے ہیں تو انہیں کتابیں باندھ دیتے ہیں اور اس طرح کتابوں اور کھدر کے تاجر ہمیشہ ان سے مایوسی کے باوصف خوش رہتے ہیں۔ ان کی دکان ایسے موقع پر ہے کہ وعدہ پر ملنے کے لیے کتب خانہ عزیزیہ ہی کا پتہ ہر شخص لیے پھرتا ہے اور نہ جانے کس کس کے عہد و پیمان پورے ہوتے ہیں مولانا سمیع اللہ کی خوش خلقی اور خوش مزاجی مشہور ہے اور سب لوگ انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں جہاں تک علم وفضل کا تعلق ہے مولانا دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں۔

سلامت علی خیال بادلوی

جناب سلامت علی خیال ملازمت پیشہ انسان ہیں اور دہلی کے قریب بادلی کے رہنے والے ہیں دلی میں اساتذہ کی صحبتیں اٹھائے ہوئے ہیں اور پختہ مشق شاعر ہیں ترنم سے پڑھتے ہیں اور ان کا شعر سن کر مایوسی نہیں ہوتی وہ قدیم رنگ میں ضرور کہتے ہیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے سجا بنا کر غزل کو غزل بنانا ان کا مشغلہ ہے زندگی کی مصروفیات کے باوجود وہ شاعری کرتے ہیں اور ان کے پاس ان کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔

شجر طہرانی

سیالکوٹ میں سب سے بزرگ شاعر ہیں ان کے قطعات کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے جس سے ان کی قدر و منزلت کلام ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کا برمحل استعمال اور حسن معانی کے لیے الفاظ کا چناؤ ان کی مشق و مزاولت اور مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔ کاش طہرانی صاحب اپنی زندگی کے ادبی ہنگامے قلمبند کر دیں۔ ہمارے یہاں اس صنف ادب کی بڑی کمی ہے اور ان کے لیے یہ کوئی بات نہیں کیونکہ ان کا مشاہدہ ہے اور انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے۔

شرقی چاندپوری

جناب شرقی چاند پوری' چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور گوجرانوالہ کے کئی شعراء ان سے مشورہ کلام کرتے تھے اور یہ بے تکلف اصلاح کرتے تھے اپنی مزدوری کے علاوہ کسی سے کسی امداد کے طالب نہیں تھے۔ میں نے ان کے پاس ان کے کلام کی بیاض دیکھی تھی ان کے انتقال کے بعد نہ معلوم وہ ذخیرہ ادب کہاں اور کس کے پاس رہا۔

عرصہ ہوا ان کا ایک شاگرد میرے پاس آیا تھا اس کا نام بھول گیا اس کا بیان تھا کہ ان کا کلام میرے پاس محفوظ ہے۔ عنقریب ایک رسالے کا اجرا کر رہا ہوں جس میں ان کا کلام شائع کیا کروں گا پھر کچھ روز کے بعد ایک معمولی سا رسالہ بھی آیا مگر افسوس وہ رسالہ بھی میرے پاس نہیں۔

شوکت تھانوی

جناب شوکت تھانوی یوں تو مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف مصنف اور شاعر ہیں لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے متین اور باقاعدہ شاعری بھی کی ہے۔ وہ جناب آسی الدنی کے شاگرد تھے اور اپنے دور میں بڑی اچھی غزل کہتے تھے اور تقریر و تحریر دونوں پر پوری طرح حاوی تھے لیکن آج لوگوں کے سامنے ان کے مزاحیہ شاہکار تو ہیں سنجیدہ شاعری نہیں۔ حالانکہ وہ اب سے عرصہ پہلے صاحب دیوان ہو چکے تھے اور ان کے دیوان ''گہرستان'' پر اخباروں رسالوں اور اساتذہ کی قابل قدر رائیں آئی تھیں لیکن چونکہ وہ اچانک مزاح کی طرف بڑھ گئے اس لیے ان کی شاعرانہ

عظمت پر مزاح کی داد و تحسین ایک دیوار بن کر رہ گئی- میرے کتب خانے میں ''گہرستان'' موجود ہے اور اس میں ان کی شاعری ان کے شاعرانہ مقام کا تعین کرتی ہے-شوکت تھانوی کے یہاں وہ بے قاعدگیاں نہیں ہیں جو عموماً شعراا پنے یہاں روا خیال کرتے ہیں وہ ایک ایسے استاد کے تربیت یافتہ تھے جو فن سے ایک قدم بھی ہٹنا گناہ خیال کرتے ہیں شوکت کی قادرالکلامی بھی یہ تھی کہ میں نے کئی مشاعروں میں انہیں فی البدیہہ منظوم تعارف کراتے اپنے کانوں سے سنا ہے علاوہ ازیں جب کہیں وہ مشاعرے میں مطروحہ مصرع پر غزل کہتے تھے تو بیسیوں شاعروں پر بھاری رہتی تھی-ممکن ہے دھڑے بند تذکرہ نگار سنجیدہ شاعروں کی صف میں شوکت کو نہ رکھیں لیکن اگر ایسا ہوا تو ادبی بددیانتی ہوگی-

شورش کاشمیری

عبدالکریم نام تھا لیکن میں نے اسے شورش تخلص دیا اور وہ بفضل تعالیٰ شورش ہو گیا-بچپن کی تعلیم انٹر تک باقاعدہ رہی اس کے بعد فطرت نے اپنا پروگرام شروع کر دیا اور وہ اپنی آزادہ روی کے سائے دیکھ دیکھ کر بدلتے گئے اس کی علمی جستجو نے اسے مطالعے کا عادی بنا دیا اور لاابالی ودیعت نے اس کا رخ سیاست کی طرف موڑ دیا-شورش مولانا تاجور اور مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کی تربیت اور رنگ عمل لے کر جب میدان میں آیا ہے تو وہ ایک آتش نوا مقرر، شمعہ خو شاعر تھا لیکن اب کی بے تاب فطرت اسے تقریر و ادب کے میدان سے نکال کر عمل کے جادہ پر لے آئی اور اس کے سینے میں سیاست کا دھواں بڑھتے بڑھتے شعلے دینے لگا-اب اس کی تقریروں سے ملک کے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا ہوا کہ اس بلائے بے درماں نے دس سال کا عرصہ جیل میں گزارا اور جس طرح گزارا اس کی تفصیل بڑی زہرہ گداز اور دیوانہ کر دینے والی ہے جسے وہ کبھی خود اپنے قلم سے لکھے تو شورش کے قلم کا رنگ اور اس کا اسلوب تحریر آشکارا ہوگا-

شورش غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتا ہے اور ایسی قدرت رکھتا ہے کہ اگر ہمارے ملک میں شورش جیسے چند مقرر اور شاعر پیدا ہو جائیں تو ہماری سیاست اور اخلاقیات ہی کی نہیں تاریخ کی گتھیاں سلجھ جائیں-شورش کی تقریر میں خطابت کے شعلے لپکتے ہیں اور شعر میں اس کی زندگی کی تلخیاں

جھنجھلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں وہ اپنے اسلوب بیان میں ایک طوفانی کیفیت کا حامل ہے جس میں خیالات کے سمندر اور احساسات کے ذخیروں سے مواد آتا ہے لیکن راستے میں گھونگھے اور سیپیاں بھی شامل ہوجاتی ہیں جو اس کے صیقل کدے میں آ کر موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوجاتی ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

جناب شوکت سبزواری میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور کراچی ترقی اردو بورڈ سے منسلک ہیں لسانیات کے ماہر ہیں اور ادب کے ہر شعبے پر ان کی بڑی گہری نظر ہے وہ صرف ونحو میں بھی بلند مقام سے بولتے ہیں اور جہاں زبان کا مسئلہ آتا ہے اس میں ان کی معلومات وسیع اور رائے صائب ہوتی ہے۔

پنڈت شیونرائن شمیم

پنجاب کے مشہور قلمکاروں میں تھے مولانا تاجور سے ان کے بڑے گہرے مراسم رہے ہیں ان کے لڑکے چاندنرائن مولانا کے شاگرد تھے کالج سے باہر آ کر پھر خود کو علامہ اقبال کا شاگرد بتاتے تھے وہ جہاں علم و ادب میں لاجواب تھے وہیں سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں اور معمولی نہیں وہ ادیب شاعر اور سیاسی کے علاوہ محقق بھی تھے اور صاحب خیر بھی۔

شمس باپوڑی

جناب شمس باپوڑی سے میں ملا ہوں وہ تقسیم ملک کے ہنگامے میں لاہور آ گئے تھے انہوں نے کسی سے مل کر کوئی کاروبار شروع کیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بدگمان سے رہنے لگے ان کے پاس ایک معقول رقم تھی جو تمام کی تمام اس کاروبار کی نذر ہوگئی اور وہ بددل ہوکر ملتان اپنے داماد کے پاس چلے گئے وہاں چند ہی روز میں ان کا انتقال ہوگیا۔

وہ شعر کے معاملے میں استادانہ حیثیت رکھتے تھے اور بڑا منجھا ہوا شعر کہتے تھے۔ کہیں کہیں رسالوں میں ان کی غزلیں ملتی ہیں لیکن ان کا مجموعہ کلام ان کے داماد یا کسی دوست کے قبضے میں آ گیا تھا۔ جس کا اب تک اتا پتا نہیں ملتا۔ وہ نہایت مشرع صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان اور نہایت شفیق اور

مخلص انسان تھے۔

عبدالرحمٰن شمیم

مولانا تاجور مرحوم کے بھانجے تھے اور بہت اچھے خوشنویس تھے۔ تصوف سے بے حد شغف تھا اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ نہایت خوددار طبیعت پائی تھی اور حفظ مراتب ان کی نظر میں انسانی اوصاف میں سب سے اہم وصف تھا۔ وہ قدیم رنگ میں شعر بھی کہتے تھے ان سے دو چار غزلیں میں نے سنی ہیں اور وہ معیاری کلام تھا۔ وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن کلام کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کس کے پاس رہا۔

شیر افضل جعفری

جناب شیر افضل جعفری جھنگ کے لکھنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کا کالم ''ماہ نو'' کے علاوہ دیگر رسالوں میں بھی چھپتا رہتا ہے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے ان کے تجربات اور مشاہدات اس قدر ہیں کہ اگر یہ باہر کی فضا سے ایک لفظ بھی نہ لیں تو سرمایہ الفاظ ختم نہیں ہو سکتا۔ ان کی نظر خوردہ گیر ہے اور یہ اپنے ماحول سے ہی اپنی شاعری کا مواد اخذ کرتے ہیں ہر چند ان کے یہاں اسماء و اشیاء، مقامی ہونے کے باعث نامانوس ہیں لیکن یہ ضروری کہنا پڑتا ہے کہ جھنگ کے مقامی رسم و رواج عشق و محبت اور تہذیب و معاشرت ان کے کلام میں صاف جھلکتی ہے جہاں یہ اضافے کیفیت سے اپنی ترکیبوں اور الفاظ کے انتخاب سے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں وہاں یہ اصول وقواعد اور صرف ونحو پر اپنے خود ساختہ الفاظ یا ضرورت شعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ قواعد وقانون کے ساحلوں میں رہ کر چلنے والے ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں لیکن یہ سب سے بے پروا ہو کر اپنی دھن میں مصروف رہتے ہیں اور مشاعروں میں ان لوگوں سے زیادہ داد وتحسین وصول کرتے ہیں جو علم کے اصولوں سے بغاوت نہیں کرتے تاہم اردو کے لیے شیر افضل جعفری کا وجود نعمت ہے۔ انہیں تجدید وتنوع کا جنون ہے اور جنون ہی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ان کا مجموعہ کلام ''سانوے من بھانوے'' چھپ چکا ہے جو ان کے حسن شعر کا آئینہ دار ہے۔

شاہد حسین رزاقی

حیدر آباد کے پرانے لکھنے والوں میں ہیں ان کی تحریروں میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دلکشی بھی قائم رہتی ہے وہ ایک عالمانہ طرز تحریر کے مالک ہیں اور مسائل پر سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے ہیں ان کی کئی مطبوعات ہماری اس رائے کی تصدیق کریں گی۔ آج کل وہ ادارہ ثقافت لاہور سے منسلک ہیں اور بڑی پامردی سے کام کر رہے ہیں۔ نہایت خوش خلق ملنسار اور سوسائٹی کو دیکھنے اور برتنے والے ادیب ہیں۔ میں ان سے جتنی بار ملا ہوں میں نے ان میں وہ نشیب نہیں دیکھے جو عموماً کم علم اور کھوکھلے مصنفین میں پائے جاتے ہیں۔

محمد ابراہیم شمیم

لائل پور کے رہنے والے ہیں اور طالب علمی سے شعر و ادب کا ذوق ہے۔ لاہور سنٹرل ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے آج کل حیدر آباد سندھ میں ایجوکیشنل بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ نہایت اچھا علمی ذوق پایا ہے اور بڑا سنبھال کے شعر کہتے ہیں کم گو ضرور ہیں لیکن جو کہتے ہیں وہ قدیم روش سے ذرا ہٹ کر جدید رنگ میں کہتے ہیں اور بہت کم لوگوں کو سناتے ہیں مشاعروں میں بالکل حصہ نہیں لیتے نہ اب تک کوئی شعری مجموعہ آیا ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

شاہد صاحب کو میں حیدر آباد دکن سے جانتا ہوں وہ جناب زور قادری کے چہیتے شاگردوں میں ہیں نظم اور نثر دونوں میں مہارت رکھتے ہیں اور تحقیق کا فن انہیں استاد سے تفویض ہوا ہے۔ آج کل ترقی اردو بورڈ کراچی میں کام کر رہے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا تحقیقی کام بھی قابل قدر ہے ان کی تحریروں میں حقیقی اظہار و ابلاغ پایا جاتا ہے۔ اور اردو کے ابتدائی دور پر خصوصیت سے قابل قدر تحریریں دے رہے ہیں بحیثیت انسان بھی وہ خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں۔

مظفر حسین شمیم

شمیم صاحب تقسیم سے پہلے عرصے تک لاہور میں رہے ہیں اس زمانے میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں- پھر وہ انڈیا چلے گئے اور تقسیم کے بعد کراچی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے- انہوں نے زندگی بھر اپنے قلم سے روزی کمائی اور کسی کے محتاج نہیں ہوئے وہ اپنے افلاس کے باوجود اردو ادب کی خدمت میں منہمک رہے ان کی گرفت نظم اور نثر دونوں پر یکساں پائی گئی اس سے صحافت میں بھی انہیں ایک مقام حاصل رہا- لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی تصانیف میں کیا کیا ہے؟

سندر شن سنگھ شگفتہ

شگفتہ امرتسر کے رہنے والے مگر اردو کے شیدائی اور اردو زبان میں معیاری گفتگو کرتے تھے وہ اچھی غزل کہتے تھے اور لاہور امرتسر سے لے کر دہلی تک کے مشاعروں میں ان سے ملاقات ہوتی تھی- بڑے خلیق اور یار باش قسم کے انسان مگر کبھی حد ادب سے آگے نہیں بڑھے ان کے یہاں حفظ مراتب کا خاص خیال تھا- ان کا خلوص میرے دل میں اب تک زندہ و پائندہ ہے نہ جانے کوئی مجموعہ کلام چھپا ہے یا نہیں؟

شمس مینائی

امرتسر کے بزرگ شاعروں میں تھے یوں تو پنجابی زبان کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی بے تکلف کہتے تھے اور طرحی مشاعروں میں بھی غزل کہہ کر لاتے تھے آخر میں بینائی جاتی رہی تھی لاہور میں ایک دو بار ملاقات ہوئی اور پھر سنا کہ انتقال کر گئے "انا للہ وانا الیہ راجعون"

غلام حسن شاد مرحوم

جناب شاد گوجرانوالہ کے ایک خوش ذوق نوجوان تھے جناب محوی صدیقی کے شاگرد تھے اور ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے غزل اور نظم دونوں دونوں اصناف پر عبور تھا مگر افسوس کہ موت نے انہیں زیادہ فرصت نہیں دی اور جوانی میں داعی اجل کو لبیک کہا- ان کی ایک کتاب ادبی یادداشتوں کی چھپی تھی نہ معلوم ان کا مجموعہ بھی کہیں ہے یا نہیں-

محمد مسلم شمیم

کامرس کالج لاڑکانہ میں لکچرر ہیں- کم گو ہیں مگر جو کہتے ہیں بڑے فکر سے کہتے ہیں اور اس میں ان کے نئے رجحانات نمایاں رہتے ہیں- ان کی شاعری مقصدی شاعری ہے ان کے حسن و عشق میں مجاز کا مقام جنون تک نہیں پہنچتا بلکہ ان کا جنون باہوش رہتا ہے اور وہ اقدار انسانیت کی حدوں کو شکست نہیں کرتے-

مرزا شجاع شیون

مرزا شجاع شیون نہایت حسین و جوان انسان اور اردو' فارسی میں بے پناہ درک رکھنے والا شاعر شیون کی مادری زبان فارسی تھی- وہ جناب مرزا بیضا خاں مروی کے برادر خورد تھے مگر جوانی کی کجراہیوں نے انہیں مے کدے کی راہ پر ڈال دیا تھا یار باش قسم کے انسان تھے اور اس پر خودداری اور قیامت تھی- جناب اختر شیرانی کے قریبی دوست تھے اور ان کے رسالوں میں شیون کا کلام بھی چھپتا تھا- مگر افسوس کہ موت سے پہلے ہی وہ دنیا کو چھوڑ گئے-

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

شیدا

جناب شیدا اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور ان کا تخیل بلند اور فکر اونچی ہوتی ہے وہ انفارمیشن میں ڈائریکٹر ہیں اور بڑے سلیقے سے کام کرتے ہیں- جنگ کے دنوں میں جو انہوں نے کام کیا ہے وہ قابل تحسین ہے وہ نثر اور نظم دونوں میں تعمیر و تنقید کے اصولوں سے آگاہ ہیں اور اعلیٰ قسم کے صحافی بھی ہیں-

پیارے لال شاکر

یہ پیارے لال شاکر وہ نہیں جو میرٹھ کے رہنے والے اور مذہباً عیسائی تھے- یہ شاکر صاحب تو مولانا تاجور کے شاگرد اور دیال سنگھ کالج کے نمودار لوگوں میں تھے- غزل اور نظم دونوں لکھتے تھے اور

نثر کی طرف بھی بند نہیں تھے اس دور کے اخبارات اور رسالوں میں چھپتے تھے اور مشاعروں میں بھی انہیں سنا جاتا تھا۔

شبیر بخاری

جناب شبیر بخاری ملتان کے رہنے والے ہیں لاہور میں اوقاف کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ایڈوائزر تے اور آج کل محکمہ تعلیمات میں انسپکٹر ہیں۔ نہایت اچھا شعر کہتے ہیں اور غزل کے علاوہ نظم بھی بڑی چابک دستی سے کہتے ہیں۔ نثر میں بھی مہارت تامہ ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ مذہبی معلومات میں بھی قابل تحسین انسان ہیں۔ ابھی کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

شبلی بی کام

جناب شبلی بی کام پرانے ادیب ہیں اور نہایت اچھے صحافی وہ بڑے دھواں دھار انداز سے ادب میں آئے تھے لیکن قدر ناشناس دنیا کا کیا کریں کہ انہیں اب تک ان کی ڈگری اور ادبی صلاحیتوں کے مطابق جگہ نہیں مل سکی اور وہ اب جب بازار کے فٹ پاتھ پر دیوار سے لگے لگے نیچی نظر کئے گزرتے ہیں تو کلیجہ خون ہو جاتا ہے انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب تک لکھ رہے ہیں ان کی کئی ایک کتابیں ہیں لیکن یہ پروپیگنڈے کی کھوکھلی دنیا اچھے لوگوں کو ابھرنے نہیں دیتی۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ

کراچی میں مقیم ہیں۔ تعلیم و تہذیب میں وہ ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ قدیم معاشرہ اور قدیم خاندانوں اور ان کی طرز معاشرت کے متعلق انہوں نے انگریزی میں بہت کچھ لکھا ہے اور ''رسالہ عصمت'' کی وہ مستقل مضمون نگار ہیں۔ اگرچہ وہ کم آمیز ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر انہیں موقع ملے تو ملک کے لیے بہترین کام کر سکتی ہیں۔ ان کی تربیت اور قابلیت دونوں سے ہمیں امید ہے کہ وہ معاشرے میں تہذیب و تعلیم کے لیے بہت کچھ کریں گی۔

شفیق کوٹی

شفیق اللہ خان نام' شفیق تخلص، کوٹ ضلع فتح پور یوپی کے رہنے والے ہیں زندگی بھر گورنمنٹ کی ملازمت میں رہے اب ریٹائر ہونے پر لاہور میں مستقل ہیں۔ شفیق صاحب جناب سیماب اکبر آبادی مرحوم کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں ہیں شعر جلد کہتے ہیں اوران کے شباب کا کلام واقعی شباب کا کلام ہے جس میں جذبات اور روزمرہ گتھے ہوئے ملتے ہیں۔ جناب شفیق نے نظمیں بھی کہی ہیں اور کہتے ہیں لیکن ان کا میدان غزل ہی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے طبقے کے شعراء میں قابل ذکر محنت کی ہے اوراردو کی توسیع واشاعت میں ان کی قابل قدر خدمات ہیں۔ ملازمت میں جہاں جہاں شفیق صاحب گئے وہیں مشاعرے اور مناظمے شروع ہو گئے اوران کی لگائی ہوئی داغ بیل جہاں کہاں ہے اس پر اب تعمیریں نظر آتی ہیں یہ مرتب بھی ہیں مصنف بھی ہیں ان کی مرتب کردہ کئی کتابیں ہیں۔ اب اپنا مجموعہ کلام چھپوانے کی فکر میں ہیں دیکھیے کب تک چھپتا ہے۔

شکیب جلالی

جوانا مرگ شکیب جلالی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا وہ جو رنگ تغزل چھوڑ گیا ہے موجودہ دور اسی روش پر چل کر کامیاب ہو سکے گا۔ شکیب افق ادب پر مہتابی کی طرح ابھرا اور جناتی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ اس کے نقوش باقی رہیں گے اوراس کا تذکرہ ادبی دنیا میں ہوتا رہے گا۔

صورت از بے صورتے آید بروں۔ باز شد انا الیہ راجعون!

شاہد صدیقی اکبر آبادی

شاہد صدیقی تھے تو آگرے کے لیکن ان کا مستقل قیام حیدر آباد دکن میں تھا اور انہوں نے اپنے لیے وہاں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ وہ پرانے اور کہنہ مشقوں کی طرح شعر کہتے تھے اوراسی ذوق اور مہارت سے پڑھتے تھے۔ حیدر آباد ہی نہیں جہاں وہ ایک بار اپنا کلام سنا دیا کرتے تھے وہیں ان کے جاں نثار پیدا ہو جاتے تھے۔ لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور شاید اس ستارے کے طلوع نے اسی لیے زیادہ سے زیادہ روشنی دی تھی کہ غروب قریب تھا۔

شاہد جمال

مرزا شاہد جمال صاحب طنز و مزاح کی شاعری کرتے ہیں ان میں طنز و مزاح کا سلیقہ ہے اگر ان کی غزلوں اور نظموں سے عریانی اور فحاشی علیحدہ کر دی جائے تو غزل سے غزل اور نظم سے نظم ایسی باقی رہتی ہے جو طنز و مزاح کے معیار پر پوری اترے۔ اب ان کے اشعار غزل میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں اور لوگ داد و تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن کہیں کہیں سوقیانہ انداز بیان کئی اچھے اشعار کو لے بیٹھتا ہے۔ وہ اپنے کلام کو مرتب کر رہے ہیں۔ خدا کرے اچھا اور معیاری انتخاب ہو۔

شاد امرتسری

ایک خوبصورت بانکا چھیلا جوان' اس کی تصویر اب تک میرے سامنے ہے وہ نہایت ذہین اور فطین قسم کا انسان تھا میں اسے اس کے تعلیمی دور سے جانتا تھا اس میں' اس کی ہونہاری میں پہلے سے جانہاری بولتی تھی۔ اس کی طباعی کہتی تھی کہ یہ مسافر دیر تک راستوں کی صعوبتیں نہیں اٹھا سکے گا۔ شاد ریڈیو کی ملازمت سے پہلے نہایت صالح اور جینیس قسم کا انسان تھا مگر ریڈیو میں آنے کے بعد جو ملاقات ہوئی تو اس کی فطانت ایک دھند میں کھوئی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ رنگ و نور کے سیل میں بہہ جانے والی صف کا انسان ہو گیا تھا جو نشے کی لذات سے باہر نہیں جھانکتے اس کی فطرت کا کرب ضرور بولتا تھا لیکن وہ اپنے کرب کا علاج ایک بڑے کرب سے کرنے لگا تھا۔ وہ نئے اور پرانے انداز کے ملے جلے جذبات کو اپنی شاعری کا تانا بانا بناتا تھا۔ اس کی شاعری میں محرومی نے تلاش کا روپ دھار لیا تھا اس لیے اس کے اشعار کے مفاہیم نہایت لطیف اور جانگداز ہو گئے تھے وہ شاعر تھا صرف شاعر اور شاعر ہمیشہ صرف شاعر ہی ہوتا ہے۔ اگر شاعر کوئی دوسری ذات بھی ہے تو وہ شاعری کے شرائط سے بھی نکل جاتا ہے۔ شاد ایک تصور اور ایک تخیل کے پیچھے ایک صلیب کو ڈھونڈتا ہوا مر گیا۔ مگر صلیب دینے والے تو سیکڑوں ملے صلیب نہ مل سکی۔ شاد امرتسری کا مجموعہ کلام ''داغ فراق'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو اس کی زندگی کی ناکامیوں اور اس کے کرب کا پتہ دیتا ہے اور بس!

عبداللطیف شاکر دہلوی

جناب شاکر دہلوی نواب سراج الدین سائل کے تلامذہ میں تھے اور دلی کی خاص محلاتی زبان میں شعر کہتے تھے اپنے استاد کی طرح ان کے یہاں بھی روزمرہ اور محاورات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور وہ اس طرح اردو کے آگے بڑھانے اور سجانے سنوارنے میں منہمک رہتے تھے ان کے بعد دلی کی زبان میں شعر کہنے والا شاعر نظر نہیں آتا - جو محلاتی اصطلاحات اور بولی ٹھولی سے کماحقہ آگاہ ہو- دیوان ابھی تک نہیں چھپا-

جلال الدین شارب

لاہور کے نوجوان شعراء میں ہیں مشاعروں میں کم جاتے ہیں مگر شعر بہت اچھا کہتے ہیں نظم کم اور غزل زیادہ کہتے ہیں- مگر ان کا خیال ہے کہ مشاعروں میں شریک ہونا اپنے فن کو گردآلود کرنا ہے وہ تنہائی میں شعر سننا اور سنانا پسند کرتے ہیں- مجموعہ کلام اگرچہ اچھا خاصا ضخیم ہے لیکن چھپوانے پر آمادہ نہیں ہوتے میں کئی بار کہہ چکا ہوں دیکھیے کب ان کا بھوت اترتا ہے-

شہزاد احمد شہزاد

جناب شہزاد نوجوان شاعر ہیں اور بڑی شگفتہ زمینوں میں نامانوس ردیف و قافیہ لے کر بڑی شگفتہ غزلیں کہتے ہیں جن میں ابہام نہیں ہوتا بلکہ جدید رنگ میں جدید اشعار تخلیق کرتے ہیں اور اپنے حلقے میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے میرے خیال میں وہ اپنے ہم عصروں میں اپنی راہ الگ تراشتے اور اپنے اصول فکر سے رنگ آمیزی کرتے ہیں- ابھی وہ نوجوان ہیں مگر ان کے کلام سے ان کا مستقبل جھلک رہا ہے- خدا عمر دراز کرے- آمین!

شہرت بخاری

جناب نور حسین شہرت بخاری اسلامیہ کالج میں اردو کے لیکچرر ہیں اور غزل کے شاعر ہیں ان کا ایک مجموعہ ''طاق ابرو'' کے نام سے چھپ چکا ہے جو ان کے اسلوب نگارش اور معیار شاعری کا آئینہ دار ہے اپنا کلام مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں جو ان کے سوز و گداز کو اور بھی نکھار دیتا ہے جناب

شہرت مضامین بھی لکھتے ہیں ابھی ان کا کوئی نثری مجموعہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

شارب الٰہ آبادی

نام محمود علی خان، شارب تخلص کرتے ہیں اور اب اردگرد کی فضا کو گدلا پا کر خود کو محمود شارب لکھتے ہیں ۱۹۴۷ء سے پہلے جامعہ ملیہ دہلی کے دفتر میں تھے اور جب ملک تقسیم ہوا تو لاہور چلے آئے شروع شروع بڑی پریشانیاں اٹھائیں۔ خدا خدا کر کے تین چار سال کے بعد ایک دول ہاؤس میں محاسب ہو گئے اور اب تک اسی جگہ کام کر رہے ہیں۔ چونکہ الٰہ آباد اور دہلی میں جامعہ ملیہ کی فضا میسر آئی تو فطری ذوق چمک اٹھا اور پھر غربت کے مصائب اور لوگوں کی کج نظری نے انہیں اور بھی متاثر کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں حسن و عشق کے وہ جذبات و احساسات نہیں ملتے جو آسائش کی دین ہوتے ہیں ان کی جگہ ان کے یہاں حزن و یاس اور حرمان و مایوسی کا اثر ہے جو ایک فطری بات ہے۔ ہمیں اب ضرورت ہے کہ انفرادی خیالات و نظریات سے بلند ہو کر اجتماعی تعمیر و ترقی کی راہیں اختیار کریں جناب شارب کے یہاں کلام میں نرمی اور نغمگی دونوں ہیں اور یہی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو اسے زندہ رکھتی ہیں جب یہ خود پروری کی فضا روبہ اصلاح ہو گی تو بہت سے شاعر اور ادیب ایسے نکلیں گے کہ جن کو پڑھ کر ہمیں اپنے ماضی کی ناانصافیوں سے بھی پردہ اٹھانا پڑے گا اور تاریخ ادب کو بھی از سرِ نو مرتب کرنا ہو گا۔

شاہد چاندپوری

جناب شاہد چاندپوری ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں لیکن مدت مدید سے لاہور میں مقیم ہیں نہایت خلیق اور ملنسار قسم کے انسان ہیں اور شعر کے معاملے میں قدیم روش کے متبع ہیں۔ مزاح میں بھی بند نہیں، مصروف آدمی ہیں۔ کم کہتے ہیں مگر برا نہیں کہتے۔

باقر شمس لکھنوی

جناب شمس لکھنوی ہیں لیکن تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی مقیم ہو گئے اور اب وہیں ہیں۔ جناب شمس کو لکھنوی زبان اور محاورے پر بدرجہ اتم عبور ہے اسی موضوع پر ان کی ایک کتاب ''لکھنؤ کی

زبان'' شائع ہو چکی ہے جوان کی کاوش قلم کا شاہکار ہے وہ قدیم معاشرے کے سیدھے سادے اور مہذب انسان ہیں سرتاپا اخلاق وادب شیریں زبان!

صفیہ شمیم ملیح آبادی

میں نے پہلی بار صفیہ شمیم ملیح آبادی کو باندہ کے ایک مشاعرے میں حیا لکھنوی کے ساتھ دیکھا یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے آخر زندگی کے تجربات انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔اس لیے اگر صفیہ شمیم کی شاعری پختہ مشق ہو کر انہیں تاریخ تک لے آئی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تقسیم ہند کے بعد شمیم اپنے رفیق حیات کے ساتھ پاکستان چلی آئیں اور اب تک وہ راولپنڈی میں ہیں ان کا کلام کبھی کبھی ملک کے مقتدر جرائد میں دیکھنے میں آتا ہے اب بھی وہ جب مشاعروں میں غزل پڑھتی ہیں تو ماضی کے تصورات سے آنچ آنے لگتی ہے۔صفیہ شمیم اپنے ذاتی مطالعہ اور مشاہدے سے شعروادب کی بلندیوں پر ہیں اور ان سے خدا کا یہ انعام کوئی نہیں چھین سکتا چنانچہ وہ ہر صنف سخن پر حاوی معلوم ہوتی ہیں۔منظریہ نظموں میں وہ جوش کا رنگ اپنانے کی کوشش کرتی ہیں اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہیں۔صفیہ کی غزلوں میں بھی مجموعی طور پر روحانی فضا نظر آتی ہے مگر ایسی روحانی فضا جیسے بارش میں کوئی کسی کو دور سے پکار رہا ہو۔صفیہ کے نغموں کی لے میں حب وطن اور ملک کی زبوں حالی کا احساس بھی ملتا ہے اور حساس آدمی کے لیے یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تعجب سے دیکھی جائے مگر ان کی محبت کا یہ رنگ ایسا رنگ ہے جو وقت کے فاصلوں اور زندگی کی دوسری کشمکشوں کو سنگ راہ خیال نہیں کرتا۔

شفیق جونپوری

جناب شفیق جونپوری' پس ماندہ انسان مگر بلند خیال صالح اور نغز گو شاعر ہیں۔غربت اور افلاس میں رہ کر اخلاقیات اور مذہب کی اقدار کو تابندہ رکھنا اور اپنے اصول و کردار سے ایک انچ نہ ہٹنا یہ شفیق جونپوری ہی کا کام تھا۔جناب شفیق جو بھی محسوس کرتے تھے وہی لکھتے تھے نہ وہ لالچی تھے اور نہ مرعوب ان میں ایک درویشانہ خوبی تھی جو ان کے اطوار واخلاق سے زیادہ ان کی شاعری کو حسین بنا دیتی ہے۔میں بے شمار مشاعروں میں جناب شفیق سے ملا ہوں اور انہیں جیسا پہلے دن پایا تھا ویسا ہی

دیکھتا رہا ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپے ہیں وہ مشاعروں میں اپنے کلام کے مجموعے فروخت بھی کرتے تھے اور ان کا یہ رویہ جاگیرداروں کی خوشامد سے بہتر تھا ان کے کلام میں اچھے اشعار کی کمی نہیں - مطالعہ شرط ہے!

شرر نعمانی

جناب فراست علی شرر نعمانی نظم و نثر دونوں میں دسترس رکھتے ہیں اور صحافت میں بھی ان کے رشحات اور جدوجہد سے ان کی ذہانت اور خطابت کا پتہ چلتا ہے - اگرچہ وہ اب تک محدود فضا میں نغمہ افشاں و قلم فرسا ہیں لیکن مشاہدہ اور قیافہ سے وہ اس مقام کے آدمی نہیں جہاں آج نظر آتے ہیں - مجھے حال سے ان کے مستقبل کے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی ہے -

امیر حمزہ شامی

جناب شامی جالندھر کے رہنے والے ہیں اور آج کل ماڈل ٹاؤن لاہور میں اقامت گزیں ہیں - نثر اور نظم دونوں میں قابل رشک مہارت ہے اور کثرت مطالعہ نے انہیں ادیب اور مفکر دونوں کی شرائط سے سرفرازی دی ہے اور وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں ہر چند کہ ان کا کوئی خاص کام ابھی سامنے نہیں آیا لیکن میں ان سے مایوس نہیں خدا انہیں تندرست رکھے ان کے عزائم پست نہیں ہیں -

ظہور عالم شہید

جناب شہید اس ملک کے مشہور صحافی ہیں اور آج کل ''نوائے وقت'' میں نائب مدیر ہیں - ان کی تحریر میں وقت اور موقع کے لحاظ سے الفاظ کا ایسا انتخاب ہوتا ہے کہ زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ان کی تحریر میں جامعیت اور قلم میں ایک قوت ہوتی ہے جو خاص خاص ادیبوں اور صحافیوں کا حق ہے - ظہور عالم شہید بحیثیت انسان بھی بلند ہیں اور انسانی اقدار کو اچھی طرح جانتے ہیں جہاں ان کی نظر سیاست کے گوشوں سے آشنا ہے وہیں وہ مذہبی اور دینی شرائط سے بھی بخوبی آگاہ ہیں -

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

ڈاکٹر شرف الدین صاحب ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں اور تعلیم و تعلم کے سلسلے میں سرائے میر میں بھی رہے ہیں اور غالباً یہ وہیں کا فیض ہے کہ ان کا ذہن تحقیقی مسائل میں بیدار معلوم ہوتا ہے۔ ان کا مقالہ ''اردو سندھی کے لسانی روابط'' ان کا شاہکار ہے اگر وہ اسی انداز سے کام کرتے رہے تو ایک دن ملک کے بلند پایہ محقق ہوں گے۔ سندھ یونیورسٹی خوش قسمت ہے کہ اس میں شرف الدین سے لوگ موجود ہیں۔

شارب باغپتی

جناب شارب باغپتی ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے نوجوانی ہی میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ ان کا ایک دیوان پاکٹ سائز پر نہایت حسین اور خوبصورت شائع ہوا تھا اب تو مدت سے اس کا کوئی نسخہ نظر نہیں پڑا۔ شارب نہایت اچھے غزل گو تھے اگر عمر وفا کرتی تو اپنے تمام ہم عصروں میں ان کا ایک مقام ہوتا۔

شفیق لکھنوی

جناب شفیق لکھنوی یوں تو امی قسم کے شاعر ہیں ان کا ایک مجموعہ کلام بھی موجود ہے اور اس میں ان کی فطری طباعی اپنا تعارف کراتی ہے وہ ایک اچھے پختہ مشق شاعر کی طرح فن شعر پر قادر ہیں اور مشاعروں میں داد و تحسین لیتے ہیں۔

شریف کنجاہی

جناب شریف کنجاہی خود ساز قسم کے انسان ہیں اور پنجابی زبان پر بھی انہیں عبور ہے اردو میں وہ نظم زیادہ اور غزل کم کہتے ہیں ان میں جدید ادب کا چاؤ تو پایا جاتا ہے مگر قدیم سانچوں اور روایتی راستوں سے بغاوت کرتے گھبراتے ہیں اور اپنے ایک خاص رنگ میں شعر کہتے ہیں جو ان کے نئے ادب کی تعریف میں آتا ہے نثر میں ان کے کئی مضمون میری نظر سے گزرے ہیں اس میں بھی وہ پاؤں ملتے معلوم نہیں ہوتے مگر ان کی شاعری نثر سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ لاہور میں ملاقات ہوئی

اب کسی کالج میں لکچرر ہیں۔

شمس النہار صاحبہ بہاری

یہ ایک بہار کے مہاجر خاندان کے غریب ماں باپ کی نور نظر ہیں، بی اے کر چکی ہیں اور نہایت ذہین لڑکی ہے۔ خدا نے اسے شعر و شاعری کا جذبہ عطا فرمایا ہے مگر وہ قدیم روش سے ہٹ کر سوچتی ہے اور جدید انداز سے متاثر ہے وہ ردیف و قافیہ اور وزن و بحر سے باغی نہیں لیکن فکری طور پر وہ جدید انداز کی طرف جھکی ہوئی ہے۔

شاعرہ وحید

مشاعروں میں غزلیں پڑھتی ہیں اور جو پڑھتی ہیں اس میں رنگینی اور پختگی چولی دامن ہیں ان ان کی مشق و مہارت اور مزاولت کی سعی کا نتیجہ مجموعہ کلام کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ خاص خاص حلقوں میں جہاں وہ خود کلام سناتی ہیں اس وقت کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے۔ وہ خلیق بھی ہیں اور مہمان نواز بھی۔ نرم دل بھی ہیں اور صاحب ایثار بھی۔ کلام میں پختہ کاروں کی طرح الفاظ و معانی کا استعمال ملتا ہے اور مفہوم شعر میں حیات کے مختلف پہلو بولتے ہیں جو شعر کا خاصہ ہے۔

شہاب مالیر کوٹلوی

جناب شہاب مالیر کوٹلوی سے تعارف کو ایک زمانہ گزر چکا ہے اس وقت وہ صرف شاعر تھے مگر نہایت اچھے شاعر اس کے بعد ان کے نثر کے مضامین آنا شروع ہوئے پھر کئی مضمون تحقیقی انداز کے بھی چھپے ان کی نظمیں غزلیں بھی آتی رہیں لیکن غالباً ایک بار دہلی میں ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں آخری ملاقات ہوئی جب سے اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے قلم نے کیا کیا تخلیق کیا۔

شعری بھوپالی

جناب شعری بھوپالی میرے بڑے قدیم دوستوں میں ہیں اور اکثر مشاعروں میں ساتھ رہے وہ جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ ہندوستان کا کوئی مشاعرہ شعری کے بغیر مکمل نہیں

کہلاتا تھا ان کا ایک مجموعہ ''صبح غزل'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس میں وہ اپنی تمام شعری صلاحیتوں اور شاعرانہ آثار کے ساتھ موجود ہیں۔

تربنی سرن شاد

مین پوری کے رہنے والے تھے بھوپال میں منصف سے لے کر جوڈیشل کمشنر تک کے عہدے پر فائز رہے شعر کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے اور انہیں ساتذہ کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ ان کی عدالتی مصروفیت نے ان کے دل و دماغ پر پہرے تو ضرور بٹھا دیئے تھے۔ لیکن وہ اس کے باوجود شعر کہتے تھے اور نہایت خلیق انسان تھے۔

شاکر عروجی

جناب شاکر عروجی لائل پور کے مشہور اخبار نویس ہیں اب تو انہوں نے ایم اے کر لیا ہے لیکن اس سے پہلے بھی اچھے خاصے مشہور انسان تھے۔ اب غالباً وہ اور بھی چاق و چوبند ہو گئے ہوں گے۔ ان کے رسالہ ''پرچم'' میں ان کے نام سے غزلیں بھی چھپتی ہیں اور نظمیں بھی اچھا خاصا کتاب کا مواد ہو گیا ہوگا مگر ابھی تک کوئی مجموعہ کلام نہیں آیا۔

شاکر پشاوری

جناب شاکر لاہور کی مشہور خانقاہ شاہ محمد غوث کے سجادہ نشین تھے میں نے ایسے نیک شریف اور متواضع انسان بہت کم دیکھے ہیں وہ نہایت اچھا شعر کہتے تھے اور عموماً غزلیں کہتے تھے۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ دل میں بٹھا لینے کو جی چاہتا تھا۔ جب میں ان سے بغل گیر ہوتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایسے جسم سے معانقہ کر رہا ہوں جس میں ہڈیاں بالکل نہیں ہیں۔ عجیب و غریب خوبیوں کے انسان تھے افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور ضعیفی کی حدوں کو نہ چھو سکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

شدید لکھنوی

جناب شدید لکھنوی بھی نہایت شستہ ورفتہ شعر کہتے ہیں اور زبان و بیان پر انہیں بھی بڑا فخر و ناز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا فخر و ناز غلط نہیں۔ ان کے یہاں زبان کا استعمال نہایت خوبصورت اور موزوں ہوتا ہے وہ عامیانہ حالات کو بھی اپنے انداز تحریر کے افسوں سے جان لیوا بنا دیتے ہیں اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

شارب ردولوی

جناب شارب ردولوی تھے تو ردولی کے رہنے والے لیکن لکھنؤ میں قیام تھا۔ قدیم رنگ اور ردیف و قافیہ کی قید میں بڑے شگفتہ شعر کہتے تھے فن شاعری کے رموز سے بھی واقف اور معانی و بیان کے علاوہ عروض پر بھی نظر تھی تقسیم کے بعد کچھ معلوم نہیں ہو سکا سیاسی دیواروں نے ادب میں بھی دیواریں حائل کر دی ہیں۔

شارب لکھنوی

شارب لکھنوی قدیم رنگ تغزل میں بڑا سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے حسن و عشق کے بڑے بڑے نازک پہلو اور لکھنؤ کی زبان کے خاص خاص محاورات ان کے یہاں بڑے سلیقے سے نظم پائے جاتے ہیں۔ شارب اپنے دور کے ان شاعروں میں ہیں جو زبان کے نمائندہ لوگ کہلاتے ہیں۔

شوق رینہ

جناب جگموہن ناتھ شوق رینہ شاہجہان پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور انہیں دنوں میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر ضعیفی کے ریگزاروں کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ زندگی کی بے ثباتی پر زیادہ گفتگو کرنے لگے تھے۔ نہایت وجیہ اور شریف کے علاوہ مہمان نواز خوش مذاق انسان۔ ان کا دیوان بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ نہ جانے انہوں نے اور کیا کیا لکھا ہوگا اور ایک بار کی ملاقات کے بعد پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔

شفیق کھتولوی

جناب شفیق کھتولوی، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں اور ایک زمانے سے شعر کہتے ہیں ظاہر ہے کہ مشق کسی بھی فن میں کیوں نہ ہو ضائع نہیں جاتی شفیق صاحب نہایت اچھے شاعر ہیں ان کے کلام میں وہ اوصاف ہیں جو ایک اچھے شاعر کی تخلیق میں ضروری ہیں ان کے اشعار میں ان کا دل دھڑکتا اور زندگی بولتی ہے۔

شاعر لکھنوی

جناب شاعر لکھنوی سے میری ملاقات لکھنؤ کے پہلے مشاعرے میں ہو چکی تھی ان میں اسی وقت سے ایسی چنگاریاں تھیں جو وقت کے ساتھ رنگ بدلتی ہیں اور پھر ستاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں میں نے انہیں پہلی ملاقات میں کہہ دیا تھا کہ خدا آفات سے محفوظ رکھے میں تمہاری شاعری میں پر دار جراثیم دیکھتا ہوں۔ شاعر لکھنوی کو ہمارے ادبی حلقے نے ابھی اس نظر سے نہیں دیکھا جس کے وہ مستحق ہیں میرے خیال سے تو وہ اپنی نوعیت کے ایک ہی انسان ہیں جہاں شاعری، شرافت، اخلاق اور انسانیت کی تدوین ایک ساتھ زندہ و پائندہ ہیں اور یہی ان کے شعر کا مسالہ ہے۔

حمایت علی شاعر

جناب حمایت دکن کے رہنے والے ہیں بڑی عسرت سے زندگی شروع کی ہے اور بہت جلد بام ترقی پر پہنچ گئے وہ مشاعروں میں غور سے سنے جاتے ہیں ان کی نظموں اور غزلوں میں جدید روح ہے اور کہیں کہیں جدید جسم بھی اور جہاں جدید جسم فربہی تک نہیں پہنچا یا جدید لاغری بیماری کی حد تک نہیں گئی۔ وہاں تک جدید طرز کی شاعری دلچسپ بھی ہے اور رنگین بھی جہاں ابہام الجھ گیا ہے اسے ہم الجھن کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتے۔ جناب شاعر الجھن اور بے مقصدی سے بچ کر چلتے ہیں مگر کہیں کہیں لغزش بھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ فطری بات ہے ان کے یہاں شاعری با مقصد ہے اور یہی ہونا چاہئے۔

حمیدالدین شاہد

دکن کے دوستوں میں حمید الدین شاہد نا قابل فراموش انسان ہیں وہ تقسیم ملک کے وقت پاکستان آ گئے اور آج کل اردو بورڈ کے ادارے میں کام کر رہے ہیں وہ نہایت ذہانت اور ذکاوت کے مالک ہیں اور نظم و نثر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ شاعری میں وہ فن کے تابع رہتے ہیں اور مفہوم کو الفاظ دینے میں انہیں دقت نہیں ہوتی وہ شروع سے تحقیق کے آدمی ہیں کیونکہ ان کی تربیت زور مرحوم نے کی ہے جو ملک میں لاجواب محقق تھے۔ شاہد صاحب کا کوئی مجموعہ کلام ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔

شاکر میرٹھی

شاکر میرٹھی صاحب کی نظمیں بھی اچھی خاصی ہیں انہیں بھی نیچرل نظموں کا ذوق ہے اور انگریزی زبان و ادب کو بھی اردو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی شاعری میں سرور خیال آبادی اور چکبست لکھنوی کا اثر جھلکتا ہے اور ان کی طباعی اسے اور بھی رنگین بنا دیتی ہے مذہب کی رو سے جناب شاکر عیسائی ہیں لیکن ان کی نظمیں انہیں محب وطن اور فطرت پرست ظاہر کرتی ہیں۔ ابھی تک میری نظر سے جناب شاکر کا کوئی مجموعہ کلام تو نہیں گزرا ہاں ان کی منتشر نظمیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے مجھے امید ہے کہ ان کی نظمیں انہیں زندہ رکھیں گی۔

شور علیگ

جناب شور نہایت سلیقہ مند شاعر ہیں جن کے کلام میں گیرائی بھی ہے اور جذبات کو الفاظ کا ایسا حسین لباس دیتے ہیں کہ ادبی طبقے کے بخیل بھی داد و تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں وہ اپنی نظموں میں ایک ایسے علمی اور ادبی انقلاب کا پیغام دیتے ہیں جو نہایت کارآمد اور صحت مند انقلاب ہے اور اس کی شدید ضرورت بھی ہے شور صاحب فنی طور پر بڑے معلومات کے انسان ہیں اور شاعری میں بھی وہ قدیم روش سے ہیئتی طور پر کوئی بغاوت نہیں کرتے اور ردیف و قافیہ کی افسونی کیفیات بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موقع بموقع استعارات اور تشبیہات بھی نگینوں کی طرح ضیاپاش

دکھائی دیتے ہیں وہ ایک باخبر اور محقق قسم کے ماہر ادبیات ہیں جو اپنے فن سے علم و ادب اور شعر و نغمہ کی دنیا میں اضافے کر رہے ہیں- ہر چند شور کو اس ماحول کے اجارہ داروں اور دھڑے بند لوگوں نے جانچ پرکھ کر کبھی مقام نہیں دیا- لیکن شور اس گرد و غبار سے اٹے اور تعفن سے پٹے ہوئے ماحول میں بھی دلوں میں چمکتے ہیں اور ادبی تاریخ ہو یا تذکرہ کوئی انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا ان کے دو مجموعے "نبضِ دوراں" "دیوارابد" ادبی مضامین میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں-

دوارکا داس شعلہ

لاہور کے رؤسا میں تھے تقسیم کے ہنگامے میں دلی چلے گئے اور وہیں کاروبار کر رہے ہیں- جناب یاس یگانہ کے چہیتے شاگردوں میں بڑا ستھرا شعر کہتے ہیں اور بحیثیت انسان بھی نہایت معقول واقع ہوئے ہیں جب وہ لاہور میں تھے ان کی غزلیں سننے میں آ جایا کرتی تھیں- ان کے یہاں رنگینی بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی وہ روزمرہ سے بھی آگاہ ہیں اور دنیا کے نشیب و فراز پر بھی نظر رکھتے ہیں- تقسیم کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں-

اسحاق شور

جناب اسحاق شور میرے پرانے ساتھیوں میں ہیں وہ جامعہ ملیہ میں خوشنویس تھے اور آج کل لاہور میں ہیں وہ خوشنویس بھی ہیں اور آرٹسٹ بھی شاعر بھی ہیں اور بنوٹ ماسٹر بھی- انہوں نے اپنے دہلی کے قیام میں اچھی اچھی نظمیں کہی ہیں لیکن لاہور میں آ کر وہ شاعر سے زیادہ مصور اور مصور سے زیادہ کنبہ پرور ہوئے اور یہ ان کے دلی عزائم نہیں بلکہ حالات اور ماحول کا تقاضا ہے- بہر صورت وہ اچھے اور قابلِ قدر انسان ہیں-

شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی (مرحوم) کو کون نہیں جانتا کہ وہ ایک اچھے ادیب تھے اور ذوق ادب انہیں ورثے میں ملا ہے وہ جس طرف قلم اٹھاتے ہیں گنجائش پیدا کر لیتے ہیں- ان کا رسالہ "ساقی" ان کی قلمی کاوشوں کے علاوہ ان کے ادبی خدوخال اور مذاق سلیم کا آئینہ دار ہے- جناب شاہد بہت کم

لوگوں سے بے تکلف ہوتے تھے- لیکن وہ خوش ذوق انسان ضرور تھے جب تک ان سے گفتگو ہوتی تھی آدمی اکتاتا نہیں تھا بلکہ ایسا محسوس کرتا جیسے کچھ نہ کچھ مل رہا ہے- ان کی ایک کتاب گنجینہ گوہر کے نام سے چھپی ہے جس میں قدیم اور باکمال اساتذہ کے قلمی چہرے ہیں اور وہ ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے-

شاد بھکر

جناب شاد سے بھکر میں ملاقات کا شرف ملا- وہ قدیم رنگ میں شعر کہتے ہیں اور خوب غزل ہوتی ہے ادبی مرکزوں سے دور رہ کر بھکر جیسی جگہ میں جو شاعر اپنے ذوق شعری کو شاداب رکھتے ہیں وہ قابل داد ہیں- جناب شاد قابل تحسین ہیں کہ اس کوردہ میں ان کا ذوق شعری مرجھایا نہیں جہاں ادب کے اکھوے سوکھ جاتے ہیں-

شعلہ دہلوی

خلیل الرحمن شعلہ جناب بے خود دہلوی کے شاگرد تھے- دلی کے مشاعروں میں عموماً ان سے ملاقات ہوتی تھی اس دور اور ماحول کی فضا کے مطابق اچھا اور جاندار شعر کہتے تھے- تقسیم ملک کے بعد وہ لاہور آ گئے تھے اور پھر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی شاعری کا کیا انجام ہوا-

معراج الدین شامیؔ

شام چوارسی ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے اسی رعایت سے خود کو شامی لکھتے تھے وہ سرکاری ملازمت میں ایک معزز اسامی پر تھے- لیکن مصروفیت کے باوجود شعر وادب کا دامن نہیں چھوڑتے تھے- نہایت اچھا اور سلجھا ہوا شعر کہتے تھے میں نے دسیوں مشاعروں میں انہیں سنا ہے افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلدی ہی خدا کو پیارے ہو گئے نہ جانے ان کا ذخیرہ شاعری کہاں ہے اور کس کے ہاتھ آیا-

متھرا پرشاد شیدا علی گڑھ

جناب شیدا علی گڑھ استاد پرست قسم کے لوگوں میں تھے ہر اچھے شاعر کی عزت کرنا ان کا شعار زندگی میں شمار تھا اور ان کا کلام بھی ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے ان کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے اتنا ضرور ہے کہ وہ شاعر اچھے تھے۔

شمس زبیری

میں تقسیم سے پہلے دہلی ہی سے شمس صاحب سے متعارف ہی نہیں نزدیک ہوں۔ وہ ایک شریف انسان اچھے شاعر اعلیٰ شہری اور کھرے مسلمان کے علاوہ یار باش قسم کے انسان ہیں۔ شعر کے عیوب ومحاسن کو خوب جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جگہ جگہ نیا پن جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی اردو زبان کی ترویج واشاعت میں گزری ہے بے وطن ہونے کے باوجود وہ "نقش" جیسا رسالہ نکال رہے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی دیو بند کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کا علم مثالی اور فضیلت مسلم تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب دہلی میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے ندوۃ المصنفین میں ملاقات کرائی تو میں نے انہیں اپنی تازہ مگر طویل نظم "گورستان" سنائی تو فرمانے لگے اگر ایسی نظم کو الہام نہ کہا جائے تو آخر کیا کہا جائے۔ یہ تو تمام وجدان کی بات ہے علم میں یہ تفصیل نہیں ہوتی۔ مولانا عثمانی شعلہ بیان بھی تھے اور شبنم مزاج بھی وہ جب کہیں مصر ہوتے تھے تو آسانی سے مقام نہیں چھوڑتے تھے۔ اور انکسار پر آتے تھے تو سرتا پا موم ہو جاتے تھے۔ میری نظر سے ایسا عالم خوش بیان نہیں گزرا انکی گفتگو بھی ایک تفویض تھی۔

حکیم شفیق الرحمن شفا کاندھلوی

میرے بچپن کے دوست ہیں عربی فارسی کے فاضل اور طب میں ید طولی رکھتے ہیں کاندھلہ میں بڑے زندہ دل لوگوں میں تھے۔ تقسیم کے بعد منجورہ (سندھ) میں مقیم ہیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت ہے اور دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جب سے وہ پاکستان آئے ہیں مسلسل پریشان ہیں سنا ہے کہ ان کی دماغی پریشانی سے ان کی بینائی پر اثر پڑ گیا۔ کاش حکومت ایسے فاضل اور صاحب فن لوگوں سے غافل نہ رہے اور ہمارا ملک ایک ترقی یافتہ ملک کہلائے جہاں علم و ہنر کی قیمت لگتی ہے۔

شفیق اللہ شورائی

علامہ شورائی پانی پت کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک کے بعد سے کراچی میں مقیم ہیں۔ نہایت ذہین اور فطین قسم کے انسان ہیں اور زبان و قلم دونوں میں بڑی مضبوطی سے چلتے ہیں۔ آپ نے سائنٹفک قرآن کے نام سے دو جلدیں مرتب کیں پہلی جلد میں ایک پارہ اور دوسری میں دو پارے ہیں جن پر صدر پاکستان کی طرف سے پانچ صد روپیہ انعام ملا تھا لیکن اس کے بعد ان کی تحریروں پر پابندی لگا دی گئی اور یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ ''اللہ کی حکومت'' کے نام سے ایک کتاب اور بھی چھپی جو اس سلسلے کی کڑی تو نہیں تھی لیکن ان کا طریق وہی ہے اس میں انہوں نے مسئلہ خلافت پر بحث کی ہے۔

شہید نیازی

جناب شہید نیازی پختہ عمر انسان ہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں ان کی اکیڈمک تعلیم تو کسی ڈگری تک نہیں لیکن ان کا مطالعہ اور تجربہ سیکڑوں دانشوروں سے زیادہ ہے وہ شاعر بھی ہیں اور فلسفیانہ رجحان ہونے کے باعث اشعار میں بھی ان کا فلسفہ نظم ہوتا ہے۔ غالب کے رنگ میں بھی انہوں نے شاعری کی ہے لیکن غالب کی طرح وہ شروع میں مقبول عوام کے درجے تک نہیں پہنچی جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا نثر میں

وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں فلسفہ اور تحقیق کا مواد ملتا ہے۔

صفی لکھنوی

عربی، فارسی کے فاضل تھے اور انگریزی میں بھی خاصی مہارت تھی سرکاری ملازمت سے پنشن کے بعد زندگی بھر اردو شعروادب کی خدمت کرتے رہے۔شعر گوئی کا فطری ملکہ تھا کسی کے شاگرد نہیں تھے اس کے باوصف لکھنؤ کے ان ممتاز شعراء میں تھے جنہیں اس دور کے لوگ استاد کہتے تھے علم عروض وقوانی کے ماہر زبان لکھنؤ کے استاد اور اصناف سخن میں ہر صنف شعر پر قادر، جب فن میں کمال حاصل ہوتا ہے تو بعض اساتذہ مغرور اور بعض چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔لیکن صفی صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی ان میں شفقت ہی شفقت پائی۔ حالانکہ وہ غزل اور نظم دونوں پر کمال کی دسترس رکھتے تھے۔ جہاں وہ سوز، نوحہ اور مرثیہ بلند پایہ کہتے تھے وہیں نیچرل نظم اور غزل میں بھی ان کا ایک نیا اسلوب سنا۔جس نے لکھنؤ کے تغزل کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور چونکہ وہ غزل میں دہلی کے شعراء و اساتذہ سے متاثر تھے اور رہتے تھے لکھنؤ، اس لیے انہوں نے دہلی کے اتباع کو لکھنؤ کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ایسا باندھا ہے کہ ان کا پورا دور ان کے اجتہاد کو تسلیم کرتا تھا۔ جہاں وہ اپنی غزل میں حیات و ممات اور جہد وسکون کو چابکدستی سے استعمال کرتے تھے وہیں وہ مغربی خیالات کو بھی اردو زبان بخش کر زندہ جاوید کر دیتے تھے۔ان کی برمحل اور برجستہ حسین ترکیبیں اور قدرت بیان عجیب لطف پیدا کر دیتی تھی۔ ان کی نظر اس بدلتے ہوئے دور پر بھی تھی جو میدان میں نئے ذہنوں کو لا رہا تھا۔ چنانچہ صفی کی شاعری میں لکھنؤ کی وہ پرانی بات نہیں ملے گی ان کے یہاں رقیب، جوبن، بوسہ اور اسی قسم کی تمام رکاکتیں مفقود ہیں اور ابتذال کا کوسوں پتہ نہیں لگتا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے لیکن میں ان کو نظم کا شاعر کہوں گا۔اس لیے نہیں کہ وہ زمانہ نظم کا تھا بلکہ ان کی نظم میں جہاں ان کی مہارت بولتی ہے وہیں نظم میں ان کا خلوص اور دقت نظر متوجہ کرتی ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے قومی، وطنی اور نیچرل نظمیں بھی کہیں اور ان میں بھی صفی کا رنگ نمایاں ہے لیکن جہاں وہ حسن وعشق کے بیان پر آتے ہیں۔صحیح شاعری ان کی اسی جگہ معلوم ہوتی ہے اور مہارت فن وہیں اپنا اعلان کرتی ہے۔

صدق جائسی

جنابِ صدق جائسی بڑے کہنہ مشق اور پختہ گو شعراء میں تھے اخباروں اور رسالوں میں ان کا کلام اکثر چھپتا رہتا تھا اور نثر میں بعض بعض جگہ ان کی کاوش نظر آتی تھی۔ لیکن ایک عرصہ سے ان کا کلام یا مضمون نظر سے نہیں گزرا شاید اس لیے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ایک ایسی دیوار کھنچ گئی کہ ادھر سے ادھر نہ روشنی جاتی ہے نہ آواز۔

مولانا صلاح الدین

اردو کی خدمت کے دعویداروں میں صرف صلاح الدین صاحب ہی وہ شخص ہیں جنہیں میں نے ذاتی مقاصد اور تعصب سے پاک پایا ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے لیے جس قربانی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اس کی مثال یہاں کی تاریخ میں ناپید ہے۔ مولانا صلاح الدین اصناف ادب میں ہر صنف پر عبور رکھتے تھے وہ ناقد بھی تھے افسانہ نگار بھی وہ مورخ بھی تھے اور مجاہدوں کی طرح کام کرنے والے عسکری بھی۔ ان کے سامنے خدا کی بلندی تھی اور باقی وہ کسی عارضی بلندی کو نظر میں نہیں لاتے تھے۔ ادب کے حلقے میں لاہور سے ایسا مجاہد کم اٹھے گا۔ یہاں تو لوگوں نے ابھی ان کے کام کو اکٹھا کرنا بھی شروع نہیں کیا کیسا آدم خور ماحول ہے یہ؟

صبا اکبر آبادی

جناب صبا کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شروع ہی سے ادب و شعر کے ماحول میں پرورش پائی اور اس پر فطری ذوق نے اور بھی دھاریں رکھ دیں۔ نظم، غزل اور مرثیہ تک ہی بات نہیں اصناف سخن میں انہیں ہر صنف پر عبور ہے اور بڑا ہی رواں شعر کہتے ہیں۔ ہر چند کہ کراچی میں کاروباری مصروفیات زیادہ رہتی ہیں لیکن اس کے باوصف صبا کے یہاں بڑا نکھرا ہوا شعر ہوتا ہے اور دشمن بھی تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں مجموعہ ابھی شائع نہیں کیا۔

عبدالصمد صارم الازہری

صارم صاحب جامع ازہر مصر کے فاضل ہیں اور اورینٹل کالج لاہور میں استاد ہیں ان کے والد حضرت ناظم سہاروی مشہور مصنفین میں تھے اور انہیں بھی ورثہ میں تصنیف و تالیف کا وہی ذوق و شوق ملا ہے صارم صاحب کی بھی کئی تصانیف حدیث فقہ ادب اور تذکرے پر موجود ہیں۔ وہ کم گو کم آمیز ضرور ہیں مگر جب کھل کر بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے ادب پر بھی حاوی ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہئے!

صوفی وارثی

جناب صوفی وارثی میرٹھ کے رہنے والے تھے تقسیم ملک کے بعد لاہور میں آ گئے۔ انہیں اکثر مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ قدیم روش کے آدمی تھے اور عرفانیات ان کے کلام کی خصوصیات تھیں وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں عروض' میلاد' تاریخ' تصوف' قصص' سیرۃ وغیرہ شامل ہیں ان کا دل سوز و گداز سے مالا مال تھا وہ دنیا کے رویے سے بددل تھے اور پریشان بھی جس سے ان کی فطرت کا سوز اور بھی چمک گیا تھا۔ صوفی صاحب کی شاعری ہماری غزل کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ صوفی صاحب لاہور میں ۷ اردسمبر ۱۹۶۲ء کو سپرد خاک ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد صادق

ڈاکٹر صادق صاحب لاہور کے پرانے اساتذہ میں سے ہیں اردو اور انگریزی کے علاوہ پنجابی میں بھی انہیں کمال حاصل ہے وہ تنقید و تبصرہ میں بھی بند نہیں اور تحقیق و تدقیق میں بھی ان کا ایک مقام ہے ان کی کتاب ''محمد حسین آزاد'' اور ''تاریخ ادب اردو'' بزبان انگریزی چھپ چکی ہیں جن میں وہ اپنی تمام خوبیوں سمیت موجود ہیں۔

صادق دہلوی

حیدرآباد سندھ میں مقیم ہیں قدیم رنگ میں شعر کہتے ہیں اور رباعیات ان کی مخصوص صنف سخن ہے جس میں انہوں نے اپنی طبیعت کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔

صفدر جعفری

جناب صفدر جعفری، مظہر جعفری کے صاحبزادے ہیں انہیں شعر کا ذوق ورثہ میں ملا ہے وہ نظم اور غزل دونوں برابر کی لکھتے ہیں اور ان کا کلام ابتذال سے پاک ہوتا ہے۔ ابھی وہ جوان ہیں اور ترقی کے لیے ایک زمانہ پڑا ہے اگر ان کا ذوق وشوق اور مطالعہ یہی رہا تو ایک دن وہ بڑے کار آمد ادیب وشاعر ہوں گے۔ انشاءاللہ!

صوفی دہلوی

جناب صوفی دہلوی ایک احرام پوش درویش تھے اور ''درویش'' کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء بھی کیا تھا یہ حضرت سائل دہلوی کے شاگرد اور وارثی سلسلہ میں بیعت تھے۔ سفید داڑھی کے باوجود ترنم سے غزل پڑھتے تھے دیکھنے میں ڈاکوؤں جیسی صورت تھی مگر جب کوئی ان سے قریب ہو جاتا تھا تو پھر ان کے اندر کا انسان اپنا تعارف کراتا تھا۔ بڑے بے تکلف، خوش اخلاق اور یار باش قسم کے بزرگ تھے اور مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

صمد رضوی

لاڑکانہ (سندھ) کے رہنے والے ہیں اور نظم گو ہیں۔ یوں تو غزل میں بھی بند نہیں لیکن ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے اور نظم میں ان کی طبیعت رواں بھی ہے نہ جانے اب تک کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

ایوب صابر ہزاروی

نوجوان ادیب ہیں آج کل ایبٹ آباد میں لیکچرار ہیں۔ تنقید وتحقیق کی طرف رجحان ہے جو نہایت مفید رخ ہے کیونکہ ہمارے ملک میں محقق بہت کم ہیں۔ میں نے ان کے کئی مضمون پڑھے ہیں ان میں ادبی زندگی کے آثار نمایاں ہیں اور ترقی کے سخت جان جراثیم کلبلاتے ہیں۔ ان کی سعی ادب ان کے مستقبل کے متعلق امید دلاتی ہے۔

صابر دہلوی

محمد اسحاق نام صابر تخلص' جناب صابر دہلوی میرے پرانے ساتھی تھے زندگی بھر آزاد خیال آزادہ اور آزاد فیصلہ انسان رہے تقسیم ملک کے بعد دہلی سے ملتان آگئے اور یہاں اپنے زور بازو سے ایک فلور مل لگایا جس سے ان کے پس ماندگان آج شریفانہ زندگی بسر کر رہے ہیں- جناب صابر اس دور کی تمام شاعرانہ خصوصیات کے باوصف محنتی اور سچے انسان ضرور تھے انہیں اپنی لا ابالی طبیعت کے باوجود فرائض کا احساس تھا اور یہ بڑا جوہر انسانی ہے- شاعری میں قدیم روش کے آدمی تھے اور تجربہ و مشاہدہ ان کے شعر کا تانا بانا تھا- وہ مشاعروں میں اپنی غزل ترنم سے پڑھتے تھے اور کامیاب رہتے تھے- انہیں اپنا تمام کلام یاد تھا کبھی میں نے انہیں بیاض سے پڑھتے نہیں دیکھا- نہ معلوم ان کا کلام تحریر میں آیا ہے یا نہیں اگر ان کا کلام ضائع ہو گیا تو یہ ان کے ورثا پر بڑا مجرمانہ دھبا ہو گا-

علاؤ الدین صابر

علاؤ الدین موچی دروازے کا رہنے والا ایک نوجوان شاعر تھا جو صابر تخلص کرتا تھا- شادی سے کچھ دنوں بعد تپ دق میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا- اس کا ایک لڑکا ہے جو خود کو قیس لکھتا ہے اور خوشنویس ہے لیکن جناب صابر مرحوم کے کلام کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے اور کس قدر ہے صابر مرحوم کی بیاض میں نے دیکھی ہے اس میں اچھا خاصا ایک مجموعے کا مواد تھا- صابر ریلوے کارخانہ میں ملازم تھا نہایت خلیق اور منکسر المزاج نوجوان اس کی تصویر اب تک میری آنکھوں میں پھرتی ہے-

صادق دہلوی

جناب صادق دہلوی دہلی کے ایسے درویشوں میں ہیں جو مزدوری اور حلال روزی سے اپنا گزارہ کرتے ہیں اور اپنے مریدین و معتقدین کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے وہ صاف باطن انسان ہیں اور سیدھے سچے پرانی وضع کے مسلمان یوں تو وہ غزلیں بھی معمولی نہیں کہتے لیکن

حقیقت یہ ہے کہ ان کا میدان نعت گوئی ہے اور نعت میں ان کی زبان پر وہی بات آتی ہے جو ان کے دل کی ہوک ہوتی ہے ہمارے ملک میں جو لوگ نعت کہہ رہے ہیں سبھی قابل داد ہیں لیکن صادق صاحب کے یہاں خلوص، محبت اور عقیدت کا غلبہ ہے جو بہت کم لوگوں میں ملتا ہے۔

بہاری چرن صادق

جناب صادق غزل کے معیاری شاعر تھے اور ان کی شاعری غالباً جگر مراد آبادی کے انداز کلام کی بازگشت تھی ان کے اشعار سے ان کی انسانیت کا عکس زیادہ تاثر دیتا تھا۔ وہ نہایت خلیق اور انسان دوست قسم کے افسر تھے جو درویشی کی راہ پر گامزن تھے۔

ڈاکٹر صابر علی

پروفیسر ڈاکٹر صابر علی صاحب قدیم تہذیب کے نئے انسان ہیں علم اور معلومات میں تو وہ بڑے بڑے جغادریوں سے بھی آگے ہیں لیکن شرافت اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں ماضی کا نمونہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صابر صاحب نے سعادت یار خان رنگین پر مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے اور اس مقالہ کو دیکھنے سے صابر صاحب کی محنت اور دیدہ ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا انداز تحریر نہایت سادہ ہے وہ مغلق الفاظ استعمال نہیں کرتے اور نہ ان کی تحریر میں کسی قسم کی کوئی گنجلک ہوتی ہے۔ بہت کم ادیب اس انداز تحریر کو اپناتے ہیں کیونکہ یہ آسان بات نہیں ہے۔

صابر خلیلی

جناب صابر خلیلی امرتسر کے مشہور شاعروں میں ہیں ان کے کلام کا ایک مجموعہ "بہار جاوداں" کے نام سے چھپا تھا جس میں میر منظور ولی وارثی کا کلام تھا اور جناب صابر خلیلی کا اس کے مطالعہ سے صابر صاحب کی شاعری کے طول و عرض پر نظر جاتی ہے اور امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کے حالات کچھ ایسے ناگفتہ بہ ہوئے کہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئے اور کبھی کبھی اور کہیں کہیں نظر آتے ہیں یہ صابر خلیلی صاحب پر ہی منحصر نہیں نہ جانے کتنے جوہر گرد آلود ہو کر رہ گئے اور کتنے موتی پاش پاش ہو گئے۔ صابر خلیلی پرانے کہنے والوں میں ہیں میرے خیال سے وہ کہتے ضرور

ہیں مگر ان کا کلام سامنے نہیں آتا۔

صغیر احمد جام مرحوم

صغیر احمد صاحب ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے پہلے دہلی میں لیکچرار تھے تقسیم کے بعد غالباً ایبٹ آباد میں اردو، فارسی کے استاد مقرر ہو گئے تھے ان کا ایک مجموعہ کلام بھی ہے جو غالباً تقسیم ملک سے پہلے چھپ چکا تھا اور ایک ''تاریخ ادب اردو'' جسے وہ دوبارہ شائع کرانا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور اللہ کو پیارے ہو گئے ان کی دونوں کتابیں میرے کتب خانہ میں محفوظ ہیں اور جب ہم انہیں تصنیفی تالیفی معیار سے جانچتے ہیں تو وہ مصنف کی عظمت کا اعتراف کرا دینے کے لیے کم نہیں۔

صغیر احسنی مظفر نگری

جناب صغیر احسنی حضرت احسن مارہروی کے شاگرد ہیں کچہری کی مصروفیات کے باوصف وہ شعر و ادب کے ہنگاموں میں ملتے ہیں جناب صغیر غزل نظم کے علاوہ نثر بڑے سلیقے کی لکھتے ہیں وہ بیک وقت ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔ جناب احسن مارہروی پر انہوں نے اچھا خاصا مواد جمع کر رکھا ہے جو آسانی سے ایک کتابی صورت میں منتقل ہو سکتا ہے۔ ان کا کلام عامیانہ روش سے ہٹ کر خیال و تصور کی بلندیوں اور گوناگوں محاسن کی دلچسپیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مجموعہ ابھی کوئی نہیں۔

صفدر زیدی

ڈاکٹر صفدر زیدی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں انہوں نے علی گڑھ سے ایم اے کیا اور لاہور آ کر پہلے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر ہوئے اور پھر موقع ملنے پر ادارہ تعلیم سے منسلک ہو گئے آج کل جوہر آباد (تھل) میں پرنسپل ہیں۔ وسیع النظر ہونے کے علاوہ غیر معمولی ذہین ہیں ان کی دو کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر ملک کے اکابر نے اپنی آرا سپرد قلم کی ہیں ان کا ایک مجموعہ بقید ردیف و قافیہ ہے اور دوسرا ردیف و قافیہ کی قید سے آزاد جناب صفدر کا کمال یہ ہے کہ وہ ردیف و قافیہ سے ہٹ کر صرف وزن کے بل پر اس میں سے موسیقیت کو کم نہیں ہونے دیتے

صہبا لکھنوی

صہبا لکھنوی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں مگر انہوں نے بہت جلد اس فضا کو پہچان لیا اور اس کے چور رستے بھی معلوم کر لیے اب وہ برابر علمی، عملی اور نطقی اور قلمی جنگ کر رہے ہیں - اگرچہ شاعری ان کی زندگی نہیں بلکہ ایک شعبہ حیات ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے معاصرین میں ایک بلند و برتر مقام رکھتے ہیں نثر نگاری میں بھی وہ قابل تعریف مضامین لکھتے ہیں زبان و بیان پر انہیں عبور ہے اور وہ نظم و نثر دونوں اسی ہتھیار سے لڑتے ہیں - قدیم و جدید دونوں انداز کے شعر کہتے ہیں اور دونوں گروہوں میں مقبول ہیں - ان کا رسالہ ''افکار'' ان کی تخلیقات کا سفینہ ہے جو ہر گھاٹ پر ان کا تعارف کراتا ہے -

صادق کشمیری

راولپنڈی کے مشہور شاعر ہیں ان کے یہاں نظم اور غزل دونوں ملتی ہیں اور وہاں کے مشاعروں میں ان کے دم سے رونق رہتی ہے - میں نے جب بھی انہیں مشاعروں میں سنا ہے انہوں نے نہایت اچھی غزل پڑھی ہے لیکن ان کا کوئی مجموعہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا مجھے امید ہے کہ ان کا مجموعہ قبول عام کی سند لے گا - کیونکہ یہاں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے -

صادق نسیم

جناب نسیم یوں تو فوج میں افسر ہیں لیکن جب ان کی نظمیں اور غزلیں سننے میں آتی ہیں تو یہ شاعر کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتے - ان کے اشعار دلکش اور انداز بیان جاذب ہے - ان کے اشعار سے ان کی زندگی پر جو روشنی پڑتی ہے اس میں وہ نہایت دردمند دل رکھنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں - ان کی نظر عمیق احساس بیدار ہے اور سچے شاعر کی یہی خصوصیات ہیں -

صدیق افغانی

محمد صدیق نام صدیق تخلص ان میں جذبہ شعری بڑا شدید اور منہ زور قسم کا ہے - اس پر طرہ یہ کہ جدید رنگ کو پسند کرتے ہیں مگر جہاں تک شعری ماہیت کا تعلق ہے اس میں وہ قدیم سانچوں کے

قائل ہیں صدیق افغانی کے یہاں اچھے اشعار کی کمی نہیں بعض بعض مقامات پر وہ جہاں اپنا تراشا ہوا بسمل استعمال کرتے ہیں تو الفاظ کے ڈانڈے اور معانی کے رشتے بے مقصدی شاعری کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی ترقی کی رفتار یہی رہی اور ان کے مشغلہ نے ان کے دماغ کو نہ دبوچ لیا تو ان سے ادب میں اضافے کی امیدیں ہیں

محمد صدیق چیمہ

رہنے والے تو سیالکوٹ کے ہیں لیکن آج کل گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو کے لیکچرار ہیں اور پنجاب کے ادباؤ شعراء پر ایک مقالہ لکھ رہے ہیں جو پی ایچ ڈی کے لیے ہے۔ خوش اخلاق اور خوش ذوق انسان ہیں کم استاد ایسے ہوتے ہیں جو تلامذہ کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں۔ صدیق صاحب کو یہ فن خوب آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے شاگرد ان سے محبت کرتے ہیں۔ چیمہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا ذوق ہے۔ خدا کامیاب کرے۔ آمین۔

ایوب صابر (کوہاٹ)

ایوب صابر صاحب اس علاقے کے مشہور شعراء میں ایک حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی غزلیں گل و بلبل اور بوس و کنار تک محدود نہیں یہ موجودہ حالات کا بھی غور سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے اشعار میں طنز و مزاح کے رنگ میں بیان کرتے ہیں بحیثیت انسان بھی خوب آدمی ہیں اور نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

نواب صدیق علی خان

نواب صدیق علی خان سے شملے میں ملاقات ہوئی اور پھر میں مسلم لیگ کے جلسے پر ان کے دولت کدے پر ناگ پور بھی گیا اور وہاں ان سے اور بھی نزدیک ہونے کا موقع ملا۔ میں نے ان کے گھر کو اپنے گھر کی طرح محسوس کیا اور ان سے جس قدر نزدیکی ہوئی ان کے محاسن روشن سے روشن تر ہوتے چلے گئے۔ وہ جہاں عالمی سیاست پر ایک قائد جیسے نظر رکھتے ہیں وہیں وہ درمیانہ طبقے کی طرح زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں انہیں میں نے ایک مخلص اور ذی فہم قائد پایا اور ایسا قائد جو معمولی

زندگی بسر کرتا ہے اور پس ماندہ طبقے کی ترجمانی اور اسلام پر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے وہ مسلم لیگ میں سالار کی حیثیت سے تھے اور میں نے انہیں معمولی رضا کار کی طرح جدو جہد میں مصروف دیکھا ہے۔ کاش ایسے مخلص لوگوں کی تعداد بڑھ جائے۔

مولانا ضیاء احمد بدایونی

مولانا ضیاء احمد بدایوں کے رہنے والے ہیں اور علی گڑھ میں استاد ہیں۔ علی گڑھ کے استاد بچ مچ استاد ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں شاگردوں کے لیے مشفقت اور ورثہ دونوں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ مولانا ضیاء احمد صاحب کی تالیفات و مضامین ہمیں ان کی علمی استعداد سے باخبر کرتی ہیں اور ان کے مضامین ان کا ادبی مقام متعین کرتے ہیں کاش ایسے اساتذہ اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ نصیب ہوں مولانا ضیاء کا دم علی گڑھ کے لیے غنیمت اور بدایوں کے لیے عظمت ہے۔

ضیاء الاسلام ضیاء

جناب ضیاء ایک زمانہ سے میرے کرم فرما ہیں میں جب شملے کے مشاعرے میں پہلی بار شریک ہوا تو اس وقت وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں تھے۔ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تقسیم ملک ہو گئی تو کراچی آ گئے کچھ عرصہ تو وزارت کشمیر کے ادارہ میں رہے آج کل نہ جانے کہاں ہیں بڑے ہی رکھ رکھاؤ اور قاعدہ کے آدمی ہیں شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق پایا ہے اور ان کی تالیفات میں کئی کتابیں ہیں۔ بحیثیت دوست بھی نہایت نفیس انسان ہیں مگر پاکستان میں آ کر وہ اس قدر مصروف ہو گئے کہ ادبی نشستوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

ضیاء جعفری

جناب ضیاء جعفری پشاور کے رہنے والے ہیں اور بہت سنبھل کے شعر کہتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ بڑے رنگین مزاج اور مجلس پسند آدمی تھے لیکن اب مسائل تصوف میں گم ہیں اور درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں میں ان میں یہ رنگ تو بہت دنوں سے دیکھتا تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اچانک یہ اس طرف رخ کر لیں گے اب ان کے یہاں اشعار میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے اور گفتگو میں بھی

ان کا وہی انداز فکر ہے اور ان کا یہ تبلیغی رخ جو اسلامی نظریہ حیات کا حامل ہے ہم لوگوں کی شاعری سے کہیں بلند و برتر ہے۔

مسلم ضیائی

اپنی فضیلت اور علمیت کے اعتبار سے ضیائی صاحب بلند سطح کے انسان ہیں ان کے ذوق مطالعہ اور علمی لگن کا ثبوت ان کی ذاتی لائبریری ہے اس دور میں ہر شخص لائبریری نہیں رکھ سکتا یہ بڑے دل گردے کا کام ہے زندگی اور وقت کی اہم ضروریات پر کتاب کے ذوق کو ترجیح دینا معمولی صاحب علم کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔۔ضیائی صاحب کی علمی معلومات کا کوئی ایسا کارنامہ ابھی طبع نہیں ہوا جس پر ضیائی صاحب کو بھی اعتماد ہو ویسے ان کے نقوش قلم سے یہ دور بچپن ہی سے آشنا ہے وہ نئے ادیب نہیں ہیں بلکہ آج کے نئے ادیبوں کا بچپن ان کے لٹریچر کے شباب کا زمانہ ہے۔

ضیاء جالندھری

بڑی سوجھ بوجھ کے پڑھے لکھے کہنے سے زیادہ سمجھتے اور سمجھنے سے زیادہ کہتے ہیں دور رس نظر اور حساس دل پایا ہے اگر چہ ملازمت کی مصروفیات میں شعر کی فرصت کم ہی ملتی ہے لیکن جتنا بڑا عہدہ ہے اتنا ہی کام کم اور ذمہ داری زیادہ ہوا کرتی ہے ہر وہ شاعر جو فطری ہے زندگی کی انہی مصروفیات سے وقت نکالتا ہے اور شعر کہتا ہے۔ جناب ضیاء تنقید میں بھی ایک خاص طریق فکر رکھتے ہیں اور ادبی حلقوں میں ان کا نام ہے بحیثیت انسان بھی ضیاء بڑے معقول واقع ہوئے۔

ضمیر فاطمی

ضمیر فاطمی اصناف سخن میں غزل ہی تک ہیں مگر ان کی غزل اپنے دور کے سیکڑوں ساتھیوں سے بہتر ہوتی ہے چونکہ وہ اپنا کلام اپنے مخصوص ہلکے ہلکے ترنم میں پڑھتے ہیں اس لیے مشاعرہ میں انہیں ناکامی نہیں ہوتی ۔اگر زندگی کی مصروفیات مطالعہ کی فرصت دیں تو مشق و مزاولت انسان کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتی ہے مگر فرصت کسے نصیب ہے۔

مہر لال سونی ضیاء

مہر لال سونی ضیاء کپور تھلے میں پیدا ہوئے لیکن ان کا اصل وطن فتح آباد جوامرتسر کے قرب و جوار میں ہے۔ بی اے کی ڈگری ایف سی کالج لاہور سے لی اور ایم اے بھی وہیں سے کیا۔

وہ جناب سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں اور مولانا سیماب کی نظر کیمیا ساز نے انہیں مقید کردیا۔ ان کے نام سے ایک تذکرہ بھی چھپا ہے جس کا نام ''کارواں'' ہے۔ یوں تو وہ مختلف شعراء کا تذکرہ ہے لیکن ان میں اکثر سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ ہیں ان کے کلام کے دو تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک میری نظر سے گزرا ہے جس کا نام ''طلوع'' ہے اس میں اچھی معیاری نظمیں غزلیں ہیں۔ وہ جدید شاعر ہیں مگر چونکہ جدید شاعری میں ابہام اس قدر آ گیا ہے کہ ہم اسے بے مقصدی شاعری کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جس ملک کا ادب و شعر بے مقصد ہو جائے وہ جہاں تہذیبی اور اخلاقی جرم ہے وہاں علمی اور ادبی گناہ بھی ہے۔

پرشوتم لال ضیاء

پرشوتم لال ضیاء بڑا ہونہار نوجوان تھا اس نے سناتن دھرم کالج سے ایم اے کیا تھا اور فارسی میں اسے اچھی مہارت ہوگئی تھی۔ وہ بلا تکلف شعر کہتا تھا مگر تقسیم ملک کے بعد سنا ہے کہ دیوانگی کی طرف مڑ گیا لاہور میں بھی ایک بار اس پر یہ دورہ پڑ چکا تھا مگر اسے سنبھال لیا گیا تھا۔ دہلی میں اس کی دیکھ بھال نہ ہوسکی اور وہ دنیا سے اٹھ گیا اس کے پاس اس کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا نہ جانے اس کا کیا ہوا۔

ضیاء صدیقی

پیرزادہ منظور حسین ضیاء صدیقی، ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں لیکن بسلسلہ ملازمت ضلع رہتک میں زیادہ وقت گزارا اور ریٹائر ہو کر ملتان میں مستقل سکونت اختیار کر لی ملتان میں اردو کی ترویج و ترقی میں ضیاء کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے لیکن اب وہ ایک طویل عرصہ سے رعشہ میں مبتلا ہیں اور ایک قسم کی بے دست و پائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بہت اچھا اور صاف شعر کہتے ہیں

صناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں جس میں انہیں مہارت نہ ہو- قدیم روش کے دلدادہ ہیں اور اسی دائرہ میں ان کی شاعری پھلتی پھولتی ہے- ان کے کلام کا ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا- سنا ہے ایک عرصے سے ترتیب دے کر رکھا ہوا ہے- دیکھئے کب چھپے-

ضیاءالاسلام عیاں میرٹھی

جناب ضیاء الاسلام صاحب عیاں میرٹھی بلا کے شاعر تھے اور زبان پر تو انہیں ایسا عبور تھا کہ لفظوں کی نشست پر گھنٹوں تقریر کرتے مگر افسوس کہ راہی عدم ہو گئے ان کا مجموعہ کلام چھپ گیا ہے- جس میں وہ اپنے فن سمیت موجود ہیں اور موجود رہیں گے-

ضیاء شاہد

اس نوجوان میں بھی ایسی خوبیاں کلبلا رہی ہیں جو اپنا خول توڑ کر بہت جلد باہر آ جائیں گی اور اگر ہوا موافق اور فضا ساز گار ملی تو اس کی صلاحیتیں بھی زیادہ اور گونگی نہیں رہیں گی- خدا کرے یہ اکتساب سے دامن نہ بچائے اور لوگ گمراہ نہ کریں-

سر ضیاءالدین احمد صاحب

جن دنوں نواب صدیق علی خان سے ملاقات ہوئی اسی دوران میرے اعزاز میں نواب صاحب نے دلی مسلم ہوٹل شملے میں ایک عشائیہ دیا تھا اور وہیں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جوان کے اوصاف ہیں ان سے تو زمانہ آگاہ ہے- وہ ملنے جلنے کے آدمی نہیں تھے بعض وقت تو وہ مدتوں کے بعد ملنے والے کو بھی پہچان لیتے تھے اور بعض وقت روز ملنے والوں کو بھول جاتے تھے- میرے خیال سے تو ان کے ذہن میں علی گڑھ کی بہبود کے علاوہ کوئی جمتا ہی نہیں تھا وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ہر شے سے بے تعلق تھے-

سید ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری فوج کے ذمہ دار افسر ہیں اور تعلیم کے وقت سے میرے حلقہ نظر میں ہیں۔ ان کی شاعری طنز و مزاح کی شاعری ہے لیکن ہمارے ملک میں ان کا حریف کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ بعض بعض اشعار میں طنز و مزاح کے سہارے پر ایسی ایسی اصلاحی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کی روح کے حلول کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کا انداز بیان صاف اور سیدھا سادا ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اس سادگی میں اپنی ذہانت سے ایسے ایسے بیل بوٹے تراشتے ہیں کہ سامعین ان کے کلام کی داد و تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن میں یہ اپنا فن لیے ہوئے مختلف رنگوں سے نظر آتے ہیں۔

ضیاء الرحمٰن ضیا (سکھر)

نوجوان طالب علم ہیں مگر ان کا آغاز ان کے انجام کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی کتاب ''ادب اور امن عالم'' میری نظر سے گزری ہے اگر یہ اسی طرح تصنیف و تالیف کے دلدادہ رہے تو مستقبل سے بہت امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں اگر چہ ان کی یہ کتاب تصنیف و تالیف کے زمرہ میں نہیں آتی بلکہ ترتیب و تدوین کی صف میں ہے لیکن اس فن کے لیے تالیف سے زیادہ سلیقہ درکار ہے اور اس نوجوان میں ترقی کے آثار ملتے ہیں۔

طاہر فاروقی

پروفیسر طاہر فاروقی صاحب پشاور میں اردو شعبہ کے صدر ہیں انہیں شعر و ادب پڑھاتے اور پڑھتے ایک عمر گزری ہے۔ وہ جہاں ایک بلند پائے کے ادیب ہیں وہیں وہ شاعر بھی ہیں لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ انہوں نے ایک زمانہ ہوا شاعری سے کنارا کر لیا۔ لیکن اس کے باوصف جو انہوں نے ادب میں کام کیا ہے اور اردو زبان کی جس قدر خدمت کی ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں وہ علم و ادب میں جس قدر بلند ہیں اسی قدر اخلاقی طور پر بھی مثالی انسان ہیں۔ وہ قدیم معاشرہ کے انسان ہونے کے باوصف موجودہ ادب کے ہر گوشہ پر نظر رکھتے ہیں۔

طپش مارہروی

جناح طپش مارہروی سے جناب جوش ملیح آبادی کے دولت کدہ پر دلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی ضعیفی پختہ ہو چکی تھی مگر آواز میں وہی کڑکا اور مزاج میں شگفتگی موجود تھی۔

وہ قدیم رنگ میں معیاری شعر کہتے تھے اور جوش صاحب سے نوک جھوک رہتی تھی وہ غزل کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے تھے اور جوش صاحب غزل گو شاعر کو شاعر ماننے سے انکار کرتے تھے ان کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔

فیروزالدین طغرائی

جناب طغرائی امرتسر کے ان لوگوں میں تھے جنہیں امرتسر کا تمام لکھا پڑھا طبقہ جانتا تھا شعر و شاعری میں وہ اساتذہ کی صف کے آدمی تھے اور فارسی پر بھی انہیں عبور تھا۔ امرتسر کے بیسیوں انسان جناب صوفی تبسم کی طرح طغرائی صاحب کے دامن سے فیض یاب ہو کر بام شہرت پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ ''کلیات طغرائی'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور اس میں طغرائی صاحب اپنی اردو فارسی کی بلندیوں سمیت موجود ہیں۔

ڈاکٹر عطا محمد طاہر

ڈاکٹر عطا محمد طاہر صاحب راولپنڈی سے لاہور آ گئے تھے وہ ہومیو پیتھی کے بے مثال ڈاکٹر تھے۔ بعض ہومیو پیتھی جاننے والے انہیں انسائیکلو پیڈیا کہتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ برقعے میں عورتوں کے امراض کو پہچان کر دوا دیتے تھے اور شفا ہوتی تھی۔ اصناف سخن میں وہ کسی جگہ بند نہیں تھے وہ غریب خانہ پر بلاناغہ تشریف لاتے تھے اور ان کی کوششوں سے نہ جانے کتنے مشاعرے شہر سے باہر باغوں اور نہر کے کناروں پر ہوئے ان کے صاحبزادگان بھی ان کی جگہ ڈاکٹری ہی کر رہے ہیں مگر ان میں وہ شاعرانہ جنوں کہاں نہ معلوم انہوں نے طاہر صاحب کے کلام کو بھی محفوظ رکھا ہے یا نہیں۔

طاہر سردھنوی

جناب طاہر سردھنوی، سردھنہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تبادلہ آبادی ہوا تو وہ جھنگ میں جا کر رہ پڑے۔ وہ نہایت سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں مگر بیس برس سے اب تک انہیں ایسا ماحول نصیب نہیں ہوا جو ان کے شاعرانہ جوہر کو پہچانے اور قدر کرے۔ ان کی غزلیں بعض رسالوں میں چھپتی ضرور ہیں مگر وہ جس پائے کے شاعر ہیں انہیں وہ مقام حاصل نہیں۔

انہیں فکر معاش کھائے جا رہی ہے اور ایسا اچھا بلند فکر اور تنوع پسند شاعر ریگ زار میں ضائع ہو رہا ہے۔ کاش ہمارے علمی، ادبی ادارے اور پڑھے لکھے حکام اپنے حلقوں میں اس قیمتی عنصر حیات سے باخبر ہوں اور انہیں کم از کم معاشی سہولتیں بہم پہنچائیں تا کہ ہمارے ملک کے ادب کو ترقی یافتہ ملکوں کے ادب کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

جناب طاہر سردھنوی غزل کے مزاج کو پہچانتے ہیں اور اپنی جان لیوا مصروفیات کے باوصف ایسی نفیس غزل کہتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی اس روش کا شاعر ملے گا۔

کنور لطافت علی خان طالبؔ

جناب کنور لطافت علی خاں طالبؔ باغپت کے رہنے والے ہیں اور نہایت اچھا شعر کہتے ہیں ان کے کلام میں پختگی بھی ہے اور رنگینی بھی وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی دونوں میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے وہ عجیب و غریب انداز سے بات کہتے ہیں جس سے شعر لطیف بھی ہو جاتا ہے اور خوبصورت بھی ان کی کتاب ''شاخ نبات'' میری نظر سے گزری ہے اور اسے کوئی تذکرہ نگار نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ستیش چندر طالب دہلوی

جناب ستیش چندر طالب دہلی کے رہنے والے ہیں اور جناب مہاراج بہادر برق کے تلامذہ میں ہیں اور ایسے شاگرد جو استاد کی موت کو بھی زندگی جانتے ہیں ان کا نام آتا ہے تو فرط عقیدت سے ان کے چہرے پر تقدیس کھیلنے لگتی ہے۔ جناب طالب جیسے شاعر ہیں اسی درجے کے ادیب بھی ہیں

ان کا نظم ونثر کا سلسلہ مختلف جرائد میں آتا رہتا ہے۔ وہ دلی کی زبان پر عبور رکھتے ہیں اور حیات انسانی کے مختلف گوشوں پر بھی نظر رہتی ہے۔ ان کے ادب میں حسن وعشق کے علاوہ اخلاقیات وحالات حاضرہ پر بھی تیز روشنی پڑتی ہے۔ ان کا کوئی مجموعہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا تقسیم کی سیاسی دیوار علم و ادب میں بھی حائل ہوگئی ہے۔

جعفر طاہر

جناب جعفر طاہر جھنگ کے رہنے والے کہنہ مشق شاعر ہیں کچھ دن ہوئے فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں اور جھنگ میں مقیم ہیں۔ حکومت کی طرف سے انعام یافتہ ہیں۔

یوں تو وہ غزل بھی خوب کہتے ہیں لیکن ان کے طویل اور مشہور ''کنیٹو'' نے بھی انعام پایا ہے۔ جس میں ان کے مشاہدات اور تجربات کے علاوہ بعض فوجی سوانح بھی شعر کی صورت میں ڈھل گئے ہیں ان کے اس ''کنیٹو'' سے ان کی علمی قابلیت ادبی صلاحیت کے علاوہ معلومات اور مطالعہ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس ''کنیٹو'' کے ادبی ادارے اور ادبی مطالعہ کرنے والے بھی واقف ہیں کیونکہ وہ ان کی طویل محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ جدید اسلوب بیان کی ایسی طویل نظم اب تک ہمارے اردو ادب میں نہیں تھی۔

یہ ''ہفت کشور'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ مگر ان کی غزلوں کا مجموعہ ابھی باقی ہے اور یہ بھی ادب میں اضافہ ہوگا۔ جعفر طاہر صاحب کو چاہئے کہ وہ مجموعہ بھی جلد از جلد چھپوائیں۔

طاہر کپور تھلوی

جناب طاہر کپور تھلوی کو دو چار بار مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا ہے اور دو چار بار جناب ایف ڈی گوہر صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی۔ عموماً مشاعروں کی تگ ودو میں سرگرداں رہتے ہیں اور روائیتی غزل پڑھتے ہیں۔ غزل کو ترنم کا لباس دینے میں ماہر ہیں۔ جس سے مشاعرے میں رنگ جم جاتا ہے ان کے دم سے ملتان کی فضا میں ادبی ہنگامے برپا رہتے ہیں۔

لطیف طاہر

جناب شہزادہ لطیف طاہر گجرات (پنجاب) لطیف صاحب کا خاندان تو ہندوستان سے باہر کا ہے لیکن ایک زمانہ سے وہ یہیں ہیں۔ میں نے ان کی غزلیں سنی ہیں وہ سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں بہت سے لوگوں سے بہتر اور بلند کہتے ہیں۔ مطالعہ کے لحاظ سے بھی لطیف طاہر صاحب اچھی معلومات کے حامل ہیں لیکن ان کی شاعری ان کے ادب سے کہیں آگے ہے۔ جس میں ان کے خیالات کی وسعت اور نظر کی گہرائی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے وہ جن دنوں لاہور میں تھے ملاقات ہوتی رہتی تھی اب وہ ایک عرصے سے گجرات میں ہیں۔

طفیل دار

جناب طفیل دار ایم اے او کالج کے لیکچرار ہیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں دن رات منہمک رہتے ہیں اور شاعری میں ان کا طریق فکر فلسفہ حیات کا حامل ہے۔ جس کی آج کل ضرورت ہے۔ غزل میں حسن و عشق کے عامیانہ پہلوؤں سے بچ کر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا ایک الگ اختیار کرتے ہیں نہایت خلیق اور دلچسپ آدمی ہیں اور دوستوں کے دوست۔

طفیل ہوشیار پوری

جناب طفیل ایک عرصہ سے شعر کہتے ہیں اور مدت سے اخبار نکالتے ہیں۔ ان کے فلمی گیتوں سے سارا ملک باخبر ہے ریڈیو پر جب یہ اپنی غزل، گیت یا نظم پڑھتے ہیں تو ان کی سریلی آواز سننے والوں پر ایک افسونی اثر ڈالتی ہے۔

جب وہ کوئی نازک شعر پڑھتے ہیں یا گیت میں حسن و عشق کا کوئی نازک مرحلہ بیان کرتے ہیں تو ان کے جسم اور شعر میں کوئی تطابق نہیں رہتا اس وقت وہ اپنے صحیح مقام کا اعلان کرتے ہیں۔ اور ان کی شاعرانہ قدرت سامنے آتی ہے۔ ہر چند کہ وہ ایک اخبار اور ایک رسالہ نکالتے ہیں لیکن وہ صحافی نہیں بلکہ وہی شاعر ہیں جو اپنی شاعری کو نغموں کے ہجوم میں دلہن کی طرح بنا سجا کر پیش کرتے ہیں۔

طاہر دیوبندی

طاہر حسین نام طاہر تخلص، میں نے جناب طاہر کو لائل پور کاٹن ملز کے مشاعروں میں کئی بار سنا ہے۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جو سب کچھ ہونے کے باوصف خود کچھ نہیں بنتے۔ یہ جناب عزیز سہارنپوری کے شاگرد ہیں اور اچھی خاصی سلجھی ہوئی غزل کہتے ہیں ہر چند کہ ان کا ماحول غزل کا نہیں لیکن اس کے باوصف سیکڑوں سے اچھی غزل ہوتی ہے اور ایسے نہ جانے کتنے لوگ اندھیروں میں ہیں جو ادبی پروپیگنڈے سے محروم ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر گئے ہیں۔

محمد مصطفیٰ جوہر

جناب محمد مصطفیٰ جوہر کراچی میں مجتہد قسم کے عالم اور عوامی قسم کے پیشوا ہیں اور ان کے صاحبزادے طالب جوہری ہیں ظاہر ہے کہ جوہری تربیت ہی جوہر کو لعل بدخشاں بنا سکتی ہے جناب جوہر معقول و مقبول عالم ہیں اور ان کے قد سے ادب قدآور ہے وہ پرانے ڈھانچوں پر سوچنے والے آدمی نہیں۔ ان کے یہاں شعر میں نیا پن بھی ہے اور مفاہیم بے پردہ بھی جو بہت کم شعراء کا وصف ہے۔

ڈاکٹر مظاہر علی ہاشمی طور

ڈاکٹر مظاہر علی ہاشمی صاحب پاکستان ہومیوپیتھی کالج میں لیکچرار ہیں اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ جہاں وہ ڈاکٹری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہاں وہ شعر بھی خوب کہتے ہیں اگرچہ کم گو ہیں مگر جو وہ کہتے ہیں اس میں ان کی طبیعت کی اپج اور مشق بولتی ہے اور اچھا کہنے والے عموماً کم ہی کہنے لگتے ہیں اور کمی کا ان کو شکوہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی معروفیت انہیں سر نہیں اٹھانے دیتی۔ تاہم انہیں چاہئے کہ کلام کو ضائع نہ ہونے دیں۔

طالب جوہری

جناب طالب جوہری حضرت جوہر کے صاحبزادے ہیں جب وہ لاہور میں کسی امتحان کے سلسلے میں جناب عاشق حسین اکبری کے یہاں مقیم تھے تو ان سے ہفتوں مسلسل ملاقاتیں رہتیں وہ

اچھے ہونہار اور قابل امتیاز نوجوان ہیں ان کی فطانت بتاتی ہے کہ وہ کبھی نہایت اچھے عالم دین منطق مفسر اور چابک دست ادیب ہوں گے وہ شعر بھی کہتے ہیں اور اس میں بھی وہ معمولی درجے کے شعراء میں نہیں ہیں۔

سیدنا طاہر سیف الدین

حضرت طاہر سیف الدین صاحب داؤدی بوہروں کے روحانی پیشوا تھے عربی اور فارسی کے ایسے فاضل تھے کہ عرب اور ایران میں ان کی شاعری اور انشاء پردازی کی دھوم تھی انہوں نے حضور اکرم ﷺ اور آئمہ کی شان میں قابل قدر عقائد اور نعتیں کہی ہیں عرب اور ایرانی انہیں بڑی قدر و احترام سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف برہان پور میں ہوا۔ ایک مشاعرے میں گیا ہوا تھا وہاں سے مجھے جناب اختر حسین کی والدہ کا تار ملا کہ تم مشاعرہ پڑھ کر برہان پور ضرور آؤ چنانچہ حکم کی تعمیل میں برہان پور پہنچا اور جعفر منزل میں قیام کیا جہاں برہان پور کا قبرستان کالے پتھر کی مسجد اور شاہ منصور کا مزار اب تک میری نظر میں ہے وہیں حضرت ابوطیب محمد برہان الدین اور برہان پور کے مشہور مورخ جناب راشد برہان پوری کی ملاقات بھی لوح دل پر مرتسم ہے حضرت طاہر سیف الدین صاحب کو اردو سے بڑا شغف تھا اور اردو کی ترویج میں ان کا بڑا حصہ ہے جسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

مولانا ظفر علی خان

مولانا ملک کی سیاست اور ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں چنانچہ جیسا کہ یہاں کے سیاسی لوگوں کا انجام ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی سادگی خلوص اور ایمان داری کے باعث مالی نقصان کے علاوہ تاریکی زنداں کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن طبیعت ایسی حاضر اور رواں پائی تھی کہ وہ کسی جگہ بھی عجز کا اظہار نہیں کرتے اور نہ ان کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی میدان سے گریز کر رہے ہیں۔

مولانا عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔ اور چونکہ اردو پر عبور تھا اس لیے انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمے میں اس قدر مہارت تھی کہ قلم برداشتہ ترجمہ

کرتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ اور اصطلاحات سامنے دست بستہ موجود ہیں- مولانا کچھ عرصہ محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے کیونکہ علیگ ہونے کی وجہ سے آپس میں قربت لازمی تھی پھر نواب صاحب کی سفارش سے حیدر آباد دکن پہنچے اور دارالترجمہ میں شامل ہو گئے پھر مولوی عزیز مرزا کی توجہات سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری مقرر ہو گئے لیکن یہ عہدہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا کیونکہ ایسے تنک مزاج ایک جگہ ذرا مشکل ہی سے رہ سکتے ہیں- دکن سے آ کر بسلسلہ تجارت کچھ دنوں بمبئی میں رہے لیکن شاعر اور ادیب تجارتی انسان کہاں ہوسکتا ہے چنانچہ بمبئی کو خیر باد کہہ کر پھر دکن روانہ ہوئے اور وہاں رجسٹرار کا عہدہ سپرد ہوا اور لارڈ کرزن کی کتاب خیابان فارسی کا ترجمہ کیا تو پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپیہ انعام دیا اور تین ہزار نظام دکن نے عطا فرمائے-

مولانا حیدر آباد دکن سے واپس آئے تو وزیر آباد میں زمیندار اخبار کے مدیر ہو گئے یہ اخبار مولانا کے والد نے نکالا تھا اور ان کے انتقال کے بعد ظاہر ہے کہ یہ انہیں ہی سنبھالنا تھا- چنانچہ مولانا زمیندار کا دفتر وزیر آباد سے لاہور لے آئے اور پھر اپنی شاعری اور ادب کے بل پر ہی نہیں بلکہ جرأت قلم اور سینہ زبان کے وہ جوہر دکھائے کہ زمیندار دنیائے صحافت کا آفتاب بن گیا مولانا عجیب قسم کے بذلہ سنج اور لطیفہ بیاں شاعر تھے ان کی صاف گوئی اور بے باکی آج تک سراہی جاتی ہے اسی جرأت اور ہمت کے باعث انہیں قید و بند کے مصائب بھی اٹھانا پڑے مگر ان کا یہ بانکپن اسی طرح رہا- مشکل قوافی اور شگفتہ ردیف کے لحاظ سے مولانا کا کلام آج بھی بے مثال ہے-

مولانا ظفر علی خان زبان و بیان کے اعتبار سے ملک بھر میں مشہور تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے اور حب الوطنی ان کے شعار میں داخل تھی- انہوں نے قادیانی فرقہ کی مخالفت میں بھی بہت کچھ لکھا اور کانگریس اور ہندو سبھا کی اصل تصویر کے لیے بھی کالم صرف کئے- مگر وہ کسی مقام پر بھی اپنے معیار سے نہیں گرے- ان کا نعتیہ کلام ان کے عقیدہ کا آئینہ دار ہے- ان کی نعتیں ہر چند کم ہیں مگر جو کچھ ہیں وہ مولانا کے دل کی ہوک معلوم ہوتی ہیں انہیں پڑھ کر پیغمبر کی عظمت آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور یہ ان کا سب سے بڑا کمال ہے- عقیدہ اور احساس کو الفاظ دینا انہی کا کام تھا آج بھی شاعری ایسے شاعروں کی جستجو میں ہے-

سراج الدین ظفر

سراج الدین ظفر صاحب میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں اور جہلم کے قدیم معزز اور مقتدر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد کچھ روز انہوں نے وکالت کی لیکن چونکہ طبیعت لطیف اور حق پسند تھی اس لیے اس میں زیادہ دن نہ گزار سکے اور ہوائی فوج میں افسر ہو گئے وہاں سے آ کر وہ کتابوں کی تجارت کی طرف رجوع ہو گئے۔ آج کل کراچی میں فیروز سنز کی ایک شاخ کے انچارج ہیں۔

اول تو ظفر صاحب کو شروع ہی سے علمی ادبی ماحول ملا تھا اور شعر و ادب ان کا ورثہ تھا۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ڈاکٹر عبدالوحید ڈائریکٹر فیروز سنز کے برادر نسبتی ہو گئے اور ظاہر ہے کہ وہ ہمارے ملک کا مشہور ادارہ ہے جب سے ظفر صاحب کراچی میں گئے ہیں ان کا رنگ شعر اور ہی کچھ ہو گیا۔

ظفر صاحب روائتی استادی شاگردی کے قائل نہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی اپج سے کہتے ہیں ان کا ذوق سلیم ان کو اس مقام پر لے گیا ہے کہ وہ اپنے رنگ میں یکتا و تنہا نظر آتے ہیں۔

جناب ظفر موجودہ دور کی اشاریت اور ایمائیت کے سیلاب میں نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنا ایک الگ جادہ تراشا ہے اور اس میں ایسی مہارت پیدا کر لی ہے کہ ان کا ہر نقش قلم نقش کالجر دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ نظم، غزل، گیت، رباعی، مثنوی اور قطعہ وغیرہ تمام اصناف پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ جس صنف پر بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کی پختگی اور مہارت ہر مقام پر انہیں منوا لیتی ہے۔ اس کا ثبوت ان کا مجموعہ زمزمہ حیات ہے جس میں بہت سے لافانی نقوش ہیں۔

ظفر صاحب اپنے موجودہ کلام میں جو احکام تراشی کرتے ہیں وہ بلاشبہ معراج کمال پر ہے۔ الفاظ برجستہ اور برمحل استعارات و تشبیہات کا استعمال نایاب اور معنوی اعتبار سے ان کا ہر شعر ان کی انفرادیت کا ضامن ہوتا ہے۔ ہر چند انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ وہ غزل گو شاعر ہیں اور اردو غزلیات میں اگر کیف و سرور کے علاوہ وجدان کو بھی کوئی مقام دیا جا سکتا ہے تو انہیں اس دور کا حافظ و خیام کہہ دینا مبالغہ نہ ہو گا۔

ظفر اقبال

ظفر اقبال صاحب جدید دور کے جدید شاعر ہیں -ان کی شاعری میرے پیمانہ نظر میں اس دور کے بہت سے معروف شعراء سے زیادہ قد آور ہے- ہیت کے اعتبار سے ماضی کی پٹڑی سے نہیں اترتے اور یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کے جدید انداز بیان میں بھی ایک ایسی شگفتگی ہے جو صحیح معنی میں جدید طرز کہلانے کی مستحق ہے-

جناب ظفر اقبال تو وکالت کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں کہیں بھی اس پیشہ کا سایہ نہیں پڑا اپنی شعری تخلیقات میں وہ شاعر اور محض شاعر معلوم ہوتے ہیں -ظفر اقبال تبدیلی ہیئت یعنی اس ادبی آواگون کے چکر میں نہیں پڑے- کیونکہ ہیئت میں بعض نہیں اکثر شعراء کی غنائی قوتوں کا خون ہو جاتا ہے- اور روح شعر کی اسی ناتوانی سے مفہوم کا گلہ بھی رندھ جاتا ہے-

دور جدید کی معیاری غزل جو ظفر اقبال کے یہاں ملتی ہے وہ خال خال ہی دکھائی دیتی ہے- ان کی عمیق نظر زندگی اور حسن زندگی کے ان گوشوں پر پڑتی ہے جنہیں اب تک ادبی دنیا نے کوئی نام نہیں دیا وہ زندگی کو اس زاویہ سے دیکھتے ہیں جہاں پر عام شاعر کی نظر نہیں جاتی جن ناہموار گوشوں سے فلسفی اور نفسیات کے ماہر عاجزانہ گزر جاتے ہیں ظفر اقبال صاحب اسی درد تہ جام سے اپنی شاعری کا مواد اخذ کرتے ہیں- اگر یہ اسی ڈگر پر چلتے رہے تو ان کی شاعری نہ صرف ادب کے لیے سرمایہ ہوگی بلکہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی شاعری کے مقابلہ میں ترجیحی مقام پائے گی- ان کا ایک مجموعہ کلام ''آب رواں'' کے نام سے چھپ چکا ہے- جو ان کے مستقبل کا لقب ہے- خدا انہیں عمر دراز عطا فرمائے اور صحیح راستے پر چلائے- آمین-

ظہیر کاشمیری

اردو شعراء میں ظہیر کی شخصیت گمنام نہیں ہے وہ بڑا منجھا ہوا شعر کہتے ہیں- ان کی نظر قدیم و جدید دونوں پر ہے ان کے یہاں ہیئت کے اعتبار سے قدیم سانچے مستعمل ہیں- لیکن خیالات کے لحاظ سے وہ ترقی پسندی کی طرف مائل ہی نہیں ترقی پسند ہیں- جہاں تک ادب کے مطالعہ کا تعلق ہے- ہمارے شاعروں کے طبقے میں ایسے کم لوگ ہیں- اصناف سخن میں ظہیر صاحب نظم اور غزل

دونوں پر غالب ہیں اور بے تکلف کہتے ہیں لیکن جہاں ان کی رندانہ آزادی قلم سے نکل کر گفتگو میں آجاتی ہے۔تو ان کے سراپا سے پردے اٹھنے لگتے ہیں اس وقت وہ ظہیر کشمیری کی ادبی عظمت اور ناقدانہ سنجیدگی کے لیے باعث ننگ ہوتے ہیں اور ان کے دیکھنے سننے والے اپنے اندازوں پر ہاتھ ملنے لگتے ہیں۔لیکن یہ فروعی باتیں ہیں شاعر اور ناقد کی عظمت اس کا کام ہوتا ہے اور اس کا قلم اس کی خصوصیات کا مصور۔

ظریف جبل پوری

جناب ظریف جبل پوری یوں تو مزاح نگار شاعر تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے شریف اور خوش ذوق لوگ کم ہوتے ہیں۔ جناب ظریف مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اصلاح کی طرف مڑ گئے تھے ان کی آخری نظموں سے ان کے اسلامی وطنی اور قومی جذبہ کا آبشار پھوٹتا معلوم ہوتا ہے افسوس کہ ظریف کے بعد ہمارے ادب میں اچھے مزاح نگار اور طنز گو کا بڑا گہرا خلا نظر آنے لگا ہے۔ جناب ظریف جہاں اچھے اور خوش گو شاعر تھے وہیں وہ شریف انسان اور دوست بھی تھے۔

ظفر زبیری

جناب زبیری طالب علمی کے زمانے سے میرے دوست تھے۔وہ خوبصورت وجیہ اور ادبی ذوق رکھنے والے نوجوانوں میں اپنی طرز کے ایک آدمی تھے۔ہاکی کا انہیں جنون تھا ایک بار ان کے گھٹنے میں گیند لگی اور اس وقت وہ اس کی پرواہ کیے بغیر کھیلتے رہے لیکن پھر تکلیف بڑھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ٹانگ کٹی اور وہ معذور ہو کر بیٹھ گئے۔اس معذوری سے ان کے زندگی بھر کے منصوبے تباہ ہو گئے۔وہ اپنے دیہات میں بیٹھ کر بھی زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن چونکہ تنہائی کا احساس معذوری کو اور بھی جان لیوا کر رہا تھا اس لیے انہوں نے لاہور ہی میں موچی دروازے کے باہر ''منزل'' کے نام سے ایک ہوٹل کھول لیا تھا اور ہر ہفتہ ایک مشاعرہ کراتے تھے جس میں ان کے معمولی اخراجات نہیں آتے تھے مگر خدمت اردو کی جہاں تک ممکن تھی انہوں نے کی۔ظفر زبیری شگفتہ اور برجستہ شعر کہتے تھے۔لیکن زندگی نے ان کا زیادہ ساتھ نہ دیا اور وہ عالم شباب ہی میں راہی عدم ہو گئے۔

ظریف لکھنوی

جناب ظریف حضرت صفی لکھنوی کے بھائی تھے اور طنز و مزاح میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنا جواب خود ہیں شاعری کے علاوہ بھی وہ بڑی معلومات رکھتے تھے زبان اور اس کے طول و عرض پر ان کی گہری نظر تھی اور صفی صاحب کی طرح اخلاقی اعتبار سے بھی وہ سرتاپا خلوص و محبت تھے۔ ان کا دیوان ''دیوانجی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور اس میں ان کا کلام خود ان کا مقام متعین کرتا ہے۔

ظفر ادیب

بھیم سین نام ظفر تخلص اور اب ظفر ادیب کے نام سے متعارف ہیں۔ یہ ملتان کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک نے انہیں دلی پہنچا دیا۔ اور وہاں ایک مختصر سے چوبارہ میں اہل و عیال سمیت زندگی کے دن گزار رہے ہیں حالانکہ وہ ملتان اور ''نواں کوٹ لاہور'' میں اپنی عالیشان بلڈنگیں چھوڑ کر گئے ہیں ان کا شعری مجموعہ ''جوبار'' کے نام سے تقسیم سے پہلے ہی چھپ چکا تھا دلی میں ظفر کی پریشان حالی نے انہیں شعر کی طرف کم رجوع کیا۔ حکومت کی بے پروائی سے ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ شعر کی طرف کم اور تنقید کی طرف زیادہ جھک گئے میں ان کے اس تغیر کو اچھی نظر سے دیکھتا ہوں کیونکہ آج جعلی شاعر اس قدر ہو گئے ہیں کہ کہیں بھی صحیح شاعری کی جانچ پرکھ کے لیے کوئی آدمی نظر میں نہیں آتا تنقید و تحقیق میں ظفر ادیب کا اچھا خاصا مطالعہ ہے اور مطالعہ سے زیادہ ان کی اپج قیمت رکھتی ہے۔ شاعری میں بھی وہ اپنے خیالات اور نظریات کچھ جدا رکھتے ہیں۔ وہ اس جدید طرز خیال و اسلوب نگارش کے قائل نہیں اور اس بات میں ایک قسم کی صداقت بھی ہے آخر شاعر اس قدر دبو اور بزدل کیوں ہو کہ بات صاف کہنے کی بجائے اسے بجھاوت کا انداز دے دے میرے خیال سے تو جو صاف بات نہیں کہتے یا نہیں کہہ سکتے وہ ابہام میں بات کرتے ہیں اور یہ کوئی ایسی صنف نگارش نہیں جو مقبول عوام ہو سکے اس میں کیا شک ہے کہ محذوفات شعر کا حسن بن جاتے ہیں کیونکہ وہ ایک جہاں معنی کو ایک اشارے میں پنہاں رکھتے ہیں۔ لیکن ابہام جہاں کثیف و غلیظ ہو جاتا ہے وہاں مافی الضمیر کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ جناب ظفر صاف، نکھرا اور ستھرا کہنے کے حق میں ہیں اور احساسات کے ان گوشوں سے بولتے ہیں جہاں عامیانہ نظر رک کر دیکھتی ہے۔

نثر میں ان کا انداز مجھے پسند ہے کیونکہ وہ تحقیق میں تنقید کی چاشنی اور تنقید میں تحقیق کا قوام شامل کر دیتے ہیں جو بہت کم لوگوں کے یہاں دستیاب ہوتا ہے۔

مظفر علی ظفر

نام مظفر علی ظفر تخلص آباؤ اجداد کبھی ہندوستان سے باہر سے آئے تھے اور ملتان کو وطن قرار دے لیا تھا۔ اب جناب ظفر جھنگ میں ہیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی ہے۔
یہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور گیت بھی جن میں روانی بھی ہوتی ہے اور نغمگی بھی ان کے گیت اوردو ہے ہندی کے اسلوب نگارش سے مشتق ہیں اور ظاہر ہے کہ حسن و عشق کے بیان کے لیے جو لوچ اور لچک ہندی میں ہے دوسری زبانوں میں ذرا کم دستیاب ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے ظفر صاحب نے جھنگ کے ریگزاروں کی خشکی کو ہندی کے پرترنم رس سے معتدل کیا ہے۔

ظفر اکبر آبادی

جناب ظفر اکبر آبادی زبان و بیان پر حاوی ہیں غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں مگر زیادہ ان کی غزلیں ہی موثر ہوتی ہیں۔ جوان ہیں اس لیے ترقی کے بہت سے مواقع ان کے منتظر ہیں۔ اصطلاحات و محاورات پر بھی انہیں اچھا عبور ہے اور ان کے استعمال کا سلیقہ بھی جانتے ہیں غالباً ابھی کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا۔

ظفر واسطی

جناب ظفر واسطی صاحب ڈاکخانہ میں پوسٹ ماسٹر ہیں۔ قدیم غزل کے دلدادہ ہیں لیکن ملازمت کی مصروفیت میں نہ تو ادبی حلقوں میں شریک ہوتے ہیں اور نہ رسالوں کے دفتر اور اخباروں کے برآمدوں کی دقت برداشت کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں کم لوگ جانتے ہیں کبھی کبھی نجی نشستوں میں ظفر صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کے جوہر کھلتے ہیں اور پروپیگنڈے کی قوتوں کا یقین محنت سے بلند و بالا معلوم ہونے لگتا ہے ظفر صاحب کے پاس ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن ابھی طبع نہیں ہوا۔

ظفر سہانپوری

جناب ظفر سہار نپور کے رہنے والے ہیں لیکن ایک عرصہ لاہور میں ہو گیا شاعری میں اچھی مہارت ہے بلکہ اپنے تلامذہ کا حلقہ بھی رکھتے ہیں- قدیم روائتی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اردو زبان کی توسیع واشاعت ان کا محبوب مشغلہ ہے-

ظفر بریلوی

مرزا راحت علی بیگ ظفر کے والد جناب ولایت علی بیگ نگار بریلوی اچھے نعت گو تھے ظاہر ہے کہ شاعری کا ذوق گھر سے ہی پیدا ہوا ہو گا-

۱۹۴۸ء میں یہ پاکستان آئے اور اس وقت سے غالب رسول صاحب کے یہاں کارندہ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں مشاعروں میں ان کا کلام سنا ہے قدیم روش کے انسان ہیں اور روایتی شاعری کرتے ہیں- حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں اس لیے انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں-

طویل عرصہ سے ایک شعراٴ کا تذکرہ مرتب کر رہے ہیں اور جب دیکھیے اسی کی ادھیڑ بن میں لگے نظر آتے ہیں- جناب ظفر کسی بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی میں ڈرامہ نویس بھی رہے ہیں اور بیس بائیس سال کام کیا ہے ان کے ڈرامے شائع بھی ہو چکے ہیں مگر شاعری کا ابھی کوئی دیوان نہیں چھپا مگر ڈرامہ اور دیوان سے زیادہ اہم کام اس تذکرہ کا ہے خدا کامیاب کرے- آمین- ان کا مجموعہ کلام ''خم کدہ'' کے نام سے زیر ترتیب ہے-

مفتاح الدین ظفر

مفتاح الدین ظفر صاحب سیدھے سادے مسلمان ہیں تعلیم و تربیت کے شعبہ میں ان کا مطالعہ معمولی نہیں انہوں نے فلسفہ تعلیم پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو ماضی کی چیز ضرور ہے لیکن اس میں ایسے اشارات ملتے ہیں کہ اگر کام کو آگے بڑھایا جائے تو نئی نئی راہیں نکل سکتی ہیں اور تعلیم صحیح معنی میں تعلیم کہلائی جا سکتی ہے- شاید دفتری مصروفیات نے انہیں اس رخ پر سوچنے اور لکھنے کا وقت نہیں دیا ورنہ ان کی صلاحیتیں گونگی نہیں ہیں-

ظہیر احمد بدایونی

ظہیر احمد صاحب بھی بدایوں کے نوجوان ادیب ہیں- ان کا پیشہ بھی تقسیم علم ہے اور اکثر ذہین اور طباع لوگوں کا یہی رجحان دیکھا گیا ہے- وہ دنیا کے دوسرے جھمیلوں کو قبول نہیں کرتے اور انہیں کسی علمی جمع و تقسیم میں لطف آتا ہے- ظہیر احمد صاحب کی تصنیف و تالیف وغیرہ میں کئی کتابیں ہیں جن سے ان کی تحقیق و تدقیق اور اسلوب نگارش کے افسوں پر روشنی پڑتی ہیں وہ ابھی نوجوان ہیں مگر ان میں بلندی کے آثار کی عجلت نمایاں ہے- وہ دن قریب ہے کہ وہ اردو کے بلند پایہ مصنفین میں شمار ہوں گے-

یوسف ظفر

جناب محمد یوسف ظفر میرے بڑے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں اور چونکہ ان کا ابتدائی زمانہ مجھ سے بہت قریب ہو کر گزرا ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک فطری شاعر ہیں لیکن ان کے ابتدائی حادثات نے انہیں زندگی کے ایسے ایسے راستوں سے گزرنے پر مجبور کر دیا جو شاعری کا لازمہ ہیں-

بی اے کرنے کے بعد انہیں بے روزگاری میں وہی مشکلات پیش آئیں جو پریشان روزگار لوگوں کا سرمایہ ہوتی ہیں لیکن چونکہ ظفر میں قدرت نے شعر کا ملکہ ودیعت کیا تھا اس لیے یہ پریشانیاں ان کے لیے ادبی زندگی کا سامان بن گئیں اس اثناء میں ظفر صاحب نے ملک کے جو موقر جرائد میں کام کیا اور پھر محکمہ انہار سے وابستہ ہو گئے لیکن انہیں ان کی متلون طبیعت نے کہیں نہ ٹھہرنے دیا آخر جب جوانی کی دھوپ ڈھلی اور گرد و پیش کے مناظر سنولائے ہوئے نظر آنے لگے تو وہ ریڈیو کے محکمہ سے وابستہ ہو گئے اور ابھی تک وہیں ہیں- وہ پہلے بھی شاعر تھے اور آج بھی شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں ان کے وہی ماضی کے تلخ تجربات رنگ آمیزی کرتے ہیں-

یوسف ظفر کی پہلے پہلے تمام تر توجہ منظر نگاری پر رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ قدیم رنگ غزل سے جدید غزل پر آ گئے اور اب اپنے معاصرین میں ایک مقام کے مالک ہیں- ان کے کلام کے دو مجموعے ''زنداں'' اور ''زہر خند'' شائع ہو چکے ہیں-

ظفر کے یہاں جدید طرز روش کی ایمائیت اور اشاریت بھی ہے جس میں ابہام ضروری جزو ہے لیکن یہ ابہام جہاں مفہوم میں گنجلک پیدا کر دیتا ہے وہاں شعر گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ظفر کے یہاں ایسا ابہام نہیں جو اپنے مفہوم سے دور نکل جاتا ہو یہ الگ بات ہے کہ پڑھنے والا فکر کی ان راہوں سے آشنا نہ ہو جو شاعر سے شعر کہلواتی ہیں۔ بعض اوقات شاعر بھی جب ایک صحرائے بسیط کو ذرات کے سینوں میں کھپانا چاہتا ہے وہاں خود بھی گڑبڑا جاتا ہے لیکن ایسے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور ان سے ظفر صاحب بھی خالی نہیں۔

ظہیر بابر

ظہیر بابر صاحب نہایت ذہین اور فطین نوجوان ہیں اور کیوں نہ ہو علم و ادب تو ان کی وراثت میں ہے۔ یہ مولانا غلام مرشد صاحب سابق امام بادشاہی مسجد شہر لاہور کے صاحبزادے ہیں اور جناب احمد ندیم قاسمی کے بھانجے ہیں۔ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ بابر صاحب بڑے سلیقہ کے صحافی ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ ایک زمانے سے "امروز" جیسے روزنامہ کو اپنے قلم کے بل پر مقبول کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اداریئے وقت کی آواز اور ماحول کے تقاضوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں سمجھنا یا نہ سمجھنا اس کی ذمہ داری پڑھنے والوں پر آتی ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں نوجوانوں کی قدر کرنی چاہئے جنہیں صحافت کا سلیقہ ہو۔

ظفر الاحسن لاری

جناب ظفر الاحسن گورکھ پور کے رہنے والے ہیں انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں جو جو کام کر دیئے ہیں وہ ہر حاکم کے بس کی بات نہیں تھی۔ تقسیم ملک کے وقت وہ ڈپٹی کمشنر لاہور تھے اس وقت مہاجرین کے سیلاب کو روکنا اور انہیں ٹھکانے سے بٹھانا انہیں کا کام تھا۔ اسی طرح تھل کے علاقے کی ترقی و تعمیر اور لاہور میں شاہ عالمی مارکیٹ کی تنظیم و تعمیر ان کے کارنامے ہیں اگرچہ اس دور میں اختر حسین، جی معین الدین، وزیر علی شیخ، ایس ایس جعفری وغیرہ یہ سب گھاگ قسم کے حاکم یہیں تھے لیکن ظفر الاحسن کا کام ان سب میں اہم اور دقت طلب تھا لیکن ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آئی۔ ہمارے ملک میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

ظہیر الحسن لاری

جناب ظہیر الحسن لاری سے پہلی ملاقات گورکھ پور میں ہوئی تھی اس کے بعد میں کئی بار گورکھ پور گیا اور ان سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ ایک اعلیٰ پائے کے مقنن ہیں جو زبان اور قلم دونوں کے اعتبار سے مضبوط اور قد آور ہیں عالمی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیتیں ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں تقسیم کے بعد کراچی آ گئے تھے لیکن شاید ایسے شخص کی موجودہ ماحول میں گنجائش دشوار ہے۔

لہور ناظم

بڑا ذہین اور فطین نوجوان ہے اور سراپا فنون لطیفہ کا دیوانہ جہاں وہ اچھا شاعر ہے وہیں وہ اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی ہے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں اس کے میدان ہیں اور دونوں میں اس کی طبیعت کی احتیاط اور احتیاط میں فنکارانہ اظہار بولتا ہے۔ اگر شکم پری اور بدن پوشی کی گرفتیں سخت نہ ہو گیں اور ماحول سازگار مل گیا تو بہت اچھا شاعر نکلے گا۔

احمد ظفر

احمد ظفر صاحب نئے شعراء میں ہیں راولپنڈی میں کتابوں کے تاجر ہیں یار باش قسم کے خوش مزاج اور خوش ذوق انسان ہیں مگر ان کے اشعار کی لطافت اور ان میں ایک ایسا فاصلہ ہے کہ ان سے نزدیک ہوئے بغیر مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ جہاں اچھے شاعر ہیں وہیں اچھے انسان بھی ہیں۔ لیکن اس رخ پر بھی وہ اپنی فطرت اور ظاہر داری میں بڑا میدان رکھتے ہیں۔ جو ہفتوں کی صحبت کے بعد کھلتا اور طے ہوتا ہے۔ وہ طنز گو اور لطیف طبع شاعر ہیں مگر ماحول کی چومکھی جنگ نے ان کی شخصیت پر پردے چھوڑے ہوئے ہیں۔ وہ مردانہ واری سے گردو پیش کا مقابلہ کرتے ہیں اور آج ایسے شعراء کی ضرورت ہے خدا کرے شاعری ان کی تاجرانہ ذہنیت سے بچتے بچتے زیادہ ہی دور نہ نکل جائے۔

قاضی عبدالودود صاحب

جناب قاضی عبدالودود صاحب سے کون واقف نہیں کہ وہ مشہور و معروف محقق ہیں اور ان کی تحقیق پہ آ کر ہر مضمون اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اجاگر کر دیتا ہے۔ اور سبھی محققین ان کی اس خصوصیت کے معترف ہیں وہ اپنی زندگی کے شب و روز اردو کی تحقیق پر صرف کر رہے ہیں ان کی ذات سے اردو زبان کا دامن قیمتی جواہر پاروں سے بھرتا جا رہا ہے۔ قاضی صاحب ایک عرصہ سے مصحفی پر کام کر رہے ہیں ان کا یہ کام جب سامنے آئے گا تو ریسرچ کا ایک شاہکار ہو گا۔

عبداللہ یوسف علی

عبداللہ یوسف علی صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل تھے وہ انگریزی ادب پر بڑی شخصیت کے مالک تھے انہوں نے قرآن پاک کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور پھر ان کے بعد کئی ترجمے ہوئے لیکن وہ ترجمہ اپنی جگہ ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب بڑے فاضل لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کی اسلامی اور تاریخی معلومات اس قدر اہم تھیں کہ جب وہ کوئی مسئلہ بیان کر کے حوالے دیتے تو بڑے بڑے علامہ الدہر ان کا منہ تکتے رہ جاتے تھے افسوس کہ لاہور والوں نے ان سے کوئی مفید کام نہ لیا۔

عندلیب شادانی

شادانی صاحب ہمارے ملک کے مشہور شاعر ہیں جہاں وہ ایک بلند پایہ شاعر ہیں وہیں وہ کہنہ مشق ادیب بھی ہیں۔ ان میں اپنے فن کے اظہار کا سلیقہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو بہت کم شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں میں قابل رشک دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں لطافت اور بصیرت گھ کر ان کے شعر کو رنگین کرتی ہیں۔ ان کی شعری اور نثری تصانیف سے کوئی لائبریری خالی نہیں جن میں وہ اپنی خصوصیات سمیت ملتے ہیں۔ عندلیب شادانی صاحب نہایت خوش ذوق اور دلچسپ انسان ہیں۔ ان کی معیت سے گھبراہٹ نہیں ہوتی ان کا ایک رخ عوامی زندگی بھی ہے آج کل ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے صدر شعبہ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ ڈی لٹ پہلے اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے اور اب انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ادارہ میں چیئر مین کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ اپنی تالیفات وتصنیفات میں اپنی تمام خصوصیات اور فطری رجحانات سمیت موجود ہیں اور صرف سید صاحب ہی نہیں ہر مصنف اپنی تحریروں میں اپنا تعارف کراتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کون سمجھتا ہے یا کب سمجھتا ہے سید عبداللہ صاحب ہمارے ملک کے مشہور مصنف محقق اور نقاد ہیں اور پھر خشک مزاج نہیں بلکہ صاحب ذوق اور خوش طبیعت انسان ہیں میں نے کبھی سید صاحب سے کوئی شعر نہیں سنا اور نہ کسی نے یقین دلایا کہ وہ شاعر ہیں اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت وسیع خلیج ہے۔

نصیر اللہ خاں عزیز

عزیز صاحب بہت تجربہ کار صحافی اور کہنہ مشق شاعر ہیں ایک عرصہ تک مدینہ بجنور کی ادارت کرتے رہے۔ پھر لاہور آ کر بھی مختلف اخبارات میں کام کیا اب اپنا اخبار چلا رہے ہیں۔ قدیم تہذیب وتمدن کے انسان ہیں اور زندگی کی وہی قدریں انہیں عزیز ہیں جن پر اسلام صاد کرتا ہے۔ اب تک اپنا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں اور ان کے ترنم میں اب تک ان کے دل کا گداز اپنا اعلان کرتا ہے۔ ان کے کلام میں ناہمواری اور ابتذال نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کا گنجینہ ہے۔ ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپ سکا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

عبادت یار خاں نام عبادت تخلص، وطن بریلی تھا اب لاہور کے اورینٹل کالج میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ عبادت صاحب کو عوام ایک مولف ایک مصنف ایک استاد اور ایک نقاد کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ عبادت صاحب شعر بھی کہتے ہیں اور نظم وغزل دونوں اصناف میں ملکہ ہے۔

ان کی نظموں میں جوانی کے جذبات اور حسن وعشق کے واردات نہایت معتدل انداز میں ملتے

ہیں- ان کا انداز بیاں الجھا ہوا نہیں بلکہ ایک مثالی طریق اظہار ہوتا ہے- ان کی ادبی اور تنقیدی کتابیں تو بہت ہیں لیکن ابھی کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا-

قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار صاحب مراد آباد کے رہنے والے تھے ان کے متعلق ادب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے- اس لیے میں ان کے لیے صرف یہ کہوں گا کہ ایسا صحیح ذوق رکھنے والا ادیب اور ترجمے کا ماہر بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے- ان کا قلم ان کے دماغ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اور ہر موقع پر ان کے سامنے الفاظ کے بازار لگے رہتے ہیں- ان کی دو کتابیں "لیلا کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" ملک بھر میں مشہور ہیں ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں ہیں اور وقیع ترجمے ہیں-

عاصی ضیائی

جناب عاصی ضیائی مرے کالج سیالکوٹ میں استاد ہیں اور ادب کے ہر گوشے پر ان کی گہری نظر ہے- وہ نظم و نثر دونوں اصناف ادب پر حاوی ہیں ان کی تخلیقات میں ایک تذکرہ ادب میں ایک مقام رکھتا ہے جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی وہ کسی طرح کم درجے کے شاعر نہیں- لیکن خاموش اور گوشہ نشین قسم کے شریف انسان ہیں- انہیں دیکھ کر قدیم تہذیب کی شرافت اور رواداری آنکھوں میں پھر جاتی ہے آج کل وہ مرثیہ پر کام کر رہے ہیں- میں نے اس مقالہ کا کچھ حصہ سنا ہے ان کا طریق فکر انوکھا اور انداز بیان اچھوتا ہے-

سید عابد علی عابد

لاہور کے رہنے والے ہیں وہ شباب میں لاہور کے مشہور رسالوں "دلکش" اور "ہزار داستاں" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے- افسانہ میں بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں اور شعر گوئی میں بھی ان کا رنگیں اور سلجھا ہوا انداز ہے-

۱۹۴۲ء میں وہ دیال سنگھ کالج میں آ گئے اور قیام پاکستان کے بعد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل ہو گئے لیکن کچھ عرصہ بعد بعض ناہمواریوں کے باعث تنازعات بڑھے اور اس میں انہیں پرنسپل کے

عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ سید عابد علی عابد صحیح معنوں میں استاد ہیں۔ اس لیے نہیں جیسے کہ کالج کے طلباء میں لیکچرار استاد کا مقام پا جاتے ہیں بلکہ ان کی معلومات اور مطالعہ اس قدر وسیع ہے کہ ان سے گفتگو کر کے خوشی ہوتی ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی وہ گم راہ نہیں نہ کج راہ وہ چونکہ فنون لطیفہ پر بھی اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں۔ اس لیے اپنی شاعری میں بھی ان اصطلاحات کو بڑی خوش سلیقگی سے استعمال کرتے ہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ سید عابد علی عابد کے قریب تمام ہم عصر غنائی اسکول سے وابستہ ہیں ان کے کلام میں غزلیں ہی نہیں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں جن سے ان کی وہی بادہ و شباب کی مخصوص کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل کو بڑی ہی سجا کر پیش کرتے ہیں زبان صاف شستہ و رفتہ اور انداز بیان غنائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔

عابد صاحب میں منہ زور شباب کی بعض خامیاں ایسی پختہ ہوگئی ہیں کہ انہوں نے ان کے آخری دور کو ان کے معیار سے گرا دیا۔ کاش وہ دوست دشمن کو پہچان سکتے اور غلط روی کو غلط روی سمجھتے انہیں دیکھ کر میں کڑھتا ہوں کہ جوانی کی بعض کجراہیوں نے کیسا اچھا انسان بلند پایہ شاعر اور ادیب شہیر ہم سے چھین لیا ہے۔ میں نے ایک بار رائٹرز گلڈ میں ان کے وظیفے کی تجویز پیش کی لیکن انہیں کے ایک مقرب نے مخالفت کی اور میں خاموش ہوگیا۔ میں آج بھی ان کا ہمدرد ہوں اور چاہتا ہوں کہ ادباء و شعراء کی بعض خامیوں کو نظر انداز کر کے انہیں کم از کم معاش سے بے نیاز کرا دینا چاہئے اس طرح یہ لوگ ملک اور قوم کے لیے مفید کام کر سکتے ہیں۔

علی محمد راشدی

جناب راشدی لاہور میں پڑھتے تھے اس وقت وہ اچھا خاصا شعر کہتے تھے اور نثر بھی ان کی معمولی نہیں تھی لیکن نہ معلوم اب کے ادبی ذوق کا کیا حال ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً لوگ سیاست اور حکومت میں جا کر اس دنیا سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ علی محمد راشدی صاحب ایک خاندانی انسان ہیں۔ ان کے یہاں ادب پروری تو اب تک چلی آ رہی ہے لیکن ادب آفرینی کا پتہ نہیں چلتا۔ اب کچھ دنوں سے وہ اس کمی کو بھی پورا کر رہے ہیں۔ ان کے مضمون بصیرت افروز ہوتے ہیں اور عوام

وخواص کے لیے دلچسپ۔

عظیم مرتضیٰ

جناب عظیم مرتضیٰ حکومت کے کسی ادارہ میں ذمہ دار منصب پر ہیں شعر نہایت صاف ستھرا اور نچا تلا کہتے ہیں۔ چونکہ تعلیم یافتہ ہیں اس لیے ادب کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہے وہ نئے دور سے گزر رہے ہیں اور کچھ جھلکیاں ان میں موجود ہیں۔ لیکن وہ معتدل مزاج کے انسان ہیں اس لیے پرانی ہیئت سے وہ گریزاں نہیں ہیں مگر انداز بیان اچھوتا اور خوبصورت ہے اور میں اسے ہی ترقی خیال کرتا ہوں۔

سید احمد مسعود عاصم گیلانی

اناوہ کے رہنے والے ہیں نوجوان ہیں اور بڑا جیتا جاگتا شعر کہتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ان کے جوان جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ میں ان میں بڑی صلاحیتیں دیکھ رہا ہوں وہ اگر سنبھل کر چلے تو ان کا مستقبل ابھی سے ان کی ذمہ داری پر آمادہ نظر آتا ہے۔

عزیز الرحمٰن عزیز لدھیانوی

جناب شرقی چاندپوری کے شاگرد ہیں اور ''نوائے گوجرانوالہ'' کے ایڈیٹر ہیں میں گوجرانوالہ میں ان سے ملا ہوں۔ جناب شرقی کا تمام مجموعہ کلام ان کے پاس محفوظ ہے۔ اگر وہ اسے چھپوا دیں گے تو ادب میں ایک صحت مند اضافہ ہوگا۔ عزیز الرحمٰن خود بھی شاعر ہیں میں نے ان سے زیادہ کلام نہیں سنا بہر نوع وہ ایک اچھے شاعر کے تربیت یافتہ ہیں اور پھر نوجوان ہیں اور ان کے سامنے زندگی کا بڑا امیدان ہے۔

عابد گلریز

تقسیم سے پہلے ہی لاہور سے بمبئی چلے گئے تھے اور کسی فلمی ادارہ سے منسلک ہو گئے تھے پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کیا بیتی جب تک وہ لاہور میں رہے اس وقت تک مشاعروں میں حصہ لیتے رہے اور جو غزلیں ان سے سنیں وہ ایسی نہیں تھیں کہ جن کا شاعر فراموش کر دیا جائے۔

محمد منیر عرشی کرتپوری

گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں لکچرر ہیں جناب عرشی نے ذوق شعری ورثہ میں پایا ہے اور بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان کا پیشہ معلمی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کا ذوق فطری ہے اور اس پر ان کا مطالعہ اور مشاہدہ سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا ہے۔ ان کی زبان تپا ہوا سونا ہے اور آرائش بیان میں وہ بڑے بلند ذوق شاعر ہیں ابھی مجموعہ کوئی نہیں چھپا۔

خواجہ محمد عادل صاحب

قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے کہنہ مشق اور فاضل قسم کے بزرگوں میں تھے نہایت پرگو اور قدیم رنگ کے دلدادہ مگر شاعرانہ راہ میں بڑے خوش ذوق اور علم نواز کی دو بیاضیں میں نے خود دیکھی تھیں نہ معلوم ان کی وفات کے بعد اس ذخیرہ کا کیا انجام ہوا۔

عبد الصمد انصاری

انصاری صاحب مراد آباد کے رہنے والے ہیں علی گڑھ سے ایم ایس سی کیا اور وہیں لیکچرار ہو گئے۔ پھر ۱۵ء میں سپریر سروسز آف پاکستان میں آگئے اور آج کل ڈپٹی آڈیٹر جنرل (ریلویز) ہیں نظم اور غزل دونوں میں ان کا ایک الگ رنگ ہے۔ جو قدیم سے جدا اور جدید ابہامی روش سے بچا ہوا۔ ان کی شاعری بامقصد شاعری ہے اور نثر میں بھی ان کا ایک خاص انداز تحریر ہے جو بڑی کدو کاوش کا غماز ہے۔ ان کا جسم افسرانہ اور روح مسلمان ہے۔ نوجوان ہیں اور انسانیت کی اقدار کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

نور حسین عزیز

نور حسین عزیز وریال کلاں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے گجرات پنجاب میں تعلیم پائی اور آج کل بسلسلہ ملازمت ایک پرائیویٹ ادارہ میں معزز عہدہ پر فائز ہیں۔ نوجوان ہیں اور ان میں بڑی صلاحیتیں بولتی ہیں۔ غزل اور نظم دونوں یکساں کہتے ہیں اور اسلوب و بیان صحت مندانہ ہے لیکن ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا امید ہے کہ یہ وقت اور عمر کے ساتھ ادب میں اضافے کریں گے۔

جمیل الدین عالی

میں مرزا جمیل الدین احمد عالی کو عرصہ سے جانتا ہوں اور انہیں سے نہیں بلکہ ان کی خاندانی عظمتوں سے بھی آشنا ہوں وہ اپنی اردو زبان کی خدمت کے اعتبار سے آج کا معروف نہیں۔ تاریخ ادب کے وسطی دور کا شباب اسی خاندان کے کارناموں سے سجا ہوا ہے اور ایک باب تاریخ ہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی میں چلے آئے اور کچھ روز کی تلاش و تجسس کے بعد افسر انکم ٹیکس کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ پاکستان میں جب رائٹر گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس میں انہیں ایک وقیع مقام کے لیے انتخاب کر لیا گیا۔

میں دہلی سے لے کر کراچی کی آمد تک انہیں غزل کا شاعر دیکھتا رہا اور انہوں نے قابل تحسین غزلیں کہیں۔ لیکن اچانک ان کا مجموعہ نظر سے گزرا غزلیں دوہے گیت مجھے حیرت ہوئی کہ چپکے چپکے عالی کو یہ مہارت کیسے ہو گئی کہ کیف و سرور کے اظہار میں کہیں کہیں ان کے دوہے غزل سے بھی زیادہ گہرا زخم لگاتے ہیں۔

عالی کے کالم میں زبان کے چٹخارے کے ساتھ گہرا اشارہ اور رنگینیاں ایسی گتھی ہوئی ہیں کہ لطف کو دوبالا کر دیتی ہیں ورنہ عموماً کلام کا عمق بعض اوقات مفہوم تک پہنچنے میں سد راہ ہو جاتا ہے۔

دوہوں میں ان کا نرم لہجہ اور الفاظ کا لوچ ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے بہت نزدیک کر دیتا ہے۔ بہاری اپنے کلام میں مقامی رنگ کے ایسے ایسے نشتر چھپائے رکھتا ہے جن کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ ان کے نثری ادب پارے مختلف جرائد میں چھپتے رہتے ہیں کبھی ان کا مجموعہ بھی ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تو شاعر ہیں اور جذبات نگاری کے علاوہ شباب کی کیفیات کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور یہی شاعری کا پہلوان کا طرہ امتیاز ہے۔

عبدالباری آسی

میں جب لکھنؤ گیا اس وقت آسی صاحب اساتذہ میں شمار ہوتے تھے وہ یوں تو الدن ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ نول کشور پریس میں گزرا تھا۔ بیسیوں کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں اور نہ جانے کس قدر کتابوں کے دیباچے اور حاشیے لکھے ہیں۔ ''معرکہ سخن'' بھی

انہیں کی کتاب ہے جو قابل مطالعہ ہے۔مشاعرہ میں جب انہوں نے مجھے سنا اسی دن سے وہ مجھ پر بڑی شفقت فرمانے لگے تھے۔میرے لیے وہ کئی لوگوں سے جھگڑے ہیں اور اپنے کئی شاگردوں کو ڈانٹا ہے نول کشور پریس میں رہتے رہتے ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کیجیے شافی جواب ملے گا۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام ابھی تک نہیں چھپ سکا ہاں رباعیات کا ایک مجموعہ چھپا ہے۔

عبدالمالک آروی

جناب عبدالمالک آروی ایک بار لاہور تشریف لائے تو غریب خانہ پر ہی قیام رہا اس دوران ان سے سیکڑوں موضوعات پر گفتگو رہی اور ہر نشست میں یہی محسوس ہوا کہ علمی اور معلوماتی طور پر کچھ نہ کچھ ملا ہے۔جناب نیاز فتح پوری نے اپنا رسالہ نگار صرف دو آدمیوں کے سپرد کیا تھا۔ان میں پہلے عبدالمالک آروی ہیں۔دوسرے مسعود جاوید' جناب عبدالمالک آروی عالم بھی تھے ادیب بھی' مورخ بھی تھے اور محقق بھی لیکن وہ معاشی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ڈاکٹر سید محمود کی توجہ سے ان کی دو کتابیں چھپی ہیں ایک ''مقام محمود'' دوسری ''مضامین مالک'' دونوں معلوماتی لٹریچر سے مالا مال ہیں۔

عشرت رحمانی

عشرت رحمانی صاحب بڑے پرانے ادیب اور صحافی ہیں۔ان کی زندگی ریڈیو کے ادارہ میں گزری وہاں تو خیر تعمیری لٹریچر کی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عشرت ریٹائر ہوئے ہیں تو اب تصنیف و تالیف کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔جبکہ ان کے محکمے نے انہیں چوس کر چھلکوں کی نوکری میں پھینک دیا ہے۔چنانچہ عشرت رحمانی صاحب نے ریڈیو سے فراغت پا کر قلم اٹھایا ہے اور ان کے قلم سے کئی کتابیں نکلی ہیں۔جو ادب میں قابل ذکر ہیں خدا انہیں زندگی دے اگر وہ ریڈیو کے مشاہدات بھی لکھ جائیں تو بڑا کام کر جائیں گے۔

ہیں۔

علی جواد زیدی

علی جواد زیدی سے دہلی میں ملاقات ہوئی اور اس کے بعد کئی ایک مشاعروں میں ان کی نظمیں غزلیں سنیں، ان کا مجموعہ کلام بھی میری نظر سے گزرا ہے جو شاعری کے سب وقت کے تقاضوں کو اجاگر کرتا ہے اور یہی شاعری صحیح شاعری ہے علی جواد صاحب نثر میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کا سیدھا سادا مضمون بھی ادب اردو کی تاریخ کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آتا ہے۔ وہ یوں تو ترقی پسند ادیبوں کے حصہ کے آدمی ہیں لیکن انہوں نے شاعری کے قدیم اوزان و بحور میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ نہیں کی وہ سلامت روی سے چل رہے ہیں اور مقبول عوام ہیں۔

عبدالرحمٰن اصلاحی

جناب عبدالرحمٰن اصلاحی لاہور میں میرے ہمراہ رہتے تھے وہ عربی کے فاضل اور اردو کے بہت اچھے ادیب ہیں آج کل وہ بمبئی میں ہیں اور صحافت و تصانیف میں ان کا نام پڑھنے میں آتا رہتا ہے۔ دہلی سے جناب ظفر نے ایک کتاب ''مومن'' کے نام سے شائع کی ہے جس پر عبدالرحمٰن اصلاحی اور راقم الحروف کا نام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اصلاحی صاحب ہی کی ہے۔ کچھ معاونت اور مواد انہیں ضرور میری لائبریری سے ملا تھا لیکن اس کے لیے میرا نام مولف کی حیثیت سے آنا میرے خیال سے درست نہیں۔

عبدالوحید صاحب

نہایت اچھے ادیب اور مورخ ہیں وہ ملاقات میں کم اور اپنی تصنیف میں بہت بلند انسان معلوم ہوتے ہیں۔۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چند ساعت کی ملاقات میں انسان ایک اجنبی کے سامنے سینے میں کہاں تک اپنا خلوص انڈیلے گا؟ یہ ان کی تاریخ آگاہی اور سیاسی بصیرت تھی جو انہیں وزارت کی کرسی تک لے گئی لیکن چونکہ وہ ادیب بھی تھے اور مصنف بھی اور ہر فنکار زیادہ دیر اپنی فطرت سے گریز نہیں کر سکتا اس لیے اب وہ پھر ادیب اور مورخ ہیں وزیر نہیں۔

عرش ملسیانی

عرش ملسیانی ایک مسلم الثبوت استاد جناب جوش ملسیانی کے فرزند ارجمند ہیں' باپ کی طرح بیٹے کو بھی قدرت نے اپنے انعامات سے نوازا ہے جیسی طبیعت نرم پائی ہے ویسی ہی شاعری بھی بجی سنوری عطا فرمائی ہے- تعلیم بھی اعلیٰ ہے اور تربیت بھی اعلیٰ' تو ظاہر ہے کہ جناب عرش کس پایہ کے شاعر ہوں گے جہاں ان کے اشعار اخلاقی معیار پر پورے اترتے ہیں وہیں وہ دیگر شعراء کی طرح بادہ پرست و آوارگی پرست شاعر نہیں ہیں-

وہ ایک بلند سوسائٹی کے انسان ہیں اور بلند کردار رکھتے ہیں- ان کے اشعار میں کوئی الجھنیں اور ابہام نہیں ہوتا- کیونکہ خود حضرت جوش کے یہاں الجھنیں اور ابہام نہیں ہے- عرش ملسیانیؔ کے یہاں فنی بلندیاں بھی ہیں اور تجرباتی اور مشاہداتی لٹریچر بھی- وہ کسی مقام پر بھی فن کا دامن نہیں چھوڑتے اور اخلاقی قدریں ان کے پیش نظر رہتی ہیں اور ایسی ہی شاعری تاریخ میں بلند مقام پاتی ہے جہاں وہ شکل وصورت سے موقر' مدبر اور پر جلال انسان معلوم ہوتے ہیں دوستوں میں وہ اسی قدر میٹھے اور پر مذاق انسان ہیں ان کی محبت سے انسان کبھی اکتا نہیں سکتا وہ نہایت شگفتہ مزاج انسان واقع ہوئے ہیں-

عقیل روبی

بہاول پور میں لیکچرار ہیں- شاعری کا جذبہ تو فطری ہوتا ہے لیکن تجربات اور مشاہدات اس کی ریڑھ کی ہڈی سے کم نہیں ہوتے یہی سبب ہے کہ عموماً مصائب زدہ لوگوں کے یہاں زبان وبیان میں خود بخود تاثر آجاتا ہے- عقیل روبی کی اوائل عمری نے بلوغ تک ایسے ایسے مراحل طے کئے ہیں کہ اگر ان میں شاعری کا مریل قسم کا جذبہ بھی ہوتا تو چمک کر تلوار بن جاتا-

عقیل روبی پرانی شاعری کے پرانے سانچوں تک محدود نہیں وہ جدید انداز بیان کے ساتھ ہیئت کی تبدیلی بھی ضروری خیال کرتا ہے اور یہ چونکہ تجربہ ہے اس لیے ضروری نہیں کہ اس جدت سے ہر جگہ حسن ہی پیدا ہو- تجربہ کے نقوش تو کہیں حسین ہوتے ہیں کہیں قبیح - ان کے یہاں بھی یہی معاملہ ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ حسن کہیں زیادہ ہے-

عقیل روبی ابھی نوجوان ہیں عمر، وقت اور مطالعہ تو انسان کے کئی خول بدلتا ہے مجھے ان سے بڑی امیدیں ہیں۔

عاطر لومانی

جناب عاطر یوں تو دکنی ہیں لیکن ایک عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی صحافی بھی ہیں اور وقائع نگار بھی۔ جنگ کے متعلق ان کی ایک کتاب ''آگ کی آندھی'' کے نام سے چھپی ہے اور مشاعروں میں ان کی شاعری کو سننے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ وہ سوجھ بوجھ سے شعر کہتے ہیں اب تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

عطا حسین کلیم

جناب عطا حسین کلیم کو میں ایک زمانہ سے جانتا ہوں جب وہ بسلسلہ ملازمت گورنمنٹ آف انڈیا دہلی میں تھے آج کل ریڈیو کے ادارہ میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہیں۔

حیرت ہے کہ جناب کلیم اس رقص و نغمہ کے مرکز میں ہوتے ہوئے بھی اسی طرح شرافت اور اخلاقیات کے امین ہیں نہ جانے وہ یہاں کی گمراہ کن فضاؤں کے اثر سے اب تک کیسے محفوظ ہیں۔ ان کی شاعری میں اخلاقی اقدار کا تحفظ اور تقدیس کی روایات جوں کی توں نظر آتی ہیں وہ ایک نہایت اچھے غزل گو ہیں۔ ان کے یہاں دل کی واردات اور فطری احساسات و خیالات سے شاعری کا مواد بنتا ہے۔ ان کا کوئی مجموعہ بھی نظر سے نہیں گزرا لیکن ان کی غزلیں جو سننے میں آئی ہیں وہ اپنے شاعر کے معیار کا اعلان کرتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی نوجوان شاعر ہیں اور شاعر ہی نہیں، انہیں نثر میں بھی اچھی خاصی مہارت ہے وہ بڑے طباع واقع ہوئے ہیں۔ اور جو کہتے یا لکھتے ہیں اس میں ان کی سوجھ بوجھ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی ہر چند کہ وہ جدید روش کے انسان ہیں لیکن ان کے یہاں حفظ مراتب اور انسانیت کی قدریں بڑی صاف و شفاف ملتی ہیں جو خاندانی نجابت کی غماز ہیں۔ میں نے ان کے بشرے کے قیافہ سے

اندازہ لگایا ہے کہ وہ مستقبل میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہوں گے-اور زندگی میں ہر دلعزیز انسان رہیں گے-

عمر فیضی صاحب

جناب عمر فیضی صاحب ایم اے کسی کالج سے منسلک ہیں نظم غزل اور قطعات کہتے ہیں-زبان و بیان معیاری اور ہندی الفاظ سے اپنی شاعری کو وہ اور بھی شیریں کر دیتے ہیں-ان کے قطعات میں ان کے تغزل سے زیادہ رنگینی اور دلکشی ملتی ہے-ابھی کوئی مجموعہ نہیں آیا-

رشید اختر عرش لکرالوی

جناب رشید اختر عرش لکرالوی لاہور میں تقسیم سے پہلے سے آباد تھے-وہ اپنے فطری ذوق کے تحت شاعری کرتے تھے اور مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے-زبان کے معاملہ میں نہایت احتیاط اور روزمرہ میں سوجھ بوجھ رکھتے تھے-عرصہ سے لاہور میں نہیں ہیں اور ان کا کوئی مجموعہ کلام بھی نہیں دیکھا گیا-

محمد عبداللہ قریشی

ادبی دنیا کا ایک پرخلوص مزدور ایک خاموش کارکن شرافت کا مجسمہ اور اخلاق کا دلدادہ ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی اور ادبی اجارہ داروں نے اب تک ان کو اپنی مرضی کے ماحول میں کام کا موقع نہیں دیا اور ارکان حکومت کے گرد بھی نااہلوں کی دوڑ دھوپ نے اس قدر دھول اڑائی ہوئی ہے کہ حکومت کو اپنے پرائے کی تمیز نہیں ہو سکتی- میں نے عبداللہ قریشی جیسے کام کرنے والے بہت کم دیکھے ہیں جن کے سامنے اپنی روزی سے زیادہ شرافت اور اصول کی اپنی بقا کا سوال رہتا ہے-میں ان کے لیے دست بہ دعا ہوں کہ خدا ان کو معقول ماحول عطا فرمائے-

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی صاحب ملک کے مشہور افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں جو زندگی کے خاکے اور تہذیب و تمدن کی تصویریں نظر آتی ہیں ان سے ان کے مطالعے مشاہدے اور دقت نظر پر

روشنی پڑتی ہے ان کے فن افسانہ نگاری کو ملک کے بڑے بڑے دھنتر تسلیم کرتے ہیں۔ اور اہل فکر و قلم میں ان کا بڑا نام ہے۔ ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں اور کئی رسالوں کے "علی عباس حسینیؒ" نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن سے ان کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تبصرے، تنقید اور ثنائیے موجود ہیں۔

عبداللہ فاروقی

جناب عبداللہ فاروقی ایڈووکیٹ ہیں اور کمال یہ ہے کہ اپنے پیشے کی مصروفیات کے ساتھ انہیں علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی مضامین لکھنے کا شوق ہے اور وہ جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اس میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا وہ نہایت محنت اور مطالعہ سے کام لیتے ہیں اور ان کے مضامین ملک کے وقیع رسالوں میں چھپتے ہیں ابھی تک ان کا کوئی ایسا کارنامہ طبع نہیں ہوا ہم ان سے جس کی امید کرتے ہیں لیکن مایوسی بھی نہیں کیونکہ یہ چیزیں وقت پر ہوتی ہیں۔

الیاس عشقی

جناب الیاس عشقی جے پور کے رہنے والے ہیں نثر اور نظم دونوں پر حاوی ہیں اور غزل تو بہت خوب کہتے ہیں۔ لیکن جب سے ریڈیو میں ملازم ہوئے ہیں اس وقت سے ان کا دماغ بانجھ ہو گیا ہے۔ ایسے زود گو انسان کا اچانک خاموش ہو جانا قیامت ہے۔ حالانکہ کئی لوگ ریڈیو میں جا کر شاعر بنے ہیں اور کئی لوگوں کی غزل چمک گئی اگر چہ اہل نظر سے یہ تعمیر و ترقی پوشیدہ نہیں لیکن مطالعہ کا ایک رخ یہ بھی ہوتا ہے۔ جو الیاس صاحب پر طاری ہے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کچھ بھی ہوں۔ ان کے جاننے والوں کو ان سے آج بھی بہت امیدیں ہیں۔

عابد سیمابی

جناب عابد سیمابی کو بھی بھکر میں سنا وہ بڑے محنتی اور تیز رو شاعر معلوم ہوتے ہیں اگر ایسے شاعروں کو نظر انداز کیا جائے تو مستقبل میں ان کا ایک اپنا پیغام ہوتا ہے۔ ان کے شعر میں وہ جھول نہیں ہیں جو شاعری کو خراب کر دیں یا رخ بدل کر غلط رو بنا دیں ان کے یہاں شگفتگی بھی ہے اور برجستگی بھی اور بلندی کے امکانات بھی۔

عارف عزیزی

جناب عارف عزیزی ہارون آباد میں رہتے ہیں اور بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اگرچہ ان کے شاگرد دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن لاہور کے ادبی ہنگاموں سے دور ہونے کے باعث ان کا نام ابھر نہیں سکا اور ایسے نہ جانے کتنے صاحب فن اپنے حقوق سے محروم چلے آتے ہیں جو لاہور اور کراچی سے دور مضافات میں گمنامی کی گھٹن سے گزر رہے ہیں۔

پروفیسر محمد عاشق

پروفیسر محمد عاشق صاحب دار العلوم السنہ شرقیہ لاہور کے ایک تجربہ کار استاد ہیں اور اردو' فارسی پر عبور رکھتے ہیں جس شخص کا اوڑھنا بچھانا ہی ادب ہو ظاہر ہے کہ وہ شاعر اور ادیب ہی نہیں شاعر آفریں اور ادیب گر ہو جاتا ہے۔محمد عاشق صاحب اردو فارسی ادب کے گوشے گوشے سے آگاہ ہیں اور نثر و نظم دونوں پر تبصرہ کرنا ان کا روز کا مشغلہ ہے۔

علی عباس سہارنپوری

جناب علی عباس صاحب سہارنپور کے معززین میں ہیں انہیں اردو' انگریزی' فارسی اور قانون پر عبور ہے۔ وہ شاعری کے معاملہ میں بڑے محتاط ہیں اور سمجھ سوچ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کی کتاب ''گل دمن'' ان کی مشق سخن کی شاہد اور تصورات وتخیلات کی آئینہ دار ہے اگرچہ دیباچہ نگار نے ان کے لیے بہت تفصیل سے ان کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔لیکن ہر قاری کا زاویہ نظر جدا ہے ہر آدمی اس میں اپنے ذوق کے مطابق خوبیاں تلاش کرے گا۔

عنوان چشتی

نوجوان ہیں مگر ان کے ادب میں ان کی عمر سے آگے کی پختگی موجود ہے۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر یکساں حاوی ہیں سنا ہے کہ آج کل جامعہ ملیہ میں بحیثیت استاد کام کر رہے ہیں۔ ایک بار ایک پندرہ روزہ جریدہ کے ایڈیٹر نے بتایا تھا کہ عنوان چشتی کا شعری مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ جوان کے یہاں ریویو کے لیے آیا تھا لیکن میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں جناب عنوان چشتی میں ان کے مستقبل

کی تابندگی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

عامر عثمانی

جناب عامر عثمانی دیوبند کے نوجوان شاعر ہیں اور ان کے اشعار میں بے شمار بلندیاں جھلکتی ہیں ان کے یہاں قدیم رنگ کے شیشوں میں جدید رنگ کا بادہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں بھی ان کا اسلوب نگارش نہایت معقول اور دلچسپ ہے۔ رسالہ ''تجلی'' کے مدیر ہیں اور بڑے خلوص سے اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔

منصور عاقل

منصور عاقل نوجوان ادیب اور تعلقات عامہ میں ایک ذمہ دار جگہ کام کر رہے ہیں یوں تو میں انہیں ایک عرصہ سے جانتا ہوں مگر اب آ کر ان کی غزل میں ایک خاص رنگ آ گیا ہے۔ اگر چہ ان کے یہاں سانچے پرانے ہیں لیکن مسالہ نیا ہے اور اس ترکیب سے وہ بہت اچھی اچھی غزلیں پیش کر رہے ہیں ابھی وہ جوان ہیں اور زندگی کے بے شمار سبزہ زاران کے سامنے ہیں فن سے ان کا مستقبل انہیں آواز دے رہا ہے۔

عرشی لکھنوی

جناب عرشی لکھنوی میں معلوم کی حیثیت سے رہتے تھے اور فن شاعری کی مہارت اور معلومات کی بنا پر لکھنو میں سب ان کی عزت واحترام پر مجبور تھے۔ میں ان کے اسکول کے کئی مشاعروں میں شریک ہوا ہوں۔ عرشی صاحب خلیق ہونے کے علاوہ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ ان کی غزل میں قدیم رکھ رکھاؤ اور رسم و رواج کے مطابق مضمون ملیں گے وہ اسلامی شعار اور اخلاقی اقدار کو عزیز رکھتے تھے اور میں نے انہیں کبھی کسی سے ایسا بے تکلف نہیں دیکھا جہاں سے گستاخی کی حدیں نظر آنے لگتی ہیں۔ نہ معلوم ان کا مجموعہ کلام چھپا ہے یا نہیں۔

عمر انصاری

جناب عمر انصاری لکھنو میں میرے سب سے پہلے دوست ہیں اور بقول میر ع

پھر ایک ملاقات چلی آتی ہے

وہ آج تک اسی خلوص محبت اور احترام سے ملتے ہیں جناب عبدالباری آسی الدنی سے تلمذ ہے اور نظم وغزل پر قابل رشک عبور رکھتے ہیں ان کا کوئی مجموعہ مجھ تک نہیں پہنچا چند روز ہوئے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک عرصہ سے بمبئی میں ہیں فلم سازی اختیار کر لی - خدا کامیاب کرے مگر ہمارے ملک کے کئی ادیب اور شاعر فلم میں جا کر اپنی فطری بلندیوں سے محروم ہو گئے ہیں - عمر انصاری زبان و بیان پر حاوی ہیں اور نظم ونثر دونوں میں مہارت تامہ ہے -

جناب عاصی کرنالی

جناب عاصی کرنالی جیسا کہ "کرنالی" سے ظاہر ہے کہ کرنال سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہو گئے بڑے محنتی اور سوجھ بوجھ کے انسان ہیں اور اخلاقی اقدار کو ابھی تک اپنے کلام سے زندہ و تابندہ رکھتے چلے آ رہے ہیں وہ اردو فارسی کے فاضل ہیں اور انگریزی پر بھی بقدر ایم اے عبور رکھتے ہیں - غزل اور نظم دونوں اصناف میں مہارت ہے اور نثر میں بھی یہ اعلیٰ پایہ کے ادیب ہیں - نہایت شریف النفس اور شریف الطبع انسان ہیں - کالج میں پروفیسر کے باوصف وہ درس و تدریس سے غافل نہیں - پڑھنا اور پڑھانا دونوں فن ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ابھی ان کی عمر ایسی بھی نہیں جہاں انسان صاحب طرز ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتا - ان کے سامنے زندگی کے روشن میدان ہیں اور علمی راہوں میں برق رفتاری سے مصروف سفر ہیں -

عشرت کرتپوری

جناب عشرت کرتپوری ایک مشاق اور کہنہ مشق شاعر ہیں - نظم اور غزل دونوں پر انہیں قدرت ہے ہمدرد دواخانہ سے منسلک ہیں کمال یہ ہے کہ مصروفیت کے باوصف وہ اپنے ذوق ادب کو گرد آلود نہیں ہونے دیتے اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں - نثر میں بھی وہ ایک خاص انداز رکھتے ہیں - اور

ترتیب وتدوین کا فن بھی انہیں اچھا خاصا آ گیا ہے ان کی یوں تو کئی کتابیں ہیں لیکن اب تک مجموعہ کلام نہیں چھپا۔

عطاء المنعم

عطاء المنعم صاحب حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے صاحبزادے ہیں وہ تقریر میں شاہ صاحب مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ذوق تحریر مزید برآں ہے۔ انہوں نے ایک عربی اردو لغات بھی مرتب کی ہے اور شاہ صاحب کی یادداشتوں کا ایک مجموعہ بھی ''سواطع الالہام'' کے نام سے ترتیب دے رہے ہیں ابھی وہ ماشاءاللہ تو جوان ہیں اور ہمیں ان سے بڑی امیدیں ہیں۔

عرش صدیقی

عرش صدیقی صاحب ملتان میں لیکچرار ہیں اور یہ بھی شاعری کی بدلتی ہوئی اقدار سے متاثر ہیں۔ ان کے یہاں موجودہ اقدار کی تبدیلی کے سلسلے میں ایک فکر ایک تقدس اور ایک تحقیقی رجحان شعر کی صورت اختیار کرتا ہے اور ہر دور میں اچھے اور بیدار طبع لوگوں کا یہی رویہ رہا ہے اور یہی عمل ہے جو ایک معاشرہ کی داغ بیل کو غور سے دیکھتا اور سوچتا ہے اور قدیم معاشرہ کی طرف وہ دور تک نظر نہیں ڈالتا بلکہ دور حاضر کے محاسن کا تقابل کرتا ہے۔ ماضی کے اخلاقیات اور رسم ورواج سے۔

جناب عرش کے یہاں صاف نمایاں ہے کہ یہ رجعت پسند نہیں بلکہ یہ اس حد فاصل پر کھڑے سوچ رہے ہیں جہاں سے دونوں معاشروں کے خدوخال نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری میں یہی مواد جگہ جگہ اپنے نئے رنگ وروغن سے نظر آتا ہے۔

ان کے اشعار کی سطح اس سطح عوام سے بلند ہے جہاں اشعار پر مشاعروں میں دادوعیش کا شور بلند ہوتا ہے۔ ان کے یہاں فکر ہے عمق ہے اور زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ ہے ہر چند کہ ان کی نظر اپنے ماحول سے باہر نہیں بلکہ ان کی شاعری اپنے ہی گردوپیش تحلیل کرتی ہے لیکن اجتماعیت پر سوچنے والے بھی اسی سطح سے بلند ہو کر اجتماعی تصورات تک پہنچے ہیں۔ ان کی کتاب ''دیدہ یعقوب'' چھپ چکی ہے۔ جس میں عرش صدیقی کے خدوخال دھندلے نہیں ہیں۔

عزمی

جناب ارتضیٰ عزمی حضرت صبا اکبرآبادی کے شاگرد ہیں اور حیدرآباد میں مقیم ہیں غزل گو ہیں اوران کے کئی اچھے شعر سننے میں آئے ہیں۔

عزیزؔ حاصل پوری

عزیز حاصل پوری صاحب ملتان میں پیدا ہوئے اور کیونکہ ان کے والد بسلسلہ کاروبار حاصل پور ضلع بہاولپور میں رہے اس لیے خود کو حاصل پوری لکھتے ہیں۔ ان کے دو مجموعے ''جام نور'' اور کشت زار غزل چھپ چکے ہیں۔ آپ اچھی صاف ستھری غزل کہتے ہیں اور جناب افق کاظمی کے شاگرد ہیں۔ عزیز صاحب غزل کے ساتھ ساتھ نعت بھی اچھی کہتے ہیں اور مختلف جرائد میں چھپتے رہتے ہیں ابھی یہ عمر کے ڈھلوان پر نہیں اس لیے ان کے سامنے عمر کے بڑے سبزہ زار ہیں خدا استقامت عطا فرمائے ان میں جوہر ذاتی اپنا اعلان کرتے ہیں۔

غلام جیلانی عاصی

جناب عاصی شملہ میں ملے اور ایسے ملے کہ بے تکلفی تک نوبت آ گئی وہ نہایت شریف اور وضع دار انسان تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا میں کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے۔ قدیم رنگ میں اس دور کے مطابق اچھی غزلیں کہتے تھے اور کمال یہ تھا کہ انہیں شعر کہنے میں دیر نہیں لگتی تھی وہ برق رفتاری سے غزل کہتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں انتقال ہوا لیکن نہ معلوم ان کا کلام کس کے پاس رہا ان کے بچوں میں کوئی صاحب ذوق ہے یا نہیں۔

عیسیٰ امرتسری

جناب عیسیٰ امرتسری سے امرتسر کے مشاعروں میں ملاقات ہوتی تھی وہ اصل میں نعت کے شاعر تھے میلاد شریف کی مجلسوں میں اور قوالیوں میں ان کا کلام زیادہ سننے میں آتا تھا۔ نعت گوئی ان کی اچھی خاصی شہرت تھی اور رسالوں میں بھی ان کا کلام دیکھنے میں آ جاتا تھا۔ لیکن ان کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا اور وہ انتقال کر گئے۔

عنایت اللہ خاں عنایت گورداسپوری

گورداس پور کے بڑے نمایاں شاعر تھے اور مشاعروں کے بے حد شوقین' نہایت' خوب انسان اور ساتھ ہی نیک خو مرد مومن لاہور میں میانی صاحب والے قبرستان میں دفن ہیں اور قبر کے کتبہ پر بھی منظوم دعا کندہ ہے نہ جانے کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

عیش شاہ جہاں پوری

جناب عیش شاہ جہاں پوری سے ہارون آباد میں ملاقات ہوئی وہ گفتگو میں اپنے محاسن کو انلارج کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کا کلام ان کی صحیح صلاحیتوں اور قابلیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے کلام کی ادائی میں بھی ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ جو عموماً قدیم شاعروں میں پایا جاتا تھا۔

عظیم لاہوری

محمد عظیم بٹ لاہوری پنجابی میں تو ان کی شاعری کی کئی کتابیں چھپی ہیں لیکن اردو میں ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں دیکھا اردو شاعری میں یہ جناب رفیق میرٹھی کے شاگرد ہیں جو ایک صاحب دیوان اور بڑے پرگو شاعر تھے بڑے کہنہ مشق ہیں اور غزلوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔

عفت بانو

عفت بانو بیگم شیروانی' غزل گو شاعرہ ہیں اور بڑی سنبھلی ہوئی غزل کہتی ہیں اگرچہ انہیں اپنی گھریلو مصروفیات میں شعر کہنے کی فرصت کم ملتی ہے۔ لیکن جب وہ شعر کہتی ہیں نہایت بچے تلے انداز میں کہتی ہیں۔ اگر ان کی مشق سخن جاری رہی تو وہ نہایت اچھی شاعرہ ہو جائیں گی ان کے تخیل اور تصور کے اکھوے ان کے اشعار میں نمایاں ہو رہے ہیں جو نہایت امید افزا ہیں۔

عارض القادری

عارض القادری سے میری پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی - اس وقت اپنے انداز نگارش طرز ادا کے اعتبار سے مشاعرہ میں تنہا تھے عارض صاحب ریختی کہتے ہیں اور ریختی کو انہیں لوازمات کے ساتھ ادا کرتے ہیں اگر وہ اس رنگ میں اصلاح قوم وملت پر کمر باندھ لیں تو ہمارے معاشرہ کی کشتی کے کئی سوراخ بند ہو سکتے ہیں -

عیش فیروز پوری

جناب عیش بہت پرانے کہنے والے ہیں اور انہوں نے جواب تک کہا ہے اگر وہ چھپ جائے تو کئی جلدوں میں ہوگا اور اس میں اردو کے کم از کم دو دور سامنے آ سکیں گے - جناب عیش کے بہت سے شاگرد بھی ہیں اور ان میں اچھا کہنے والے بھی ہیں عیش صاحب نے اساتذہ کو دیکھا ہے اور پون صدی کا مشاہدہ ان کی نظر میں ہے اگر وہ اپنے دور کی تاریخ ادب بھی لکھ دیں تو بڑا کام ہو جائے گا - وہ قدیم روش کے شاگرد پرور ہیں لیکن بہ اعتبار فن ان کے یہاں وہ نشیب نہیں جو کلام کو فنی طور پر پست بنا دیتے ہیں - اس لیے اگر ان کا کوئی منتخب مجموعہ چھپ جائے تو اس کی مقبولیت کے روشن امکانات ہیں سنا ہے کہ عرصہ سے عیش صاحب کوئٹہ میں مقیم ہیں -

عزیز جائسی

جناب عزیز جائسی جائس کے رہنے والے ہیں اور جناب عبدالباری آسی الدنی کے شاگرد ہیں - ایک تو غزل اچھی کہتے ہیں دوسرے وہ ترنم سے پڑھ کر مضامین کا رنگ دو بالا کر دیتے ہیں - جناب آسی الدنی کے پرستار ہیں اور ان کے سوا کسی کی عظمت کو مشکل ہی سے تسلیم کرتے ہیں -

معاشرے میں ان کی غزل اور ترنم دونوں کامیاب رہتے ہیں ابھی کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور تقسیم کے بعد لکھنؤ اور اس کے نواح میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے -

عیاض فتح پوری

یہ جناب آزاد فتح پوری کے اعزا میں ہیں اور اچھی خاصی غزل کہتے تھے تقسیم ملک کے بعد میں نے انہیں ایک بار لاہور میں بھی دیکھا لیکن وہ کراچی جانے والے تھے اس کے بعد دو چار بار رسالوں میں تو ان کی غزلیں دیکھی ہیں لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔ نہ ان کے کلام کے سرمایہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کہاں تک پہنچے ہیں؟ تاہم اگر زمانے نے انہیں کسی امتحان میں نہ ڈال دیا تو ان سے امیدیں وابستہ کرنا کوئی غلط نہیں۔

عالم واسطی

جناب عالم واسطی سے میں نزدیک نہیں صرف مشاعروں تک ملاقات ہے اور مشاعروں میں میں نے جواب تک ان سے غزلیں سنی ہیں وہ ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں انہیں ادب میں آنا چاہئے۔ وہ ترنم سے پڑھتے ہیں اور ترنم سے پڑھنے والوں کے عیوب ومحاسن نغمہ کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں۔ لیکن عالم واسطی صاحب کا ترنم ایسا ہے، کہ اس میں وہ لہجے کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور شعر کے عیوب ومحاسن پردہ کرنے نہیں پاتے۔

عیش زیروی

محمد صدیق عیش زیرہ ضلع فیروز پور کے رہنے والے ہیں اور میں انہیں ایک عرصہ سے مشاعروں میں دیکھ رہا ہوں۔ ان کے یہاں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی لیکن عیش فیروز پوری کی طرح کثیر الکلام نہیں۔ جناب عیش زیروی آج کل دھرم پورہ لاہور میں مقیم ہیں اور اب بھی وہ مقامی نشستوں میں شریک ہوتے ہیں۔

سر عبدالرحیم

مشاعروں کی ملاقات کوئی ملاقات نہیں ہوتی لیکن سر عبدالرحیم صاحب مجھے اپنے مستقر پر لے گئے اس وقت وہ شملے ہی میں مقیم تھے۔ وہاں انہوں نے مجھے چند قلمی کتابیں دکھائیں اور مجھے ان کی اس بلند ذوقی پر تعجب ہوا۔ ان کے پاس مثنوی مولانا روم کا ایک مجلّا و مطلا نسخہ تھا جو ابھی آنکھوں میں

ہے- عبدالرحیم صاحب کو فارسی میں بھی درک تھا اور سیکڑوں شعراء کے اشعار انہیں یاد تھے- مجھے ان سے مل کر حیرت ہوئی کہ کیسے صحیح ذوق کا انسان مجھ سے اوجھل تھا- ان کی ایک کتاب انگریزی زبان میں علم فقہ پر ہے-

پروفیسر علم الدین سالک

سالک صاحب کی ساری عمر درس و تدریس میں گزری ہے اور زندگی بھر وہ اسلامیہ کالج سے منسلک رہے ہیں- یوں تو وہ تاریخ کے آدمی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سراپا محبت وطن ہیں اور سینہ میں ایک حساس دل رکھتے ہیں- جو مسلمانوں کی پستی کا نوحہ خواں رہتا ہے- ہمارے اس دور میں ایسے مخلص کارکن اور صاحب دل انسان خال خال نظر آتے ہیں- سالک صاحب کی کئی ایک تصانیف ہیں- وہ غالباً تحریر سے زیادہ عمل کو اہم خیال کرتے ہیں اور رات دن وہ تبلیغ دین میں منہمک پائے جاتے ہیں-

عبدالمجید پروین رقم

گیلانی پریس کے بک ڈپو کی ملازمت کے دور میں صوفی عبدالمجید صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں جہاں وہ اپنے دور کے فن خطاطی میں امام تھے وہیں وہ ایک صاف باطن صوفی بھی تھے اور ان میں وہی باتیں تھیں جو عموماً بزرگان دین میں پائی جاتی ہیں- وہ کم گوئی' انکساری' رقت اور اتقا کی ملی جلی چلتی پھرتی تصویر تھے- ان کا فن اور سوانح ایک کتاب چاہتے ہیں-

عاشق حسین اکبری

جناب عاشق حسین اکبری پٹنہ کے رہنے والے تھے- بہت شستہ مذاق پایا تھا تقسیم سے پہلے گورنمنٹ آف انڈیا میں تھے- اور تقسیم کے بعد سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئے ان کے تجربات اور معلومات سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے- انہیں ہزارہا شعر یاد تھے اور ادب کے عیوب و محاسن کو خوب جانتے تھے- بڑے بے تکلف اور پرخلوص انسان تھے ایسا دوست نواز میں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے- کراچی میں سقوط قلب سے وفات پائی-

مولانا عبدالمالک

یہ مولانا عبدالمالک صاحب جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے صاحبزادے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں- جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے وہ مستند اور جید عالم ہیں علاوہ ازیں ان کا مطالعہ انہیں ان کے ہم عصروں میں بلند کرتا ہے- منڈوالہ یار میں استاد ہیں اور تقویٰ و طہارت میں بھی اپنے والد صاحب کا اتباع کر رہے ہیں- ایسے لوگ اس دور کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں- یہی چند چراغ ہیں جن کی روشنی روحوں تک پہنچتی ہے اور دین الہی کی تبلیغ ہوتی ہے- ان کی چند کتابیں ہیں اصول تفسیر اردو، پیغام مسیح علیہ السلام (اردو)، تجرید مسلم کا اردو ترجمہ و شرح، ہدایہ جلد سوم و چہارم کا اردو ترجمہ و تشریحات

چودھری عبدالغفور (علیگ)

چودھری عبدالغفور صاحب (علیگ) اصل میں تعلیم کے آدمی ہیں لیکن تعلیم کا آدمی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اخلاق، تاریخ، تہذیب، شعر اور نثر کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ اصناف ادب و تعلیم میں کسی شعبے میں بھی بند نہیں اور ان کا قلم ہر میدان میں یکساں گامزن ہوتا ہے- اگرچہ وہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں- لیکن اگر وہ دل لگا کے کوئی اہم کتاب لکھیں گے تو شرائط تصنیف و تدوین سے بہ آسانی عہدہ برآ ہو سکیں گے-

علی مظہر رضوی

جناب علی مظہر رضوی تعلقات عامہ کے ایک ذمہ دار عہدے پر ہیں اور بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں- اصناف ادب کے ہر رخ پر ان کی گہری نظر ہے- ان کے یہاں تلخیص کا فن اپنی پوری بہار پر ہے- وہ اگر چاہیں تو ایک کتاب کو ایک ورق کے مواد میں منتقل کر دیں- علاوہ ازیں وہ صحافت اور نفسیات کے بڑے بڑے اہم مسائل کو اپنی یک جنبش قلم سے قابل فہم ہی نہیں قابل عمل بنا دیتے ہیں- ان میں تصنیف و تالیف کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں محکمے میں بھی انہوں نے انتخاب وغیرہ کئی کتابوں کی صورت میں چھاپے ہیں-

عبدالقیوم پی ایس سی

عبدالقیوم صاحب ایک اچھے اور منتظم افسر ہیں لیکن وہ ادب نواز بھی ہیں اور ادب پسند بھی۔ جہاں وہ انتظامی امور میں غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں وہیں وہ علم وادب پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ اصول وضوابط کے انسان ہیں اور آسانی سے ہر شخص ان کے رجحانات کا پتہ نہیں لگا سکتا۔ ان کی نظر فرق مراتب پر بھی رہتی ہے اور فرق علم پر بھی۔ وہ اردو بولتے اور پڑھتے ہیں اور اسی زبان کو تبلیغی زبان خیال کرتے ہیں۔ ان کی نظر ماحول پر رہتی ہے اور وقت کی نبض سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن چغتائی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن چغتائی ملک کے مشاہیر میں سے ہیں دنیا جانتی ہے کہ ان کا فن مصوری انہیں کی ذات تک محدود ہے ان کی صحیح تقلید کرنے والا ابھی تک میدان میں نہیں آیا۔ ان کے آرٹ میں مغل آرٹ کا تصور ضرور ہے۔ لیکن مغل آرٹ نہیں ہے۔ ان کے فن کی تمام تر قوت رنگوں کے امتزاج اور خطوط کے لوچ پر صرف ہوئی ہے۔ یہی دو چیزیں جس پر چغتائی آرٹ کے تمام حسن کا دارومدار ہے۔ اور کسی کے یہاں ان کی طرح رنگ میں جاذبیت اور خطوط میں زندگی نہیں پائی جاتی ' وہ تصویر کی واقعیت اور صداقت پر نہیں جاتے بلکہ رنگوں اور خطوط سے واقعیت کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ کامیاب ہیں ان کی تصویریں دیکھ کر ناظر مشابہت کے فقدان کا اظہار نہیں کرتا بلکہ رنگوں اور لکیروں کے طلسماتی دوائر وقوسین میں گم ہو جاتا ہے اور یہ آرنسٹ کی بڑی کامیابی ہے۔

عارف جلالی

دہلی میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں وہ سیاسی رخ کے نوجوان ہیں اور شعر میں بھی ان کا وہی رخ نمایاں رہتا ہے۔ مقبول قسم کے نوجوان اور صالح کردار کے انسان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کا کوئی مجموعہ کلام مجھ تک نہیں پہنچا۔

عبداللہ چغتائی

عبداللہ صاحب عبدالرحمن چغتائی کے بھائی ہیں اور یہ مصنف بھی ہیں کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں ان کا تاریخ پر اچھا مطالعہ ہے اور آرٹ کے عیوب و محاسن پر بھی ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ قدیم تاریخ اور قدیم آرٹ کے سلسلے میں ان کی معلومات میں بہت خاص خاص باتیں ہیں۔ وہ عموماً قدیم کتابوں اور قدیم مصنفین کے علاوہ قدیم خطاطوں اور مصوروں کے عیب و ثواب پر بھی اچھا خاصا مطالعہ رکھتے ہیں۔ لیکن ابھی کوئی خاص کارنامہ ان کے قلم سے سامنے نہیں آیا جس کی امید رکھنے میں ہم حق بجانب ہیں۔

عبدالمجید قریشی

مزدور لیڈر عبدالمجید قریشی اپنے دور کے اچھے خاصے مشہور کارکن اور شاعر تھے۔ وہ اصل میں وہی لٹریچر پیدا کرتے تھے جو آگے چل کر ترقی پسندوں نے برائے نام اپنایا اور ایک جماعت کی بنا ڈالی۔ عبدالمجید قریشی مخلص قسم کے انسان تھے اور مزدور و سرمایہ دار کی پھانس ان کے سینے میں ہمیشہ ایک خلش رکھتی تھی۔ مگر یہ زمانہ ماضی پر گہری نظر نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی صلیبیں خود اٹھائے پھرتا ہے۔ یہاں ابھی تاریخ اور تحقیق کا شعور کہاں بیدار ہوا ہے۔

ملک عمر حیات

ملک عمر حیات صاحب اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے سیاست اور ادب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور انتظام کے معاملے میں بھی وہ معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ صاف گو انسان واقع ہوئے تھے اس لیے کہیں لچکتے نہیں تھے۔ ان کے کالج سے جانے کا غالباً یہی سبب تھا کہ کالج کے انتظامی امور میں وہ دخل برداشت نہیں کرتے تھے۔ پھر سنا تھا کہ ملک سے باہر کی انہیں کوئی اچھی اور معقول ملازمت مل گئی جو وزارت خارجہ سے متعلق تھی۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی

علامہ عنایت اللہ مشرقی ہمارے ملک کی اہم شخصیتوں میں تھے۔ وہ علمی طور پر بھی بہت بلند شخصیت تھے اور عملی طور پر بھی جو سوچتے تھے کر ڈالتے تھے۔ ریاضی میں جو ڈگری ان کی تھی بہت کم لوگ اس تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح عربی پر جو انہیں عبور تھا کم لوگوں میں دیکھا گیا ہے۔ اگر وہ تعلیمی شعبے میں ہوتے تو وائس چانسلری ان کے لیے معمولی بات تھی لیکن انہیں نہ جانے کس طرح لیڈری کا جنون اور ماضی اسلام کے احیاء کا ذوق لے نکلا۔ انہوں نے خاکسار تحریک اٹھائی جو ہماری تاریخ میں جدوجہد کا ایک اہم جز قرار پائے گی۔ اس میں جو جو مشاہدات اور قربانیاں ہیں وہ علیحدہ ایک کتاب ہے اور وہ سب علامہ مشرقی صاحب کی علمی اور عملی قوتوں کا کرشمہ ہے۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری

مولانا عبدالقادر رائے پوری بڑے صاحب علم و ریاضت بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے کسی معتقد کو غلط راستے پر نہیں لگایا اور ہمیشہ اسوۂ رسول کی تبلیغ کی وہ یوں تو بالکل اسی طرح تھے جیسے عموماً اہل اللہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی صاف باطنی کے باعث ان کے الفاظ میں بھی ایسی تاثیر تھی کہ بڑے بڑے گمراہ راہ راست پر آ گئے اور ان کا تاثر منجمد نہیں تھا بلکہ اس میں نشوونما تھی جسے کوئی راستہ بتا دیا اسے اس کا شعور بھی تفویض کر دیا۔ آج سیکڑوں مسلمان ان کے اخلاق اور تبلیغ سے فیض یاب ہو کر اپنے عقائد اور تصورات کی تعلیم کو عام کر رہے ہیں۔ میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے لوگوں کو ان کی بزم میں باادب، خاموش اور دوزانو پایا ہے اور نہ جانے کتنے مریض صحت مند اور کتنے مایوس ان کی دعاؤں سے اپنی مراد کو پہنچے ہیں۔

عبدالعزیز المیمنی

عبدالعزیز میمنی جیسا فاضل اجل میری نظر سے بہت کم گزرا ہے۔ علی گڑھ میں مولانا سواتی اور میمنی صاحب دونوں تھے اور دونوں میں معاصرانہ چشمکیں رہتی تھیں۔ عبدالعزیز صاحب نے بڑی مشکل مشکل کتابوں پر حاشیے لکھے جنہیں مصر کے فضلاء نے حیرت سے دیکھا اور جہاں تک انسان کی

یادداشت کا تعلق ہے۔شاید اپنی معلومات اور حافظے کے پہلے آدمی ہیں جنہیں سیکڑوں شجرے یاد ہیں لیکن ان کی کوئی علمی ادبی کتاب اب تک ایسی نہیں چھپی جو ان کی شان کے شایاں ہوتی ایک معمولی سا تذکرہ چھپا تھا جو میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شاہ صاحب کے متعلق اور ان کے سوانح اگر قلمبند ہوں تو ایک بڑا دفتر درکار ہوگا۔وہ عالم بھی تھے مقرر بھی بزرگ بھی تھے اور دوست بھی' عاشق رسول بھی تھے اور مبتلائے امت بھی جب وہ بات کرتے تھے ان میں ایک محبوبانہ دلکشی ہوتی تھی۔تقریر کرتے تھے تو حسان بن ثابت کی روح کے پرتو میں مگن محسوس ہوتی تھی۔جب کسی سرکاری افسر کے سامنے جاتے تھے تو ان میں بلال کا اصرار نظر آتا تھا۔اور جب وہ جھوم کر کوئی شعر پڑھتے تھے تو سراپا شرح ہو جاتے تھے۔ایسا صاحب ایمان اور شعلہ بیان مقرر ہمارے ملک کی تاریخ میں اب تک پیدا نہیں ہوا شورش کاشمیری کے یہاں وہ کہیں کہیں جھلکتے ہیں اور اس عصمت رسولؐ کے محافظ کی ساری عمر غربت وعسرت میں گزر گئی اور کسی نے انہیں نزدیک سے اس طرح نہیں دیکھا جس طرح ان کا حق بنتا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی

مولانا عبدالماجد کی علمی عظمت سے کون آگاہ نہیں۔جناب شورش کاشمیری کے یہاں ان سے ایک کھانے پر رواداری کو ملاقات ہوئی اور وہ ایسا ہنگامہ تھا کہ کسی مسئلہ پر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔مولانا کی ذہانت اور قلم کی جولانیوں کے نقوش تو بہت ملتے ہیں۔لیکن میں ان کی کتاب ''حکیم الامت'' سے ان کی عظمت کا اندازہ لگاتا ہوں تو ان سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔مولانا نے اس کتاب میں جہاں اپنی علمی شکستوں کا اعتراف کیا ہے وہیں مولانا تھانوی کی بلندیاں بھی سامنے آتی ہیں۔اور اس کے مطالعے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔اصل میں ایسی کتابیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں اور یہ تصنیف وتالیف ہر شخص کے بس کا روگ بھی نہیں یہ تو جسے خدا توفیق دے۔

قاری عبدالمالک

جناب قاری عبدالمالک صاحب غیر منقسم ہاندوستان میں علم تجوید کے امام تھے اور ساتھ ہی شعر بھی کہتے تھے۔ حضرت جگر سے وہ بہت قریب تھے اور انہیں کے رنگ کی تقلید میں اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے یہاں اشعار میں اسلامی اقدار اور اخلاق کے مسائل پر زیادہ توجہ معلوم ہوتی ہے۔ افسوس کہ قاری عبدالمالک صاحب اس قدر ناشناس ملک میں زیادہ نہ جی سکے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون!

مولانا عبداللہ فاروقی

مولانا عبداللہ صاحب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے سلسلے سے تھے۔ عربی فارسی کے منتہی اور نہایت صاف باطن بزرگ تھے۔ ان کی زندگی درس و تدریس میں گزری وہ متقی اور پاک طبیعت بزرگ تھے اور تبلیغ دین سے والہانہ شغف تھا۔ وہ دیوبندی عقائد رکھتے تھے اور ایسی سادہ زندگی گزاری جو عموماً اہل اللہ کا شعار رہا ہے۔ وہ صاحب کشف بزرگ تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر ایک روحانی تسکین ہوتی تھی اور زندگی کا ہر غم دل سے دور رہتا تھا۔ دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں ایک مدت تک اپنے عارفانہ خطبے دیتے رہے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا بڑا کام ندوۃ المصنفین کا قیام ہے اس ملک میں ایسا مخلص اور کار آمد ادارہ دور دور نظر نہیں آتا اور مفتی صاحب ادارے میں کام کرنے کے لیے جو مولفین و مصنفین انتخاب کرتے ہیں وہ قابل داد ہیں۔ اصل میں مفتی صاحب وقت کی ضرورت اور ماحول کی تشنگی سے آشنا ہیں اور پھر انہیں ایسے مخلص لوگ مل جاتے ہیں جو صحیح معنی میں کام کے اہل ہیں۔ ہم مفتی صاحب کو اس ادارے کی تنظیم و تعمیر کے لیے نعمت خیال کرتے ہیں۔

علاؤالدین صدیقی

جناب علاؤالدین صدیقی پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے صدر اور بڑی اہم شخصیت ہیں۔ وہ تقریر اور تحریر دونوں دھاروں میں اپنی ایک خاص گونج رکھتے ہیں۔ جو بازگشت تک نہیں پہنچتی ان کے شاگردوں کو اکثر ان کا مداح پایا ہے اور حکومت نے بھی ان کے علم و آگہی کو جانچ پرکھ کر ہی انہیں اسلامی مشاورتی کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کے قلم سے کوئی ایسی تصنیف نہیں نکلی جو ان کی بلندی کا ایسا اعلان کرے جس سے حکومت اور عوام ہم آہنگ ہو جائیں۔

عبدالستار نیازی

ملک اور قوم کی بھلائی چاہنے والا انسان جو ایک زمانہ سے خدمت قوم و ملک میں منہمک ہے۔ نیازی صاحب پر بڑے بڑے ابتلا کے وقت آئے لیکن یہ اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے اور آج تک خدمت قوم و وطن کی راہ پر ہیں انہوں نے زنداں کی تاریکی بھی جھیلی اور پھانسی کے امکانات سے بھی گزرے مگر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی یہ دامے درمے قدمے سخنے ہر صورت سے اپنے وطن کی ترقی و بہبود میں حصہ لیتے ہیں مگر نہ جانے وہ دور کب آئے گا جب دنیا میں خلوص اور صداقت کی قیمت لگے گی۔ نیازی صاحب زبان اور قلم دونوں کے دھنی ہیں اور ان کی یہ کوششیں اپنے لیے نہیں ملک کے لیے ہیں۔ وہ واحد سیاست دان ہیں جن کی سیاست بے ریا ہے۔

عبدالعزیز فطرت

عبدالعزیز فطرت میرے بہت پرانے دوستوں میں تھے۔ پہلی بار راولپنڈی میں لاہور میں بسلسلہ ملازمت عرصہ تک رہے اور ایک ہی محلّہ میں ہونے کے باعث ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی وہ نہایت شریف انسان اور قابل قدر دوست کے علاوہ اپنی مشق و مزاولت کے اعتبار سے قادرالکلام شاعر تھے۔ شاعری کے ساتھ وہ اسلامی تصور کے انسان تھے اور دوستوں کے دوست ۵؍اکتوبر ۱۹۶۷ء کو راہی عدم ہو گئے ان کا کلام ابھی میں نہیں دیکھ سکا۔

عنایت علی آغا زبرہان پوری

آغا زبرہان پوری مرحوم نہایت خوشگوار اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے یہاں نظموں میں انقلابی تصورات اور اصلاحی خیالات بدرجہ اتم موجود ہیں وہ اپنے دور کے سیکڑوں انقلابی شاعروں سے بلند شعر کہتے تھے افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ان کا ایک کتابچہ ''شعلہ احساس'' کے نام سے میری نظر سے گزرا ہے۔ اسی کی بنا پر میں ان کا کلام چھاپنا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ مجموعہ ظفر ادیب صاحب کے پاس تھا جو اب دہلی میں ہیں نہ معلوم انہوں نے اس کا کیا کیا۔

ڈاکٹر مولوی غلام مصطفیٰ خان

حیدرآباد سندھ میں پروفیسر ہیں ان کی تصنیفی قوتیں اور تالیفی صلاحیتیں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ اگرچہ ان کا رجحان اب تصوف کی طرف زیادہ ہے اور وہ ایک معمولی قسم کے درویش ہیں لیکن ان کی کتابوں میں ایسا تحقیقی مواد ملتا ہے کہ سبحان اللہ ان کی کتابوں کے مطالعے سے ذہنی راستے صحیح علم کی طرف مڑ جاتے ہیں اور یہ خوبی بہت ہی کم مصنفین میں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے کئی الجھے ہوئے مسائل ایسے سلجھ گئے ہیں کہ پانی معلوم ہوتے ہیں ان کے درس میں تعیم سے زیادہ تفویض کا حصہ ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

جناب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اورینٹل کالج ہی کے تعلیم یافتہ ہیں اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے تربیت یافتہ، ہم نہایت تجربات اور قلب سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ سید صاحب کو زندگی بھر ایسا شاگرد نہیں ملا ہوگا اور نہ ملے گا ذوالفقار صاحب ہمہ وقت سید صاحب کے مداح ہیں اور زندگی کو فقط استاد کی خیر خواہی کے لیے وقف کر رکھا ہے اور اس کا اجراء انہیں خدا ہی دے سکتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ذہین ہونے کے علاوہ محنت شاقہ کے عادی ہیں اور ایسے محنتی انسان کے لیے بلندی اور مناصب کی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں آج تک کسی کی محنت ضائع نہیں ہوئی اس کا

ضرور پھل ملتا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں۔

سبط حسن غافل امروہوی

جناب غافل حضرات بخود دہلوی کے تلامذہ میں تھے اور ان تلامذہ میں تھے جو استاد کے حکم پر کان پکڑنے کو فخر خیال کرتے تھے اور جب بخود صاحب انہیں کبھی گالی دیتے تھے تو چہرے پر تلخی کے آثار کی جگہ بشاشت کھیل جاتی تھی وہ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے تھے اور اے جی آفس میں ملازم تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار مگر قدیم روش اور روایتی رسم و رواج کے محافظ لوگوں میں تھے نہ معلوم ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

غلام عباس

غلام عباس ایک معیاری ادیب ہیں اور افسانہ کی دنیا میں کون ہے جو ان کے اسلوب تحریر اور انداز بیان سے آگاہ نہیں انہوں نے نئے لکھنے والوں کی صف کے ہراول دستہ کی مدت کو بڑھایا ہے اور خود نہایت سلامت روی سے اس فن کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے مرہون قلم کئی کتابیں جن میں یہ اپنی تمام خوبیوں اور نفسیاتی زاویوں سمیت بولتے ہیں۔ تاریخ ادب میں جناب غلام عباس صاحب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور ان کا ادب نئے نئے راستوں کی داغ بیل ڈالتا رہے گا۔

وہاب علی غنچہ امروہوی

جناب وہاب علی غنچہ امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن تقسیم سے پہلے ہی وہ ملتان میں مقیم تھے میں ان سے ملا ہوں وہ نہایت اچھے شاعر تھے اور قدیم رنگ میں غزلیں کہتے تھے۔ ان سے میرا تعارف جناب ظفر ادیب نے کرایا تھا ان دنوں جناب حزیں سیالکوٹی کی نظمیں برائے اصلاح ان کے پاس آتی تھیں۔ غنچہ صاحب روایتی تہذیب کے آدمی تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ان کا کوئی مختصر سا مجموعہ بھی چھپا تھا وہ وفات پا چکے ہیں مگر ان کے شعری سرمائے کے متعلق معلوم نہیں کہ کہاں اور کس کے پاس ہوگا اہل ملتان کو چاہئے کہ اسے حاصل کریں اور ضائع نہ ہونے دیں۔

غافل کرنالی

جناب غافل کرنالی سے لیہ میں ملاقات ہوئی تھی وہ رواں شعر کہتے ہیں اور عیوب و محاسن کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے شعر میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور وسعت بھی۔ ایک زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں اور قابل قدر سعی حصول کی ہے۔ غالباً ابھی کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا۔

غلام محی الدین (کراچی)

غلام محی الدین خاں صاحب کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں ان کی زندگی پولیس افسری میں گزری ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ اب بڑے شدید متقی ہو گئے ہیں اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے ہیں انداز شعر گوئی اسی قدیم روش پر ہے اور وہی اصول فکر ہے لیکن پھر بھی سنجیدگی، فطانت اور روانی ان کے اشعار میں سنگھار ہو کر رہ گیا ہے۔

مولوی غلام مرشد

مولوی غلام مرشد صاحب لاہور کی شاہی مسجد کے امام تھے اور ایک طویل عرصہ تک یہ دینی خدمت انجام دیتے رہے مگر یکا یک کسی سیاسی سائے میں آ گئے اور علیحدگی اختیار کر لی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ کسی غلط راہ پر گامزن نہیں ہو گئے۔ اس سے ان کی دینی اور علمی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے خاموش ہیں اور درویشانہ زندگی گزار رہے ہیں جو اکابر کا طور طریقہ رہا ہے۔

قاضی غلام کبیر راحل

جناب راحل جہلم میں پروفیسر ہیں وہ صرف ادیب اور شاعر ہی نہیں وہ ادیب اور شاعر پیدا بھی کرتے ہیں وہ اپنی اردو دوستی میں ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ ان کے دم سے جہلم میں بڑا ادبی کام ہو رہا ہے۔ وہ صاحب دیوان ہیں اور ایک تذکرے کے مصنف بھی جس میں جہلم کے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر ہے وہ اپنے کلام میں متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور ان میں ان کی خاندانی شرافت ہر پہلو سے آشکار ہوتی ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر انہیں عبور ہے یہی سبب ہے کہ میں نے ان کے شاگردوں کو بھی ان کا مداح پایا ہے۔

آغا غلام رضا

اے جی رضا سی ایس پی سے میں اس وقت سے آشنا ہوں جب وہ اختر حسین صاحب سے ٹریننگ لے رہے تھے۔ انہوں نے نہایت اچھا ادبی ذوق پایا ہے اور شعر کو معائب و محاسن سمیت سمجھتے ہیں۔ یوں تو تمام ہی سی ایس پی دماغی طور پر اچھے اور نابغہ قسم کے انسان ہوتے ہیں لیکن بعض، بعض ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں تیسرے درجے کا انسان کہنا تیسرے درجے کے انسانوں کی توہین ہے اور ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں کہ اگر ملک میں ان سا صرف ایک حاکم بھی ہو تو ملک کا نظم و ضبط خراب نہیں ہو سکتا اور یہ ملک لیڈروں اور وزیروں کے بغیر امن کے ساتھ چل سکتا ہے اے جی رضا اسی درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن تقابلی مطالعہ سے کسی کا معیار اور درجہ قائم کرنا ذرا دشوار ہوگا۔

فانی بدایونی

جناب شوکت علی فانی بدایونی کے والد ماجد سرکار انگریزی میں پولیس انسپکٹر تھے اور انہوں نے شاید کسی سرکاری عہدہ کے لیے انہیں علی گڑھ سے ایل ایل بی کرایا تھا مگر انہیں تو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔ وکالت کا غیر شاعرانہ پیشہ اختیار کہاں کرتے چنانچہ والد کی چھوڑی ہوئی پونجی جو کئی پشتوں کا سرمایہ ہو سکتی تھی آہستہ آہستہ ٹھکانے لگا دی۔ کچھ دنوں لکھنؤ اور بریلی بسلسلہ وکالت رہے لیکن ان کی قسمت میں وکالت کا رزق نہ تھا وہ تو فطرتاً گداز دل، فراخ دست اور فراخ حوصلہ واقع ہوئے تھے جو تمام زندگی ان کی عسرت اور ناداری کا باعث رہا۔

فانی کی طبیعت عجیب تھی وہ کسی استاد کے شاگرد نہ ہوئے اور قادر الکلام ایسے کہ ابتداء میں دو دیوان مرتب کر لیے تھے جو چھپ نہ سکے اور تلف ہو گئے لیکن وحید احمد گیلانی مدیر رسالہ ''نقیب'' نے فانی کی چند پرانی غزلوں کے ساتھ دیوان کی شکل میں شائع کیا اور دوسرا دیوان ''باقیات فانی'' طبع ہوا۔

فانی غزل گو شاعر تھے اور ایسے منفرد غزل گو کہ ان کے بعد اب تک کوئی ان کی تقلید میں بھی کامیاب نہ ہو سکا اور حقیقت یہ ہے کہ اس آدمی کی تقلید کیسے ممکن ہے۔ جس نے کبھی زندگی کا جمالیاتی رخ دیکھا ہی نہ ہو اس کی مشکلات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ جس کی زندگی اسے موت کا عاشق بنا

دے اور ایسا عاشق جو موت کو زندگی سمجھنے لگے اور زندگی کا کوئی پہلو بھی اس کے سامنے نہ رہے۔

فانی ایک خوددار اور غیرت مند شاعر تھا یہی سبب تھا کہ وہ حیدر آباد میں جا کر بھی عسرت کے احاطے سے باہر نہ آسکا اسے کیا خبر تھی کہ حیدر آباد کی زندگی کے لیے جھوٹی خوشامد فریب کارانہ رکھ رکھاؤ اور مصاحبانہ انداز معاشرت کے بغیر زندگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ اس میں کامیاب تھے وہ حیدر آباد میں اچھی خاصی امیرانہ زندگی کے مالک رہے۔ لیکن فانی میں یہ لچک کہاں تھی کہ کہیں جھک جاتے اور محسوس نہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد ان کے لیے ایک ایسا ہسپتال ہو گیا جہاں مریض نہ مرتے ہیں اور نہ شفایاب ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیمار رہنے لگے اور بغرض علاج یا تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کشمیر کا سفر اختیار کیا ان کے ساتھ میرے پرانے دوست نجم آفندی بھی تھے اسی کی وجہ سے وہ لاہور آئے اور مجھے عزت بخشی اس ملاقات کے بعد بھوپال کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی بڑے ہی خلوص سے پیش آئے ان دنوں وہ پریشان تھے کیونکہ وہ اسکول کی ملازمت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ جناب جگرؔ، جناب جوشؔ اور راقم الحروف نے مشورہ کیا کہ نواب صاحب سے فانی کے وظیفے کے لیے کہا جائے لیکن ارادہ اور عمل کے باوصف ہم لوگ کامیاب نہ ہو سکے اسی مشاعرہ میں فانی کی یہ غزل پڑھی گئی۔

شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی چمک رہی ہے مرے آشیاں سے دور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور

اور اس غزل کا مطلع تو سبحان اللہ

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

۲۷ اگست ۱۹۴۱ء میں فانی موت کی ان پہنائیوں سے ہمکنار ہو گئے جس کی تمام زندگی

انہیں آرزو رہی۔

فانی کے یہاں مایوسی اور محرومی کا احساس جس طرز ادا کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ پورے اردو ادب میں کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا کہیں کہیں ان کا سوز و گداز غالب کے انداز میں ڈھل کر ایسا تیز نشتر ہو گیا ہے جو انسانی روحوں میں تیر جاتا ہے۔

ہر چند بعض لوگ فانی کی شاعری کو تعمیری شاعری نہیں کہتے لیکن جب فانی کے کلام کو پڑھتے ہیں تو فانی کو ایک بلند پایہ شاعر ماننتے بن پڑتی ہے۔ اس کی یاسیت نے سیکڑوں مایوسیوں کو سہارا دے رکھا ہے اور اس کے غم نے سیکڑوں مغموم دلوں کو سکوں بخشا ہوا ہے۔

مرتضیٰ حسین فاضل

مولوی مرتضیٰ حسین میرے کرم فرماؤں میں ہیں وہ جہاں عربی و فارسی کے فاضل ہیں وہیں شعر و ادب پر بھی عبور رکھتے ہیں اور کئی ادبی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں۔ ان کا تاریخ پر جزیاتی مطالعہ اور ادب پر محققانہ نظر ایسی ہے کہ ادب کے ہر رخ پر وہ سیر حاصل نقد و تبصرہ کرتے ہیں اور تحقیق میں ان کی نظر سے کوئی گوشہ بچ نہیں سکتا۔ جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے وہ ان کا ورثہ ہے۔ اساتذہ علماء اور حکماء کی صحبتوں نے ان کی فکر و تصور کی دھاریاں اور بھی تیز کر دی ہیں ادب کے نہایت اچھے مشیر اور تحقیق کے قابل قدر انسان ہیں۔

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو کون نہیں جانتا کہ وہ کبھی تو شاعر سے زیادہ ادیب اور کبھی ادیب سے زیادہ شاعر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ کاستھ ہیں اور سری واستو خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے والد جناب عبرت گورکھپوری نہایت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔

الہ آباد سے گریجویشن کے بعد انہیں گورنمنٹ نے آئی سی ایس کے لیے نامزد کر لیا لیکن ان دنوں وہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناہمواریوں سے اس قدر برداشتہ خاطر تھے کہ گورنمنٹ کی ملازمت کی بجائے کانگریس میں شریک ہو گئے اور طبیعت کی تشنگی کو وطن کی خدمت سے بجھانا چاہا اور اس سلسلے میں انہیں صعوبت زنداں بھی برداشت کرنا پڑی جو لیڈروں کی سنت میں داخل ہے قید سے رہائی ہوئی تو

کانپور کے کسی کالج میں لکچرار ہو گئے اور اس اثناء میں انہوں نے انگریزی میں ایم اے کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی نے انہیں انگریزی کا لکچرار لے لیا اور پھر انہوں نے زندگی بھر انگریزی پڑھانے کے ساتھ اردو کے شعر و ادب میں جو کام کیا وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں - چونکہ فراق کی نظر ہندی اردو، فارسی اور انگریزی کے ادب کو کھنگالے ہوئے تھی اس لیے ان کے لٹریچر میں آ کر جو باتیں ہمارے ادیبوں اور شاعروں تک پہنچیں اس سے دل و دماغ کھلی فضا میں آئے اس کے لیے اس پورے دور کو فراق صاحب کا ممنون ہونا چاہئے -

وہ جن دنوں زنداں کی فضا سے متعارف ہوئے ان دنوں مولانا حسرت موہانی ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صحبتیں ملیں - اس سے فراق کی شاعری نہیں شاعرانہ قوتوں کو اور بھی پر لگ گئے اور قید سے رہا ہو کر انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی ہاں شروع میں جناب ناصری اور وسیم خیر آبادی سے مشورۂ سخن ضرور کیا تھا - جسے وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے -

ابتدائی کلام میں فراق صاحب کے یہاں کہیں امیر ضیائی کہیں عزیز لکھنوی کہیں حضرت صفی لکھنوی اور کہیں میر کا رنگ جھلکا دیتا ہے لیکن بعد میں جب انہوں نے اپنی معلومات کو اشعار اور مضامین میں لانا شروع کیا اور ان کے مطالعہ نے پر نکالے تو فراق کے یہاں ایک ایسا سنجیدہ اور گمبھیر انداز کا لٹریچر پیدا ہوا کہ ملک کے کونے کونے سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے -

میں نے نہ جانے کتنے مشاعرے ان کے ساتھ پڑھے ہیں بلکہ جب وہ لائل پور کے مشاعرے میں آئے تو واپسی پر غریب خانہ ہی پر قیام رہا اس سے ان کی محبت اور قدر افزائی ظاہر ہے مشاعروں میں بھی میں نے انہیں اسی طرح پر خلوص پایا جو نجی صحبتوں میں تھے - جہاں وہ شعر پر فراخ دلی سے داد دیتے ہیں - وہ بڑے بے تکلف بھی ہیں اور میں نے ان کی معیت اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ پایا ہے - ان کی شاعری سے زیادہ تر ان کی فطرت کا جمالیاتی پہلو نمایاں ہے اور اسی کو شاعری کہتے ہیں - ویسے اگر غور کیا جائے تو ان کے یہاں عام زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی بڑے کارآمد خیالات ملتے ہیں - لیکن وہی جمالیاتی رخ ہر موڑ پر سامنے آتا ہے اور آنکھیں جھکا پیوند کر دیتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ وہ حسن و عشق کے بیان میں کہیں کہیں تنقیدی رخ بھی لے آتے ہیں - جس سے ان کا تغزل دوسرے غزل گو حضرات سے ایک الگ رخ اختیار کر لیتا ہے - جہاں کہیں عرفی

فارسی یا اردو الفاظ سے کام نہیں چلتا وہ بے تکلف ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جن میں حسن بھی ہوتا ہے اور نرمی بھی اور پھر عشق و محبت کے معاملہ میں تو ہندی الفاظ کے افسوں کا کوئی توڑ ہی نہیں ہے۔

بعض بعض جگہ فراق صاحب کے یہاں ایسا نفیس ابہام ہوتا ہے کہ قاری پھڑک اٹھتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں جب وہ کسی دور کے خیال کو قریب لا کر کسی نامانوس جذبے سے پیوند کرتے ہیں تو ذرا سوچ اور فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو شعر کے جادوئی تعریف سے نکل جاتا ہے۔ یوں تو فراق صاحب ہر صنف سخن پر قادر ہیں لیکن ان کی غزلیات اور رباعیات ان کی مخصوص اصناف ہیں اور ان میں بڑے بڑے نازک پہلو ملتے ہیں۔

آج جو اشاریت اور ایمائیت کا شور مچا ہوا ہے میرے خیال سے سب سے پہلے یہ فراق کے یہاں بڑے اچھے اور خوشگوار انداز میں پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جو پاکستان تک بمشکل تمام پہنچتے ہیں۔ فراق صاحب کے شاگردوں میں نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے مگر اس نابکار دنیا میں اعتراف اکتساب جرم خیال کیا جاتا ہے۔

فضل کریم فضلی

جناب فضلی اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اور فن کے اصولوں پر ان کی اچھی معلومات ہے وہ یوں تو نظمیں بھی کہتے ہیں اور گیت بھی ناول بھی لکھتے ہیں اور افسانے بھی لیکن اصل میں بات یہ ہے کہ وہ بہترین غزل گو ہیں اور صرف غزل کے آدمی ہیں۔ انہیں زبان اور اس کی نزاکتوں سے خوب آگاہی ہے وہ لفظوں کے انتخاب اور روزمرہ و محاورات کا استعمال خوب جانتے ہیں۔ وہ غزل کے مزاج اور شعر کے رموز سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "چشم غزال" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

فہیم بیگ چغتائی

جناب فہیم بیگ چغتائی گوالیار کے رہنے والے تھے اور لاہور پیسہ اخبار میں قیام پذیر رہے۔ پھر ان کے ایک شاگرد جناب قمر انہیں پشاور لے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے نہایت اچھے ادیب اور شاعر تھے اردو زبان کی نزاکتوں سے آگاہ اور روزمرہ و محاورہ کے استاد۔ ان کی کچھ کتابیں بھی

چھپی تھیں جن میں ''محمدی بوا'' اور ''چہیتا بھائی'' میرے کتب خانہ میں موجود ہیں وہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بڑے بھائی تھے لیکن اپنی خودداری کے باعث ان سے دور دور رہے زبان کے معاملہ میں ایسا آدمی اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔

محمد عثمان فارقلیط

مولانا فارقلیط فارسی اور عربی کے منتہی ہیں تقسیم سے پہلے لاہور کے صحافی حلقوں میں قابل احترام تھے اور اب دہلی میں ''الجمعیۃ'' میں ان کا قلم اپنی جولانیوں پر ہے۔ جہاں تک میں نے فارقلیط صاحب کا مطالعہ کیا ہے وہ ایک عظیم ادیب اور صحافی ہونے کے علاوہ عقیدے اور خیال کے اعتبار سے بڑے اچھے مسلمان ہیں۔ ان کے قدم ممکن ہے کبھی لڑکھڑا جاتے ہوں لیکن ان کا قلم کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ ان کی اخبار نویسی بھی معمولی درجے کی نہیں ان کے دماغ میں معلومات اور سینے میں یقین کا اندازہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

فیاض محمود

گروپ کیپٹن فیاض محمود صاحب اسلامیہ کالج میں لکچرار تھے اس کے بعد وہ فوج کے تعلیمی شعبہ میں لے لیے گئے اب فوج سے سبکدوش ہو کر یونیورسٹی میں ''تاریخ ادبیات پاکستان'' کے صدر شعبہ ہیں اور یہ جناب پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر کی نہایت مفید اور ضروری بنیاد ڈالی ہے۔ خدا اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین جناب فیاض محمود صاحب کی فطانت قابل داد ہے کہ وہ زندگی بھر فوج میں رہ کر بھی علم و ادب اور تاریخ و تدقیق کے ایسے اہم شعبہ کی ذمہ داری پر لبیک کہہ رہے ہیں۔

فخری پانی پتی

فخری مرحوم جناب سلیم پانی پتی کے شاگرد تھے ان کی تربیت نے جہاں انہیں شاعر ادیب مضمون نگار نعت نویس اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا تھا۔ وہ ترنم میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور شاعری میں وہی شاعری کرتے تھے جو وقت کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ حسن و عشق کی شاعری کو بیکار

خیال کرتے تھے اور وہ شاعری جس سے انقلاب کی بنیادیں انھیں ان کا محبوب رخ تھا مگر ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوسکا- زندگی عسرت میں گزری لیکن خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا اور اپنے نظریات سے ایک انچ نہیں ہٹے-

فائق رام پوری

کلب علی خان فائق رام پور کے رہنے والے ہیں وہ وہاں پبلک لائبریری میں ممبر تھے اور ساتھ ساتھ عدالت فوجداری میں بھی اچھے خاصے ذمہ دار عہدہ پر تھے- پاکستان کی فضا نے انہیں خوب شکنجہ میں کسا لیکن ان کی دماغی صلاحیتیں محفوظ ہیں ان کا حافظہ ادبی اور علمی معلومات کے علاوہ تاریخی شواہد کا محافظ خانہ ہمارے ادبی حلقوں میں ان کے اسلوب نگارش اور معلوماتی صلاحیتوں کے بہت کم آدمی نکلیں گے آج کل وہ لاہور میں ''مجلس ترقی ادب'' میں کام کر رہے ہیں- چنانچہ ''مومن'' اور آرائش محفل کی ترتیب و تدوین جدید انہی کے قلم کی مرہون منت ہیں ان کے علاوہ کلیات مومن' کلیات سلیم اور کلیات سالک اور کلیات خلق کو بھی فائق صاحب ہی نے ایڈٹ کیا ہے-

آدتیہ پرشاد فدا

لاہور میں فدا صاحب اسکول میں معلم تھے اور قومی نظمیں کہتے تھے وہ ملک کے خیر خواہ تھے اور کانگریسی لوگوں میں ان کا خاص وقار تھا- وہ قابل قدر انسان تھے ان کے کئی دیوان چھپ چکے تھے اور ان میں ان کی زندگی بھی تھی- وہ پڑھ کر جب ان کی نظموں کو دیکھتے ہیں تو ان کی شخصیت بڑی بلند اور پرخلوص نظر آتی ہے اس کے علاوہ محب وطن لوگوں میں بھی وہ ایک خاص مقام کے انسان معلوم ہوتے ہیں-

فاخر ہریانوی

جناب فاخر ہریانوی معصوم ہیں اور یوں تو وہ اصناف سخن میں ہر صنف پر حاوی ہیں لیکن وہ زیادہ نظم ہی کہتے ہیں اور مولانا تاجور صاحب ''ادبی دنیا'' نکالتے تھے اس میں جناب فاخر مستقل چھپتے تھے اور انہوں نے نہایت اچھی اچھی نظمیں کہی ہیں اقدار انسانیت و شرافت پر وہ اپنی نظموں میں

زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں شعر میں صفائی اور شستگی کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔ اس دور کے جن رسالوں اور اخباروں میں ان کی نظمیں چھپتی تھیں ان کی مقبولیت زیادہ تھی ان کا ابھی کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔

فرخ امرتسری

بزم سروش کے سرگرم سیکریٹری تھے شاعری کے ساتھ بچوں کے لیے کتابیں بھی لکھتے تھے اور معاوضہ پر تصنیف و تالیف کے علاوہ خوش نویسی ان کا مشغلہ تھا۔ وہ پرانے قدیم دہچر کے انسان تھے لیکن نہایت زندہ دل اور صاحبِ ذوق، تقسیم کے وقت لاہور آ گئے تھے اور لاہور ہی میں انتقال ہوا۔

فیض احمد فیض

جناب فیض ایک معیاری شاعر اور باکمال صحافی ہیں۔ انہیں اپنی زبان کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی میں بھی برابر کی مہارت ہے۔ اس ملک کے لیے ان کا وجود غنیمت بھی ہے اور عظمت بھی۔

ان کے خیالات و نظریات سے عمل کی ایسی منہ زور راہیں نکلتی ہیں جس پر جرأت و یقین کی شمع لیے وہ خود بھی چل نکلتے ہیں اور یہیں آ کر ان کی شاعری کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے۔ انہیں خودی کے راستوں سے بے خودی بھی نہیں بھٹکا سکتی جس سے شاعر اور ادیب کم عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

جناب فیض پاکستان کے بلند پایہ صحافی ہیں اور عظیم الفکر ادیب، انہوں نے شاعری کو ایک ایسا اسلوب دیا ہے، جس میں نرمی بھی ہے اور رنگینی بھی ہے اور بیداری بھی۔

جناب فیض اخلاقی بلندی اور ادب دوستی میں بھی مثالی انسان ہیں۔ ان کے نثری مضامین میں ان کی بلندی فکر اور اسلوب تحریر میں فلسفیانہ فکر ہے۔

دل محمد فضا جالندھری

جناب فضا جالندھری بڑے کہنہ مشق اور پختہ عزائم کے انسان ہیں جناب دل شاہجہاں پوری اور نواب فصاحت جنگ جلیل سے تلمذ ہے ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی تربیت کلام میں ایسے استنام نہیں

چھوڑتی جن پر اچانک نظر پڑ جائے فضا صاحب کے ادبی مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں اور نہایت مفید ہیں سنا ہے کہ اب اپنا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ آج کل خانیوال میں ہیں۔

فطرت واسطی

جناب فطرت سے عرصہ ہوا ملاقات ہوئی تھی وہ بڑے سلجھے ہوئے ذہن کے انسان ہیں اور ان کی نظم اور غزل کے مضامین میں بڑا اعتدال پسندانہ انداز ہے۔ تحریک آزادی کے دور میں انہوں نے بھی شعراء آزادی کا ساتھ دیا ہے وہ ہیں تو معلم مگر ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ حیثیت ان کے مشغلہ سے بالکل جدا ہے اور وہ ایک الگ انسان ہیں۔ مجموعہ کلام چھپ چکا ہے جو شعراء کے طبقے میں ان کا مقام متعین کرتا ہے۔

فرق انبالوی

جناب فرق انبالوی اپنے دور کے اچھے شعراء میں تھے اور ان کے کلام میں ابتذال نہیں تھا یہ الگ بات ہے کہ وہ قدیم روش کی شاعری کرتے تھے لیکن اس میں بڑی مہارت تھی اور اچھے بلند شعراء میں شمار ہوتے تھے ان کے مجموعہ کلام سے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

پریم شنکر فرحت

جناب فرحت اچھے انسان بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی ان کی شاعری میں روائیتی خصوصیات کے ساتھ دیواریں نہیں ہیں وہ حسن و عشق کے علاوہ بھی اپنے مشاہدات اور تجربات کو شاعری میں لاتے اور انہیں جزویات خیال کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ زبان سے نابلد ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی اور شاعری جدا جدا نہیں بلکہ شاعری زندگی کی روداد اور اشعار مشاہدات و تجربات کی تصویریں ہیں۔

فاضل زیدی

قصبہ شاہ پور ریاست ٹونک کے رہنے والے ہیں اور نواب شاہ میں مقیم ہیں۔ غزل نظم اور مرثیہ ہر سہ اصناف سخن میں ان کے پاس اچھا خاصا مواد ہے۔ ۱۹۵۴ء میں ''اشک و آہ'' کے نام سے

ایک مجموعہ چھپا تھا وہ فرماتے ہیں کہ دوسرا مجموعہ ''ادائے دل'' کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔

فطرت اکبرآبادی

فطرت اکبرآبادی آگرہ کے رہنے والے تھے میں نے جب کپورتھلہ کے مشاعرہ میں حضرت سیماب کے ساتھ انہیں دیکھا تو اس وقت وہ جوانی میں قدم رکھ رہے تھے اور بڑے بانکپن سے رہتے تھے۔ کالی شیروانی' چوڑی دار پائجامہ اور غزلوں کی بیاض پر کارچوبی سے تاج محل کی تصویر' تقسیم کے بعد جب وہ لاہور آئے تو بڑی ہی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ بڑے بڑے بال میلے کپڑے اور پریشان روزگاری سے اترا ہوا چہرہ اس وقت جلد سازی کرتے تھے لیکن وہ اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ مسلسل کام بھی نہیں کر سکتے تھے ایک دن ان کو بخار کے ساتھ تشنج ہوئی اور اسی میں بڑی بے کسی و بے بسی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

فضل الدین فدا کھیم کرنی

جناب فضل الدین فدا ریلوے میں ملازم ہیں اور اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں جس پر انہیں عبور نہ ہو نہایت نیک اور سادہ خاطر انسان ہیں وہ ادبی سوسائٹیوں اور مشاعروں میں شامل نہیں ہوتے مگر نظمیں غزلیں مستقل کہتے ہیں اور شہرت کی طلب نہیں رکھتے کبھی ان کا مجموعہ چھپا تو ادب میں اچھا خاصا اضافہ ہوگا۔

فیض کاظمی

جناب فیض کاظمی' گورکھپور کے رہنے والے ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد سید پور ضلع رنگ پور مشرقی پاکستان سے لاہور آئے اور لاہور میں حسابات کے شعبہ سے متعلق رہے کہ پھر کراچی تبادلہ ہوا اس کے بعد ریلوے سے مستعفی ہو کر واپس لاہور میں آ گئے اور یہیں قیام ہے یہ جناب عبدالرحمن صاحب زاہد اعظم گڑھی کے شاگرد ہیں۔

نظم اور غزل کہتے ہیں مگر زیادہ رجحان غزل کی طرف ہے اور جس معیاری غزل کہتے ہیں ویسا ہی پڑھتے بھی ہیں اور اس طرح ان کا کلام ایک افسونی اثر کا حامل ہو جاتا ہے اور مشاعروں میں دادو

تحسین کا شور برپا ہو جاتا ہے ابھی کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا۔

فرحت زبیری

جناب فرحت زبیری میرٹھ کے رہنے والے ہیں صاحبِ ذوق ہیں اور جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے اچھی خاصی مشق ہے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں میں برابر کا ملکہ ہے اور ان سے کئی اردو پسند لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ جب بھی مشاعرہ میں انہیں سنا ان کی غزلیں سن کر مایوسی نہیں ہوئی بلکہ ان کے مستقبل پر امید افزا جھلک محسوس کی دفتری مصروفیت کے باوصف بے تکلف غزلیں کہتے اور سناتے ہیں۔

فراق لکھنوی

جناب فراق لاہور میں ملازم ہیں سر سے پاؤں تک لکھنوی مگر شاعری میں غالباً لکھنؤ کا اتباع نہیں کرتے البتہ زبان میں وہی لوچ اور لچک موجود ہے۔ نوجوان ہیں اگر ان کا ذوق زندہ رہا تو اچھے نکلیں گے ان کی غزلوں سے ان کے مستقبل پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

سید فیاض علی مرحوم

سید فیاض علی صاحب پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل تھے نہایت خوش خو اور خوش مذاق انسان۔ بڑے بلند پایہ کے ادیب اور ناول نگار! ان کے دو ناول ''شمیم اور'' ''انور'' اس قدر مشہور ہوئے اور پڑھے گئے کہ ہندوستان بھر میں شور مچ گیا۔ مرحوم سے بڑے اچھے مراسم تھے انتقال سے پہلے وہ ایک مسودہ تیار کر رہے تھے جس کا کچھ حصہ میں نے بھی دیکھا تھا لیکن ان کی اچانک موت کے بعد اس مسودے کا پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گیا یا کس کے پاس رہا۔ فیاض کے یہ دونوں ناول ان کے انداز تحریر اور اسلوب نگارش کے شاہد رہیں گے۔

برکت علی فراق

جامعہ ملیہ میں استاد ہیں۔ بڑے خلیق اور شریف انسان بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے ان میں بھی بچوں جیسی معصومیت آ گئی ہے۔ گفتگو میں وہی نرمی اور جاذبیت سادگی میں دلکشی اور تعلق میں خلوص

مضامین بھی لکھتے ہیں اور وہ بھی سہل ممتنع کے حامل ہوتے ہیں ان کے یہاں مغلق الفاظ نہیں آتے اور کہیں ابتذال نہیں پایا جاتا۔

فہمی ترمذی

محمود اعظم فہمی مصنف شعرستان وگلبانگ بھوپال میں تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو وطن بنالیا۔ بھوپال میں شہرت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے ان کی نظموں میں وطن دوستی اور انسانیت پرستی کے علاوہ مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ اور وہ غالباً بھوپال کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے اظہار خیال کے لیے غزل کا انتخاب نہیں کیا اور خوب نظمیں کہی ہیں۔

دلاور فگار بدایونی

بدایوں کے نوجوان شاعر ہیں اور طنز و مزاح کے دھنی ہیں ان کی کتاب پر ان کی گورنمنٹ نے انعام بھی دیا ہے۔ وہ ہندوستان کے طنز نگار شاعروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں یوں تو وہ تعلیم و تعلم کے آدمی ہیں اور کالج میں لکچرار ہیں لیکن مشاعروں میں وہ طنز نگار شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور جب وہ اسٹیج پر آتے ہیں تو نظموں اور غزلوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں ابھی وہ ماشاءاللہ نوجوان ہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا میدان پڑا ہے اور ترقی کے لیے راستے ہی راستے۔

فاروق بانسپاری

جناب فاروق بانسپاری، ضلع گورکھپوری کے رہنے والے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''سوز و ساز'' کے نام سے چھپا ہے۔ وہ اپنے کلام میں انفرادی غم سے زیادہ اجتماعی ہمدردی کو اہمیت دیتے ہیں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں ان کے جذبات و احساسات کا آئینہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ہم عصر شعراء میں صرف فاروق صاحب ہی کو وہ مقام حاصل ہے جسے صحیح معنی میں وقت کا نباض کہا جاسکتا ہے۔ ان کی اسی خصوصیات سے غزل کو نظم پر اور نظم کو غزل پر فوقیت ہے۔ وہ اپنے سینے میں پورے ملک کا درد لیے ہوئے ہیں۔ جو ان کی شاعری کے دریچوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ اور ان کے ہر شعر کو معاشرہ کے زخم کی تصویر بنا دیتا ہے۔ کاش ایسے شاعر ہمارے ملک میں پھلیں پھولیں اور امن

دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں۔

فرہاد لکھنوی

آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور اعلیٰ درجے کے تاریخ گو تھے نابینا ہونے پر ان کا حافظہ کچھ زیادہ روشن ہو گیا تھا اور انہیں کتابوں کے باب کے باب اور فصلیں کی فصلیں یاد تھیں۔ انہیں فن شعر کے معائب و محاسن پر بلا کا عبور اردو زبان و بیان پر قدرت تھی۔ انہوں نے جن اساتذہ سے پڑھا تھا یا دیکھا تھا ان کے عجیب عجیب واقعات سنایا کرتے تھے۔ جو تاریخ ادب میں موجود نہیں تھے۔

فرمان فتح پوری

جناب فرمان فتح پوری کراچی میں ہیں اور نظم، غزل، تنقید، تبصرہ ہر صنف ادب پر لکھتے ہیں۔ جناب نیاز فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' کو وہ عرصہ سے مرتب کر رہے ہیں۔ فرمان صاحب کو تحقیقی مضامین میں بھی خاص مہارت ہے اور نقد و تبصرہ میں بھی انہیں بڑی دسترس ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ان کی معلومات اور کاوش نظر کا پتہ چلتا ہے۔ وہ نہایت ہونہار قسم کے انسان ہیں اور ابھی ان کی ترقی کے لیے بڑا امید ان ہیں۔ خدا کامیاب کرے آمین!

فضل دہلوی

جناب فضل دہلوی پہلے لاہور میں تھے اور اب ایک عرصہ سے کراچی میں جا بسے وہ طنز و مزاح کے شعر کہتے ہیں اور سیکڑوں لوگوں سے اچھا کہتے ہیں۔ ان کے یہاں پھکڑ پن نہیں وہ معمولی معمولی باتوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ نظمیں میں نے سنی ہیں وہ اس شعبہ میں بڑا سوچ سمجھ کے کہتے ہیں۔ اگرچہ ارتجال میں کبھی کبھی دہلوی انداز کا کرخنداری مذاق بھی آ جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ کمال کرتے تھے کہ کلام فحش نہیں ہونے دیتے۔

فدا گلاوٹھوی

جناب فدا سے کانپور کے مشاعرہ میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت وہ اساتذہ میں تھے اور میں نے مشاعروں میں آنا شروع کیا تھا۔ ان میں تمام وہی خصوصیات تھیں جو قدیم طرز کے استادوں

میں ہوتی تھیں وہی فن کے مختلف گوشوں پر نکتہ چینی اور الفاظ کے مزاج پر اعتراض جس میں ان کے مطالعہ کا پتہ چلتا تھا۔ نہ معلوم ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

فغاں علی گڑھی

جناب فغاں علی گڑھ کے ان لوگوں میں تھے جنہیں مشاعروں میں بڑی عزت و احترام سے بلایا جاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ تھے اس لیے کہ وہ اچھے اور بلند رتبہ شاعر تھے۔ ان کے مجموعہ کلام کے متعلق معلوم نہ ہو سکا۔

فکر ندوی

جناب فکر ندوی سے خط و کتابت سے تعلق پیدا ہوا اور دیوبند کے مشاعرہ کے بعد ملاقات ہوئی اس کے بعد دہلی میں بھی وہ ملتے رہے وہ نظم و نثر دونوں میں رواں تھے مگر پھر ممانت کی طرف چل نکلے اور شعر و ادب برائے نام رہ گیا عرصہ سے ان کا نام کہیں پڑھنے میں نہیں آیا۔

فرحت شاہ جہاں پوری

فرحت اللہ خان نام فرحت تخلص، میں جب ان سے ملا ہوں تو یہ بزم ادب شاہجہاں پور کے سیکرٹری تھے میرے دوست جناب ضیاء الاسلام ان دنوں وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے انہوں نے فرحت صاحب سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ نوجوان بڑے ہونہار ہیں اور ان میں ترقی کے آثار ہیں۔ اگر چہ فرحت کو غربت کے مصائب اپنوں کی چشم پوشی اور مقامی تعصب رکھنے والوں نے گرد و غبار سے نہیں نکلنے دیا لیکن انہوں نے اپنی علمی ادب جد و جہد کو جاری رکھا سرکاری نوکری میں انہوں نے اپنے قلم سے ملک کے باوقار جرائد اور اخبارات میں جو کچھ لکھا ہے اور لکھتے رہتے ہیں وہ ان کی قیمت کا اعلان اور مقام کے تعین کے لیے کم نہیں ہے۔

نظم اور غزل میں دسترس ہے اور رواں شعر ان کے یہاں بکثرت ملتے ہیں چونکہ اتنے بوڑھے نہیں ہیں۔ اس لیے غزلوں میں حسن و عشق کے واردات کا بیان بھی شگفتگی سے کرتے ہیں۔ حساس انسان ہیں اس لیے قدم قدم پر شاعری کا مواد مہیا ہوتا رہتا ہے۔ زود گو ہیں اور الفاظ کا انتخاب

حیرت ناک حد تک اچھا اور برمحل کرتے ہیں۔ ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

فیض جھنجھانوی

فیض جھنجھانوی صاحب، جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں تقسیم کے بعد پاکستان میں آئے اور لائل پور میں مقیم ہیں لائل پور کاٹن ملزم میں ملازم رہے اور اب خود اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور باعزت زندگی گزر رہی ہے۔

کہنہ مشق شاعر ہیں اور جہاں تک فن کا معاملہ ہے اس میں انہیں ضرورت سے زیادہ عبور ہے وہ اصناف شعری میں ہر صنف پر قادر ہیں وہ اپنے خیالات وتصورات کو بڑی چابکدستی سے نظم کرتے ہیں۔ اور شعر میں کسی قسم کا جھول نہیں آنے دیتے ان میں ایک استادانہ استعداد ہے مگر لائل پور میں چونکہ اردو ادب کا چرچا بہت کم ہے۔ وہ تو تاجروں اور ملوں کا شہر ہے اس لیے ان کی علمی ادبی اور شاعرانہ مہارتیں اول تو خاموش رہتی ہیں اور کبھی کبھی اعلان پر آتی ہیں تو اردگرد زندہ مردوں کا قبرستان ہر آواز کو پی جاتا ہے۔ لائل پور سے نہ تو کوئی قابل ذکر ادبی جریدہ چھپتا ہے اور نہ کوئی اخبار حالانکہ لائل پور پاکستان کا مانچسٹر ہے اس میں تو پاکستان کا سب سے بڑا پریس ہونا چاہیے لیکن یہاں کا سرمایہ دار صرف اپنے جاہل ملک کے خون سے سونے کے ذرات تو نکال سکتا ہے لیکن علمی ادبی خدمات کو جرم سمجھتا ہے حیرت ہے کہ یہاں کے تاجر اپنے پروپیگنڈے کو بھی گناہ خیال کرتے ہیں آخر یہ تاجر دوسرے ترقی یافتہ ملک تجارت کو تجارت کی طرح کرتے ہیں، اور یہاں ہر تاجر تجارت کو ایک موسمی شکار خیال کرتا ہے اور اس میں ملک کے بڑے بڑے فنکار گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جن میں شاعر، ادیب، سائنسٹ، فلسفی اور آرٹسٹ وغیرہ سب شامل ہیں۔

فارغ بخاری

سید میر احمد شاہ بخاری، اردو، فارسی اور پشتو میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور انگریزی سے بھی بقدر ضرورت آشنا ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر ہیں۔ لیکن ان کا فطری لگاؤ ادب وشعر سے ہے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ شعر وادب کی ترویج میں گزرتا ہے۔

وہ کئی ایک رسالوں میں کام کر چکے ہیں اور جناب رضا ہمدانی کے ساتھ پشاور سے ایک رسالہ

''سنگ میل'' کے نام سے بھی نکالا تھا - جو غالباً آزاد خیالی اور آزادروی کے جرم میں بند ہو گیا اور یہ خود ترقی پسندی کے جرم میں ایک سال کے لیے زنداں میں ڈال دیئے گئے -

جناب فارغ نظم اور غزل دونوں میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور ہم عصر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں - وہ رومانی اور انقلابی نظموں کے علاوہ غزل بھی نہایت اچھی کہتے ہیں - نظم اور غزل دونوں میں فارغ کی نظر سیاسی نشیبوں اور اخلاقی ڈھلوانوں پر رہتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائی میں نہایت کامیاب شاعر ہیں - جوں جوں عمر کے میدان میں بڑھتے جاتے ہیں ان کے خیالات پختہ اور انداز بیاں حسین ہوتا جاتا ہے -

وہ اپنے شعور کی بلندیوں سے پستی کی طرف نہیں جھانکتے ان کی نظر ہمیشہ مستقبل کی بلندیوں پر رہتی ہے - ان کے یہاں ایک جذبہ ہے اور جذبہ میں جب شدت ہوتی ہے تو وہ اپنے اشعار جوالہ بنا دیتے ہیں اور اس عمل میں ان کا کوئی مثل نہیں ہے - خصوصاً عرصہ سرحد میں وہ اپنی روش کے واحد شاعر ہیں وہ اپنے فن اور سعی عمل کے باعث آج اپنے ہم عصر شعراء میں نظر انداز نہیں کئے جاتے یہاں مذہب، خدا اور اخلاق جیسی زندگی کی قدریں نظر انداز کی جا رہی ہیں -

جناب فارغ نثر اور نظم دونوں میں بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں ان کی نظموں کا مجموعہ ''زیرو بم'' اردو ادب میں ایک صحت مند اضافہ ہے اور ان کا ذوق سلیم معروف سفر اب نہیں معلوم کہ وہ کس بلندی پر جا کر رکیں گے -

فاضل مشہدی

فاضل مشہدی صاحب امرتسر میں تھے تقسیم ملک میں وہ لاہور چلے آئے تھے - پختہ عمر کے آدمی تھے اور عمر کے لحاظ سے ان کا کلام بھی پختہ تھا اور کئی کتابیں بھی ان کے قلم سے نکل چکی تھیں - لیکن ان کے کلام کا مجموعہ نظر سے نہیں گزرا البتہ مذہبی اور قومی قسم کی کئی نظمیں چھپی ہوئی دیکھی ہیں وہ بے تکلف شعر کہتے ہیں - لیکن روش قدیم کے دلدادہ ہیں اور نئی تہذیب کے مقابلے پر پرانی تہذیب کو ترجیح دیتے ہیں -

اے کے فضل الحق

اے کے فضل الحق صاحب شیر بنگال کے نام سے مشہور تھے اور بنگال کے بڑے سیاسی آدمی تھے۔ ان سے شملے کے مشاعرہ میں تعارف ہوا اور میں نے انہیں نہایت بلند ذوق انسان پایا ان کا مرغوب مشغلہ پس ماندہ، یتیم اور نادار لوگوں کے بچوں کو تعلیم دلوانا تھا چنانچہ ان کی آمدنی اور دوسری تمام آمدنیاں اسی ذوق پر صرف ہوتی تھیں اور وہ مقروض رہتے تھے یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے ۲۳؍مارچ ۱۹۴۰ء بروز جمعہ قرارداد پاکستان پیش کی تھی اور پاکستان جب جمہوریہ بننے لگا تو ۲۳؍ مارچ بروز جمعہ اساسی دستور پیش کیا افسوس کہ میں ان سے قریب نہیں رہ سکا ورنہ ان کے مکمل حالات قلمبند کرتا۔

ابوالفطرت میر زیدی

جناب فطرت بہت دنوں سے کہتے ہیں اور انہیں کسی حادثے واقعے یا مشاہدے کو نظم کرتے کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ غالباً نوشہرہ میں وہ کسی سرکاری دفتر سے منسلک ہیں اور عرصہ سے وہیں ہیں سنا جاتا ہے کہ انہوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی ہے ایک زمانے میں وہ جب لاہور تھے تو ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ اب عرصہ سے نہیں ملے۔

قدرت اللہ شہاب

جناب شہاب انتظامیہ کے ذمہ دار رکن ہیں لیکن اس کے باوصف ان کا ذوق ادب صرف زندہ ہی نہیں تازہ اور شگفتہ بھی ہے وہ جہاں نظم وضبط کے مشاق ہیں وہیں تنقید و تبصرہ کے آدمی بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا اسلوب قلم اور انداز بیاں ایک الگ رخ رکھتا ہے وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو اپنے انداز نگارش سے سہل ممتنع میں ڈھال دیتے ہیں اور یہ اصول تحریر کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

جہاں تک یہاں اردو کی ترویج و اشاعت کا معاملہ ہے ان کی سعی فکر و عمل سب سے زیادہ ہے۔ وہ علم و ادب کی توسیع و ترقی کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کی زندگیوں کو بھی آسودہ و آسان بنانے کی

فکر میں رہتے ہیں اگر کسی ایماندار آدمی نے اردو کی تاریخ لکھی تو جناب شہاب کا ایک خاص مقام ہو گا۔

قلندر علی ولیؔ

رسالہ ''مخزن'' کے دور میں جن شعراء نے شہرت حاصل کی ان میں قلندر علی ولیؔ کا نام بھی آتا ہے۔ وہ اصناف سخن میں کسی صنف پر بھی اظہار عجز نہیں کرتے تھے۔ وہ اگرچہ وکالت کرتے تھے۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود انہیں شعر و ادب سے انتہا کا شغف تھا اور بہت اچھی مہارت کے لوگوں میں تھے۔ زمانہ ہوا علم فصاحت پر ان کی ایک کتاب چھپی تھی جو میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ لیکن ان کا مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا۔

مرزا ہادی علی بیگ قیسؔ

اردو فارسی سے عشق اور ساری زندگی اردو فارسی پڑھائی۔ علمی ادبی معلومات کا ایک ذخیرہ سینے میں لیے بیٹھے ہیں قدیم رنگ میں ان کی شاعری اساتذہ سے لگا کھاتی ہے وہ فن شعر کے معائب و محاسن سے آگاہ ہیں اس لیے ان کے یہاں فنی اسقام نہیں ملتے۔ سنجیدہ خیالات اور اخلاقی اقدار ان کی شاعری کا جزو لازم ہیں کاش وہ کوئی کتاب علم معانی و بیان پر لکھیں کیونکہ ایسی کتاب کی ضرورت ہے اور لاہور میں چند ہی آدمی اس سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔ جن میں مرزا ہادی علی بیگ پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے۔

قدیر لکھنوی

جناب قدیر لکھنو کے قابل ذکر اور پختہ شعراء میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ جناب قدیر جب مجھے لاہور آ کر ملے تو لائبریری میں سے پہلی ملاقات ہی ایسی تھی کہ ان کی گفتگو اور بیان سے لکھنؤ کے مزاج شعری سے آگاہ ہو گیا۔ جناب قدیر نے اپنے انتخاب کے ایسے ایسے شعر سنائے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

جناب قدیر بھی سراج صاحب کی طرح لکھنوی انداز کے ہلکے ترنم سے غزل پڑھتے تھے اور

جگہ جگہ ان کے کمال فن کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ نہ ادق الفاظ، نہ پیچیدگی، نہ تشنگی، نہ ابتذال سہل ممتنع کا جادو ان کے پورے اسلوب بیان کا رنگ وروغن معلوم ہوتا تھا۔ نہ معلوم کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

قمر مرادآبادی

جناب قمر مرادآبادی دھان پان قسم کے انسان ہیں اور اپنے اردگرد کے حلقوں میں گمنام نہیں۔ جہاں تک شعروشاعری کا ذکر آتا ہے اس میں قمر صاحب کا نام بھی ضرور آتا ہے۔ وہ مرادآباد کے مقبول و مشہور شاعر ہیں جناب قمر مخلص اور حساس دل رکھتے ہیں اور ان کی یہ دونوں خصوصیتیں ان کی شاعری میں بھی ملتی ہیں وہ صرف تجربوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز اور اشاروں کو بھی دیکھتے اور سنتے ہیں۔

محمد حسین قمر جلالوی

حضرت قمر جلالوی کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ کی نمائش میں سنا تھا۔ وہ بڑے ڈھب کے شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں سادگی میں پرکاری ہے اور اصطلاحات ومحاورات کا استعمال ان کے یہاں اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے اور اس میں کوئی درز نہیں ہوتی وہ شعری صنف میں یوں تو غزل کے لیے مشہور ہیں لیکن وہ مرثیہ غزل سے بھی اچھا کہتے ہیں جب وہ مرثیہ پڑھتے ہیں تو غزل کے شاعر بالکل نہیں ہوتے وہاں ان کی روح بولتی ہے اور دل کام کرتا ہے اور غزل میں صرف دماغ سادہ کاری دکھاتا ہے ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں دیکھا۔

قتیل شفائی

جناب اورنگ زیب قتیل شفائی کا وطن مالوف ہری پور ہزارہ ہے میں ان سے سب سے پہلے راولپنڈی کے ایک مشاعرہ میں ملا اور پھر مختلف مشاعروں میں ملتے رہے۔

اچانک ۱۹۴۷ء میں قتیل شفائی نے لاہور میں اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا اور اب تک وہ فلمی لٹریچر کے علاوہ اپنے شعری جذبہ کو نظموں اور غزلوں کی صورت عالم آشنا کرتے رہتے ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے جناب حکیم شفا کانپوری سے اصلاح لی تھی۔ یہ ان کی بڑی وفاداری ہے کہ انہوں نے

جناب شفا کی نسبت کو اپنے نام کا جزو بنالیا-

لاہور میں آ کر انہوں نے جو سلیقہ شعر پایا ہے- وہ جناب ندیم قاسمی کا مرہون نظر ہے- اس میں کیا شک ہے کہ وہ فلم کے مشہور شاعر ہیں لیکن وہ نظم اور غزل دونوں کے عیوب ومحاسن سے آشنا ہیں اور پھر جناب ندیم قاسمی کی معیت اور مشورہ دونوں ان کی بلند پائی کے معاون ہیں ان کے گیتوں کا مجموعہ ''ہریالی'' ان کے غنائی شاعر ہونے کی ضمانت ہے جس میں وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں- اگر سچ پوچھیے تو قتیل صاحب اردو زبان میں گیتوں کے خلا کو پاٹنے میں مصروف ہیں اور یہ بڑی خدمت ہے-

جناب قتیل کے کلام میں موجودہ دور کے رجحانات ادب اور دور حاضر کی اخلاقی قدروں کے زخموں کا مرہم بھی دستیاب ہوتا ہے- جو وقت کے تقاضے کی بڑی پروقار تعمیل ہے-

قیس شروانی

جناب قیس شروانی جموں کے رہنے والے ہیں تقسیم ملک کے بعد وہ گوجرانوالہ میں آ بسے تھے اور وہیں ہیں شعر وشاعری میں بڑے کہنہ مشق اور برساتیں دیکھے ہوئے شاعر ہیں- انہوں نے جموں میں جو اردو کی توسیع واشاعت کے لیے کام کیا ہے وہ ان کی بڑی خدمت ہے- جناب قیس شعر کے حسن وقبح سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان کے کلام میں فنی نشیب نہیں آتے نہ معلوم کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں-

قیصری ایڈووکیٹ

جناب قیصری سے میں تقسیم سے پہلے فیروز پور کے مشاعروں میں ملتا رہا ہوں- وہ اپنے دور کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے اور اکثر مشاعروں کی نشستیں انہی کے مکان پر ہوتی تھیں- تقسیم کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا سرمایہ کلام کہاں اور کس کے پاس ہے وہ بحیثیت انسان بھی خوب آدمی تھے-

قیس جالندھری

امر چند نام قیس تخلص جالندھر کے رہنے والے ہیں اردو، فارسی بقدر ضرورت ہے۔ لیکن شعر کہنے کا ملکہ انہیں اول سے اور قیس ملاپ کا پورا پورا مشاعرہ بیک وقت مختلف ناموں سے مکمل کرتے تھے۔ شاعر کے علاوہ امر چند قیس بڑے اعلیٰ پائے کے صحافی ہیں اور مخلصی کے اعتبار سے ہر دل عزیز ہیں، وہ جب تک لاہور میں رہے بڑی بے غل وغش زندگی گزارتے رہے حالانکہ قیس کی عادت اور خصلت سب عیاں تھی۔ لیکن قیس صاحب بڑی محنت اور کاوش سے وقت گزارتے تھے اور یہی محنت ہے جو زندگی بھر ان کا ساتھ دے گی میرے سامنے وہ اب بھی کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ سیاسی دیواروں کے پیچھے آ گئے جنہیں نگاہیں ڈھونڈتی ہیں۔

قیس بھی بمبئی میں ہیں لیکن نہ معلوم کسی اخبار سے منسلک ہیں یا انہیں بھی فلم نے جذب کر لیا۔

رحیم اللہ قابل گلاوٹھوی

جناب قابل گلاوٹھوی کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں وہ بڑے ذہین طباع اور زود گو شاعر ہیں ان کے حافظے میں بڑی بڑی پرانی یادوں کے عکس جھلملاتے ہیں۔ جنہیں وہ دیوانوں کی طرح بیان کرتے ہیں اور انہیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت ہے۔ انہوں نے بڑی بڑی صحبتیں اٹھائی ہیں اور بڑے بڑے جغادری استادوں سے تربیت یافتہ ہیں اور اس کا اثر جو ہونا چاہئے وہ ہے لیکن ابھی وہ اپنی زندگی کا کوئی ادبی شاہکار پیش نہیں کر سکے۔ میری ہی نہیں ان کے بہت سے جاننے والوں کی نگاہیں منتظر ہیں۔

قابل اجمیری

نوجوان مگر جوان شاعر جس نے چند روز میں ایک زمانے کو اپنی شاعری کا قائل کر دیا تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ ''دیدہ بیدار'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور قابل اس میں اپنے تمام اوصاف اور خط و خال سمیت نظر آتا ہے۔ ''دیدہ بیدار'' اس دور کے مطبوعہ سیکڑوں دواوین پر بھاری ہے۔ وہ روایتی سانچوں میں اپنی نئی تخلیقات کو پیش کرتا تھا مگر ''دیدہ بیدار'' کو پڑھنے کے بعد قابل کی شاعری کو اس

نسل کی نمائندہ شاعری ماننا پڑتا ہے۔

اکرم قمر

جناب قمر ساہیوال کے رہنے والے ہیں اور باوقار زمیندار ہیں۔ یہ بھی بشیر کے انداز کی نہایت سلجھی ہوئی غزل کہتے ہیں۔ ان کی غزل کو سن کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ جناب قمر کہاں کے رہنے والے ہیں ان کے یہاں زبان کا صحیح اور برمحل استعمال ایسا ہے کہ اہل زبان عش عش کر اٹھتے ہیں۔ خوش اخلاق اور ہردل عزیز انسان ہیں قدیم دوستوں میں یار باش ہیں اور نئے لوگوں میں متین طبع ان کی غزلوں میں ردیف و قافیہ کے پائے تمام غزل کا بار اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر قمر صاحب جب غزل پڑھتے ہیں تو ان کی ادائی اس بلا کی ہے کہ شعر خود بخود شرح ہوتا چلا جاتا ہے۔ ابھی تک کوئی مجموعہ نہیں آیا۔

قدرت نقوی

جناب قدرت نقوی ایک بلند پایہ ادیب ہیں وہ اگر چہ ایک اسکول سے متعلق ہیں لیکن ان کی نظر عمیق اور خیالات بلند و وسیع ہیں ان کی تحقیقی تحریریں ان کے رجحان کا پتہ دیتی ہیں انہیں کسی تحقیقی ادارے سے متعلق ہونا چاہئے تھا لیکن نہ جانے اہل علم کی طرف کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔ نا اہل اور خوشامد کے خوگر کب تک مستحق لوگوں پر شب خون مارتے رہیں گے اور عوام کی علمی تشنگی کے لیے کب تک پھاٹک لگے رہیں گے۔

شیخ قربان احمد قربان

جناب شیخ قربان احمد صاحب قربان بزرگ لوگوں میں ہیں اور مشق و مزاولت نے انہیں پختہ کار بنا دیا ہے ان کے کلام کا مجموعہ ''شاخ بنات'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جو ان کے محاسن شعر پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ نہایت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور ان کے یہاں فن کے اعتبار سے بہت سی خوبیاں ملتی ہیں۔

قیصر باہروی

جناب قیصر باہروی بڑے منجھے ہوئے شعر کہتے ہیں اور ان کے اسلوب کا تیکھا پن انہیں اپنے معاصرین میں سب سے جدا رکھتا ہے- وہ غزل کے شاعر ہیں اور قدیم سانچوں میں نئے مسالے کے اصنام ڈھالتے ہیں- جو چشم خریدار سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے- ان کی مشق سخن کا پتہ ان کے اشعار سے لگتا ہے لیکن کوئی مجموعہ ابھی تک نہیں آیا-

قمر جلال آبادی

قمر جلال آبادی' بڑے ذہین اور طباع قسم کے انسان ہیں میں ان سے اس زمانہ میں ملا ہوں جب ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں- اور میں بھی قریب قریب اسی دور میں داخل ہو رہا تھا وہ اس وقت اچھی خاصی غزل کہتے تھے اور اب تو انہیں مشق نہ جانے کس مقام پر لے گئی ہو گی- ان کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری

صادق قمر

صادق قمر صاحب ملتان کے رہنے والے ہیں اور ابھی نوجوان ہیں لیکن ان کی شاعری میں ابھی سے وہ چنگاریاں ملتی ہیں جو کبھی شعلگی پر مصر ہوں گی- ان کا انداز فکر جدید ہے اور نہایت ریشمی انداز سے جذبات کو شعر کا لباس دیتے ہیں- ان میں ایمائیت اشاریت اور سمبل ازم کے وہ تمام اسلوب نگارش موجود ہیں جو دور حاضر کی خصوصیات کہلاتے ہیں- ان کا رجحان نظم سے زیادہ غزل کی طرف ہے اور خوب غزل کہتے ہیں-

محمد حفیظ قیصر نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی کے اعزاء میں تھے لاہور میں بسلسلہ ملازمت رہتے تھے یہاں سے پھر ایک رسالہ کی ایڈیٹری کے لیے جالندھر چلے گئے اور وہاں سے نجیب آباد جا کر لاہور نہ آسکے- جب وہ لاہور تھے تو اچھی خاصی غزلیں کہتے تھے- نہ جانے وہاں ان کا ذوق زندہ رہا یا خودکشی کر گیا-

قاسم نوری

جناب قاسم نوری نو جوان شاعر ہیں اور ان کا جس قدر کلام چھپتا ہے ان میں وہ نشیب نہیں جو روشنی قبول نہیں کرتے۔ بلکہ ایک فنکارانہ انداز اور نکھرا ہوا تغزل دعوت نظر دیتا ہے۔ مشاعروں میں بھی اچھی اچھی اور محتاط ملاقات ہوتی ہے۔ اس رواداری کی قربت میں آنکھوں کی زبان میں ہکلاہٹ آجاتی ہے اور الفاظ میں جھنکار نہیں جاگتی۔

قیصر ہوشیار پوری

جناب قیصر ہوشیار پوری ملتان میں رہتے ہیں اور ایک عرصہ سے شعر کہتے ہیں لیکن ان کی مصروفیت ان کو ادبی ہنگاموں کی اجازت نہیں دیتی وہ مشاعروں میں بھی کم ہی دیکھے جاتے ہیں ایسے لوگوں کی اس دور میں بڑی مصیبت ہے جو مرکز سے دور مضافات کی فضا میں رہ کر خمول کے دائرہ میں آگئے ہیں اب تک ملک میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو ان لوگوں سے مل کر ان کی کاوشوں کو جانچے پرکھے اور ٹھکانے لگائے

ڈاکٹر قمر الحسن قمر کیرانوی

میں قمر صاحب سے غالباً دو بار ملا ہوں۔ جناب قمر اس ماحول کے پروردہ ہیں جہاں گلی گلی میں شاعر اور ادیب پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا شاعر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اور پھر وہ تو ایک بلند اور علمی خاندان کے فرد ہیں لیکن اس قسم کے نہ جانے کتنے صاحب فن لوگ گمنامی کے دھندلکوں میں ڈوبے پڑے ہیں کیونکہ وہ پروپیگنڈسٹ پارٹیوں تک نہیں پہنچ سکتے اور صحیح آدمیوں کی تلاش کا ابھی ماحول نہیں ہے۔ آج کل کہیں پاکستان میں ہیں۔

انوار قمر

انوار قمر سے میری ملاقات سندھ حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ اس نوجوان کو اردو کی خدمت کا جنون ہے۔ چنانچہ حیدر آباد میں تھا تو وہاں بھی اور اب لاہور میں ہے تو یہاں بھی اردو کی توسیع و اشاعت میں دن رات کوشاں نظر آتا ہے۔ مشاعروں میں وہ نہایت اچھی غزلیں پڑھتا ہے اور داد
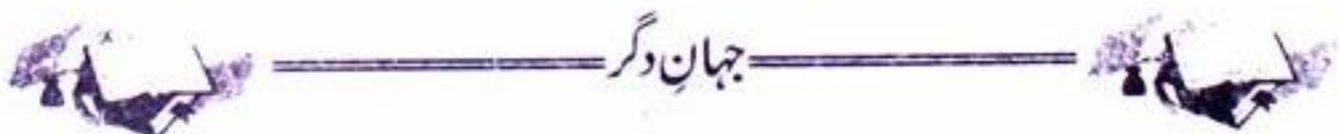
لیتا ہے اس کے پاس اچھا خاصا ذخیرہ کلام موجود ہے۔ جب کبھی وہ چھپے گا تو معلوم ہوگا کہ اس عمر میں اس نے کیسی کیسی غزلیں کہی ہیں۔

قاسم رضوی

جناب قاسم رضوی جناب سید غلام بھیک نیرنگ کے خاندان کے فرد ہیں۔ جہاں ان میں انتظامی صلاحیتیں وافر ہیں وہیں وہ علمی ادبی ذوق سے بھی بہرہ اندوز ہیں اور ان کی تقریر و تحریر دونوں اس کی گواہ ہیں کہ یہ غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان ہیں۔ میں نے کم لوگوں میں علم و ادب کا ایسا صحیح ذوق دیکھا ہے۔ ان کے یہاں فکر اور برجستگی دونوں چولی دامن ہیں میں تو ان کی مصروفیت کو جاننے کے باوجود اپنے ملک کے مفاد میں ان سے کسی عظیم شاہکار کی توقع رکھتا ہوں۔

علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

جناب کیفی یوں کشمیری پنڈت تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی تھی۔ وہ اردو، فارسی، ہندی، عربی، سنسکرت اور انگریزی کے فاضل تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ لاہور اور لائل پور میں رہے اور تقسیم میں دہلی چلے گئے تھے۔ وہیں انتقال ہوا۔

جب میں کیفی صاحب سے ملا ہوں تو وہ لاہور میں تھے اور مولانا تاجور کے یہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا انہیں دنوں مولانا تاجور مرحوم کیفی صاحب اور ڈاکٹر بھٹناگر وغیرہ نے مل کر ایک اردو سبھا قائم کی تھی۔ جس میں اصطلاحات کے ترجمے ادبی مقالات اور شعر و شاعری کبھی کچھ ہوتا تھا۔ کیفی صاحب نے زمانہ اور اس کے مشاہیر اور اساتذہ کے کئی دور دیکھے تھے جس سے ان کی معلومات میں جہاں فنی بلندیاں آئیں وہیں وہ ایک چلتی پھرتی ادبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ بھی تھے۔

کیفی کی محبت خلوص اور خوش اخلاقی کے ساتھ ان کی علمی، ادبی اور شعری خدمات رہتی دنیا تک تاریخ میں جگہ پاتی رہیں گی۔ حضرت کیفی کو شاعری تو ورثہ میں آئی تھی مگر انہیں شعر و ادب سے جو شغف تھا اور اس کے جو نقوش انہوں نے اپنے لکچروں کی صورت میں چھوڑے ہیں وہ اردو زبان پر ایک ایسا احسان ہے جو فراموش نہیں ہو سکتا ان کی تصانیف میں کیفیات، منشورات، خمسہ کیفی، ناگزیر قیل و قال وغیرہ خالص ادبی اور فنی کتابیں ہیں اور کیفی صاحب کے کام کو آگے بڑھانا وقت کا اقتضا

ہے۔افسوس کہ ایسا کوئی آدمی اب نظر نہیں آتا۔ جناب ابواللیث صدیقی کی طرف نگاہیں اٹھتی تھیں لیکن وہ مصروف اس قدر ہیں کہ شاید یہ اہم کام انجام نہ دے سکیں۔ ہاں شوکت سبزواری اس کام کو انجام دے رہے ہیں لیکن ابھی ان کا کام اس مقام پر نہیں آیا جہاں ہمارا صرف ونحو ترقی یافتہ ممالک کے صرف ونحو کے تقابل میں آسکے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی یہ کام انجام دینا چاہا تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں اردو کی ترویج وترقی رات دن مصروف رکھتی تھی۔ اس کے باوصف جب بھی وہ قلم اٹھاتے تھے تو حیرت انگیز کام کر جاتے تھے۔ ان کے خطبات، مقدمات اور نقد وتبصرہ اس کا بین ثبوت ہیں۔

جناب کیفی نثر کی ہر صنف پر تو حاوی تھے ہی شاعری میں بھی وہ جملہ اصناف سخن کے ماہر تھے اس کے لیے ان کی کتاب ''واردات'' اس کا بہترین ثبوت ہے۔

ان کے لٹریچر میں دہلی کی زبان اور ثقافت روزمرہ محاورات اور طرز بیان ایسا ملے گا جسے ہم اہل علم کا ورثہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں روایت کو قائم رکھنا اور اخلاقی قدروں کو بلند کرنا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

ان کی نیچرل نظمیں اپنی جگہ قابل ذکر ہیں اور کیوں نہ ہو حالی کی اصلاح کا بھی تو آخر کچھ اثر ہونا ضروری تھا۔ میرے خیال سے اگر طرز ادا میں بھی ارتقاء کا عمل کارفرما ہے تو کیفی صاحب نے حالی کی شاعری کو آگے بڑھایا ہے اور کیفی کی شاعری سے موجودہ دور کے جدید لکھنے والے مستفید ہوئے ہیں۔ اگرچہ جدید دور اس کا قائل نہ ہوگا۔ لیکن جب ہم ارتقائے شعر وادب پر قلم اٹھائیں گے تو آخر کہیں سے تو رشتہ جوڑنا پڑے گا۔ لگے ہاتھوں میں کیفی صاحب کا ایک واقعہ بیان کر دوں ان دنوں وہ لائل پور میں اپنے لڑکے کے یہاں مقیم تھے اور بیمار تھے ہاتھ پاؤں پر ورم آ گیا تھا اور ہلکا ہلکا بخار مستقل رہنے لگا تھا یہ وہ زمانہ ہے جب ''کیفیہ'' اور منشورات وغیرہ کتابیں زیر قلم تھیں۔

میں اور مولانا تاجور مرحوم ان سے ملنے گئے تو کیفی صاحب بچوں کی طرح لپٹ لپٹ کر رونے لگے ہم نے کہا آپ اطمینان رکھیں آپ کی بیماری مہلک نہیں جگر خراب ہو رہا ہے۔ یہ درست ہو جائے گا۔ انہوں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا کہ بیٹا تمہیں ابھی معلوم نہیں میں اردو زبان سے کس قدر محبت کرتا ہوں ارے بھائی عمر کم رہ گئی ہے اور کام زیادہ باقی ہے میرے سامنے چار کتابوں کی تکمیل ہے۔

مجھے دہلی کے ایک خاص آدمی نے بتایا کہ جب ملک تقسیم ہوا تو کیفی صاحب کی طبیعت ناساز تھی ہم لوگوں نے کہا کہ پنڈت جی ملک تقسیم ہو گیا پاکستان بن گیا ہے آپ بتائیں پاکستان میں رہیں گے یا ہندوستان میں' کیفی صاحب نے فرمایا ''جہاں اردو بولی جائے گی'' ایسے علم دوست اور اردو پرور حضرات کہاں پیدا ہوں گے۔

کوکب جوالا پوری

جناب کوکب جوالا پوری مولانا تاجور مرحوم کے ساتھ ادبی دنیا میں کام کرتے تھے۔ پرانے لوگوں میں تھے اور اسی رنگ کے اشعار کہتے تھے۔ اس وقت کچھ سیاسی ماحول بھی ایسا زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ گل و بلبل کی شاعری یا قومی نظمیں زیادہ کہتے تھے۔ لیکن لکھے پڑھے آدمی تھے اور اردو فارسی پر انہیں عبور تھا۔ ادبی دنیا کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں گئے۔

پنڈت رادھے ناتھ کول

پنڈت رادھے ناتھ نظم اور نثر دونوں برابر کی کہتے تھے۔ وہ قدیم شعراء کے مقلد تھے اور انہی فنی خطوط پر چلتے تھے ان کے یہاں عیوب و محاسن پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور بدیع و بیان کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ پریم نگران کا گاؤں تھا اور اس میں ان کے مزارعین ان سے خوش تھے اور انہوں نے بھی وہاں اپنے مزارعین کے لیے مسجد بنوائی تھی۔ اس سے وہ اور بھی گرد و نواح میں مقبول ہو گئے تھے۔ نہ جانے تقسیم کے بعد کس حال میں ہوں گے۔

کیفی چڑیا کوٹی

الٰہ آباد میں ان سے ملاقات ہوئی وہ ایک صاحب مطالعہ ادیب تھے ان کا ایک انتخاب چار جلدوں میں چھپا تھا اور وہ ان کا یادگار کارنامہ کہلایا جا سکتا ہے۔ انہیں قدیم و جدید شعراء کے کئی ہزار اشعار یاد تھے اور وہ انہیں موقع موقع سے حوالہ میں پیش کرنے پر قادر تھے۔ ایسے محنتی اور باسلیقہ لوگ بہت کم ملتے ہیں وہ اپنے دور کے ناقابل فراموش انسان تھے اور تاریخ میں ان کا نام آتا ہے اور آتا رہے گا۔

کیف مراد آبادی

میں نے جناب کیف مراد آبادی کو عالم جوانی میں دیکھا ہے وہ اس وقت بھی نہایت سنبھلا ہوا شعر کہتے تھے گھریلو تعلیم و تربیت و اور بزرگان دین کی صحبت کے باعث اس وقت بھی ان کے تصورات وتخیلات کی باگ تصوف کی طرف مڑ چکی تھی۔۔جس کا اثر ان کی ظاہری شکل وصورت پر تھا وہ صالح نوجوان اور پاکیزہ خیال شاعر تھے اور اب تو ان کی مشق ومزاولت اور بھی بڑھ گئی ہوگی لیکن ان کا کوئی مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا۔

کرم حیدری

جناب کرم حیدری کالج میں لیکچرار ہیں۔ادبی معلومات کے اعتبار سے جیسا کہ ایک کالج کے استاد کو ہونا چاہئے۔کرم حیدری اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ان کی شاعری میں انفرادی غم سے زیادہ زمانے کا غم کارفرما ہے اور یہ اسے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی شاعری میں سمو لیتے ہیں۔یہ پاکستان کے سب سے مقبول و متعارف شاعر اور قومی ترانے کے خالق جناب حفیظ کے شاگرد ہیں انہوں نے ہر رخ سے اپنے استاد کو اپنایا ہے اور امید ہے کہ کبھی یہ اسی بام عروج پر پہنچیں گے۔جناب کرم کے نقش قلم کتابی صورت میں بھی آرہے ہیں خوشی کی بات تو یہ ہے کہ کرم صاحب نثر میں بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔

عطاء اللہ کلیم

ملک عطاء اللہ کلیم، ان کا مولد راولپنڈی ہے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی اور ایسے ایسے کامل اساتذہ انہیں ملے کہ جنہوں نے ان کے ذاتی جوہر کو پرکھ کر ان کے ذوق کی پرورش کی لاہور آکر ایف سی کالج سے بی اے کیا اور پھر ''انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس'' کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوکر راولپنڈی میں ملازم ہوگئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔

جناب کلیم نثر بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں اور ترجمے تو اس قدرت کے ساتھ کرتے ہیں کہ بعض بعض اوقات اصل سے زیادہ تاثر پیدا ہوجاتا ہے ان کے بہت سے ترجمے ادبی دنیا میں چھپتے

رہے ہیں اور شاعری بھی ادبی دنیا ہی میں بے نقاب ہوئی ہے۔

نہایت خلیق اور محتاط قسم کے آدمی ہیں۔ ان کی کم آمیزی اپنی جگہ درست لیکن اپنے پرانے دوستوں میں وہ بڑے ہی خوش مذاق ہیں اور ایثار پسند انسان واقع ہوئے ہیں وہ ہر دوست کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے ہیں جو فاصلے پر ہیں ان کے لیے وہ کم گو' سنجیدہ اور کم آمیز انسان ہیں اور جن کو وہ جانتے بوجھتے ہیں اور طول وعرض سامنے ہے ان کے لیے نہایت نفیس دوست ہیں۔

شاعری کا جہاں تک تعلق ہے ان کے یہاں احساس کو الفاظ اور خیالات کو زبان دی جاتی ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو جس خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسی قدرت شعر رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا ممکن ہے کہ وہ اب اپنی کاوش قلم کی اشاعت کریں' کیونکہ اب ان کی دفتری مصروفیات ختم ہو چکی ہیں اور گھر کی مصروفیات سے آدمی کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتا ہے۔

محمد یعقوب خاں کلام سہارنپوری

جناب کلام سہارنپور کے رہنے والے تھے اور رسالہ ''زمانہ کانپور'' میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے زمانہ دیکھا تھا اور ہر سوسائٹی کے نشیب وفراز سے آگاہ تھے۔ اس لیے انہیں ادب کے کسی رخ پر لکھتے ہوئے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ ایک کہنہ مشق ادیب اور نغز گو شاعر تھے اور جدید رنگ کے شور وغوغا سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ان کا مجموعہ کلام بھی نظر سے نہیں گزرا۔

کشفی ملتانی

جناب کشفی ملتانی' ملتان کے بزرگ اور زود گو شعراء میں شامل ہیں۔ میں انہیں ان کی منہ زور جوانی اور ان کے چوگانی دور سے جانتا ہوں جہاں تک شعر کا تعلق ہے نہایت اچھا اور سنبھلا ہوا شعر کہتے ہیں لیکن چونکہ زندگی ملازمت میں گزری ہے اس لیے وہ زمانہ کے نشیب منجمد ہو گئے جس سے وہ محدود ہو کر رہ گئے اور اب ان کے ان دنگلوں کو نہیں دیکھ سکتے جو لاہور' راولپنڈی اور کراچی میں ہوتے ہیں جناب کشفی مظفر گڑھ سے ایک اخبار بھی نکالتے ہیں اور ایک پریس بھی چلا رہے ہیں لیکن وہ اس مقامی ضمانت سے زیادہ صلاحیتوں کے انسان ہیں مگر افسوس کہ انہیں ان کا ماحول پابہ زنجیر کئے

ہوئے ہے- اس میں بھی وہ شعر کہتے ہیں اور بے خودی کی راہوں سے فرار کی کوشش کرتے ہیں مگر مے خانہ کی راہ دور تک نہیں جاتی، اور جنگل میں شام ہو جاتی ہے جناب کشفی کا مجموعہ نظر میں نہیں ہے-

مہاشہ کرشن

ہندو اخبار ''پرتاب'' کے مالک اور مدیر تھے- یوں تو ہندوؤں کے بہت سے اخبار نکلتے تھے لیکن مہاشہ کرشن کے قلم سے جو نکلا اس کا جواب پیدا نہ ہو سکا- وہ ایک ہی وقت میں مفکر بھی تھے ادیب بھی، مقرر بھی تھے اور سیاست دان بھی- میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ لاہور کے اخبارات کو عوامی اداریہ لکھنا ہی مہاشہ کرشن نے بتایا تھا وہ متعصب تو ضرور ہوں گے لیکن دیکھا جائے تو اردو میں ریڑھ کی ہڈی انہی سے پیدا ہوئی ہے-

مکین احسن کلیم

جناب مکین سے میری پہلی ملاقات الہ آباد مسلم ہاسٹل کے مشاعرہ میں ہوئی اور پھر پرتاب گڑھ میں- وہ اردو، فارسی اور عربی پر قابل رشک معلومات رکھتے ہیں اور ان کا یہی وصف انہیں لاہور کی صحافت میں انہیں ایک بلند معیار صحافی قرار دیتا ہے- اسمیں شک نہیں کہ کلیم میں شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی نہیں اور جب کہتے ہیں تو بہت اچھا شعر کہتے ہیں اخبار نویسی کی غیر شاعرانہ مصروفیات نے نہایت اچھے ادیب اور نغز گو شاعر کو ہم سے چھین لیا ہے- جناب کلیم انسان کی حیثیت سے قابل قدر اور مثالی شخصیت ہیں-

محمد موسیٰ کلیم

جناب موسیٰ کلیم صاحب کالج کے پرنسپل ہیں اور تمام عمر تعلیم میں گزری ہے- ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور ہر صنف ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں- اسلامی اقدار کے محافظ اور انسانیت کے شیدائی ہیں غزل اور نظم دونوں میں مہارت ہے اور قابل قدر تخیلات و تصورات کو نظم کرتے ہیں انسان کی حیثیت سے بھی منکسر المزاج اور خلیق ہونے کے علاوہ صاحب ایثار اور دوست پرور انسان ہیں-

کرار نوری

جناب کرار نوری اساتذہ کی صف کے بڑے کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں اور کیوں نہ ہوں ایک علمی ادبی خاندان کے فرد ہیں اور فن سے آگاہی ان کا ورثہ ہے وہ شعر کے اصول وضوابط پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور نئے دور کی اوٹ پٹانگ طرز روش کو نہیں سراہتے۔ ان کے یہاں شعر کا معیار اخلاقی قدریں ہیں اور اساتذہ کی تراشی ہوئی راہیں قابل اعتماد خیال کی جاتی ہیں۔ وہ بحیثیت انسان بھی بڑے معیار کے انسان ہیں۔

کوثر جموی

جناب کوثر جموی۔ جموں کے بڑے مقبول شاعر ہیں تقسیم کے بعد وہ پاکستان میں آ گئے اور غالباً گوجرانوالہ یا اس کے قرب و جوار میں آباد ہوئے ہیں۔ انہیں حضرت چشتی اور جناب قیس کی پشتی بانی میسر تھی۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہ نشیب نہیں جو شاعر کو معیار سے گرا دیتے ہیں ملاقات کو ایک زمانہ ہو گیا نہ معلوم ان کے ذوق نے انہیں کس حد تک بلند کر دیا ہے۔

کیفی دیوبندی

محمد ذکی کیفی مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی کے صاحبزادے ہیں اور چونکہ مفتی صاحب بھی اردو، عربی اور فارسی کے شاعر ہیں اور معمولی نہیں بڑے جید شاعر ہیں اس لیے کیفی صاحب کو ذوق شعر ورثہ میں ملا ہے جناب کیفی اپنے ہم عصروں میں اچھا اور بلند شعر کہتے ہیں ان کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں لیکن وہ کہنہ مشقوں کی طرح شعر کہتے ہیں ہر چند کہ ان کا ڈھانچہ قدیم ہوتا ہے اور ہیت شعر میں ان کا کوئی اضافہ نہیں لیکن جن لوگوں نے ہیئت شعر میں ایجاد بندہ سے کام لیا ہے کیفی صاحب کے یہاں ان سے زیادہ تاثر موجود ہے۔

کسریٰ منہاس

میرے قدیم کرم فرماؤں میں ہیں آج کل اسلامیہ کالج کی انتظامیہ سے منسلک ہیں۔ یوں تو وہ فوجی ہیں لیکن نظم اور نثر دونوں پر انہیں عبور ہے ایک زمانہ میں جب وہ لکھنؤ میں تھے تو جب تک ان کی یونٹ رہی انہوں نے حضرت صفی لکھنوی سے کسب فیض کیا۔ یوں تو کسریٰ صاحب غزل اور نظم دونوں میں کہیں بھی بند نہیں لیکن ان کا اصل میدان تاریخ گوئی ہے اور اس سلسلے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس دور میں بہت کم لوگ ان کے پلے کے علم تاریخ جاننے والے ہوں گے۔ مختلف اخباروں اور رسالوں میں تاریخ گوئی پر ہی ان کے مضامین آتے رہتے ہیں لیکن ابھی کوئی کتاب نہیں۔

عبدالقیوم کوثر

جناب کوثر بڑے پختہ مشق لوگوں میں ہیں ان کے کلام میں تغزل اور نظم میں حقیقت نگاری ملتی ہے وہ اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں ان کی مہارت انہیں اس مقام پر لے آئی ہے جہاں خود بخود شعر میں خلوص آ جاتا ہے۔ اور حقائق زبان پر اترنے لگتے ہیں۔

چونی لال کاوش

کاوش صاحب مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگرد ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت بمبئی چلے گئے اور وہیں کسی فلم کمپنی میں کہانی اور گیت لکھتے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور مولانا تاجور کے بڑے چہیتے شاگردوں میں ہیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد بھی وہ حق شاگردی ادا کرتے رہے ایسے شاگرد آج کل بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کا رخ آزادی کی طرف مڑ چکا تھا نہ جانے اب کس حد تک کامیاب ہوئے ہوں گے۔

کوکب شادانی

جناب کوکب شادانی حضرت شاداں بلگرامی کے شاگرد ہیں انہوں نے تعلیم تو لاہور میں پائی لیکن لاہور سے تعلیم پا کر وہ کہیں باہر چلے گئے - اب وہ عرصہ سے کراچی میں ہیں اور حکومت کے کسی ادارہ سے منسلک ہیں قدیم کہنے والوں میں ہیں اور نظم و غزل پر برابر کا عبور رکھتے ہیں ادب کے عیوب و محاسن پر ان کی اچھی نظر ہے - اس لیے ان کے یہاں ابتذال نہیں ہوتا - اور یوں بھی وہ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں - ان کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تو کئی ایک چھپی ہیں لیکن ان کا مجموعہ کلام ابھی میری نظر سے نہیں گزرا -

کیف رضوانی

پتلا دبلا انسان بال بڑھے ہوئے چہرہ ستا ہوا آنکھیں بند کرے تو فقیر اور کھولے تو قاتل معلوم ہوتا ہے - اس کی آنکھوں کی سرخی میں انقلابی شاعری کا تشدد جھانکتا ہے - وہ ہندوؤں میں ہندو اور مسلمانوں میں مسلمان ہی نہیں صوفی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی مذہب کا آدمی نہیں وہ تو شاعر ہے اور جو اس سے محبت کرتا ہے اس کی امداد کرتا ہے اسے نشہ بخشتا ہے اسی کا ہے وہ شاعر بھی ہے اور جادوگر بھی مشاعرہ کے بعد اسے ہزار روپیے وہ خدمت پیر مغاں میں پہنچتا ہے اور ساقی کے قدم پر سجدے گزارتا ہے - وہ نشہ کے عالم میں قابل رحم اور خمار میں ہڑکایا انسان معلوم ہوتا ہے - لیکن شاعر ہے مشاعرہ میں رس شاعر بلکہ مشاعرہ پٹ شاعر -

حکیم کیف دہلوی

حکیم ہاشم جان کیف صاحب جناب حبیب اشعر کے بھائی تھے طب میں ان کا تجربہ ان کے سیکڑوں ہم عصروں سے زیادہ تھا اور شاعری میں بھی وہ اپنے دور کے مشہور غزل گو تھے - میں نے کئی مشاعروں میں انہیں سنا ہے وہ جب اپنی غزل کو نغمے میں ڈبو کر پیش کرتے تھے تو در و دیوار سے داد ملتی محسوس ہوتی تھی - کیف صاحب کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا اور اگر ان کا کلام ضائع ہو گیا تو یہ تاریخ غزل میں ایک خلا رہے گا -

کیف عرفانی

ایسا شاعر اور ایسا انسان جو گدرانے سے پہلے پک گیا تھا وہ بے یار و مددگار نوجوان صرف خدا کے سہارے زندگی بسر کرتا تھا کبھی کبھی اخبار میں جا کر کچھ لکھ دیا تو پیسے مل گئے۔نہیں ملے تو میرے پاس آ گیا میں نے کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی وہ پیدائشی طور پر درویش ہے اس کے خیالات جسم کی حدود کو عبور کر کے روحانی دنیا کے راستے میں ہیں۔ وہ اشعار میں بھی اپنے انہیں خیالات کا اظہار کرتا ہے اور زندگی پر بھی وہی گمان دھیان طاری رکھتا ہے۔ وہ نیک نیت ہے اور نیک اطوار بھی اس کا ایک مجموعہ کلام بھی لاہور میں چھپا تھا۔ اس میں اس کی زندگی کا ہر شعبہ اشعار کی صورت میں ایک اعلان ہے۔

وارث کامل

جناب وارث کامل بڑے صاحب ہمت اور فاضل اجل ادیب تھے سب سے پہلے میں نے ان کی صلاحیتوں کو محسوس کیا اور ان سے ایک کتاب ''تاریخ مجاہدین اسلام'' تین جلدوں میں مرتب کرائی جوان سے جنابِ شورش کاشمیری نے خرید لی اور ابھی تک تشنہ طباعت ہے اس کے بعد ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں جن میں ترجمے بھی ہیں اور تالیف بھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور قدیم روش کا بڑا ہی نکھرا ہوا شعر کہتے تھے اور علامہ اقبال کے بڑے مداحوں میں تھے۔ مولانا وارث کامل اچھی قسم کے مسلمان تھے اور تمام کتابیں کسی نہ کسی رخ سے اسلامی خصوصیات اور تبلیغ کی حامل ہیں۔

کیف بھوپالی

کیف بھوپالی زندگی کی عکاسی کرنے اور معاشرہ کے نشیب و فراز کا نقشہ کھینچنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبات ہیں اور جذبات کو محرکات کے ذریعہ اجاگر کرتے ہیں۔ وہ ایک فن کار ہیں ایسے جس کی موجودہ دور کو اشد ضرورت ہے ان کے یہاں اپنے سے زیادہ زمانے کا درد ملتا ہے اور یہ شاعری ہی نہیں انسانیت کی بڑی نشانی ہے ان کا مجموعہ کلام ''شعلہ حرف'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور اس میں ان کی ذات کی خوبیاں اجاگر ہیں۔

غلام رسول کاوش بٹ

لالہ موسیٰ کے رہنے والے ہیں اور مختلف اخبارات کے نمائندے ہیں قدیم پیمانوں پر اچھے اور لطیف انداز کے شعر کہتے ہیں ان کا رنگ تغزل ایسا ہے جسے قدیم اور جدید دونوں فریق نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا اسلوب مخصوص ہے جس میں موسیقی بھی ہے اور روانی بھی معنویت بھی ہے اور شعریت بھی۔

حکیم احمد کیفؔ

جناب کیف بڑے کہنہ مشق شعراء کی صف کے شاعر ہیں ان کے یہاں روانی اور برجستگی بہت ہے یہ بزرگوں کے نقش قدم سے سرمو نہیں ہٹے اور اسی طرح کے صاف ستھرے اشعار کہتے ہیں۔ میں نے انہیں دو تین مشاعروں میں سنا ہے وہ بڑے اعتماد سے شعر پڑھتے ہیں لیکن ان کا مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔ تقسیم ملک کے بعد کوئی مجموعہ چھپا ہو تو چھپا ہو۔

کلیم جلیسری

جناب کلیم جلیسری ایک قدیم طرز و طریق کے بزرگ شاعر ہیں اور ان سے مشاعروں میں ملاقات ہوتی رہتی ہے وہ نوشہرہ میں مقیم ہیں جو شعر و ادب کا ماحول نہیں لیکن کلیم سے جب بھی سنی ہے اچھی غزل سنی ہے وہ زبان کے نشیب و فراز سے آگاہ ہیں اگرچہ ایک ایک غزل کئی کئی بار سماعت آشنا ہو چکی مگر ان کے کلام کی کیفیت جب سنئے نئی ہوتی ہے ان کا لہجہ اور انداز ادا پرانے شعراء کی طرح موثر ہے لیکن ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں دیکھا۔

محمد طفیل کاڑو

دیہاتی زبان کے شاعر ہیں۔ ان کو سن کر منور خان دلمیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کلیات دلمیر میں بھی اس قسم کی شاعری ہے اور یہ وہ ہریانی زبان ہے جو دریائے جمنا کے مشرقی کناروں کے دیہات اور قصبات میں بولی جاتی ہے۔ اس کا اصل مرکز تو ضلع رہتک ہے اور وہاں سے اپنے نواح میں پھیلتی پھیلتی جمنا پار کے مضافات سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ کا مغربی حصہ اور ادھر گوڑگانواں تک پھیلی ہوئی

ہے۔ طفیل کاڑ و صاحب اس زبان کے اچھے شاعر ہیں اور اس طرز ادا کے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں۔

کلیم عثمانی

نام احتشام الٰہی، نوجوانوں میں کلیم عثمانی کی اٹھان بھی معمولی نہیں۔ ہر چند کہ ان کا نغمہ ان کے شعر کو جان لیوا بنا دیتا ہے۔ لیکن نغمے سے قطع نظر بھی کلیم کے یہاں اچھے اور معیاری اشعار کم نہیں وہ کم ضرور کہتے ہیں۔ لیکن جب کہتے ہیں تو کمی پوری ہو جاتی ہے اب کچھ دنوں سے وہ فلم کی طرف راغب ہو گئے ہیں۔ یہ گریز اگر مصلحتاً ہے تو بھی خوب ہے اور اگر ماحول کا تقاضا ہے تو بھی برا نہیں ادب و شعر کے معیار سے جدا بات ہے۔ جناب کلیم غزل، نظم اور گیت ہر صنف پر تیز خرام ہیں اس لیے ناکامی کا خدشہ نہیں۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپ سکا۔

حکیم کاظم بنارسی

جناب کاظم بنارسی سے بنارس کے مشاعرے ہی میں ملاقات ہوئی اور جب میں نے دیکھا تو وہ شعراء اور مطب دونوں میں یکساں شہرت رکھتے تھے نہ جانے شعر نے مطب کو سنبھالا ہوا تھا یا مطب نے شعر کو سہارا دیا ہوا تھا۔ ماحول کے مطابق وہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور اخلاق و اطوار کے لحاظ سے بھی اچھے انسان ہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا ملک کی تقسیم سے سیاسی دیواروں نے ادبی دریچے بھی بند کر دیئے۔

کرم حیدری

کرم حیدری صاحب حضرت حفیظ جالندھری کے تلامذہ میں ہیں انہیں نثر و نظم دونوں پر عبور حاصل ہے ہر چند کہ ان کا پیشہ انہیں شعر و ادب کی تحقیق پر مجبور کرتا ہے لیکن ان کا ادب ان کے ذوق کا حاصل معلوم ہوتا ہے وہ روائتی قسم کے ادیب یا شاعر نہیں بلکہ نئے ادب پر ان کی گہری نظر ہے لیکن ان کی شاعری قدیم خطوط سے نہیں ہٹتی ان کے یہاں معرا نظم نہیں ہے بلکہ ردیف و قافیہ کی قید میں وہ نئے خیالات نظم کرتے ہیں۔ کرم صاحب کو تحقیق کا ذوق بھی ہے چنانچہ اس کے ثبوت میں ان کی

ایک کتاب پوٹھوہاری زبان پر موجود ہے۔

سعد اللہ خاں کلیم

کلیم صاحب رہنے والے تو ضلع کیمبل پور کے ہیں لیکن آج کل گورنمنٹ کالج چکوال میں لیکچرار ہیں۔غزل بہت سنبھل کے کہتے ہیں قدیم قیود میں نیا انداز ان کے یہاں عجیب لطف دیتا ہے۔ وہ صرف شاعری تک ہی محدود نہیں وہ تنقید و تحقیق میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ہمیں تعلیمی اداروں میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔خوش اخلاق اور سیدھے سادے انسان ہیں لیکن ان کا مطالعہ ان کی گفتگو اپنی وسعتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین میں قابل قدر مواد ہوتا ہے۔

کرم چند

کرم چند صاحب ''پارس'' اخبار کے مالک تھے اور نہایت ملنسار قسم کے انسان تھے اپنی محرومی علم کے باعث کبھی کبھی پٹڑی سے اتر کر بولتے اور لکھنے لگتے تھے۔اس سے قطع نظر برے انسان نہیں تھے ایسے لوگ اب کہاں نظر آتے ہیں۔ ''پارس'' اخبار اگرچہ ہفتہ وار تھا مگر اس کی اہمیت اپنی جگہ تھی اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایڈیٹر نہایت اچھا اور ایسا چاق و چابند رکھتے تھے جو واقعات اور حادثات کے اجمال و تفصیل پر حاوی ہو۔چنانچہ ایک عرصہ تک باصر صاحب جیسے ادیب ان کے یہاں کام کرتے رہے جو اچھے چابک دست مدیروں میں شمار ہوتے ہیں۔

حکیم کبیر الدین

حکیم صاحب آج کل دہلی میں طبیہ کالج کے پرنسپل ہیں اس سے پہلے حیدرآباد دکن میں ''کلیۃ طبیہ'' کے پرنسپل تھے اور دکن جانے سے پہلے جب وہ دہلی میں گوردوارہ روڈ پر رہتے تھے ان دنوں میں نے ان سے تشریح پڑھی ہے اور سب سے پہلے مجھے تعلیم اور تفویض کا فرق معلوم ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر حکیم کبیر الدین صاحب جیسا استاد ہو تو دنیا کا کوئی علم بھی ایسا نہیں جو ایک بار کے مطالعے کے بعد محو ہو جائے ان کے علم و فضل کے متعلق کچھ کہنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے ان کی بے شمار کتابیں آج دنیا کو مستفید کر رہی ہیں اور ان سے مشتق اور سیکڑوں کتابیں دنیائے طب میں

متعارف ہورہی ہیں۔حکیم صاحب نے بڑے بڑے علمی اور تاریخی مقابلے زبان اور فکر و ادراک سے کئے ہیں جو علمی دنیا میں یادگار اور تحقیقی تاریخ میں روشن عنوان لیں گے۔

حافظ کفایت حسین

حافظ صاحب کی فضیلت میں کیا شک ہوسکتا ہے انہوں نے عربی میں منطق اور فلسفہ کا اچھا مطالعہ کیا ہے اور خلق اللہ سے ان کا تعلق اللہ کی طرح معلوم ہوتا ہے کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو معاملہ معمولی ہو یا اہم حافظ صاحب کی طرف رخ کرتا ہے اور وہ مذہب وملت کے امتیاز کو انسانی امداد کے معاملے میں روا خیال نہیں کرتے حالانکہ ان کے مذہبی وعظ دلوں کی خبر لیتے ہیں مگر انہیں آنسوؤں سے داد ملتی ہے۔

ایف ڈی گوہر

جناب فضل دین گوہر ریلوے کے شعبہ حسابات سے ریٹائرڈ ہوکر دوبارہ اسی شعبہ میں کام کر رہے ہیں۔کمال ہے کہ حساب کے آدمی ہیں مگر شعر کا ایسا ستھرا ذوق پایا ہے کہ سبحان اللہ۔ میں ایک عرصہ سے ان کا کلام سن رہا ہوں جناب گوہر بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں ان کی غزلیں طویل اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے قدیم معاشرت اور روایات کے شیدائی ہیں اور اخلاقی اقدار میں بھی یقین اور اطمینان کے حامل ہیں۔لیکن کوئی مجموعہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

فضل میر گوہر نوشاہی

جناب گوہر نوشاہی نوجوان ادیب ہیں انہوں نے پہلی کتاب ''بیتال پچیسی'' کو ایڈٹ کیا اور پھر ''نتائج المعانی'' کو جس میں ان کی مولفانہ صلاحیت اور اسلوب نگارش کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ وہ ان کتابوں میں خود موجود ہیں اور ان کی یہ سعی ادب بڑے ٹھکانے کی چیز ہے میں ان سے زیادہ قریب نہیں رہا لیکن جہاں تک ان سے ملاقاتیں ہوئی ہیں وہ نہایت زیرک اور چوکنے انسان ہیں آج کل ادب اور تحقیق میں ایسے انسان ہی کامیاب ہوتے ہیں اس لحاظ سے ہمیں ان کے مستقبل سے امیدیں رکھنا چاہئیں۔

ڈگمبر پرشاد گوہر

جناب ڈگمبر پرشاد گوہر آغا شاعر قزلباش کے شاگردوں میں ہیں اور ایسے سعید شاگرد ہیں کہ انہیں پرستش کی حد تک مانتے ہیں۔ گوہر صاحب جواہر کا کاروبار کرتے ہیں اور روایتی شاعری یعنی بقید ردیف قافیہ شعر کہتے ہیں اسی کو شاعری خیال کرتے ہیں۔ گوہر سے میں نے جتنی غزلیں سنیں ان میں فنی اغلاط اور ابتذال نہیں دیکھا نہ معلوم ان کا کوئی مجموعہ بھی شائع ہوا ہے یا نہیں۔

گلزار دہلوی

جناب گزار نہایت شوخ و شنگ قسم کے نوجوان ہیں اور ادب کا ذوق ورثہ میں پایا ہے۔ وہ اصناف سخن میں کہیں بھی بند نہیں لیکن غزلوں میں وہ خوب خوب مضامین پیدا کرتے ہیں۔ مگر کمال ہے کہ نئے دور کے انسان ہیں مگر شاعری اور ادب میں قدیم روایات سے نہیں ہٹتے یہ شاید ان کے بزرگوں اور استادوں کی تربیت کا اثر ہے کہ قدیم شاہراہ کو نہیں چھوڑتے۔ زندگی میں تو وہ پگڈنڈیاں قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ بے راہ روی ادب میں نہیں آتی نہیں معلوم ان کا کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں۔

گوہر امروہوی

جناب گوہر امروہوی رئیس امروہوی کے بھائی ہیں ظاہر ہے کہ انہیں ذوق شعر و ادب خاندانی ورثہ میں ملا ہے شاعری تو فطری ذوق ہی سے پروان چڑھتی ہے چنانچہ جناب گوہر نہایت اچھا اور بلند شعر کہتے ہیں جس میں عیوب و محاسن کی احتیاط صاف ظاہر ہوتی ہے۔ مشاعروں میں بھی انہیں داد و تحسین ملتی ہے اور وہ اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں۔ نہ معلوم کوئی مجموعہ کلام بھی چھپا ہے کہ نہیں۔

گلشن جلال آبادی

گلشن جلال آبادی جناب قمر جلال آبادی کے چھوٹے بھائی ہیں یہ دیال سنگھ کالج کے طالب علم تھے اور ان کی ذہانت اسی وقت اپنا اعلان کرنے پر مجبور تھی وہ اس وقت بھی اچھا خاصا شعر کہتے

تھے اور زندگی نے اب تو نہ جانے انہیں کیا کیا انعامات دے دیئے ہوں گے وہ خدوخال سے ہونہار معلوم ہوتے تھے۔

ایشری پرشاد گوہر

جناب گوہر گورکھ پور کے رہنے والے ہیں اور بڑی دلجمعی کے ساتھ غزل پڑھتے ہیں ان کے کلام میں کچھ ایسا التزام ہے کہ ابتدا میں اساتذہ کا تتبع معلوم ہوتا ہے اور شباب میں دور شباب کے شعراء کی صف میں کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل زیادہ کہتے ہیں اور بڑے مزے میں پڑھتے ہیں نہ جانے کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں۔

رائے بہادر گور بخش رائے سیٹھی

رائے بہادر گور بخش رائے سیٹھی خود تو شاید شاعر نہیں تھے لیکن ان کے اندر کا انسان شاعر بھی تھا اور دیوتا بھی۔ وہ اکثر اپنے گھر پر نشست کراتے اور خاطر تواضع کے علاوہ جس کو قابل امداد خیال کرتے اسے خالی نہ جانے دیتے۔ وہ بہت شعر فہم بھی تھے اور صاحب احساس بھی اکثر اشعار پر ان کی آنکھوں میں آنسو جھلکتے اور وہ منہ پھیر کر پونچھتے۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل اور آنکھ میں مروت تھی نہ جانے تقسیم کے بعد وہ ویسے ہی ہیں یا سیاست کی گتھیوں میں وہ بھی الجھ گئے۔

گلچیں کرنالی

جناب گلچیں ملتان کے مشہور شاعروں میں ہیں۔ ان کی پختہ مشقی مسلم ہے۔ وہ فن کے متعلق بھی اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں اور قدیم رنگ میں نہایت سنبھل کر شعر کہنے والے لوگوں میں ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام بھی تقسیم سے پہلے چھپ چکا ہے اور اس کے بعد اسی عرصہ بیس سال میں نہ جانے انہوں نے کیا کیا ہوگا جو ابھی تک تشنہ طباعت ہے گلچیں صاحب نثر میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور اخبارات میں بھی ان کی تحریریں آتی رہی ہیں لیکن ان کے نثری مضامین کا اب تک کوئی مجموع نظر نہیں پڑا۔ آدمی با اخلاق ہیں اور مرنجان مرنج طبیعت رکھتے ہیں۔

مولوی گل محمد (دیوبند)

میں جب دیوبند گیا تو مولانا گل محمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی وہ ایک جید عالم ہیں۔ اگرچہ وہ صاحب زبان نہیں لیکن دیوبند کی آب و ہوا اور علماء سے دن رات کی علمی گفتگو نے ان میں ایک ایسی جاذبیت اور تاثر پیدا کردیا ہے جو بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دیوبند کے تمام اساتذہ جہاں علمی طور پر اپنی جگہ ستون ہیں وہاں ہر استاد ادبی طور پر بھی حیرت ناک معلومات کا حامل ہے۔

حاجی لق لق

جناب حاجی لق لق کا نام ابوالعلا تھا وہ عربی اور اردو کے بڑے فاضل تھے اور صحافت میں بھی ان کے لیے راستے ہی راستے تھے۔ انہیں عربی سے اردو میں ترجمے کی بھی بڑی مہارت تھی وہ فوج میں بھی رہ چکے تھے اور فوج نے انہیں بعض خصوصیات ایسی دے دی تھیں جو عمر بھر ان کے ساتھ رہیں۔ حیرت ہے کہ عربی کے فاضل ہو کر وہ مزاحیہ نگار کیوں ہو گئے تھے۔ ان کی مزاح نگاری کا رنگ الگ ہے جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

م۔ حسن لطیفی

لطیفی صاحب لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ جب وہ لندن سے جنزل ازم پاس کر کے آئے تو جناب اختر شیرانی نے اپنے رسالہ ''خیالستان'' میں ان کی تصویر شائع کی تھی۔ جب انہوں نے لاہور میں زندہ دلان لاہور کو پارٹی بند اور دوست نوازی میں مبتلا دیکھا تو انہوں نے ایک پریس اپنے بنگلہ میں ''شاطو پریس'' کے نام سے لگالیا اور عرصہ تک اپنی قلمی کاوشوں کو پمفلٹوں اور پوسٹروں کی صورت میں شائع کرتے رہے اور پھر اپنی شاعری کے مجموعے بھی شائع کیے جن میں سے نظریہ مہدی 'لطیفیات' اول دوم اور شعر منثور وغیرہ میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ لطیفی بڑا معیاری ادیب تھا، تقسیم ملک پر وہ لاہور میں آ گئے اور یہاں حکومت کی بے پروائی اور دوستوں کی کج خلقی نے اسے زیادہ روز نہ جینے دیا۔ لطیفی ایک کتاب کا حق دار ہے اس نے اس قدر مواد چھوڑا ہے کہ تین چار

سوصفحات کا مقالہ آسانی سے لکھا جاسکتا ہے مگر یہ آدم خور ماحول ابھی تک خاموش ہے۔

ل۔احمد اکبرآبادی

لطیف الدین احمد اکبر آبادی صاحب فہم و فراست انسان ہیں تاریخ ادب اور تنقید پر ان کی بڑی ناقدانہ نظر ہے اور اپنی تحریر میں بڑے سے بڑے الجھے ہوئے مسئلہ کو پانی کر دیتے ہیں تحریر میں روانی کے ساتھ سنجیدگی باقی رہتی ہے۔ جو بہت کم ادیبوں میں دیکھی گئی ہے۔ وہ ترجمے کے بھی ماہر ہیں اور الفاظ کو معانی و محل کی ہم آہنگی سے استعمال کرتے ہیں سنا جاتا ہے کہ وہ بحیثیت دوست بھی خوب آدمی ہیں۔

محمد دین فوقؔ

جناب فوق کو میں نے خوب دیکھا ہے وہ روایتی قسم کے انسان تھے لیکن نظم اور نثر دونوں پر انہیں حیرت ناک عبور تھا۔ ان کا مجموعہ کلام ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔ جس کی ایک جلد میرے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ انہوں نے ادب و تاریخ اور خصوصاً کشمیر پر جو کام کیا ہے وہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کشمیر پر کام کرنا چاہیں گے تو جناب فوق کے مطالعہ کے بغیر شاید ان کی تحقیق مکمل نہ ہو سکے۔ وہ بڑی معلومات کے انسان تھے اور ملک و قوم کا درد انہیں بے تاب رکھتا تھا۔ جناب فوق کی شخصیت بذات خود ایک کتاب چاہتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی

جناب محمود شیرانی تھے تو ریاست ٹونک کے رہنے والے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا ہے وہ اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ حافظ صاحب اس زبان کے سب سے پہلے محقق ہیں جنہوں نے اردو میں تحقیق کی بنیادیں اٹھائیں اور اردو کے ابتدائی دور کی تحقیق اس تکمیل کے ساتھ کی کہ ان کے بعد اب تک کوئی ان حدود کو عبور نہیں کر سکا "پنجاب میں اردو" ان کی تحقیق کا کارنامہ ہے جو ہمیشہ حوالے کی کتابوں میں آئے گی۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں اور مضامین بھی اپنی جگہ ادبی ستونوں کا مقام رکھتے ہیں۔ جناب مظہر شیرانی نے ان کے مقالات کو یکجا کیا ہے

جس کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر کا تعارف کرانا سورج کا تعارف کرانا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جناب مہر لاہور کے مشہور صحافی ہیں اور پاکستان کے مشاہیر ادباء میں شمار ہوتے ہیں۔

مہر صاحب نے زمیندار لاہور میں بھی کام کیا ہے اور ''انقلاب'' اخبار کا مہر و سالک کا دور اردو ادب کا ناقابل فراموش دور ہے۔ کیونکہ ان دونوں نابغوں نے عمر کا بہترین حصہ انقلاب بنانے میں صرف کیا ہے۔ اگرچہ صحافت کو تو ان حضرات نے بہت کچھ دیا۔ مگر انقلاب کے دور تک مہر صاحب کی تصانیف میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ انقلاب کے بعد مہر کے کارنامے دنیا کے سامنے ہیں اور دنیا داد و تحسین دے رہی ہے۔ میری نظر میں جناب مہر کی بڑی عزت و عظمت ہے لیکن انہوں نے ابھی تک علمی ادبی دنیا کو کوئی ایسی تصنیف یا تالیف نہیں دی جو تحقیقی یا تنقیدی شعبہ میں قابل ذکر کہی جائے۔ البتہ اب وہ یونیورسٹی سے نزدیک ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی کام ان کے قلم سے نکلے۔ اتفاق ہے کہ تاریخ ادبیات اردو کا شعبہ ابھی ابھی قائم ہوا ہے اور مہر صاحب ایسے گمنام نہیں کہ علمی ادبی حلقوں کے لوگ ان سے ناآشنا ہوں مجھے امید ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد ان سے کوئی مفید کام لیں گے ایسے ذہین اور طباع آدمی کم نظر آتے ہیں۔ اس نعمت خداوندی کا کفران گناہ کبیرہ ہے۔ جناب مہر کی کتاب ''غالب'' بھی بڑی اچھی کاوش ہے۔ لیکن اس کے بعد بہت سی کتابیں ''غالب'' اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ایسی آ گئی ہیں کہ غالب اب ایک گہری نظر اور تحقیق عمیق چاہتا ہے۔ اگرچہ مہر صاحب شاعری سے ملت برادری کی حد تک بے تعلق سے ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کا کلام ان کی طبیعت کی پختگی کا آئینہ دار ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ شاعر اس طرح گوشہ گیری بھی اختیار کرے گا۔ نہ جانے کون سی مصلحت جناب مہر کی روگردانی کا باعث ہوئی ہے۔

آنند نرائن ملا

پنڈت آنند نرائن ملا کشمیری پنڈت ہیں- ظاہر ہے کہ کائستھوں اور کشمیری پنڈتوں کے گھروں میں آج تک اردو فارسی مادری زبان ہے اور ان پر خاندانی روایت اور تعلیم و تربیت انسانی سیرت کو اور بھی چار چاند لگا دیتی ہے-

لکھنؤ میں پہلی بار ہی میری ملاقات آنند نرائن ملا سے ہوئی اور کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ایک زمانے سے وہ مجھ پر کرم فرماتے ہیں- ان دنوں وہ وکالت کر رہے تھے اور شہر میں ان کی قابلیت کی شہرت تھی انہوں نے اردو فارسی کی تعلیم مولانا برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محلی سے پائی تھی اور اسی زمانہ میں وہ ایسے قادر الکلام ہو گئے تھے کہ فارسی کے اساتذہ کے منظوم ترجمے نہایت کامیابی سے کر لیتے تھے اور انگریزی میں شعر گوئی کا راستہ بھی ان کے لیے مسدود نہیں تھا-

جناب پنڈت منوہر لال زتشتی کے اشارے پر انہوں نے غزل گوئی شروع کی اور باقاعدہ استاد کسی کو نہیں بنایا- ان کے فطری ذوق نے ان کی ایسی رہنمائی کی کہ آسی اور ناطق جیسے اساتذہ ان کے بارہ میں رطب اللسان تھے- ملا صاحب لکھنو کی سکونت کے باوجود لکھنؤ کی طرز شاعری کے قائل نہیں- ہاں کبھی کبھی ان کے یہاں غالب اور چکبست کے علاوہ اقبال کے کلام کی جھلکار بھی آ جاتی ہے-

ملا صاحب کی شاعری میں حسن و عشق کے سنجیدہ معاملات اور شریفانہ جذبات کا اظہار ملتا ہے وہ زندگی اور اس کے عوامل پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انسانیت کے پرچارک ہیں وہ موجودہ دور کی بے راہروی سے متاثر نہیں بلکہ اپنے خیالات اور نظریات کو فنی باقاعدگیوں سے مزین کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے شعر کی سچائی اور ان کا دلی خلوص اس میں ایک افسونی اثر پیدا کر دیتا ہے اور کیوں نہ ہو وہ بہر عالم ایک شریف، مخلص اور تربیت یافتہ شاعر ہیں اور اصناف سخن میں کسی بھی صنف میں عاجز نہیں-

ملا صاحب تقسیم ملک کے بعد اپنی سرکاری ملازمت کے تحت لاہور تشریف لائے تو یہاں بھی کئی مشاعروں میں شامل ہوئے- ان کے کلام سے پاکستان کے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ

مشاعروں میں ان کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور ہر سوسائٹی میں وہ عزت وافتخار کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔

جناب ملا کے یہاں جانبداری نہیں۔ وہ حق وصداقت پر اپنی جگہ ٹھوس اور اٹل نظریات رکھتے ہیں۔ ان میں انسان دوستی اس مقام پر ہے کہ بڑے بڑے درویشوں میں نہیں پائی جاتی اور جہاں تک معلومات اور علمی قابلیت کا سوال ہے وہ بڑے بڑے پروفیسروں سے زیادہ علم وادب کے سلوتری ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض پست خیال آدمی کہیں کہیں ان کے یہاں نشیب محسوس کریں لیکن پڑھے لکھے لوگ ملا کو ایک معیاری شاعر مانتے اور فاضل انسان گردانتے ہیں۔ ان کے تغزل میں اظہار خیال مہذب اور اخلاقی قدریں بلند ہیں۔

ملا صاحب غزلوں کی طرح نظمیں بھی اسی قادرالکلامی سے کہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں حب وطن سیاسی جدوجہد اور قومی تحریکات کا جذبہ ملے گا اور شاعری کی یہ پگڈنڈی پیغمبرانہ عمل واصلاح کی طرف مڑ جاتی ہے۔ ان کے کلام میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی ''جوئے شیر'' ان کے کلام کا مجموعہ میری نظر سے گزرا ہے۔ جس میں وہ اپنے خدوخال سے سامنے آتے ہیں۔

شیخ محمد اکرم

محمد اکرام صاحب پرانے آئی سی ایس ہیں اور کمال یہ ہے کہ حاکمانہ مصروفیات کے باوجود انہوں نے شعروادب کی تخلیق وتدوین کو بھی ضروری سمجھا ہے۔ جس کے ثبوت میں کئی تحقیقی کتابیں ان کے اس مشغلہ کی گواہ ہیں اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی ایسے ہی ادارے سے منسلک ہیں جس میں صرف تصنیف وتالیف ہی کے لوگ جمع ہیں اور ملک وقوم کے لیے مفید لٹریچر مہیا کر رہے ہیں۔ اکرام صاحب انتظامیہ کے تجربہ کار ہیں۔ ادارے میں ان کا وجود جہاں نظم وضبط اور اسلامی لٹریچر کی ترقی و توسیع کے لیے غنیمت ہے وہیں ارباب طریقت کی تاریخ وتذکرہ کی تدوین کے لیے بھی بڑے مناسب انسان ہیں۔

ماہر القادری

منظور حسین ماہر القادری کے والد جناب محمد معشوق علی ظریف تخلص کرتے تھے- اس اعتبار سے ماہر کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے- ماہر نسباً قریشی اور خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے ہیں- میں نے نہ جانے کتنے مشاعرے ماہر کے ساتھ پڑھے ہیں اور ان سے قدرے نزدیک رہا ہوں- اچھی معلومات کے انسان ہیں انگریزی میں بھی شد بد ہے مگر مطالعہ نے انہیں کندن بنا دیا ہے- چنانچہ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور آج کل اپنا ایک رسالہ "فاران" نکال رہے ہیں اور اس میں شاعری سے زیادہ وہ نثر کے آدمی معلوم ہونے لگے ہیں-

ماہر صاحب کچھ دنوں اخبار "مدینہ" بجنور سے بھی منسلک رہے ہیں اور ایک عرصہ حیدر آباد دکن میں بھی گزارا ہے- اس کے بعد وہ بمبئی میں آ کر فلمی گانے لکھنے لگے لیکن کچھ روز کے بعد یہ مشغلہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا اور اپنے وطن کیسر کلاں چلے گئے- ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک ہوئی تو پاکستان چلے آئے اور کراچی میں فاران کے ذریعہ علم و ادب ہی کی نہیں دین و مذہب کی خدمت کر رہے ہیں-

ماہر کے پہلے کلام میں نظموں کے علاوہ تڑپا دینے والی غزلوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے- مگر کمال ہے کہ یہاں آ کر ماہر بالکل بدل گئے- اب وہ ایک باشرع مسلمان ہیں اور تبلیغ دین ان کا محبوب مشغلہ ہے- چنانچہ کراچی سے جو اسلامی ادب کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تھا وہ بھی ماہر صاحب کے دماغ کی جدت تھی اب جناب ماہر کو مذہب، سیاست اور تاریخ سے بھی اچھا خاصا لگاؤ ہے اور ان کے کلام میں ان کی موجودہ رش کو ان کی وہ تمام شاعری پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ماہر اپنی کتاب "ذکر جمیل" ہی میں اپنے صحیح روپ میں آئے ہیں- اس میں ان کی عقیدت اور روحانی محبت کے علاوہ شاعرانہ خلوص بھی جلوہ گر ہے-

اگر چہ ماہر کی غزلوں میں بھی مطالعہ کے باعث مختلف دریچے کھل گئے ہیں اور مضامین کی بہتات نظر آتی ہے- لیکن ان کی روحانی چیخ کا گداز ان کی نعتوں میں ایسا شدید ہے کہ پتھر دل بھی پگھل کر بہنے لگتے ہیں-

نظموں میں الفاظ کا دروبست ماہر کے لسانی عبور کا غماز ہے۔ ان کے یہاں مناظر کی عکاسی اور جذبات نگاری کے بڑے اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں اور ان میں ایسا تنوع ہے کہ اگر ماہر صاحب نظم پر ہی قلم فرسا رہتے تو ان کا مقام اس میں بھی بلند ہوتا۔ ماہر کی مقبولیت کا یہ ثبوت کم نہیں کہ ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور ان کی برابر مانگ جاری ہے۔

مجاز

۳۴ء میں جب میں کلکتہ سے واپس آ رہا تھا تو دو ایک روز کے لیے عثمانیہ ہاسٹل میں جناب راحت مولائی مراد آبادی کے پاس قیام کیا اور وہیں مجاز سے ملاقات ہوئی ان دنوں مجاز وہیں زیر تعلیم تھے۔

جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے اصل میں وہیں سے ان کی شاعری ابھری ہے بی اے کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں تو انڈیا ریڈیو دہلی اور کچھ روز محکمہ اطلاعات بمبئی میں ملازم رہے اور اس کے بعد "حلقہ ادب" لکھنؤ کے کارکنوں میں شامل ہو گئے ان دنوں حلقہ ادب میں علی سردار جعفری، جذبی اور سبط حسن وغیرہ کام کر رہے تھے۔ مگر مجاز وہاں بھی زیادہ روز نہ رہ سکے اور دلی آ کر ہارڈنگ لائبریری میں رہے اور کچھ عرصہ بعد اس ماحول میں بھی ان کی گنجائش نہ رہی۔ اب مجاز وہاں سے علیحدہ ہو گئے تو ان کے لیے شعر و شاعری کے سوا کوئی مشغلہ نہ رہا۔

یوں تو مجاز ایک جذبات نگار شاعر ہیں لیکن جب ان کی شاعری پر شباب آ رہا تھا اس کے ساتھ ملک میں تحریک آزادی کا ہنگامہ برپا ہوا اور ہر شاعر اور ادیب نے اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ مجاز کی شاعری میں آزادی ملک کے احساس نے ایک انقلابی دھاری لگائی جس سے ان کے رنگ میں اور بھی شعلگی آ گئی۔ ان ساغر و بادہ کے اشعار میں بھی جب آزادی کا خون دوڑا تو انگڑائیوں سے قوس قزح بننے لگی اور خمار کا تشنج شاخ گل کی لچک میں ڈھل گیا۔

مجاز کے یہاں خلوص میں اس کے تجربات کی ایسی رنگ آمیزی ہے جو اس دور کے بہت کم شعراء میں کہیں کہیں ملتی ہے۔ اس کے باوجود کہ مجاز خود متوازن نہیں رہے تھے۔ ان کی شاعری میں رمزیت اور اشاریت کا ایسا بھلا توازن ملتا ہے جو مجاز کی ساری زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی

انقلابی شاعری روائتی نہیں بلکہ اس نے اپنے طرز نگارش سے مشعلوں کو شبنم میں سمو کر پیش کیا ہے۔ اس کی شاعری بگل کی آواز نہیں ہے بلکہ ایک نغمۂ انقلاب ہے جو دلوں میں اترتا چلا جاتا ہے اور قدم خود بخود میدان کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ مجاز کے آہنگ کو اس کے ہم عصر شعراء نے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور پھر اس راہ سے ہٹ کر خود مجاز کو سطحی شاعر بنانے لگے مجاز زندگی بھر اس کشمکش میں رہا کہ ایک طرف تو وہ حسن کے خاموش آنسوؤں کی زبان کو سمجھتا تھا اور دوسری طرف ملک کی آزادی کا جنوں اس کے پاؤں اکھاڑے ڈالتا تھا اور اس کشمکش میں اس نے جو راگ الاپا ہے وہ نہایت کارگر اور حسین ہے اور یہ ایک ایسے راستے کی داغ بیل ہے جس سے ہر شاعر اپنی کشمکش کو اپنے انداز میں کامیابی سے بیان کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہوں۔

مجاز کی زندگی میں اس کا ایک مجموعہ ''آہنگ مجاز'' کے نام سے چھپا تھا اور پھر اس کے کئی نام بدلے گئے۔ آج مجاز خود ایک آہنگ ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب

خواجہ صاحب مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء میں تھے۔ میں نے زندگی میں ایسی محبت اور سپردگی کا انسان نہیں دیکھا۔ ان کی محبت کا ثبوت مجذوب صاحب کا کلام اور ان کی کتاب ''اشرف السوانح'' ہے۔ میں نے بھی بچپن میں انہیں ایک دو غزلیں دکھائی ہیں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''کشکول مجذوب'' چھپ چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ غزل کا صحیح تصور ان کے یہاں ایسا ہے جسے ہم تغزل کی مثالوں میں پیش کر سکتے ہیں۔

سید عبدالجلیل مائل نقوی

جناب مائل اساتذہ کی صف کے آدمی ہیں۔ اصناف سخن میں کوئی ایسی صنف نہیں۔ جس پر انہیں عبور نہ ہو وہ بچوں کے ادب سے لے کر تحقیق تک بے تکان لکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں قواعد و ضوابط کے لحاظ سے چاروں چول برابر ہوتی ہیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں اور واقعات بھی سلام بھی کہتے ہیں اور رباعیات و قطعات بھی۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں کئی وقیع کتابیں ہیں۔

اور کئی کارآمد کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔

مانی جائسی

جناب مانی جائسی اساتذہ کی صف میں تھے۔ ان سے الہ آباد میں ملاقات ہوئی اور پھر کئی بار مشاعروں میں شرف نیاز ہوا۔ قدیم رنگ کی روائتی شاعری کے مشہور لوگوں میں سرفہرست آتے ہیں نثر اور نظم دونوں میں کمال حاصل کیا۔ ان کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔

مجید نظامی

جناب مجید نظامی' حمید نظامی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں اور بڑے صاحب حوصلہ اور عالی ظرف انسان ہیں۔ نئی عمر میں ''نوائے وقت'' جیسے اخبار کو سنبھالنا اور اس کی روائتی روش پر چلانا ان کی ذہانت کا حیرت ناک کارنامہ ہے۔ وہ کم گو ضرور ہیں مگر پست فکر نہیں وہ کم آمیز ہیں مگر انسان کو بیک نظر بھانپ لیتے ہیں اور پھر بولتے ہیں ان میں صحافیوں کی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک بڑے صحافی میں ہونی چاہئیں اگر یہ زمانہ کی ہوا اور وقت کے فریب سے محفوظ رہے تو ایسے صحافی کے لیے تاریخ کا آغوش ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

محمود کپورتھلوی

صوفی خورشید عالم محمود کپورتھلہ کے رہنے والے ہیں بچپن کی اسلامی تربیت کا فیض ہے کہ نہایت اچھے مسلمان ہیں اور ارباب طریقت کے ماننے والوں میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ جدید شاعری کے دلدادہ نہیں ہو سکتے اور قدیم رنگ میں شاعری کرتے ہیں۔ زود گو بھی ہیں اور خاصا صاف ستھرا شعر کہتے ہیں۔ ان کے خیالات و تصورات ان بزرگان دین کی تعلیم کے سائے میں چلتے ہیں جن کے یہ ماننے والے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ان کی تبلیغ دین اور اخلاق و اعمال کی اصلاح بولتی ہے۔ فن خطاطی میں آپ جناب تاج الدین زریں رقم کے شاگرد ہیں' اور ایسے شاگرد ہیں جن کے موئے قلم سے استاد کی عظمتوں کا سراغ ملتا ہے۔

صوفی خورشید صاحب جیسے خوشنویس ہمارے ملک میں بہت کم ملتے ہیں یہ صحیح معنی میں اپنے

استاد کے جانشین ہیں-فن کے اعتبار سے اوج ثریا پر ہیں اور سادگی کے اعتبار سے درویشانہ زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں-ابھی تک صوفی صاحب کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا-

اخبارات اور رسالوں میں بھی بہت کم چھپتے ہیں کوئی خود جا کر ان سے غزل لے آیا تو لے آیا ورنہ وہ نہ اپنا کلام کہیں بھیجتے ہیں اور نہ توڑ جوڑ کی منڈیوں کے عادی ہیں-ان کے یہاں اکتفاو استغنا ضرور ہے مگر خلوص محبت اور ہمدردی سے ان کا سینہ پٹا پڑا ہے-

مظہر صدیقی

جناب مظہر الدین صدیقی ملک کے مشہور شاعر بلند پایہ ادیب اور قابل قدر صحافی ہیں وہ اپنے سینے میں حساس دل رکھتے ہیں-ان کا مطالعہ ہشت پہلو اور ان کی فکر چومکھی ہوتی ہے وہ ادب وشعر کے علاوہ ملکی سیاست سے بھی باخبر ہیں' اور اپنے اسلاف کی طرح تبلیغ اسلام کے علمبردار بھی-ان کی خلوص نیت ان کی تحریروں سے ثابت ہے اور وہ تصنیف و تالیف میں اپنی تمام خوبیوں سمیت ملتے ہیں-

شاہ معین الدین ندوی

شاہ معین الدین ندوی صاحب میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں اعظم گڑھ کے مشاعروں سے جہاں میری نیت بشیر احمد صاحب پرنسپل' سید سلیمان ندوی صاحب' مولوی عبدالسلام صاحب اور نیاز صاحب سے ملاقات ہوتی تھی وہیں شاہ معین الدین صاحب کا خلوص بھی کھینچتا تھا-اس میں شک نہیں کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ہر فرد اپنی جگہ ایک علمی ستون ہے-لیکن اکثر اوقات ایسے لوگ ملاقات میں کھل کر سامنے نہیں آتے-شاہ صاحب میں یہ یہ بات نہیں-وہ زندگی میں تکلفات سے پرہیز کرتے ہیں-وہ جس درجے کے عالم ہیں اسی مقام کے مخلص اور وفا پرست بھی ہیں-ان کی تصانیف ان پر اچھی طرح روشنی نہیں ڈالتیں-وہ بہت خوش خلق' خوش گو اور خوش مزاج انسان ہیں-

مائل انبالوی

جناب مائل انبالوی سے ملاقات کو ایک زمانہ ہوگیا وہ سکول میں ٹیچر تھے اور اپنے مقام کو لوگوں کے اندازے سے پہلے سمجھ گئے تھے۔ شعر کے عیوب و محاسن کی انہیں اچھی خاصی معلومات تھیں وہ غزل کم نظم زیادہ اور مرثیہ خوب کہتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد نہ معلوم کہاں گم ہیں۔

محشر امروہوی

جناب محشر سے اکثر مشاعروں میں ملاقات ہوئی ہے۔ وہ قدیم رنگ میں غزل کہتے ہیں اور مستقل طور پر بمبئی میں قیام ہے۔ جہاں تک مشاعروں میں غزلیں سننے کا تعلق ہے نہایت اچھی غزلیں پڑھتے ہیں۔ اپنی ہیئت اور شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اسٹیج پر غنیم کی صورت میں آتے ہیں اور غزل سے اسٹیج کو تالیوں میں گم کر کے چلے جاتے ہیں۔ ابھی ان کا مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا۔

محشر رام پوری

جناب محشر بڑے تجربہ کار اور پختہ مشق شاعر ہیں ان کی غزلوں میں وہ تمام شرائط قریب قریب پورے ہوتے ہیں جو غزل کے لیے ضروری ہیں۔ کم الفاظ میں طویل مضمون کو کھپانا محشر کی خصوصیات میں ہے۔ وہ سنجیدہ بات کہتے ہوئے بھی زبان و بیان کی رنگینی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے اشعار میں محذوفات کا حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ روزمرہ اور محاورات پر ان کی پوری گرفت ہے، اور الفاظ کے برمحل استعمال کا سلیقہ ان کے اکثر اشعار میں بولتا ہے۔

ایم ایم فرشوری

جناب فرشوری بدایوں کے ایک علمی خاندان کے فرد ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے نواب شاہ میں مقیم ہیں۔ ادب اردو پر ان کی گہری نظر ہے۔ نظم، غزل اور تنقیدی مقالات بڑی چابک دستی سے لکھتے ہیں۔ زبان کے روزمرہ اور محاورے سے خوب واقف ہیں۔ ان کے یہاں تحریر میں پستی اور کلام میں ابتذال نہیں ہوتا۔

مظہر اداس آہوجہ

مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگردوں میں مولانا کا سب سے زیادہ معتقد اور قدر دان، لٹریچر میں نہایت اچھی سوجھ بوجھ، غزل گوئی میں نہایت سنبھل کر بڑی نکھری ہوئی غزل کہنے والا، اور نظموں میں طبیعت انگریزی لٹریچر کا اثر لیے ہوئے۔ دوستوں کا دوست اور صحیح مذاق شعری سے بہرہ اندوز نوجوان، نہ جانے کلام کا مجموعہ کوئی چھپا ہے یا نہیں۔ یہ سطور لکھتے ہوئے اس کا ہنستا ہوا چہرہ اب بھی میرے سامنے ہے۔

میراجی

محمد ثناء اللہ ڈار، تخلص، لقب یا ادبی نام کی جگہ میراجی لکھتے تھے۔ جب مزنگ میں رہتا تھا تو میرے ایک دوست سلیم سوز نے میراجی سے میرا تعارف کرایا تھا۔ میراجی میں جب اس فن لطیف (شاعری) نے آنکھ کھولی تو وہ سامری تخلص کرتے تھے۔ لاہور کے دوران قیام انہیں کسی بنگالی لڑکی سے لگاؤ ہوا تو سامری سے میراجی بن گئے۔ ان کی جنسی تشنگی اور محرومی نے انہیں ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ وہ کچھ اور ہو گئے۔ اب وہ پہلے میراجی نہیں تھے۔

میراجی مجھے اکثر ملتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب دیکھی۔ اگرچہ وہ انٹرنس پاس بھی نہیں تھے لیکن ان کے ذوق مطالعہ نے ایسی رہنمائی کی کہ انگریزی کی مشکل تحریر ان کے لیے پانی ہو گئی تھی۔

اسی اثناء میں میراجی کے کوئی دوست انہیں ''ادبی دنیا'' کے دفتر لے گئے اور مولانا صلاح الدین صاحب نے انہیں نائب مدیر کی حیثیت سے دفتر میں رکھ لیا۔ چار پانچ برس وہ ادبی دنیا سے منسلک رہے اور مولانا صلاح الدین صاحب جیسے بالغ نظر انسان کی صحبت ملی جس سے ان کا ذوق ادب اور بھی آبدار ہو گیا۔ یہاں سے ہٹے تو ریڈیو میں ملازم ہو گئے اور وہاں ریڈیو کے مسودات دیکھنے میں انہیں جہاں مختلف انداز کے خطوط پڑھنے میں مہارت حاصل ہوئی وہیں ریڈیو کے ڈھب کی عامیانہ تحریریں لکھنے میں بھی ملکہ ہو گیا اور ریڈیو میں ان کی شاعری نے بھی ایسی ڈگر اختیار کی جو ان کی کتاب ''گیت ہی گیت'' میں ملتی ہے۔

لیکن دلی پہنچ کر ریڈیو کے اراکین کی صحبت اور رنگینی نے جہاں انہیں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ادب سے روشناس کیا وہیں شیشہ و ساغر کا رسیا بھی کر دیا۔ چند روز وہ دہلی رہے اور جب اپنی گنجائش نہ دیکھی تو بمبئی چلے گئے کیونکہ وہاں شاعروں اور ادیبوں کو نظمی حلقے نواز رہے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک ادبی رسالہ ''خیال'' کے نام سے نکالا اور نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی کے ایک ہسپتال میں نذر اجل ہو گیا۔

میرا جی اپنے طرز نگارش کے واحد انسان ہیں جو ماضی کی روایت سے سرتاپا باغی ہیں وہ سماجی اور اخلاقی پابندیوں کو بار سمجھتے تھے۔ جن سے ان پر ایک روحانی کشمکش طاری رہتی تھی اور اس میں جو وہ کہنا چاہتے ہیں ایسے الفاظ میں کہتے جن سے کلام میں ابہام آ جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ قدیم رنگ سے واقف نہیں تھے۔ جب وہ کوئی زندگی کا ایسا پہلو بیان کرتے تھے جو عوامی ہو تو وہ اسے روائتی اسلوب ہی میں کہتے تھے۔ جس سے ان کی فن سے واقفیت بولی اٹھتی تھی۔

میرا جی کے گیتوں میں نرمی اور ترنم ہے اور وہ ہر ہیئت شعری پر قادر ہیں۔ انہیں گردوپیش کے حالات و معاملات کا ادراک اور شعور بھی ہے۔ لیکن جہاں وہ اپنی جنسی الجھن کو بیان کرنا چاہتے ہیں وہاں ان کے جذبات کا ہجوم اس قدر ہو جاتا ہے کہ انہیں الفاظ دستیاب نہیں ہوتے۔ اسی لیے وہ اکثر ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ جنسی جذبات کے بیان کے لیے ہندی الفاظ میں جس قدر وسعت اور مٹھاس ہے وہ ابھی ہماری اردو شاعری میں پورے شباب کے ساتھ نہیں آ سکی۔

میرا جی کی شاعری کو اگر دیکھا جائے تو ان کی جنسی محرومی اور جمالیاتی تشنگی کا تشنج ہے جسے وہ ایمائیت اور اشاریت سے بیان کرتے ہیں اور یہی ان کے کلام کے مجموعوں میں خاص بات ہے۔ میرا جی نے انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کیے ہیں اور ان سے ان کی مہارت اور قدر آشکار ہے۔

منیر چغتائی

پروفیسر منیر چغتائی پنجاب یونیورسٹی میں ریڈر ہیں اور آکسفورڈ سے ڈی فل ہیں۔ شروع ہی سے ان کا ذوق ادب نہایت شستہ و صاف رہا ہے آج بھی وہ اگرچہ سیاسیات کے استاد ہیں لیکن ان کا ادبی ذوق اپنی جگہ ہے اور وہ شعر کم کہتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری میں ناہمواری خیال نہیں ہوتی۔

وہ انسانی اقدار کے مبلغ ہیں اور اردو کی خدمت کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے وہ اردو لکھنے' اردو پڑھنے اور اردو بولنے کے حق میں ہیں میں انہیں ان کے زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے اردو کے علاوہ گفتگو نہیں سنی حالانکہ وہ فارسی' عربی اور انگریزی میں قابل رشک قابلیت کے مالک ہیں۔ منیر چغتائی صاحب حافظ قران بھی ہیں' اور انگلستان میں طویل مدت گزارنے کے باوجود آج تک شراب کو نہیں چھوا۔ وہ ایک صالح نوجوان معیاری ادیب اور نغز گو شاعر ہیں اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ تصنیفی و تالیفی ذوق رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں تاریخ کے مستند اور معاشرہ کے مفید اور کار آمد گوشے ہیں ان کے خاندان کے اکثر افراد سے مل کر شرافت نسبی کا احساس ہوتا ہے اور ہر آدمی کسی نہ کسی رخ سے کسی نہ کسی فن لطیف کا دلدادہ ہے اور ان میں حکمت اور مصوری کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ لاہور کے مشہور و معروف مصور ماسٹر میراں بخش صاحب' پرنسپل میوسکول آف آرٹ (نیشنل کالج آف آرٹ) جناب منیر صاحب کے نانا تھے اور اب ان کی اولاد اسی آبائی ذوق کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ جناب منیر کے یہاں سے ایک قدیم طبی رسالہ ''الحکیم'' بھی نکلتا ہے جو آج تک اپنی روایت کی خصوصیت سے ذرا بھی نہیں ہٹا اور جناب منیر کا اس میں بہت ہاتھ ہے۔

مقبول بدخشانی

جناب مقبول بیگ بدخشانی تعلیمی شعبہ کے انسان ہیں اور فارسی زبان و ادب پر ان کی نظر بڑی گہری ہے آج کل وہ محکمہ اوقاف کے شعبہ تحقیق و تالیف میں ایک ذمہ دار عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن جہاں وہ کام کر رہے ہیں دوسرے سے کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن انہیں خود کام کرنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اور ان کا وہ تصنیفی و تالیفی ذوق پھول پھل نہیں سکے گا۔ جس کے وہ اہل ہیں۔ فارسی شعراء کا تذکرہ اور فارسی ادب پر دیگر کتابیں ان کی کاوش کی شاہد ہیں کہ یہ ریسرچ کے آدمی ہیں۔

پروفیسر مجیب

پروفیسر مجیب جامعہ کے اساتذہ میں نمایاں شخصیت کے حامل ہیں- ان کی زندگی ہی علم وادب ہے- ایسا فرض شناس اور پر خلوص انسان مشکل سے دستیاب ہوتا ہے- ان کے قلم سے جو کتابیں نکلی ہیں وہ اپنی جگہ ملک کے علمی سرمایہ میں اضافہ ہیں- وہ صحیح معنی میں استاد ہیں- ہمارے تعلیمی اداروں میں ایسے ہی اساتذہ کی ضرورت ہے جو سرتاپا خلوص ہوں اور دن رات علمی فیض میں گم رہیں-

مشیر جھنجھانوی

جناب مشیر جھنجھانوی سے دہلی میں اکثر ملاقاتیں ہوئیں اور کئی مشاعروں میں بھی انہیں سنا- یہ مشاعروں میں انتخاب پڑھتے ہیں اور غیر طرحی مشاعروں میں انتخاب ہی پڑھنا چاہئے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ محظوظ ہوسکیں- جناب مشیر نے شگفتہ طبیعت پائی ہے- ان کی شاعری میں بھی ان کا ذوق نمایاں ہے- یہ شعر میں جو بات کہتے ہیں وہ ہمیشہ شگفتگی کا دامن تھامے ہوئے ہوتی ہے- یہی سبب ہے کہ ان کی غزل غور سے سنی جاتی ہے اور مشاعروں میں ہڑبونگ نہیں ہوتی- اخباروں اور رسالوں میں ان کا کلام پڑھنے میں آتا ہے لیکن مشیر صاحب کا کوئی مجموعہ میری نظر میں نہیں آیا-

تلوک چند محروم

جن دنوں مجھ میں شعر کا شعور پیدا ہوا اور اردگرد کے شعراء پر نظر ڈالی تو مجھے محروم کی شاعری بھی پسند آئی اور چونکہ میں کسی شخص سے بھی مشورہ کو عیب نہیں سمجھتا تھا- چنانچہ کئی بار میں نے محروم صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کا احترام میری نظر میں اساتذہ جیسا ہی رہا ہے- لیکن محروم صاحب مجھ سے برابر والوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے- حالانکہ میں ان کے لڑکے جگن ناتھ آزاد سے کسی طرح بھی بڑا نہ تھا اور یہ جذبہ ان میں شاید اس لیے تھا کہ زندگی کا طویل عرصہ درس و تدریس میں گزرا تھا- ان میں اخلاقیات اور ادبیات کی وجہ سے ایک ایسا حسین امتزاج آگیا تھا جو ادب کی معیاری خصوصیات میں داخل ہے ان کی نظموں میں بھی ان کی وہی فطرت ثانیہ کام کررہی ہے- وہ کہیں اخلاقیات کے حدود سے نہیں نکلتے اور ان کی شاعری میں نظموں کا حصہ اسی لیے بلند ہے کہ اس میں

ان کے روحانی تقاضے اور فطری پسندیدگی شامل ہے- یوں تو ان میں شاعری کی ہر صنف پر عبور ہے لیکن میں ان کی نظموں کو زیادہ پسند کرتا ہوں- شاید اس لیے مجھے بھی اچھی نظموں سے لگاؤ رہا ہے- جہاں تک اصلاح قوم وملت کا سوال ہے- وہاں نظم ہی کام کرتی ہے- غزل سے بات نہیں بنتی کیونکہ نظم تفصیل ہے اور غزل میں اجمال ہے اور سمیٹ کر بات کہی جاتی ہے- بہرنوع میں مرحوم صاحب کے اخلاق اور شاعری دونوں سے متاثر ہوا ہوں اور انہوں نے جو اپنی نیچرل شاعری کے طبع زاد نقوش چھوڑے ہیں وہ زمانہ کے لیے یادگار رہیں گے-

کرنل مجید ملک

جناب کرنل مجید ملک پرانے لکھنے والوں میں ہیں- انہیں تخلیق ادب کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا کیونکہ ان کے عہدوں کی مصروفیات نے انہیں سر نہیں اٹھانے دیا- اس لیے ان کا سرمایہ تحریر کا ضرور ہے- لیکن انہوں نے جب بھی لکھا ہے اور جو بھی لکھا ہے وہ ابتذال سے معرا اور عیوب انشا سے پاک ہے- اس میں ان کی فکر اور سلیقہ بولتا ہے- وہ ایک بلند فکر ادیب اور نغز گو شاعر ہیں- وہ ایک عرصہ سے ایک ادبی ذخیرہ کی ترتیب میں ہیں جس میں شعراء نے اپنے انتخاب سے پانچ پانچ شعر لکھے ہیں اور ان کے عیوب ومحاسن پر اظہار خیال کیا ہے اب دیکھیے ان کی یہ علمی کاوش کتابی صورت میں کب منصۂ شہود پر آتی ہے-

پروفیسر مرزا منور

مرزا صاحب گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہیں اردو٬ فارسی اور انگریزی پر قابل رشک عبور ہے- اپنے فرض منصبی کے بعد ان کا وقت علمی ادبی صحبتوں میں گزرتا ہے اور جب دیکھیے اردو کی توسیع و ترویج میں مصروف نظر آتے ہیں- انہیں ترجمہ وتالیف کا ذوق بھی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے کام بھی کیا ہے- گزشتہ کئی سالوں سے ان کی نظر علامہ اقبال کے زیادہ ہی قریب رہنے لگی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ علامہ صاحب انہیں کہیں اور دیکھنے سے منع فرما دیں زبان و ادب اور خصوصی طور پر اقبالیات کے ضمن میں ان سے بڑی توقعات رکھنا قطعی طور پر بجا ہے-

منیر بھوپالی

قدیم رنگ کے استاد تھے اور آخر تک انہوں نے اپنے رنگ تغزل سے انحراف نہیں کیا- انکی نظر اصناف ادب کے ہر پہلو پر تھی اور بڑی احتیاط سے شعر کہتے تھے ان کا مجموعہ کلام دیوان بھر کا تھا' نہ معلوم مجموعہ چھپا ہے یا نہیں-

محوی صدیقی

زیادہ تر مدارس میں رہے- نہایت خوشگوار اور خوش مذاق شاعر ہیں ان کے شاگرد بھی ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں- اب بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور بھوپال آگئے ہیں-

مسعود جاوید

مسعود جاوید صاحب بھی دیوبند کے رہنے والے ہیں اور لکھنؤ میں مدرس ہیں- ان کا صاحب کمال ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں لیکن وہ دیوبند کی فضا سے ہٹ کر جو شے ہو گئے ہیں وہ بھی عام نہیں ہے- وہ صحیح معنی میں ادیب ہیں- احساس کو الفاظ میں بیان کرنا ان کا حصہ ہے وہ ناول بھی لکھتے ہیں اور افسانے بھی' ترجمہ بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی- نیاز فتح پوری نے صرف دو آدمیوں کو خیال کیا تھا کہ ''نگار'' ان کے سپرد کر دے ایک عبدالمالک آروی مرحوم دوسرے مسعود جاوید' اس دور جدید میں مسعود جاوید کا قلم لکھنؤ کے ادیبوں سے الگ ایک روش رکھتا ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں پر پوری اترتی ہے-

مذاق العیشی

جناب مذاق حضرت عیش فیروز پوری کے شاگرد ہیں اور ملتان ہی میں بسلسلہ ملازمت سکونت پذیر ہیں دفتری اور کاروباری مصروفیات کے باوجود شعر کہتے ہیں اور اچھا شعر کہتے ہیں- لیکن چونکہ ملتان ابھی شعر و ادب کا مرکز نہیں اس لیے ان کے نغمے مقامی انجمنوں اور مشاعروں تک رہ جاتے ہیں- مذاق العیشی صاحب ویسے بھی کچھ کم آمیز معلوم ہوتے ہیں کیونکہ میں نے انہیں بہت کم

مشاعروں میں دیکھا ہے اوران کے اشعار نے ان کی صلاحیتوں کا تعارف کرایا ہے-

منظور احمد منظور

لائل پور کے مشہور شاعر ہیں-خلیق اور ملنسار قسم کے انسان ہیں شاعروں میں ان کی شاعری بھی اسی خیال سے سنی جاتی ہے کہ وہ ضرور کوئی کارآمد بات کہیں گے اور پھر سامعین مایوس نہیں ہوتے وہ انفرادیت کی کم اوراجتماعیت کی بات زیادہ کہتے ہیں- انہیں زندگی میں عوام سے زیادہ سابقہ رہا کیونکہ وہ عوامی ادارے میں ایک افسر کی حیثیت سے نیک نام ہیں-عرصہ ہواان کا ایک مجموعہ ''دیرو حرم'' چھپا تھا جسے اردوادب میں اضافہ کہنا غلونہیں-

سید منظور بخاری

جناب منظور بخاری سے امرتسر میں ملاقات ہوئی اس وقت یہ زیرتعلیم تھے مگراس وقت بھی شاعر تھے اوراچھے شاعر بعد میں جب ان سے نزدیکی ہوئی توان کی انسانیت نے بھی متاثر کیا ان میں بلندی اورترقی کے آثار موجود تھے اوران کی شاعری سطحی شاعری نہیں تھی-وہ نظم بھی کہتے تھے اورغزل بھی-عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی سنا ہے لاہور میں کسی گورنمنٹ کے ادارے سے منسلک ہیں-ان کا کوئی مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا-

مظہر گیلانی

سید مظہر گیلانی پشاور کے متعارف شعراء میں ہیں-ان کی پختگی اورکہنہ مشقی نے اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں-وہ نظم اورغزل دونوں میں تیز خرام ہیں-ان کے کلام میں حسن وعشق کے عامیانہ مضامین نہیں ہوتے وہ اپنے سے زیادہ سماج اور معاشرے کی بہبود کے متعلق سوچتے اورعمل کرتے ہیں-اگرکبھی محبان وطن کا کوئی تذکرہ لکھا گیاتو مظہر گیلانی کا اس میں ایک خاص مقام ہوگا وہ علم سے زیادہ عمل کے انسان ہیں اوران کا عمل بصیرت کی زمین سے اگتا ہے جس کی صحت مشکوک نہیں ہوسکتی-

ممتاز حسین

ممتاز حسین صاحب کراچی میں لیکچرر ہیں تنقید و تبصرہ میں انہیں خاص مقام حاصل ہے اور وہ اپنی دوسری مصروفیات سے وقت نکال کر اس ذوق اور خدمت سے بھی غافل نہیں۔ وہ ایک محنتی اور زیرک انسان ہیں اور اس پر اپنی صلاحیتوں سے بھی بے خبر نہیں۔ ان کے سامنے علم و ادب کے بڑے عجیب عجیب پہلو آتے ہیں جو ان کی روزمرہ کی گفتگو میں بھی جھلک دے جاتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

محسن برلاس

مرزا محمد محسن برلاس متخلص محسن رام پور کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں ۱۹۵۰ء میں لاہور آئے ایم اے تک علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ایل ایل بی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ اب حکومت کے کسی ادارہ میں ہیں۔

علمی ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' اس لیے شاعری ان کا آبائی ذوق ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود شعر کہتے ہیں۔ شعر کی تعریف یہی ہے کہ شاعر کو اپنی تخلیق پر مجبور کر دے نہ کہ خود مجبور ہو جائے اور جو شعر کو مجبور کرتے ہیں وہ متشاعر تو ہو سکتے ہیں شاعر نہیں ہو سکتے۔

محسن برلاس چونکہ رام پور کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس لیے یہاں زبان کا استعمال برمحل ہوتا ہے۔ شعر میں وہ جو کہنا چاہتے ہیں بڑی بے تکلفی اور صفائی سے کہہ جاتے ہیں اور اخلاقیات کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ قدیم معتقدات کے انسان ہیں۔ مذہب کو انسانیت کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور ان کی شاعری بھی کفر و الحاد میں قدم نہیں رکھتی۔ وہ خالص غزل کہتے ہیں۔ جو واقعی غزل ہوتی ہے ابھی تک ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا' اگرچہ کلام اس سے کہیں زیادہ ہے۔

مظہر جعفری

جناب مظہر جعفری ایک اسکول میں استاد ہیں اور وہی استادی ان کی شاعری میں برقرار ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں بڑی چابکدستی سے کہتے ہیں اور مرثیہ میں تو ان کا قلم وہ جولانیاں دکھاتا ہے کہ

بے ساختہ منہ سے داد و تحسین نکلتی ہے۔ ان کی نظر شعر کے ردیف و قافیہ پر بڑی گہری ہے اور چونکہ اسکول میں انہیں صرف و نحو بھی پڑھانی پڑتی ہے اس لیے وہ شاعری میں بھی معانی و بیان اور زبان کے قواعد و ضوابط کا سختی سے التزام کرتے ہیں اور انہیں اپنی شاعری کے معیار کا خود بھی احساس ہے۔ مگر ابھی تک ان کا کوئی مجموعہ کلام اشاعت تک نہیں پہنچا۔

سجاد علی مہر اکبر آبادی

جناب مہر راولپنڈی میں پروفیسر ہیں انہیں نظم اور غزل دونوں پر قابل رشک عبور حاصل ہے تنقید و تبصرہ میں انہیں معقول درک ہے ادب کے وہ گوشے جو عموماً ناقدوں کی نظر سے بچ جاتے ہیں جناب مہر کی پرواز نظر سے پردہ نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت کے شعبہ کا تجربہ انسانی دماغ کو بہت کچھ دیتا ہے۔ لیکن اپنا اپنا انداز نظر ہے۔ جناب مہر اکبر آبادی خالص تنقید کے آدمی ہیں اور شعر میں بھی ان کا ایک خاص رنگ ہے۔

ماہر لکھنوی

جناب مہر لکھنؤ کے شاعروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اصناف سخن پر ان کی ہر صنف پر گہری نظر ہے اور لکھنؤ کے خاص رنگ میں شعر کہنا ان کا حصہ ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ اور محاورات کا استعمال برمحل ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

مہذب لکھنوی

جناب مہذب لکھنوی لکھنؤ کے نمودار ادباء میں سے ہیں۔ ذوق شعر و ادب ورثہ میں ملا ہے اور انہوں نے اس ورثہ کو ضائع نہیں کیا بلکہ آگے بڑھایا ہے روزمرہ اور محاورات پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ انہوں نے ایک لغت ''مہذب اللغات'' بھی مرتب کیا ہے۔ جو قابل قدر خدمت ہے۔ جناب مہذب کو اپنی عظمت اور علمی معلومات کا احساس ہے اور اس لغت میں انہوں نے اپنے اشعار زیادہ سے زیادہ دیئے ہیں۔ باقی تقسیم ملک کی دوری کے باعث ان کی دیگر تصانیف میری نظر سے حوالہ کے لیے نہیں گزریں۔

ڈاکٹر محفوظ علی

ڈاکٹر محفوظ علی صاحب پاکستان نیوی میں ہیں وہ جدید شاعری کرتے ہیں۔ جب وہ جناب ظفر زبیری کے منزل ہوٹل کے مشاعروں میں آتے تھے اس وقت بھی جدید رنگ کی نظمیں سناتے تھے جو ردیف، قافیہ اور مروجہ اوزان و بحور سے آزاد تھیں۔ ملاقات کو ایک زمانہ ہو گیا ہے نہ معلوم وہ اب کن منازل میں ہیں۔

مسرور مجاز

مسرور مجاز کو میں نے سب سے پہلے بھکر ملز کے مشاعرہ میں سنا۔ اس وقت وہ مزدوروں کی صف کے انسان تھے۔ مجھے مسرت ہوئی کہ مزدوروں سے ایک اچھا شاعر اٹھ رہا ہے۔ اب وہ لاہور میں اخباری دنیا سے منسلک ہو گئے ہیں اور شاعری کے میدان میں نمایاں ہیں ریڈیو کے ادارہ میں بھی ان کی رسائی ہو گئی جس سے سیکڑوں ہزاروں انسان ان کے کلام سے محظوظ ہوتے ہیں۔ آدمی ذہین ہیں اور دنیا کی راہوں سے آئے ہیں اگر اخباری دنیا نے انہیں فرصت دی تو بام شہرت پر پہنچنا ان کے لیے مشکل بات نہیں لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ اخباروں کے ادارے کئی اچھے ادیبوں اور شاعروں کو ہم سے چھین چکے ہیں۔ وہاں پہنچ کر آدمی ادب و شعر کی دنیا سے بہت دور ہو جاتا ہے۔

مظفر وارثی

مظفر وارثی نوجوانوں میں اچھی غزل کہتے ہیں۔ لیکن مشاعروں پر زیادہ قطعات کی تکرار ہوتی ہے۔ یہ جناب صوفی وارثی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور انہیں ورثہ میں شاعری پہنچی ہے۔ پہلے قدیم رنگ میں کہتے تھے۔ اب کچھ دنوں سے جدید کی طرف رخ کر لیا ہے اور تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں جس سے شعر میں اور بھی تیکھا پن آ جاتا ہے اور داد و تحسین کی بھرپور آوازیں ان کا استقبال کرتی ہیں ابھی تک کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا۔

عبدالمجید بھٹی

جناب بھٹی اردو، پنجابی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور شاعری میں بڑی سیدھی سادی اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی بچوں کی شاعری بڑی ہی دلچسپ اور جلد یاد ہو جانے والی ہے۔ جناب بھٹی کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جن میں مجید صاحب اپنی خوبیوں سمیت دیکھے جا سکتے ہیں۔

منیر نیازی

ایک نوجوان اور لا ابالی شاعر ہے اگرچہ ان کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں لیکن بڑے تیکھے شعر کہتے ہیں اور جدید رنگ و روش میں اس قدر گم نہیں ہوئے کہ الفاظ معنی سے الگ ہو جائیں اور معنی مفہوم سے جدا ہو جائے۔ ان کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے اور انعام یافتہ ہے۔ ابھی ان کی عمر میں ترقی کی بڑی گنجائش ہے۔ اگر یہ راستے سے بھٹک نہ گئے تو تذکرہ نگار انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

محمد عبداللہ مضطر

جناب مضطر گجراتی حضرت سیماب کے تلامذہ میں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سیماب صاحب کے شاگردوں میں چند لوگ ہیں جو استاد کا نام زندہ رکھیں گے اور ان میں مضطر صاحب پیش پیش ہیں۔ جناب مضطر غزل سے زیادہ نظم کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ نظم کو غزل سے زیادہ مفید خیال کرتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر نظم اچھی ہو تو غزل سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ نظم میں اصلاحی پہلو زیادہ نمایاں کیا جا سکتا ہے کیونکہ غزل تفصیل کی حامل نہیں ہوتی اور اجمال عوام کے بالعموم پلے نہیں پڑتا۔

مشرف انصاری

جناب مشرف انصاری بڑے تجربہ کار ادیب ہیں اور تصنیف و تالیف کے انسان ہونے کے علاوہ اخلاقی طور پر بھی بہت بلند ہیں۔ انہیں خدا نے شعور انتظام ایسا بخشا ہے کہ بڑی سے بڑی الجھن کو وہ بڑی آسانی سے سلجھا لیتے ہیں۔ مجھے مشرف صاحب سے ملنے کا اتفاق اس دور میں ہوا جب وہ جدید شعرا کا تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ جس کی فہرست کی منزلیں میرے ہاتھوں سے بھی

گزری تھیں اور جس میں شروع شروع میں میں نے بھی کچھ کام کیا تھا- اس وقت تک اس کا نام تجویز نہیں ہوا تھا-

صلاح الدین محشر

جناب محشر سرکاری ملازمت میں ہیں اور ایک اہم عہدہ پر فائز ہیں وہ خاندانی طور پر نواب لوہارو کے سلسلے سے ہیں- فرائض کے باوصف وہ جو کچھ کہتے ہیں- وہ زبان و بیان بہت کم لوگوں کا حصہ ہے ان کے یہاں روزمرہ اور محاورات کا خاص التزام ہوتا ہے- وہ نثر میں بھی اپنے اس وصف کو برقرار رکھتے ہیں میں نے ان کے دوناولوں کا مسودہ دیکھا ہے اور ان میں بھی ان کی زبان کا حسن نمایاں ہے-

ریاض منظر

جناب ریاض منظر احمد پور شرقیہ میں وکیل ہیں جہاں تک شعروادب کا تعلق ہے- وہ نہایت قادرالکلامی سے کہتے اور لکھتے ہیں- اگر چہ ان کی شاعری کے سانچے روایتی ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز بیان اور اسلوب قلم ایک خاص مقام کا مالک ہے- مگر چونکہ مرکز سے دور ہیں اس لیے ان سے زیادہ متعارف نہیں- ان کا ابھی تک کوئی مجموعہ نہیں آیا-

محشر بدایونی

جناب محشر بدایونی ایک زمانہ سے میرے کرم فرما ہیں- ریڈیو کے ادارہ سے وابستہ ہیں مگر انہوں نے اپنی قدیم روش نہیں بدلی- نہایت محتاط اور اصول کے انسان ہیں جہاں تک شعروشاعری کا تعلق ہے وہ کہنہ مشق انسان ہیں اور ان کی پختہ مشقی کہنہ خیالات و تصورات تک نہیں- وہ جدید رنگ کے بڑے پیارے شعر کہتے ہیں- ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا گداز ہے- جو عموماً زمانے کے پامال اور دکھی لوگوں میں ہوتا ہے ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی- وہ اپنے شعر میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جن میں حد درجہ موسیقیت ہوتی ہے- اور اس طرح وہ شعر شعر نہیں رہتا بلکہ افسوں ہو جاتا ہے جو دل سے دل تک مار کرتا ہے-

مسعود اشعر

مسعود اشعر صاحب کے کچھ مضامین میری نظر سے گزرے ہیں وہ ایک اچھے صحافی بھی ہیں اور ایک اچھے ادیب بھی۔ ان میں لکھنے کا سلیقہ ہے اور بات جس طرح ہونی چاہئے اسی طرح کہتے ہیں وہ موقع محل کی نزاکت اور وقت کے تقاضے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن جس جگہ کے وہ مستحق ہیں انہیں ابھی وہ نہیں ملی مستقبل میں اگر اقربا نوازی کو نظر انداز کر دیا گیا دوست نوازی کی رسم اٹھ گئی تو وہ ایک نہ ایک دن کسی اچھے مقام کو ضرور چھو لیں گے۔

مجید لشاری

میرے مزنگ کے قیام میں کچھ شاعر اور ادیب اکٹھے ہو گئے تھے اور جناب مجید لشاری کے مکان پر ہر ہفتہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ مجید لشاری مزنگ کے روساء میں شمار ہوتے تھے۔ غزل کے علاوہ وہ کبھی کبھی افسانہ بھی سناتے تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں کا مجموعہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ وہ بڑے خوش فکر اور یار باش قسم کے انسان ہیں۔

ماچس لکھنوی

جناب ماچس لکھنوی شاعری میں خاص لکھنؤ کی زبان استعمال کرتے ہیں اور نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایسا مزاح تخلیق کرتے ہیں کہ مشاعرہ کشت زعفران ہو جاتا ہے۔ جناب ماچس کہیں کہیں سیاست' ادب اور تہذیب پر بھی طنز کرتے ہیں اور وہ دیکھا جائے تو ایک طرح کی ایسی تنقید ہے جو قانونی زد میں نہیں آ سکتی مگر اصلاح قوم ضرور ہے۔

صفدر میر

جناب صفدر میر اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر ان کی خاصی نظر ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مدت تک انگریزی پڑھاتے رہے۔ ان کی انگریزی ادب پر قابل رشک نظر ہے دوران جنگ انہوں نے اپنے نغموں سے فضاؤں کو بھرپور رکھا اور اس ملکی خدمت سے غافل نہیں رہے وہ جدید ادب کے علمبردار ہیں اور عموماً ردیف و قافیہ سے بے

نیاز معرا شاعری کرتے ہیں- ان کے عزائم ان کی ذات کی سواری میں رہتے ہیں اور یہ جذبات کو منہ زور نہیں ہونے دیتے- ان کے ادب میں فکر سے زیادہ عمل کی تلقین ہے اور جب عمل کی تلقین نہیں کرتے تو جذباتی ہو جاتے ہیں-

مظفر علی سید

جناب مظفر علی سید نے فطری طور پر بڑا اچھا ذوق ادب پایا ہے- یہ لکیر کے فقیر نہیں ان میں ایک تخلیقی قوت ہے جو جدید راہ گیری پر مجبور کرتی ہے- جناب مظفر علی سید سے میں ویسے تو نزدیک نہیں لیکن میں ان کی تخلیقات سے بھی غافل نہیں- وہ نہایت اچھے اور سلیقہ مند ادیب ہیں- ان کے مضامین ان کی وسعت نظر اور کاہش جگر کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان میں نئی پود کی ضیافت نظر کے لیے سامان کی کمی نہیں ہوتی-

مصطفیٰ زیدی

جناب مصطفیٰ زیدی صاحب وہی نوجوان ہیں جنہوں نے خود کو کبھی تیغ الہ آبادی کے نام سے عالم آشنا کیا تھا اب وہ سی ایس پی افسر ہیں اور خود کو مصطفیٰ زیدی لکھتے ہیں-

ان کی پہلی شاعری بھی اگرچہ عوام کی روش سے بالکل الگ تھلک تھی لیکن ان کے صحیح جوہر اب بے نقاب ہو رہے ہیں انہوں نے یورپ سے واپس آ کر ایک ایسے اسلوب شعر کو اپنا لیا ہے جو ریڈیو پر گانے والوں اور قوالوں کے نرغے میں مشکل سے آئے گا- لیکن ہر پڑھا لکھا آدمی اس کے لطف سے محروم نہیں رہتا اور ہونا بھی یہی چاہیے نااہلوں میں شعر کی تعریف بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ریشم اور بادلے کے تھان میلے اور پھٹے ہوئے پیروں سے کھندل رہا ہو-

مصطفیٰ زیدی صاحب کے یہاں احساس کے دامنوں سے ٹپکے ہوئے آنسو بھی ہیں اور خیرہ کر دینے والی چکا چوند بھی- وہ جہاں شعر میں آنسوؤں کو زبان دینے اور شعلوں کو کلیوں میں منتقل کرنے کا عمل کرتے ہیں- اس وقت وہ اپنے اسلوب بیان کے راستے پر معلوم ہوتے ہیں- ان کے یہاں احساس و عمل کا اس قدر حسین امتزاج ہے کہ پڑھنے والا عش عش کرنے لگتا ہے-

وہ عصر جدید کے شاعر ہیں اور جدید رنگ اختیار کرتے ہیں- ان کے یہاں کہیں کہیں ابہام بھی

ہے مگر حسین ابہام جو دوسروں کے ذہن میں بتدریج صاف چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کے یہاں مشرق و مغرب کے خیالات و تصورات کا اور بعض وقت ایمائیت اور اشاریت کا ایسا ملا جلا آبشار ملتا ہے کہ بڑی بڑی تشنگیاں سیراب ہو جاتی ہیں کئی شاعر مصطفیٰ زیدی کے طرز نگارش پر چلتے ہیں اور ان کے بھی بلاشبہ حسین شعر ملتے ہیں۔ لیکن مصطفیٰ صاحب کے یہاں شاعری میں جو آب و آتش کی الگ الگ دھاریاں چمکنے کے باوجود ایک جسم معلوم ہوتی ہیں وہ دوسرے شعراء کے یہاں نہیں اور اس میں جہاں ان کی زبان کا فسوں کام کرتا ہے وہیں ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کی گہرائی کے علاوہ ان کا اظہار خیال اور طرز ادا بھی جان لیوا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے مثلاً موج مری صدف صدف ''شہر آذر'' اور گریبان وغیرہ ان کی شاعری کے شاہد اور میرے خیال کے موئد ملیں گے۔

مختار صدیقی

مختار الحق مختار صدیقی صاحب کا آبائی وطن سیالکوٹ ہے لیکن پھر ان کے والد مستقل طور پر گوجرانوالہ آ گئے تھے اور مختار صاحب کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ کالج سے نکل کر چند روز تلاش معاش میں پریشان رہے اور بعد میں ریڈیو پاکستان کے ادارے سے منسلک ہو گئے اور ابھی تک اسی میں ہیں۔

شاعری میں انہیں مولانا سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ ہے اور شروع شروع میں وہ اسی قدیم روش پر چلے لیکن بعد میں ان کے ذہن نے رہنمائی کی اور ادب برائے زندگی کے اصولوں پر چلنے لگے اور ان کی شاعری بھی ان کے مافی الضمیر کی ترجمان ہوتی چلی گئی اور اب اپنی شاعری میں اسلوب کے اعتبار سے نمائندہ شاعر ہیں۔

اب وہ اپنے جذبات و احساسات کو عام لوگوں کی طرح بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں ایسا نرالہ اسلوب ہے کہ جو قدامت سے الگ اور موجودہ دور کے اسالیب بیان سے بالکل جدا' بامعنی اور اظہار پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ اس میں موسیقی ڈگمگا جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں بعض اوقات ایک گمبھیر قلم کا ابہام بھی پایا جاتا ہے۔ مگر وہ ان اشعار میں ہے جہاں وہ ذرے میں کائنات اور قطرے میں سمندر انڈیل دینا چاہتے ہیں اور اچھے شاعروں کے یہاں جب ہجوم فکر ہوتا ہے تو

انہیں یہی مرحلہ پیش آتا ہے۔

ممکن ہے مختار صدیقی نے ابتدا میں مولانا سیماب کے رنگ میں کہا ہو لیکن عموماً ان کی غزلیں میر تقی میر اور فانی کی غم انگیز لے کی نرمی اور دلکشی سے مل جاتی ہیں اور اگرچہ ریڈیو کی ملازمت نے انہیں گیتوں کے انداز میں الاپنا بھی بتایا ہے لیکن پہلے بھی ان کے یہاں اکثر اوقات اردو کے بہت قدیم حسین اور ہندی کے بڑے میٹھے اور نرم الفاظ استعمال ہوئے ہیں مگر کہیں ان کا قدم اعتدال سے باہر نہیں پڑتا۔ ان کا مجموعہ کلام ''منزل شب'' چھپ چکا ہے اور جانے ابھی کتنے نشتر انہوں نے چھپا رکھے ہیں۔

ہاں میں اس کا اظہار بھول گیا تھا کہ پہلے پہل ایک طویل عرصہ مختار صدیقی دور حاضر کے اس گروہ کے ساتھ رہے جو قدامت کی دیواروں کے سائے میں چلنا بھی جرم خیال کرتا ہے۔ اور جن کے یہاں بڑی بڑی اخلاقی قدروں کا احترام روا نہیں ہوتا۔ لیکن جب یہ راولپنڈی میں تھے تو کسی خدا کے بندے نے روبرو کر دیا۔ اب وہ خیر و شر میں تمیز کے قائل ہیں اور گناہ ثواب کا امتیاز شدومد سے کرتے ہیں ان کے یہاں کتاب و سنت کی توہین سب سے بڑا جرم ہے اور پیغمبر ﷺ کے وہ شیدائی ہیں۔

ایوب محسن

جناب ایوب محسن نوجوان شاعر ہیں وہ ایک اچھے ادیب ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی ان خصوصیات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ٹرانسپورٹ کے رسالہ ''راہ منزل'' کو دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ اس سے ان کے اس کمال کا بخوبی پتہ چلتا ہے وہ نہایت خوشگوار شاعر ہیں اور قدیم رنگ سے دامن بچا کر جدید رنگ میں قدیم دروبست کے ساتھ چلتے ہیں جس سے ان کے کلام میں مقصدیت آ جاتی ہے۔ ورنہ عموماً جدید رنگ کے ایسا شعراء عموماً بے مقصدی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایوب محسن صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور شعر جیسا فن سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانے سے باعزت رہ سکتا ہے۔

پروفیسر میاں محمد شریف

پروفیسر میاں محمد شریف صاحب مرحوم کی تمام زندگی تعلیمی ماحول میں گزری وہ پہلے علی گڑھ میں استاد رہے اور پھر لاہور میں پرنسپل ہو گئے پھر غالباً پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے- ریٹائر ہوکر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں مہتمم اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور وہیں سے راہی عدم ہو گئے- میاں محمد شریف مرحوم بڑی ہی سوجھ بوجھ اور فکر وفہم کے آدمی تھے ثقافت اسلامیہ کے ادارہ میں ان کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی-شریف صاحب کی کتاب جمالیات کے موضوع پر ادارہ ثقافت سے شائع ہوئی ہے-جس میں وہ اپنی تمام قابلیتوں سمیت ہمارے سامنے آئے ہیں اسلامی فلسفہ پر ان کی کتاب حرف آخر تک پہنچتی ہے-

بشنو پرشاد منور

جناب منور بڑے پختہ مشق اور کہنہ مزاولت کے انسان ہیں-نظم اور غزل دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں خوش اخلاق اور خوش ذوق ہونے کے علاوہ ان کی یار باشی قابل ذکر ہے-وہ ہیں تو لکھنوی مگر انہیں دہلی کی ٹکسال پر بھی عبور ہے-اس لیے ان کی شاعری میں زبان بڑی سلجھی ہوئی اور صاف ملتی ہے اور یہ شاعری کا سب سے بڑا حسن ہے کہ پر معنی اور طویل بات کے لیے الفاظ سادہ اور سلیس ہوں-میری نظر سے ان کا وہ ترجمہ ''نسیم عرفاں'' گزرا ہے-جو انہوں نے بھگوت گیتا کو منظوم کیا ہے-اس سے ان کی مہارت اور الفاظ کے انتخاب کا اندازہ ہوتا ہے-اس کے علاوہ کمار سنبھو اور دھمپد بھی ان کے مشہور شاہکار ترجمے ہیں-

زین العابدین محشر لدھیانوی

جناب محشر شملے میں میرے دوست بنے وہ قالین کی تجارت کرتے تھے اور نہایت اچھا شعر کہتے تھے-تقسیم کے بعد ان کے حالات کچھ سازگار نہ رہے پھر وہ مختلف اخبارات میں مضامین لکھتے اور کئی پبلشروں کے یہاں معاوضہ پر مضامین لکھتے رہے-یکا یک منہ میں کینسر (آکلہ) ہوا اور علاج کراتے کراتے راہی عدم ہو گئے ان کے صاحبزادے کے پاس ان کا کلام ضرور محفوظ ہوگا-

محمد ذکریا مائل

جناب ذکریا مائل ادارہ ترقی اردو بورڈ کراچی میں کام کر رہے ہیں۔ شاعر بھی خوب ہیں اور ادیب تو بڑے پایہ کے ہیں۔ انہیں نظم میں جو مہارت ہے وہ غزل میں ہی نہیں قطعات اور رباعیات پر بھی عبور ہے لیکن نظم ان کی قابل تعریف ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں وہ احادیث کو منظوم کر رہے تھے۔ نہ جانے کہاں تک پہنچے ہوں گے یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو اچھا کام ہوگا باقی ان کی دیگر تصانیف بھی معمولی نہیں ہیں۔

مجیب خیر آبادی

جناب مجیب خیر آبادی پہلے لاہور میں تھے مگر انہیں لاہور راس نہ آیا کیونکہ یہاں باہر کے لوگوں کے لیے کم گنجائش نکلتی ہے۔ مجبور ہو کر کراچی چلے گئے اور وہاں پی آئی اے میں ملازم ہیں اردو، فارسی اور انگریزی بقدر ضرورت جانتے ہیں شاعری میں اپنے معاصرین سے کم نہیں۔ ان کے شعر میں رنگینی بھی ہوتی ہے اور رس بھی اور پھر انکا ترنم اور بھی شعر میں پر لگا دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ مشاعروں سے کامران و کامیاب لوٹتے ہیں یار باش قسم کے آدمی ہیں جنہیں کل کی فکر نہیں ہوتی۔

منظر صدیقی

جناب منظر صدیقی حضرت سیماب کے صاحبزادے ہیں وہ افسانہ، ناول، غزل اور نظم وغیرہ سب کچھ لکھتے ہیں اور کیوں نہ ہو جس گھر میں انہوں نے پرورش پائی ہے اس میں ان کا ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں علامہ سیماب بھی تو ادب و شعر کے ہر شعبہ پر حاوی تھے۔ جناب منظر کراچی میں ہیں اور علمی ادبی مزدوری پر بسر اوقات کر رہے ہیں۔ ان کی صحت بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی اور پھر اس میں گزارے کی فکر اور بھی جان لیوا ہے۔ حکومت سے وظیفہ بھی ملتا ہے۔ مگر وہ ان کی کفالت نہیں کرتا۔

محمود دہلوی

جناب محمود دہلوی مرحوم بڑے مفکر المزاج انسان اور نہایت اچھا شعر کہنے والے شاعر تھے ان کے یہاں اشعار میں وہی سوز و گداز ہے جو ان کی زندگی کا سرمایا تھا۔ وہ کردار کے اعتبار سے سیکڑوں شرفاء سے اچھے اور نجیب الطرفینی کا دعویٰ کرنے والوں سے زیادہ اصیل آدمی تھے۔ خلوص و محبت میں ان کا جواب نہیں تھا۔ ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے اور اس میں ان کا معیار کلام خود اپنا مقام بتاتا ہے۔

محمد عبداللہ منتظر

جناب عبداللہ منتظر گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور نہایت شریف خاندان کے فرد ہیں۔ میں انہیں ان کے زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں وہ اسی دور سے شعر و شاعری کے شائق تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ لیکن کالج سے نکل کر وہ ایک زمانے تک تو سرکاری نوکری میں رہے اور پھر نوکری ترک کر کے ٹھیکیداری کرنے لگے اب ماشاءاللہ وہ ایک آئل ملز کے مالک ہیں لیکن معلوم نہ ہوسکا کہ شعر و ادب نے کب تک ان کا ساتھ دیا اور پہلا ذخیرہ جو ان کے پاس تھا وہ کہاں ہے۔

محسن اعظم گڑھی

پرانے اور پختہ مشق لوگوں میں ہیں اب کراچی میں بہت سے شاگردوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور آئے دن ان کے تلامذہ کہیں کہیں مشاعرے میں انہیں ضرور لے آتے ہیں۔ ان کی کتاب ''آئینہ جمال'' جس میں مرثیے اور سلام ہیں شائع ہو چکی ہے۔ جس میں وہ اپنے تمام اوصاف و محاسن سمیت جلوہ گر ہیں۔ ان میں فنی نقائص اور ابتذال کا پتہ نہیں لگتا۔ کیونکہ ان میں شعر کے معائب و محاسن پر عبور ہے اور نہایت سجا بنا کر شعر کہتے ہیں۔

محمود سرحدی

جناب محمود سرحدی طنز گو ہیں اور ان کے طنز و مزاح میں ایک چونکا دینے والا خیال یا تصور ہوتا ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کی طرح معاشرہ پر طنز کرتے ہیں اور اس طرح ان کا کلام مشاعروں میں پھل

جاتا ہے-میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں-ان کے پرخلوص انسان ہونے میں کسی رخ سے بھی شک کی گنجائش نہیں ان کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا-مختلف اخبارات اور رسائل میں اپنے قلمی نقوش چھوڑ رہے ہیں-

مجاز دہلوی

جناب مجاز دہلوی کراچی میں نیشنل بنک سے متعلق ہیں اور ایک زمانے سے شعر کہتے ہیں- ترنم سے پڑھتے ہیں اور شاعروں میں انہوں نے بڑے بڑے میدان مارے ہیں وہ جس توجہ سے شعر کہتے ہیں-اسی قوت سے شعر پڑھتے ہیں-ان کی آواز میں میں ان کا جذبہ اور الفاظ میں دماغ کی کاوش صاف نظر آتی ہے-وہ شعر کی پرانی ڈگر پر چلتے ہیں مگر خیالات پرانے نہیں ہوتے-انہوں نے جدید طرز شعر کو نہیں اپنایا جو ردیف قافیہ اور اوزان و بحور سے مبرا ہے-بحیثیت انسان بھی مجاز قابل قدر ہیں-ان میں موجودہ زمانے کی ریاکاری اور خودغرضی نظر نہیں آتی-

مشتاق مبارک

مشتاق مبارک جناب حبیب جالب کے بھائی ہیں اور گورنمنٹ کے کسی ادارہ سے متعلق ہیں- مگر وہ جالب کے ہم خیال و ہم شعار نہیں- وہ شاعر ہیں اور اپنی شاعری کو سیاسی داغ سے پاک رکھتے ہیں وہ غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں لیکن ان کے یہاں شاعری کے حدود مقرر ہیں- اور وہ اخلاقیات کی حدود کو عبور نہیں کرتے بلکہ بڑے قاعدے کی شاعری کرتے ہیں-جس میں انسانی اقدار اور تمدن و معاشرت کی بہبود کے لیے تبلیغ و تدریس مضمر ہوتی ہے-

مسرور کپورتھلوی

میں نے جناب رنجور کپورتھلوی کی کتاب ''نوائے رنجود'' پڑھی تھی وہ اپنے دور کے جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے شاعر تھے-جناب مسرور انہیں کے صاحبزادے ہیں تقسیم ملک کے ہنگام میں کپورتھلہ سے پاکستان آ گئے تھے-جب میں نے انہیں دیکھا-اس وقت وہ بڑے کروفر سے بانکوں کی طرح زندگی گزارتے تھے-یہاں آ کر وہ گجرات کے ایک کالج میں کمپوڈر یا کلرک کی خدمت

انجام دینے لگے غربت میں اس قدر مصائب و آلام کا سامنا ہوا کہ موجودہ ذریعہ معاش پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ وہ جن کے دوست تھے آخر وقت تک ان کے دوست رہے اور جن سے مخالفت تھی انہیں بھی عزیز گردانتے لگے تھے۔ اچھا منجھا ہوا شعر کہتے تھے اور اب تو ان کے اشعار میں ان کا نغمہ آہوں میں بدل گیا تھا۔ جس نے اور بھی تاثیر پیدا کر دی تھی۔ وہ آج کل کی سوسائیٹیوں سے بھاگتے تھے۔ کیونکہ قدیم ریاستی تہذیب میں زندگی گزارنے کے بعد لاہور یا راولپنڈی جیسی ترقی یافتہ مخلوق میں مسرور کا مسرور رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ آخر ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو راہی عدم ہو گئے۔ ان کا کوئی مجموعہ نہیں لیکن ان کے صاحبزادے جمشید مسرور اب مرتب کر رہے ہیں۔

مضطر اکبر آبادی

مضطر صاحب آگرہ سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے اور لاہور میں بھیڑ دیکھ کر راولپنڈی چلے گئے۔ ایک مدت سے راولپنڈی ہی کی فضا کو مسرور کر رہے ہیں۔ مضطر صاحب کے یہاں الفاظ کا برمحل استعمال اور سیدھے سادے انداز میں مافی الضمیر کو بیان کر دینا ان کی قدرت کلام کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ذوق سے نوخیز شعراء کی آبیاری بھی ہوتی ہے اور ان کی غیر معمولی مشق سخن بھی عام ہو رہی ہے۔ میں نے انہیں جس قدر سنا ہے ان کے کلام میں اسقام نظر نہیں آئے اور دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں اور جب سے یہ ریڈیو کے احاطے میں گئے ہیں اس قوت سے ان کا رنگ کلام اور بھی نکھر گیا ہے۔

مہدی دیوبندی

دیوبند کے رہنے والے ہیں اور ہندوستان کے مشہور شعراء کی فہرست میں آتے ہیں۔ شاعری میں ان کا شعر بیدار اور احساس زندہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ جس بات کو لکھتے ہیں، اس کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو تشنہ نہیں رہتے ان کا طریق فکر اور اسلوب نگارش بہت ہی خوب ہے۔ اگر زمانہ ساز گار رہا تو نہایت اچھے شاعر اور بلند پایہ ادیب نکلیں گے۔

محمد رمضان رسا بریلوی

جناب رسا بریلوی کبھی تو بریلی کے رہنے والے تھے مگر اب تو ایک مدت سے وہ بھکر میں مقیم ہیں اور ان کے قدردان میاں عزیز ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ جناب رسا بھی ان لوگوں میں ہیں جنہیں زمانہ نے نہیں پہچانا اور فکر معاش میں پریشان رہنے کے باعث اہل ادب کی نگاہوں سے چھپے رہے ہیں۔ جناب رسا کو ایک مدت سے جانتا ہوں اس زمانے سے جب یہ اور ان کی شاعری دونوں جوان تھی نہ جانے ان کے پاس وہ غزلیں، نظمیں ہوں گی یا نہیں اس وقت بھی جناب رسا بہت کم آمیز تھے اور اس کا سبب ان کی عدیم الفرصتی تھی۔ ان کا ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

محضر لکھنوی

جناب محضر لکھنوی منظر لکھنوی کے بھائی ہیں اور بڑی بجی سنوری غزل کہتے ہیں میں نے انہیں مشاعروں میں سنا ہے اور جہاں تک سنا ہے وہ خوب کہتے ہیں اور ان کے اشعار پر داد و تحسین ملتی ہے۔ لکھنؤ کے خاص رنگ میں عوامی روش سے بچ کر کہتے ہیں اور اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مجموعہ کلام کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ چھپا ہے یا نہیں۔

منظر لکھنوی

جناب منظر کو میں نے صرف مشاعروں میں سنا ہے مشاعرہ سے علاوہ ان کی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں ملا۔ مشاعروں میں انہوں نے جس قدر غزلیں پڑھی ہیں وہ ان کے خاص رنگ میں ایسی تھیں کہ داد و تحسین سے نوازی جاتی تھیں۔۔ فنی لحاظ سے بھی ان میں کہیں نشیب یا جھول نظر نہیں آتا تھا۔ ممکن ہے ان کا کوئی کلام بھی چھپا ہو جس کے متعلق ہنوز مجھے کوئی علم نہیں۔

ممتاز جالندھری

جناب ممتاز جالندھری خوب شعر کہتے ہیں۔ شاعری کے میدان میں مجھ سے پہلے کے ہیں اور سنبھل کے شعر کہتے ہیں کم گو اور گوشہ نشینی کے آدمی تھے۔ نہ جانے تقسیم ملک کی غربت نے کیا سلوک کیا ہو عرصہ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

محمود علی خاں مخمور

ان کا وطن تو رہتک ہے لیکن آج کل ساہیوال میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ نظم اور غزل کہتے ہیں۔ لیکن غزل سے زیادہ ان کا رجحان طبع نظم کی طرف ہے۔ محنتی نوجوان ہیں اگر مطالعہ جاری رہا ان کے لیے ترقی کے آثار خاموش نہیں۔

دیوان امرناتھ محسن

محسن صاحب امرتسر کے پرانے اور کہنہ مشق شاعروں میں تھے بزم سروش میں انہیں ایک مقام حاصل تھا اس بزم کی طرف سے محسن صاحب کا ایک مختصر سا مجموعہ کلام بھی چھپا تھا جس میں محسن صاحب کی کچھ غزلیں تھیں۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہ چل سکا کہ تقسیم کے بعد کیا ہوا اور بزم سروش کے کون کون ممبر کہاں کہاں گئے۔

مجروح سلطان پوری

میں جب مجروح سلطان پوری سے ملا ہوں اس وقت وہ کسی طبیب کے پاس طب پڑھ رہے تھے۔ لیکن پھر حضرت جگر مراد آبادی کی معیت میں رہ کر مشاعرہ میں ملاقاتیں رہیں۔ نہایت شریف اور مسلمان قسم کے انسان ثابت ہوئے۔ شاید یہ حضرت جگر کا فیض صحبت تھا۔ ان کے دو نغموں نے ''کیا کہیے مجھے کیا یاد کیا'' اور گائے جا پئے گائے جا'' شاعروں میں بڑا مقبول کیا اور یہی مقبولیت انہیں بمبئی لے گئی۔ شرمیلے اور زود آمیز قسم کے انسان تھے مگر بمبئی میں جا کر ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو گئے۔ لیکن وہ رعائیت اور ہیئت کے تجربات سے دور رہے' غزل میں ایک رچاؤ پایا' جو ہر شاعر کا حصہ نہیں ہوتا اور وہ ایک ایسا عطیہ فطرت ہے جو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھے گا۔ فلمی دنیا میں یہ نہایت کامیاب انسان ہیں مگر خدا جانے ادبی تاریخ میں انہیں کوئی اچھا مقام ملتا ہے یا نہیں۔ حالانکہ ان کے یہاں علامتی شاعری ہے جو اس دور کا طرہ امتیاز ہے اور اس میں یہ کسی سے کم نہیں!

خواجہ محمد شفیع دہلوی

خواجہ صاحب دہلی کے ایک علمی خاندان کے فرد ہیں۔ان کے والد خواجہ عبدالمجید صاحب دہلی کے فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔خواجہ محمد شفیع صاحب نے کئی ایک کتابیں بھی لکھی ہیں جو کسی نہ کسی رخ سے مفید ضرور ہیں اس کے علاوہ اردو کی توسیع واشاعت کے سلسلے میں خواجہ صاحب تقسیم ملک سے پہلے بھی پیش درپیش تھے اور دہلی کی طرح آج بھی ان کے یہاں فرشی نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔جن میں شعراء کے علاوہ معززین اور حکام بھی آتے ہیں اور یہ نشستیں جہاں خواجہ صاحب کے لیے منفعت ہیں وہاں اردو زبان کے لیے بھی کارآمد ہیں۔خواجہ محمد شفیع صاحب دہلی کے روزمرہ اور محاورات پر خاصی نظر رکھتے ہیں۔اوران کے استعمال کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے۔

راجہ مہدی علی خان

جناب راجہ مہدی علی خان نے لاہور میں پرورش پائی اور یہیں تعلیم کے مراحل سے گزرے لیکن قسمت دیکھیے کہ بمبئی میں جاکر پیوند خاک ہوئے اور مولانا ظفر علی خاں کے اعزاء میں سے تھے لیکن ان کا مزاج خاندان بھر سے جدا تھا۔اس میں شک نہیں کہ فن لطیف ورثہ میں ملتا ہے لیکن وراثت کو سنبھالنا بھی تو کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔راجہ مہدی علی خان نے مزاحیہ رنگ میں جو نقوش چھوڑے ہیں ان سے مزاح نگاری میں بہت سی سمتیں متعین ہوسکتی ہیں اور ہوں گی۔وہ مثالی قسم کے ادیب اور سرتاپا صاحب خلوص تھے۔

محوی جے پوری

جناب محوی جے پور کے رہنے والے ہیں اور ریلوے میں ملازمت کرتے ہیں۔نہایت سادہ اور نیک انسان ہیں۔اکثر غزلیں کہتے ہیں اور وہ معمولی درجے کی نہیں ہوتیں۔وہ زود گو بھی ہیں اور نغز گو بھی۔مشاعروں میں بڑے انہماک سے غزل پڑھتے ہیں۔مگر ابھی مجموعہ کلام زیور طبع کو نہیں پہنچا۔

محمد علی بخاری

محمد علی بخاری ملتان کے معزز خاندان کے فرد ہیں- کچھ دنوں ملتان ہی میں لیکچرر بھی رہے ہیں- لیکن زیادہ دنوں ملازمت کی پابندی نہیں جھیل سکے- گھر کے زمیندار ہیں اس لیے انہیں ملازمت وغیرہ کی ایسی کوئی پروانہیں اور پھر وہ شاعر بھی ہیں، شاعر بھی اچھے اور بیدار احساس- بخاری صاحب غزل اور نظم دونوں میں عجیب عجیب پہلو اجاگر کرتے ہیں- میں نے ان کی جتنی غزلیں اور نظمیں سنی ہیں- وہ معیاری ہی نہیں بلکہ اس دور کے سیکڑوں شاعروں سے بلند ہیں- ان کے یہاں اردو غزلوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش اور نظموں میں ہندی روایات وتلمیحات کا استعمال بڑے سلیقہ سے ہوتا ہے-- جس سے ان کی شاعری میں ضرورت سے زیادہ شیرینی آجاتی ہے اور سننے والے مسحور ہوجاتے ہیں- اب تک کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا-

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش

میں جب جامعہ عثمانیہ کے مشاعرہ میں شریک ہوا تو جہاں محی الدین زور اور عبدالقادر سروری صاحب سے ملاقات ہوئی- وہیں نوجوانوں میں حمید الدین شاہد اور صاحبزادہ میکش سے بھی ملا وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے- ان کی شاعری میں ان کی عمر کے لحاظ سے پختگی نہ ہونی چاہئے تھی لیکن ان کے یہاں بڑی ماہرانہ پختگی تھی اور شاید یہ اس لیے تھی کہ وہ دنیا میں زیادہ روز کے لیے نہیں آئے تھے- چنانچہ عین شباب میں اللہ کو پیارے ہوئے- ان کی نظموں کا مجموعہ ''گریہ وتبسم'' کے نام سے چھپ چکا ہے- جسے ''تبسم وگریہ'' ہونا چاہئے تھا تاکہ زندگی کی ترتیب درست ہوجاتی-

صادق مصور

مصور صاحب میرے پرانے دوستوں میں ہیں- ان کی کتاب ''شب چراغاں'' چھپ چکی ہے- جو ان کے کلام کا مجموعہ ہے- صادق مصور صاحب تخیلات وتصورات کو الفاظ میں لاکر تصویر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں- شب چراغاں میں کئی جگہ ان کی یہ کامیاب پینٹنگ بڑی جان لیوا ہوگئی ہے- وہ نہایت نرم گو اور ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں دوستی کے اعتبار سے بھی وہ بڑے آدمی

نہیں بلکہ سیکڑوں سے اچھے ہیں۔

قریش علی صاحب نثار پانی پتی

جناب نثار پانی پتی خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کے عزیزوں میں ہیں ظاہر ہے کہ شعر کا ذوق ان کا ورثہ ہے۔ یہ نائب تحصیلدار ہیں جہاں سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی مگر چونکہ فطری ذوق ہے اس لیے شعر بھی کہتے ہیں۔ میں نے جب بھی انہیں مشاعرے میں سنا ہے مجھے ان کی غزل میں حالی کی بو آئی ہے۔ یہ واقعیت ہے یا میری عقیدت اس کے متعلق میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تاہم حاضرین مشاعرہ میرے اس احساس کو اور بھی پختہ کر دیتے ہیں۔ ابھی تک ان کا کوئی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔

مکرم علی خاں

جناب مکرم کی زندگی پولیس کی کرسی پر گزری ہے۔ اور اسی شدت کے ساتھ اب اللہ کی طرف رجوع ہیں۔ خدا کرے ان کا دامن ان کی دنیا کے سایوں کو خوشنما بنا دے ان کی کوتوالی کے زمانے میں ان سے میں نے کبھی شعر نہیں سنا کیونکہ اس وقت وہ عوام کے آدمی ہی نہیں تھے۔ اب جبکہ وہ پنشنر ہو گئے ہیں۔ تو ان کے شاعرانہ جوہر کھلے کہ ایک تھانہ کا انسان بھی ایسا لطیف خیال اور شاعر مزاج ہو سکتا ہے وہ بہت اچھا اور نپا تلا انداز رکھتے ہیں اور شعر کے محاسن پر ان کی خاصی نظر ہے۔

دینا ناتھ مست

جناب مست ایک معزز کشمیری پنڈت ہیں تقسیم ملک سے پہلے عموماً ان سے سری نگر، لاہور اور دہلی کے مشاعروں میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ نہایت ستھرا اور صاف شعر کہتے ہیں اور غزل میں ایسا ایسا شعر کہہ جاتے ہیں کہ منہ سے بے اختیار داد و تحسین نکلتی ہے اور غالباً یہ حضرت برجموہن دتاتریہ کیفی کا فیض ہے کہ ان کے یہاں غیر شاعرانہ بات کبھی نہیں ہوتی۔

مظفر احسانی

جناب مظفر احسانی پرانے صحافی ہیں جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ وہ طنز و مزاح میں کہتے ہیں اور ان کا ایک خاص رنگ ہے۔ جس میں وہ معاشرہ اور نظام کے سیاسی نشیبوں پر روشنی ڈالتے ہیں علاوہ ازیں وہ ایک اچھے صحافی بھی ہیں اور لاہور میں ایک عرصہ تک مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ اب کئی برس سے وہ سرگودھا سے کبھی کبھی لاہور آتے ہیں۔ نہ جانے اب ان کی شاعری کس رنگ میں جا رہی ہے۔ دنیاوی الجھنوں اور مقامی سیاست نے انہیں لاہور سے چھین لیا ہے۔

میکش چاندپوری

جناب میکش لاہور چھاونی میں انگریزی دواؤں کی دکان کرتے ہیں اور چھاونی میں ان کے دم سے اردو کی ترویج و اشاعت شباب پر ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں برابر کی رفتار ہے اور دو تین رسالے بھی نکلتے ہیں۔ شاعری میں قدیم روش کے دلدادہ ہیں مگر جدید روش پر نہیں آتے۔ شاید ان کی مصروفیت مانع ہے ذوق سے زیادہ ان کی محنت کو شاعری میں بڑا دخل ہے اور مشق بڑھتی بھی اسی طرح ہے۔

مقبول جہانگیر

یہ ایک ہونہار نوجوان ہے۔ میں اس سے اس قدر نزدیک تو نہیں کہ اس کے محاسن اور عیوب پر تبصرہ کر سکوں لیکن اس کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص میں ترقی کے منہ زور جراثیم ہیں اور ایک دن یہ نوجوان کوئی بلند مقام حاصل کرے گا۔ اس کے قلم میں ایک ایسی پھیلتی ہوئی خوبی ہے جو اکتساب سے تخلیق کی طرف نشست لگائے ہوئے چل رہی ہے۔ نہ جانے اسے کب اس کا فن ترجمہ تخلیق کے احاطے میں لے آئے۔

مختار مسعود

جناب مختار مسعود نوجوان اور مہذب کے علاوہ انتظامیہ کے اعلیٰ کارکن ہیں- وہ حالانکہ پنجاب کے ہیں لیکن اردو ایسی نفیس بولتے اور لکھتے ہیں کہ زیرک آدمی بھی نہیں پہچان سکتا اور صرف ان کا تلفظ ہی درست نہیں لہجہ بھی ایسا ہے کہ اس کے دیدبان سے مغلیہ دور کے محلاتی لہجے دکھائی دیتے ہیں- وہ علم وادب کا نہایت نکھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں اور غالباً یہ علی گڑھ کی دین ہے- وہ نظم اور نثر دونوں میں برابر کا شعور رکھتے ہیں وہ ایک کتاب ''فن خطاطی'' عرصہ سے مرتب کر رہے ہیں- ہمیں امید ہے کہ وہ اردو کتاب میں ایک اضافہ ہوگا ان کا خط کوئی خاص اچھا نہیں ہے- کیونکہ بالعموم بڑے لوگ زیادہ پڑھتے ہیں اور چھوٹے لوگ زیادہ لکھتے ہیں-

مسرت حسین زبیری

یوں تو زبیری صاحب بڑے آفیسر ہیں مگر کمال یہ ہے کہ مصروف کار کے باوجود ان کا ذوق ادب ابھی زندہ و پائندہ ہے- بہاولپور میں اردو اکیڈمی کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی تھی اور اب وہاں خوب کام ہو رہا ہے- چنانچہ جہاں بھی وہ جاتے ہیں ارباب ادب پیدا کر لیتے ہیں اور ان میں زبان وادب کا جنون پیدا کر دیتے ہیں- اردو زبان کو ایسے حکام کی ضرورت ہے ایسے ہی لوگ ہیں جو تاریخ کے صفحات میں اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں اور یہ ایک فطری ذوق ہوتا ہے-

ممتاز حسن

جناب ممتاز حسن کو میں ایک زمانے سے جانتا ہوں وہ حکومت کے بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے ہیں- پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے وہ علم وادب کے میدان سے فاصلے پر تھے- لیکن ملک بنتے ہی وہ اردو کی خدمت میں ایسے منہمک ہوئے کہ میں ان کے واقعات سنتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں اس پون صدی میں شاید ہی کسی نے اردو زبان کی توسیع و ترویج میں اس شدومد کے ساتھ حصہ لیا ہو' ان کے حالات و واقعات ایک کتاب چاہتے ہیں- جس کی یہاں گنجائش نہیں پا رہا ہوں- ممتاز صاحب تصنیف و تالیف کے آدمی ہیں- لیکن ان کے گرد ذمہ داریوں کا اس قدر ہجوم

رہتا ہے کہ وہ اس طرف توجہ زیادہ نہیں دے سکتے۔

مولوی محمد میاں

فاضل دیوبند ہیں' عربی' فارسی سے ترجمہ کرنے میں انہیں مہارت تامہ ہے۔ ان کی مرہون قلم اب تک کئی کتابیں ہیں۔ خاموش مگر زیرک انسان ہیں۔ لیکن مجلس کے انسان نہیں بلکہ تنہائی پسند واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے مندرجہ ذیل کام کیا ہے۔ مقامات حریری کا ترجمہ وحل لغات تذکرہ نزہۃ الخواطر جلد ہفتم، صحیح مسلم کے حواشی بزبان عربی' عبقریت الصدیق (اردو ترجمہ) ترجمہ ہدایہ اردو جلد اول وثانی' الاوراد از بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا مقدمہ' تعارف اور حواشی' ترجمہ بخاری از علامہ وحید الزماں پر تعلیقات' فقہ اسلامی اردو' وغیرہ۔

مجتبیٰ احمد خاں

جناب راحت مولائی کی انجمن سے ایک شخص مجتبیٰ احمد خاں بھی ملا علی گڑھ سے نکلتے ہی نیوی میں چلے گئے۔ نیوی سے آ کر برماشیل میں ملازمت کی اس کے بعد کہنے لگے کہ فلم سازی کا ارادہ ہے۔ ایک بار بیگم سمیت لاہور تشریف لائے۔ مگر پھر نہ معلوم کہاں گم ہو گئے عرصہ ہو گیا کوئی خط نہیں آیا۔ خدا کرے بہ عافیت ہوں نہایت اچھے دوست اور صاحب فکر لوگوں میں ہیں۔

مظفر حسین

میں جب شملہ کے مشاعروں میں جاتا تھا تو مال پر حسین بخش کمپنی میں مظفر حسین کو دیکھتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کا آبائی پیشہ تجارت ہے نہ جانے کیوں مجھے اس پورے خاندان سے ماسٹر شرافت کا تاثر ملتا تھا۔ مظفر حسین شروع سے ادبی علمی اور فنون لطیفہ کے ماہرین سے خلوص برتتے تھے اور ان کے اسی فطری رجحان نے انہیں تجارت سے نکال کر ریڈیو کے ادارے میں داخل کر دیا یہ نہایت ذہین اور طباع ہیں لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق صرف ریڈیو کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا اور ایک یہ دماغ بھی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مظفر حسین ملکی تقسیم کے وقت بھی خبر خوانی کرتے تھے اور جب ٹیلیویژن کا آغاز ہوا تو وہاں بھی خبر خوانی پر انہیں کا انتخاب ہوا ہر چند کہ ریڈیو پر انہیں معاوضہ کم ملتا ہے۔ لیکن

مظفر حسین اب اسے قومی اور ملکی خدمت قرار دیتے ہیں۔

مقبول قریشی

جناب مقبول سے ملتان کی ملاقات ہے وہ اکسائز کے محکمہ سے منسلک ہیں اور شاید یہی سہولت انہیں بعض اوقات ہوش وخرد سے مستغنی کر دیتی ہے۔لیکن اس بے خبری کے عالم میں وہ بڑی باخبری کے اشعار سناتے ہیں۔ان کی شاعری میں جو غزلیں ہندی بحروں میں سنی گئی ہیں وہ تخصیص کے ساتھ بڑی مترنم اور حسین ہیں۔مقبول صاحب بڑے خوش مزاج اور خوش ذوق واقع ہوئے ہیں اور اپنے ماحول کو ہمیشہ شعر انگیز رکھنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔وہ ملتان میں اچھے نغز گوشعراء کی فہرست میں ہیں۔میں بحیثیت شاعر انہیں ملتان کے کئی مشہور شعراء سے بہتر خیال کرتا ہوں۔ابھی مجموعہ کوئی نہیں۔

عزیز ملک

جناب عزیز ملک راولپنڈی میں رہتے ہیں اور کسی سرکاری محکمہ سے منسک ہیں انہیں دفتر کے وقت سے جو فرصت ملتی ہے۔وہ اس میں تصنیف و تالیف کرتے رہتے ہیں اور کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں آج کل بھی وہ تصوف کے متعلق ایک تذکرہ کی فکر میں ہیں۔ابھی ابھی انہوں نے اپنی ایک کتاب ''بلال حبشی'' دی ہے۔ جو حضرت بلال کے متعلق اچھی معلومات کا ذخیرہ ہے۔اور ان کی کاوش قلم کے مداحوں کی تعداد بڑھائے گی۔

مختار عباس

مختار عباس ایک بلند مقام خاندان سادات کا فرد ہے۔ذہین محنتی اور خوش قماش نوجوان لیکن ان خوبیوں پر ان میں ایک شاعرانہ لاابالی فطرت بھی بڑی منہ زور واقع ہوئی ہے۔وہ کسی جگہ جم کر کام کرنا زندگی کا جمود خیال کرتے ہیں۔چنانچہ جب کسی جگہ انہیں زیادہ روز ہو جاتے ہیں تو انہیں یک دم ان کا جنون راہ گردی آواز دیتا ہے وہ اچھی خاصی بلندیوں سے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر چھلانگ مار دیتے ہیں۔جس سے چوٹ تو نہیں لگتی مگر دماغی سکون کا کباڑا ہو جاتا ہے۔مجھے ان سے بے حد

ہمدردی ہے۔ کاش وہ کسی سیدھے راستے پر گامزن ہو جائیں۔ ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں ہو سکتا۔

محمد متین محمد انیس

مولوی محمد متین صاحب اور محمد انیس صاحب دونوں بھائی ہیں اور ڈھاکہ میں ان کی تجارت ہے نہایت مہمان نواز اور مسلمان قسم کے انسان ہیں۔ تبلیغ کے دلدادہ اور علماء و ادباء کے علاوہ شعراء کے قدردان غالباً حضرت عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت ہیں۔ صورت و سیرت دونوں کے مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔

محمود علی خاں

محمود علی خان فرخ آباد کے رہنے والے تھے اور جامعہ ملیہ دہلی کے ادارے میں تھے۔ جگر صاحب سے خصوصی تعلقات تھے اور غالباً انہیں سے مشورہ کلام کرتے تھے۔ عام مشاعروں سے گریز کرتے تھے۔ لیکن خاص خاص موقعوں پر اپنا کلام سناتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے تھے۔ یہاں بھی وہ کوئی ادبی کام چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور اس خاک پاک کا پیوند ہو گئے۔

حکیم محمود علی خان ماہر اکبر آبادی

جناب حکیم محمود علی خان ماہر اکبر آبادی سے میری پہلی ملاقات دہلی کی ایک پرائیویٹ نشست میں ہوئی تھی اور انہوں نے بڑی منجھی ہوئی غزلیں سنائی تھیں۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور لاہور میں مقیم ہو گئے یہاں بھی انہوں نے بہت سی نجی نشستوں میں شرکت کی۔ طب کے متعلق تو ان کی دسیوں کتابیں ہیں۔ لیکن سب میں ان کی تشریح الحروف قابل قدر ہے اور تحقیق زبان کے متعلق اس میں اچھا خاصا مواد ملتا ہے اور میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولانا مستحسن فاررُوقی

یہ اردو بازار میں ''آستانہ'' کے مالک مدیر ہیں اور بڑی پامردی سے دہلی میں اپنا لوہا منوار ہے ہیں۔ ان کا اخبار اگرچہ تصوف اور مذہب کا ملا جلا جریدہ ہے۔ لیکن جناب مستحسن کی سعی نے اسے دنیا

بھر میں مستحسن کر رکھا ہے۔ دہلی سے نکلنے والے اخبارات میں ''آستانہ'' بھی قابل توجہ اور قابل مطالعہ مضامین کا حامل ہے۔ یوں تو ان کا ایک کتب خانہ بھی ہے۔ لیکن ''آستانہ'' پھر ''آستانہ'' ہے۔

مدہوک

جناب مدہوک کا طویل زمانہ لاہور میں گزرا ہے۔ وہ گیت نگار بھی تھے اور کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے فن میں ان کا کوئی حریف نہ تھا اور ویسے بھی لوگ انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ سنا ہے کہ بمبئی میں ہیں اور اب عمر کے ساتھ ان کا فن بھی ڈھلوان پر چل رہا ہے۔

محرم علی چشتی

نہایت زیرک نہایت فاضل اور درویش طبع انسان تھے۔ شروع شروع میں جب میں پیسہ اخبار میں آ کر مقیم ہوا ان دنوں محرم علی چشتی کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ وکیل ہونے کے باوجود وقت کا زیادہ حصہ حیات خدمت خلق اور علمی ادبی ذوق میں صرف کرتے تھے۔ میں نے ان کے یہاں محفل میلاد بھی دیکھی ہے اور مجلس سماع بھی ان کے یہاں ایک ڈائری آباؤ اجداد سے پر ہوتی چلی آ رہی ہے۔ جو لاہور کی ثقافتی تاریخ ہے اسے ان کے ایک عزیز بھی آج تک برابر لکھ رہے ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے ملک میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔

محمد علی جناحؒ

جناح صاحب سے مجھے بات کرنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن انہیں کئی بار دیکھا ہے اور ہر بار اپنے قیافے کی رو سے ایک مایوسی لے کر پلٹا ہوں۔ لیکن زمانے نے میرے خیال اور قیافے کو غلط ثابت کیا میں جس کام کو وہم خیال کرتا تھا وہ ہوا اور مستحکم ہوا۔ میرے قیافے میں وہ صاحب فہم و فراست کے ساتھ کانوں کے کچے تو نہیں البتہ مجبوراً غلط لوگوں پر اعتبار کر جانے والے لوگوں میں تھے اور میں ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں مسلمان قوم کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور ان کے مخلص جانشینوں نے ان کے تعمیری خطوط کو اور بھی مستحکم کر دیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا مودودی کے علم کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ یگانہ روزگار عالم ہیں اور ہمیں ایسے عالموں کی ضرورت ہے۔ مجھے ان کے عقائد کے متعلق کچھ لکھنے کا شعور نہیں میں تو ایک شاعر یا ادیب کی حیثیت سے صرف یہ کہوں گا کہ میں نے آج تک تحریروں میں کہیں ایسا سلجھاؤ نہیں دیکھا وہ ہمیشہ سے پیچیدہ مسائل کو اپنی تحریر میں پانی کرتے چلے آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ملک کو ان کی سیاست سے بھی کچھ مفاد پہنچے۔ لیکن میں تو یہ کہوں گا کہ مولانا مودودی کو اپنے جیسے عالم پیدا کرنے چاہئیں۔ انہیں چاہئے کہ ایسی خانقاہ قائم کریں جہاں مودودی طرز تحریر اور اصول فکر کی تعلیم ہو کیونکہ فکر و قلم کے اصول ہی آئندہ عالمین کی جماعت کی تشکیل کرتے ہیں۔

مولوی محمد صدیق کاندھلوی

مولانا محمد صدیق کاندھلہ کے امام شہر تھے اور کاندھلہ جیسی جگہ جہاں معمولی آدمی بھی علمی طور پر عربی، فارسی کا منتہی ہوتا تھا اور ایک دوسرے سے خیالی طور پر بھی اختلافات طول پکڑ جاتے تھے۔ کاندھلہ میں امامت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مولوی محمد صدیق صاحب فاضل اجل اور طبیب بے بدل تھے اور ان کے یہاں اس خدمت خلق کا کوئی معاوضہ بھی نہیں تھا۔ پھر تمام زندگی ان کا یہی مشغلہ رہا ہے۔ ایسے عالم باعمل بہت کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ کاندھلہ کے لوگوں میں آج بھی وہی بات ہے۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی

مولانا محمد الیاس کاندھلہ کی خاک سے اٹھے میں انہیں اس وقت سے دیکھتا چلا آ رہا تھا جب انہوں نے یہ تبلیغی جماعت بھی نہیں بنائی تھی اور کاندھلہ کے اسٹیشن پر حج کو جانے والے لوگوں کے سامنے روتے پھرا کرتے تھے کہ دنیا چند روزہ ہے وہاں جا کر وہی چیز مانگنا جو رسول مقبول ﷺ نے طلب کی تھی یعنی امت کی بخشش و بہبود مجھ پر شروع ہی سے ان کی شخصیت کا اثر تھا ہر چند کہ وہ بات کرتے ہوئے ہکلاتے تھے۔ لیکن جب وہ بات کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک لفظ کانوں کے راستے دل میں داخل ہو رہا ہے اور اس کا اثر دل سے ہو کر دماغ میں گردش کر رہا ہے۔ یہی سبب

تھا کہ انہوں نے لاکھوں مسلمان کر ڈالے اور آج تک تبلیغی جماعت اپنے خلوص کے بل پر صحابہ کی طرح کام کر رہی ہے۔ اس جماعت کا شہرہ دور دور کے ملکوں میں بھی ہے اور مختلف اقوام کے لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔

ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف بھی اسی خلوص سے اس فریضہ کو انجام دیتے رہے اور اسی سعی کے سلسلے میں آخر اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون!

اب ان کی جگہ مولوی محمد انعام صاحب کام کر رہے ہیں اور ان میں بھی وہی جذب واثر ہے جو ان بزرگوں میں ہونا چاہئے وہ بھی دن رات تبلیغ اسلام اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔ خدا انہیں عمر عطا فرمائے۔ اس ملک میں اس جماعت کا وجود غنیمت ہے۔

مفتی محمد حسن

مشہور عالم اور فاضل اجل تھے اور سیکڑوں پڑھے لکھے لوگ ان سے بیعت تھے اور اپنا دینی رہنما تسلیم کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ امرتسر سے تیس برس کی سکونت چھوڑ کر لاہور میں آ گئے تھے اور یہیں سپرد خاک ہوئے ان کی دینی عظمت اور علمی بلندی مستند تھی وہ صاحب دل اور صاف باطن لوگوں میں تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے جامعہ اشرفیہ میں تقسیم علم کرتے رہے اور ان کے تربیت یافتہ سیکڑوں انسان اب بھی تبلیغ دین میں رات دن مصروف ہیں اور یہ مفتی صاحب کا فیض جاریہ ہے چھچھ ضلع کیمبل پور کے خاک سے یہ فاضل بے بدل اٹھا تھا جو لاہور کی خاک میں غروب ہو گیا۔

ڈاکٹر سید محمود

ڈاکٹر سید محمود صاحب بہار کی معروف شخصیتوں میں ہیں جہاں وہ علم وادب پر عبور رکھتے ہیں وہیں وہ اعلیٰ درجے کی سیاسی بصیرت کے مالک بھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اہل علم و ادب کے قدر دان ہیں ساغر نظامی کو بھی تھپکتے ہیں القصہ وہ کسی انسان سے مایوس نہیں ہوتے جس میں ذرا سی بھی صلاحیت دیکھتے ہیں اس سے انہیں بہبود کا یقین ہوتا ہے اور یہ بڑا اعلیٰ کیریکٹر ہے انہوں نے اس طرح کئی ادیبوں کو ابھارا ہے۔

مہاتما گاندھی

شہید الہند مہاتما گاندھی کی عظمتوں کا کیا ٹھکانا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے لسانی مسئلہ کو ہر ممکن کوشش سے سلجھانے کی کوشش کی اور انہیں کی کوشش سے ۱۹۳۷ء میں اردو کانفرنس ہوئی جس میں مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد میں گفتگو ہوئی جس کا نتیجہ پٹنہ پیکٹ کی صورت میں سامنے آیا پھر واردھا میں جو ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی کانفرنس ہوئی اور اثر یہ ہوا کہ ڈاکٹر تاراچند صاحب کو ہندوستانی کی ڈکشنری تیار کرنے کو کہا گیا اور تقسیم کے بعد تو مہاتما جی نے اس مسئلہ پر اور بھی زور دے دیا تھا۔ لیکن اس کے شہید ہوتے ہی ان کے تمام منصوبے کو غت ربود کر دیا گیا اور ہندی ایسے مشکل الفاظ میں شروع کر دی جسے وہ خود بھی نہ سمجھ پاتے۔ نہ بول سکتے ہیں۔ لیکن مدارس کی پبلک نے ابھی تک اس ہندی کو قبول نہیں کیا ان کا کہنا ہے کہ ہم تو وہی اچھوت ہیں جس کے کانوں میں وید کے الفاظ پڑتے تھے تو کانوں میں سیسہ گلا کر ڈال دیا جاتا تھا۔ اب ہم پر ہندی کیوں ٹھونسی جاتی ہے۔ اردو ادب کے جولائی ۵۱ء میں پنڈت برجموہن وتاتریہ کیفی دہلوی نے اس کانفرنس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد شفیع مرحوم

مولانا محمد شفیع مرحوم جامع مسجد سرگودہا کے خطیب تھے۔ ان کے علم و فضل کا صحیح اندازہ کوئی نہیں کر سکتا ان کے درس میں بیٹھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے یہاں نہ مسائل کی تکرار تھی اور الفاظ کی اور نہ اس طرح انہوں نے چالیس سال درس دیا ہے۔ ان کے جنازہ پر ہجوم دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ضلع ٹوٹ پڑا ہے اس کے علاوہ اطلاع کے بغیر دور دور کے بزرگان دین ان کے جنازہ کی نماز میں دیکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی نجمی

جناب نجمی انبالے کے رہنے والے ہیں انہیں ایک زمانے سے جانتا ہوں۔ وہ فطری شاعر ہیں اور قدیم رنگ میں اچھی غزل کہتے ہیں۔ انبالہ کے علاوہ میں دو چار بار لاہور میں بھی ان کے

ساتھ مشاعروں میں رہا ہوں-ان کی غزلوں میں اخلاق و تصوف کی چاشنی زیادہ ہے اور حسن وعشق کی شوخی کم! ان کے کلام کا مجموعہ بھی اچھا خاصا ضخیم ہو چکا ہوگا-لیکن اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا-

ڈاکٹر مسعود احمد (ہومیو)

ڈاکٹر مسعود صاحب لاہور ہی نہیں لاہور کے گردونواح میں اپنی طرز کے واحد ڈاکٹر ہیں-ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر عطا محمد طاہر کے ساتھ وہ ہمارے نجی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے-وہ نہایت خوش ذوق اور لطیف طبع انسان ہیں اور شاید ان کی لطیف طبعی ہی انہیں ہومیو پیتھی کی طرف لے گئی ہے-کیونکہ وہ بھی ایک شاعرانہ اور مفکرانہ طریق علاج ہے-مسعود صاحب نے اس فن کی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں-جو ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کی غماز ہیں-

حکیم محمد جمیل

حکیم محمد جمیل صاحب ہندوستان کے مشہور طبیب اجمل خان دہلوی کے صاحبزادے ہیں علم طب کے ساتھ ساتھ شاعری بھی انہیں ورثہ میں ملی ہے اور ان کا ایک دیوان بھی میری نظر سے گزرا ہے-جو چھوٹے سائز پر ٹائپ میں چھپا ہوا تھا-ان کے یہاں روایتی شاعری ضرور ہے لیکن اس دور کی غزل کا حوالہ جمیل صاحب کی غزل ہی سے دیا جا سکتا ہے-کیونکہ علمی خاندان ہونے کے علاوہ دہلی کی ٹکسالی سے بھی بخوبی آگاہ ہیں-

حکیم محمد نبی جمال سویدا

جناب جمال سویدا لاہور میں ایک کامیاب طبیب ہیں اور کیوں نہ ہوں وہ حکیم اجمل خان مرحوم کے پوتے اور حکیم جمیل خان دہلوی کے صاحبزادے ہیں-علم و ادب انہیں ورثہ میں ملا ہے اور طب ان کے گھر کی لونڈی ہے-وہ غزل کہتے ہیں اور دہلی کی زبان ظاہر ہے کہ مضمون میں اور بھی چار چاند لگا دیتی ہے-روایتی روش کے دلدادہ ہیں اور روزمرہ و محاورہ پر انہیں عبور ہے-جو ایک شاعر کے لیے ضروری ہے-

مفتی محمد شفیع

جناب مفتی محمد شفیع صاحب علماء دیو بند کی نمودار ہستیوں میں ہیں اور اس دور میں مفتی پاکستان ہیں جہاں علم سے لوگ بھاگتے ہیں اور علماء سے کنارہ کرتے ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب تقریر اور تحریر دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آناً فاناً حل کر دینا اور عام فہم زبان میں بیان کرنا مفتی محمد شفیع صاحب ہی کا حصہ ہے۔ مفتی صاحب نے دیو بند جیسا دارالعلوم یہاں بھی قائم کر دیا ہے۔ جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم اسی نہج پر ہوگی جو دیو بند کی روایت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مفتی صاحب دن رات تقسیم علم ہی میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر ان کے منصب سے ہمیں اور بہت سی امیدیں ہیں۔

قاری محمد طیب

قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم دیو بند کے مہتمم ہیں فاضل اجل اور خطیب بے بدل کے ساتھ ساتھ ان کا علمی کام قابل رشک ہے۔ وہ تقریر میں عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ جو خطابت کا صحیح مقصد ہے۔ ان کی تقریر میں جہاں ان کے علم کی بلندی بولتی ہے وہیں رسول اکرم کی تعلیم کی ترغیب بھی جلوہ گر ملتی ہے۔ وہ دیو بند کی علمی عظمت کے صحیح نمائندے ہیں اور ایسے دارالعلوم کے لیے ایسے ہی باکمال عالم باعمل مناسب ہیں۔ قاری طیب صاحب بھی مسلمانوں کے لیے رحمت الٰہی سے کم نہیں۔

مولانا محمد علی جالندھری

مولانا محمد علی جالندھری نیک خصلت اور فرشتہ سیرت انسان تھے۔ ان کا علم و فضل بھی مثالی تھا اور حب الوطنی بھی اپنی مثال خود ہی تھی وہ احرار کے سربلند اور قابل قدر کارکنوں میں تھے۔ ان کی ساری زندگی احرار کی وفاداری اور اسلام کی تبلیغ میں گزری اور اسی جنوں میں راہی عدم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مولانا مسعود علی

مولانا مسعود علی دار المعارف کے ارکین میں ایک قابل قدر فاضل اور تقریر و تحریروں کے دھنی۔ مسعود علی صاحب میں یہی دو عناصر گتھے ہوئے ملیں گے۔ ان کا اسلوب بیان اچھوتا اور انداز نگارش جدا ہے اور وہ اپنی تحریروں میں الگ نظر آتے ہیں۔

مولوی مجید حسن

مجید حسن صاحب ''مدینہ'' بجنور کے مالک و مدیر تھے۔ نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والے انسان انہوں نے جس کامیابی سے مدینہ کو چلایا ہے وہ انہیں کا کام تھا۔ مدینہ کے فائل سے اس دور کی اعلیٰ قسم کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ مجید حسن صاحب کو انسان شناسی میں بھی ملکہ تھا۔ انہوں نے مدینہ میں کام کرنے کے لیے جن جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ آج اپنی جگہ ایک ستون ہیں اور انہیں صحافت کی تاریخ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا نصر اللہ خان عزیز اور مولانا وارث کامل مرحوم جیسے لوگوں پر مجید حسن صاحب کی نگاہ انتخاب کا پڑنا ان کی قابلیت اور تجربہ کی دلیل ہے۔

مولانا محمد علی کاندھلوی

کاندھلہ یوں تو ہمیشہ سے اہل علم کا مرکز رہا ہے۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ آج بھی وہاں سے مولوی محمد علی جیسے جید عالم اور کارکن ہی انسان آئے ہیں۔ مولانا محمد علی جہاں علمی طور پر فضیلت رکھتے ہیں وہیں عملی کارکن بھی اور اسی جنون میں وہ سنت یوسفی تک ادا کر چکے ہیں یوں تو ان کی تصنیف و تالیف میں کئی کتابیں ہیں۔ لیکن ان کی نئی کتاب ''امام اعظم اور علم حدیث ایسی کتاب ہے کہ امام اعظم پر اب تک ایسی کتاب نہیں آئی مولانا نے جس شرح و بسط سے کام لیا ہے یہ بڑی اہم خدمت ہے ہم بانیان دار الشہابیہ اور اہالیان سیالکوٹ کو لائق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ان کے یہاں مولوی محمد علی جیسے عالم موجود ہیں۔

مولوی محمد یوسف کاندھلوی

مولوی محمد یوسف کاندھلوی حضرت مولانا مولوی الیاس کے صاحبزادے تھے اور اپنے والد صاحب کے وصال کے بعد تبلیغ کا کام انہوں نے سنبھالا تھا اور یہ کلیتہً مولانا الیاس کا روحانی فیض تھا کہ وہ اس راہ میں اسی رفتار سے گامزن ہوئے اور ان تقریر میں وہی بات اور اثر آ گیا تھا جو مولانا الیاس کی زبان میں تھا - ان کا یہ تبلیغی سلسلہ اب تک جاری ہے - مولانا جیسا حافظ حدیث شاید ہی ان کے دور میں ہو بالآخر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے - انا للہ وانا الیہ راجعون! ان کی جگہ اب مولوی انعام صاحب اس میدان میں گامزن ہیں اور دن رات منزلیں مارتے جا رہے ہیں - خدا کامیاب کرے آمین!

حکیم محمد عمر کاندھلوی (سیالکوٹ)

حکیم محمد عمر کاندھلوی ضلع مظفر نگر کے بڑے علمی ادبی خاندان کے فرد ہیں ان کے خاندان سے علمی اور طبی بڑی بڑی روایات منسوب ہیں - حکیم محمد عمر صاحب بھی علم الادیان اور علم الابدان دونوں سے بہرہ ور ہیں - ان کے یہاں کچھ صدری نسخے ایسے چلے آ رہے ہیں جو کسی رخ سے بھی ناکام نہیں ہوتے اور پھر ان کی تشخیص ان کا الگ ایک کرشمہ ہے حکیم صاحب بندگان دین کے نقش قدم پر چل رہے ہیں - ان کے یہاں علم بھی ہے اور اتقا بھی جو میرے خیال سے طبیب کے لیے نہایت ضروری ہے - حکیم محمد عمر صاحب ایک کتاب میں اپنے مجربات ترتیب دے رہے تھے نہ معلوم وہ کس منزل میں ہے -

مجاہد الحسینی

مجاہد الحسینی صاحب علم و فضل میں مثالی انسان ہیں وہ تقریر و تحریر دونوں میں اپنا مقام رکھتے ہیں وہ خوش وضع بھی ہیں اور خوش اخلاق بھی وہ ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی انہیں مبلغ اسلام کہنا بھی درست ہو گا اور خادم خلق بھی لیکن ہم ایسے علماء سے ان کے قلمی شاہکاروں کی امیدیں لیے ہوئے ہیں - کاش وہ وقت نکال کر اس طرف بھی توجہ دیں -

مولوی محمد سالم دیو بندی

مولوی سالم صاحب جناب قاری طیب صاحب کے صاحبزادے ہیں ان کی محنت، دیو بند کی تربیت اور اساتذہ کی توجہ نے انہیں بہت جلد اس راستے پر لگا دیا ہے۔ جس پر ان کے آباؤ اجداد اور اساتذہ گامزن چلے آتے ہیں۔ مولوی سالم میں بھی بفضلہ وہی آثار نمایاں ہیں جو دیو بندی علماء کی روایت ہے ان کی زبان میں اثر اور الفاظ میں ان کا دل شامل ہوتا ہے۔ اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ ہو آمین!

مشتاق احمد گورمانی

نہایت قابل اور زیرک انسان ہیں ادب، شعر اور سیاست میں بھی ان کا مطالعہ قابل رشک ہے۔ علماء شعراء اور ادیبوں کے قدر دان ہیں۔ ان کی متانت اور سنجیدگی بھی اہل نظر کے لیے بہت کچھ رکھتی ہے۔ تقریر اور تحریر میں بہت کم لوگ ہیں جو ان جیسی گہرائی اور گیرائی کے مالک ہیں زبان اور قلم پر انہیں برابر کا قابو ہے اور نقر شناسی سے لے کر سلطانی تک کے راز ان پر منکشف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنا گورنری کا دور بھی نہایت نیک نامی اور خوش کامی سے گزارا اور اپنے ظاہر و باطن کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ کاش وہ کچھ قلمبند بھی کر جائیں۔ ان کا کتب خانہ قابل دید ہے۔

میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ

نہایت پڑھے لکھے قانون دان اور سیاسی قسم کے انسان ہیں انہیں سیاست میں ایک خاص قسم کا شعور حاصل ہے۔ لیکن ابھی تک شاید فضا سازگار نہیں مل سکی۔ ہر چند کہ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ چاہتے تھے وہ نہ کر سکے اور وقت برق رفتاری سے گزر گیا۔

وہ بڑے گہرے مطالعہ کے انسان ہیں اور اہل علم کی قدر و منزلت سے بھی غافل نہیں ان میں اب تک روسائے قدیم کی خو بو باقی ہے جو ان کے بڑے چابک دست انسان ہونے کی دلیل ہے۔ میں نے انہیں نہایت سرسری دیکھا ہے۔ لیکن میرا قیافہ انہیں زیرک اور غیر معمولی ذہین انسان بتاتا ہے۔

محمد خاں کلیم

جناب محمد خان کلیم ٹریننگ کالج میں استاد ہیں۔ نہایت شریف خاموش اور با اخلاق انسان ہیں نثر اور نظم دونوں میں انہیں مہارت تامہ ہے۔غزلوں میں بھی ان کا ایک خاص رنگ ہے۔جس میں انہیں کی طرح متانت اور سنجیدگی ملتی ہے۔ان کے کلام میں شوخی نہیں بلکہ ایک طرح کا ایسا ادبی انداز ہے جوان کے پیشہ سے مطابقت رکھتا ہے۔وہ فارسی میں بھی اچھی مہارت رکھتے ہیں اور ادب پران کے مطالعہ اور مشاہدہ کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے ابھی مجموعہ کوئی نہیں چھپا۔

چودھری محمد علی

چوہدری صاحب ملک کے مشہور سیاست دان اور حسابیات کے ماہرین کی صف کے انسان ہیں۔ پاکستان کا پہلا آئین انہیں کا مرہون قلم ہے جوان کی وزارت میں ان کا کارنامہ شمار ہوتا ہے۔

ملک میں ایسے سوجھ بوجھ کے لیڈر بڑی مدت میں پیدا ہوتے ہیں۔مسلم لیگ میں ان کے دم سے بڑی صحت مندی آ گئی تھی اور یہ ان چند لیڈروں میں سے تھے جو ایبڈو کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

لیکن اب تک انہیں فضا سازگار نہیں ملی۔اگر چہ یہ شب و روز جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ابھی وقت نے کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

محمد مرتضٰی علی صدیقی

مرتضٰی صاحب سے میری ملاقات نیاز احمد مرحوم کی معرفت ہوئی تھی لیکن ان کی شخصیت کچھ ایسی دلچسپ ہے کہ پہلے ہی دن سے یوں معلوم ہونے لگے جیسے برسوں سے نزدیک چلے آ رہے ہیں۔میں انہیں پہلے انکم ٹیکس کمشنر ہی خیال کرتا تھا۔ لیکن پھر کھلا کہ وہ تو شعر بھی کہتے ہیں اور جب سنا تو ان کی شاعری سیکڑوں شعرا سے بہتر پائی ایسی ہی مہارت انہیں نثر میں بھی ہے۔میں ان سے آج تک جتنی بار ملا ہوں میں نے ان کی توجہ اور محبت میں کمی نہیں پائی ۔وہ ایک اچھے مسلمان اور اعلیٰ قسم کے قومی کارکن ہیں۔لیکن افسوس کہ مناسب ماحول میسر نہیں اور وہ دن رات اسی انسان دوستی

میں مضطرب رہتے ہیں۔

نوح ناروی

محمد نوح صاحب نوح ناروی نارہ ضلع الہٰ آباد کے جاگیر دار تھے اردو، فارسی کے عالم اور انگریزی سے بے بہرہ نہیں تھے۔ شروع شروع میں امیر مینائی اور جناب حکیم ضامن علی جلال سے اصلاح لی اور پھر جناب داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور استاد نے شاگرد کے جوہر دیکھ کر اپنے پاس دکن بلوالیا وہاں انہیں بڑے بڑے علماء اور شعراء کی صحبتوں نے اور بھی کندن بنا دیا۔

ان کے اطراف و جوانب میں شعروادب کا ذوق انہیں کے دامن کا ممنون ہے۔ ان کے تلامذہ میں خاصی تعداد اچھے شعراء کی ہے۔ جن میں جناب زیبا ناروی اور سکھدیوراج بسمل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

چونکہ حضرت نوح کے کلام میں جناب داغ کی فصاحت کے ساتھ بعض جگہ ان میں شوخی بھی پائی جاتی ہے اور کلام بھی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ ان کے کلام سے جہاں ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے وہیں الفاظ ومحاورات اور ضرب الامثال پر بھی عبور اپنا رنگ دکھاتا ہے نکھرا ہوا روزمرہ اور جگہ جگہ لفظوں اور جملوں کے الٹ پھیر سے مضمون پیدا کرنے میں حضرت نوح کا جواب پورے ملک میں نہیں تھا۔ حضرت نوح کی خصوصیات ان کے تلامذہ میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ لیکن مولوی مدن کی سی بات نہیں وہ اپنا رنگ اپنے ساتھ لے گئے اب وہ زبان کی سادگی خواب ہو کر رہ گئی ہے جو مشاعروں میں داد و تحسین کے ہنگامے برپا کیے رکھتی تھی۔ رہے نام اللہ کا جناب نوح کے چار دیوان مطبوعہ ہیں۔

قاضی ظہور الحسن ناظم سہواروی

ناظم صاحب سہوارہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ایک زمانے میں وہ حیدرآباد دکن میں بھی رہے میری ملاقات ان سے لاہور ہی میں ہوئی وہ چومکھی معلومات کے انسان تھے۔ چنانچہ ان کی قلمی کاوشیں بھی ایسی ہی ہیں انہوں نے قرآن وحدیث پر بھی کام کیا ہے اور تاریخ وتذکرے پر بھی ان کے نقوش قلم ادب اور شعر میں بھی ملتے ہیں۔ وہ قدیم طرز وطریق کے انسان تھے اور کبھی اقدار

اسلامی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے-انہوں نے کتاب وسنت پر بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور بچوں کے لیے نصابی لٹریچر بھی دیا ہے-

نیاز فتح پوری

جناب نیاز صحیح معنی میں ادیب تھے شروع شروع میں انہوں نے شاعری بھی کی لیکن بہت جلد سمجھ گئے کہ وہ اس میدان کے آدمی نہیں ہیں اس لیے انہوں نے کنارہ کرلیا-ادب میں جتنا کام نیاز فتح پوری نے کیا ہے-ہمارے بڑے بڑے ادارے بھی نہیں کر سکتے -اگر ان کے رسالہ ''نگار'' کے مضامین کو شعبہ وار تقسیم کر کے کتابی صورت دے دی جائے تو ادب کے پاس بیش بہا سرمایہ ہو جائے گا-حضرت نیاز کی ادبی اور مذہبی معلومات اس قدر تھیں کہ بڑے سے بڑا طرہ باز خان ان کے سائے سے جھک کر نکلتا تھا-ان کی تصنیفات وتالیفات کی ایک طویل فہرست ہے اور ان میں کوئی بھی معمولی کتاب نہیں-وہ ترجمہ‘ تنقید‘ افسانہ اور مذہبی تبصرے بڑی سینہ سپری اور دیدہ دلیری سے لکھتے تھے-

ناطق گلاوٹھوی

حضرت ناطق اساتذہ کی صف میں ہیں پہلی بار میرا تعارف ان سے لکھنؤ میں ہوا - جناب عبدالباری آسی مرحوم حضرت ناطق کے شاگرد تھے اور آسی صاحب ہی نے تعارف کرایا تھا- حضرت ناطق کا اردو‘ فارسی اور عربی کا علم تو ہے ہی ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے-ان کی کتاب ''سبع سیارہ'' چھپی تھی جس کی ایک جلد انہوں نے مجھے بھی عنایت فرمائی تھی-اس سے ناطق صاحب کی صلاحیتوں اور ہمہ گیر مطالعہ کا پتہ چلتا ہے-ان کی کچھ اور تصانیف بھی ہیں جو مجھے دستیاب نہیں ہو سکیں بہر حال وہ صحیح معنی میں استاد ہیں اور ابھی تک ناگپور میں اردو زبان کی ترویج واشاعت کر رہے ہیں-

سید نذیر نیازی

جناب سید نذیر نیازی صاحب شروع ہی سے علم و ادب کے شائق اور تصنیف و تالیف کے انسان رہے ہیں عرصہ سے وہ ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' کے ادارہ سے منسلک ہیں اور یہ کام ان کے ذوق کے مطابق ہے- اس لیے وہاں نہایت انہماک سے کام کر رہے ہیں- اس میں شک نہیں کہ نہایت اچھا اور ضروری کام کر رہے ہیں- لیکن وہ تو محدود موضوعات ہیں اب نہ جانے وہ اپنے روحانی ذوق اور تقاضے پر کہاں تک عمل کر رہے ہیں اور فرائض منصبی سے ہٹ کر فراغت میں بھی کچھ لکھ رہے ہیں یا نہیں-

عبدالرب نشتر

جناب نشتر کے ساتھ میں نے پشاور اور کوئٹہ میں مشاعرے بھی پڑھے ہیں اور وقتاً فوقتاً لاہور میں ان سے ملتا رہا ہوں وہ جہاں سیاست اور تاریخ پر عبور رکھتے ہیں وہیں بڑے سلیقہ کے شاعر بھی تھے- ان کے یہاں اپنے سے زیادہ عوام کا غم ملتا ہے- وہ گورنری کے دور میں نیلا گنبد کی مسجد میں آ کر پچھلی صفوں میں نماز ادا کرتے رہے ہیں- جس سے ان کی عوامی زندگی سے لگاؤ اور خلوص ظاہر ہوتا ہے- پاکستان کی تاریخ میں ایسا مخلص انسان ذرا مشکل ہی سے دستیاب ہوگا- ان کے یہاں فکر و عمل کا چولی دامن ہونا ان کی انسانیت اور خلوص نیت کی بین دلیل ہے-

نہال سیوہاری

عبدالخالق نہال سیوہاروی ایک معزز خاندان کے فرد تھے- عرصہ گزرا دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی اور پھر نہ جانے کتنے مشاعروں میں ساتھ رہا- وہ ریلوے میں حسابات کے شعبہ سے منسلک تھے اور ۵۲ء میں انتقال کیا-

نہال صاحب نہایت مخلص اور سادہ و معصوم قسم کے انسان تھے ان میں جھوٹ اور فریب کا عنصر شاید فطرت نے ودیعت ہی نہیں کیا تھا- عجیب و غریب قسم کا والہانہ مزاج پایا تھا- بعض اوقات تو ان کی حرکات و سکنات سے ان کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا تھا- لیکن ان کی معصومیت پر ہر شخص کو پیار

آتا تھا۔ اگر اس شخص کی تفصیلی زندگی لکھی جائے تو ولی اللہ اور صاحب مقام لوگوں کی طرح ہوگی۔
لڑکپن سے شاعری کا ذوق تھا۔ وقت، تجربہ اور مشاہدہ انہیں میدان دیتا چلا گیا اور جس قدر عمر بڑھتی گئی اسی قدر ان کی شاعری شباب پر آتی گئی۔ وہ محبت اور انسانیت کے شیدائی ہی نہیں تھے ان کی زندگی محبت کی تبلیغ اور شاعری پامال انسانیت کی درد بھری چیخ تھی۔
ان کا کلام اپنی وسعتوں کے اعتبار سے انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن کہیں اس میں ابتذال اور پستی نہیں آنے پاتی۔ ان میں ایک جوش ہے ولولہ ہے ترنگ ہے اور چیخ ہے۔ جو کانوں کے راستے سے دلوں میں انڈیل دیتے ہیں۔ ان کے یہاں قنوطیت نہیں ہے ان کے یہاں جرات کا سبق ہے عزائم کے مشورے ہیں ہمت کی پشت پناہی ہے اور شکستہ دلوں کے لیے ایک جرات کا پیغام
وہ شاعری کی ہیئت میں اپنے اشعار انہیں قدیم سانچوں میں ڈھالتے ہیں جو بزرگوں سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کو پڑھ کر نئے سانچوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ اردو زبان کی تنگ دامانی کا شکوہ زبان پر آتا ہے۔
جہاں نہال پریشانیوں سے تنگ آکر ملک وملت کی خستہ حالی دیکھ کر کوئی نغمہ الاپتے ہیں ان کا ہر شعر ایک ٹھنڈی تلوار کی طرح دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ جس کی روانی اور تیزی کا وہی لوگ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو زندہ دل اور حساس ضمیر رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے ''گلبانگ آزادی'' اور شباب وانقلاب'' شائع ہو چکے ہیں جو اردو کی شاعری میں گراں بہا اضافہ ہیں۔

نذیر مرزا برلاس

مرزا برلاس نے علوم مشرقی سے فراغت پا کر اردو میں ایم اے کیا اور پھر بی ٹی کر کے صوبہ سرحد کے محکمہ تعلیمات سے متعلق ہو گئے مرزا بڑے خلیق اور ملنسار انسان ہیں صوبہ سرحد میں جو انہوں نے اردو کی ترویج واشاعت میں کوششیں کی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ وہ قدیم روائتی شاعری کی شاہراہوں سے ہٹ کر جدید رجحانات کو مقبول عام کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اس لحاظ سے شاید ہی کوئی ادبی ادارہ یا علمی جریدہ ایسا ہو جو ان کی سعی قلم کا مرہون نہ ہو۔
برلاس صاحب کلاسیکی شاعری کے علاوہ یورپ کی رومانیت سے بھی متاثر ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی

نظموں میں جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ انہی کا اسلوب نظر آتا ہے۔ مگر ہم اسے نقل نہیں کہتے۔ یہ برلاس صاحب کی تنوع پسند طبیعت کا کارنامہ ہے۔ برلاس کے یہاں غزلوں سے زیادہ نظموں کی منظر نگاری وقیع اور قابل داد ہے۔ کیونکہ وہ اس میں بڑی ہی خوردہ گیری اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں۔ میں تو ان کی غزلوں میں بھی وہی ان کی طبیعت کی نرمی، لوچ اور غنائی عناصر دیکھتا ہوں جو نظموں میں ان کا اصل رنگ ہے۔ چونکہ غزل کی تمام تر خصوصیت نظم کی شرائط سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اس لیے بعض اوقات نظم کی لذت اور غزل کی کیفیت میں امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔

خوشی محمد ناظر

چوہدری خوشی محمد ناظر کو میں نے بہت نزدیک سے نہیں دیکھا البتہ کئی مشاعروں میں ان کا میرا ساتھ رہا ہے۔ لائل پور میں جب انہوں نے میری نظمیں سنیں تو اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ میں خیال کرتا تھا کہ میرے استاد حالی کے بعد شاید کوئی فطرت نگاری کو نہیں اپنائے گا کیونکہ یہ کام آسان نہیں۔ شاعر انسانی حسن سے نظر ہٹا کر مشکل ہی سے فطرت بینی کی طرف آتا ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ احسان دانش نے حالی کی فطرت نگاری کو اور بھی وسیع کر دیا ہے اور جو انداز احسان دانش نے اختیار کیا ہے۔ وہ ایسا ہے جو ہمارے ملک کے ہر شعبہ کو محیط ہو سکتا ہے۔ میرا ابتدائی زمانہ تھا میں ان کی مشہور نظم

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعہ نور ہوا

سے بہت مرعوب تھا۔ مشاعرہ کے بعد میں ان سے ملا اور انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میرے لیے دعا کی۔ میری نظر میں آج بھی ان کی شفقت اسی طرح زندہ و تابندہ ہے۔

چودھری خوشی محمد ناظر کشمیر کی گورنری تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے اور پھر یہیں کہیں پنجاب میں رہنے لگے تھے۔ یہاں ان کی اچھی خاصی زمینداری تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں آپ کا انتقال ہو گیا اور وہ اردو ادب کو بڑی نعمت سے محروم کر گئے۔

انہوں نے جب وہ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے اسی وقت سے شاعری شروع کر دی تھی اور ان کی ایک نظم پر انعام بھی ملا تھا۔ وہ پمفلٹ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور وہیں سے معلوم ہوتا

ہے کہ ناظر بھی حالی کے شاگرد ہی نہیں حالی کے دور اصلاح کے ایک رکن ہوں گے۔

نسیم امروہوی

جناب نسیم امروہوی کہنہ مشق اور صاحب طرز شاعر ہیں وہ اصل میں مرثیہ کے شاعر ہیں اور مرثیہ کے فن پر ان کا مطالعہ قابل تعریف ہے۔ وہ مرثیہ کہتے ہیں تو فنی نقطہ نظر سے عیوب و محاسن کا خیال رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا مرثیہ نہایت اچھا اور خصوصاً ٹیپ میں تو چاروں طرف سے لنگر پڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مرزا انیس کی طرح ان کے ہاں بھی ٹیپ پر سارا زور قلم صرف ہوتا ہے۔ مجلسوں میں جب وہ مرثیہ پڑھتے ہیں تو مرثیہ کے کردار زندہ اجسام کی طرح چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ جناب نسیم اصناف ادب میں ہر صنف پر حاوی ہیں اور مطالعہ بھی وسیع ہے۔

نجیب اشرف

جناب نجیب اشرف بمبئی میں ہیں اور ایک تحقیقی ادارہ کو سنبھالے ہوئے ہیں بمبئی سے ''نوائے ادب'' انہی کی مساعی جمیلہ سے پھل پھول رہا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک عظیم ادیب ہیں اس لیے عظیم ادب کی جانچ پرکھ اچھی کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ''نوائے ادب'' کو ادبی ریسرچ کے سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نجیب اشرف صاحب کے مضامین علمی ادبی معلومات سے پر اور ان کے خاص اسلوب نگارش سے مزین ہوتے ہیں۔

شفیع الدین نیر

نیر صاحب جامعہ ملیہ نئی دہلی میں پروفیسر ہیں قصبہ تلہر کے رہنے والے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد تلہر سے دہلی آ گئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے اخبار فروشی شروع کی اتفاق ہے کہ یہ شمس العلماء سید احمد امام جامع مسجد دہلی کو بھی اخبار دیا کرتے تھے۔ انہوں نے نیر کو ہونہار دیکھ کر اپنے یہاں رکھ لیا اور ابتدائی تعلیم کے بعد عربک اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ ہر جماعت میں اول یا دوم آتے تھے۔ فطرت نے انہیں خوش نویسی کا ملکہ بھی عطا فرمایا مشق کے بعد اور بھی مشاق ہو گئے

خلافت کے زمانے میں خلافت کے اسکول میں داخل ہو گئے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے بعد ایم اے کیا اور جامعہ ملیہ میں استاد ہو گئے اب پروفیسر ہیں۔ منشی فاضل کے بعد شاعری کا شوق ہوا۔ بچوں کی کہانیوں اور کئی منظوم مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دہلی میں ڈاکٹر محمد سعید بریلوی کی دختر سے شادی ہوئی اس وقت ان کی عمر ساٹھ یا کچھ زائد ہو گی جناب یوسف بخاری کے ہم جماعت تھے۔

پروفیسر ناظر حسن زیدی

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی اورینٹل کالج میں استاد ہیں قدرت نے انہیں بلا کا حافظہ عطا فرمایا ہے اساتذہ کے ہزار ہا اشعار انہیں یاد ہیں اور وہ انہیں درس و تدریس اور گفتگو میں بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ جناب ناظر حسن تصنیف و تالیف سے بھی غافل نہیں۔ چنانچہ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہیں ''والدین اور بچے'' ''فرض شناسی'' ''مقالہ مومن''، ''مکتوبات سعد اللہ خان''، ''خلاصۃ التواریخ'' وغیرہ ڈاکٹر صاحب نہایت محنتی، ذہین اور زود نویس انسان ہیں ابھی نہ جانے ان کے قلم سے کیا کیا تخلیق ہو گا۔

نعیم صدیقی

جناب نعیم صدیقی جہلم کے رہنے والے ہیں اور ایک عرصہ سے لاہور میں قلم کی مزدوری کر رہے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ان کی زود گوئی بھی مشہور ہے اور بسیار نویسی بھی۔ عقیدہ کے اعتبار سے با اعتبار مسلمان اور اخلاقی لحاظ سے بڑے فراخ دل، ان کی شاعری زیادہ تو روائتی اصول وضوابط کے تحت ہے مگر اب وہ نئے رنگ میں بھی کہنے لگے ہیں جو غالباً ان کے عجز کا اعلان ہے۔ ردیف و قوافی کی قید میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے۔ اس میں وہ اپنے مافی الضمیر کو بڑی کامیابی سے بیان کر لیتے ہیں تو نہ جانے معرا نظموں میں انہوں نے کون سی بات دیکھی ہے۔

نجم الاسلام

نجم الاسلام بجنور کے رہنے والے ہیں اور آج کل حیدر آباد کے غزالی کالج میں شعبہ اردو سے منسلک ہیں بڑے محنتی اور ذوق سلیم رکھتے ہیں- میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی گھنٹوں تحقیقی مسائل پر گفتگو رہی ہے- ان کی ایک کتاب ''تحریکات احیائے دین اور اردو'' مکمل ہو چکی ہے- چھپے گی تو ادب میں مفید اضافہ ہوگا آج کل وہ ''دبستان دہلی کی ابتدائی نثر'' پر کام کر رہے ہیں- خدا کامیاب کرے آمین ثم آمین میں اداروں میں جب ایسے نوجوانوں سے ملتا ہوں تو طبیعت کو حقیقی خوشی ہوتی ہے-

جناب نظم کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا ہر شعر ان کی قدرت کلام کا آئینہ دار ہے- یار باش قسم کے انسان ہیں اور اخلاقیات جسے وہ غربت کے راستوں سے بھی صاف نکال لائے کبھی دست بردار معلوم نہیں ہوتے-

جہاں وہ شعر میں معاملہ بندی پر آتے ہیں تو کمال کرتے ہیں- معلوم ہوتا ہے کہ شعر خود بخود اترا ہے- محنت اور کوشش کا بالکل دخل نہیں راولپنڈی کے مشاعروں میں جناب نظم کے دم سے رونق بڑھتی ہے اور مقامیوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا نہ جانے وہ کب تک اس ادبی امانت کو اپنی تحویل میں رکھیں گے-

نیر اکبر آبادی

نیر صاحب آگرہ کے رہنے والے تھے تقسیم ملک ہوئی تو پاکستان آ گئے اور راولپنڈی میں مقیم رہے ہیں- نیر صاحب کو تقسیم سے پہلے بھی مشاعروں میں سنتا رہا ہوں- وہ اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور جہاں مشاعرے میں جاتے تھے- انہیں ایک بلند مقام ملتا تھا- وہ اپنی کہنہ مشقی کے بل پر نہایت اچھا شعر کہتے تھے اور جہاں تک فن کا تعلق ہے وہ شاعری میں فنی محاسن کو نظر انداز نہیں کرتے تھے- ترقی پسندی سے کوسوں دور تھے اور اخلاق و معتقدات کی نگہبانی کو فرض خیال کرتے تھے- ان کا کوئی مجموعہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا- جو کلام سننے میں آیا ہے وہ زبان کے لحاظ سے بھی اور لفظوں کے در و بست کے اعتبار سے بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں-

نادم سیتاپوری

جناب نادم سیتاپوری شاعر بھی بڑے ڈھب کے ہیں اور ادیب بھی بڑے تیور کے' ان کے یہاں تنقیدی ذہن بھی ہے اور تحقیقی فطرت بھی وہ اصناف ادب میں ہر صنف پر مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوشیں اور ادبی کوششیں کامیاب ہیں وہ اہل نظر طبقے میں عزت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ نادم صاحب انسان کی حیثیت سے بھی بڑے مزیدار انسان واقع ہوئے ہیں۔ ان سے مل کر زندگی کا ہر غم رخ بدل لیتا ہے وہ خود زخمی زندگی رکھتے ہیں مگر دوسروں کو قہقہے تقسیم کرتے ہیں۔

مولوی نور الحسن

مولانا نور الحسن صاحب اورینٹل کالج میں استاد ہیں اور اردو فارسی اور عربی پر انہیں استادانہ عبور ہے۔ میں نے ان کی ایک کتاب کا مسودہ دیکھا ہے۔ جو فن موسیقی پر ہے اور وہ اس قدر تفصیلی اور تحقیقی کتاب ہے کہ آج تک اردو میں ایسی کتاب نہیں آئی اس کے علاوہ مولوی نور الحسن صاحب کو فقہ اور حدیث پر بھی عبور ہے اور ان کے درس قرآن و حدیث میں سوجھ بوجھ کے لوگ شامل ہوتے ہیں اور میں نے ان میں اکثر لوگوں کو مولانا کے متعلق رطب اللسان پایا ہے۔ ہر چند کہ وہ اس معلمی پر مطمئن ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حکومت میں کسی کارآمد جگہ کے مستحق ہیں۔ جہاں انہیں اپنے علم کے استعمال کا موقع مل سکے۔

ندرت میرٹھی

جناب ندرت میرٹھی' میرٹھ کے بہت مشہور شاعر ادیب تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے بھی ان کا پایہ بلند تھا اور شہر میں ایک خاندانی اور معزز ہونے کی حیثیت سے بھی لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ انہیں اپنی شاعری اور علم و فضل پر غرہ نہیں تھا۔ وہ صاحب ظرف انسان تھے اور شرفاء کا ہمیشہ یہی شعار رہا ہے۔ انہوں نے اپنے چار مجموعہ کلام اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ خون نابہ دل حصہ اول دوم' صحیفہ ندرت' لوح و قلم' اور ان میں ان کا علم اور کردار بولتا ہے۔

سعید انصاری نشترؔ

مولانا محمد سعید انصاری مولانا شبلی کے بڑے محبوب شاگردوں میں تھے آخری عمر میں وہ یونیورسٹی پنجاب میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں آ گئے تھے- عجیب درویشانہ زندگی کے مالک تھے جب وہ کہیں سے سکونت بدلتے تھے تو اس گھر سے کوئی چیز لے کر نہیں چلتے تھے اور جہاں جاتے تھے وہاں ان کے لیے سب کچھ مہیا ہو جاتا تھا- نہایت کم آمیز طبیعت پائی تھی ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ان کے سامنے رہتی تھی اور کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے یہ دارالمصنفین کے ایک رکن تھے مگر پائے گدا لنگ نیست والا شعر ان پر صادق آتا تھا- انہوں نے کئی ایک معیاری کتابیں لکھی ہیں جو انہیں تاریخ میں لانے کی ضامن ہیں-

نسیم احمد تسنیم

بریلی کالج میں ان سے ملاقات ہوئی تھی وہ غزل اور تنقید دونوں سے شغف رکھتے تھے- اب تک تو ان کے مضامین اور کلام کتابی صورت میں آ چکے ہوں گے ایک زمانہ ہو گیا ان سے ملاقات نہیں ہوئی آدمی بڑے قاعدے کے ہیں اور ان میں بڑائی کے آثار گو نگے نہیں-

نور بجنوری

جناب نور ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہیں نہایت کم گو اور کم آمیز شاید وہ فطرتاً تو ایسے نہ ہوں مگر یہاں کے ادبی ماحول نے اپنی تنگ دلی اور تنگ نظری کے باعث انہیں نہیں سراہا اور انہیں ہی نہیں کسی بھی اس اچھے شاعر کو نہیں سراہا جو پارٹی بند نہ ہو اور اپنی ٹولی ساتھ لے کر نہ بیٹھتا ہو- میں نور سے قریب کا آدمی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ماحول میں ان کی ٹکر کے شاعر بہت کم ہیں اور غزل اور نظم دونوں پر حاوی ہیں اور دونوں میں ترقی پسندی کی ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو دوسرے ترقی پسندوں میں نہیں ملتی-

وہ اپنے ماضی کی روایات سے باغی نہیں اور قیود میں رہ کر اپنے ذہن اور فکر کے اعجاز سے ایسے شعر کہتے ہیں کہ نورؔ کے مجموعہ کلام ''جگمگ کے بعد کے کلام پر ذرا مشکل سے دل جمتا ہے- ان کے

کلام میں ہمارے اس دور سے کہیں زیادہ لطافت اور غنائی کرامتیں موجود ہیں۔

مگر ہمارے نقادوں اور تذکرہ نگاروں کی بے رحمی کی انتہا ہے کہ نور بجنوری جیسا شاعر ان کے احاطہ معلومات سے باہر ہے کیا اس اندھے پن کو مستقبل کا نقاد معاف کر دے گا؟ کیا اس قسم کے شاعر کو اندھیرے میں دھکیل دینا ان کی اپنی بے علمی اور تعصب کی دلیل نہیں کیا یہ بے ضابطی اور سفلگی کا تواتر آنے والے نقادوں کو از سر نو اردو ادب کی تاریخ کے جائزے پر مجبور نہیں کر دے گا؟

نور بلند پایہ شاعر ہے اور قادر الکلام شاعر وہ دن دور نہیں کہ نور کے ذکر کے بغیر اردو ادب کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہلا سکے گا۔

خورشید حسن نازش حیدری

جناب نازش حیدری کراچی میں ہیں اور صحافیوں میں ایک مقام رکھتے ہیں وہ جناب حیدر دہلوی کے شاگرد ہیں اور ادب کے سیکڑوں شاگرد انہیں گھیرے رہتے ہیں وہ اخبار کی قلمی مزدوری کے باوجود سیکڑوں نوجوانوں کی رہنمائی کرتے ہیں ان کے کلام میں بلند فکری اور اقدار انسانیت کی روشنی ملتی ہے اور ان کی سعی و کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ جناب نازش حیدری نظم و نثر دونوں میں قابل رشک مہارت رکھتے ہیں اور دونوں میں ان کی رہنمائی سے اردو ادب میں اضافے ہو رہے ہیں۔

ابھی ان کا مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا ۴۷ء میں پاکستان آ گئے تھے اب سب ایڈیٹر ہیں روزنامہ ''جنگ'' میں۔

نجم آفندی

جناب نجم آفندی آگرہ کے رہنے والے ہیں اور میرے بڑے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی اور دونوں میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے جو ہر شاعر کو میسر نہیں خصوصاً قصائد اور منقبت میں جو انہوں نے انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل جدا ہے۔ اس میں علم بھی ہے اور ان کی روح کی چیخ بھی۔ ان کے کلام میں ان کا ایک مجتہدانہ انداز ہے اور اس میں بڑا تاثر ہے وہ اپنے رنگ کے خود موجد ہیں اور خود ہی خاتم۔ عرصہ سے دکن میں مقیم ہیں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔

قیوم نظر

یوں تو قیوم نظر صاحب اول سے ذہین اور طباع آدمی ہیں لیکن دیال سنگھ کالج لاہور کے زمانہ میں سید عابد علی اور علامہ تاجور کے فیض صحبت نے ان کے رنگ طبیعت کو اور بھی صقیل کر دیا۔

قیوم نظر کی شاعری میں تخیل کی کارفرمائیوں سے قطع نظر ایک تلاش اور فکر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جس سے ان کی کاوش خیال اور کاوش طبع کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے دور کے شعراء میں وہ ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔

انہوں نے شاعری میں ہیئت کے لحاظ سے کوئی خاص کوشش نہیں کی لیکن قدیم ہیئتوں کے باوصف ان کے یہاں کچھ ایسے نئے اور انوکھے نقوش آ گئے ہیں جو قدیم و جدید انداز شعر اور اظہار حال کے لیے الگ تھلگ ہیں اور یہ بھی انفرادی تخلیق میں آتا ہے۔

قیوم نظر کی زندگی چونکہ تدریس میں زیادہ گزری ہے۔ اس لیے وہ صرف و نحو اور صنائع بدائع سے بھی آگاہ ہیں جن کا جاننا شاعر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے طبع ہو چکے ہیں اور نثر پر بھی کئی کتابیں موجود ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ''قندیل'' میری نظر سے گزرا ہے۔ اس پر اخبارات اور جرائد نے حوصلہ افزا تبصرے کیے ہیں۔

نشور واحدی

کانپور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی نہایت شریف اور محتاط قسم کے انسان ہیں ان دنوں وہ ایک اسکول میں ماسٹر تھے جب بھی ان سے ملاقات ہوئی ہے انہوں نے مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا ہے۔ نشور کے یہاں ہیئت کے تجربے تو نہیں لیکن ان کی غزل سن کر نئی شاعری سننے کو دل نہیں مانتا اور جدید ادب کا تانا بانا بے تار معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ ان کا ترنم بھی بڑا جان لیوا ہے۔ لیکن میں تو اس شاعری کو شاعری کہتا ہوں جو کاغذ پر بولے نشور صاحب کے یہاں غزل ہو یا نظم اس میں الفاظ کا ایک ایسا بہاؤ ہوتا ہے کہ آدمی تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شاعری منجمد نہیں بلکہ وہ وقت کے ساتھ شاعری کو بھی ترقی دیتے ہیں اور نئے نئے رخ شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی عمر کو ان کی شاعری سے ناپنا چاہیں تو غلطی کا امکان نہیں ہوگا۔ ان کے مجموعہ کلام سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پہلے غالب کی

طرح ادق اور مغلق الفاظ کے بیانوں کو جذبات واحساسات کا سانچہ بنایا لیکن وقت کے ساتھ جیسے غالب اغلاق سے اتر کر "نکتہ چیں ہے غم دل" تک آ گئے تھے اسی طرح نشور بھی غزل میں اس روش پر آ گئے جس میں الفاظ کی دھاریں آسانی سے سینوں میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

منصور احمد ندیم

انکا مولد تو جموں ہے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزرا ہے۔ ایک علمی ادبی خاندان کے فرد تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ گھر ہی میں علمی ادبی تربیت ہوئی ہوگی اور انگریزی ان کی ذاتی محنت اور مطالعہ کا نتیجہ تھا اردو اور انگریزی پر منصور صاحب کو اس قدر عبور تھا کہ مشکل سے مشکل انگریزی کا ترجمہ وہ قلم برداشتہ کرتے تھے۔ چنانچہ "دنیا کے بہترین افسانے" ان کے ترجے اور ذوق کو ظاہر کرتی ہے۔ لاہور کے مشہور رسالہ "ہمایوں" کے مدیر بھی رہے مگر پھر علالت کے باعث ہمایوں سے دست بردار ہو گئے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی کے بعد "ادبی دنیا" کی ادارت آپ کے حسن ذوق کی نمائندگی کرتی رہی وہ "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں بھی چھپتے تھے اور لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ندیم منصور کا تخلص ہے۔

وہ اپنی نظموں میں ذاتی جذبات واحساسات نظم کرنے کے عادی تھے چنانچہ ان کے ہاں بیشتر جگہوں پر اس کا اظہار ملتا ہے۔ وہ باقافیہ اور بے قافیہ دونوں صنف میں کہتے تھے۔ منصور صاحب ایسے مہذب، باوقار، محتاط اور کم آمیز انسان تھے کہ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ سے منصور احمد صاحب بے تکلف تھے۔ ان کا مجموعہ کلام غالباً اب تک شائع نہیں ہوا۔ اگر کہیں وہ محفوظ ہے تو اسے ضرور شائع ہونا چاہئے ورنہ ایک ادبی ضیاع ہے۔

نذیر بنارسی

نذیر صاحب سے بنارس ہی میں ملاقات ہوئی یہ حضرت جگر مرادآبادی کے شاگرد ہیں اور مشاعروں میں ان کے ترنم کا جادو بڑے بڑے دھنتر پڑھنے والوں کو ڈھیر کر دیتا ہے۔ ان کی نظموں میں جدید رنگ نہیں بلکہ قدیم انداز سے تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔ جہاں تک فن شعر کا تعلق
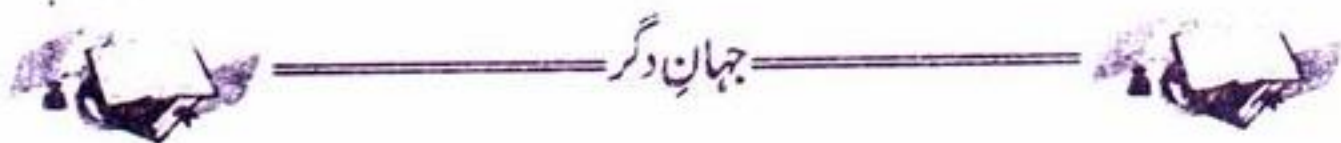
ہے۔ ظاہر ہے حضرتِ جگر تو فن کی پابندی کے قائل تھے اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس گمراہی سے روکتے تھے۔ چنانچہ نذیر صاحب کی غلط روی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مذہب وملت کے محدود دائرے میں نہیں رہتے بلکہ فطرت کے ہر رخ پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں تہواروں کا ذکر بھی ہے اور فطری مناظر بھی عشق کی چاشنی بھی ہے اور غم کی برچھیاں بھی اور نئے لکھنے والوں کی طرح ان میں ابہام کی الجھنیں نہیں ہیں بلکہ ان کے اشعار ہیرے کے ٹکڑوں کی طرف شفاف ہیں ان کا مجموعہ ''گنگ وجمن'' بھی ان کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔ بہت کم شعراء اپنے کلام کو اس خوبصورتی سے چھپوا سکے ہیں۔

نانک چند ناز (ویر بھارت)

جناب ناز ''ویر بھارت'' کے ناخدا تھے مگر نہایت زود گو شاعر تھے۔ اور مشہور صحافی بھی۔ ان کی آئے دن کسی نہ کسی سے چپقلش رہتی تھی اور وہ نظمیں کہتے رہتے تھے۔ اگر چہ ہنگامی نظمیں ہوتی تھیں لیکن ناز صاحب کو شاعروں کی صف سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے ان کا کوئی مجموعہ چھپ چکا ہو میری نظر سے نہیں گزرا میں ایسے ہنگامی شاعری کے مجموعوں کی تلاش میں رہتا ہوں کیونکہ ان میں تحریکات کے آثار اور ادبی ہنگامے نظر آتے ہیں۔

نظم اکبرآبادی

جناب نظم آگرہ کے رہنے والے ہیں اور سلسلہ ملازمت راولپنڈی میں مقیم ہیں یوں تو آگرہ کا ہر شاعر ''مچھلی کے جائے کو تیرنا سکھائے'' کا مصداق ہے لیکن جناب نظم کو شاعری کا ملکہ ورثہ میں ملا ہے اور چونکہ زبان کے نشیب وفراز اور محاورات کے استعمال سے واقف ہیں اس لیے جذبات کے ساتھ روزمرہ اور اصطلاحات کا جادو بھی شامل ہو جاتا ہے تو شعر اور بھی جان لیوا ہو جاتا ہے اور عمر کے ساتھ ان میں تاثر کا اضافہ ہو رہا ہے۔

نثار احمد فاروقی

جناب نثار احمد فاروقی نئے ادیبوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں میں ان سے اس لیے بھی خوش ہوں کہ انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ نثار فاروقی مستقبل قریب میں اردو زبان کے قابل فخر ادیب اور محقق ثابت ہوں گے وہ بڑے مخلص انسان ہیں اور ان کے یہاں اخلاقی اقدار اسی طرح زندہ و تابندہ ہیں وہ لاہور میں اگرچہ رواداری کو آئے تھے لیکن مجھ جیسے گوشہ نشین کو نہیں بھولے ہیں ان کی اس روایت پسندی کی قدر کرتا ہوں۔ نثار احمد کے آثار و قرائن ان کی تصنیفات اور تالیفات میں زیادہ معتبر طریقہ سے نظر آتے ہیں اور ان کی تخلیقات ہر ادیب اور دانشور کی میز پر ملتی ہیں۔

صلاح الدین ندیم

صلاح الدین ندیم نوجوان شاعر ہیں اور بہت ستھری غزل کہتے ہیں قدیم روش سے بچ کر جدید روش میں اعتدال برتتے ہیں اور ان کے کلام کی یہی خوبی انہیں دوسرے شعراء سے اونچا کرتی ہے اب تک ندیم بڑی سلامت روی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اگر ان کا یہ ادبی سفر اسی انہماک سے جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ دنیا ان کے مقام کا تعین ان کی توقع سے زیادہ کرے گی۔ یہ بھی ابھی نوجوان ہیں اور ترقی کے بہت مواقع ان کی توجہ کے منتظر ہیں۔

خدا بخش نازش

خدا بخش نازش صاحب ڈیرہ اسماعیل خاں کے رہنے والے ہیں۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت شروع کر دی نوجوان شخص ہیں اور اصناف سخن میں نظم اور غزل کے علاوہ قطعات بھی کہتے ہیں۔ نازش کو اپنے ماحول کے اعتبار سے اسی فضا کا شاعر رہنا چاہئے تھا لیکن اس کے برخلاف ان کی نظر دیہات اور شہر دونوں کے مختلف پہلوؤں پر پڑتی ہے اور یہ اپنی شاعری میں دونوں کے معاشی رخ پر نشتر زنی کرتے ہیں لیکن چونکہ نئے رنگ کی طرف مائل ہیں اس لیے اشعار کا وار عوام پر پورا نہیں پڑتا کیونکہ ابہام عوام کی چیز نہیں البتہ لکھے پڑھے لوگوں میں یہ حربہ نہایت کار آمد ہے۔ چنانچہ نازش

صاحب بھی ادباء شعراء میں ناقابل فراموش شخصیت ہیں اور ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

رابعہ نہاں

رابعہ نہاں آگرہ کے ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے گھر ہی سے ان کے ذوق شعری پر جلا ہوئی ہے۔

ان کی شاعری میں ان کے دل کی ادارت ہوتی ہے اگر ان کا سارا کلام میرے سامنے ہوتو میں ان کے سوانح مرتب کرسکتا ہوں۔اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے جذبات واحساسات ایسے ہیں کہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر شعر کی صورت میں ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔

ان کے اشعار میں ان کی روح کا کرب اور آواز میں ان کے دل کی ہوک ہوتی ہے۔ان کے یہاں مافی الضمیر کو نہایت سلیقہ اور پردہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ان کے یہاں موجودہ دور کا ابہام نہیں بلکہ اپنے واردات قلبی کو نہایت مہذب طور پر بیان کرتی ہیں اور چونکہ اہل زبان ہیں اس لیے الفاظ، محاورات اور روزمرہ کا برمحل استعمال شعر میں اور بھی قوت پیدا کردیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ رابعہ نہاں کی شاعری میں اردگرد کا ماحول بہت کم ہوتا ہے۔ان کے اشعار میں کسی ایسے زخم کا رساؤ ہے جو خشک ہونے میں نہیں آتا اور کرب ناک نغموں کی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ اگر چہ رابعہ نہاں شاعر نہ ہوتی اور اپنے جذبات واحساسات کو اشعار کی موسیقی میں سمو کر اپنا جی ہلکا نہ کرتی تو اس کی روح میں کوئی ایسا غم ہے جو اسے ہلاکت تک پہنچا سکتا ہے لیکن فطرت ہر تکلیف کا علاج ساتھ دیتی ہے۔رابعہ کی شاعری اس کی روحانی غذا بھی ہے اور قلبی تقویت بھی۔

نظیر لدھیانوی

جناب نظیر لدھیانوی مولانا تاجور مرحوم کے حلقہ تلامذہ سے ہیں انہیں نثر اور نظم پر یکساں قدرت ہے وہ ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی وہ صحافت میں بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ جہاں تک تصنیف وتالیف کا سوال ہے وہ اس میں بھی کسی سے کم نہیں ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے اور ایک تاریخ ادب اردو کے بھی مصنف ہیں اور بھی کئی کتابوں پر ان کا نام دیکھا ہے اور اپنی تحریروں میں محرر خود ہوتا ہے کتاب سے مصنف کو پڑھ لینا کوئی اہم بات نہیں ہے۔

احمد ندیم قاسمی

جناب ندیم ایسے شاعر ہیں کہ اگر چاہیں تو اس جدید ادب کے قافلے کی نمائندگی سے اس کے سفر کی صحیح سمت کا تعین کر سکتے ہیں ان کی زبان اور قلم دونوں قابل ستائش ہیں لوگ انہیں حق گو خیال کر کے سنتے ہیں اور حق نگار سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

یہ اپنے اسلوب نگارش اور انداز بیان میں اپنا رستہ علیحدہ رکھتے ہیں اور نظم ہی نہیں نثر میں بھی وہ منفرد ہیں جہاں وہ ایک باشعور ادیب ہیں وہیں ان کی صحافیانہ خصوصیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے حب الوطنی اور انسان دوستی میں قابل رشک قربانیاں دی ہیں۔ وہ فکر و خیال کے ساتھ عمل کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو شاعری کا دریچہ پیغمبری کے صحن میں کھول دیتی ہے۔

ان کے سینے میں ایک پر خلوص دل ہے اور دل میں ایک سچی آگ جو زندگی کو آگے بڑھانے پر مصر ہے۔ بحیثیت انسان ندیم ہمارے جدید شعراء میں بلند کردار کے حامل ہیں۔ آج جوش، ندیم اور فیض جیسے لوگوں سے ہی شاعری عظیم فن خیال کی جاتی ہے۔

ناصر شہزاد

ناصر شہزاد کی طرح بہت کم لوگ ہیں جو جدید تقاضوں کو سمجھ پائے ہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ جدید روح کو لوگوں نے محسوس تو کیا مگر جب اس کو جسم دینے لگے تو ان کا آرٹ اس کا متحمل نہیں ہو سکا۔ ناصر شہزاد کے یہاں یہ بات نہیں ہے وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اس سے کہیں بہتر انداز کے سانچے بناتے ہیں اور پھر اس میں ہندی الفاظ اور ہندی کا انداز نگارش اسے اور بھی حسین کر دیتا ہے۔ مگر ان کی شاعری کے مطالعہ سے بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کلاسیکی انداز میں ہندی کی شیرینی کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔

ان کی شاعری قاری کو ایسے نرم و نازک لہجوں سے آشنا کرتی ہے جو اردو میں کہیں کہیں بمشکل نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جہاں ہندی الفاظ کی بھرمار ہے وہیں ابہام کی پرچھائیں بھی ہیں لیکن جہاں وہ غزل کہتے ہیں اس میں ان کا ابہام بہت حسین ہو جاتا ہے۔ بعض نئے نوجوانوں کی طرح

قدم قدم پر الجھاوے نہیں ان کے یہاں ٹھیٹھ اور مقامی الفاظ استعمال ہوتے ہیں گویا وہ اپنے ماحول کے لوک گیتوں کو ایک نیا انداز دے رہے ہیں۔

مجھے ان کی ذات سے بڑی امیدیں ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "چاندنی کی پتیاں" چھپ چکا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر شہزاد مستقبل قریب میں اردو ادب میں صحت مند اضافے کریں گے۔

نسیم لیہ

نہایت ذہین اور ذکی انسان ہیں نثر اور نظم دونوں میں یکساں لیکن ان کی نظم نثر سے زیادہ اثر رکھتی ہے اور مشاعروں میں ترنم سے پڑھ کر وہ اس میں اور بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "پیراہن" کے نام سے چھپی ہے جو ان کے محاسن کا آئینہ ہے۔ ابھی ان کا مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا۔

شیخ نذیر احمد

پاکستان کے مزاح نگار شاعروں میں ہیں مگر ان کی شاعری کا ایک خاص انداز ہے جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے۔ ان کے یہاں بڑی احتیاط سے شعر کہا جاتا ہے۔ وہ مزاحیات اور فحشیات میں فرق کرنا جانتے ہیں اور یہ ان کا عجیب وغریب وصف ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "حرف بشاش" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ جس میں وہ اپنے اوصاف سمیت نظر آتے ہیں۔

نہال رضوی لکھنوی

نہال رضوی بھی لکھنؤ کے ناقابل فراموش لوگوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی لکھنؤ کا خاص رنگ اور روزمرہ نظم کرنے کا شعور جھلکتا ہے۔ بڑا سنبھل کے شعر کہتے ہیں اور معمولی مضمون کو رخ دے کر اس میں نئی بات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اسلوب بیان بڑی مشق و مزاولت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ پتہ نہیں ملا کہ ان کی کوئی کتاب بھی شائع ہوئی ہے یا نہیں۔

کشوری لال نسیم کنجاہی

جناب نسیم کنجاہی لاہور میں تھے تو ان سے اکثر بڑی پر لطف ملاقاتیں رہتی تھیں۔ آج کل وہ لکھنؤ سے ایک ہفت روزہ اخبار ''مادر وطن'' نکالتے ہیں اور اس میں ان کے روح و جسم دونوں کی تسکین ہو جاتی ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں اور ان کا انداز بیان الگ ہوتا ہے۔ وہ نہایت زندہ دل اور شوخ مزاج انسان ہیں ان کی غزل میں نغمۂ عجم اور نظم میں سوز ہند!!

محمد حنیف ناچیز

جناب محمد حنیف ناچیز ایک درویش قسم کے انسان تھے۔ قدیم روش اور ہیئت کے اعتبار سے سو برس پہلے کے انسان۔ تہجد گزار اور دائم الصوم شاعر ان کی ایک کتاب ''دم نامہ'' بھی عرصہ ہوا چھپی تھی۔ مشاعروں میں جب لوگ ان کے کلام پر قہقہے لگاتے اور بے ہنگام داد دیتے تو ان کے چہرے پر ہلکا سا تبسم رونما ہوتا جیسے انہیں خوشی ہو رہی ہو۔ اشعار باوزن مگر اس میں دم کا لفظ کہیں نہ کہیں ضرور آتا تھا۔ سنا ہے کہ وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

نصیر کوٹی

جناب نصیر کوٹی تقسیم کے ہنگامے میں وطن ترک کر کے کراچی میں مقیم ہو گئے وہاں وہ کسی اسکول میں معلم ہیں نہایت شریف اور با اخلاق اور منکسر المزاج انسان ہیں اور غزل بڑی اچھی کہتے ہیں قدرت نے انہیں نہایت اعلیٰ درجہ کا حافظہ عطا فرمایا ہے اور اس پر ان کا ذوق مطالعہ انہیں بلندی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر بھی ہے اور رنگینی بھی الفاظ کا جادو بھی ہے اور اشعار میں گہرائی بھی۔

نیر قریشی گنگوہی

جناب نیر قریشی گنگوہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور ان کی ہر شعبہ ادب پر اچھی خاصی نظر ہے شعر بھی کہتے ہیں لیکن جدید روش کی شاعری جو ردیف، قافیہ، وزن اور بحر بے نیاز ہوتی۔ ہے نہیں کرتے بلکہ روائتی شاعری میں نئے مضامین لاتے ہیں یا نئے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک

تذکرہ بھی لکھ رہے ہیں۔ جس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر وہ شاعروں کے حالات جمع کر رہے ہیں۔ ان کا مجموعہ ابھی تک نظر سے نہیں گزرا۔

سید عبدالرب نشتر

سید عبدارب نشتر صاحب حضرت سید احمد شہید کے خاندان سے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تشریف لائے اور پوسٹ ماسٹری سے ریٹائر ہوئے قدیم تہذیب اور روائتی معتقدات کے دلدادہ تھے۔ ۴ جولائی ۱۹۷۶ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

کئی ایک مشاعروں میں ان سے کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ پرانے سکول کے مطابق آپ نظمیں اور غزلیں کہتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے یہاں اسقام کم ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ شروع سے ان لوگوں کی نظر فن پر ہوتی ہے۔

نور سہارنپوری

جناب نور سہارن پوری بھی بڑی کاوش اور خلوص سے شعر کہتے تھے کہ ان کا ہر شعر سہل ممتنع کا نمونہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ عوام میں ان کا کلام مقبول تھا قوالیوں اور میلاد کی مجلسوں میں اکبر میرٹھی کے بعد نور سہارنپوری ہی کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ ان کے دو مجموعے ''باغ کلام نور'' اور ریاض کلام نور کہیں کہیں ملتے ہیں۔

کرپارام شرما ناظم

کرپارام ناظم ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف شخص تھے۔ اور امرتسر میں ہر ادبی مجلس میں ضروری سمجھے جاتے تھے۔ پرانی روش پر بڑا رنگین انداز تھا مگر نہ معلوم تقسیم ملک کے بعد کہاں گئے اور ان کے کلام کا کیا ہوا۔

نفیس خلیلی

امرتسر کے مشہور پڑھنے والوں میں تھے جب وہ مشاعروں میں نظمیں پڑھتے تھے تو ترنم والوں کے چراغ نہ جل سکتے وہ اسٹیج پر ٹہل ٹہل کر حاضرین پر ایسا افسوں کرتے کہ مشاعرہ میں ان کے سوا کوئی

شاعر نہ بچتا مگر ان کی شاعری اداکاری سے ہٹ کر جب کاغذ پر آتی تو اپنا تعارف کسی اور طرح کراتی -ان کے کئی کتابچے چھپے مگر شاید کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپ سکا-

ناظم بھوپالی

جناب ناظم بھوپالی بڑے ٹھاٹھ کا شعر کہتے تھے ان کے یہاں پیمانے تو وہی قدیم تھے لیکن اس کے باوجود ان کے شعر میں ایک بات ہوتی تھی جو عوام سے بہت ہٹ کر ہوتی تھی- وہ اپنے ہم عصروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے تقسیم ملک کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی سیاسیات نے ایسی دیواریں کھینچ دیں کہ علم وادب میں بھی پھاٹک لگ گئے-

نخشب جارچوی

جناب نخشب میرٹھ کے رہنے والے تھے اور فلم سازی میں بھی انہوں نے شہرت پائی تھی جب کہ انہیں میں نے مشاعروں میں سنا وہ اپنے اشعار کو ترنم سے پڑھتے تھے جس سے اشعار میں حسن آجاتا تھا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ ایسے شعبہ سے متعلق تھے کہ انہیں شاعری میں بلند پردازی کی ضرورت تھی لیکن فلم کی ادبی زندگی پر دھندسی چھا گئی جہاں تک دولت کا تعلق ہے وہ ممکن ہے نخشب صاحب نے بہت کمائی ہو لیکن انہوں نے تاریخ کو نظر انداز کر دیا تھا- افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور ۱۹۶۷ء اگست کے آخر میں بڑی مختصری علالت میں راہی عدم ہو گئے-

ابوظفر نازش رضوی

جناب نازش مولانا تاجور مرحوم کے شاگرد ہیں اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے- جو غالباً فارسی ہے اردو کلام کا بھی ایک مجموعہ چھپا تھا جو غالباً غزلیات کا نہیں بلکہ مناقب اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے لیکن ان کی ان مطبوعات میں بھی نازش اپنا معیار بتانے سے نہیں چوکتے ان کا انداز بیان اور شوخی قلم ان کے اصل اوصاف کو اجاگر کر دیتی ہے-

خواجہ نذیر احمد

اسلامیہ کالج میں فارسی کے استاد تھے اب کہیں باہر چلے گئے ہیں وہ شعروشاعری بھی کرتے تھے اور مضمون نگاری بھی اب دیکھئے دوسرے ملک میں جاکران کا یہ ذوق زندہ رہتا ہے یانہیں یہاں تو ہم ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ اردو زبان کی ترویج میں منہمک رہے تھے۔ حالانکہ وہ فارسی کے استاد تھے۔

نذیر قیصر

نوجوان شاعر ہے مگر نوجوانوں میں بہت سنبھل کر شعر کہتا ہے۔ اگرچہ اس میں علم کی کمی جگہ جگہ انکاوے ڈالتی ہے۔ لیکن اگر اس نے مطالعہ بڑھالیا تو یہ خامی بھی دور ہو جائے گی۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اگر ایسے ذہین اور طباع انسان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اس کے جوہر ذاتی ادب کو اضافوں سے خالی نہیں چھوڑتے ان میں ادب کے پردار جراثیم ہیں اگر ماحول کی سرخ شفق سے متاثر نہ ہوئے اور اسی طرح لکھتے رہے تو ان کا مستقبل انہیں تاریخ میں داخل کردے گا۔

نزہت اکرم

نزہت اکرم جناب جدت میرٹھی مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ شعروادب کا ذوق ان کا خاندانی ورثہ میں اضافہ ہے۔ وہ فن شعروادب پر ناقدانہ عبور رکھتی ہیں اور صحافت میں بھی اپنے معاصرین میں کسی طرح کم نہیں وہ اہل زبان ہیں اور اردو ان کے گھر کی چیز ہے۔ خدا کرے کوئی قابل ذکر کام کر جائیں۔

اصغر نثار قریشی

جناب اصغر نثار ریلوے میں ملازم ہیں اور بہت دنوں سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں غزل اور نظم دونوں سلیقے کی ہوتی ہیں اور ویسے بھی اردو کی ترویج واشاعت میں ہمہ وقت منہمک رہتے ہیں۔ چونکہ یہ انگریزی ادب سے بھی واقف ہیں اس لیے ان کے یہاں وہ گل وبلبل کی شاعری نہیں

بلکہ زندگی کے گرد و پیش پر نظر رکھتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے نشیب ان کے کلام میں ابھر ابھر کر اصلاح چاہتے ہیں انگریزی سے اردو ترجمے میں بھی انہیں خاص ملکہ ہے اور الفاظ کے استعمال کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

نظر زیدی

جناب نظر زیدی نے زندگی ادب کی خدمت میں گزاری ہے مولانا تاجور کے تلامذہ سے ہیں نثر اور نظم دونوں پر یکساں عبور ہے۔ ادیب اور صحافی بیک وقت بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن جناب نظر میں یہ دونوں وصف ہیں ان کی غزلیں قدیم روش پر ہوتی ہیں اور فن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ باقاعدہ کہنے والوں میں جناب نظر اپنا مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر ادبی اداروں میں کام کیا ہے اور نہ جانے کتنے اخبار اور رسالے ان کے رشتہ قلم سے منسلک ہو کر کامیاب ہوتے ہیں۔ کم آمیز اور کم گو ہیں لیکن بلند فکر اور تہذیب یافتہ انسان ہیں اور یہ عادات و خصلات ہیں جناب تاجور نجیب آبادی کی تربیت سے۔

آپ کی کئی کتابیں تو چھپ چکی ہیں اور جو تجارتی اداروں میں رہ کر دوسروں کے نام سے چھپی ہیں۔ انہیں کون گنے اور کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔ لیکن کوئی وقت آئے گا کہ تحریریں اپنے لکھنے والوں کے نام بتائیں گی مگر ذرا دیر لگے گی۔

نظیر کھاتولوی

جناب نظیر قصبہ کھاتولوی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے تبادلہ آبادی میں لاہور آ کر رہ پڑے نہایت پختہ مشق اور نغز گو شاعر ہیں زندگی کی مزدورانہ مصروفیات اس قدر ہیں کہ ادبی ہنگاموں میں حصہ نہیں لے سکتے مگر جہاں تک شعر کا تعلق ہے۔ بڑا مضبوط شعر کہتے ہیں اور چونکہ کہنہ مشق ہے اس لیے شاگردوں کی اصلاحیں بھی انہیں ادھر ادھر جانے سے باز رکھتی ہیں۔ وہ زود گو بھی ہیں اور الفاظ کی نشست اور موسیقی کا خیال بھی رکھتے ہیں مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا۔

نثار اکبر آبادی

نثار اکبر آبادی نوجوان شاعر ہیں آگرہ میں یوں بھی شعروادب کا چرچا رہتا ہے اس لیے ان کا شاعر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں نثار غزل اور نظم دونوں پر قادر ہیں اور اپنے دور کے سیکڑوں شاعروں میں کامیاب ہیں سرکاری ملازم ہونے کے باعث ادبی ہنگاموں میں حصہ نہیں لے سکتے اس لیے انہیں کھوکھلے پروپیگنڈے سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ ان کے جوہر نجی نشستوں میں کھلتے ہیں۔

نعیم ہاشمی

نعیم ہاشمی اچھے سلجھے ہوئے ذوق کے انسان ہیں بہت اچھی غزل کہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ انہیں گیت لکھنے کا ملکہ بھی ہے۔ یہی گیت نگاری انہیں فلم میں لے گئی اور وہاں وہ اچھی پوزیشن میں ہیں مگر اردو سے ایک اچھا غزل گو نوجوان چھن گیا اس میں شک نہیں کہ گیت بھی ایک صنف ادب ہے۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ ریڈیو اور فلم کے اداروں میں جاکر ادبی ذوق کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ خدا کرے نعیم قریشی فطرت کے عطیہ کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور اپنے ادبی ذوق سے روگرداں نہ ہوں۔

نصرت قریشی

جناب نصرت قریشی سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور پختہ مشق شاعر ہیں قدیم انداز پر ردیف و قافیہ اور اوزان و بحور کے اصولوں پر شعر کہتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں پر داد و تحسین ملتی ہے وہ وقت کے تقاضوں اور سیاست کے جوار بھاٹا سے بھی بخوبی واقف ہیں اور اکثر اشعار میں اب وہ انہیں سیاسی تصورات کے سائے میں رہتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن و معاملات بھی کم نہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ جوانی کے جن سے نجات پاکر اب صحیح شاعری کی طرف آرہے ہیں ان کے مندرجہ ذیل مجموعے چھپ چکے ہیں۔

۱۔ رموز دل ۲۔ سوز و سرور ۳۔ شکست خاطر ۴۔ ظرف غزل

مگر آئندہ ان کا کلام چھپ کر کچھ لائے گا۔

نریش کمار پرشاد

جناب نریش کمار پرشاد لاہور سے جب گئے تو وہ زیر تعمیر عمر میں تھے اگر چہ ان کی شاعری لاہور میں آنکھ کھول چکی تھی مگر اس کے خدوخال دہلی میں سنورے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر شباب آیا اب وہ اس مقام کے شاعر ہیں کہ تاریخ ادب انہیں محو نہیں کر سکتی وہ اپنے معاصرین میں ایک خاص مقام کے مالک ہیں- ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں- جن میں وہ اپنے لاابالی انداز حیات سمیت پڑھے جاسکتے ہیں-

ایوب شاہد نسیم

جناب ایوب شاہد نسیم جناب مولانا تاجور نجیب آبادی کے عزیز بھی ہیں اور شاگرد بھی- یہ مولانا کی زندگی ہی میں شاعر ہو گئے تھے اور مشاعروں میں انہوں نے اپنا مقام پیدا کر لیا تھا- لیکن معاشی مصروفیات نے ادبی ماحول سے دور رکھا اب وہ ایک اچھی اور بڑی دکان کے مالک ہیں اور ان کے بچے سب برسر روزگار ہیں انہیں ادبی ہنگاموں سے بچنا لازم نہیں لیکن وہ اب بھی مشاعروں سے دامن بچاتے ہیں- اس میں شک نہیں کہ ادبی پارٹی بندیاں ریڈیو تک پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور بہت مستحق شعراء کو نظر انداز کیا ہوا ہے- لیکن اپنی آواز اور شاعری کے لحاظ سے ایوب نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں یہ ایک ادبی خسارہ ہے-

نیساں اکبر آبادی

جناب نیساں اکبر آبادی راولپنڈی مقیم ہیں شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں پایا ہے- اصناف ادب میں انہیں حیرت انگیز معلومات ہیں اور غزل بڑی کاوش سے کہتے ہیں- مشاعروں میں ان کی غزلیں کامیاب اور داد و تحسین سے مالا مال ہوتی ہیں ہر چند کہ وہ قدیم روش کے شاعر ہیں لیکن ان کی قدامت میں جدید رنگ بھی بڑی خوبصورتی سے اپنا جلوہ دکھاتا ہے- لیکن اب تک کوئی مجموعہ نہیں دیکھا-

ناصر کاظمی

ناصر کے انداز حیات میں ایک ایسی جاذبیت اور کشش پائی جاتی ہے کہ بعض اوقات سوچنے سے اس کے ڈانڈے سحر و افسوں سے جا ملتے ہیں۔ احساس عشق ہو یا درد حیات اس میں وہ بلند پرواز نہیں ہیں بلکہ اپنے قرب و جوار کی پھیلی ہوئی فضا کو اپنے درد و غم میں شریک کر لیتے ہیں اور یہ سادگی ان کی غزل میں پرکاری بن کر رہ گئی ہے۔

ناصر کاظمی شاعر ہیں اور شاعر بھی جدید خیال و عمل کے اس لیے ابھی بہت سی بلندیاں ان کی منتظر ہیں اور اگر ان کی آزادہ روی اور لاابالی طبیعت نے انہیں گمراہ نہ کر دیا تو اپنے دور کے بلند پایہ شعراء میں جگہ پائیں گے ان کے کلام کا مجموعہ ''برگ نے'' ان کے امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ جو مستقبل کے لیے چراغ راہ ہیں۔

اصغر نثار

اصغر نثار صاحب دہلی یونیورسٹی میں تھے۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور میں آئے جب دہلی میں تھے اس وقت غزل اور نظم میں اچھی خاصی مہارت تھی۔ یہاں لاہور میں آ کر بھی یونیورسٹی ہی میں نوکر ہوئے اور آج کل وائس چانسلر کے پی اے ہیں۔ لیکن اب مصروف کار ہونے کے باعث ادب و شعر کے شعبے میں رہتے ہوئے ادب آشنائی سے منکر ہیں اس وقت کی کہی ہوئی نہ جانے کتنی غزلیں نظمیں ان کے پاس ہوں گی۔

کشور ناہید

کشور ناہید ایم اے ہیں اور ادبی ذوق نہایت سلجھا ہوا ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر ان کا احاطہ ہے۔ ریڈیو اور دیگر مشاعروں میں بھی ان کا کلام داد و تحسین لیتا ہے۔ آج کل بسلسلہ ملازمت کسی سرکاری ادارہ سے منسلک ہیں جہاں تک ہوتا ہے سوچ سمجھ کر شعر کہتی ہیں اور ترنم کی طرف سے بھی مار نہیں کھاتیں غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں ہیں۔

نظر امروہوی

جناب نظر امروہوی بڑے پرانے کہنے والے ہیں اور آج تک ان کا وہی انداز ہے کمال ہے کہ ان کا گلا ان کی عمر سے بڑی وفاداری کر رہا ہے۔ لیکن وہ صرف آواز کے بل پر نہیں بلکہ ان کے یہاں چونکا دینے والے اشعار بھی بکثرت موجود ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں بہت سے شاعروں سے بلند کہتے ہیں اور قریب قریب ہر مشاعرے میں ملتے ہیں یا شرکت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر بھی ہے اور گہرائی بھی' الفاظ کا دروبست بھی ہے اور نغمہ کی جھنکار بھی۔ لیکن ابھی تک کوئی مجموعہ نہیں چھپوا سکے۔

نازش کاشمیری

جناب نازش نوجوان شاعر ہیں اور نوجوان شعر کہتے ہیں یہ شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی ادیب بھی اور سیاسی کارکن بھی ان کا رنگ شاعری قدیم وجدید کے ساحلوں میں سفر کرتا ہے اور اس میں موجیں بھی ہیں گرداب بھی' ٹھنڈک بھی ہے اور روانی بھی اور کشتیوں کو ڈبو دینے والے طوفان بھی کے آثار بھی۔ ابھی کوئی مجموعہ تخلیق نہیں ہوا۔

نصرت کرنپوری

محمد نصیر الدین نصرت کرنپوری کرن پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ میں ان کو ہندوستان کے مشاعروں میں بھی سنتا رہا ہوں وہ بڑے مشاق اور کہنہ مشق شاعر تھے ان کے یہاں الفاظ کا دروبست اور غزل کے ہر شعر میں چونکا دینے والا تنوع تھا۔ تقسیم کے وقت پاکستان آ گئے تھے اور کھارو شاہ ضلع نواب شاہ میں وفات پائی۔

ناز مظفر نگری

جناب ناز مظفر نگری کو کراچی اور سندھ کے کئی مشاعروں میں سنا وہ نظم اور غزل دونوں میں رواں ہیں ہر چند کہ وہ قدیم رنگ میں کہتے ہیں لیکن ان کے کلام سے ان کی مشق و مہارت نمایاں ہے۔ نظموں میں تسلسل برقرار رہتا ہے اور تصورات پھیل کر نہیں چلتے وہ عنوان سے قریب قریب ہی

رہتے ہیں ابھی کوئی مجموعہ نہیں ہے۔

ظہور نظر

بہاولپور میں متعدد بار نظر کو سننے کا اتفاق ہوا۔ اور بے خود و خوددار دونوں طبقوں میں انہیں دیکھا اور وقت کے مطابق پایا۔ یہ غزل اور نظم دونوں برابر کی کہتے ہیں۔ یار باش قسم کے انسان ہیں جسمانی اور روحانی دونوں رخ قدیم ڈگر سے جدا اور جدید سے قریب ہیں اسلوب بیان خوب اور تصور و تخیل بالکل اقتضائے وقت کا آئینہ ہے۔ خوش ذوق اور خوش باش ان سے بڑھ کر شاید بہاول پور میں کوئی نکلے۔ ان کی خوش گوئی انؔ کی زندگی کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اور یہ شاعری ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید زندگی میں اور کوئی شعبہ ان کے بس کا نہیں۔

ناصر زیدی

ناصر زیدی نوجوان شعراء میں ہیں اور علمی ادبی ذوق میں ہمہ وقت منہمک پائے جاتے ہیں وہ نثر بھی لکھتے ہیں اور نظم بھی کہتے ہیں۔ ان کی جوانی ان کے مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ اگر انہیں موقع ملا اور زمانے نے زنجیریں نہ ڈال دیں تو کسی وقت نام پیدا کریں گے۔

سرداری نشتر میرٹھی

میرٹھ کے مشاعروں میں کئی باران سے ملاقات ہوئی وہ قدیم روش کے دلدادہ تھے۔ اور اپنے درد کے لحاظ سے اچھا کہتے تھے۔ ان کے یہاں کلام میں الجھنیں نہیں تھیں اور نہ وہ شعر کو بجھاوت بناتے تھے۔ بلکہ سیدھے سادے انداز میں شعر کہتے تھے۔ جسے ہم سہل ممتنع بھی کہہ سکتے ہیں۔ نہایت نیک اور خلیق انسان تھے اور ہر شخص سے جھک کے ملنا ان کے شعار میں داخل تھا تقسیم کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا حال ہے اور ان کی شاعری اب کس رنگ میں ہے۔

ناز انصاری سہارنپور

ناز صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی ان دنوں وہ دو اخباروں میں کام کر رہے تھے زبان و قلم کے دھنی ہیں اور ادب و سیاست پر قابل رشک مطالعہ رکھتے ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں غیر معمولی

رفتار ہے اور اس وجہ سے عوام و خواص میں مقبول ہیں۔

نجمی نگینوی

نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں اور اصفہانی چائے کے ادارہ میں کسی خاص اسامی پر ہیں انہیں بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔لیکن ملازمت کی مصروفیت نے وہ انہماک چھین لیا ان کے کلام کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔لیکن ان میں وہ پہلی بات نہیں شاید پہلا مجموعہ ہی ان کے اسی موسم جنوں کی یادگار ہے۔ جدید رنگ سے وہ قطعاً دور ہیں شاید اس دور کے ادب کا ساتھ نہیں دے سکے۔

وحیدہ نسیم

وحیدہ نسیم صاحبہ کراچی میں سائنس کی پروفیسر ہیں مگر ان کے ذوق ادب کی بلندی سے سائنس کے مرغزار کا اندازہ گھناؤنا اور دشوار ہے۔انہوں نے سائنس کے شعبہ کی مصروفیات کے باوصف اپنے شعری ذوق کو جس طرح محفوظ اور سرسبز رکھا ہے۔وہ صرف انہیں کا کام ہے۔ وحیدہ نسیم صاحبہ ایک زندہ ذوق، زندہ دماغ اور زندہ احساس خاتون ہیں۔وحیدہ نسیم ہی ایک ایسی شاعرہ ہے جس کی شعر گوئی پر شبہ نہیں ہوتا۔ان کے اشعار اور خصوصاً غزل میں ان کی زندگی کے مختلف پہلو بولتے ہیں اور ان کی نظموں میں ملک و قوم کا درد ابھرتا دکھائی دیتا ہے ان کا شعر اور ادب دونوں ان کی ذات کو محترم بناتے ہیں۔

ظہور ناظم

بڑا ذہین اور فطین نوجوان ہے۔اور سراپا فنون لطیفہ کا دیوانہ جہاں وہ اچھا شاعر ہے وہیں وہ اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی ہے۔نظمیں اور غزلیں دونوں اس کے میدان ہیں۔ اور دونوں میں اس کی طبیعت کی احتیاط اور احتیاط میں فنکارانہ اظہار بولتا ہے۔اگر شکم پروری اور بدن پوشی کی گرفتیں سخت نہ ہو گئیں اور ماحول سازگار مل گیا تو بہت اچھا شاعر نکلے گا۔

نذیر احمد رضوی

این اے رضوی صاحب پولیس کے ایک ذمہ دار افسر ہیں اردو تحریر و تقریر میں انہیں قابل رشک مہارت ہے اور اگر یہ چاہیں تو پاکستان کی صحیح تاریخ لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد رضوی صاحب شعر بھی کہتے ہیں۔ اور ان کی کئی نظمیں میری نظر سے گزری ہیں وہ اپنے سینے میں شاعر کا دل رکھتے ہیں اور واقعات سے بہت جلد تاثر لیتے ہیں میں نے ان کی نظمیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ یہ اپنا شعری ذخیرہ بھی چھوڑنا چاہتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں علاوہ ازیں ان کے نثری کام کے نمونے بھی اچھے خاصے ہیں اور انگریزی میں بھی انہیں حیرت انگیز عبور ہے۔

نیاز احمد مرحوم

نیاز احمد مرحوم میرے نہایت اچھے دوستوں میں تھے۔ انہوں نے فطرت کی طرف سے ایسا ستھرا مذاق پایا کہ گھنٹوں وہ مختلف شعراء کے منتخب اشعار سناتے رہتے تھے۔ اور ہر موقع پر ان کا دماغ موزوں و مناسب شعر دیتا تھا۔ ایک دفعہ ارادہ کیا کہ دو چار روز ان کی معیت میں رہ کر ان کے حافظے کے ذخیرے کو کاغذ پر منتقل کر لیا جائے لیکن ان کی مصروفیت نے یہ کام انجام کو نہ پہنچنے دیا اور اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نیاز احمد بڑی خوبیوں کے آدمی تھے ایک بار آپس میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی اور میں نے انہیں لکھا کہ آپ کی کمشنری کی میری نظر میں کوئی قیمت نہیں میں تو صرف نیاز احمد کو جانتا ہوں اور اگر نیاز احمد وہی ہے جو گزشتہ ملاقات میں تھے تو میں اپنی حماقتیں اور بدنصیبی پر افسوس کرتا ہوں اب سے میرا کوئی خط آپ کو نہیں ملے گا وہ خط وصول کر کے پی گئے اور جب لاہور آئے بیگم سمیت گھر پر معافی مانگنے آئے ان کا یہ اخلاق اور احسان شناسی زندگی بھر یاد رہے گی۔

نصرت (سی ایس پی)

جناب نصرت یوں تو سی ایس پی افسر ہیں لیکن جہاں تک اردو علم کے مقام کو سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں ادبی لوگوں کی قدر و قیمت کو جانچنے پرکھنے میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ سنا ہے کہ آج کل کہیں پبلک سروس کمیشن میں ہیں اگر یہ درست ہے تو میں ان کے انتخاب کرنے والے کو لائق تحسین خیال

کرتا ہوں اوران سے کسی عظیم تخلیق کی امید رکھوں تو بے جا نہ ہوگا- آخر تمام باغوں کے پھول کھاد کی منزلوں سے گزر کر ہی رنگ و بو کا اظہار کرتے ہیں-

مہیش حیدر نقش

جناب نقش ایک نوجوان شاعر اور وسیع المشرب انسان ہیں-شعروشاعری ان کا فطری ذوق ہے ان کا مجموعہ کلام ''خرام'' کے نام سے چھپ چکا ہے جس میں وہ اپنی تمام روحانی بلندیوں اور جسمانی مزاولتوں سمیت جلوہ گر نظر آتے ہیں- ان کے یہاں شاعری شرافت کے پرچار کا نام ہے اور وہ اس نئے دور کے نئے اہل قلم کی طرح اخلاقیات سے دست بردار نہیں ہوئے- ان کی شاعری میں پاکیزگی اور شرافت ایک حسن ہے اور لازوال حسن! مستقبل میں ہمیں ''نقش'' سے بہت امیدیں ہیں-

پروفیسر اللہ دتا نسیم

نہایت پختہ مشق شاعر اور اعلیٰ درجے کے نثر نگار ہیں- زندگی بھر ادبی اور علمی سوسائٹیاں دیکھی برتی ہیں اور طالب علموں کو ادب پڑھایا ہے اس لیے ان کی معلومات سیکڑوں ادیبوں سے بہتر ہے- ان کے کئی قابل قدر اور طویل مضمون میری نظر سے گزرے ہیں جو کتابی صورت میں آ کر ادب میں اضافہ کا باعث ہوں گے آج کل ساہیوال میں لیکچرار ہیں اور سنا ہے کہ تصوف کے کسی خاص رخ پر تحقیق کر رہے ہیں-

نورالصباح بیگم

نورالصباح بیگم کا وطن ریاست شیر پور ہاؤس کے نام سے مشہور ہے- نورالصباح بیگم ناول بھی لکھتی ہیں اور افسانہ بھی نظمیں بھی کہتی ہیں اور غزلیں بھی- زبان کے اعتبار سے ان کی تحریریں قابل قدر ہوتی ہیں- ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ان کے مجموعہ کلام کے متعلق اخبارات اور جرائد نے نہایت اچھے تبصرے کیے ہیں- نورالصباح بیگم اگر زنانہ لٹریچر پیدا کریں اور بچوں کے لیے کتابیں لکھیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی- کیونکہ ہمیں اپنے بچوں کو اردو سکھانے کے لیے بازار میں اچھی

کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں-

سعیدہ ناز

سعیدہ ناز صاحبہ جناب سید محمد مرتضٰی ادیب نگینوی مرحوم کی صاحبزادی ہیں- ظاہر ہے کہ ناز صاحبہ کو والد کی طرف سے ورثہ میں ادب کا ذوق ملا ہے- ان کے والد ادیب صاحب نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور شعروادب میں نمایاں ہستی تھے- سعیدہ ناز صاحبہ بھی غزل' مرثیہ' قطعہ اور واقعاتی نظمیں کہتی ہیں اور اچھا خاصا ذخیرہ ہو چکا ہے- لیکن ابھی زیورطبع سے آراستہ نہیں ان کا کہنا ہے کہ تین جلدوں کا مواد ہے- میں نے ناز صاحبہ کی غزلیں سنی ہیں وہ کلام تربیت یافتہ کلام ہے اور ہرگز نظرانداز کردینے کے قابل نہیں-

مرزا ناصر احمد

مرزا ناصر صاحب جب لاہور میں کالج کے پرنسپل تھے ان سے ملاقات ہو جاتی تھی- لیکن جب سے وہ ربوہ گئے ہیں صرف ایک دو بار ملاقات ہوئی - وہ نہایت خوش تدبیر لوگوں میں سے ہیں- ان کی اخلاقی بلندی سے ان کی زبان میں بھی تاثیر آ گئی ہے- انہیں مخالف پر کبھی غصہ نہیں آتا اور ان کا عوام سے برتاؤ تبلیغ کے راستوں سے جاملتا ہے- انہوں نے ربوہ کی لائبریری میں بڑی نادر ونایاب کتب کا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے- جوآئندہ نسلوں تک کام دے گا-

ان کی ادبی اور شعری تصانیف میں سے میری نظر سے کوئی نہیں گزری- شاید ان کی جماعتی مصروفیات بڑھ گئی ہیں اور اب تو وہ خلیفہ ہیں ان کا تسخیر قلوب کا عمل اب تو معراج پر ہو گا--

خواجہ ناظم الدین مرحوم

خواجہ صاحب ملک اور قوم کے سچے خیرخواہ اور اہل علم کے قدردان تھے میں ان سے کئی بار ملا ہوں- ان میں وہی قدیم بزرگوں کی شرافت اور رکھ رکھاؤ موجود تھا- وہ قومی خدمت کرنے والے لوگوں کی قدر کرتے تھے اور سیاست میں ان کے دم سے خلوص باقی تھا- ان کا ذوق ادب زندہ تھا اور وہ شعر کی برمحل داد دیتے تھے اور جھوم جھوم کر لطف اٹھاتے تھے- ان کی موت جہاں قوم اور ملک کے

لیے نقصان ہے وہاں اہل ادب کے لیے بھی تاریخی خسارہ ہے۔

مولانا نیاز

نیاز صاحب سے شبلی کالج کے مشاعرہ میں ملاقات ہوئی اور میں نے انہیں پرخلوص اور پاکیزہ خیال انسان پایا۔ یوں تو دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ہر رکن اپنی جگہ ایک جاندار شخصیت ہے۔ لیکن

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''

والی بات ہے نیاز صاحب علم و ادب کے اعتبار سے بڑی معیاری قابلیت کے انسان ہیں اور ...یں کہ مجھے اپنی معلومات سے آگے کی باتیں ملیں ہر تعلیمی ادارہ میں ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے۔

وزیرالحسن عابدی

عابدی صاحب اورینٹل کالج میں فارسی کے استاد ہیں اور ان کی فارسی دانی کو بڑے بڑے اساتذ تسلیم کرتے ہیں۔ میرا کتب خانہ دکھانے کے لیے وہ دو تین بار اپنے ایرانی دوستوں اور مہمانوں کو لائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ جن کی مادری زبان فارسی ہے اور نئے نئے لہجوں سے گفتگو کرتے ہیں وہ بھی عابدی صاحب کو استاد کا مقام دیتے ہیں۔ اہل لاہور کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں اورینٹل کالج میں وزیرالحسن عابدی جیسا فاضل میسر ہے۔

میلارام وفا

جناب وفا مولانا تاجور کے دوستوں میں ہیں اور ادب اردو میں ہر صنف پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں یکساں قدرت کے ساتھ کہتے ہیں۔ نثر میں بچوں کے لٹریچر میں بہت کم لوگ ان کے پائے کو پہنچتے ہیں۔ وہ نہایت اچھے صحافی اور بلند مقام ادیب ہیں۔ ان کی شاعری اصول وقواعد کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے اور عیوب وابتذال سے معرا۔ ان کا ایک چند ورق کا انتخاب میری نظر سے گزرا تھا۔ نہ جانے ان کے عمر کے شعری سرمایہ کا کوئی مجموعہ چھپا ہے یا نہیں اگر نہیں چھپا تو بڑے خسارے کی بات ہے۔

وحید قریشی

جناب وحید قریشی ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ اورینٹل کالج میں پروفیسر ہیں۔ اصناف شعر میں وہ نظم اور غزل دونوں پر عبور رکھتے ہیں اور خصوصاً ان کی غزل بڑے تیور لیے ہوئے ہوتی ہے۔ فارسی پر عبور کے باوجود وہ اپنی شاعری میں مغلق الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ عام فہم مگر جدید غزل کہتے ہیں۔ تنقید و تحقیق میں ان کا مقام کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان کی تصانیف ان کی مشق و مزاولت اور دقت نظر کی شاہد ہیں۔ میرے خیال سے تو جناب وحید قریشی کا وجود اردو کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔

وحشت کلکتوی

میں ۳۴ء میں کلکتہ جب ایک ہفت روزہ اخبار خادم کی ادارت کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے جناب وحشت کلکتوی سے شرف نیاز ہوا ان دنوں جناب جمیل مظہری بھی کلکتہ ہی میں تھے اور اختر حسین رائے پوری بھی جمیل مظہری چونکہ وحشت صاحب کے شاگرد تھے۔ اسی لیے ان کے ساتھ کئی نشستوں میں شامل ہوا۔ وحشت صاحب کے یہاں بھی خلوص اور محبت کا وہی حال تھا جو باکمال لوگوں میں ہوا کرتا ہے۔ میں نے تو یہ اندازہ لگایا کہ کلکتہ جیسے غدار شہر میں حضرت وحشت کی جو قدر و منزلت تھی وہ کسی بادشاہ کو بھی مشکل سے حاصل ہوئی ہوگی۔ وحشت صاحب جناب عبدالغفور نساخ کے فرزند ابو القاسم محمد شمس مرحوم شاگرد داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔

ملک کے بڑے اساتذہ اور علماء وفضلا حضرت وحشت کے مداحوں میں تھے اور جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اپنے رنگ کے خود ہی مالک تھے۔ انداز بیان صاف ستھرا اور سلجھا ہوا لیکن تخیل اور تصور میں غالب کا رنگ لیے ہوئے۔

اردو زبان کی خدمت جناب وحشت نے بھی اپنی بساط سے زیادہ کی ہے۔ ان کی پوری زندگی علمی ادبی سرگرمیوں میں گزری اور اس میں وہ اردو کی ترویج و اشاعت کے خیال کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ الفاظ کا برمحل استعمال اور حسین حسین تراکیب وحشت کی شاعری اور صنف شاعری کے

نمونے ہیں۔

حافظ ولایت اللہ

سی پی کے رہنے والے تھے شملہ کے مشاعروں میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہی ہیں وہ اکبر کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کے یہاں پست مذاقی 'ابتذال اور چھچھورے مضامین کو دخل نہیں تھا۔ وہ نہایت متین اور سنجیدہ شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں بالکل اکبرالہ آبادی کے کلام کا لطف آتا تھا اور میل ملاقات میں بھی وہ انسان کو دیکھ کر خوب خوب رنگین باتیں کرتے تھے سنا ہے کہ ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا تھا میری نظر سے نہیں گزرا۔

وقار انبالوی

ناظم علی وقار قصبہ ملانہ ضلع انبالہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو وہی قصباتی فضا کی زبان اور محاورات کا استعمال ملے گا جو قدیم اردو میں چلا آتا ہے۔ ان کی زبان میں سلجھاؤ ان کی سوتیلی والدہ ہی کی دین ہے۔ اور ذوق شعری آبائی ورثہ ہے۔ وقار صاحب پاکستان بننے سے پہلے بھی غیر منقسم ہندوستان کے صحافت نگاروں میں مشہور تھے اور شعراء میں بھی انہیں بلند مقام حاصل تھا کیونکہ ان کے یہاں پر گوئی ایسی ہے کہ بدیہہ گوئی کی صف میں آجاتی ہے۔ پاکستان کے بعد چونکہ علمی ادبی حلقے پہلے سے جانتے تھے اور اس ماحول میں وہی قدآور ادیب و شاعر تھے۔ اس لیے ہر جگہ عزت و افتخار کی نظر سے دیکھے گئے آج ملک کا ہر وہ ادارہ اور طبقہ جو صحافت یا سیاست سے ذرا بھی لگاؤ رکھتا ہے میں وہ وقار افتخار کی نظر سے دیکھے گئے آج ملک کا ہر وہ ادارہ اور طبقہ جو صحافت یا سیاست سے ذرا بھی مس رکھتا ہے وہ وقار انبالوی کے قلم کی ساحرانہ قوتوں سے نا آشنا نہیں۔ پاکستان کا کوئی اخبار اور رسالہ ایسا نہیں ہے جس میں وقار کے نام سے کوئی وقیع مضمون یا نظم نہ چھپی ہو۔

وقار انبالوی نے زیادہ تر اپنے احساس و جذبات کو نظم کی صورت میں کہا ہے اور وہ ایسے موثر ہیں کہ غزلیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کے یہاں ہنگامی شاعری زیادہ ہے لیکن تاریخ تمدن اور رواداراتہذیب کے لیے ہنگامی لٹریچر سے زیادہ کارآمد کوئی لٹریچر یا شہادت نہیں ہوسکتی۔

وقار کے دو مجموعے ''زبان حال'' اور ''بیان حال'' میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ تاریخ کے لیے ہنگامی شاعری بھی نہایت ضروری ہے۔

وقار کی تحریروں میں ایک قسم کا طنز بھی پایا جاتا ہے۔ جو ساحلوں میں رہ کر بھی وسعتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ اپنے انداز بیان کا پہلو نکالتے نکالتے ظرافت سے نیچے کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔ اس سے ان کا وہ مقام دور ہو جاتا ہے جس سے وقار انبالوی وقار انبالوی ہیں۔

وزیر آغا

جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے طنز و مزاح میں پی ایچ ڈی کیا ہے لیکن شاید مزاح نگاری پر لکھنے کے باوجود وہ مذاحیہ انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو ادب و تنقید پر بڑے سنجیدہ مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی ان کے دیگر مضامین سے کم نہیں ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر نقاد شاعر نہ ہو تو وہ شاعری کے رموز و غوامض کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جو نقاد جتنا شاعر ہے وہ اسی قدر کی تفہیم میں دخل رکھتا ہے۔ جو غیر شاعر نقاد شاعری پر نقد کرتے ہیں۔ ان کا نقید و تبصرہ ان کی معلومات کا آئینہ دار تو ہو سکتا ہے۔ مگر شاعری کے مواد اور اس کے رموز کے چشموں کا پتہ نہیں لگا سکتا۔ ہمارے ملک میں جس قدر غیر شاعر نقاد ہیں شاعری کے معاملے میں کوئی بھی قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ شاعری اکتسابی نہیں۔ بلکہ وہبی جذبہ اور فطری ملکہ ہے اسی بنا پر ہم وزیر آغا صاحب کو غیر شاعر ناقدوں کی فہرست میں نہیں شامل کرتے وہ شاعر ہیں اور انہیں شعر پر قلم فرسائی کا حق حاصل ہے۔

سکندر علی وجد

ایک زمانے میں جب وجد صاحب اثر لکھنوی کے معاون تھے وہ حیدر آباد سول سروس کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر یہاں ٹریننگ لے رہے تھے مگر اس وقت بھی وہ نہایت اچھے اور خوش فکر شاعر تھے ان سے ملاقات کو ایک زمانہ ہو گیا لیکن ان کا کلام نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ آج وہ حیدر آباد ہی میں ہیں اور شعرائے دکن کی صف اول میں آتے ہیں۔

وجد عموماً نظم نگاری کی ان تمام شرائط اور لطافتوں سے آگاہ ہیں جو شاعر کو معیار بخشتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ سول سروس کے آدمی ہیں لیکن اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں

پس ماندہ طبقے کی عکاسی بھی ہے اور انسانی محبت بھی، مناظر کی عکاسی بھی ہے اور نفسیات و فلسفہ کے مسائل کا سلجھاؤ بھی- وہ جب اجنتا اور ایلورا پر نظم کہتے ہیں تو ان غاروں کے تمام مجسمے متحرک اور چلتے پھرتے انسانوں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں- انہیں قدرت نے ایسی خوردہ گیر نظر دی ہے کہ تمدن اور معاشرہ کا کوئی گوشہ اور نشیب ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا اور وہ نہایت چابک دستی سے تصورات و خیالات کی تصویریں پیش کرتے چلے جاتے ہیں-

ان کی تاریخی اور رومانی نظمیں خصوصیت سے بڑی وسعتوں کی حامل ہیں جن میں درد بھی ہے اور اثر بھی بہاروں کے مہکے ہوئے جھونکے بھی اور پت جھڑ کے جھکڑوں سے جھنجھناتی ہوئی عریاں شاخیں بھی، ان کی رومانی نظمیں غزل سے بھی زیادہ پر لطف ہیں-

جناب وجد غزل کے میدان میں بھی بند نہیں میں نے ان سے مصرع طرح پر بھی غزلیں سنی ہیں- وہ لکھنؤ کے ماحول میں اپنی غزل کا لوہا منوا لیتے تھے اور جناب اثر لکھنوی جیسے کہنہ مشق استاد داد و تحسین سے نوازتے تھے-

وجد خدا کا شکر ہے کہ آج بھی حیدرآباد دکن میں اپنی اسی بہار آفرینی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں ان کی شاعری بڑے سنبھلے ہوئے انداز کی شاعری ہے- جس میں کسی نہج سے بھی سوقیانہ پستی نہیں آتی ان کے رومان میں بھی اخلاقی احتیاط باقی رہتی ہے اور ایسی شاعری ہماری قوم اور ملک ہی نہیں پوری انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہے-

واقف ردولوی

واقف ردولوی مرحوم لاہور میں آ گئے- ان کے گھر میں جناب عبدالرزاق کانپوری کی صاحبزادی تھی- واقف صاحب نہایت اچھا شعر کہتے تھے اور خالص غزل کے شاعر تھے اچانک سقوط قلب سے جاں بحق ہو گئے ان کا مجموعہ کلام اور ادب اور جناب عبدالرزاق کانپوری کے کئی مسودات میں نے ان کے پاس دیکھے ہیں- جو غیر مطبوعہ ہیں- ۱- عرب عالم اسلام سے پہلے ۲- عمر فاروق ۳- صدیق اکبر اور غالباً تاریخ جلال آباد ان کے پاس تھی- نہ معلوم ان مسودات کا کیا ہوا-؟

وامق جونپوری

جناب وامق جونپوری سے اکثر مشاعروں میں ملاقاتیں رہی ہیں وہ بڑے ہی میٹھے انسان ہیں۔ ان کی شاعری میں ادب اور سیاست کا ایسا حسین آمیزہ ہے جو اس دور کا تقاضا ہے۔ ان کے یہاں قدیم و جدید کا امتزاج ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اور اسی تخصیص نے ان کا مقام پیدا کیا ہے۔ وہ جہاں بہت اچھے شاعر ہیں وہیں نہایت اچھے دوست اور زیرک ساتھی بھی ہیں۔ وہ ترقی پسند شعراء سے بھی نزدیک ہیں اور حکومت کے کاموں میں اپنے فرائض سے بھی غافل نہیں ان کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔

واقف مراد آبادی

جناب واقف مراد آبادی ایک مدت لاہور میں رہے ہیں اور ان سے بڑی صحبتیں رہی ہیں آج کل وہ دلی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اردو پڑھاتے ہیں۔ وہ جس قدر اچھا شعر کہتے ہیں اتنے ہی اچھے رخ سے پڑھتے بھی ہیں۔ ان کے شعر کو ہر شاعر پڑھ کر نہ تو ویسا مزا لے سکتا ہے۔ اور نہ اس طرح شعر کی تصویر بن کر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ ان کے یہاں روزمرہ اور محاورات کے علاوہ بیگماتی زبان کا برمحل استعمال جناب واقف کا حصہ ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ابھی نظر سے نہیں گزرا۔

وصل بلگرامی

جناب وصل بلگرامی لکھنؤ میں رہتے تھے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے صوم و صلوٰۃ کے پابند اور اخلاقی زندگی کے قائل مگر جہاں یارباشی کی بات ہوئی وہ سب سے زیادہ آزاد اور بے تکلف ملتے۔ مشاعروں سے انہیں بڑی دلچسپی تھی اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ جب دیکھے کتاب پر جھکے پڑے ہیں ان کی شاعری کا کوئی ایک مخصوص رنگ یا طرز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی غزل ہیرے کی طرح رنگا رنگ پہلو رکھتی تھی اور ہر شعر کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل ہوتا تھا ان کا کوئی مجموعہ مجھ تک نہیں پہنچا۔

ولی وارثی

جناب ولی وارثی امرتسر کے معززین میں سے ہیں ان کا امرتسر کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ان کے ادبی ہنگاموں میں شامل ہوا ہوں امرتسر میں اردو کی توسیع واشاعت کا جنوں انہیں بے تاب رکھتا تھا اور ادب وشعر میں ان کا انہماک مشہور تھا۔ لاہور میں آ کر فضا کو دیکھا تو گوشہ نشین ہو گئے ان کی شاعری کا ایک مجموعہ "بہار جاوداں" کے نام سے چھپا تھا۔ جس میں ان کا اور ان کے دوست صابر خلیلی کا کلام تھا۔ اس کو پڑھنے سے جناب ولی وارثی کی شاعری کے خدو خال نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اب تک کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔ ان کے تغزل میں حسن وعشق اور تصوف ہوتا تھا۔ مگر اب تقسیم کے بعد ایک عجیب رنگ آ گیا ہے۔ جس میں عوام کے دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔

وحیدالحسن ہاشمی

جناب وحیدالحسن ہاشمی وحید تخلص کرتے ہیں۔ اور ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ان کی ہر بات خلوص سے پر اور انسانیت کا پرچار معلوم ہوتی ہے۔ علمی ادبی معلومات کے علاوہ علمی ادبی ہنگاموں کے مختلف پہلوؤں پر ان کی ایسی گہری نظر ہے کہ جس کی روشنی ان کے مستقبل پر پڑتی ہے۔

وحید صاحب ماشاءاللہ نوجوان ہیں مگر ان کے کلام میں تو جوانوں جیسی بے راہ روی نہیں یہ بڑا سمجھ سوچ کر شعر کہتے ہیں اور چونکہ تعلیم کے ادارے سے متعلق ہیں اس لیے کبھی اخلاقی پہلو کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ انداز بیاں اور انداز تحریر دونوں دلکش ہیں۔ بعض بعض اوقات تو ان کی شاعری کو سن کر ان کی ترقی کا اندازہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے ابھی عمر کا بڑا میدان ہے اور ہمیں وحید جیسے نوجوانوں کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ آئے دن علم وادب کی راہیں بدلتی رہتی ہیں۔ جنہیں وحید صاحب خوب سمجھتے ہیں اور منشائے وقت کو بہت جلد بھانپ جاتے ہیں۔

نثر میں بھی ان کے قلم کی جولانیاں کم نہیں تنقید وتحقیق کے فن پر بھی انہیں عبور ہے اور ان کے لکھے ہوئے مضامین اکثر ایسا مواد دیتے ہیں جن کی ضرورت شعر وادب کے ہر طالب علم کو ہوتی ہے۔ جب یہ کسی موضوع ادب پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیتے ان کی نظر خورده گیر اور ان کا قلم جزئیات نگاری میں برق رفتار نظر آتا ہے ابھی کوئی مجموعہ کلام مرتب نہیں کیا مگر ان

کا کلام اور مضامین جرائد میں چھپتے رہتے ہیں-

وصال الدین وصال

جناب وصال اول سے شعر و ادب کے دلدادہ ہیں اور بہت خوب شعر کہتے ہیں-م جودہ وقت میں ان کی زندگی ایک بڑے کاروباری انسان کی زندگی ہے اور انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعر یا ادیب اگر تجارت کی طرف مڑ جائے تو اس کی کامیابی بھی شعر و ادب کی طرح تابناک ہو سکتی ہے- میں نے ان کا کلام بہت کم سنا ہے لیکن جو سنا ہے وہ اچھا اور معیاری کلام ہے اور مجھے خوشی ہے کہ شاعر ہونے کے باوصف وہ اپنے کاروبار میں کامیاب ہیں-

گلزار وفا

جناب گلزار وفا مرے کالج سیالکوٹ میں اردو کے لیکچرار ہیں ذہین اور فطین قسم کے نوجوان ہیں نثر اور نظم دونوں میں وہ بند نہیں نئے دور کے مطابق وہ شاعری میں جدید نظم کے بھی قائل ہیں اور قدیم طرز تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ابھی نوجوان ہیں اور فطری ذوق ملا ہے- اس لیے ان کی ادبی ترقیوں کے متعلق وثوق سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا صلاحیت اپنی جگہ لیکن مستقبل میں جب ان کا کوئی کارنامہ سامنے آئے گا تو معلوم ہوگا-

ولی حسین ولی

جناب ولی حیدرآباد سندھ میں ہیں اور ستھرا شعر کہتے ہیں میں نے ان کی نظمیں نہیں سنیں مگر وہ غزل اچھی کہتے ہیں- سیدھی سادی اور سہل ممتنع کی شاعری کرتے ہیں اور اردو کی ترویج و اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں ابھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا-

وفا راشدی

جناب وفا راشدی کو میں قریب سے جانتا ہوں وہ ایک عرصہ لاہور میں رہے ہیں اور غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے وہ بڑے محنتی آدمی ہیں اب تک ان کا تمام تر کام محنت کا کام ہے اور دفتری مصروفیات کے بعد محنت ہر ایک کے بس کا روگ نہیں- ہمارے ملک اور قوم کو ایسے نوجوانوں کی

ضرورت ہے۔ابھی جناب وفا کے سامنے کوئی بڑا کام نہیں آیا مجھے امید ہے کہ جب بھی انہوں نے کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالا وہ کامیاب ہوں گے ان کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر وجدی

جناب وجدی میرے قدیم کرم فرما ہیں اور ایک زمانہ سے شاعری کے ذوق میں مست ہیں ظاہر ہے کہ زمانہ تو خود بڑا استاد ہوتا ہے۔وجدی صاحب کہنہ مشق ہیں اور بڑے سنبھل کے غزل کہتے ہیں۔ان کی غزل میں قدیم سانچے ضرور ہیں لیکن ان کے یہاں جدید فکر کی روشنی بھی ملتی ہے۔بڑے خلیق اور دوست نواز انسان ہیں اور یہ خصوصیت بھی ان کے اچھا شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

وفا فرخ آبادی

جناب وفا فرخ آبادی ادبی دنیا میں مستقل چھپنے والے لوگوں میں تھے ان کے یہاں رعایت لفظی سے آرائش بیان پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور اس دور کے رجحان کے مطابق خوب شعر کہتے تھے اگر ان کی غزلیں اکٹھی کی جائیں تو ایک اچھا خاصا مجموعہ ہو سکتا ہے۔وہ بڑے زود گو قسم کے شاعر تھے مگر پھر ایک دفعہ ہی غائب ہو گئے اور پتہ نہیں چل سکا کہ کیا ہوا۔ان کا کوئی مجموعہ بھی ہے یا نہیں۔

وفا جھانسوی

وفا جھانسوی لاہور میں بڑے پریشان رہے اب ریلوے میں ملازم ہیں۔بہت اچھی طبیعت پائی ہے۔ان کا نظریہ شعر انفرادیت تک نہیں بلکہ اجتماعیت تک مار کرتا ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز اور تہذیب و تمدن کے سلگتے ہوئے ناسور بھی موجود ہیں۔اگر ذرا سا علم و فراغت کا سہارا مل جائے تو ان کے جوہر اور بھی تابناک ہو سکتے ہیں۔

وامق عظیم آبادی

جناب محبوب الرحمن وامق پٹنہ کے رہنے والے ہیں پہلے لاہور میں تھے اور اب کراچی کی سکونت اختیار کر لی بڑے ہی رنگین اور تیکھے شعر کہتے ہیں۔جناب نیاز فتح پوری مرحوم کے رسالہ ''نگار'' میں مستقل چھپتے تھے بڑے پر خلوص صاف گو اور انسان شناس واقع ہوئے ہیں وہ یوں تو انکم ٹیکس کے

ماہر ہیں لیکن جب وہ شعروادب پر گفتگو کرتے ہیں تو اپنے مشغلہ حیات سے کوسوں دور نظر آتے ہیں تنقیدی مطالعہ بھی ان کا اس قدر ہے کہ سیکڑوں مصنفین کے اقوال اور نظریات ان کے سامنے دست بستہ رہتے ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی نہیں چھپا۔

وشوامتر عادل

ایک نوجوان شاعر جو کالج کے مباحثوں اور مناظروں میں دن رات سرگرداں رہتے تھے اور غزل و نظم کے علاوہ نثر میں بھی اچھے خاصے رواں تھے۔ مجھے ان میں ترقی کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد بعض رسالوں میں دو چار بار نظر آئے پھر معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی کوئی سمت بھی متعین ہوئی یا نہیں اور زندگی نے انہیں اس کی فرصت دی یا نہیں کہ دنیا کے باطن میں جھانک سکیں۔

واصف حسین واصف

اسلامیہ کالج بریلی میں زبان و قلم کے مرد میدان تھے۔ ادباء وشعراء میں ان کی بڑی شہرت اور عزت تھی۔ تصوف کے ساتھ ساتھ علمی ادبی معلومات کے اعتبار سے بھی وہ مطالعہ کا ایک خاص رخ رکھتے تھے۔ جس میں تاریخ وادب کا امتزاج ہوتا تھا۔ ان کی شاعری کو تصوف سے ہٹا کر دیکھنا گمرہی ہے۔

وحشی کانپوری

جناب زور سہائے وحشی کانپوری وکالت کرتے تھے نہایت خلیق، ملنسار اور زود آمیز قسم کے انسان اور شاعری میں حسن وعشق کے مختلف پہلوؤں پر عجیب عجیب انداز سے روشنی ڈالتے تھے۔ کانپور کے مشاعروں کے علاوہ میں ان سے گھر پر بھی ملا ہوں اور وہ ہر موقع پر شاعر اور ہنس مکھ انسان ملے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کا کلام ہر رسالے اور اخبار کی زینت ہوتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ نئے انسانوں کے نئے خیالات وتصورات کے اخبار قدیم خیالات ونظریات کو دباتے چلے آئے ہیں نہ معلوم ان کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے کہ نہیں۔

وید محمد اجمل

تقسیم ملک سے پہلے وہ ادب میں آ رہے تھے مگر ان کا انداز ایسا تھا جس میں ان کی شاعری کا مستقبل بھی جلوے کی چھوٹ ڈال رہا تھا- بے شکن اور بے جھول کے شعر کہتے تھے اور الفاظ کے استعمال پر ان کا اچھا خاصا قابو معلوم ہوتا تھا اور ان میں بلا کی ذہانت ذوا ز دیتی تھی-اب نہ جانے وہ کن منزلوں میں ہوں گے کیونکہ پاکستان میں بغیر اکھاڑے کے ہندوستانی ادیبوں کے کارنامے ذرا کم ہی دستیاب ہوتے ہیں-

سید ہاشمی فرید آبادی

جناب ہاشمی فرید آبادی سے اہل علم خوب واقف ہیں میں چند سطور میں ان کے متعلق کیا لکھوں ان کے لیے تو ضخیم کتاب درکار ہے کیونکہ ادب میں ان کا اس قدر کام ہے کہ جب ان کی کتابوں کی فہرست اور ضخامت سامنے آتی ہے تو انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے- ایسا محقق' ادیب' شاعر اور چوکھا عالم ادیب صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے- انہوں نے جو دکنی ادب پر کام کیا ہے وہ اہل دکن کے لیے صدیوں باعث افتخار رہے گا-ضرورت ہے کہ ان کی کتابوں کا پورا سیٹ ملک کی ہر لائبریری میں موجود ہو اور عوام ان سے استفادہ کریں-

ہاشم رضا لکھنوی

لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور تقسیم کے بعد کراچی میں انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر فائز تھے لیکن شعر و ادب میں بھی بلند مقام کے انسان تھے میں نے مشاعرہ میں انہیں سنا ہے- وہ آرائش بیان میں لاجواب شاعر تھے اور ضرب الامثال اور تلمیحات کا ان کے یہاں بڑا مناسب استعمال ہوتا تھا- یوں تو وہ سارا خاندان ہی علمی ادبی ہے لیکن وہ اپنی طرز بیان کے واحد آدمی تھے- مرثیے انہوں نے کم کہے لیکن جو کہے وہ بہت خوب کہے- حالانکہ انہیں اپنے فرائض کی مصروفیت سر نہیں اٹھانے دیتی تھی- لیکن اس کے باوجود وہ ادب و شعر سے ان کا رشتہ مضبوط تھا-

ہادی حسن

ریٹائرڈ آئی سی ایس ہیں لیکن مدت ملازمت میں بھی انہوں نے ادب کا دامن نہیں چھوڑا اور کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے ہیں۔ غزل اور نظم کے علاوہ تنقید و تبصرہ اور ترجمہ بھی بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ انگریزی ادب میں قابل رشک عبور ہے کلام کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں ان کے قلم کی مرہون ہیں۔

ہوش ترمذی

ہوش ترمذی ساڈھورہ ضلع انبالہ کے رہنے والے ہیں تعلمی لحاظ سے ایم اے ہیں اور نسبی لحاظ سے ان کا شجرہ حضرت سید احمد توختہ ترمذی سے جاملتا ہے۔ ملازمت کے اعتبار سے انفارمیشن کے افسر ہیں۔

جہاں تک شاعری کا سوال ہے اس میں یہی کہتے بن پڑتی ہے کہ آپ فطری شاعر ہیں غزل اور نظم دونوں میں مہارت تامہ حاصل ہے ہیتی اعتبار سے جدید صورت پر قدیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن خیالات کا بیان نئے اور اچھوتے انداز میں کرتے ہیں۔ اور اس سے شعر میں اس قدر اثر پیدا ہو جاتا ہے کہ جدید رنگ کے شاعر مڑ کر قدیم دور کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہوش صاحب کے یہاں اشعار تو خیر جان نواز ہوتے ہی ہیں ان کا ترنم ان میں اور بھی بجلیاں بھر دیتا ہے۔ چند روز ہوئے اپنا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ ابھی تک غالباً چھپ کر نہیں آیا۔

ہشیار میرٹھی

جناب ہشیار میرٹھی ایک مزدور قسم کے انسان ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ نہایت اچھے شاعر اور لطیف احساس انسان ہیں۔ بڑی سلجھی ہوئی غزل کہتے ہیں ان کے شعر میں الجھاؤ نہیں ہوتا اور وہ فن کی بھی زیادہ الجھنوں میں نہیں پڑتے اور سیدھے سادے نشتر ڈھالتے ہیں جو دل تک کی خبر لیتے ہیں۔ خوب انسان ہیں اور اقدار شرافت کے اچھے محافظ۔

پورن سنگھ ہنر انوری

مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگردوں کی صف کا ایک شاعر مشاعروں میں کم اور نجی نشستوں میں کھل کر غزل پڑھنے والا باحوصلہ انسان' غزل میں سانچے قدیم رنگ کے لیکن وقت کی آواز پر رخ بدل لینے والا صاحب قلم' ہنرمند شاعر ہی نہیں وہ صحافی بھی ہے اور ادیب بھی عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ان کا کوئی مجموعہ مجھ تک پہنچ سکا۔ سنا ہے کہ کسی تصنیف پر گورنمنٹ سے انعام یافتہ بھی ہیں۔

ہندی گورکھپوری

جناب ہندی گورکھپوری کا شعر اس وقت پیدا ہو رہا تھا۔ جب ملک میں چاروں طرف سیاسی ہنگامے تھے یعنی قدم قدم جہاد آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور چونکہ فطرت کو یہ منظور تھا کہ یہ شاعر بنیں اس لیے انہیں اس نے افلاس سے نوازا اور دکھوں بھرے دنوں سے ان کی زندگی شروع ہوئی یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں ایک تلخی ہے جو ہمیشہ انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنی مصیبتوں کو نظر انداز کر کے دوسرے دکھوں کو اپناتے ہیں ملک کی غلامی' وطن کا افلاس' دوستوں کا رویہ' اعزا کا شکوہ اور تمدن و معاشرت کی طرف سے جھلاہٹ ان کے کلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اب تو نہ جانے یہ چنگاری کہاں پہنچ گئی ہوگی میں نے جب انہیں دیکھا تو ان میں شاعری کا تیکھا پن جنم لے رہا تھا۔ اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی صرف رسالوں اور اخباروں ہی میں کہیں کہیں نظر آئے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ کیسے شاعر ہو جاتے ہیں اور ان میں فطرت کس قسم کے شعلوں کو جنم دے کر ان کے ہاتھ سے تمدن و معاشرت کے کیسے کیسے خس و خاشاک کو خاکستر کراتی ہے۔ میں تو اسے جہاد آزادی کا ایک سپاہی کہوں گا جو ماضی قریب میں بھرتی ہوا تھا۔ مگر اس میں بلندی کے آثار اپنا اعلان کر رہے تھے۔

احمد ہمیش

ضلع بلیا کا رہنے والا نوجوان جس میں شاعری کے منہ زور جراثیم بے تاب تھے۔ لیکن اس کے حالات نے اسے باقاعدہ تعلیم سے بہرہ اندوز نہیں ہونے دیا۔ وہ عرصہ تک لاہور کی گلیوں میں کھنکتا

پھراا ور اپنی حالت کے احساس نے اس کی صحت بھی خراب کردی وہ تو خیر گزری کہ جناب حبیب اللہ سعدی اسے اپنے باغ میں کمالیہ لے گئے اور وہاں کچھ آب و ہوا کی تبدیلی اور کچھ علاج معالجہ سے اس کی صحت بحال ہوئی آج کل وہ کراچی میں تھے اور سنا ہے کہ ریڈیو کے ادارہ سے متعلق تھے وہ جدید لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے جو ردیف' قافیہ اور بحر کی قید سے آزاد ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ آزادی اپنا مفہوم اسی طرح سمجھاتی ہے۔

ہزار لکھنوی

جناب ہزار لکھنوی کی بھی عمر ایسی نہ تھی مگر اس میں شاعری ورثہ کی چیز تھی اور ابتدا ہی سے شاعرانہ صلاحیتیں ابھر رہی تھیں وہ اگرچہ میری بھی ابتدا کا زمانہ تھا اور شاعری کے رموز سے میں بھی ایسا آگاہ نہ تھا جتنا جانتا تھا اس معیار پر میں ہر شعر کو جانچتا اور پرکھتا تھا۔ ہزار کا مستقبل اس کے حال کے دریچوں سے اشاروں میں اپنا تعارف کرا رہا تھا۔ خدا کرے وہ تندرست ہو اور حضرت بہار کی تابندہ یادگار کہلائے۔

ہادی مچھلی شہری

سید محمد ہادی مچھلی شہری عربی' فارسی کے منتہی تھے اور علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی کر کے وکالت شروع کی اور تقسیم ملک سے پہلے تک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے وکالت کرتے رہے۔ قیام پاکستان پر ہادی صاحب کراچی آ گئے۔ اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہادی صاحب کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا اور اوائل عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔

فن شعر میں حضرت جلیل مانک پوری سے تلمذ تھا عرصہ ہوا اردو غزلوں کے دو دیوان مرتب کر چکے تھے جن میں ایک تو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اور دوسرا نظموں پر جہاں تک ان کی فارسی دانی کا تعلق ہے ان کے کلام کو ایران کے اساتذہ معیاری فارسی قرار دیتے ہیں۔ عرصہ ہوا اہالیان ایران نے اقبال کی موجودگی کے باوصف ہندوستان سے صرف دو آدمیوں کو آنے کی دعوت دی تھی۔ ایک ٹیگور دوسرے ہادی مچھلی شہری اور وہاں ہادی صاحب کی زبان اور شاعری کو توقع سے زیادہ سراہا گیا۔ اردو شاعری میں وہ ہر صنف سخن پر حاوی ہیں اور شعر کی افسونی کیفیت ان کے اکثر اشعار سے

جھلکتی ہے کلام میں ناہمواری، ثقافت کا کوسوں پتہ نہیں چلتا اظہار خیال میں ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ طویل طویل مضمون سمٹ کر شعر کے مختصر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

ہادی کی غزلوں میں زبان کی گھلاوٹ اور بیان کی لطافت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور یہ سلیقہ بڑی مشکل سے آتا ہے۔ یوں تو شعر قریب قریب سبھی موزوں کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ موزونیت ہی تو شاعری میں تو سوز و گداز کے ساتھ سلیقہ بیان اور لطافت اسلوب کی متقاضی ہے۔

ہادی کی غزلوں میں جلیل صاحب والی سادگی اور سہل ممتنع تو ملتا ہے لیکن جہاں تک مفہوم کا تعلق ہے وہ پورے دور سے الگ ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔

ان کی نظموں میں تجربات کے ساتھ ان کا گہرا مشاہدہ بھی بولتا ہے اور مناظر نگاری میں جب وہ خوردہ گیری کی طرف آتے ہیں تو ہوا کی رمق اور پتی کی جنبش بھی ان کی نظر سے نہیں بچتی لیکن اس کے باوصف وہ غزل کے کامیاب اور معیاری شاعر ہیں۔

میں جب الہ آباد مسلم ہاسٹل کے مشاعروں میں جاتا تھا تو سید نجم الدین جعفری کے یہاں قیام کرتا تھا کیونکہ جعفری صاحب مجھے بچوں کی طرح محبت بھی کرتے تھے اور میری شاعری کے مداح بھی تھے۔ ہادی صاحب سے جعفری صاحب کے یہاں ہی بڑی طویل طویل نشستیں رہتی تھیں کئی بار وہ مجھے اپنے مکان پر بھی لے گئے اور بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے وہ میری منظریہ نظموں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ نظم میں اتنی تفصیل اور تفصیل کے ساتھ گہرائی ملک کے اور کسی شاعر میں نہیں ملتی میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اس طرح میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اس دور کے بزرگوں میں یوں ہی اپنے سے چھوٹوں پر شفقت کا قاعدہ چلا آتا تھا۔ اس سے مبتدیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے تھے اور عزائم میں راہ پیمائی آ جاتی تھی۔

ہادی صاحب کراچی میں آنے کے بعد بھی ریڈیو اور دیگر ادبی مجلسوں میں حصہ لیتے رہے انہیں آخری وقت تک شعر کا ملکہ رہا اور بہت کم لوگ اس جگرے کے دیکھنے میں آتے ہیں سنا ہے کہ ان کا اردو دیوان چھپ چکا ہے۔ میں ابھی تک اس کے مطالعہ سے محروم ہوں۔

غلام مصطفیٰ ہمدانی

ہمدانی صاحب پرانے لکھنے والوں میں ہیں اردو فارسی اور انگریزی پر قابل قدر عبور ہے۔ انہیں ایک زمانہ ریڈیو میں ہو گیا ہے۔ لیکن وہ ہنوز اخلاق اور انسانیت سے دست بردار نہیں ہوئے اور نہ ان کی غلط شہرت ہے ورنہ ریڈیو اراکین کے معائب اور محاسن دونوں سفر میں رہتے ہیں۔

جناب ہمدانی نہایت اچھا صاف ستھرا شعر کہتے تھے اور خصوصاً اسلام اور منقبت تو تخصیص کے ساتھ خوب کہتے تھے۔ خیال تھا کہ ان کا ادب میں ایک خاص مقام ہوگا لیکن انہیں ریڈیو کی مصروفیت لے بیٹھی اور جب سے وہ اس ادارہ میں داخل ہوئے ہیں ان کا کوئی کارنامہ سامنے نہیں آیا۔

ہوش لکھنوی

ہوش صاحب جناب زخمی لکھنوی کے صاحبزادے ہیں ظاہر ہے کہ ورثہ میں شاعرانہ ذوق پایا ہے۔ یہ بھی ریلوے میں ملازم ہیں اور اپنے والد کے سائے میں شاعری کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ غزلیں تو کئی بار سنی ہیں مجموعہ ابھی کوئی نہیں دیکھا۔ ان میں بھی لکھنؤ کا رنگ اسی طرح ہے جیسے زخمی صاحب میں وہی زبان اور روزمرہ و محاورات کا سنبھلا ہوا استعمال۔

یاس یگانہ چنگیزی

مرزا واحد حسین یاس۔ میں یاس صاحب سے نہ قریب رہا ہوں اور نہ ایک دو ملاقات سے زیادہ ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔

وہ دوار کا داس شعلہ کے استاد تھے اور دوار کا داس شعلہ لاہور کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ انارکلی میں ان کی بہت بڑی دکان تھی جہاں دوائیں فروخت ہوتی تھیں شعلہ صاحب تقسیم ملک کے باعث دہلی چلے گئے اور وہیں کاروبار کر رہے ہیں۔ وہ جہاں ایک کاروباری اور مخیر قسم کے انسان ہیں وہیں وہ دوست نواز اور نغز گو شاعر بھی ہیں۔ کبھی کبھی رسالوں میں ان کا کلام پڑھتا ہوں تو ایک ڈرامہ سا آنکھوں سے گزر جاتا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر خدانخواستہ گھر میں کوئی تکلیف ہو تو دواؤں پر پیسے صرف کرنے کی ضرورت نہیں نسخہ میرے یہاں بھیج دیا کریں یہی نہیں بلکہ

جس کو آپ غریب اور مستحق خیال کریں اسے اپنے دستخطوں کے ساتھ میری دکان کا پتہ بتا دیں اور جب تک وہ لاہور میں رہے اسی طرح ہوتا رہا۔

ان میں یہ دوستی اور دوست نوازی کا جذبہ غالباً یاس یگانہ کی تعلیم نے پیدا کر دیا تھا۔ ورنہ عموماً کاروبار بڑے سخت دل ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے صرف اپنے مفاد رہتے ہیں ان کی دوستی بھی مفاد کے لیے ہی ہوتی ہے۔ شعلہ صاحب میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ جس کے دوست تھے اس کے تو دوست تھے ہی انہوں نے اگر دشمن کو بھی مصیبت میں دیکھا ہے تو اس کی مدد کی ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ بہت کم کہتے ہیں۔ مگر خوب کہتے ہیں۔ ابھی تک ان کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کیونکہ تقسیم ملک نے علمی رسل ورسائل کے راستے بھی مسدود کیے ہوئے ہیں۔

یگانہ کے قادر الکلام ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن یگانہ پر ابھی تک کوئی خاص کام نہیں ہو سکا۔ پچھلے سال میں نے ایک ایم اے کی لڑکی کی یاس کے مقالے کے سلسلے میں رہنمائی کی تھی اور وہ اچھا خاصا دو سو ڈھائی سو صفحے کا مواد ایک جگہ ہو گیا تھا اب نہ جانے وہ کب چھپے کیونکہ پنجاب یونیورسٹی میں مقالوں کے چھپنے کی روایت بڑی کمزور ہے۔

پہلے یاس بے تاب عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے اور بے تاب نے اپنے استاد شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا اور ان کے فن میں بڑی ترقی ہوئی۔ پھر وہ کلکتہ چلے گئے وہاں بیمار ہو کر بغرض علاج لکھنؤ آئے تو لکھنؤ کی فضا ایسی دل کو لگی کہ وہیں شادی کر لی اور لکھنؤ کو وطن بنا لیا۔

یاس بڑے نازک مزاج اور زود رنج قسم کے انسان تھے چنانچہ جب وہ لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں شامل ہوئے تو وہ کسی کو خاطر میں نہ لائے کچھ روز تو لوگ خاموش رہے۔ لیکن تابہ کے چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور رفتہ رفتہ یہ تلخی تحریروں میں آ گئی پھر یاس یگانہ کہاں دبنے والے تھے۔ پورے لکھنؤ کے مقابلے پر تنہا ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کی کتاب ''خرافات عزیز'' اس کا بین ثبوت ہے لکھنؤ کے حلقے سے نکل کر وہ غالب اور اقبال دونوں پر برسے جس سے لوگوں میں ان کی گمراہی عام ہو گئی اور لوگ انہیں نظر انداز کرتے چلے گئے۔ حالانکہ وہ ہر سیہ کے استاد تھے اور ان کے ساتھ ایک متعصب گروہ ہونا چاہئے تھا لیکن وہ ایسے تنگ مزاج اور سخت جان واقع ہوئے تھے کہ لچکنا نہیں جانتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ کہیں ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ صرف ایک دوار کا داس شعلہ کی ذات تھی جس سے وہ بہت

نزدیک تھے اور شعلہ بھی ان سے پرستش کی حد تک محبت کرتے تھے۔

جب لکھنؤ میں ان کے مخالفین نے ان کے لیے میدان اتنا تنگ کر دیا تو وہ حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں رجسٹرار ہو گئے۔ یگانہ کی فطرت کا تیکھا پن ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔ زبان سے کما حقہ واقفیت کے باعث ان کے یہاں زبان کا صحیح استعمال ملتا ہے۔ یاس اپنے انداز کا بڑا ہی بانکا شاعر ہے اگر زبان کا چڑ چڑا پن نہ ہوتا تو غزل میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے اشعار میں ایک قسم کا سلجھاؤ ہے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مفہوم کو آسانی کے ساتھ غزل میں کہہ جاتے ہیں اور معنویت میں ذرا بھی ناہمواری نہیں آتی۔ ان کے طرز بیان میں ان کے تخلص جیسی یاس نہیں وہ زمانے کے مصائب کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہیں اور یاسیت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔

اساتذہ میں یگانہ صرف آتش کے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ اردو ادب نے ایک ہی شاعر کام کا پیدا کیا ہے اور وہ ہے خواجہ آتش لیکن اگر دیکھا جائے تو خود یاس کے یہاں خواجہ آتش سے کہیں زیادہ روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔

یاس کی رباعیات اور قطعات میں بھی نکات کی کمی نہیں ان میں زبان ایسی استعمال ہوئی ہے جس میں یاس اپنے معیار شعری سے گر گئے ہیں ان میں ان کی وہی تلخی و تیزی نمایاں ہے جو حد ادب میں نہیں رہتی وہ سنجیدگی سے ظرافت پر آ جاتے ہیں اور ظرافت سے گستاخی تک مار کرتے ہیں۔ مگر نہ جانے انہوں نے کیوں یہ روش اختیار کی اور کیوں اس نشیب کو وہ اپنی بلندی سمجھنے لگے۔

مرزا یاس یگانہ جب حیدر آباد سے لکھنؤ آ گئے تو ان میں ایک عجیب قسم کی سنجیدگی آ گئی تھی چنانچہ ایک دن نہ جانے دماغ کے کس دریچے سے کون سا پردہ اٹھ گیا کہ بیٹھے بیٹھے آبدیدہ ہو گئے اور اپنا منہ پیٹنے لگے اور کہنے لگے میں تجھے یہیں ذلیل کروں گا یہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک گدھا منگوایا اور اپنا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار ہو گئے اور محلّے کے بچوں کو کہا کہ میرے گلے میں رسی باندھ کر مجھے شہر بھر میں رسوا کرتے پھرو۔ چنانچہ یہی ہوا اخبارات نے لکھا کہ یاس یگانہ پاگل ہو گئے ہیں۔ لڑکے انہیں گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ (ممکن ہے یہ خود اذیتی ان کی توبہ کا ایک انداز ہو) بعد میں اسی عالم میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ان کے دو مجموعے ''آیات وجدانی'' اور ''گنجینہ'' چھپ چکے ہیں اور ''چراغ سخن'' ان کی ایک

مختصر کتاب عرض پر ہے جو بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے زیادہ کارآمد ہے۔

یوسف جمال انصاری

جناب یوسف جمال انصاری انگریزی کے لیکچرر ہیں اور اردو میں ایک زمانہ سے شاعری کر رہے ہیں۔ میں ان کے علی گڑھ کے زمانے سے انہیں سنتا اور پڑھتا آ رہا ہوں۔ پاکستان کے ہر اچھے اور برے رسالے میں ان کا کلام چھپتا ہے۔ جس میں ان کے استادانہ پہلو اور کہنہ مشقی کے انداز بولتے ہیں۔ نہایت زندہ دل اور خوش ذوق انسان ہیں ان کی نظموں اور غزلوں میں ان کی معلومات اور مطالعہ دعوت فکر دیتا ہے اور داد و تحسین پر مجبور کرتا ہے۔

ڈاکٹر یاور عباس

جناب ڈاکٹر یاور عباس بڑے پرانے کہنے والوں میں ہیں۔ غزل ہو یا نظم، منقبت ہو یا مرثیہ یہ کسی میں بند نہیں ہیں۔ زبان و بیان کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کے شناور ہیں۔ روزمرہ اور محاورات کا استعمال ان کے یہاں بڑے اصول وضوابط سے ہوتا ہے اور معمولی سے معمولی خیال کو وہ اپنے اس فن سے چمکا کر آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بڑے ہی دوست نواز اور یار باش قسم کے انسان ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کا ایک ہنگامہ ان کے گرد رہتا ہے۔ لیکن کمال ہے کہ وہ شاعروں اور ادیبوں کی صحبت سے نہیں گھبراتے اور ان کی حوصلہ افزائی ان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر یاور عباس کا دم کراچی کے شرفاء کے لیے ایک رحمت ہے۔

مولوی شرف الدین یکتا

یکتا جودھ پور کے رہنے والے ہیں حیدرآباد میں مقیم ہیں اور حضرت بے دل بدایونی خلف بے خود بدایونی کے شاگرد ہیں وہ شعرائے جے پور کا ایک تذکرہ لکھ رہے تھے سنا ہے کہ وہ مکمل ہو گیا ہے۔ نہ معلوم کب چھپے گا مکمل صورت میں بھی میری نظر سے گزرا البتہ جناب یکتا غزل اور نظم کہتے ہیں اور قدیم انداز میں بہت خوب کہتے ہیں۔

راز یوسفی

راز یوسفی لاہور میں مقیم ہیں۔ ناول اور ڈرامے میں انہیں خاص مہارت ہے اور شعر بھی کہتے ہیں۔مگر قدیم روش کی نظمیں اور غزلیں تخلیق کرتے ہیں ان کی شاعری بے مقصد نہیں اور فن کے احاطے سے نکلتی ہے۔ان کے ڈرامے الحمراء میں بھی اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔آج کل بچوں کا لٹریچر لکھ رہے ہیں۔ہمارے خیال سے وہ شاعر سے زیادہ ادیب ہیں اور انہیں اسی میدان میں مہارت ہے ان کے کئی ناول چھپ چکے ہیں جو ان کے اوصاف کے آئینہ دار ہیں۔

یزدانی جالندھری

جناب یزدانی جالندھری مولانا تاجور نجیب آبادی سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔قاعدہ کے شاعر ادیب اور صحافی ہیں لیکن ادبی اور صحافتی فضا سے الگ ہو کر ایک عرصہ سے فلمی لائن کی طرف رخ کر لیا ہے اور اس میں بھی وہ شریفانہ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔جہاں تک ان کی قابلیت اور ذہانت کا تعلق ہے۔وہ پڑھے لکھے انسان ہیں لیکن چونکہ وہ شرافت، ذہانت اور حق گوئی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اس لیے یہاں کی ادبی فضا کے ہنگاموں اور ریڈیو کے اراکین سے باہر رہتے ہیں۔نظم اور غزل دونوں پر یکساں عبور ہے۔اداریہ نگاری اور مضمون نویسی میں بھی طاق ہیں مگر ہر جگہ ان کی اخلاقی اقدار اور ان کی حفاظت ان کے آڑے آئی ہے۔رسالوں اور اخباروں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں۔بیس پچیس کتابیں ہیں۔ان میں کچھ ترجمے ہیں اور ایک رباعیوں کا مجموعہ ہے۔

یوسف علی گڑھی

بزرگ شاعر تھے اور خود کو حضرت داغ کا شاگرد بتاتے تھے مشاعرہ میں بڑے ٹھاٹھ سے غزل پڑھتے تھے اور جذبات میں غزل پڑھتے پڑھتے بے قابو ہو جاتے تھے اور بے قابو ہوتے تھے تو کہیں کہیں بحر کے کناروں سے آب ضائع ہونے لگتا تھا۔انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کی صحبتیں اٹھائی تھیں اس لیے ادب کی تاریخ کا بڑا حصہ ان کی گفتگو میں آ جاتا تھا اور ان سے مل کر معلومات میں اضافہ ہوتا تھا بالآخر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یوسف بخاری دہلوی

جناب یوسف بخاری دہلی کے معززین سے ہیں آج کل کراچی اردو بورڈ میں تدوین لغت کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔انہیں نظم ونثر دونوں میں مہارت ہے۔دلی کے روزمرہ اور محاورات ان کی زبان وقلم پر آکر ہی اپنے معنی بتاتے ہیں۔دہلی کی تہذیب کے متعلق جو انہیں معلوم ہے وہ بہت کم لوگوں کے علم میں دیکھا گیا ہے۔وہ قدیم تہذیب کے شرفاء کی طرح خلیق ملنسار اور شیریں گفتار انسان ہیں ان کا چہرہ لباس، تحریر اور رکھ رکھاؤ ان کے اصل دہلوی ہونے کا روشن ثبوت ہے۔

نواب یوسف علی خاں مگسی

نواب یوسف علی مگسی مرحوم میرے بڑے عزیز دوستوں میں تھے وہ ریاست جھل کے نواب ضرور تھے مگر شاعر اور ادیب بھی تھے اور درویش دوست بھی، میں نے ان میں کئی خوبیاں ایسی دیکھی ہیں جو بادشاہوں میں نہیں ملتیں۔انہیں جہاں ادب پر عبور تھا وہیں سیاست پر بھی گہری نظر تھی وہ میرے ساتھ ایک ادبی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ان کے پیش نظر ایک بڑے معیاری پریس کا منصوبہ تھا اور ایک تصنیف وتالیف کا مثالی حلقہ اور اخبار مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ عزیز کوئٹہ کے زلزلے میں زمین کا لقمہ ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

سر محمد یعقوب

سر یعقوب صاحب سے نجم الدین جعفری کی معرفت ملاقات ہوئی اور وہیں باتوں میں ایسی بے تکلفی ہوگئی کہ برسوں کے تعلقات معلوم ہونے لگے۔سر یعقوب صاحب بڑے مسلمان اور مسلم نواز انسان تھے۔جہاں وہ ہندوستان کی بہبود کے طالب تھے وہیں وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔ایک بار مل کر وہ جب بھی ملے دوستوں کی طرح ملے۔

صاحبزادہ محمد یونس

صاحبزادہ محمد یونس صاحب حکومت کی انتظامیہ میں ایک ذمہ دار افسر ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان اور وفادار انسان ہیں ان کی کئی غزلیں نظر سے بھی گزری ہیں اور سنی بھی ہیں

وہ عموماً علامہ اقبال کا اتباع کرتے ہیں اور انہیں کی صحت فیصلہ کا یہیں سے پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ ابھی تک ہمارے ادب میں اقبال کے اتباع کا ابھی کوئی ڈھب کا شاعر نظر نہیں آتا۔ صاحبزادہ یونس مادی بیانوں سے گزر کر روحانی مناظر پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جب لکھنؤ میں ریونیو بورڈ میں تھے تو رات کو دو دو تین بجے تک مجھے مزارات پر لیے پھرتے تھے اور ان کی قریب قریب ساری رات فاتحہ خوانی اور چلتی پھرتی عبادت میں گزرتی تھی۔

حکیم یوسف حسن

حکیم یوسف حسن صاحب کو کون نہیں جانتا کہ وہ لاہور کے مشہور رسالہ ''نیرنگ خیال'' کو ایک زمانہ سے نکال رہے ہیں اور اب تک اسی جرات و ہمت سے اسے زندہ رکھ رہے ہیں۔ حکیم صاحب چونکہ ایک زمانہ سے لکھ رہے ہیں اس لیے ان کے ادیب ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ ''نیرنگ خیال'' کے بہت اچھے اچھے نمبر بھی نکلے ہیں۔ جنہیں آج تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ نیرنگ خیال کے اچھے مضامین کتابی صورت میں ایک جگہ کروائے جائیں یا نیرنگ خیال کا انتخاب نمبر شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی خدمات سامنے آ جائیں۔

نیلے پھولوں کی بارش میں (نیا شعری مجموعہ)

مشہور شاعر اور منفرد اسلوب نگارش کے حامل سعد اللہ شاہ کا نیا شعری مجموعہ۔ نئی سوچ، نئے زاویے نیا لہجہ۔ دلکش سرورق اور نہایت اعلیٰ کاغذ پر عمدہ طباعت۔ قیمت -/۱۵۰ روپے

محبت

سعد اللہ شاہ کے شعری مجموعہ کی نئی اشاعت۔ قیمت -/۱۵۰ روپے

تمہی ملتے تو اچھا تھا

سعد اللہ شاہ کا یہ شعری مجموعہ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ادارہ خزینہ علم و ادب نے اب اسے نہایت اعلیٰ کاغذ اور بہترین معیار طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت -/۱۰۰ روپے

جہاں پھولوں کو کھلنا تھا

سعد اللہ شاہ کی منتخب غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ۔ ادارہ خزینہ علم و ادب نے اسے نہایت اعلیٰ کاغذ اور بہترین معیار طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت -/۱۵۰ روپے

کچھ دیر ٹھہر اے دل

سعد اللہ شاہ کی منتخب نظموں پر مشتمل مجموعہ۔ ادارہ خزینہ علم و ادب نے اسے نہایت اعلیٰ کاغذ اور بہترین معیار طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت -/۱۵۰ روپے

ذرا جو تم ٹھہر جاتے (شعری مجموعہ)

نوجوان شاعر آصف شفیع کا نام اب محتاج تعارف نہیں رہا۔ اولین اشاعت کے بعد نہایت قلیل مدت میں اس شعری مجموعے کی دوسری اشاعت منظر عام پر آئی ہے۔ قیمت -/۱۰۰ روپے

ترے ہمراہ چلنا ہے (آصف شفیع کا دوسرا شعری مجموعہ) قیمت -/۱۰۰ روپے

مشہور شاعرہ فاخرہ بتول کے شعری مجموعوں کی نئی اشاعتیں

کہ وہ چاند کیسا تھا	قیمت -/۱۲۰ روپے
چاند نے بادل اوڑھ لیا	قیمت -/۱۲۰ روپے
پلکیں بھیگی بھیگی سی	قیمت -/۱۲۰ روپے
اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو	قیمت -/۱۲۰ روپے

ناشر: خزینہ علم و ادب۔ الکریم مارکیٹ۔ اردو بازار، لاہور